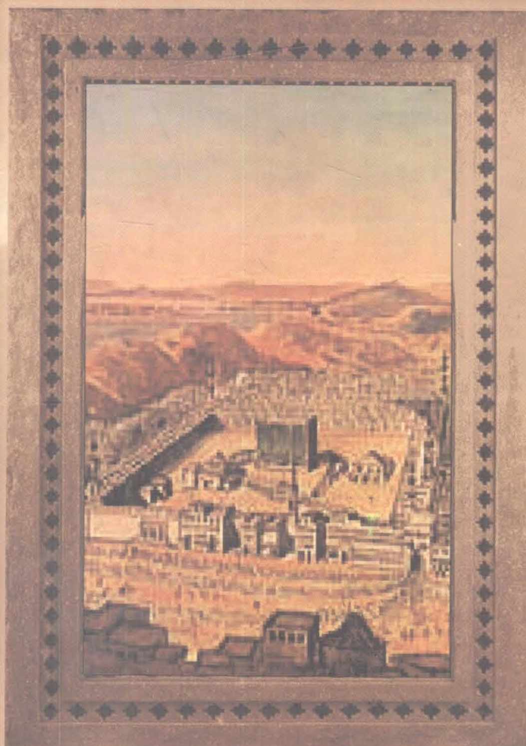
عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تمدن

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی



عہدِ نبوی ﷺ کا تمدن

مولانا پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

دار النوادر
۴۰ اُردو بازار، لاہور۔فون: ۰۳۰۰۔۸۸۹۸۶۳۹

بیاد
پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ
۱۹۴۷ - ۲۰۰۹

۱۴۳۲ ہجری ۲۰۱۱ء

نام کتاب : عہدِ نبوی ﷺ کا تمدن
مؤلف : مولانا پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
اہتمام : دار النوادر، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

انتساب

میرے عزیز فرزندوں

احمد مبین، احمد معین، احمد یمین

اور عزیز تر پوتوں

احمد مامون، احمد منیب، احمد زین

کے نام

- 83

فہرستِ مضامین

✪✪✪

الحمد لله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين
وعلىٰ اٰله واصحابه الطاهرين ومن تبعهم باحسان الىٰ يوم الدين

تقدیم

تہذیب وتمدن اور ثقافت کے معانی اور تعریفات کا معاملہ خاصا مشکل رہا ہے اور ان کے باہمی ارتباطات کا پیچیدہ تر۔ ان کی مختلف تعریفات ملتی ہیں اور ان کے باہمی روابط پر خاصے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض محض تنوعات ہیں۔ بہرحال ایک بنیادی فرق یہ پایا جاتا ہے کہ ان کے کچھ اصول ومبادی، احکام واقدار ہوتے ہیں جو ان کے دین ومعاشرت پر مبنی ہوتے ہیں۔ دوسرے تمدن و مدنیت کے کچھ مادی اور ظاہری اظہارات ہوتے ہیں اور ان کا وجود واظہار اصول واقدار کی بنا پر ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت ومدنیت کے خاص اصول واحکام اور مبادی واقدار ہیں جو دوسروں سے ممتاز ومنفرد ہیں۔ اس کی مدنیت کے جو ظواہر اور ٹھوس معاملات وامور وجود میں آئے وہ ان ہی بنیادی اقدار واصول کے عطایا ہیں اور وہ بھی دوسری تہذیبوں، تمدنوں اور ثقافتوں کے ظواہر سے جداگانہ اور ممتاز ہیں۔

اسلامی تہذیب وتمدن بالخصوص نبوی عہد کے تمدن کے دو بہت اہم پہلو ہیں: ایک آفاقی وعالمی پہلو ہے اور دوسرا مقامی اور علاقائی پہلو ہے۔ عہد نبوی کا تمدن اپنی بنیاد ونہاد میں عربی اسلامی تمدن ہے جس میں عربی مقامی روایات بھی موجود ہیں۔ ان خالص مقامی روایات وظواہر میں سے بھی بعض میں اسلامی آفاقیت موجود ہے اور وہ تمام اقدار واصول کی طرح تمام مسلمانوں اور مسلم علاقوں کے لیے لازمی اگر نہیں بنتی تو پسندیدہ ومسنون ضرور قرار پاتی ہے، خالص مقامی عربی رسوم میں آفاقیت نہیں ہے۔ سردست ہمارا مطمحِ نظر نہ تہذیب وتمدن اور ثقافت ومدنیت کے اصول ومبادی پر بحث کرنا ہے اور نہ ان کے باہمی ارتباط پر، اس موضوع پر خاصا وقیع ادب پہلے ہی تیار کیا جاچکا ہے۔ اسلامی آفاقی اور عربی مقامی پہلوؤں پر بھی زیادہ بحث مقصود نہیں ہے کہ وہ خود بخود مختلف ابواب ومباحث میں ابھر کر سامنے آتے جائیں گے۔ البتہ عہد نبوی کے تمدن پر ایک تمہیدی نظر ڈالنی ضرور ہے۔

عرب اسلامی تمدن کا مسئلہ

عربوں کی قبائلی زندگی اور ان کی سیاسی وسماجی ابتری کا ایک شاخسانہ یہ نکالا گیا کہ ان کو تمدن سے ہی عاری قرار دیا گیا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) جیسے عبقری سیرت نگار اور صاحبِ فکر کو تسامح ہوگیا۔ انہوں نے صرف لسانی اسباب وعوامل کی بنا پر عربوں اور قریشِ مکہ کے تمدن سے نابلد رہ جانے کا نظریہ پیش کیا۔ وہ متمدن اقوام کی قربت کی بنا پر یمن اور شام وعراق وغیرہ کے سرحدی علاقوں کے لوگوں کے متمدن ہونے کے قائل ہیں لیکن اندرونی مقامات کے عربوں کے تمدن کے نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ''......عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب وتمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسبابِ معاشرت سے تعلق ہے ان کے لیے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں۔'' مولانا مرحوم نے سکہ، درہم ودینار، چراغ، کوزہ، لوٹے (ابریق)، طشت، پیالہ (کأس)، کرتہ (قرطق)، پائجامہ (سروال) کی مثالیں دینے کے بعد مزید لکھا ہے کہ ''جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیے کہاں سے لفظ آتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس کے ممالک کی تہذیب وتمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لیے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے اسی اصلی حالت پر رہ گئے۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے تک عیش ونعمت کے سامان بہت کم تھے''۔ اور اس بیان کی تائید کے لیے بعض چیزوں کا ذکر کیا ہے جیسے گھروں میں بیت الخلاء نہ تھے، رفعِ حاجت کے لیے مستورات تک باہر جایا کرتی تھیں، آٹا چھاننے کے لیے چھلنیاں نہ تھیں، گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، حشرات الارض کی حرمت نہ تھی۔ مولانا مرحوم کے اس نقطۂ نظر یا نظریۂ تمدن کی تردید ان ہی صحیح احادیث وروایات سے ہوتی ہے اور دوسرے بیانات ونظریات سے بھی۔ اس نظریہ کی خامی یہ ہے کہ اس کا مدار صرف لسانی اثبات پر ہے یا چند اکا دکا روایات واحادیث پر۔ مجموعی روایات واحادیث کا تناظر سامنے ہوتا تو یہ نظریہ وجود ہی میں نہ آتا (سیرت النبی، ۱/۱۱۷-۱۱۸)۔ اس نظریہ کی تردید میں صرف چند نکات پیش کیے جاتے ہیں:

امام بخاری نے عورتوں کے براز کے لیے باہر جانے کے باب کے معاًبعد باب باندھا ہے:
باب التبرز فی البیوت جس میں حدیث: ۱۴۸ ہے۔ اس کی بحث میں حافظ ابن حجر نے بیان کیا ہے کہ گھروں میں بیوت الخلا بن گئے تھے، لہٰذا باہر جانے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی (فتح الباری، ۱/۳۲۶-۳۲۹)۔ چھلنیاں موجود تھیں (مناخل پر بحث کے لیے آٹا چھاننے کی بحث ملاحظہ ہو)، حدیث بخاری: ۴۷۹۸ میں حضرت ابوطلحہؓ کے گھر میں چراغ جلنے کی شہادت موجود ہے۔ حشرات الارض کی حرمت دربار نجاشی میں حضرت جعفر کے خطبہ میں مذکور ہے۔ باقی اگلے مباحث میں شواہد آتے ہیں۔

خود مولانا مرحوم نے ”مانسیو لیبان فرنساوی“ کا خیال تہذیب وتمدن پر بحث کے شروع میں لکھا ہے کہ اس نے ”اصولِ عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوجِ کمال تک پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصولِ ارتقاء کے رُو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعۃً اعلیٰ درجہ کی تہذیب وتمدن تک نہیں پہنچ سکتی“۔ مولانا نے اسے ”ایک قیاسی استدلال“ قرار دے کر مسترد کر دیا ہے، حالانکہ وہ محض قیاسی نہیں ہے۔ امامِ عمرانیات ابنِ خلدون جیسے صاحبانِ بصیرت نے عرب تہذیب وتمدن بالخصوص قبائلی دور کے تمدن پر بحث کر کے ان کے متمدن ہونے کا ذکر کیا ہے اگرچہ وہ اوجِ کمال پر نہیں پہونچا تھا اور ابھی ارتقاء کے مختلف مراحل میں تھا۔ اصل یہ ہے کہ ہر قوم، ملت اور ملک کا تمدن اس کے اپنے احوال وظروف اور اعتبارات سے ہوتا ہے، مستعارات کے حوالے سے نہیں۔

(سیرت النبی، ۱/۱۴۱ و مابعد؛ ابن خلدون، مقدمہ، المقدمة الخامسة فی اختلاف احوال العمران، مطبعہ مصطفیٰ محمد، مصر، غیر مورخہ، ۸۷-۹۱ و مابعد؛ بالخصوص عمران بدوی کے ابواب مختلفہ، ۱۲۰-۱۲۸ و مابعد اور رضاعت، زراعت وتجارت اور تمدن کے ابواب اواخر کتاب میں)

جن الفاظِ مستعار کی بنا پر مولانا موصوف نے عرب اسلامی نبوی تمدن کے فقدان کا نظریہ پیش کیا ہے ان کے بارے میں ان کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل رہ گئی کہ ان اشیاءِ معمول ومعمولی کی اصل عربی نہ تھی، عجمی تھی، عربوں میں مدتوں سکوں کا رواج نہیں رہا۔ وہ عہدِ عبدالملک اموی تک عجمی دراہم ودنانیر پر انحصار کرتے رہے اور جب اپنے سکے ڈھالے تو ان کے عجمی اسماء کو نہیں

بدلا کہ وہ اب عربی اسماء بن چکے تھے۔ اسی طرح سروال، سراج، ابریق، کوز، طست، قرطق وغیرہ کا معاملہ ہے۔ چھلنیاں بھی تھیں اور ان کے عربی نام بھی تھے مگر جس روایت کا حوالہ دیا ہے اس میں بھوسے کو ملا کر روٹی پکانے کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ گھروں میں چراغ بھی جلتے تھے اور مکہ مکرمہ اور بعض دوسرے مقامات پر گھروں میں بیوت الخلاء بھی تھے۔ لیکن یہ تو صرف چند امور کا معاملہ اور الفاظِ مستعربہ کا قضیہ ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جائے تو عربی زبان کی وسعت تو متاثر ہوگی ہی قرآن مجید میں ایسے الفاظ کا شمول اسے عجمی زبانوں کا ملغوبہ بنادے گا جب کہ اللہ تعالیٰ اسے عربی مبین قرار دیتا ہے۔ اسی بنا پر امام شافعیؒ جیسے صاحب بصیرت فقیہ نے اور متعدد ماہرین لُغت ولسانیات نے قرآن مجید میں الفاظ مستعربہ کا انکار کیا ہے۔ اصل عربی الفاظ واسماء کا معاملہ دیکھنا ہو تو ان چیزوں کے بارے میں دیکھنا چاہیئے جو عربی النسل اور عربی الاصل ہیں اور ان کی تعداد عجمی اور مستعرب الفاظ سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے اگلے مباحث اس نظریۂ تمدن کی تائید مسکت کریں گے۔ پھر تمدن کسی ایک دو قوم کی جاگیر ہے، نہ دین، وہ بقولِ ابن خلدون بہت سی قوموں اور ملتوں کا مجموعی عطیہ ہے جسے متحدہ انسانی کاوشوں اور صدیوں کے تجربات کا نچوڑ بھی کہا جاسکتا ہے۔ رہا لیکن دین کا معاملہ، تو وہ انسانی ضرورت ہے جس سے متمدن ترین اقوام بھی خالی نہیں، بسا اوقات انہوں نے نسبتاً کمتر متمدن لوگوں سے تہذیب وتمدن لیا ہے، پھر کیا وہ غیر متمدن کہلائے جاسکتے ہیں۔

متمدن ممالک اور اقوام کے پڑوس میں آباد ہونے کے سبب اگر جزیرہ نمائے عرب کے سرحدی علاقے مثلاً یمن، عمان، ہجر وغیرہ تمدن سے کسبِ فیض کر کے متمدن بن سکتے تھے تو متمدن ممالک سے مسلسل رابطہ کی بنا پر بھی یہ فیض مل سکتا تھا۔ اندرونِ عرب کے علاقے بالخصوص مکہ مکرمہ کے قریش اور مدینہ، خیبر وغیرہ کے عرب اور یہودی تاجروں کا مسلسل رابطہ ان متمدن ممالک سے تھا۔ شام، عراق، حبشہ اور ایران غیر ممالک میں اور یمن وغیرہ جزیرہ عرب میں ان کی تجارتی جولان گاہیں تھیں اور یہ سلسلہ کعبہ کی تعمیرِ ابراہیمی کے بعد ہی سے شروع ہوگیا تھا جو اجدادِ نبوی کے زمانے بالخصوص چوتھی- چھٹی صدیوں میں خاصا ترقی یافتہ بن چکا تھا۔ مرکزی علاقوں کے عربوں نے اس دوران عراق کے لخمیوں، شام کے غسانیوں اور رومیوں، ایران کے

ساسانیوں اور حبشہ کے باسیوں سے بہت سا تمدن سیکھا تھا۔ ان ملکوں کے واسطہ سے وہ مصر وغیرہ سے شمال میں اور ترکستان وخراسان وغیرہ سے مشرق میں اور یمن وغیرہ کے ذریعہ ہندوستان، لنکا اور چین جیسے جنوبی علاقوں سے بھی واسطہ رکھتے تھے اور ان سے کسبِ تمدن کرتے تھے۔ تجارتی تعلقاتِ دوطرفگی کا دوسرا زاویہ یہ تھا کہ متمدن ممالک کے رومی/شامی، عراقی/ایرانی، حبشی/افریقی اور یمنی، ہندی وغیرہ تاجرانِ بین الملکی ان کے علاقوں میں پہونچتے تھے، خاص کر اسواق العرب میں برابر حصہ لیتے تھے اور اپنے سامانِ تجارت کے ساتھ سازِ تمدن بھی لے جاتے تھے۔ اس تمدنی لین دین نے اندرون عرب کے علاقوں اور ان کے باسیوں خاص کر قریشِ مکہ کو بہت سے تمدن سے آراستہ کردیا تھا۔ جس کا ثبوت سامانِ عیش ونعمت کے علاوہ فکر سے بھی ملتا ہے۔

افکار واعمال کے تمدنی لین دین کی تاریخ خاصی پیچیدہ اور مشکل ہے اور ابھی اس پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے لیکن خزاعی سردار عمرو بن لحی نے عرب دینِ ابراہیمی میں جو بدعات و خرافات کی قلم لگائی تھی اس کو شام ہی سے درآمد کیا تھا۔ ان میں فکری اور دینی افکار واعمال کے علاوہ تمدنی سامان بھی تھا۔ تجارت کے ذریعہ شامی/نبطی تاجر وہ سامانِ عیش مکہ، مدینہ لاتے تھے اور اس میں کھانے کی چیزوں کے علاوہ لباس اور زیب وزینت کے اسباب بھی شامل ہوتے تھے۔ داری تاجروں نے مسجدِ نبوی کو خوشبو سے معطر کرنے اور روشنی قنادیل سے منور کرنے کا تمدنی جلوہ شام ہی سے درآمد کیا تھا۔ یہ چند مثالیں ہیں ورنہ ایسے غیر ملکی تمدنی اثرات وآثار کا ایک ذخیرہ عرب تمدن میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

دینِ حنیفی کا تمدنی عطیہ

عرب جاہلی اور نبوی اسلامی سماجی تاریخ میں دینِ حنیفی کا حصہ وعطیہ ابھی تک پوری طرح آنکا نہیں گیا اگرچہ حضرت شاہؒ نے اپنی نگارشات میں اس کا بہت وقیع ذکر اور شاندار تجزیہ کرکے نئی جہات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد قدیم سیرت نگاروں اور محققوں کے علاوہ بعض جدید اہلِ علم اور محققین نے اس پر کافی کام کیا ہے لیکن اس کا ارتکاز زیادہ تر دینی اور مذہبی عطایا اور اثرات پر رہا ہے، تمدنی اور تہذیبی اثرات کا تجزیہ ابھی باقی ہے۔ یہ ایک الگ تحقیقی کام ہے جو

ان میں غسلِ طہارت، غسلِ جنابت، وضو، کلی کرنے، ناک میں پانی ڈالنے، غیر ضروری بالوں کو مونڈنے، داڑھی رکھنے اور مونچھیں کتروانے اور ان سب سے بڑھ کر ختنہ کروانے کے اعمال شامل تھے۔ ان سب کا ایک تمدنی پہلو بھی ہے جو ان کے دینی پہلو سے پوری طرح مربوط ہے۔ دین وتمدن کے رشتہ وربط کو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ افکار واعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ عرب جاہلی دینِ حنیفی کے پیرو ہونے کے باوجود مدتوں سے نبوی سرپرستی سے محرومی کے سبب یہودیت ونصرانیت کی دینی بالادستی سے مرعوب ومتاثر ہوگئے تھے اور ان کو افضل سمجھتے تھے۔ دینی اور تمدنی معاملات میں بھی وہ یہودِ مدینہ اور نصاریٰ نجران وغیرہ سے استفتا واستفسار کر کے ان کے افکار کو مانتے اور ان کے اعمال کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ سیرتِ نبوی کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن وحدیث سے بھی کہ رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات، افکار واعمال کی تردید سے عاجز رہ جاتے تو ان ہی یہودی علماء سے امداد لیتے تھے۔

حضرت شاہؒ نے شادی بیاہ، نکاح وطلاق، تکفین وتدفین، رسومِ ولادت وخواندگی وغیرہ متعدد تمدنی چیزوں کا ذکر کیا ہے جو عربوں میں دینِ حنیفی سے آئی تھیں اور عرب جاہلوں کے درمیان ان کی حیثیت سننِ مؤکدہ کی تھی کہ ان کی پابندی کو ضروری اور ان سے انحراف کو مکروہ گردانتے تھے۔ نکاح کی قسموں میں صرف مروج طریقِ نکاح یعنی اسلامی کو صحیح مانتے اور بقیہ کو غلط مانتے تھے اور نکاح کی ایک بدعت سیئہ کو، جو منحرفوں نے ایجاد کی تھی، نکاح المقت کہتے تھے۔ اس بابِ تمدن میں حضرت شاہؒ نے افکار کے تحت اعمال کی کارفرمائی کو بھی خوب اجاگر کیا ہے۔ مختصراً یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربِ جاہلی کے تمدن کی تعمیر وتشکیل سے زیادہ اس کے ارتقاء میں دینِ حنیفی نے حصہ لیا تھا اور جب اس پر نبوی تمدن کی تشکیل وتعمیر کا کارنامہ عہدِ نبوی میں انجام دیا گیا تو خالص اسلامی تمدن وجود میں آیا جو بعد میں دوسروں کے عطایا پا کر آفاقی بن گیا۔

کتاب کے ابواب ومباحث

اس مفصل تحقیقی مطالعہ کے متعدد ابواب ومباحث ہیں جیسے دوسری کتابوں اور مطالعات میں

اہلِ بصیرت وصاحبانِ بصارت کو دعوتِ نگارش وتحقیق دیتا ہے، سرِ دست چند ملاحظات پیش ہیں۔

حضرت شاہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک خاص فصل عربِ جاہلی کے اعمال واحوال اور ان کی اصلاحِ نبوی پر لکھی ہے۔ اس میں متعدد دینی احوال اور ان کی اصلاحاتِ اسلامی کے علاوہ تمدنی احوالِ عرب کا بھی ذکرِ خیر موجود ہے۔ حضرت شاہؒ نے ایک اصولی حقیقت اور کانٹے کی بات یہ لکھی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے تمام احوال واعمال کو تبدیل کر کے بالکل نئی عمارتِ دین وسماج نہیں تعمیر فرمائی تھی بلکہ جو چیزیں ٹھیک تھیں ان کو باقی رکھا، جن میں اصلاح کی ضرورت تھی ان کی خرابی دور کر کے اصلاح کر دی اور جن میں فساد پوری طرح سرایت کر گیا تھا ان کو یکسر ختم کر کے نئی چیزیں داخل فرما دیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ سلفیہ لاہور، غیر مورخہ، ۱/۱۲۴-۱۲۸؛ مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، باب اول، مفصل بحث کے لیے)

ان اصلاحاتِ نبوی یا خالص دینِ حنیفی کی تمدنی عطایا کا ایک اور بنیادی زاویہ یہ تھا کہ وہ سابق انبیائے کرام کی عطایا تھیں جو ان کے خالص اور صحیح پیرؤوں کے واسطے سے نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی عربوں تک پہونچی تھیں لہٰذا اس جاہلی عرب تمدن میں نبوی - اسلامی عطایا بھی شامل تھے اور گذشتہ اقوام کے تہذیبی عطیات بھی کارفرما تھے۔ ایک اور بنیادی اصولی چیز یہ تھی کہ اعمال، رسوم، رواج اور عملیات کے علاوہ ان میں افکار وخیالات بھی تھے جو تہذیب کی اساسی چیزیں ہوتی ہیں اور جو تمدن کو جنم دیتی اور پروان چڑھاتی ہیں۔ افکار کی کاریگری سے اعمال ورسوم کی تعمیر وارتقا کا مطالعہ بھی تہذیب وتمدن کا ایک زاویہ ہے اور نبوی تمدن میں ان کا باہمی تفاعل بڑے گل کھلاتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

طہارت اور پاکیزگی کے تصور وفکر نے دینِ حنیفی کے پیرؤوں اور دوسرے نبوی لوگوں کو گندگی سے بچنے اور نظافت وصفائی سے آراستہ ہونے کا تصور دیا تھا۔ رجس، گندگی، اثم، گناہ وغیرہ گندگی کے جس طرح تصورات وافکار تھے اسی طرح نظافت وصفائی کے مختلف افکار وجہات تھے۔ ان کی ایک عملی شکل خصالِ فطرت کے تصور وعمل کے تفاعل میں ملتی ہے۔ خصالِ فطرت کو سننِ انبیاء کہا جاتا ہے لہٰذا وہ تمام انبیاءِ کرام کے دین وملت اور اقوام کی مشترکہ میراث تھیں۔

ہوتے ہیں۔ ان کا ایک سرسری تعارف یہاں اس لیے کرایا جارہا ہے کہ قارئین وناقدین کو شروع ہی میں مندرجات کا ایک اندازہ ہو جائے۔ اولین بحث یا باب عہد نبوی کے کھانوں پر ہے اور وہ اپنی جگہ خود ایک پور اتحقیقی مطالعہ ہے۔ اس میں ایک تمہید کا باب بھی ہے جس میں کھانے کی بنیادی بشری ضرورت کو آیاتِ قرآنی کے حوالے سے مختلف زاویوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے: کھانے کے اوقات، اس کی متعدد اقسام، کھانا پکانے کی نوع بہ نوع ترکیبیں، نبوی دعوتیں، صحابہ کرام کی دعوتیں، خاص تقریبات کے کھانے اور ہدایائے طعام اس کے مختلف اور ذیلی مباحث ہیں اور وہ عہد نبوی کے کھانوں کا ایک تجزیہ اور سماجی رسوم کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں۔ اس کا لازمی تتمہ وتکملہ عہدِ نبوی کے مشروبات پر بنیادی مبحث ہے جو اپنی خاص ذیلی بحثوں پر مشتمل ہے۔

دوسرا بنیادی مبحث عہدِ نبوی کے ملبوسات پر ہے جس میں تمہیدی باب کے علاوہ تمام اہم اور ضروری لباسوں پر بحث کی گئی ہے اور ان کی اقسام واستعمال اور سماجی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ اسی بحث میں موزوں/خفین اور جوتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ وہ کتاب اللباس کا ایک لازمی حصہ تمام کتبِ حدیث میں قرار دیا گیا ہے اور تمدنی لحاظ سے بھی اسی کا جزو ہے۔

تیسرا باب آرائشِ بدن کے مختلف پہلوؤں سے تعرض کرتا ہے۔ ان میں آرائشِ گیسو کے علاوہ عطریات وخوشبو اور زیورات کے تمدنی وسماجی استعمال کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

چوتھا تحقیقی مبحث عہدِ نبوی کے مکانات اور اسبابِ زیست سے بحث کرتا ہے۔ اس کے متعدد ذیلی ابواب ہیں جیسے فرش وفروش، برتن اور ظروف، اور دوسرے اسبابِ زیست/عیش وغیرہ۔ ان میں چیزوں کے عربی ناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں مختلف سماجی تقریبات کا ذکر ہے جیسے شادی بیاہ، عقیقہ وختنہ وغیرہ۔ ان کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: تقریباتِ شادی اور تقریباتِ غم۔ ان میں مختلف کھیلوں اور سماجی زاویوں جیسے موسیقی وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔

ان ہی پر اس مطالعہ کو ختم کیا گیا ہے کہ ضخامت پہلے ہی زیادہ ہو چکی ہے، دوسرے ابوابِ تمدن کے لیے جگہ اور ہمت کہاں سے لاتا!

عہدِ نبوی کے تمدن سے متعلق خاکسار راقم نے پہلے ہی چند مطالعات پیش کیے ہیں۔ ان کا

سرسری حوالہ اس تقدیم میں مفید رہے گا۔ کیونکہ بعض مباحث کو اس مطالعہ میں نہ پا کر ناقدین کی جبینِ مبارک پر شکن پڑ سکتی ہے اور پڑے گی۔ اس تمدنی مطالعہ میں خاص خواتین کا سماجی کردار اس بنا پر زیرِ بحث نہیں آیا ہے کہ ایک خاص کتاب ''رسول اکرم ﷺ اور خواتین'' کے عنوان سے شائع کر چکا ہوں۔ اس میں رسولِ اکرم ﷺ سے اس جہانِ نسواں کے روابطِ شائستہ کا تجزیہ مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے کیا جا چکا ہے جن کا یہاں دہرانا کارِ عبث ہے۔

''مکی عہدِ نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء'' اگرچہ دینی، تشریعی اور احکامی منظر نامہ پیش کرتا ہے لیکن اس میں سماجی اور تمدنی پہلو از خود آ جاتے ہیں کیونکہ کوئی بھی تشریعی اور دینی ارتقا سماجی اور تمدنی پس منظر اور معاشرتی تقاضوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس میں خالص عبادات- نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج وغیرہ- کے علاوہ بہت سے معاشرتی اور تمدنی ابواب و مباحث بھی ہیں جیسے نکاح وطلاق، ولادت و رضاعت، عقیقہ وختنہ، تدفین وتکفین، تجارت و زراعت، صنعت وحرفت وغیرہ کے علاوہ خاص آدابِ معاشرت کے احکام وغیرہ۔ اگرچہ ان پر دینی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی گئی ہے لیکن ان کی تمدنی حیثیت واہمیت بھی اسی طرح مسلم ہے۔

گذشتہ مطالعات اور موجودہ مطالعہ کے بارے میں خاکسار راقم کسی طرح یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہیں۔ وہ ہماری ناقص فہم وبصیرت پر مبنی ہونے کے سبب نقص ونقصان سے بری نہیں، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ عہدِ نبوی کے تمدن کا ایک جلوۂ محبوبانہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ بھی خیال خاطر میں ہمیشہ جاگزیں رہا کہ اگر سب نہیں تو تھوڑا سا منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے یہ تو ہوگا کہ عہدِ نبوی کے تمدن کو بازیافت کرنے کی ایک سعی سامنے آئے گی۔ اور یقین یہ ہے کہ یہ سعی مشکور ہے۔ اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ اس مطالعہ میں صرف مستند ترین مواد استعمال کیا ہے جو صحیح ترین کتبِ حدیث- موطا، بخاری، مسلم، سننِ اربعہ وغیرہ- سے اخذ کیا گیا ہے۔ تعبیر کی سعی بھی ہماری ہے مگر اس کے بارے میں اللہ گواہ ہے کہ خلوص اور صحت کو اصول بنایا گیا ہے اور بددیانتی کو کسی طرح راہ نہیں دی گئی۔ البتہ ایک ''ضروری خرابی'' کا یہاں اعتراف کر لیا جائے کہ ابواب ومباحث کے ناگزیر تقاضوں کے سبب بعض معلومات کی تکرار بیان میں در آئی ہے اور اس کو جان بوجھ کر داخلِ دفتر کیا گیا تا کہ

خاکسار کا قلم عاجز زیرِ بحث نکات کو مستند و مدلل بنا سکے۔

مطالعہ کی تحریک و دورانیہ

یوں تو ہر کام اس کارخانۂ قدرت میں منشاء و اذنِ الٰہی سے ہوتا ہے تاہم اس عالمِ اسباب میں کچھ محرکات وعوامل بھی کارفرمائی کرتے ہیں اور وہ اسباب وعوامل بھی قدرتِ الٰہی کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اس مطالعہ کی تحریک کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ پچاس سال یعنی نصف صدی قبل استاذِ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مبارک مجلس میں یہ خاکسار راقم اپنے چند احباب کے ساتھ حاضر تھا۔ مولانائے محترم خاصے متفکر، بے چین اور مضطرب تھے۔ معلوم ہوا کہ اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ ندوی حسنیؒ کا انتظار کر رہے ہیں جو لاہور سے آنے والے ہیں اور آیا ہی چاہتے ہیں۔ مولانا کی بیتابی نے ہمارا بھی اشتیاق بڑھا دیا اور ان سے حضرتِ زائر کریم کا تفصیلی تعارف چاہا۔ مولانا محترم نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ وہ سیرتِ نبوی کے ایک خاص پہلو پر مدتوں سے کام کر رہے ہیں۔ مولانا سید محمد طلحہؒ کی آمد پر حضرت مولانا نے ان کا لپک کر استقبال کیا۔ تمہیدی و تقریبی باتوں کے بعد حضرت زائر سے ہم نے ان کے موعودہ مطالعہ کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ بڑی حسرت سے فرمایا کہ عہدِ نبوی کے تمدن پر تیس برسوں سے وہ مواد اکٹھا کر رہے ہیں۔ اب مواد تو اکٹھا ہو گیا ہے مگر اس کی ترتیب و تدوین کا مشکل مرحلہ درپیش ہے۔ غالباً وہ مواد یوں ہی رہ جائے گا اور عمر مستعار فنا ہو جائے گی۔ قضا و قدر کا فیصلہ کہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا علی میاںؒ کے بیان کے مطابق مولانا طلحہ مرحوم نے ان کو ''سارا مسودہ اور بیاضیں بھیج دیں''۔ مگر مولانا علی میاںؒ اپنی مصروفیات کے سبب نہ اس پر خود کام کر سکے اور نہ کسی اور سے کروا سکے۔ اب وہ سارا 'موادِ حسرت' نہ جانے کہاں ہے؟

(ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ، لکھنؤ ۱۹۷۵ء مقالہ ''مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم اے، ۲۲۹-۲۵۶: مصنف گرامی نے مولانا طلحہ حسنی کی آمد کا سنہ ۱۹۵۵ء دیا ہے اور ان کے علمی منصوبے کا عنوان ''عہد صحابہ کا تمدن'' بتایا ہے، خاکسار کو ''عہد نبوی کا تمدن'' یاد ہے جس پر اصرار نہیں)

تمدنِ نبوی کے بارے میں حضرت محرکؒ کے بیان کردہ خاکے نے مجھ طالب علم کے دل

میں ایک تمنا جگادی اور دعا بھی کہ میرے اللہ مجھے اس کام کی توفیق عطا ہو اور میری حیاتِ مستعار میں اس کی تکمیل واشاعت بھی ہو۔ بابِ قبول چوپٹ کھلا ہوا تھا، تمنا نے کوشش کا روپ دھارا اور سیرتِ نبوی پر مطالعہ ونگارش کی توفیق ملی تو اول روز سے مطلوبہ مواد جمع کرتا رہا۔ مدتیں لگ گئیں، کئی مطالعاتِ سیرت شائع ہو گئے اور یہ مطالعہ اذنِ الٰہی کا منتظر رہا۔ دس برس قبل اولین تسوید کے بعد یہ اطمینان بہر حال دل میں آیا کہ شاید مرضی الٰہی اور مرضی مولیٰ، ہیچمداں کو سرخرو کرنے کی ہے۔ غالباً یہ واحد نگارش ہے جس کی بار بار تسوید وتبییض ہوئی اور اب وہ اس لائق ہوا کہ اہل علم اور صاحبانِ ذوق کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس پیشکش میں وہ جذبہ دل خاکسار میں موجزن ہے جو اقبالؒ کے دل میں تھا کہ میری طلب وپیشکش پر نظر نہ ہو بلکہ اپنی عطا وبخشش کو مدنظر رکھیں۔

حرفِ تشکر وامتنان

اصل شکر واحسان شناسی تو اسی رب العزت کے لیے ہے جو کسی کو سرفراز کرتا ہے اور کسی کو بے وقار۔ اس کے آخری رسولِ اکرم ﷺ کے احسانات سے ساری انسانیت دبی ہوئی ہے کہ آپ ﷺ ہی نے ذاتِ الٰہی سے متعارف کروایا اور اس تک پہونچنے کی راہ سجھائی۔ یہ مطالعہ بھی اس تقربِ الٰہی کا ایک ذریعہ اور فیضانِ ربانی کا عطیہ ہے۔ اس مطالعہ کے اصل صورت گر محدثینِ کرام اور سیرت نگارانِ عظام ہیں۔ ان کے احسانات سے کوئی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ متاخر اہل قلم اور ان کے مطالعات نے بھی راہنمائی کی ہے اس لیے ان کا شکریہ بھی واجب ہے۔

حیاتِ مستعار کی کشتی اپنے ساحل سے لگنے کے قریب ہے تو یہ طمانیت اور فخر بھرا احساس نہاں خانۂ دل میں کروٹیں لے رہا ہے کہ قبلہ گاہی۔ مولوی انعام علیؒ۔ نے جس مقصدِ خیر کے تحت اس خادم کی تعلیم وتربیت فرمائی تھی اس کی کسی حد تک تکمیل وتعمیل ہو سکی۔ باباجانِ گرامی کی دلی آرزو تھی کہ خاکسار راقم کا قلم ناقص سیرت نگاری کی سعادت سے بہرہ ور ہو۔ وہ میری تالیفی وتحقیقی زندگی کے ہر مرحلے پر حوصلہ افزائی فرماتے رہے لیکن یہ بھی کہتے رہے کہ "ہم نے تم کو اس لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ آپ ﷺ پر کچھ لکھو"۔ الحمد للہ ان کی حیات مبارک میں ہی وہ آرزو پوری ہو گئی تھی اور ان کے بعد تو یہ آرزو اور تمنا میری سعادت وخوش بختی بن گئی۔ والدہ ماجدہ کی

دعاؤں، آنسوؤں اور بے چینیوں کو کیسے ہدیۂ تشکر پیش کروں جو میری ہر کامیابی پر مگن اور ہر تکلیف پر بے چین ہو جاتی تھیں۔ میرے اہل خانہ - اہلیہ اور فرزندوں اور دختروں - کے احسان وخدمت کا ہمیشہ معترف رہا ہوں اور ایک بار پھر برملا اعتراف کرتا ہوں۔ دوسرے عزیزوں میں ادارۂ علوم اسلامیہ کے رفقاء اور اس کے کتب خانے کے اراکین بالخصوص کبیر احمد خاں صاحب کے تعاون ومحبت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ شاگردوں میں عزیزم مولانا ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، مولانا مفتی مشتاق احمد تجاروی اور ان کے احبابِ باصفا کی خدمت واعانت کو ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ مولانا ڈاکٹر عرفان قاسمی کا بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے بہت محنت ومحبت سے کمپوزنگ کی اور بہت سی غلطیوں سے بچائے رکھا۔ اور ان سب سے زیادہ وہ قارئینِ کرام اور ناقدین ومبصرینِ عظام ہیں جو خاکسار کی نگارشات پڑھنے کے بعد اپنی دعاؤں سے نوازتے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ ان ہی جیسے اصحابِ خیر وصفا نے زندگی میں بھی اضافہ کیا ہے اور اس کے حسن وجمال میں بھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد نادیدہ کرم فرماؤں کی ہے۔ ان سب کا ذکر خیر کرنا تو مشکل ہے بلکہ اسماء گرامی بھی گنانے دشوار ہیں البتہ چند دعا گو قارئین کا ذکر ان کی توجہات عالیہ کی بنا پر واجب ہے۔ محترم مولوی عبدالعزیز (دبئی)، ڈاکٹر جمیل مانوی (سہارنپور)، مفتی سعید احمد خاں (اسلام آباد) کے علاوہ خاکسار کے عظیم ترین کرم فرماؤں میں جاوید طفیل، مدیر نقوش اور ان کے ہم وطن حافظ سجاد الٰہی اور ان سب کے سلاسلِ عزیزیہ، مانویہ، سعیدیہ، جاویدیہ اور سجادیہ اپنی عنایتوں، دعاؤں اور تبصروں سے برابر حوصلہ افزائی فرماتے اور ذرۂ بےمقدار کو باوقار بناتے رہتے ہیں۔ جن کرم فرماؤں کا ذکرِ عالی رہ گیا ہے وہ یقین رکھیں کہ ان کے نام دل پر لکھے ہوئے ہیں۔ اور ناشر محترم کا تشکر واحسان اس لیے بھی واجب ہے کہ وہ صدف سے موتی منظر عام پر لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے اور اس مطالعہ کو بھی اپنے محبوب خاتم الانبیا ﷺ کے تذکارِ جلیل کا ایک نمونہ اور راقم کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادے۔

الامین، ۶۴۔ احمد نگر، علی گڈھ۔ ۲۰۲۰۰۲
۲۷ رذوالحجہ ۱۴۲۹ھ / ۲۶ ردسمبر ۲۰۰۸ء

خادم علم وعلماء
محمد یٰسین مظہر صدیقی

مبحثِ اوّل

عہدِ نبوی کے کھانے

تمہیدِ طعام

کھانا ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی زندگی کی بقا اور اس کا ارتقاء دونوں کھانے پینے پر مبنی ہیں۔ اور یہ کوئی دنیاوی یا محض مادی حقیقت نہیں ہے۔ وہ فطرت کا قانون ہے جس کے پیچھے حکمتِ الٰہی کارفرما ہے۔ قرآن و حدیث میں بھی ان دونوں کا ذکر بہت وضاحت سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خالق و مخلوق کے درمیان ایک فرق - بہت بنیادی فرق - اسی کھانے کے حوالے سے قائم فرمایا ہے۔ وہ اپنی وحدانیت، قیومیت اور خلاقی و ربوبیت جیسی صفاتِ عالیہ کا ذکر یوں فرماتا ہے: ''تو کہہ، کیا اور کوئی پکڑوں اپنا مددگار اللہ کے سوا؟ جو بنانے والا ہے آسمان اور زمین کا، اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا: ''... قل أغیر اللّٰہ أتخذ ولیاً فاطر السمٰوٰت والارض وھو یُطعِمُ ولا یُطعَمُ ط ..'' (انعام:۱۴) پھر متعدد آیاتِ کریم میں اس ذاتِ بے ہمتا نے اپنی مخلوقات کو کھانا کھلانے اور رزق پہونچانے کا ذکر کیا ہے۔ اور ان تمام آیاتِ کریمہ میں کھانے - طعام - کے حوالے سے اپنی رزاقیت و ربوبیت اور انسان کی کھانے کی محتاجی کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف کھانے پینے کا محتاج نہیں بلکہ وہ مخلوقات خاص کر انسانوں کو کھانے کھلا کر اور مشروبات پلا کر ان کی زندگی کو باقی رکھتا اور پروان چڑھاتا ہے اور ہر انسان جب تک اپنے رزق کا کوٹہ پورا نہ کر لے وہ اس زندگی فانی سے اور اس دنیائے ضرورت سے نہیں جاتا جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے۔

(سورۂ قریش:۴: الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف: جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں''؛ سورۃ الشعراء:۷۹: والذی ھو یطعمنی ویسقین ۔ اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے''۔ سورۂ ابراہیم؛ نیز سورۂ ذاریات-۵۷ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے رزق کا طالب نہیں کہ وہ خود ان کو کھلاتا ہے؛ دیگر آیات کریمہ)

www.KitaboSunnat.com

مخلوقات بالخصوص انسان کی کھانے کی محتاجی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کو بھوک لگتی ہے اور یہ اس دنیائے مادی میں اس کے جسم و جان کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت ایک خاص وجہ سے پیدا کی گئی ہے۔ اور وہ وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی بنیادی احتیاج کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے رزق طلب کرے اور اسی پر بھروسہ کرے۔ کیونکہ اصل رازق اور سچا کھلانے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور دوسرے تمام ''رازقین'' صرف ذرائع و وسائل ہیں۔ وہ خود بھی اپنے رزق اور کھانے کے لیے اور دوسروں کو کھلانے کے لیے بھی اسی ''خیر الرازقین'' پر منحصر ہیں۔ ان کی رزاقی سمندر سے پیاسے کو قطرہ عطا کرنے کے مترادف ہے اور وہ بھی ان کی اپنی دین اور اپنی صفت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی اصلی رازق ہے جو اپنی تمام مخلوقات کو طرح طرح سے کھلاتا رہتا ہے۔

کھانا کھلانے والے رزاق نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ کھانا کھانا ایک بشری ضرورت ضرور ہے مگر وہ کسی طرح قابلِ مذمت یا لائقِ تعزیر یا موردِ تحقیر نہیں ہے کیونکہ انسانوں کے سرخیل بھی کھانا کھاتے تھے۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے کہ ذرا بھی روحانی پرواز شروع ہوئی اور وہ مادی ضرورتوں کی تکمیل کو لائقِ تعزیر سمجھنے لگتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ رسولوں کے جسم بنائے تو ان کی جسمانی ضرورت کی تکمیل کے لیے ان کو کھانا کھلایا: ''وما جعلنٰهم جسدا لا یاکلون الطعام وما کانوا خٰلدین.'' (سورۂ انبیاء:۸)۔

رسول کی بشریت اور اس کے تقاضے سے کھانا کھانے پر جب مشرکین و منکرین نے زبانِ طعن دراز کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمادی اور واضح کردیا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل جتنے رسول بھیجے گئے وہ بھی کھانا کھاتے تھے: وقالوا مالِ ھذا الرسول یاکل الطعام.. ''اور کہنے لگے یہ کیسا رسول ہے، کھاتا ہے کھانا..'' (الفرقان۔۷): وما ارسلنا قبلک من المرسلین الا انھم لیاکلون الطعام ... ''اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے رسول، سب کھاتے تھے کھانا..'' (الفرقان۔۲۰)؛ دوسری آیات کریمہ میں بعض انبیاء کرام کا نام بہ نام ذکر فرما کر ان کے کھانے کا حوالہ دیا ہے۔

آیاتِ قرآنی میں طعام کا ذکر

قرآن مجید میں مختلف سیاق وسباق میں انبیاء کرام، ان کی اقوام اور عام انسانوں کے کھانا کھانے کا ذکر ملتا ہے جو اپنے اطلاقات و جہات کے لحاظ سے بہت دلچسپ بھی ہے اور اس کی صحیح اسلامی قدر وقیمت بھی ہے۔ کھانے (طعام) کا ذکر مختلف سورتوں میں اٹھارہ آیاتِ کریمہ میں آیا ہے اور ان کی مختلف جہات ہیں:

(الف) ان میں ایک جہت سابق انبیائے کرام اور ان کی اقوام کے حوالے سے ہے:

۱۔ قومِ موسیٰ علیہ السلام نے انسانی فطرتِ تنوع کا اظہار کیا تھا کہ وہ صرف ایک قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ بظاہر ان کا اظہار نعمتِ الٰہی سے روگردانی پر مبنی ہے مگر وہ بہر حال انسانی فطرت کو اجاگر کرتا ہے جو کھانوں میں تنوع چاہتی ہے:

– و اذ قلتم یٰموسیٰ لن نصبر علیٰ طعام و احد... (بقرہ:۶۱)

''اور جب کہا تم نے اے موسیٰ! ہم نہ ٹھہریں گے ایک کھانے پر''

۲۔ بنو اسرائیل کے حوالے سے ایک اور حقیقت یہ بیان کی ہے کہ تمام کھانے حلال تھے:

کل الطعام کان حلا لبنی اسراء یل... (آل عمران۔۹۳)

''سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کو''۔

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام دونوں کھانے کھاتے تھے: کانا یاکلان الطعام (مائدہ:۷۵)۔ ان دونوں کا خاص ذکر کھانے کے حوالے سے یوں کیا کہ ان کے بارے میں الوہیت کا تصور پیدا کر لیا گیا تھا۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے ساتھی قیدیوں کے حوالے سے ایک اور سماجی رواج کا ذکر فرمایا ہے کہ عام حالات کے علاوہ غیر معمولی حالات میں جیسے قید و بند کی زندگی میں بھی کھانے کھانے اور کھلانے کا دستور پایا جاتا ہے: قال لا یاتیکما طعام ترزقانه... (یوسف۔۳۷) ''بولا، نہ آنے پائے گا تم کو کھانا، جو ہر روز تم کو ملتا ہے...''۔

۵۔ اصحابِ کہف جب اپنی گہری نیند سے مدتوں بعد بیدار ہوئے تو کھانے کے طلبگار ہوئے

اور اپنے ایک ساتھی کے ذریعہ پاک کھانا منگوایا: فلینظر ایها ازکیٰ طعاما فلیاتکم برزق منه ...(کہف-۱۹) ''پھر دیکھے کون سا ستھرا کھانا، سو لا وے تم کو اس میں سے کھانا''۔اس میں مزید کئی جہات ہیں جیسے بازار سے کھانا لانا، کھانوں میں پاکیزہ کھانے کا انتخاب کرنا وغیرہ۔

(ب) کھانا کھانے اور کھلانے کا دوسرا قرآنی سیاق وسباق خاص انبیاء کرام اور ان میں بھی سرخیلِ انبیاء کرام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے کھانا کھانے سے ہے کہ وہ بشریت کا تقاضا ہونے کے باوجود منصبِ رسالت کے خلاف ہے، نہ روحانیت کے منافی اور اس کا حوالہ سورۂ فرقان کی دو آیاتِ کریمہ: ۷، ۲۰ کے حوالے سے اوپر آچکا ہے۔

(ج) تیسرا سیاق کھانے سے متعلق احکام وقوانین - حلت وحرمت - سے ہے: اصل یہ بتائی ہے کہ تمام پاک کھانے (طیبات) حلال ہیں: مائدہ-۹۳، انعام-۱۴۴-۱۴۵ وغیرہ نیز ۱۳۸۔

۱۔ اہلِ کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کا کھانا اہلِ کتاب کے حلال ہے: وطعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم وطعامکم حل لهم۔(مائدہ-۵)۔

۲۔ روزہ رکھنے سے معذور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک مسکین کے کھانا کا فدیہ اس کے بدلے میں دیں: وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین (بقرہ-۱۸۴)۔اس طعام کا حوالہ خاصا معنی آفریں ہے۔

۳۔ عمرہ/حج کا احرام باندھنے والا جان بوجھ کر برّی شکار کرے تو بطور کفارہ مسکینوں کو کھانا کھلائے: ومن قتله منکم متعمدا... کفّٰرة طعام مسٰکین... (مائدہ-۹۵)۔

۴۔ مُحرِم (صاحبِ احرام) کے لیے البتہ بحری/سمندری شکار بھی جائز ہے اور اس کا کھانا بھی: احل لکم صیدالبحر وطعامه متاعا لکم وللسیارة...(مائدہ-۹۶)۔

۵۔ مشکل گھڑی میں مسکین ویتیم کو کھانا کھلانے کا حکم، سورۂ بلد-۱۴ میں ہے۔ یہ عام احوال کے علاوہ ہے۔

۶۔ مسکین وفقیر اور محتاج کو قربانی کے گوشت سے کھلانے کا حکم: حج-۲۸، ۳۶، وغیرہ جو خاص حال کا معاملہ ہے۔

(د) بعض آدابِ طعام کا ذکر بھی قرآنی آیاتِ کریمہ میں طعام کے حوالے سے لایا گیا ہے:

ا۔ مسلمانوں کو ادب سکھایا گیا کہ جب ان کو کاشانۂ نبوی میں کھانے کی دعوت دی جائے تو کھانا ختم کر کے اٹھ جائیں اور وہاں بیٹھ کر اہلِ بیت اور رسول اکرم ﷺ کو اپنی گفتگو سے ایذا نہ دیں۔ اسی کے ساتھ ان کو برتنوں کو گھورنے سے بھی منع فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ۔ (احزاب-۵۳)۔

۲۔ کھانا کھانے کے حوالے سے بعض اور آدابِ طعام کا بھی ذکر دوسری آیاتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے، جیسے آباء واجداد، رشتہ داروں اور دوستوں وغیرہ کے ہاں کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے: سورۂ نور-۶۱۔ یہ کھانا کھانے اور کھلانے کی ایک سماجی روایت کی تصدیق بھی ہے اور صلۂ رحمی کی ایک نشانی بھی۔ اس میں فطرت انسانی کی رعایت بھی ہے۔ اس ادب واصول کا بہت عمدہ اور محبت آگیں اظہار عہدِ نبوی کی دعوتوں اور باہمی زیارتوں کے دوران ضیافتوں میں نظر آتا ہے۔

-ساتھ ساتھ مل کر کھانا کھانے اور الگ الگ بیٹھ کر کھانا کھانے کی اجازت دی گئی ہے:

نور-۶۱ ...أن تاكلوا جميعا أو اشتاتا.

-ماتحتوں، مسکینوں اور گھر والوں کو اوسط کھانا کھلانے کا حکم وادب۔ مائدہ:۸۹ میں ہے۔

(س) ایک اور سیاق یہ ہے کہ مشرکوں میں بخیل، مال کے بھوکے اور کم ظرف لوگ مسکین وغریب کو نہ تو خود کھانا کھلاتے ہیں اور نہ دوسروں کو کھلانے دیتے ہیں۔ یہ عرب جاہلی سماج کے بعض رذائل پر قرآنی نقد کا سیاق ہے:... ولا يحض على طعام المسكين. حاقه: ۳۴، ولا يحض على طعام المسكين. ماعون-۳؛ ولا تحضون على طعام المسكين. فجر:۱۸۔ نیز سورۂ مدثر:۴۴؛ مکروہ سماجی انحراف پر نقد کے لیے اس کو بار بار لایا گیا ہے۔

-حضرات خضر وموسیٰ علیہما السلام کو ایک گاؤں والوں نے طلب پر بھی کھانا نہیں کھلایا تھا: سورۂ کہف-۷۷۔ اس میں یہ ادب بھی شامل ہے کہ ضرورت کے وقت کھانا طلب کیا جا سکتا ہے

اور طالب کو کھلانا ضروری ہے۔

(ص) فضائلِ اخلاق کا سیاق رذائل کے بالمقابل ہے جس میں اہلِ ایمان کی صفتِ رزاقی / اطعام کی تعریف کی گئی ہے یا ان کو کھانا کھلانے کا حکم وادب دیا گیا ہے:

- صاحبانِ ایمان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ کھانے کی ضرورت ومحبت کے باوجود مسکین ویتیم اور قیدی کو اپنا کھانا کھلا دیتے ہیں۔ وہ صرف ان ضرورت مندوں کو کھلاتے ہی نہیں بلکہ ان کو کھلا کر خود بھوکے رہ جاتے ہیں: ویطعمون الطعام علیٰ حبه مسکینا ویتیما واسیرا. الدہر/ الانسان: ۸ نیز حشر-۹: ...ویوثرون علیٰ أنفسهم ولو کان بهم خصاصة...۔

- رضائے الٰہی کی طلب میں دوسروں کو کھانا کھلانے کی روایت وصفت: دہر-۹: انما نطعمکم لوجه الله لانرید منکم جزاء ولا شکورا۔ کھانے کھلانے کی سماجی قدر وروایت میں دینی جہت شامل کر کے خالص ایک مادی چیز کو دینی عمل بنا دیا جو اجر وثواب کا مستحق بناتا ہے۔ یہ اسلامی شریعت ودین کا عجیب وغریب زاویہ ہے۔ ایک حدیث شریف میں اسی کو دنیا سے دین بنانے کا عمل کہا گیا ہے۔ انسان اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کھاتا ہے مگر اللہ کے نام سے شروع کرتا ہے اور اس کے شکر وحمد پر ختم کرتا ہے تو یہ خالص دنیاوی کام بھی باعثِ اجر وثواب اور دینی عمل بن جاتا ہے۔

(ط) اگرچہ قریش اور جاہلی عربوں کے کھانے کی بعض روایات اور سماجی اقدار کا معاملہ قوانینِ حلت وحرمت میں آتا ہے تاہم ان کا ایک الگ سیاقِ قرآنی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مطابق عرب جاہلی بعض کھانوں کو اپنی طرف سے حرام کرتے تھے اور بعض کو حلال۔ بعض کھانوں کو مردوں کے لیے حلال بتاتے تھے اور عورتوں کے لیے حرام اور بعض میں دونوں کا مشترکہ حق بتاتے تھے۔ ایسے تمام احکام وآداب کا ذکر متعدد آیات میں ملتا ہے اور اس میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی خودساختہ حلت وحرمت کی اجازت نہیں دی تھی۔ سورۂ انعام: ۱۳۸ وغیرہ۔ یہ تشریعِ جاہلی تھی اور اس کی تردید کر کے صحیح اسلامی حلت وحرمت بتائی گئی۔ اس پر بحث مفصل ”مکی عہدِ نبوی میں اسلامی احکام کے ارتقاء“ میں متعلقہ باب میں ملے گی۔

(ع) اللہ تعالیٰ کی حکمت آمیز ربوبیت وحاکمیت اور قدرت واعجاز کا ایک سیاق بھی

کھانے کے ذکر میں ملتا ہے: انسان کو اس کا کھانا فراہم کرنا قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی ہے: فلینظر الانسان إلیٰ طعامه۔ عبس: ۲۴۔ آگے خاصی تفصیل ہے اور دوسری جگہوں پر بھی کہ کس طرح قدرتِ الٰہی دانہ سے غلہ پیدا کر کے انسان کو کھلاتی ہے۔

۔بعض بڑی چیزیں مدت دراز میں تباہ کردی گئی تھیں مگر کھانا اور مشروب جیسے نازک آبگینے قدرتِ الٰہی سے محفوظ رہے اور سڑ گل کر خاک نہ ہوئے: فانظر الیٰ طعامک وشرابک لم یتسنه. بقرہ: ۲۵۹۔ یہ معجزاتی اصول وحکمتِ الٰہی کا بیان ہے کہ حفاظت وتباہی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی جہات ہیں۔

(ف) اعمالِ صالحہ کے بدلے میں جنت کے انعامات میں سے ایک عمدہ رزق اور شاندار کھانوں کا حوالہ بھی ملتا ہے جیسے سورۂ محمد - ۱۵ وغیرہ۔ حضرات آدم وحوا علیہما السلام کے قصصِ قرآنی میں ان کے جنتی کھانوں کا بھی ذکر ملتا ہے: اعراف: ۱۹ وغیرہ۔

- یا دوزخ کے کھانوں کا ذکر و وعید ہے کہ وہ نافرمانی کا کھانا ہے جیسے دخان - ۴۴ وغیرہ۔

جنت وجہنم میں بھی انسانوں کے کھانے کا معاملہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ مخلوق ہونے کے سبب وہ کھانے کے محتاج یا حریص رہتے ہیں حتی کہ آخرت یا اخروی زندگی میں بھی ان کی مخلوقیت کی یہ صفت باقی رہے گی۔

قرآنی آیاتِ کریمہ میں کھانے کے یہی تمام سیاقات نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد دوسرے ہیں، اور ان کا تعدد بڑھ سکتا ہے۔ مراد ومطلوب استقصاء واحاطہ نہیں ہے بلکہ یہ بتانا اور واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآنِ مجید میں کھانا ایک فطری نعمت اور انسانی ضرورت ہی نہیں بتایا گیا ہے بلکہ اس کو انسانی زندگی کے قیام ونمو کی اساس بھی قرار دیا گیا ہے۔ عام انسانوں کے علاوہ چیدہ بندگانِ الٰہی کا کھانا بھی اسے قرار دیا گیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو کہ وہ مادی شے ہونے کے باوجود ایک نعمتِ الٰہی ہے اور اس سے بہرہ مندی دوسری نعمت ہے۔ قرآن مجید نے رسولوں اور نبیوں کے کھانا کھانے کی حقیقتِ عامہ بیان کر کے دو بنیادی ہدف حاصل کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ انسانی جسم اور بشری بدن رکھنے کے سبب کھانے کے محتاج تھے اور کھانا اسی لیے کھاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کھانا کھانا ان کی پیغمبرانہ شان اور رسولی عظمت کے ذرا بھی خلاف نہیں تھا، بلکہ وہی

ان کی بشری عظمت کو بڑھاتا تھا۔ اس میں تقشف اور غیر ضروری تقویٰ کی تردید کے علاوہ یہ بھی حقیقت بیان کی ہے کہ انسان کی روحانیت کھانے سے کم نہیں ہوتی بلکہ اس سے اور بڑھتی ہے بشرطیکہ وہ آدابِ تقویٰ کے مطابق اور احکامِ شریعت کے موافق ہو۔ اصل شے یہی شرط ہے جو دنیا کو بھی دین بناتی ہے اور دین کو دنیا بھی بنا دیتی ہے۔

طعام (کھانے) اور کھانا کھانے (اکل) اور رزق وغیرہ کے تمام سیاقوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کھانا کھانے کا تصور وعمل انسانی زندگی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہتا ہے خواہ اس دنیائے دنی میں آنے سے پہلے جنت میں رہائشِ آدم کا مرحلہ رہا ہو یا اس دنیا میں کاروبارِ زندگی کا معاملہ ہو یا اس دنیا سے جانے کے بعد جنت ودوزخ میں اپنے اپنے اعمال کے مطابق اچھے برے کھانے کا معاملہ ہو۔ یہ پیٹ کا تسلسل ہے اور اس سے کھانے کا تسلسل وابستہ ہے۔ اس میں اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی موجود وکارفرما ہے کہ کھانے کا تاریخی تسلسل زمان ومکان کی قیود وابعاد کے پرے ہے۔ بلکہ وہ تو جنت سے شروع ہوتا ہے اور جنت پر ہی تمام ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔ لہٰذا عہدِ نبوی میں کھانا ایک بدیہی حقیقت تھی اور اس کے کھانے انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا کا ایک مظہر تھے۔

حدیث وسنت میں ذکرِ طعام

آیاتِ الٰہی کے تلاوت کیے جانے والے مظاہر یعنی قرآن مجید میں جس طرح ذکرِ طعام پایا جاتا ہے اسی طرح تلاوت نہ کی جانے والی آیات/احادیث میں بھی ان کا ذکرِ خیر ملتا ہے کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی کا دوسرا مظہر ہے۔ حدیث وسنت شارح وترجمان ہونے کے سبب ذکرِ طعام اور بیانِ اکل ونَقل کو اور زیادہ وسیع جہات دیتی ہیں۔ ایک شارحِ فن کا یہ تبصرہ خاصا حقیقت آگیں ہے کہ حدیث وسنت دراصل ایک تاریخی آئینہ ہے جس میں تہذیب وتمدنِ انسانی کی صورت واضح تر ہو جاتی ہے۔ ان کا دینی اور تشریعی پہلو ہی ان کا اطلاقی پہلو بھی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے اقوال واعمال اور تقاریر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے آثار وافعال اس اطلاقی پہلو یا عملی صورت کو واضح طور سے سامنے لاتے ہیں، کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کا اسوہ اور

نمونہ تمام انسانوں کے لیے لائقِ تقلید و پیروی ہے اور اس عظیم ترین اسوہ و نمونہ کے سب سے بڑے حاملینِ کرام اور شارحینِ عظام آپ ﷺ کے صحابہ کرام تھے۔ احادیث و آثار میں عہدِ نبوی کے کھانوں پر اور ان کے متعلق دوسرے دینی احکام و تہذیبی آداب پر ضخیم دفاتر لکھے جاسکتے ہیں اور لکھے بھی گئے ہیں۔ احادیث کے مجموعوں میں ''کتاب الاطعمہ'' کے ابواب ان ہی کی تو تفصیل فراہم کرتے ہیں۔ اگر کتبِ حدیث وسنت کے کھانوں کے دفاتر جمع کر لیے جائیں تو کئی جلدوں میں سما سکیں گے۔ ان کی ضخامت سے زیادہ ان کی تمدنی بازیافت کا معاملہ اہم ہے کہ وہ پوری سیرتِ طیبہ ہی کو نہیں، اس خیر القرون کے پورے عہد اور ان کے طبقات و افراد کی صورت گری کرتا ہے اور سامنے لاتا ہے۔ اصلاً تمدنِ اسلامی کا یہ بابِ طعام ان ہی احادیث وسنن اور کتب الاطعمہ پر مبنی ہے اور وہی بنیادی ماخذ ہے مگر اسی کے ساتھ تاریخی اور سیرتی روایات واخبار کو بھی شامل و شریک کیا گیا ہے کہ وہ بھی ناگزیر مواد ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو سیرت و تاریخ کے اخبار و آثار حدیث وسنت ہی کے دوسرے مظاہر یا رخ ہیں۔ اس تمہیدی باب میں صرف چند اصولی مباحثِ طعام کو مختصر طور سے پیش کیا جارہا ہے کہ اصل بیانیہ تو بعد میں آ ہی رہا ہے۔

احادیث وسنن کی نوعیت

اصلاً احادیث وسنن اور تاریخی۔سیرتی روایات کی نوعیت تو ایک ہی ہے جو اجزاء کی جامع ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان احادیثِ طعام اور سننِ اکل وشرب کا ان کے جامع تاریخی و اسلامی تناظر میں مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ ہمارے بیشتر اہلِ علم وفن کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ وہ ایک دو یا ایک قسم کی روایات واحادیث کی بنا پر پوری زندگی کی بازیافت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے جزوی نتائج واستنباطات کو کلی حقیقت اور مجموعی صورت بتاتے ہیں، حالانکہ وہ تصویر کا بھی صرف ایک رخ ہوتا ہے یا سکہ کا ایک زاویہ۔ یہ ان کی فہم و مطالعہ اور پیشکش کا نقص ہوتا ہے۔

مثلاً ہمارے اہلِ علم کا ایک طبقہ بالخصوص رہبانیت اور تصوف کا مارا ہوا طبقہ فقر و فاقہ کی زندگی کو تقویٰ کا بلند ترین اور آدرش مظاہرہ مانتا ہے اور اپنے اس خیالِ خام کے مطابق قلتِ طعام یا خراب و معمولی کھانے کو ضروری قرار دیتا ہے اور اس کی سند رسولِ اکرم ﷺ کے

اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کے عملِ تقویٰ سے لاتا ہے۔ بلاشبہ احادیث وسنن اور آثار واخبار میں ایسی بہت سی روایات مل جاتی ہیں جو فقر وفاقہ کی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کے بھوک سے پریشان ہونے، فاقے کے سبب پیٹ پر پتھر باندھنے، کھانے کی طلب میں گھر سے بیتابانہ نکلنے، گھریا کاشانہ ہای نبوی میں مدتوں چولھا نہ جلنے، کھانا نہ ملنے کی صورت میں روزہ رکھ لینے وغیرہ کی احادیث ملتی ہیں اور وہ بلاشبہ صحیح بھی ہیں، اسی طرح متعدد صحابہ کرام کے قلتِ طعام کے واقعات بھی صحیح ہیں۔ لیکن عہد نبوی کا یہی سارا تمدنِ طعام تھا اور نہ ہی معاشرۂ خیر کی یہی کل حقیقت ہے۔ وہ صرف ایک جزوی بات ہے۔ حضرت ابوالہیثمؓ کے کھانے کی دعوت میں ایک تبصرہ یہ ملتا ہے کہ لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے زندگی بھر سیر ہو کر جو کی روٹی نہیں کھائی: عجبا للناس یقولون: توفی رسول اللہ ﷺ ولم یشبع من خبز الشعیر... قول الهيثم بن نصر الاسلمی، (بلاذری، ۱/۵۳۵)۔ شارحینِ حدیث اور سیرت نگاروں کے علاوہ محققین ومورخین نے واضح کیا ہے کہ ایسی روایات خاص احوال سے متعلق ہیں یا ان کا تعلق غیر معمولی حالات - جنگ وحرب - سے ہے، یا ابتدائی زندگی کی فقیرانہ یا غریبانہ زندگی سے یا رسولِ اکرم ﷺ اور بھوکے صحابہ کرام کی غربت اور اس سے زیادہ ایثار وقربانی اور دوسروں کو کھلا کر خود مگن رہنے کی زندگی بلکہ جبلت سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فقر وفاقہ غربت کے سبب نہ تھا بلکہ ایثار وقربانی کی بنا پر تھا۔

دوسری طرف ان احادیث وسنن اور اخبار وبیانات کا طومار ہے جو عمدہ کھانوں اور بہترین روایاتِ اکل وشرب کا ذکر کرتا ہے۔ ان سب کا مجموعہ فقر - خود اختیاری فقر - کی روایات کو ماند کرتا ہے لیکن فقر وفاقہ کی تعریف وتحسین کے رسیا اور اسی کو اصل اسلامی آدرش سمجھنے کے مصر افراد اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کتاب کے مختلف مباحث میں ان دونوں کا ذکر الگ الگ ملے گا بلکہ اس دوسرے پہلو کا خاص تفصیل سے ذکر ہوگا کیونکہ اس میں طعام اور آدابِ طعام اور سماجی اقدار وروایات کا جلوہ نظر آتا ہے اور اصل اسلامی تعلیم کا عکس ملتا ہے۔

نہ صرف یہی تمدنی پہلو ہی ان کی تفصیل کا متقاضی نہیں ہے۔ دینی اور تشریعی اسباب ووجوہ بھی ہیں۔ آیاتِ قرآنی سے واضح ہو چکا ہے، اور احادیث وسنن سے مزید وضاحت ہوگی،

کہ عمدہ کھانے نعمتِ الٰہی ہیں، وجہِ عقاب وسزا نہیں، لائقِ تعزیر تو ان کا غلط استعمال ہے جس طرح فقر و فاقہ اور قلت وخبثِ طعام میں توہینِ شریعت ہے اور وہ مردود ہے۔ اسلامی شریعت اسے پسند کرتی ہے، نہ دین اجازت دیتا ہے اور نہ تقویٰ کا یہ تقاضا ہے کہ انسان بالخصوص مسلمان اچھے کھانوں سے خود کو محروم کرلے محض جسم وجان کو پژمردہ کرنے کے لیے، صرف انسانی جان کو باقی رکھنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی اور نشو ونما کی کوشش وسعی بھی اسی طرح لازمی ہے۔ انسان-مسلم-قوی مطلوب ہے جو ایمان وایقان کے ساتھ جسم وبدن کی قوت کو بھی محیط ہے اور یہ قوت طعام سے آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مسلم کی تشریعی اور دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے علاوہ اپنے اہل وعیال اور ماتحتوں کو اپنی مالی اور معاشی بساط کے مطابق طعام فراہم کرے۔ اسی لیے قرآن میں ''اوسط طعام'' کی شرط ذمہ داروں پر عائد کی گئی ہے۔ نان ونفقہ کی ایک شرط سماجی اور مالی حیثیت کے مطابق بھی ہونا ہے۔ اور رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اپنی مالی اور سماجی حیثیت کے مطابق اس کا بندوبست کرتے تھے۔ پھر عمدہ کھانا نعمتِ الٰہی ہے جس کا انکار یا جس سے فرار غیر دینی طرزِ عمل ہے۔ حیاتِ طیبہ میں اور صحابہ کرام کے سوانح میں بھی اس نعمت سے لطف اندوزی کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ یہ بھی تقویٰ وطہارت کا ایک باب ہے بلکہ اصل اسلامی تقویٰ اور دینی طہارت یہی ہے۔

سیاق وسباقِ احادیثِ وسنن کا باب آیاتِ کریمہ سے وسیع تر ہے کہ وہ اصل اصول کے علاوہ اس کی فروع و جزئیات کو بھی حاوی ہے۔ قرآنی سیاقات سے ان کا تقابل کیا جائے تو حقیقت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ انبیائے کرام اور سابقہ امتوں کے کھانوں اور ان کی قسموں اور ان کے آداب کا ذکر بہت سی احادیث میں ملتا ہے۔ قرآن کریم کی جن آیاتِ کریمہ میں ان کا ذکر ہے ان کی تفصیل وتشریح روایاتِ احادیث وتفسیر میں اور زیادہ آتی ہے۔ رسولوں اور ان کے سردار حضرت محمد رسولِ اکرم ﷺ کے کھانوں اور ان کے متعلقات کا ذکر تو سب سے زیادہ آتا ہے۔ ان ہی کا مفصل اور نوع بہ نوع بیان وتشریح تو اس باب وکتاب کا اصل مبحث ہے کہ وہی بنیادی مآخذ ہیں۔ کھانے سے متعلق احکامِ حلت وحرمت کا بیانِ حدیث وسنت وسیع ترین بھی ہے اور حکمت ومصلحت کا عکاس بھی۔ ان احکام کی ایک تاریخی وتوفیقی اہمیت بھی ہے۔ اول

یہ کہ بہت سے اصولی احکام مکی عہد میں عطا فرما دیے گئے تھے کیونکہ احکامِ قرآنی بھی اصلاً مکی ہیں اور ان کے اصول وقواعد بھی، جن پر مکی عہدِ نبوی میں اسلامی احکام کے ارتقا پر ابواب میں بحث ہے۔ اسی طرح مدنی دور میں ان اصولی احکام اور بنیادی قواعد پر ارتقاء زمانی ومکانی کا معاملہ حدیث وسنت سے ثابت ہوتا ہے۔ آدابِ طعام اور سماجی روایات اور تہذیبی اقدار کا معاملہ تو ایک لحاظ سے حدیث وسنت ہی کی روایات پر منحصر ہے۔ کتاب الاطعمہ کے مختلف ابواب میں کھانے سے قبل ہاتھ دھونے، کلی (وضو) کرنے، بسملہ پڑھنے، داہنے ہاتھ سے کھانے، برتن سے اپنے سامنے سے کھانا لینے اور پورے پیالے، برتن اور ظرف میں ادھر ادھر سے لینے یا دوسروں کے سامنے سے نہ اچکنے، ٹیک لگا کر نہ کھانے، بندگی اور تواضع سے کھانا کھانے، دوسروں کا خیال رکھنے، کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لینے اور برتن صاف کر لینے، کھانے کے بعد کلی کرنے اور ہاتھ صاف کرنے کے علاوہ بہت سے آداب وسنن کا ذکر اور تفصیل تو صرف حدیث وسنت ہی سے ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی روایاتِ اکل وشرب، دعوت وصدقہ وہدیہ، ولیمہ وعقیقہ، مرگ وغمی اور دوسرے خاص مواقع کی روایاتِ طعام کا ذکر بھی اسی ذخیرۂ حدیث وسنت میں سب سے زیادہ ہے۔ سیرتی وتاریخی روایات میں بھی ان کا کافی ذکراذکار پایا جاتا ہے مگر وہ سوانح کی تنگنائے کی حد بندی کے سبب غیر مفصل رہ جاتا ہے۔

(کتبِ حدیث میں ان آدابِ طعام کا ذکر ہے بالخصوص ابوداؤد میں ان کے متعدد ابواب ہیں جیسے باب مایقول الرجل اذا طعم، باب غسل الیدین من الطعام، باب غسل الیدین عند الطعام/ غسل الیدین قبل الطعام، باب التسمیة علی الطعام، باب ماجاء فی الدعاء لرب الطعام وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تعداد دسیوں، بیسیوں سے متجاوز ہے۔)

روایاتِ حدیث وسیرت کی مکی نوعیت

عہدِ اسلامی۔ نبوی کو تاریخی لحاظ سے دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے کہ وہ ایک صحیح اور ثابت حقیقت ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل کی چالیس سالہ زندگی (۵۷۱-۶۱۰ء) عرب جاہلی کا دورِ مستقل ہے۔ بعد بعثت مکی دور کا تیرہ سالہ زمانہ (۶۱۰-۶۲۲ء) اس اسلامی۔ جاہلی عہد کا مشترکہ تفاعل ہے۔ اصحابِ ایمان اور ان کے سرخیل کا یہ اسلامی زمانہ ہے تو قریش اور عرب

کے بیشتر علاقوں اور لوگوں کا جاہلی دور ہے۔ حیاتِ نبوی کا دہ سالہ مدنی دور (۶۲۲-۶۳۲ء) کا غالب حصہ اسی مشترکہ تہذیب کا سرمایہ ہے، البتہ آخری دو تین برسوں کا زمانہ اسلامی غلبہ اور دین کی فتح ونصرت کا زمانہ ہے جب پورا عرب اسلامی پرچم تلے آ گیا تھا۔ اور حیاتِ نبوی کے آخر آخر تک تو پورا جزیرہ نمائے عرب اسلامی اور محمدی بن چکا تھا اور عرب تمدن بھی۔

مکی عہد سے متعلق حدیث وسنت ہوں یا سیرت وتاریخ کی روایات، وہ عام تہذیبی وتمدنی معلومات بھی کم رکھتی ہیں۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ راویوں نے اس دورِ مبارک میں صرف اشاعتِ دین اور اس کی راہ میں رکاوٹوں پر توجہ مرکوز رکھی۔ اول مدنی دور سے ان کی توجہ کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور زمانی تسلسل کے ساتھ معلومات وروایات کی جمع وتدوین زیادہ ہوتی گئی اور یہ سلسلۂ جمع وتدوین بعد نبوت کے ادوار بالخصوص خلافتِ اسلامی کی اولین صدی میں بنیادی رہا اور بعد کی صدیوں میں اسی بنیاد پر اضافہ وجمع کا کام مکمل ہوا۔ لہٰذا مکی دور سے متعلق کھانوں کی روایات ذرا کم ملتی ہیں۔

بایں ہمہ روایات واخبارِ طعام مکی عہد میں بھی ملتے ہیں اور مدنی عہد میں ان کا تسلسل وارتقا ہوتا نظر آتا ہے۔ تہذیبی، سماجی اور تمدنی معاملات وامور میں تبدیلی مدتوں بلکہ صدیوں کے بعد ہوتی ہے کہ ان کا تعلق انسان کی زندگی سے ہوتا ہے۔ اور انسان بدلتا ہے اور نہ اس کی سماجی اور تمدنی ضروریات، پھر کھانا جیسی بنیادی ضرورت اور عمل کیونکر اتنی جلد بدل سکتا ہے؟ عرب کھانوں اور ان کے آداب وروایات کا ایک مقامی پہلو ہے تو دوسرا اور زیادہ جامع پہلو ان کا آفاقی اور ملک گیر ہے۔ دینی وتشریعی اور اخلاقی آداب وروایات کا تسلسل بھی نظر آتا ہے۔ البتہ بعض مقامی اضافوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا مگر وہ فروعی ہیں۔

مکی عہدِ نبوی میں اسلامی احکام کے ارتقا نے جہاں دینی وتشریعی تسلسل کو واضح اور ثابت کیا ہے وہاں مختلف سماجی اور تمدنی معاملات کے تسلسل کو بھی بیان کیا ہے، صرف ارتقائی صورت ممکن نظر آتی ہے، جو اپنی اصل اور بنیادی جڑ سے الگ یا سراسر بے ربط نہیں ہو سکتی تھی اور درحقیقت کسی بھی تمدن میں وہ رہی بھی نہیں۔ مثلاً کھانوں کی اقسام مکہ اور مدینہ دونوں جگہ یکساں تھیں، البتہ بعض مقامی چیزوں کا فرق تھا، وہ اصلِ طعام کا فرق نہ تھا۔ کھانوں کی پسندیدہ اقسام،

ان کے پکانے کی ترکیبیں، ان کے اجزاء وارکان اور ناپسندیدہ چیزیں دونوں جگہ ایک تھیں۔ ان کے اسلامی احکام وآداب بھی شروع سے ایک جیسے تھے، ان میں مکی رہائش اور مدنی سکونت نے فرق نہیں کیا تھا۔ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اور دوسرے عرب مکہ میں آداب وسننِ طعام سے بے بہرہ تھے۔ یا ان کے کھانے کے اوقات۔ صبح، دوپہر/ چاشت اور رات (فطور، غداء، عشاء)۔ بدل گئے تھے۔ یا مکہ میں وہ گوشت کھاتے تھے اور مدینہ میں سبزی خور بن گئے تھے کہ وہاں سبزیاں زیادہ اگتی اور ملتی تھیں، یا مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کے کاشانے میں دعوتیں ہوتی تھیں اور مکہ مکرمہ میں ان دعوتوں کا کسی قسم کا توڑا تھا، یا صحابہ کرام کے گھروں میں رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے احباب ورفقاء اور اعزہ واقربا کی دعوتوں کا سلسلہ نہ تھا، یا خاص مواقع کے کھانے ۔عقیقہ، ولیمہ، شادی، موت وغیرہ۔ کے کھانے دونوں مقامات میں سے کسی جگہ نہ تھے، یا صحابہ کرام اور دوسرے عرب کھانوں کے ہدایا کسی جگہ بھیجتے تھے اور کسی جگہ ان کے ہاتھ خست سے بندھ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب دونوں مقامات کا معاملہ تھا، اس لیے کہ وہ سب عرب روایات تھیں اور اس لیے بھی کہ وہ اسلامی احکام تھے، اور وہ دونوں آفاقی تھے۔ اس باب میں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ معلومات کی کمی یا فقدان حقائق کے عدمِ وجود و ثبوت کو مستلزم نہیں۔ یہ ان آفاقی، مسلسل اور زمان ومکان سے بالا تمدنی اور اسلامی آداب واحکام اور اخبار وروایات ہیں جو انسانی وجود اور اس کی تہذیب وتمدن سے بدن و جان کی طرح وابستہ ہیں اور کہیں بھی جدا نہیں ہوتے۔ اس لیے اگلے تمام مباحث وابوابِ طعام اسلامی۔عرب اور آفاقی وانسانی ہیں کہ اسی صورت میں وہ اسوہ بنتے ہیں۔

کھانے کے واقعات وروایات

مدنی آیاتِ کریمہ میں بہت سے انبیاءِ کرام اور ان کی امتوں کے ذکرِ خیر سے روایت وبیان کا ایک اصول نکلا۔ وہ یہ کہ تنزیل کے زمان ومکان کے لحاظ سے وہ آیاتِ کریمہ مدنی ضروری ہیں لیکن ان میں مذکور واقعات گذشتہ ادوار کے ہیں۔ اسی طرح فقہائے کرام اور اصولی علماء نے بہت سے احکامِ تنزیل کے بارے میں واضح کیا کہ ان کا حکم مکی ہے اگرچہ تنزیل مدنی ہے۔ اس

میں ایک اور اصول واقعہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ تنزیلِ مدنی میں مذکور حکم و واقعہ مکی دور سے بھی قبل کا ہے بلکہ وہ اسلامی حکم کا تاریخی تسلسل ہے جو عہد قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ ان دونوں اصول وضوابط کا احادیث وسنن پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے اور روایات و واقعات پر بھی کہ وہ اپنے وقوع کے اعتبار سے مکی ہیں یا اس سے بھی پہلے کے دور کے۔ تمدنی اور سماجی واقعات کے علاوہ دینی احکام کا تسلسل زمانی بھی اسی وجہ سے نظر آتا ہے۔ اس اسلامی تسلسلِ حکم و واقعہ پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے حالانکہ اسلامی شریعت وتمدن دونوں کے لحاظ سے وہ اصلاً انبیاء کرام کی دین ہیں۔

طعام اور اس کی سماجی روایات اور عصری واقعات کے باب میں بھی بہت سی روایات واخبار مکی ہیں لیکن اسی کے ساتھ بہت سے واقعات ومعاملات کا بیان وحوالہ مدنی ہونے کے باوجود مکی یا سابقہ دور کا ہوتا ہے۔ جیسے رسول اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ بنت وہب زہری کے کھانے کے بارے میں ایک بہت دلچسپ روایت آتی ہے: فرطِ رعب سے ایک شخص رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے لرزنے لگا جب آپ ﷺ صاحبِ ریاست وصاحبِ رعب وداب بن چکے تھے تو آپ ﷺ نے اسے تسلی دینے کی خاطر فرمایا کہ مجھ سے نہ گھبراؤ، میں تو ایک ایسی عورت کا فرزند ہوں جو سوکھا گوشت کھاتی تھی: "کانت تاکل القدید..."۔ اس مدنی روایت وواقعہ میں مکی دور کا واقعہ اپنی عصریت بتاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ظاہر کرتا ہے کہ سوکھا گوشت کھانا ایک سماجی روایت بھی تھی اور متواضع کھانا بھی تھا۔ اور وہ صرف مکی اور مدنی دور کا واقعہ نہیں تھا بلکہ سابقہ انسانی ادوارِ تمدن کا تھا اور آج بھی وہ انسان کی تمدنی زندگی کی ایک مسلمہ روایت وحقیقت ہے۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمة، باب القدید؛ بخاری وغیرہ متعدد کتب میں قدید کے کھانے کے کئی واقعات مدنی زندگی سے متعلق ملتے ہیں)

اپنے کاشانۂ مبارک سے قبل اپنے دو چچاؤں- جناب زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی اور ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی۔ کے گھروں میں کفالت کے زمانے میں آپ ﷺ کے کھانے کا عمومی ذکر آتا ہے، جس طرح جدامجد عبدالمطلب ہاشمی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ آپ ﷺ کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ چچی حضرت فاطمہ بنت اسد ہاشمیؓ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ساتھ کھاتے تو

برکات کا ظہور ہوتا تھا، یہ ذاتِ رسالتمآب ﷺ کے قبلِ بعثت برکات کا معاملہ تھا اور محبت کرنے والی چچی کا حالِ محبت وشفقت یہ تھا کہ اپنے بچوں- طالب وعقیل فرزندانِ ابی طالب وغیرہ- کو کھانا آپ ﷺ کے ساتھ کھلاتی تھیں، پہلے نہ دیتی تھیں اور بسا اوقات ان کو محروم کر کے اپنے فخرِ آدم اور درِ یتیم بھتیجے کے لیے رکھ چھوڑتی تھیں کہ محبت کا یہ جذبہ و معاملہ بھی آفاقی ہے۔

(ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۱۸۱-۱۸۲؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، بیروت ۱۹۷۱ء، ۱/۲۴۰-۲۴۲، عبدالمطلب کے متعلق اور ابو طالب کی تخصیص کے لیے: "وکان یخصہ بالطعام... اذا اکل معھم رسول اللہ ﷺ شبعوا"؛ نیز عبدالمطلب ہاشمی ملاحظہ ہو)

اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد بالخصوص حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدیؓ سے شادی کے بعد گھریلو طعام کا حوالہ بھی ملتا ہے اگرچہ کم کم ملتا ہے۔ لیکن ذاتی کھانے سے زیادہ بعض دوسری سماجی روایات اور اقدارِ نبوی کا بڑا دلچسپ حوالہ آتا ہے۔ اہم تر نکتہ یہ ہے کہ ایسی روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سند کے حوالے سے آتی ہیں جب موصوفہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں اور ان روایات کا زمانۂ بیان مدنی بھی ہے۔ ان کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ ذبیحہ کرتے یا گوشت کا انتظام فرماتے تو اس کے پارچے حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے گھروں میں بھجواتے اور یہ سلسلۂ کرم وجود ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ مکی- مدنی دور کا فرق مٹا کرتا حیاتِ طیبہ مسلسل رہا۔ کھانے کے ہدایا بھیجنے اور وصول فرمانے کے دوسرے واقعات بھی ہیں۔

(بخاری، مناقب الانصار، باب تزویج النبی ﷺ خدیجۃ وفضلھا کی تین احادیث میں اس کا ذکر ہے، موخر الذکر حضرت جبریل علیہ السلام کے سلامِ الٰہی پہونچانے کے حوالہ سے ہے اور اس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت خدیجہ رسول اکرم ﷺ کے لیے کھانا یا ادام یا مشروب لا رہی تھیں)

سماجی روایات و اقدارِ طعام کے تعلق سے بھی بکثرت روایات مکی دور میں ملتی ہیں جن کا تسلسل مدنی دور میں بڑھ جاتا ہے۔ عقیقہ کی دعوت کے ضمن میں خود رسولِ اکرم ﷺ کے عقیقہ پر جدامجد نے جو دعوتِ شیراز کی تھی وہ کافی مفصل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ رسولِ اکرم ﷺ کے اپنے بچوں/بچیوں کے عقیقہ کی دعوتوں کا ذکر روایاتِ سیرت میں ملتا ہے اور دوسرے عقیقوں کا بھی۔ اسی طرح نکاح/برات کے کھانے کا ذکر رسول اکرم ﷺ کے اپنے نکاحِ اول کے علاوہ والد ماجد جناب عبداللہ کے نکاح کے ضمن میں بھی آتا ہے۔ اور ولیمہ تو ایک سنتِ انبیاء تھی اور

بقول حضرت نجاشیؓ دعوتِ نکاح بھی سنت نبوی ہی تھی۔ باہمی زیارتوں کے دوران ضیافت عرب جاہلی سے زیادہ اسلامی - دینی روایت تھی جو عہدِ قدیم سے چلی آ رہی تھی۔ قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاص مہمانوں کی آمد پر بھنے ہوئے بچھڑے کے لذیذ کھانے کی پیشکش کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی دونوں رضاعی ماؤں - حضرت ثویبہؓ اور حضرت حلیمہؓ - کی زیاراتِ نبوی کے دوران ان کی ضیافت نبوی کا واقعہ مسلم ہے۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی چلتا تھا اور بعض کفارِ مکہ میں بھی شدید ترین دشمنوں کے دعوت کرنے کا ذکر روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔ سخت حالات میں دشمنوں کی طرف سے ضیافت کا ایک واقعہ تو طائف کے سفرِ کرب و بلا سے واپسی پر فرزندانِ ربیعہ - عتبہ وشیبہ - کی انگوروں سے ضیافت کا ہے اور دورانِ محاصرہ نیک نفسانِ قریش کھانا پہونچانے کا اہتمام کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اولین دعوت اسلامی میں اپنے عزیزانِ بنی عبد مناف کے پینتالیس مردوں کی گوشت روٹی سے ضیافت کی تھی۔ ایسی سماجی روایاتِ طعام کا فقدان نہیں ہے بس ان کا توڑا مکی عہد میں ضرور ہے مگر وہ ان کے تسلسلِ زمانی ومکانی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

✪✪✪

کھانوں کی اقسام

عہدِ نبوی کے کھانے ہوں یا کسی اور دور کے، بالعموم ان کو دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: دال اور سبزی پر مشتمل کھانے جو جدید اصطلاح میں سبزی/غلہ/ اناج خوری (Vegetarian) کہلاتے ہیں۔ اور دوسرے گوشت پر مشتمل کھانے جو گوشت خوری کی اصطلاح رکھتے ہیں، اگر چہ جدید اصطلاح میں اس کو غیر سبزی/ غیر اناج خوری (non-Vegetarian) کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح اصلاً سبزی خوروں کی ایجاد کردہ اور لحمیات کے مخالفین کی ہے کہ وہ بنیادی غذا سبزی /اناج کو بتاتے ہیں اور لحمیات کو اپنے خیالِ خام میں غیر ضروری کہتے ہیں یا اسے انسانی غذائی انحراف قرار دیتے ہیں، حالانکہ لحمیات پر مشتمل کھانے تمام تہذیبوں اور تمدنوں میں اصل تھے اور دینی کتابوں میں بھی ان کا بطور اصل غذا ذکر آیا ہے۔ پھر فطری ارتقاء کے لحاظ سے بھی سبزی اور اناج انسانی تمدن میں کافی ''تاخیر'' سے داخل ہوئے، کیونکہ ان کی کاشت کی فنی حیثیت انسان نے ارتقاء کے ایک خاص مرحلے کے بعد سیکھی تھی۔ خودرو پھل اور گوشت اس کی غذا میں شروع سے داخل ہوئے تھے اور اسی ترتیب سے۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب اللحم کی ایک روایت میں گوشت کو دنیا اور جنت دونوں کے باسیوں کے کھانے کا سردار کہا گیا ہے: ''سید طعام اھل الدنیا واھل الجنۃ اللحم''۔ اس پر ضعف بلکہ وضع کا الزام لگایا گیا۔ دوسری روایاتِ صحیحہ سے بہر حال گوشت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور کتبِ حدیث کے ابواب اللحم کی روایات اس کی تائید کرتی ہیں اور ان کا ذکر مختلف حوالوں سے آگے آتا ہے؛ نیز فتح الباری، ۹/ ۶۸۸ میں ہے: ''سید الادام فی الدنیا والآخرۃ اللحم''۔ اور اس کو مرفوع صحیح حدیث بتایا ہے، بحثِ حافظ؛ حدیثِ بخاری: ۳۳۶۴ وغیرہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی زوجہ محترمہ کے پاس کھانے میں صرف گوشت تھا اور پینے میں پانی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں میں برکت کی دعا دی تھی جس کے اثرات آج تک موجود ہیں: ''طعامنا اللحم وشرابنا الماء...'')

کھانے (طعام) کا عربی لفظ خوراک کے وسیع تر معانی میں آتا ہے جس میں تمام قسم کے کھانے آتے ہیں اگر چہ اردو زبان میں اس کا ترجمہ اور مفہوم کھانا کیا جاتا ہے جو غلط نہیں ہے کہ عام کھانا بھی خوراک کے معنی ومفہوم پر مشتمل ہے۔ طعام کی جمع اطعمۃ ہے لیکن اس کی جمع الجمع - اطعمات - میں گیہوں کا معنی واطلاق پایا جاتا ہے (مصباح اللغات)۔ یہ ایک دلچسپ تمدنی ارتقا، کا معاملہ ہے کہ گیہوں نے کس طرح کھانوں کو جمع کر کے اصل غذا کے معنی حاصل کر لیے۔ بہرحال یہ بعد کا عربی تمدن ہے جو گیہوں کی ہمہ جہت دخل اندازی کے بعد ارتقا پذیر ہوا تھا۔ قرآن و حدیث اور سیرت وتاریخ میں طعام اپنے وسیع ترین معانی ہی میں استعمال کیا گیا ہے، اور ان میں من وسلویٰ جیسی الٰہی نعمتیں شامل ہیں، پیاز ولہسن اور غلہ واناج جیسی کاشت کاری کی پیداواریں بھی ہیں اور لحمیات بھی ان میں شامل ہیں۔

(قرآن مجید، سورۂ بقرہ: ۶۱، ۱۸۴، ۲۶۴؛ آلِ عمران: ۹۳؛ مائدہ: ۵، ۷۵، ۹۵؛ انعام: ۱۴۵، ۱۴۸ وغیرہ، حدیث و سیرت اور تاریخ کے حوالے بعد کے مباحث میں بکثرت آتے ہیں؛ نیز کتاب الاطعمہ پر بحثِ شارحین)

(الف) لحمیات کا اصل اصول

قرآن مجید میں لحمیات کا اصلِ اصول بیان کیا گیا ہے جو مویشیوں کی چار قسم کے جوڑوں پر مشتمل ہے: سورۂ انعام-۱۴۳ کے مطابق یہ آٹھ جوڑے (ثمٰنیة ازواج) ہیں، جو بقول شیخ الہندؒ "آٹھ نر اور مادہ" ہیں:

۱۔ من الضأن اثنین : بھیڑ میں سے دو...... نر اور مادہ

۲۔ ومن المعز اثنین : اور بکری میں سے دو...... نر اور مادہ

۳۔ ومن الابل اثنین : اور اونٹ میں سے دو...... نر اور مادہ

۴۔ ومن البقر اثنین : اور گائے میں سے دو...... نر اور مادہ

(نیز سورۂ زمر-۶:... وأنزل لكم من الانعم ثمنية ازواج... میں بھی "ان آٹھ نر و مادہ" کے جوڑوں کے لیے نازل کرنے کا لفظ معنی خیز ہے)

شاہ عبدالقادرؒ نے "لدنے والے اونٹ اور بیل اور دنبے بکری اور بھیڑ" موضح القرآن

میں لکھا ہے۔ اس کا مطلب لادو اور بے لادو چوپایے ہیں۔ اور یہی مویشی کھانے کے کام آتے ہیں اور جن کا کھانا ہمیشہ حلال رہا ہے۔ مترجمین اور مفسرین نے بالعموم حلال وحرام کرنے کی انسانی بدعت وانحراف کے حوالے سے اس پر بحث کی ہے۔ وہ تحریم وتحلیلِ قریش اور دوسرے عربوں نے اپنے دینِ حنفی سے انحراف کے سبب کی ہے جس پر بحث کہیں اور ہو چکی ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرنی ہے کہ پالتو یا گھریلو مویشیوں میں ان چار اقسام کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی اپنی جنس کے لحاظ سے الگ ہیں۔

(شاہ ولی اللہؒ نے اپنے ترجمہ فتح الرحمٰن میں ''انـــزل'' کا ترجمہ ''فرو فرستاد'' اور ان کے فرزند گرامی نے ''اتارے'' کیا ہے مگر اس کی معنوی اہمیت پر کچھ نہیں لکھا البتہ حضرت شاہؒ نے اپنے حاشیہ میں سورۂ انعام میں بیان کردہ جوڑوں کا ہی ذکر کیا ہے: ''یعنی نر و مادہ شتر و گاؤ و گوسفند و بز'')

دوسرے حلال جانوروں کا ذکر اس میں نہیں ہے اور وہ بالعموم حدیث وسنت کی روایات میں ملتا ہے۔ اس حلت کا ذکر دو طرح سے ملتا ہے: ایک اصولی طور سے، دوسرے ان کی اقسام کا نام بنام ذکر کر کے۔ اصول کے لحاظ سے تمام درندے جیسے شیر، ریچھ وغیرہ جانوروں میں اور بڑے نکیلے پنجے والے جیسے گدھ، چیل وغیرہ پرندوں میں حرام قرار دیے گئے ہیں۔ حلال جانوروں اور پرندوں میں کافی اقسام شامل ہیں جیسے ہرن، خرگوش، گوہ، نیل گائے، بارہ سنگھا، چیتل اور حمار وحشی وغیرہ اور پرندوں میں کبوتر، فاختہ، مینا وغیرہ اور ان ہی میں مرغ بھی شامل ہے۔

(کتبِ حدیث میں حلال وحرام جانوروں و پرندوں پر ابواب ملاحظہ ہوں۔ مفصل بحث کے لیے: مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء)

مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ''گوشت کے اقسام میں سے آپؐ نے دنبہ، مرغ، بٹیر (حباریٰ)، اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے...'' (سیرۃ النبی، ۲/۲۰۴)۔ یہ گوشت کی اقسام کا ایک عمومی بیان ہے۔

لحمیات: بکری کا گوشت

گوشت ۔لحم۔ پر مشتمل کھانوں میں خاصی رنگارنگی اور تنوع ملتا ہے کیونکہ ان کی اقسام متعدد تھیں۔ ان میں بکری کا گوشت ۔لحم شاۃ۔ ایک طرح سے بنیادی لحمی غذا معلوم ہوتا ہے کہ وہ

ہر ایک کی دسترس میں تھا۔ اس کی قیمت سب سے کم ہوتی تھی اور وہ سب سے زیادہ دستیاب بھی تھا کیونکہ مویشی پالن میں وہی مقبول ترین جنس تھی۔ بکریوں کے چھوٹے بڑے ریوڑ یا اکادکا راسیں ہر گھر یا خاندان اور طبقہ میں پالی جاتی تھیں اور بکثرت پالی جاتی تھیں۔ حدیث و تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم لحمیات میں دو بنیادی طرح کی بکریاں شامل ہوتی تھیں: ایک وہ جو صرف گھروں میں رکھی جاتی تھیں اور جن کی دیکھ بھال اور غذا اور چرائی وغیرہ کا انتظام گھروں میں کیا جاتا تھا۔ ان میں بھی دو طرح کی بکریاں تھیں: ایک دودھ کے لیے، دوسری لحمی غذا کے لیے۔ یہ دوسری قسم اپنی دیکھ ریکھ کے سبب خاص طور سے فربہ کی جاتی تھی۔ اس کو بعض احادیث و روایات میں ''بہیمۃ داجن'' بھی کہا گیا ہے اور دوسرے نام بھی ملتے ہیں۔ بالعموم یہ ریوڑوں کی شکل میں نہیں ہوتی تھیں اور صرف اکادکا راسیں ہوتی تھیں کہ گھریلو خوراک کے لیے ہی پالی جاتی تھیں۔ اس کا ذکر و حوالہ حضرت جابر بن عبداللہ خزرجیؓ کی غزوۂ خندق کے دوران دعوتِ نبوی کے ضمن میں آگے آتا ہے۔ (نیز مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، باب معاملات میں چرواہی وغیرہ)

دوسری قسم کی بکریاں چرائی کے لیے چراگاہوں کو بھیجی جاتی تھیں اور ان کے ہی دراصل چھوٹے بڑے ریوڑ ہوتے تھے اور وہ مویشی پالن میں اصل شاۃ/شیاہ ہوتی تھیں، ان کے حوالے سیرتِ نبوی میں اور حدیث میں بھی بہت ملتے ہیں۔ ان میں دودھاری بھی ہوتی تھیں اور گوشت کھانے کے لیے بھی جیسا کہ متعدد روایات و بیانات سے واضح ہوتا ہے۔ لحمیات والی بکریاں بالعموم شاۃ جمع شیاہ کہلاتی تھیں، لیکن ان کی قسموں کے لحاظ سے ان کے دوسرے نام بھی ملتے ہیں جیسے حدیث ابوداؤد: ۱۴۲ میں چار چار نام ہیں: سخلۃ (بکری کا بچہ)، بھمۃ (بکری کا بچہ)، شاۃ (بکری)، غنم (بکریاں جمع کا لفظ)۔ اس میں اہم ترین بات یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس سو بکریاں تھیں اور ان سے زیادہ تعداد ہوتے ہی ایک بکری ذبح کر دیتے تھے۔

اور ان کے گوشت کے حصوں کا ذکر بھی بہت دلچسپی کا موضوع ہے کیونکہ ان میں سے بعض کو پسندیدہ ترین قرار دیا گیا ہے۔ حدیث و سیرت میں ان پارچوں یا گوشت کے حصوں کا ذکر بھی بہت دلچسپی اور اہمیت کا باعث ہے کیونکہ وہ بسا اوقات تمدنی اور سماجی روایات اور ضیافت کی اقدار کو اجاگر کرتا ہے۔

روایاتِ حدیث میں بکری کے گوشت کے کھانے کے اتنے حوالے ملتے ہیں کہ اس پر ایک پورا مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ حوالے گھروں میں اس کا گوشت کھانے کے بارے میں بھی ملتے ہیں اور صحابہ کرام کی دعوتوں کے ضمن میں بھی۔ دورانِ سفر و غزوہ بکری خرید نے اور اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھانے کھلانے کے بھی بہت حوالے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے پس منظر ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ہجرت کے سفر کے دوران بکری کا گوشت ہی رفقاء کے ساتھ تناول فرمایا تھا اور جو کچھ بچ گیا تھا اسے سکھا کر دوسرے دن استعمال کیا (ابن سعد، ۴/۳۱۲)۔ ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عام اور معمول کا گوشت بکری کا ہی تھا: رسول اکرم ﷺ کے طعامِ مبارک کا بھی اور صحابہ کرام کے کھانے کا بھی۔ رسول اکرم ﷺ نے ولیمہ وغیرہ کی دعوت و تقریب برپا کرنے کے لیے بھی ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ بسا اوقات صرف گوشت ہی پورے کھانے کی جگہ کھالیا جاتا تھا جس کی متعدد روایات ملتی ہیں اور ذیل میں بعض کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سفرِ ہجرت نبوی کے لیے جو توشہ خاندانِ ابی بکرؓ نے تیار کیا تھا اس کے لیے ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت پکایا گیا تھا اور تھیلے میں رکھا گیا تھا (بلاذری، ۱/۲۶۰)۔ اسی سفرِ ہجرت کے دوران رسول اکرم ﷺ جب حضرت ام معبد کے گھر پہونچے تھے تو انھوں نے بھی ایک بکری ذبح کر کے آپ ﷺ اور آپ کے رفقاء حضرات ابوبکر و عامر بن فہیرہؓ کے علاوہ دلیلِ راہ عبداللہ بن اریقط کو کھلائی تھی اور ان کے پاس بہت گوشت بچ رہا تھا۔ (بلاذری، ۱/۲۶۲)

دعوتوں میں بکری کا گوشت

حضرت جابر بن عبداللہؓ کے ساتھ رسول اکرم ﷺ ایک انصاری عورت کے گھر گئے تو انھوں نے ایک بکری ذبح کر کے آپ ﷺ کی دعوت کی: ”... فذبحت له شاة فاكل“۔

(ترمذی، ابواب الطهارة، باب فی ترک الوضوء الخ۔ نیز مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابة الداعی الیٰ دعوة؛ الیٰ کراع الشاة؛ ابوداؤد، حدیث: ۳۳۳۲: لحم شاة؛ نیز دعوتوں پر فصل/ باب میں اور حوالے اور واقعات ملیں گے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اس لحمِ معمول کو متواتر بناتی ہے)

ازواج کے گھروں میں بکری کا گوشت

کبھی ہدیہ میں آتا تھا اور کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کی کسی باندی کے لیے بطور صدقہ

آ تا تھا۔ آپ ﷺ دونوں تناول فرماتے تھے۔ صدقہ باندی کے لیے ہوتا تھا مگر وہ آپ ﷺ کے لیے ہدیہ بن جاتا تھا: ’’...عن جويرية: ماعندنا طعام الا عظم من شاة اعطيته مولاتي من الصدقة، فقال: قرّبيه، فقد بلغت محلها‘‘۔

(مسلم، كتاب الزكاة، باب اباحة الهدية الخ حدیث:۱۶۹(۱۰۷۳)؛ نیز حضرت بریرہؓ کا واقعہ/ حدیثِ عائشہ)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک بار گھر میں موجود واحد چپاتی (رغیف) اپنی باندی سے ایک مسکین کو دلوادی اور اپنے افطار کے لیے کچھ نہ رکھا۔ شام کو کسی گھر سے بکری کے گوشت کا کھانا آ گیا۔ (موطا، کتاب الجامع، ماجاء من الطعام، ۳/ ۱۵۸)

- عید الاضحیٰ میں ایک بکری/ بکرے کی قربانی پورے گھر کی طرف سے کافی سمجھی جاتی تھی:

’’كان الرجل يضحي بالشاة عنه وعن اهل بيته فيا كلون ويطعمون... الخ.

(ترمذی، ابواب الاضاحی، باب ماجاء ان الشاة الواحدة تجزی عن اهل البيت؛ موطا، كتاب العقيقة، العمل في العقيقة، كان يعق عن ولده بشاة: شاة عن الذكور والاناث؛ بعض صحابہ کرام نے دو یا زیادہ کو تعق قرار دیا ہے)

- ولیمہ کے لیے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم آپ ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو دیا تھا: ’’اولم ولوبشاة‘‘۔

(ترمذی، ابواب النكاح، باب في الوليمة؛ بخاری، مسلم وغیرہ دیگر کتبِ حدیث کے کتاب النکاح کے باب الولیمہ کی روایات؛ نیز ولیمہ کی دعوتوں کی اگلی بحث)

دست کا گوشت

متعدد صحیح احادیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو گوشت کے پارچوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ دست تھی۔ مولانا شبلیؒ کا مختصر تبصرہ و بیان یہاں نقل کرنے کے لائق ہے: ’’دست کا گوشت بہت پسند تھا، شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہ آپ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا اس لیے جب کبھی مل جاتا تو آپ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے۔ دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لیے آپ اسی کی فرمائش کرتے۔ لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپ کو

یہ گوشت پسند تھا''۔ مولانا مرحوم نے روایات کا حوالہ نہیں دیا (۲۰۴/۲)۔ مسلم کی حدیث: ۳۲۸ میں خیاط صحابی کی دعوتِ ثرید کے حوالے سے یہ بیان ہے: ''... فتناول الذراع و کانت احب الشاۃ الیه ...''۔ دیگر کتبِ حدیث میں بھی یہی ہے: رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں گوشت میں سے دست کا حصہ پیش کیا گیا جو آپ کو پسند تھا اور آپ ﷺ نے اس میں کچھ حصہ تناول فرمایا: ''اُتی رسول اللہ ﷺ بلحم فرفع الیه الذراع، و کانت تعجبه، فنهس منها نهسة...''

(بخاری، کتاب التفسیر، سورہ بنی اسرائیل؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل اللحم، حدیث: ۳۷۸۰: ''احب العُراق الی رسول اللہ ﷺ عراق الشاۃ؛ حدیث: ۳۷۸۱: ''کان النبی ﷺ یعجبه الذراع؛ نیز دیگر روایات و احادیث)

بکری کے گوشت کے دیگر/ مختلف حصوں/ پارچوں کے کھانے کا ذکر متعدد احادیث میں ملتا ہے:

- رسول اکرم ﷺ نے چھری سے بکری کے شانے کو کاٹا اور دستِ مبارک سے اسے تناول فرمایا: ''...رای النبی ﷺ یحتزّ من کتف شاۃ فی یدہ، فدعی الی الصلاۃ، فالقاها و السکین التی یحتزبها...''۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب قطع اللحم بالسکین: فتح الباری، ۹/ ۶۷۷ ومابعد؛ مسلم، باب نسخ الوضوء ممامست النار، متعدد احادیث: ۹۱-۹۳؛ تمام کتب حدیث میں اس کے کھانے اور پھر تازہ وضو نہ کرنے کا ذکر بکثرت ملتا ہے)

- اسی پارچۂ گوشت کے کھانے کا ذکر اسی کتابِ بخاری میں دوسرے ابواب و احادیث میں ہے جیسے حدیث: ۵۴۰۴: ''تعرّق رسول اللہ ﷺ کتفا...'' (حدیث: ۵۴۰۵): ''انتشل النبی ﷺ عرقا من قدرٍ فاکل...'' (فتح الباری، ۹/ ۶۷۵-۶۷۷): اس میں ''تعرق العضد'' کا ذکر ہے اور حافظ موصوف کے مطابق کتف (شانے) اور مرفق (کہنی) کے درمیان کی بڑی ہڈی کو کہتے ہیں: ''و اما العضد فهو العظم الذی بین الکتف و المرفق...''۔

- مسلم کی مذکورہ بالا کتاب و باب میں رسول اکرم ﷺ کے بطن الشاۃ (بکری کے اندرون) کے کھانے کا ذکر ہے جو غلام/ مولائے نبوی حضرت ابورافع آپ ﷺ کے لیے پکاتے تھے: ''... کنت اشوی لرسول اللہ ﷺ بطن الشاۃ...'' (۹۴) بطن الشاۃ سے مراد بالعموم کلیجی لی گئی

ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے شارحین حدیث کا فرمان ہے مگر اس سے اصلاً اندرون کے تمام پارچے کلیجی (کبد)، دل (قلب)، گردے وغیرہ سب ہی مراد ہو سکتے ہیں اور ہیں۔

عُراق/ہڈی کا گوشت

متعدد احادیث میں رسولِ اکرم ﷺ کے پسندیدہ پارچۂ گوشت میں العُراق کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر دست کے پسندیدہ ترین پارچہ کے ضمن میں ایک حدیثِ ابو داؤد: ۳۷۸۰ میں آیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو عراق میں سب سے محبوب و پسندیدہ بکری کی ہڈی تھی۔ لغوی معنی تو یہ ہیں کہ عراق اس ہڈی کو کہتے ہیں جس کا گوشت کھا لیا گیا ہو (مصباح اللغات) مگر اس سے مراد ہڈی والا گوشت یا نلی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال عام پسندیدگی کی احادیث کے علاوہ بعض واقعات بھی اس کے کھانے کے ملتے ہیں اور کافی کثرت سے کتب حدیث میں نقل کیے گئے ہیں:

- حدیثِ ابو داؤد: ۳۷۷۹ میں حضرت صفوان بن امیہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ عراق/ہڈی سے گوشت چھڑا رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے اپنے منہ کے قریب کرلو اس سے زیادہ آسانی ہوگی۔

- بخاری، مسلم وغیرہ میں غالباً اسی کو عَرَق سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت سودہؓ کے واقعہ میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ ان کی آمد پر اپنے دستِ مبارک میں عرق لیے ہوئے تھے یعنی آپ ﷺ اس کا گوشت تناول فرما چکے تھے اور اب ہڈی ہاتھ میں رہ گئی تھی۔

(بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الاحزاب وغیرہ مختلف ابواب و کتب؛ مسلم، حدیث: (۲۱۷۰)، نیز دوسرے حوالے)

کُراع/پائے

عام طور سے کُراع کا ترجمہ کھری کیا جاتا ہے مگر اصلاً اس سے مراد بھیڑ بکری وغیرہ کے پائے ہوتے ہیں جیسا کہ حدیثِ موطا وغیرہ میں ہے کہ مومن عورتوں کو اپنی پڑوسنوں کو معمولی ہدیہ بھیجنے میں عار نہ آنی چاہئے خواہ وہ جلی ہوئی کھری کیوں نہ ہو۔ وہ بھی رسول اکرم ﷺ کو بہت پسند تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی تشریح کے مطابق وہ مسموط (کھال سمیت بھون کر) کھائے

جاتے تھے۔ احادیث میں رسول اکرم ﷺ کے پائے/کراع کھانے کا ذکر ملتا ہے خاص طور سے قربانی کے مویشیوں کے بارے میں۔ حدیثِ ابن ماجہ: ۳۳۱۳ کے مطابق حضرت عائشہؓ پندرہ پندرہ دنوں تک کراع/ پائے آپ ﷺ کے لیے بچا کر رکھتی تھیں اور آپ ﷺ ان کو تناول کرتے تھے۔ بہرحال اس حصۂ گوشت کو بالعموم غریبانہ گوشت کہا اور سمجھا جاتا تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خاتونِ مکرمہ نے اپنے بچوں کی فاقہ مستی کے بارے میں کہا تھا کہ ان کو ایک کھری بھوننے کا یارا نہیں: واللّٰہ ما ینضجون کُراعا...

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ؛ نیز بخاری، کتاب الھبۃ وفضلھا الخ؛ مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الصدقۃ الخ؛ ترمذی، الولاء والھبۃ، باب فی حث النبی ﷺ علی الھدیۃ میں اسی بات یا حدیث کو ''فرسن شاۃ'' کہا گیا ہے جس کے لغوی معنی کھری کے کنارہ کے ہیں؛ مصباح اللغات میں ہے: الفرسن: اونٹ کے کھر کا کنارہ (مؤنث) ج فَراسِن)

اونٹ کا گوشت

عرب میں اونٹ عربی تمدن کا سب سے بڑا نشان ہے اور وہ عربوں کا سب سے بڑا رفیق وصدیق بھی تھا۔ وہ مختلف دوسرے استعمالات کے علاوہ غذا کے لیے بھی پالا جاتا تھا۔ اس سے دو طرح کی غذائیں حاصل کی جاتی تھیں: دودھ اور گوشت۔ یہ دونوں عربوں کے پسندیدہ کھانے (طعام) تھے مگر بکری کے مقابلے میں نسبتاً مہنگے تھے کیونکہ وہ بکثرت پائے جانے کے باوجود کافی بڑا جانور ہوتا ہے اور اس بنا پر اس کی قیمت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ عام شرحِ تبادلہ میں دس بکریوں کے عوض ایک اونٹ سمجھا جاتا تھا اور بعض دوسری شروحِ تبادلہ بھی ملتی ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے اسے سات بکریوں کا معاوضہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک اونٹ میں قربانی کے سات حصے ہوتے ہیں۔ اس میں جسم اور قیمت دونوں کا اعتبار کیا گیا ہے، اگرچہ ردی، اوسط اور اعلیٰ اونٹوں کی قیمتوں میں بہت تفاوت تھا۔

(مسلم، کتاب الحج، باب الاشتراک فی الھدی؛ ... البدنۃ عن سبعۃ، البقرۃ عن سبعۃ... تشترک فیھا؛ نیز کتاب الاضاحی، باب جواز الذبح الخ، حدیث: ۲۱(۱۹۶۸)''... ثم عدل عشرا من الغنم بجزور...'')

اونٹوں کے نام بہت ہیں اور ایک لطیفہ یہ ہے کہ جس چیز یا عربی اسم کا معنی نہ معلوم ہو اس کا معنی اونٹ ہی ہوگا: ایک قول کے مطابق اونٹ کے پانچ سو سے اوپر نام ہیں، وہ اس کی مختلف عمروں۔ مدارِج عمر۔ پر زیادہ منحصر ہیں اور ان کے علاوہ علاقے، قسم اور قیمت و تربیت وغیرہ کے لحاظ سے ان کی اقسام اور ان کے اسماء ملتے ہیں۔ حدیث و سیرت و تاریخ میں کھانے کے لحاظ سے جو نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں: البدن و البدنہ، الجزور، بعیر، ابل وغیرہ۔

حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ بنو سلمہ کے ایک شخص نے ایک اونٹ ذبح کیا اور عصر کے بعد اسے پکایا اور رسول اکرم ﷺ نے بھی ان کی دعوت پر اس کا گوشت غروب آفتاب سے قبل تناول فرمایا (مسلم، حدیث: ۱۹۷ (۶۲۴ وغیرہ)۔ اسی سے متعلق حضرت رافع بن خدیجؓ کا بیان ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھتے تھے پھر ایک اونٹ (جزوراً) قربان کرتے اور اس کے دس حصے بناتے اور سورج غروب ہونے سے پہلے عمدہ پکا ہوا گوشت کھاتے تھے: ''فناکل لحما نضیجا قبل ان تغرب الشمس''۔

(بخاری، الاطعمة، باب الشركة فی الطعام الخ: باب قسمة الغنم میں ابل وغنم کے تبادلے کی شرح کے علاوہ ابل کا گوشت کھانے کا ذکر بھی ہے)

اونٹ کا گوشت کھانے اور کھلانے کا ذکر دورانِ حج وعمرہ ہدی کے ضمن میں زیادہ آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسے خود بھی تناول فرمایا اور اپنے اصحاب و ازواج کو بھی کھلایا اور دوسرے لوگوں میں اسے تقسیم کرنے کا حکم بھی دیا۔

(ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء کم حج النبی ﷺ؛ باب الاشتراک فی البدنة والبقرة میں ہے حدیبیہ کے سال سات افراد کی طرف سے ایک گائے یا ایک اونٹ کی قربانی کی گئی تھی؛ ابوداؤد، کتاب الاضاحی، باب فی الذبیحة بالمروة وغیرہ)

۔ بخاری وغیرہ کی ایک اہم روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو ایک اونٹ یا ایک گائے ذبح کی۔ یہ غزوہ سے واپسی کا واقعہ ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت جابر سے ان کا اونٹ خرید فرمایا تھا۔ (کتاب الجهاد، باب الطعام عند القدوم)

۔ حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہؓ سے شادی کے ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ ملتا ہے جس کی متعدد جہات ہیں۔ حضرت علیؓ کو غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت میں سے جو اونٹنی (شارف) ملی تھی اس

کو حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ نے نحر کر کے اس کا گوشت خود کھایا تھا اور اپنے دوستوں کو کھلایا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کا مکالمۂ نبوی بھی خاصا اہم رہا تھا۔ کھانے کے لحاظ سے یہ حصہ روایت بہت اہم ہے کہ ''اس اونٹنی کے کوہان اور کولھے کاٹ لیے گئے تھے اور ان کی کلیجیاں نکال لی گئی تھیں''۔

(بخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس؛ کتاب المغازی، باب غزوة بدر؛ کتاب البیوع، باب بیع الحطب، کتاب النکاح وغیرہ، حدیث:۳۰۹۱ وغیرہ؛ فتح الباری کے متعلقہ مباحث؛ ومسلم، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر وغیرہ: اس اونٹنی کو ''شارف'' کہا گیا ہے بلکہ وہ دو اونٹنیاں تھیں: ''... فاذا شار فان قد اجتب اسنمتهما وبُقِرت خواصرهما واُخذ من اكبادهما.'' یہ بہترین حصے تھے)

- بنو حارثہ کے ایک شخص کی ایک اونٹنی (لقحہ) احد کے علاقے میں چرتی تھی کہ اسے موت نے آ گھیرا لیکن اس کے مرنے سے پہلے ہی اسے ایک دھاردار چیز۔ لکڑی/ پتھر وغیرہ۔ سے ذبح کر لیا گیا۔ رسول اکرم ﷺ سے فتویٰ مانگا گیا تو آپ ﷺ نے اس کے کھانے کی اجازت عطا فرمادی: ''كان يرعى لقحة له باحد... فذكاها بشطاط... ليس بها باس فكلوها''۔

(مؤطا، کتاب الذبائح، مايجوز من الزكاة على حال الضرورة؛ نیز دیگر کتب حدیث کے ابواب ذبح وغیرہ)

بڑے اسفار وغزوات کے دوران بالعموم اونٹ کا گوشت ہی استعمال کیا جاتا تھا کہ کھانے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی:

- غزوۂ بدر میں مشرکین نے اپنے سپاہیوں کے لیے روزانہ ۹-۱۰/ اونٹ ذبح کیے تھے جس سے آپ ﷺ نے ان کی تعداد نوسو اور ہزار کے بیچ آنکی تھی۔

(ابن ہشام، غزوۂ بدر میں المطعمون کی بحث)

- حضرت جابر بن عبداللہؓ سے اونٹ خریدنے کے واقعہ میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ واپس آ کر ایک اونٹ یا ایک گائے ذبح کی تھی: ''...امر ببقـــرة فذبحت... لما قدم المدنية نحر جزورا اوبقرة...'' (كتاب الجهاد والسير، باب الطعام عند القدوم)

- غزوۂ ذات السلاسل میں حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ نے کچھ لوگوں کے اونٹ کو ذبح کر کے پارچے بنانے کے عوض خاصا گوشت حاصل کیا تھا اور ان کے اصحاب نے اسے کھایا تھا جن میں حضرات شیخین بھی شامل تھے، رسول اکرم ﷺ نے ان کو صاحب الجزور کا لقب دیا تھا۔

(ابن ہشام، ۲/ ۶۲۵-۶۲۶)

-کئی غزوات وسرایا میں حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ اوران کے فرزند گرامی حضرت قیسؓ نے اونٹ ذبح کر کے کھلائے تھے، اس پر ہدایائے طعام میں تفصیل آتی ہے۔

-ان کے علاوہ اونٹوں/ اونٹ کے ذبح/نحر کرنے اور اس کا گوشت کھلانے کے بہت واقعات ملتے ہیں جیسے حضرت ابن عمرؓ کی ایک ناقہ بیکار ہوگئی تو اس کو نحر کر کے اہلِ مدینہ کی دعوت کردی۔ ان کے غلام حضرت نافعؒ نے کہا بھی کہ آپ کے پاس روٹی تو ہے نہیں پھر کس لیے ان کو دستر خوان پر جمع کررہے ہیں۔ فرمایا یہ گوشت اور شوربہ تو ہے جو چاہے گا اسے کھالے گا۔ (ابن سعد،۴/ ۱۶۵)

بھیڑ کا گوشت

بکری/ بکریوں کے مماثل بھیڑ/ بھیڑیں ہوتی تھیں جو قیمت، جسم اور دوسرے اعتبارات سے ایک جیسی سمجھی جاتی ہیں۔ عربی میں ان کا وسیع ترین اور عام نام "نعجة جمع نِعج" ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر واقعۂ حضرت داؤد میں آیا ہے: سورۂ ص: ۲۳-۲۴: "ان هذا اخی له تسع وتسعون نعجة ولی نعجة واحدة ..." "یہ جو ہے بھائی ہے میرا، اس کے ہاں ننانوے دُنبیاں، اور میرے ہاں ایک دنبی"۔ روایاتِ حدیث وسیرت میں بھیڑ یا دنبہ کے ذبح کرنے اور اس کے گوشت کے کھانے کے متعدد واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ان پر بحث آگے آتی ہے اور مختلف ابواب طعام میں بھی ملے گی۔ عام طور سے بھیڑ پہاڑی علاقوں میں ہوتی ہے یا بدوی علاقوں میں۔ اس کے بڑے بڑے بال اون اور دوسری چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا گوشت بھی عام عرب غذا میں شامل تھا مگر اس کو بکری کے گوشت سے فروتر سمجھا جاتا تھا جیسے آج بھی سمجھا جاتا ہے کیونکہ بالعموم اس کے گوشت میں ریشے بڑے اور ہیک دار ہوتے ہیں، اس کی خاص بو طبعِ نازک پر گراں گذرتی ہے۔

موطا کی روایت ہے، اور بعض دوسری کتبِ حدیث کی بھی، کہ حضرت کعب بن مالکؓ کی ایک باندی ان کے بھیڑ بکری کے ریوڑ سلع نامی پہاڑی پر چراتی تھی۔ ان میں سے ایک بکری مرنے کے قریب ہوگئی تو باندی نے اسے نوکیلے پتھر سے ذبح کرلیا۔ آپ ﷺ نے اس کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی۔ (کتاب الذبائح، باب مایجوز من الزکاة الخ)

قربانی کے ضمن میں رسول اکرم ﷺ کے مینڈھے کے قربان کرنے اور اس کے گوشت کے کھانے کھلانے کا ذکر آتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے چھری مانگی اور وہ انھوں نے پتھر پر تیز کر کے دی اور آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے ذبح کیا: ''... واخذ الکبش فاضجعه و ذبحه ''۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کالے بکرے کی قربانی کی تھی۔ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے عقیقوں میں بھی ایسے ہی جانور کے قربان کرنے اور اس کا گوشت کھلانے کا ذکر ملتا ہے۔

(ابوداؤد، کتاب الاضاحی، باب مایستحب من الضحایا، حدیث:۲۷۹۲-۲۷۹۶؛ ابوداؤد، کتاب الاضاحی، باب فی العقیقة؛ ان رسول الله ﷺ عق عن الحسن والحسین کبشا کبشا، حدیث: ۲۸۴۱۔ حدیث: ۲۸۴۳ میں ہے کہ جاہلیت میں بھی عقیقہ میں ایک بکری ذبح کی جاتی تھی جیسے کہ حضرت ابو بریدہؓ نے کی تھی۔ بس سماجی روایت کا فرق ہوگیا تھا۔ دوسرے مینڈھوں (کبش) کی قربانی کے لیے ملاحظہ ہو: موطا، کتاب الضحایا، متعدد ابواب؛ بخاری، کتاب الاضاحی، مختلف ابواب۔ احادیث: ۵۵۵۳-۵۵۵۵ میں رسولِ اکرم ﷺ کے علاوہ حضرات ابوامامہ بن سہلؓ، انس بن مالکؓ کے اسماء کے علاوہ عام اہلِ مدینہ کے کبش کی قربانی کا ذکر ہے)

گائے کا گوشت

عرب لحمیات میں گائے کا تناسب کم تھا کیونکہ وہ ان کے بیشتر علاقوں میں نہیں پائی جاتی تھی۔ جغرافیائی اسباب وعناصر اس کے لیے ذمہ دار تھے۔ عام طور سے گائے (بقرة/ بقر) کے علاوہ بیل بچھڑے (عجل) کا گوشت استعمال کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں بنو اسرائیل کے حوالے سے اور دوسری اقوام کے حوالے سے بھی ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ دوسرے استعمالات کے علاوہ لحمیات کے ضمن میں اس کا ذکر تمام مآخذِ اسلامی میں آتا ہے اور اسے بسا اوقات معزز ترین کھانا/ طعام سمجھا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے معزّز مہمانوں۔ فرشتوں۔ کے لیے بھنے ہوئے بچھڑے کے گوشت کا خاص اہتمام فرمایا تھا: ''فما لبث ان جاء بعجل حنیذ''۔ (سورہ ہود: ۶۹)''۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے ایک غزوہ سے واپسی پر حضرت جابرؓ سے ان کا اونٹ خرید فرمایا اور راستے ہی میں ایک گائے ذبح کی گئی اور صحابہ نے اس کا گوشت کھایا: ''..أمر ببقرة فذبحت

فأكلوا منها. . ." (بخاري، كتاب الجهاد، باب الطعام عند القدوم)

عہدِ نبوی کے واقعات میں گائے کا گوشت کھانے اور کھلانے کا ذکر زیادہ تر قربانی کے ضمن میں ملتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک بار حج کے موقعہ پر اپنی طرف سے اور اپنی ازواج کی طرف سے گائے کی قربانی کی اور سب کو اس کا گوشت کھلایا۔ حدیثِ بخاری-۵۵۵۹ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنی ازواجِ مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی:..."وضحّى رسول الله ﷺ عن نسائه بالبقر"

(كتاب الاضاحي، باب من ذبح أضحية غيره الخ؛ فتح الباری، ۱۰/۲۴-۲۵: حافظ ابن حجر نے اپنی شرح میں اس معنی کی حدیثِ حضرت جابرؓ نقل کی ہے، ابن ہشام ۲/۶۰۱-۶۰۲ میں یہ اضافہ ہے کہ قربانی کے دن حضرت عائشہؓ وغیرہ کے گھروں میں گائے کا بہت سا گوشت پہونچایا گیا)

- حضرت ابوایوب انصاریؓ نے بکری کی اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور دوسرے صحابہ کرام نے اونٹوں اور گایوں کی قربانی غزوۂ حدیبیہ کے زمانے میں سات سات افراد کی جانب سے کی تھی اور ان کا گوشت کھایا اور کھلایا تھا: (موطا، كتاب الضحايا، الشركة في الضحايا)

- حجۃ الوداع کے باب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ قربانی کے دن (یوم النحر) میرے پاس گائے کا بہت سا گوشت لایا گیا اور میرے گھر میں ڈال دیا گیا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کی طرف سے گائیں قربان کی ہیں: "... فلما كان يوم النحر أتيت بلحم بقر كثير، فطُرِح في بيتي... قالوا: ذبح رسول الله ﷺ من نسائه البقر" (ابن ہشام ۲/۶۰۱-۶۰۲)

گھوڑے کا گوشت

بعض محدثینِ کرام نے عہدِ نبوی میں گھوڑوں کے گوشت کھانے کے عمل اور جواز پر کتب وابواب باندھے ہیں اور بعض دیگر نے اپنے مباحث میں ان پر اصولی بحث کی ہے۔ بہر حال ہمیں سرِدست واقعہ وعمل سے سروکار ہے۔ امام مسلم نے حضرت جابرؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور گدھوں کے گوشت سے روک دیا۔ یعنی

اول الذکر کو حلال اور ثانی الذکر کو حرام قرار دیا: ''اطعمنا رسول اللّٰہ ﷺ لحوم الخیل ونھانا عن لحوم الحمر...''۔

(مسلم، مقدمۃ، باب صحۃ الاحتجاج بالحدیث المعنعن، ۱/۳۲؛ کتاب الصید والذبائح، باب اکل لحوم الخیل؛ ترمذی، باب یکساں)

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ نے عہدِ نبوی میں ایک گھوڑے (فرس) کو ذبح کر کے اس کا گوشت سب کے ساتھ کھایا تھا۔ پالتو گدھوں (الحمر الاھلیۃ) کے حرام ہونے کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے اور محدثین نے اس پر کئی کتب کے ابواب میں بحث کی ہے۔

(جیسے مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب تحریم اکل لحم الحمر الانسیۃ؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، فی لحوم الحمر الاھلیۃ؛ ترمذی ایضا؛ ابوداؤد، ایضا، باب فی اکل لحوم الخیل، حدیث: ۳۷۸۸، ۳۷۸۹: ذبحنا یوم خیبر الخیل... ولم ینھنا عن الخیل؛ بعد کے فقہاو محدثین کی ایک جماعتِ کثیر نے گھوڑوں کے گوشت کی حرمت بھی احادیث سے ثابت کی ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں)

-حمارِ وحشی کا گوشت احادیثِ صحیحہ سے حلال ثابت ہوتا ہے اور صحابہ کرام نے عہدِ نبوی میں اسے کھایا تھا۔ حدیثِ بخاری: ۵۴۰۷ میں حضرت ابوقتادہ سُلمیؓ کا بیان ہے کہ مکہ کے راستے میں اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا ایک جگہ قیام تھا اور رسولِ اکرم ﷺ اگلی منزل پر قیام فرماتے۔ ہم میں سے بعض غیر مُحرم حضرات نے ایک حمارِ وحشی (گورخر) کے شکار کی تگ ودو کی اور میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ بہر حال صحابہ کرام نے اسے کھایا اور جب رسول اکرم ﷺ سے غیر مُحرم کے شکار کے مُحرم کے کھانے کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ ﷺ نے اسے خود کھا کر جواز کا فتویٰ دیا۔

(بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب تعرق العضد؛ فتح الباری، ۹/۶۷۶-۶۷۷؛ نیز کتاب الھبۃ، باب من استوھب الخ؛ موطا، کتاب الحج، باب مالا یحل للمحرم اکلہ من الصید؛ بخاری، ابواب المحصر، باب اذا اھدی للمحرم حمارا وحشیا حیا لم یقبل: اس میں یہ بیان ہے کہ زندہ جانور کا گوشت ذبح کر کے کھانے سے انکار فرمایا کہ آپ ﷺ بحالتِ احرام تھے)

پرندوں کا گوشت

سیرت وحدیث میں بعض پرندوں کے گوشت کھانے اور کھلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ عام

پرندوں (طیر) کے علاوہ ان کی بعض اقسام کا ذکر نام بنام آتا ہے اور بسا اوقات ان کے کھانے کھلانے کا ذکر ہدایا کے حوالے سے آتا ہے:

- طیـــر: حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمیؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے پرندے کا گوشت رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کھایا تھا: ...اکلناہ مع رسول اللہ ﷺ...''۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ ایک سفرِ حج کے دوران ان کے قافلہ والوں کو پرندے کا گوشت ہدیہ کیا گیا تھا اور ان کے اصحاب نے ان کے فتوے کے بعد اس کا استعمال کیا تھا۔

(مسلم، کتاب الحج، باب تحریم الصید للمحرم)

- حباریٰ/ مرغابی، بٹیر: جیسے پرندے کے گوشت کے کھانے کا ذکر حضرت سفینہؓ مولائے نبوی کی حدیث میں ملتا ہے جو انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کھایا تھا: ''اکلت مع رسول اللہ ﷺ لحم حباریٰ...''۔

(ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الحباری؛ حدیث: ۳۷۹۷؛ ترمذی، ابواب الاطعمة، باب فی اکل الحباریٰ)

- دجاج/ مرغی کا گوشت کھانے کا ذکر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث میں آتا ہے جو انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ کھایا تھا اور بعد میں بھی کھاتے رہے تھے اور ایک وفد کی آمد کے موقعہ پر کھا رہے تھے کہ ایک شخص نے اسے مکروہ سمجھا تھا۔

(بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب لحم الدجاج، احادیث: ۵۵۱۷-۵۵۱۸۔ موخر الذکر حدیث کافی مفصل ہے۔ اس میں پورا واقعہ ہے اور اول الذکر میں رسول اکرم ﷺ کے مرغی کھانے کا ذکر ہے: ''رایت النبی ﷺ یاکل دجاجا''۔ فتح الباری، ۹/ ۷۹۸-۸۰۲ میں دوسری کتب حدیث وغیرہ سے بہت سے متعلقہ امور و مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ کھانے کے واقعات سے متعلق ایک معاملہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ پالتو اور گندگی کھانے والی مرغی (الدجاجة الجلالة) کو تین دنوں تک روکے رکھتے پھر ذبح کر کے کھاتے تھے کیونکہ وہ گندگی کھاتی ہے اور اس کا اثر زائل کرنے کے لیے اس کو تین دنوں تک بند رکھتے تھے)

بٹیر/ گوہ (ضب) کا گوشت

محدثینِ کرام اور سیرت نگاروں نے بھنے ہوئے گوشتِ گوہ کا ایک واقعہ خاصے دلچسپ

انداز میں لکھا ہے حضرت میمونہ بنت حارثؓ ام المومنین کی ایک بہن حضرت حُفیدہ بنت الحارثؓ نجد سے آئیں تو اپنے ساتھ گوہ کا گوشت بھی لائیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کھانے کے لیے تشریف لائے تو آپ ﷺ کے ساتھ حضرت خالد بن ولید مخزومیؓ بھی تھے۔ وہ حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے اور حضرت ابن عباسؓ بھی۔ دسترخوان پر آپ ﷺ نے بھنا ہوا گوشتِ گوہ پایا: ''فوجد عندھا ضباً محنوذا...''۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ ایک خاتونِ حاضر باش نے عرض کیا کہ کس چیز کا گوشت ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے دستِ مبارک روک لیا۔ حضرت خالدؓ نے پوچھا کیا وہ حرام ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حرام نہیں، لیکن میری قوم کے علاقے میں وہ نہیں ہوتا لہٰذا مجھے اس سے احتراز ہے۔ حضرت خالدؓ نے بہر حال اس کو خوب کھایا اور رسولِ اکرم ﷺ ان کو کھاتے دیکھتے رہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب ما کان النبی ﷺ لا یاکل حتی یسمّٰی له فیعلم ماھو، حدیث: ۵۳۹۱۔ نیز دو اطراف ۵۴۰۰، ۵۵۳۷؛ فتح الباری، ۶۶۲/۹ ومتعلقہ جلد وصفحات۔ حضرت میمونہؓ نے ہی رسولِ اکرم ﷺ کو باخبر کیا تھا؛ نیز مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب اباحة الضب؛ حدیث: ۳۹ (۱۹۴۳) تا ۵۱ (۱۹۵۱)۔ متعدد احادیث میں کئی واقعات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت یزید بن اصمّؒ کو ایک دولہن نے مدینہ میں کھانے کے لیے دوستوں سمیت بلایا اور تیرہ بٹیروں کا گوشت پیش کیا۔ حدیث: ۵۰ (۱۹۵۱) کے مطابق ایک اعرابی نے بیان کیا کہ ہم گوہ والے علاقے میں رہتے ہیں اور ہمارے چرواہوں کا وہ عام کھانا ہے: إنا بارض مضبة وانه لطعام عامة هذه الرعاء''؛ نیز ترمذی، ابواب الاطعمة، باب فی اکل الضب؛ ابوداؤد، مذکورہ بالا باب وکتاب، حدیث: ۳۷۹۳؛ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب الضب؛ فتح الباری، ۸۱۹/۹ ومابعد)

خرگوش (ارنب) کا گوشت

شکار کے واقعات اور ان سے متعلق کتب وابوابِ حدیث میں دوسرے جانوروں کے علاوہ خرگوش کا بھی ذکر آتا ہے۔ متعدد صحابہ کرام نے اس کا شکار کرنے اور اس کا گوشت کھانے کا ذکر اپنی روایات میں اہتمام سے کیا ہے:

- رسولِ اکرم ﷺ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ مرالظہران نامی مقام پر ہم کو اچانک ایک خرگوش دکھائی دیا اور میں نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا۔ میں اسے حضرت

ابو طلحہؓ کے پاس لایا اور انھوں نے اسے ذبح کیا اور اس کے سرین اور رانوں کے حصے رسول اکرم ﷺ کے لیے میرے ہاتھ بھیجے اور آپ ﷺ نے انھیں قبول فرمالیا: "فبعث بورکھا وفخذیھا الی رسول اللہ ﷺ فاتیت بھا...فقبلہ..."

(مسلم، کتاب الصید والذبائح ؛ حدیث:۵۳(۱۹۵۳)؛ ترمذی، ابواب الاطعمة، باب فی اکل الارنب؛ ابوداؤد، کتاب الاضاحی، باب فی الذبیحة بالمروة؛ حدیث ۲۸۲۲ کے مطابق حضرت صفوان بن محمدؓ نے دو خرگوشوں کو پکڑ کر اسی طرح ذبح کرلیا اور رسول اکرم ﷺ سے فتویٰ مانگا تو آپ ﷺ نے ان دونوں کے کھانے کی اجازت دے دی: "فامرنی باکلھما"۔ ابوداؤد، حدیث:۳۷۹۱: حضرت انس کے شکار خرگوش پر؛ حدیث:۳۷۹۲ کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے بیان کیا کہ ایک شخص ایک بار ایک خرگوش لایا تو آپ ﷺ نے نہ کھایا، نہ منع کیا)

(موطا، کتاب الحج، مایجوز للمحرم اکلہ من الصید کے مطابق حضرت زبیر بن عوامؓ دورانِ حج/عمرہ ہرن کا سوکھا گوشت لے جایا کرتے تھے: کان یتزوّد صفیف الظباء وھو محرم؛ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب الارنب؛ فتح الباری، ۹/ ۸۱۷ومابعد)

ٹڈی (جراد) کے کھانے پر اسی طرح بہت سی کتب حدیث میں ابواب ہیں جن میں اس کی اباحت بیان کی گئی ہے:

-حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک حج یا عمرہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نکلے تو راستہ میں ٹڈیوں کے دل کے دل ملے اور ہم نے ان کو اپنے کوڑوں اور چابکوں اور جوتوں سے مارنا شروع کیا۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کو کھاؤ کیونکہ وہ سمندری شکار ہے: "...کلوہ فانہ من صید البحر"۔

-حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ کی روایت ہے کہ ہم نے سات غزوات میں شرکت کی اور آپ ﷺ نے ٹڈی کھائی۔ دوسرے صحابہ کے کھانے کا بھی ذکر ہے۔ حدیثِ ابوداؤد: ۱۸۱۳ کے مطابق حضرت سلمانؓ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نہ کھاتے تھے اور نہ منع کرتے تھے۔

(بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب اکل الجراد، حدیث: ۵۴۹۵: حدیث ابن ابی اوفی؛ مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب اباحة الجراد؛ ابوداؤد/ترمذی، الاطعمة، اکل الجراد: مختلف ومتعدد احادیث حلت؛ فتح الباری، ۹/ ۷۶۷-۷۷۰؛ ابن سعد، ۴/ ۳۰۱)

ہرن کا گوشت

شکار کے گوشت میں ہرن کا گوشت بہت نرم اور عمدہ سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کا شکار عام تھا۔عہدِ نبوی میں عام شکاریوں کے علاوہ صحابہ کرام بھی اس کا شکار کرنے جاتے تھے اور دورانِ اسفار وغزوات شکار کرتے تھے۔ اس کا گوشت کھانے کا بھی عام رواج تھا۔ تازہ پکا کر کھانا عام بات تھی اور اسی کے ساتھ اس کا گوشت سکھا کر رکھ لیا جاتا تھا اور اسے دورانِ سفر بطور زادِ راہ لے جایا جاتا تھا۔ دوسرے سوکھے گوشت بھی ساتھ ہوتے تھے کہ سفر میں ان سے استفادہ آسان ہوتا تھا۔ حضرت زبیر بن عوامؓ کے بارے میں ایک روایت آتی ہے کہ وہ حج وعمرہ کے اسفار کے دوران بطور خاص ہرن کا سوکھا گوشت ساتھ لے جاتے تھے اور اس کو بطور زادراہ استعمال کرتے تھے: ”...أن الزبیر بن العوام کان یتزود صفیف الظباء وھو محرم. قال مالک : الصفیف : القدید...“۔

(موطا، کتاب الحج، مایجوز للمحرم اکله من الصید ؛ان کے علاوہ اس باب میں بعض واقعات ہرن کے شکار کرنے کے ہیں)

مچھلی کا گوشت

بحری جانوروں کا گوشت عام طور سے اپنی لطافت کے سبب بہت مرغوب ہوتا ہے خاص کر مچھلی کا گوشت۔ ان کی ایک اسلامی جہت یہ بھی ہے کہ مردہ مچھلی وغیرہ کا گوشت بھی حلال ہے اور اس کی وجوہ واسباب بھی ہیں۔ شکار کے واقعات کے علاوہ مچھلی اور دوسرے بحری جانوروں کے گوشت کھانے کا ذکر احادیث وروایاتِ سیرت میں آتا ہے:

- ایک ابتدائی غزوہ - خبط - کے دوران حضرت ابوعبیدہؓ اور ان کے اصحاب نے ایسے ہی ایک جانور کا گوشت مدتوں کھایا تھا کہ وہ بڑا جانور تھا یا عظیم ترین مچھلی تھی۔ اس مردہ مچھلی کی قسم عنبر کہلاتی تھی جو پندرہ دنوں تک کام آئی تھی۔

(حدیثِ بخاری: ۵۴۹۳-۵۴۹۴۔ نیز دوسری احادیثِ بخاری جن میں اس واقعہ کا ذکر بار بار لایا گیا ہے جیسے

بخاری، کتاب الذبائح والصید، مختلف ابواب؛ فتح الباری، ۹/۶۰۷ ومابعد؛ مسلم، ایضا، باب اباحة میتات البحر؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی دواب البحر، حدیث: ۳۸۴۰)

-حضرت ابوبصیر ثقفی اور ان کے رفقائے کرام نے، جن کی تعداد تین سو تک ہوگئی تھی، صلح حدیبیہ کے بعد عیص نامی ساحل پر سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس دوران ان کا خاص کھانا مچھلی ہی تھا جو بحر احمر سے وافر مقدار میں بہ آسانی مل جاتی تھی۔ (واقدی، ۶۲۷)

گوشت کھانے کے آداب

ہر کھانے کے خاص آداب و احکام ہوتے ہیں اور سنتوں کا فرق بھی پایا جاتا ہے کہ کھانے / طعام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ گوشت کھانے کے آداب و احکام اور سنن میں بعض عرب روایات کا بھی دخل تھا اور اسلامی احکام و اصول کا بھی تھا مثلاً اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو/کلی کرنے کا حکم ملتا ہے کہ اس میں چربی زیادہ ہوتی ہے اور بکری کے گوشت کھانے کے سلسلے میں یہ حکم نہیں ہے: ''سئل رسول اللہ ﷺ عن الوضوء من لحوم الابل فقال: توضؤا عنها، وسئل عن لحوم الغنم فقال: لاتتوضؤا منها''۔

(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الوضوء من لحوم الابل، حدیث: ۱۸۴: وضو سے یہاں مراد کلی کرنا ہے، نماز کا وضو مراد نہیں)

گوشت کو- پکے ہوئے گوشت کو- ہاتھوں سے نوچ نوچ کر کھانے کا حکم ملتا ہے اور اسی طرح چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانے کی سنتِ نبوی بھی ملتی ہے جیسا کہ بخاری کی کتاب الاطعمہ کے مختلف ابواب میں ہے۔ عجمیوں کی طرح چھری سے کاٹنے کی ممانعت کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میں غالباً عیش پسندوں کے مانند چھری سے گوشت منہ میں رکھنے کا ذکر ہے۔

گرم گرم گوشت کھانے کے واقعات کا بھی حوالہ ملتا ہے، بعض اوقات رسولِ اکرم ﷺ نے کسی سبب سے بہت گرم گوشت تناول فرمایا۔ وہ اتنا گرم تھا کہ بار بار ہاتھوں میں ادھر سے ادھر کرتے رہے تھے۔ یہ راستہ کی ایک عام صحابی کی دعوت یا کھانے میں شرکت کا ذکر ہے اور اس پر بحث وحوالہ اپنے مقام پر آتا ہے۔

سوکھا گوشت کھانے کا بھی ذکر ملتا ہے اور سبزی میں سوکھے گوشت کے ٹکڑے ملا کر کھانے

کا بھی جیسا کہ بعض دعوتوں کے ضمن میں واقعات آتے ہیں اور ان کے اپنے مباحث میں ان کے واقعات بھی ہیں اور حوالے بھی۔

ہڈی چوسنے اور کھانے کا ایک واقعہ یا معمول وسنت بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ میں ماہانہ اذیت (ماہواری) سے گذر رہی ہوتی اور اس دوران رسول اکرم ﷺ کے ساتھ گوشت کھاتی تھی اور ہڈی چوستی تھی اور رسولِ اکرم ﷺ اسی ہڈی کو اسی جگہ سے چوستے اور کھاتے تھے جہاں سے میں نے اسے چوسا تھا۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب فی مؤاکلۃ الحائض وسورھا، حدیث: ۶۴۳؛ نیز دیگر کتب اور بیت نبوی میں کھانے کا باب)

معمول کا مستقل کھانا

عرب جاہلی سماج اور اسلامی - عربی تمدن میں معمول کا کھانا گوشت روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ اصل کھانا تھا اور مستقل بھی۔ گوشت نہ دستیاب ہوتا تو اس کی جگہ دوسری چیزیں بطور سالن - ادام/ ادم - استعمال کی جاتی تھیں۔ اس طرح روٹی کھانے کا جزو اعظم تھی کہ اس کے بغیر کھانا نہیں ہوتا تھا۔ روٹی پیٹ بھرنے کا وسیلہ ہمیشہ رہی ہے خواہ کوئی معاشرہ وتمدن رہا ہو۔ روٹی کے ساتھ جو سالن کھائے جاتے تھے وہ اس کے امدادی وسائل وآلات تھے۔ گیہوں اور جو کی روٹی کے واقعات کا بیان وتجزیہ ایک الگ فصل میں پیش کیا گیا ہے، اس میں اس حقیقت کا اظہار بلاتردد ہوتا ہے۔ بہرحال روٹی گوشت کے کھانے کے اتنے آثار وشواہد اور واقعات ملتے ہیں کہ ان پر ایک مفصل مقالہ لکھا جاسکتا ہے:

- بچے بالعموم دودھ چھڑانے کے بعد روٹی سے غذا کھانے کی ابتدا کرتے ہیں، یہ عالمی انسانی دستورِ غذا ہے۔ حضرت غامدیہؓ کے واقعہ سے اس کی عظیم ترین تائید ہوتی ہے اور اس عالمی دستورِ غذا کے دوسرے واقعاتِ عہد بھی ہیں۔

- رسولِ اکرم ﷺ کے علاوہ متعدد صحابہ وصحابیات کے دودھ چھوڑنے کے بعد روٹی کھانے کے واقعات ملتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں وظیفۂ طفلی حاصل کرنے کی خاطر

ایک خاتون نے قبل از وقت اپنے بچے کا دودھ چھڑا کر روٹی کھلانے کی کوشش کی تھی۔

-روٹی گوشت کھانے کے معمول سے متعلق واقعات وروایات کو بلا کسی ترتیبِ تاریخی اور توقیتِ زمانی کے پیش کیا جارہا ہے کہ وہ ایک مستقل معمولِ غذا تھا جس پر زمان اثر انداز ہوتا ہے نہ مکان، اور نہ ہی دوسرے عوامل واسباب:

ا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی دعوتِ شیراز میں رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو روٹی گوشت کھلایا گیا۔ (مسلم، کتاب الاشربة، حدیث: ۱۶۱۰؛ نیز بخاری وغیرہ کی دیگر احادیث)

۲۔ رسول اکرم ﷺ کے روٹی گوشت کھانے کا ایک دلچسپ اور معنی خیز واقعہ حضرت بریرہؓ کے صدقہ کے ضمن میں ہے: رسول اکرم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو ہانڈی گوشت سے بھری پک رہی تھی مگر آپ ﷺ کے سامنے روٹی اور گھر کے سالنوں میں سے کوئی ایک سالن (سرکہ وغیرہ) پیش کیا گیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا میں ہانڈی میں گوشت نہیں دیکھ رہا، عرض کیا گیا کہ وہ تو صدقہ کا گوشت ہے جو بریرہ کو دیا گیا ہے اور آپ ﷺ صدقہ نہیں کھاتے۔ فرمایا: وہ اس کے لیے صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے۔

(موطا، کتاب الطلاق، ما جاء في الخيار ؛ تنویر، ۲/۸۶؛ باندیوں کے ہدایائے طعام وغیرہ پر اگلی بحث ملاحظہ ہو)

۳۔ مشہور روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور حضرات شیخین - ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما - بھوک سے بیتاب ہو کر گھروں سے نکلے اور مشہور صحابی حضرت ابوالھیثم بن التیہان انصاریؓ کے دولت کدے پر گئے اور انھوں نے تینوں مہمانوں کی جو کی روٹی اور بکری کے گوشت سے ضیافت کی اور خوب ٹھنڈا پانی پلایا...''

(موطا، کتاب الجامع، ماجاء فی الطعام و الشراب؛ تنویر، ۳/۱۱۳-۱۱۴؛ ترمذی، ابواب الزھد، باب فی معیشة اصحاب النبی ﷺ؛ بلاذری، ۱/۵۳۵ میں ایک دوسری دعوت کا ذکر ہے جس میں ثرید اور کھجوروں کا حوالہ ہے)

۴۔ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اور ان کی اہلیہ حضرت ام سلیمؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو غزوۂ خندق کے سخت موقعہ پر انتہائی بھوک کے عالم میں جو کی روٹی اور گوشت ہی کھلایا تھا'' (موطا، مذکورہ بالا، ۳/۱۱۱-۱۱۲؛ مسلم، حدیث: ۱۶۱۲)

۵۔ حضرت زینب بنت جحشؓ سے شادی کے موقعہ پر ولیمۂ نبوی میں گوشت روٹی تھی اور

وہ دن کا کھانا تھا جو بہت سے صحابہ نے کھایا تھا: ''...اطعمنا رسول الله ﷺ الخبز واللحم حين اشتد النهار...'' (مسلم، کتاب النکاح، حدیث:۸۹(۱۴۲۸)

۶۔ آگ پر پکی ہوئی چیزوں کے کھانے سے نقض وضونہیں ہوتا ہے کے مسئلہ پر متعدد روایات ہیں اور ان میں روٹی گوشت کھانے کا ذکر ہے (مسلم، حدیث:۹۶(۳۵۹)...فاتی بهدية خبز ولحم...''۔

-حضرت ابن عمرؓ روزانہ رات کو اپنے تمام اہل بیت کے لئے روٹی اور گوشت کا پیالہ تیار کرتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ (ابن سعد،۴/ ۱۶۵)

-حضرت عبداللہ بن الحارث الزبیدیؓ کا بیانِ واقعہ ہے کہ ہم عہد نبوی میں مسجد کے اندر روٹی گوشت کھاتے تھے: كنا ناكل علىٰ عهد رسول الله ﷺ في المسجد الخبز واللحم''(ابن ماجہ، کتاب الاطعمة، باب الاكل في المسجد)

-حضرت عبداللہ بن سرجسؓ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ روٹی اور گوشت کھایا تھا: ''اكلت معه خبزا و لحما...'' (مسلم، کتاب الفضائل، حدیث:۱۱۲(۲۳۴۶)

خلفائے راشدین کا معمول کا کھانا: بھی گوشت روٹی پر مشتمل ہوتا تھا: عہد نبوی میں بھی اور ان کے عہدِ خلافت میں بھی۔ دینی معاملات میں بھی وہ مقتدایانِ امت تھے اور دنیوی امور میں بھی ان کا تعامل نبوی سنت ومعمول کے بعد ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسی سبب سے کتبِ حدیث میں ان کے آثار و معمولات کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اور ان سے احکام کا استنباط بھی کیا جاتا ہے، مثلاً آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضونہیں ٹوٹتا اس مسئلہ کو بتانے کے لیے خلفاء کرام کے معمولاتِ طعام کا بھی ذکر کیا جارہا ہے:

-حضرت ابوبکر صدیقؓ نے گوشت (روٹی) کھانے کے بعد تازہ وضونہیں کیا اور نماز پڑھ لی: ''اكل لحما''۔

-حضرات شیخینؓ نے روٹی گوشت تناول فرمایا اور وضونہیں کیا۔

-حضرت ربیعہ بن عبداللہ بن الھدیرؓ نے حضرت عمرؓ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور نماز پڑھ لی۔

-حضرت عثمانؓ نے روٹی گوشت کھایا پھر کلی کرلی: "ان عثمان بن عفان اکل خبزا ولحما ثم مضمض..."

(موطا/تنویر الحوالک، ۱/ ۴۸-۴۹؛ ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب الرخصة الخ، ۱/ ۱۶۴: "اکل النبی ﷺ وابوبکر وعمر خبزا ولحما")

ابواب زہد وفقر کی بعض احادیث وروایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دن بھر میں معمول کا کھانا روٹی گوشت پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا ایک زاویۂ زہد یہ بھی تھا کہ ایک وقت تناول فرمالیتے تھے تو دوسرے وقت ناغہ کر دیتے تھے۔ یہ دن اور رات کے دو معمول کے کھانوں کے بارے میں بیان ملتا ہے۔ روایات میں اسے فقرِ مجبوری اور امرِ محرومی بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر سنتِ رسول ﷺ اور حکمِ شریعت اسے فقرِ اختیاری اور زہدِ اسلامی بنا کر پیش کرتے ہیں اور یہی صحیح جہت ہے۔ اس باب میں ترمذی کی ایک روایت حضرت مسروق، مشہور تابعی، سے ملتی ہے جس کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے تازندگی ایک دن میں دو بار گوشت روٹی پیٹ بھر کر یا سیراب ہو کر نہیں کھایا: "...واللہ ماشبع من خبز ولحم مرتین فی یوم"۔

(ابواب الزهد، باب فی معیشة النبی ﷺ واهله: اس سے اہل بیت کے معمول کا پتہ بھی چلتا ہے)

حضرت فاطمہؓ اور ان کے اہل بیت کے بارے میں ایک بہت دلچسپ روایت ملتی ہے جس کی کئی جہات ہیں۔ وہ ایک طویل واقعہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ گھر آئے تو حضرات حسنینؓ کو بھوک سے بلکتے پایا۔ وہ بازار کی طرف گئے کہ کچھ کھانے کا انتظام کریں کہ راستہ میں ایک دینار پڑا پایا۔ واپس آ کر حضرت فاطمہؓ کو قصہ کہہ سنایا۔ حضرت فاطمہؓ کے مشورے وہدایت پر حضرت علیؓ نے ایک یہودی سے آٹا خریدا مگر اس نے رسول اکرم ﷺ کی خاطر سے آٹا تو دے دیا مگر دینار نہ لیا۔ پھر حضرت علیؓ نے ایک درہم رہن رکھ کر ایک قصاب سے گوشت لیا اور حضرت فاطمہؓ نے روٹی گوشت پکایا پھر رسول اکرم ﷺ کو بلوا بھیجا اور تشریف آوری پر حلت و حرمت کا مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے کھانا کھانے کا حکم دے دیا اور بعد میں دینار و درہم کو رہن سے چھڑا کر اس کے اصل مالک کو واپس دے دیا۔ اس کے علاوہ بعض جہات ہیں:

(ابوداؤد، حدیث: ۱۷۱۵-۱۷۱۶ (کتاب اللقطة): اول الذکر مختصر حدیث ہے اور ثانی الذکر بہت مفصل ہے)

۔حضرت انس بن مالکؓ خلافتِ اموی میں جب بہت بوڑھے ہوگئے تھے تو روزے رکھنے کے لائق نہیں رہے تھے لہٰذا افطار کرتے اور ہر دن/ روزہ کے فدیہ میں ایک مسکین کو روٹی اور گوشت کھلاتے تھے، یہ معمول ایک سال یا دو سال جاری رہا۔

(بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر ''ایاما معدودات''؛ فتح الباری، ۸/ متعلقہ بحث: ''...فقد أطعم انس بعد ما کبر عاما او عامین کل یوم مسکینا خبزا ولحما وافطر...'' کیونکہ روٹی گوشت ہی معمول کا طعام سمجھا جاتا تھا)

روٹی: جَو کی

احادیث میں روٹی (خبز) اور اس کی بعض اقسام کا ذکر اتنا زیادہ آتا ہے کہ اس پر پوری ایک ''کتاب الخبز'' لکھی جا سکتی ہے۔ روٹی کا عام نام ''خبز'' ہے مگر اس کی اقسام کے لحاظ سے اس کے متعدد نام روایات میں ملتے ہیں۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ نے مقدمہ فی اصول التفسیر میں قرآن مجید میں مترادفات کے نہ ہونے پر جو جامع اور مختصر بحث کی ہے اس میں روٹی کے اسماءِ مختلفہ کا ذکر بطور مثال کیا ہے تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ کسی لغت/ زبان میں مترادفات ہوتے ہی نہیں اور قرآن مجید میں تو سرے سے ہیں ہی نہیں، اور جن کو مترادفات سمجھا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک میں معنی کی جہتِ خاص ہوتی ہے جیسے ''رغیف'' (چپاتی) اور باریک روٹی ہوتی ہے، اسے رومالی روٹی بھی کہا جا سکتا ہے اور وہ میدے کی بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں ''الخبز الرقق'' کا بھی ذکر آتا ہے اور دوسری متعدد قسم کی روٹیاں عرب بالخصوص مکہ مکرمہ میں اور اعلیٰ طبقات میں مروج تھیں لیکن عام غذائے نبوی اور طعامِ مدینہ جو کی روٹی تھی اور اسے بھی آپ ﷺ نے بعض روایات کے مطابق پیٹ بھر نہیں کھایا تھا: ''خرج رسول اللّٰہ ﷺ عن الدنیا ولم یشبع من الخبز الشعیر...''

(بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب ما کان النبی ﷺ واصحابہ یاکلون؛ نیز مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کی مختلف کتبِ زہد، رقاق وغیرہ میں ایسی زاہدانہ زندگی کی بہت سی روایات واحادیث منقول ہیں)

روٹی بنیادی کھانا ہونے کے باوجود کسی ''سالن'' (ادام) کے ساتھ ہی عام طور سے کھائی جاتی تھی تاہم صرف روٹی یا روٹی کے ٹکڑے کھانے کا ذکر بھی مل جاتا ہے اور ایک حوالہ تو انتہائی

جاں نثاری اور قربانی کا ملتا ہے۔ حضرت غامدیہؓ کو جب زنا کا اعتراف کرنے کے جرم میں سنگسار کیے جانے کی سزا سنائی گئی تھی تو وہ حاملہ تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو بچے کی ولادت اور اس کے کھانے کی عمر تک پہونچ جانے کے بعد آنے اور توبہ کی سزا اٹھانے کو کہا۔ بہر حال وہ اپنے نومولود بچے کے ساتھ آئیں تو اس معصوم کے ہاتھ میں بطور شہادت وثبوت روٹی کا ٹکڑا تھا جسے وہ کھا رہا تھا: "... اتته بالصبی فی یده کسرة خبز... وقد اکل الطعام..."۔

(مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علیٰ نفسه بالزنیٰ: حدیث: ۲۳-۲۴...؛ نیز دیگر کتب حدیث)

اگلے مباحث میں روٹی کے ٹکڑوں یا ٹکیوں (اقراص) کا ذکر ملتا ہے۔ ان سب میں بالعموم جو کی روٹی ہی مراد ہوتی ہے۔ اور وہ عام اور ادنیٰ طبقاتِ امت کے علاوہ بلند مرتبہ اشخاص اور مالدار طبقات کی بھی روٹی تھی۔ بسا اوقات طعام سے مراد ہی جو کی روٹی، جو کا آٹا یا خالص جو ہوتا ہے کیونکہ طعامِ مدینہ منورہ "جو" (شعیر) ہی تھا: "کان طعامنا الشعیر"۔ جو کی روٹی کے بعض شواہد طعامِ نبوی اور طعامِ صحابہ کرام سے بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں حالانکہ اس کا ذکر کافی آچکا ہے:

- رسولِ اکرم ﷺ نے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر ایک کھجور رکھی اور فرمایا یہ اس کا سالن ہے "...رأیت النبی ﷺ اخذ کسرة من خبز شعیر فوضع علیها تمرة، وقال: هذه ادام هذه.." (ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی التمر)

- حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ایک روز میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کاشانۂ مبارک میں لے گئے۔ آپ کی خدمت میں روٹی کا ایک مجموعۂ قطعات پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا کوئی سالن نہیں ہے؟ جواب نفی میں ملا تو سرکہ طلب فرمایا اور وہ مل گیا اور آپ ﷺ نے اسے بہترین سالن قرار دے کر روٹی اس کے ساتھ تناول فرمائی: "...اخرج الیه فلقا من الخبز ..."۔ دوسری روایت میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ تین روٹیاں پیش کی گئی تھیں: "فاتی بثلاثة اقرصة"۔

(مسلم، کتاب الاطعمة، باب فضیلة الخل والتادم به، حدیث: ۱۶۴-۱۶۹؛ نیز ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کے ابوابِ سرکہ)

-رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے معمول کے کھانے گوشت روٹی کے باب میں یہی جو کی روٹی مراد ہے۔

-متعدد نبوی کھانوں میں جو کی روٹی کا ذکر آتا ہے، خواہ وہ کاشانۂ مبارک میں تناول فرمائے ہوں یا صحابہ کرام کی دعوتوں میں ان کے گھروں پر کھائے ہوں یا زیارتوں کے دوران ان سے شادکام ہوئے ہوں۔ ہدایائے طعام میں بھی اسی روٹی کا ذکر آتا ہے۔

-محدثینِ کرام کی کتب الاطعمۃ کے متعدد ابواب میں اسی جو کی روٹی (خبز الشعیر) کا ذکر آتا ہے۔ ان میں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور موطا کے علاوہ دوسری کتبِ حدیث شامل ہیں۔ ان کے حوالے بہت سے پہلے گذر چکے اور بہت سے آگے آتے ہیں۔ ابن ہشام کی ایک دلچسپ روایت کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ ابن الھیبان نامی ایک شامی یہودی اسلام/ بعثتِ نبوی سے چند سال قبل مدینہ آ کر بس گیا تھا۔ وہ بڑا اعبادت گذار تھا اور ''پنجوقتہ نمازیں'' پڑھتا اور حسین نمازیں پڑھتا۔ بارش کے امساک کے زمانے میں اہل مدینہ اس سے استقاء کی دعا کے لیے کہتے تو وہ صدقہ نکالنے کی شرط لگاتا اور ہم ایک صاع کھجور یا دومُد جو صدقہ نکالتے اور بارش ہو جاتی: ''صاعا من تمر او مدین من شعیر قال: فنخرجھا'' (ابن ہشام، ۱/۲۱۳)

روٹی: گیہوں کی

مکہ مکرمہ میں بالخصوص اکابرِ قریش کا عام کھانا گوشت روٹی تھا اور روٹی گیہوں کی ہوتی تھی۔ اگرچہ گیہوں بلکہ کسی بھی جنس یا غلہ کی پیداوار مکہ کی ''وادی غیر ذی زرع'' میں نہیں ہوتی تھی تاہم وہ فضلِ الٰہی سے شہر مقدس پہونچتی رہتی تھی۔ ان اجناس بلکہ قرآنی الفاظ میں ''ثمرات کل شی'' (ہر شے کے ثمرات) میں گیہوں بھی شامل تھا اور سب سے اہم جنس تھا۔ وہ بالعموم شمال مشرقی علاقے یمامہ سے مکہ مکرمہ میں درآمد کیا جاتا تھا جو پورے عرب کے لیے گیہوں کا گودام وخزینہ تھا۔ شام کے نبطی تاجر اور دوسرے تجارِ غلہ بھی گیہوں مکہ و مدینہ لایا کرتے تھے اور خاص میدہ یا سفید آٹا بھی درآمد کیا کرتے تھے جو عربی روایات میں ''الدرمک'' کہا جاتا تھا۔ وہ بہت مقبول و پسندیدہ کھانا تھا اور بعض اصحاب وطبقات تو اس کا بے صبری سے انتظار کرتے

تھے۔ وہ خاصا مہنگا کھانا تھا اور صرف مالدار و متمول لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے اور عام لوگ اس کی خاص قیمت نہیں دے سکتے تھے۔ شعب ابی طالب/ بنی ہاشم کے محاصرے کے دوران حضرت حکیم بن حزام اسدیؓ وغیرہ کے محاصرین بالخصوص حضرت خدیجہؓ کے لیے گیہوں پہونچانے کا ذکر ملتا ہے۔ بہرحال مدینہ کے لوگ بھی گیہوں کی روٹی استعمال کر ہی لیتے تھے تاہم وہ ان کی عام غذا نہ تھی، نہ مدنی دور میں غذائے نبوی تھی۔

(بخاری، کتاب المغازی وغیرہ، باب وفد بنی حنیفة و حدیث ثمامة بن اثال: "...والله لایاتیکم من الیمامة حبة حنطة حتی یاذن فیها النبی ﷺ"۔ شام کے ضافطہ کے گیہوں کا آٹا وغیرہ لانے کا ذکر ملتا ہے: ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، من سورة النساء: ... فقدمت ضافطة من الشام ...من الدرمک ... الخ؛ ابن ہشام، السیرة، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ۲/ ۶۳۹: فانکم تحتاجون الی الیمامة لطعامکم الخ ؛ نیز ۱/ ۳۵۴، ۳۷۴-۳۷۵ وما بعد: ہشام بن عمرو عامری کے لیے)

رسولِ اکرم ﷺ نے گیہوں کی روٹی اور اس پر مشتمل دوسرے کھانے مکی اور مدنی دونوں ادوار میں تناول فرمائے تھے، شاید مکہ مکرمہ میں زیادہ اور مدینہ منورہ میں کم۔ اس ضمن میں ایک حدیثِ حضرت عائشہ صدیقہؓ بہت اہم ہے۔ فرماتی ہیں کہ خاندانِ محمد ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد گیہوں پر مبنی کھانا تین رات مسلسل پیٹ بھر کر نہیں کھایا: "ماشبع آل محمد ﷺ منذ قدم المدینة من طعام البرّ ثلاث لیال تباعا حتی قبض"۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب ما کان النبی ﷺ و اصحابه یاکلون: ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: "من خبز بر مادوم ثلاثة ایام" (یعنی تین دنوں تک شوربہ کے ساتھ گیہوں کی روٹی)؛ مسلم، کتاب الزهد والرقاق، باب کیف کان عیش النبی ﷺ و اصحابه؛ نیز ابوداؤد، ترمذی، نسائی وغیرہ کے ابوابِ زہد)

اس قسم کی تمام احادیث میں تین چار نکات قابلِ لحاظ ہیں: ایک مدینہ میں پیٹ بھر کر نہیں تناول فرمایا کہ حضرت عائشہؓ وغیرہ اسی دور کے راوی تھے، دوسرے یہ کہ تین دنوں تک مسلسل نہیں کھایا۔ وقفوں سے تناول فرمایا، تیسرے یہ کہ مکہ مکرمہ میں گیہوں کی روٹی تناول فرماتے تھے جیسا کہ اکابرِ قریش کا معاملہ تھا، چوتھے پیٹ بھر سے مراد فقر و فاقہ نہیں قلتِ طعام ہے کہ سنت و تعلیم یہی ہے کہ تھوڑی بھوک رکھ کر کھایا جائے اور پیٹوؤں کی مانند حلق تک نہ بھر لیا جائے۔ ان روایات سے بھی اور دیگر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں اشرافِ قریش کی مانند طعامِ نبوی گیہوں کی روٹی ہی پر مشتمل تھا۔

چپاتی (خبز مرقق)

حضرت انس بن مالکؓ خادم صحابی نبوی کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے پتلی روٹی / چپاتی اور بھنی ہوئی بکری کبھی نہیں کھائی: ''ما اکل النبی ﷺ خبزا مرققا، ولا شاة مسموطة حتی لقی اللہ...'' دوسری روایت ہے: ولا خُبز له مرقق قط...'' یعنی آپ ﷺ کے لیے کبھی چپاتی یا باریک روٹی پکائی ہی نہیں گئی، یہ ایک قسم کی روایات ہیں۔

(بخاری، کتاب الاطعمہ، باب الخبز المرقق، باب ما کان عیش الخ ؛ نیز کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش ... کتاب الاطعمة میں اور دوسرے مقامات پر بھی روٹی کی شرح میں ''رغیفا مرققا'' کی وضاحت ملتی ہے جو باریک اور میدے کی ہوتی تھی۔ ترمذی، ابواب الاطعمة، باب ماجاء فی ما کان النبی ﷺ یاکل ؛ فتح الباری، ۹/۶۵۶ و مابعد۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے خبز مرقق کی تشریح قاضی عیاضؒ کی تشریح سے کی ہے: وہ نرم اور عمدہ روٹی ہوتی ہے جیسے میدے وغیرہ کی روٹی ''مرققا ای ملینا محسنا کخبز الحواری وشبهه'' ۔ ابن اثیر کے مطابق وہ طویل روٹی ہوتی تھی اور رغیف باریک چوڑی روٹی ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ بھی دوسری تشریحات بعض شارحین واماماںِ لغت سے مروی ہیں جن میں خاصا اختلاف ہے)

حُواریٰ کو ''النقی'' بھی کہا جاتا تھا۔ ترمذی میں حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ کی ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ''النقی'' یا ''حواری'' کی روٹی کبھی تناول نہیں فرمائی: ''النقی یعنی الحواری، ... ماری رسول اللہ ﷺ النقی حتی لقی اللہ..'' اس کے آگے آٹا گوندھنے وغیرہ کی ترکیب ہے جس کا ذکر اپنے مقام پر آتا ہے۔

(ترمذی، ابواب الزھد، باب فی معیشة النبی ﷺ ..؛ دیگر کتبِ حدیث میں بھی حواریٰ یا النقی کا ذکر ملتا ہے)

- حضرت ام سلیمؓ نے بہرحال رسول اکرم ﷺ کے لیے روٹی پکائی اور اس میں تھوڑا مکھن / گھی بھی ملا دیا۔ یہ دعوت کا واقعہ ہے۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، باب الخبز الملبق بالسمن، حدیث: ۳۳۴۲ نیز ۳۳۴۱ جس میں خواہش کا اظہار ہے)

بہرحال ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے لیے ان کی انا حضرت ام ایمن

برکتہ حبشیہؓ نے ایک بار چپاتی روٹی (رغیف) پکائی تھی۔ آٹے کو چھلنی سے چھان کر پکائی اور پیشِ خدمت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ حضرت ام ایمن نے عرض کیا: یہ کھانا ہم اپنے علاقے میں بناتے ہیں، میں نے چاہا کہ آپ کے لیے بھی اس طرح چپاتی پکا دوں: ''...انها غربت دقيقا، فصنعته للنبی ﷺ رغیفا، فقال ماهذا؟ قالت: طعام نصنعه بارضنا، فاحببت ان اصنع منه لک رغیفا...''۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمة، باب الحوّاری، حدیث: ۳۳۳۶؛ آپ نے بہر حال وہ نہیں کھائی اور چوکر ملا کر آٹا گندھوایا...)

خبّاز (روٹی پکانے والے)

گھروں میں بالعموم خواتین روٹی پکاتی تھیں اور اس کے لیے خاص قسم کے پتھروں کے چولھے ہوتے تھے: گھریلو چولھوں کے علاوہ سانجھا چولھے کی روایت بھی عرب سماج اور اسلامی مدنی معاشرے میں کم از کم موجود تھی محلّہ کا ایک مشترکہ تنور ہوتا تھا جہاں اردگرد کے گھروں کے لوگ بالخصوص عورتیں اپنا اپنا آٹا لے کر آتی تھیں اور وہاں باری باری سے اپنی اپنی روٹیاں پکاتی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کا مشترکہ چولہا یا تنور ایک صحابیہ کے ساتھ تھا، ان کا اسم گرامی تھا: بنت الحارث بن النعمان بقول امام ابوداؤد، اور امام ابن اسحاق نے صراحت کی ہے کہ ان کا نام ام ہشام بنت حارثہ بن النعمان انصاریؓ تھا: ''... كان تنور رسول الله ﷺ وتنّور نا واحد...''۔

(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الرجل يخطب علىٰ قوس، حدیث: ۱۱۰۰؛ ابن ہشام وغیرہ دوسرے مآخذ میں بھی اس کا ذکر ہے)

ان گھریلو خواتین کے علاوہ بعض پیشہ ور روٹی پکانے والے بھی ہوتے تھے جن کا تعلق دونوں صنفوں سے تھا۔ مرد روٹی پکانے والے کے لیے لفظ ''خباز'' آتا ہے اور عورت روٹی پکانے والی کے لیے ''خابزۃ'' کا لفظ ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجرت پر روٹی پکانے والے بھی تھے اور خاص اکابر کے ملازم روٹی پکانے والے بھی۔ حضرت انس بن مالکؓ کی جس حدیث میں رسول اکرم ﷺ کے رومالی روٹی نہ کھانے کی صراحت ملتی ہے اس کے شروع میں راوی گرامی

حضرت قتادہؒ کے بیان کے مطابق اس بیان کے وقت ان کے پاس ان کا ''خباز'' موجود تھا: ''کنا عند انس، وعنده خبازٌ له'' ۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے دوسری کتبِ حدیث مثلاً ابن ماجہ، طبرانی وغیرہ سے مزید تفصیلات فراہم کی ہیں اور بیان کیا ہے کہ حضرت انسؓ کا ایک غلام، جوان کے لیے عمدہ کھانے اور دو طرح / رنگ کے سالن پکاتا تھا، وہ ان کی میدے کی روٹیاں پکایا کرتا تھا۔ حواریٰ وہ میدہ تھا جو بار بار چھانا جاتا تھا تاکہ نرم ہو جائے اور اس میں مکھن بھی گوندھتے وقت ڈالا جاتا تھا۔ بعض علاقوں میں اس کو روغنی روٹی کہا جاتا ہے اور وہ بہت عمدہ ہوتی ہے: ''کان لانس غلام یعمل له النقانق ویطبخ له لونین طعاما ویخبز له الحواری ویعجنه بالسمن. والحواریٰ الخالص الذی ینخل مرة بعد مرة'' (فتح الباری، ۹/ ۶۵۷-۶۵۸)

روٹی پکانے والی خواتین

احادیث وروایات سے واضح ہوتا ہے کہ عرب معاشرے میں خاص روٹی پکانے والیوں کا ایک طبقہ تھا۔ وہ پیشہ ور طبقہ تھا اور اجرت پر روٹیاں پکاتا تھا۔ ان خواتین کو بالعموم غیر معمولی حالات میں طلب کیا جاتا تھا۔ اور زیادہ کھانے والوں کے لیے ان کو بلا کر ان سے روٹیاں پکوائی جاتی تھیں۔ ایسا دعوتوں میں بالعموم ہوتا تھا۔ غزوۂ خندق کے دوران جب حضرت جابر بن عبداللہ خزرجیؓ نے رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے اصحابِ کرام کی دعوت کی تو کھانا پکانے والی صرف ان کی اہلیہ تھیں۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ ان کی مدد کے لیے ایک روٹی پکانے والی (خابزہ) کو بھی بلالیں۔ خاتونِ خانہ کے ساتھ وہ خابزہ بھی روٹی پکاتی گئی اور تنور سے رسول اکرم ﷺ روٹیاں نکالتے گئے اور ان پر سالن رکھ کر یا پلیٹوں / پیالوں میں انڈیل کر صحابہ کو دیتے گئے: ''...ثم قال علیہ السلام : ادع خابزة فلتخبز معی واقدحی من برمتکم...''

(حدیث بخاری: ۴۱۰۲، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق ؛ فتح الباری، ۷/ ۴۹۴-۴۹۷: حافظ موصوف نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا ہے)

روٹی پکانے والی (خابزہ) کا یہ طبقہ عام حالات میں بھی روٹی پکاتا تھا۔ گھروں میں سالن پکالینا عام معمول رہا ہے۔ خواتینِ خانہ بالعموم گوشت، سبزی وغیرہ گھروں میں خود پکالیتی تھیں اور

روٹی ان خواتینِ خاص سے پکوالیتی تھیں۔ یہ شرفاء اور مالدار طبقات کا ہی وطیرہ اور معمول نہ تھا اور نہ آج ہے بلکہ اوسط درجہ کے گھرانوں کا بھی طریقہ ہے۔ روٹی پکانا خاصا مشکل، محنت طلب اور پریشان کن کام ہے۔ اسی ضرورت سے ان خاص روٹی پکانے والی خواتین کا طبقہ وجود میں آ گیا تھا۔ ان میں غلام/ باندی بھی ہوتی تھیں اور آزاد اجرت پر کام کرنے والی عورتیں بھی۔ ''خابزہ'' پر ابھی مفصل تحقیق باقی ہے جو معاشی/ اقتصادی زندگی کا مطالعۂ خاص ہے۔ لیکن حدیثِ نبوی اور اس کی شروحِ شارحین سے بہرحال اس خاص اجیر طبقہ کے وجود اور کارفرمائی کا ثبوت عہد نبوی سے ملتا ہے۔

بیتِ نبوی میں کھانا پکانا

ازواجِ مطہرات کے کاشانوں میں کھانے پکانے کے واقعات کا ذکر بہت سی روایات میں ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری قسم کی روایات واحادیث بھی ہیں جن میں فقر و فاقہ کی زندگی اور گھروں میں مدتوں چولھا نہ جلنے کا ذکر آتا ہے اور ان ہی غربیا مئو روایات پر خاص نقطۂ نظر سے زیادہ زور دیا گیا ہے، حالانکہ وہ اسلامی زندگی کا دوسرا پہلو ہے اور اصل پہلو وہی ہے جس میں کھانے کو نعمتِ الٰہی سمجھنے کا مفہوم و معنی پایا جاتا ہے۔ بہرحال ان واقعاتِ طعام نبوی کا ایک ذکر یہاں پیش کیا جاتا ہے تاکہ دونوں پہلو اجاگر ہو جائیں اور کاشانۂ نبوی کے تمدن کا یہ عکس بھی سامنے آ جائے۔

گھروں میں آٹا گوندھنا

۱۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے واقعۂ افک کے ضمن میں ذکر آتا ہے کہ وہ آٹا گوندھ کر رکھ دیتی تھیں اور کمسنی اور بھولے پن میں سو جاتی تھیں اور بکری آ کر اس آٹے کو کھا جاتی تھی۔
حضرت ام المومنین کے کھانا پکانے کے ضمن میں یہ ذکر بھی آتا ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کو جو سامان رسول اکرم ﷺ نے شادی پر دیا تھا اس میں آٹا گوندھنے کا ایک برتن تھا۔

(بلاذری، ۱/۴۳۱: وجفنة تعجنين...الخ)

۲۔ اس واقعہ میں حضرت ام مسطحؓ کے آٹا گوندھنے کا ذکر ہے۔

۳۔ مشترکہ تنور/ سانجھا چولھا کا واقعہ بھی گھروں میں آٹا گوندھنے کے واقعہ کو ثابت کرتا ہے۔

۴۔ حضرت زینب بنت جحشؓ کو حضرت زید بن حارثہ کلبیؓ کے طلاق دینے کے بعد جب عدت گذر گئی تو رسول اکرم ﷺ نے ان کو حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا تا کہ ذکرِ نبوی ان کے سامنے کریں۔ حضرت زیدؓ حسبِ ارشاد حضرت زینبؓ کے گھر گئے تو وہ اپنے گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر اٹھا رہی تھیں: "... وھی تخمرّ عجینھا ..."۔

(مسلم، کتاب النکاح، باب زواج زینب بنت جحش الخ، حدیث: ۸۹ (۱۴۲۸)؛ ان کے ولیمہ میں روٹی گوشت کا ذکر آتا ہے)

۵۔ امہات المومنین اور ان کی باندیوں کے علاوہ متعدد دوسرے صحابہ کرام اور صحابیات کے گھروں میں آٹا گوندھنے کے واقعات کا ذکر آتا ہے خاص کر رسولِ اکرم ﷺ کی دعوتوں کے ضمن میں یا کسی دوسرے نبوی حوالے سے جیسے حضرت جعفرؓ کی شہادت کی خبر پاکر رسول اکرم ﷺ ان کی بیوہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے پاس تعزیت کے لیے تشریف لے گئے تو وہ چالیس من آٹا پیس چکی تھیں اور اپنا آٹا گوندھ چکی تھیں: وقد دبغت اربعین مناً ... وعجنت عجینی ...الخ"

(ابن ہشام، ۱/ ۳۸۰-۳۸۲، اول الذکر جملہ کا مفہوم بہت واضح نہیں ہے)

گھر میں روٹی پکانے کے واقعات

معمول کے کھانوں اور روزانہ کی دونوں غذاؤں کے لیے روٹی پکانے کا دستور گھریلو معلوم ہوتا ہے۔ عام طور سے گھر کی خواتین- بیٹیاں، بیویاں اور خادمائیں- اپنے اپنے گھروں میں ہی چولھے پر روٹی پکا لیتی تھیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں وقت روٹیاں پکائی جاتی تھیں یا صرف ایک وقت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت روٹی پکانے کا رواج تھا، اگر ضرورت ہوتی تھی تو دونوں اوقاتِ طعام میں روٹیاں پکائی جاتی تھیں ورنہ بچی ہوئی روٹیوں یا روٹی کے ٹکڑوں سے کام چلا لیا جاتا تھا۔ ان کے لیے قرص/ اقراص کے الفاظ آتے ہیں۔

نبوی کاشانوں میں اور بعض ازواجِ مطہرات کے روٹی پکانے کے بعض واقعات کا ذکر ملتا ہے:

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے مہمانوں کے لیے کھانا (روٹی/ سالن) پکایا اور حضرت حفصہؓ نے بھی پکایا۔ موخر الذکر نے منتظر مہمانوں کے لیے کھانا جلد بھیج دیا تو حضرت عائشہؓ کو غصہ آ گیا۔ اس کا ذکر آگے ہدایائے طعام میں آتا ہے۔

- کاشانۂ حضرت عائشہ صدیقہؓ میں حضرت بریرہؓ آٹا گوندھ کر رکھ دیتی تھیں کہ بعد میں روٹی پکائیں گی اور حضرت عائشہؓ سے عرض کرتی تھیں کہ وہ اس کی دیکھ بھال رکھیں لیکن وہ کمسنی کی نیند سو جاتی تھیں اور بکری آ کر اسے کھا جاتی تھی: "... كنت اعجن عجيني: فآمرها أن تحفظه فتنام عليه، فتاتي الشاه فتاكله" (ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۳۰۱)

- حضرت زینب بنت جحشؓ سے شادی کے واقعہ میں ان کے آٹا گوندھنے اور روٹی پکانے کا قرینہ ہے اور ثبوت بھی۔

- رسولِ اکرم ﷺ کے مہمانوں، وفود کے ارکان اور بھوکے اہل صفہ اور صحابہ کو کھانا کھلانے کے بیان میں بعض ازواجِ مطہرات کے گھروں میں روٹی پکانے کا واضح ذکر متعدد روایات میں ملتا ہے۔ بعض دوسری احادیث میں کھانا پکانے کے ساتھ اس کے قرائن ملتے ہیں۔

- حضرت فاطمہ بنت رسول اکرم ﷺ ہمیشہ اپنے گھر میں کھانا پکایا کرتی تھیں۔ ان کے بعض واقعات بہت مشہور ہیں: حدیثِ ابوداؤد-۱۷۱۶: کے مطابق حضرت زہراؓ نے اپنے بھوکے فرزندوں کے لئے روٹی پکائی تھی اور گوشت بھی پکایا تھا: "... فعجنت، ونصبت، وخبزت... الخ"۔ یہ صرف ایک دن کا واقعہ نہیں ہے۔ بتولِ اہل بیتؓ کے بارے میں واضح طور سے ثابت ہے کہ وہ چکی چلا کر جو/ گیہوں پیستی تھیں، آٹا گوندھتی تھیں اور کھانا پکایا کرتی تھیں۔ رسول اکرم ﷺ کی بعض مواقع پر دعوت کی اور اس میں بھی کھانا/ روٹی پکائی تھی۔

- غزوۂ خندق کے دوران رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی کم از کم دو دعوتیں ہوئی تھیں: ایک حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اور دوسری حضرت جابرؓ کے گھر میں۔ اور ان دونوں گھروں میں دونوں خاتونانِ بیت نے روٹی پکائی تھی جس کا ذکر گذر چکا۔

- دوسری مختلف دعوتوں میں رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے متعدد کو میزبان گھروں کی خواتین نے روٹیاں گھر میں پکا کر کھلائی تھیں۔ ان میں شامل تھیں:

-حضرت ابوالھیثم بن التیہان انصاریؓ کی زوجہ مطہرہ۔

- حضرت ام سلیم بنت ملحانؓ اور ان کی بہن حضرت ام حرام بنت ملحانؓ جو قباء میں رہتی تھیں۔

- ان کے علاوہ متعدد دوسری خواتین وصحابیات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے شواہد آگے آتے ہیں۔

دراصل روٹی پکانا یا پورا کھانا - روٹی گوشت/ سالن - تیار کرنا ایک گھریلو سماجی روایت تھی اور ایک معاشرتی حقیقت بھی۔ اس کے تاریخی ثبوت بہت ہیں اور اگر نہ بھی ہوتے تو بھی یہ ایسا عام واقعہ ہے جسے کسی ثبوت وشہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ بطور مثال ایک دو واقعات اور مختصراً بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت حفصہ اور حضرت عائشہؓ کے کھانا پکانے کے واقعات صحابہ کرام کی دعوتوں اور ہدایائے طعام میں آتے ہیں۔

۲۔ حضرت صفیہؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بہت عمدہ کھانے پکاتی تھیں اور رسول اکرم ﷺ کو ان کے کھانے بہت پسند تھے۔

جو کو پیسنے اور پھر اس سے روٹی بنانے کے واقعات میں بسا اوقات کھانے پکانے کے پورے عمل کا ذکر مل جاتا ہے جیسا کہ حضرت ام سلیمؓ اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی بیوی کے غزوۂ خندق کے دوران پکانے کے ضمن میں آتا ہے۔ اس پورے عمل کے بعض اور واقعات خاص احوال یا تاریخی تناظر میں مزید ملتے ہیں جیسے ایک واقعہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی شہادت کے بعد کا ملتا ہے جب رسول اکرم ﷺ نے ان کے گھر وفات کا کھانا بھیجنے کا حکم فرمایا تو خاص رسول اکرم ﷺ کی خادمہ حضرت سلمیٰؓ نے حکم سن کر جو لیے اور ان کو پیسا، پھر ان کو صاف کر کے آٹا گوندھا اور اس کو پکایا اور تیل ڈال کر اس کو شوربہ دار بنایا اور پھر اوپر سے اس پر مرچ ڈالا: ''...

عمدت سلمیٰ خادمة إلیٰ شعیر فطحنته، ثم نسفته، ثم أنضجته، وادمته بزیت، وجعلت علیه فلفلا'' (واقدی، ۷۶۷)

-اسی طرح فتحِ مکہ میں رسول اکرم ﷺ کے لیے زادِ راہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تیار کیا

تھا بلکہ دوران سفر کرتی تھیں اور اس کے لیے وہ گیہوں کا ستو بناتی تھیں یا آٹا اور کھجور ملا کر کھانا تیار کر دیتی تھیں: ''...عائشة تعمل قمحا سویقا و دقیقا تمرا...'' (واقدی، ۷۹۶)

-ایک اور زادِ راہ کا ذکر غزوۂ تبوک کے حوالے سے ملتا ہے۔ حضرت واثلہ بن اسقع لیثیؓ نے جب سفرِ تبوک کا ارادہ کیا تو ان کی بہن نے ایک مدآٹا لیا اور اس آٹے کو ایک ڈول میں گوندھا اور ان کو کچھ کھجوریں بھی دیں: ''فاعطت ... مدا من دقیق فعجن الدقیق فی الدلو و اعطته تمرا فأخذه. (واقدی، ۱۰۲۸)

گوشت اور سبزی پر مشتمل کھانے

شوربہ

گوشت میں شوربہ بھی ہوتا تھا جس کو روایات میں ''المرق'' کہا گیا ہے اور امام بخاری وغیرہ نے اس پر خاص باب باندھا ہے۔ یہ پیاز وغیرہ مصالحوں پر مشتمل شوربہ بھی ہوتا تھا اور ان کے علاوہ ان میں سبزی ڈال کر بھی سالن بنالیا جاتا تھا۔ اس کا مفصل ذکر کھانا پکانے کی ترکیب کی فصل میں کیا گیا ہے۔ یہاں گوشت کے ساتھ بعض سبزیوں کے ساتھ پکے ہوئے سالن کا ذکر بعض روایات و احادیث کے حوالے سے کیا جارہا ہے۔ ویسے عام سالن کے لیے لفظ ادام/ ادم احادیث میں آتا ہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب المرق؛ فتح الباری، ۹/ ۶۹۶؛ باب الادم؛ فتح الباری، ۹/ ۶۸۷ و مابعد؛ نیز مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کتبِ حدیث کے مختلف ابوابِ ''سالن'' / ادام/مرق)

۱۔ حدیثِ بخاری: ۵۴۳۶ کے مطابق خیاط صحابی نے رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت انس کی دعوت میں جو کھانا کھلایا تھا اس میں جو کی روٹی کے ساتھ شوربہ شامل تھا جو لوکی اور سوکھے گوشت پر مشتمل تھا: ''...فقرّب خبزَ شعیر ومرقا فیه دباء وقدید''۔ اس واقعہ کی متعدد روایات ہیں اور ان میں تفصیلات خاصی مختلف ہیں۔

-فتح الباری کی اسی شرحِ حدیث میں اس حدیث کا حوالہ بھی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت پکانے والی خاتونوں کو ہدایت فرمائی تھی کہ جب گوشت پکائیں تو

اس میں شوربہ بڑھا دیا کریں تا کہ پڑوسیوں کو ہدیہ بھیج سکیں: ’’واذا طبخت قدراً فاکثر مرقته، واغرف لجارک منه‘‘ (نیز مسند احمد بحوالہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ)

-مسلم اور اصحاب السنن کے حوالے سے صفۃ الحج کے باب میں حافظ ابن حجر نے ایک اور روایتِ شوربہ بیان کی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ہر ایک اونٹ سے تھوڑا سا گوشت لیا اور اس کو پتیلی/ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا۔ پھر رسول اکرم ﷺ اور حضرت علیؓ نے اس کا گوشت کھایا اور اس کا شوربہ پیا: ’’فاکل رسول اللہ ﷺ وعلیؓ من لحمها وشربا من مرقها‘‘۔

-شوربے کے دوسرے شواہد اور واقعات بھی احادیث میں ملتے ہیں اور ان کا حوالہ گذر بھی چکا اور آگے بھی آ رہا ہے۔

طَفَیشَل نامی شوربہ

رسولِ اکرم ﷺ کے پسندیدہ ترین کھانوں میں ایک طفیشل نامی بھی تھا۔ اس کا ذکر اولین مدنی قیام کے زمانے کے دوران آتا ہے۔ حضرت ابوایوبؓ کے گھر میں آپ ﷺ کا قیام سات ماہ رہا اور حضرت ام ایوبؓ کے بیان کے مطابق، جو اصلاً ان کے شوہر نامدار حضرت ابوایوب انصاریؓ کا بیان ہے، کہ انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک رات کھانا کھایا اور اس کھانے میں حضرت سعد بن عبادہؓ کا بھیجا ہوا بڑا پیالہ (قصعۃ) تھا جس میں ’’طفیشل‘‘ تھا۔ حضرت ابوایوبؓ نے آپ ﷺ کو اسے اتنی رغبت سے کھاتے دیکھا کہ کسی اور کھانے کو اتنی رغبت سے کھاتے نہ دیکھا تھا لہٰذا ہم نے بھی اسے آپ ﷺ کے لیے بنانا شروع کر دیا: ’’...انه تعشى معه ليلة من قصعة ارسل بها سعد بن عبادة، فيها طَفَيشل... فرآه ينهكها نهكا لم يره ينهك غيرها، فكنا نعملها له...‘‘ (بلاذری، ۱/۲۶۷)

انساب الاشراف کے محقق گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے تاج العروس سے اس کی تعریف نقل کی ہے: ’’هو نوع من المرق معروف‘‘ یعنی وہ شوربہ کی ایک معروف قسم ہے۔ لیکن اس سے اس کی نوعیت نہیں معلوم ہوتی ہے۔

ثریدِ لحم

لغوی اعتبار سے ثرید: ثرد سے بنا ہوا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: روٹی کو توڑ کر شوربے میں تر کرنا (مصباح اللغات)۔ وہ عرب کھانوں میں سب سے زیادہ مرغوب و محبوب تھا اور رسول اکرم ﷺ نے اسے تمام کھانوں میں افضل بتایا ہے۔ احادیثِ متعددہ بتاتی ہیں کہ پسندیدہ ترین کھانوں میں ثرید بھی تھی جو روٹی وغیرہ مختلف چیزوں سے بنتی تھی۔ اس کی ترکیب کا ذکر الگ فصل میں آرہا ہے۔ یہاں چند روایات و احادیث ثرید کی فضیلت و محبوبیت کے علاوہ کھانے کھلانے کے بارے میں ذکر کی جارہی ہیں، ان سے بہرحال یہ معلوم ہوتا ہے کہ ثرید دو قسم کی ہوتی تھی: ایک گوشت والی، دوسری بلا گوشت والی۔ ان دونوں کی دوسری اقسام بھی تھیں جو ان کے ترکیبی اجزاء پر مشتمل ہوتی تھیں۔ پہلے افضلیت و محبوبیت کی احادیث:

(بخاری، کتاب الاطعمة، حدیث: ۵۴۱۸-۵۴۱۹: ... کفضل الثرید علی الطعام'' ؛ فتح الباری، ۹/۶۸۲ومابعد؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الثرید، حدیث: ۳۷۸۳: ''کان احب الطعام الیٰ رسول اللّٰہ ﷺ الثرید من الخبز...'' بہرحال موخرالذکر حدیث میں ثرید اور روٹی یا روٹی پر مشتمل ثرید کا ذکر اسے ایک خاص قسم بتارہا ہے)

ثرید کھانے کے واقعات اور روایات کی تعداد بھی کافی ہے کیونکہ محدثین نے ان کا خاص باب بھی باندھا ہے اور دوسری کتب و ابواب میں بھی ثرید کھانے کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنے بابِ ثرید میں مذکورہ بالا دو احادیث ثرید کی فضیلت میں اور تیسری: ۵۴۲۰ ثرید کھانے کے واقعہ کے طور پر بیان کی ہیں۔ اس میں غلام/خیاط کی دعوت کا بیان ہے جو لوکی/ترئی (الدباء) پر مشتمل تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرح میں فضیلت کی دوسری روایت دی ہیں مگر کھانے کی نہیں دیں۔ اس خیاطی ثرید کے اجزاء ترکیبی پر روایات و احادیث میں بڑا اختلاف یا تنوع ملتا ہے، جیسا کہ ذیل کی احادیث سے پتہ چلتا ہے:

۔مسلم کی ایک حدیث: ۳۲۸ میں ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے ثرید اور گوشت کا پیالہ رکھا گیا تو آپ ﷺ نے دست تناول فرمائی کہ بکری کے گوشت میں وہ

سب سے زیادہ محبوب تھی: "وُضِعت بین یدی رسول اللہ ﷺ قصعة من ثريد ولحم فتناول الذراع وكانت احب الشاة اليه"۔

- حدیثِ ابن ماجہ: ۳۳۰۳ میں ہے کہ ایک مولائے نبوی کی دعوت میں جو کھانا پیش کیا گیا اس میں گوشت اور کدو کی ثریدہ تھی: "وصنع ثريدة بلحم وقرع"۔ رسولِ اکرم ﷺ کو کدو (قرع) لوکی (الدباء) بہت پسند تھیں۔ یہ غالباً خیاط کی دعوت کا واقعہ ہے۔

- ابوداؤد کی حدیث: ۳۷۸۳ سے واضح ہوتا ہے کہ ثرید دو قسم کی ہوتی تھی جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے محبوب تھیں: ایک روٹی کی ثرید ہوتی تھی اور دوسری حیس کی ثرید: "كان ... الثريد من الخبز والثريد من الحيس"، مذکورہ بالا

- ترمذی کی ایک روایت ہے کہ کاشانۂ حضرت ام سلمہؓ میں حضرت عکراش وغیرہ کی ضیافت جس کھانے سے کی گئی تھی اس میں غالب حصہ ثرید کا تھا: "... فأتينا بجفنة كثيرة الثريد والوذر ..." (گوشت کے چھوٹے ٹکڑوں پر مبنی تھی)۔

(ابواب الاطعمة، باب فی التسمية على الطعام)

- ثرید کا ایک اہم ترین واقعہ ہدایائے طعام کے باب میں مفصل بیان کیا گیا ہے اور اس کا تعلق آغاز دور مدنی سے ہے جب رسول اکرم ﷺ مدینہ میں مہمان خانہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے اتر کر اپنے مسکنوں میں آ بسے تھے۔ اس دوران حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ کے گھر سے روزانہ ایک عظیم وکبیر پیالہ/جفنہ آتا تھا جس میں اکثر وبیشتر ثریدِ لحمی ہوتی تھی۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہؓ اور بعض دوسرے انصاری صحابہ کے گھروں سے ثرید کے ہدایا آتے تھے کہ وہ آپ ﷺ کا محبوب کھانا تھا۔ ان دونوں مسلسل ہدایائے طعام میں بیشتر اوقات ثرید میں گوشت کے ٹکڑے ضرور شامل ہوتے تھے: "واكثر ذلك اللحم"۔ البتہ اس کے علاوہ دوسری اقسامِ ثرید بھی تھیں جو غیر لحمی تھیں اور ان کا ذکر اپنے مقام پر آتا ہے۔ (ابن سعد، ۳/۶۱۴ وغیرہ)

- ابوداؤد کی حدیث: ۳۷۷۳ میں حضرت عبداللہ بن بُسر مزنیؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا پیالہ (قصعة) تھا جس کو "الغرّاء" کہا جاتا تھا اور اس کو اٹھانے کے لیے چار آدمی/مردانِ کار درکار ہوتے تھے۔ جب کبھی قربانی ہوتی تو اس کا گوشت اس عظیم

پیالے میں ڈالا جاتا اور اس کی ثرید بنائی جاتی :"وقد ثرِدَ فیھا"۔ پھر وہ پیالہ لایا جاتا اور لوگ اس پر جھپٹ پڑتے۔ جب لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تو رسولِ اکرم ﷺ نیچے جھک کر بیٹھ جاتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اس پیالے کے کناروں سے کھاؤ اور اس کا درمیانی مینار (ذروتھا) چھوڑ دو کہ برکت اسی میں اترتی ہے۔

(کتاب الاطعمۃ، باب ماجاء فی الاکل من اعلی الصفحۃ: اس میں بعض دوسری جہاتِ تعلیم بھی ہیں)

-حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سماج کے کمزور طبقات- بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں- کے لیے غداء میں ایک بڑا پیالۂ ثرید تیار کرتے تھے اور ایک عشاء کے لیے :... جفنۃ من ثرید غدوۃ وجفنۃ عشیۃ للارامل والیتامیٰ والمساکین" (ابن سعد، ۴/۲۹۹)

-حضرت ابوالھیثم بن التیہانؓ کی ایک اور دعوت زیارت میں ثرید تھی جس میں اوپر عراق (ہڈی کا گوشت) تھا (بلاذری، ۱/۵۳۵)

حشیشہ/ دشیشہ

خزیرہ نامی کھانے سے متعلق روایات واحادیث میں کافی اختلافاتِ لفظی ومعنوی کے علاوہ کھانے کے نام وقسم کے بارے میں بھی ملتے ہیں اور شارحین نے ان کی تشریح وتعریف بھی کی ہے۔ ان میں سے ایک حدیثِ مسلم: ۲۶۵ ہے جس میں اس کا نام "حشیشہ" ہے اور اس کی شرح میں دوسرا نام "دشیشہ" بھی لکھا گیا ہے اگرچہ وہ قولِ ضعیف بھی بتایا گیا ہے۔ شرح میں یہ لکھا گیا ہے کہ گیہوں کو خوب پیسا جاتا ہے تاکہ باریک ہو جائے اور وہ پھر پتیلی/ ہانڈی میں ڈالا جاتا ہے اور اس پر گوشت یا کھجور ڈالی جاتی ہے: "حشیشۃ: ھی ان تطحن الحنطۃ طحنا جلیلا ثم تجعل فی القدور ویلقی علیھا لحم او تمر، وقد یقال لھا: دشیشۃ"۔ اس طرح اس کھانے کی دو قسمیں- لحمی یا غیر لحمی- بن جاتی ہیں۔ کھجور اور گیہوں کے آٹے کا آمیزہ اسے غیر لحمی طعام کے خانے میں لے جاتا ہے۔ بہرحال خزیرہ کے بارے میں مختلف تشریحات سے اس کا لحمی اور غیر لحمی دونوں ہونا معلوم ہوتا ہے اور بعض تشریحات میں وہ خزیرہ ہی کی ایک قسم لگتی ہے۔

-کاشانۂ نبوی میں اصحابِ صفہ کی ایک دعوتِ نبوی میں "حشیشہ" نامی کھانا پیش کیا گیا

تھا۔ حضرت عائشہؓ نے اس کے بعد "حیسہ" نامی کھانا بھی فرمائشِ نبوی پر کھلایا جو ثرید کی طرح تھا، اس کے بعد دودھ کے پیالوں سے تواضع کی تھی: "...فجاء ت بحشیشة فأكلنا، ثم قال : يا عائشة: أطعمينا، فجاء ت بحيسة مثل القطاة، فأكلنا...الخ"

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب في الرجل ينبطح علىٰ بطنه ؛ حدیث: ۵۰۴۰؛ ابن ماجہ، کتاب المساجد والجماعات، باب النوم في المسجد ..." حدیثِ ابوداؤد حشیشہ کے باب میں حدیثِ مسلم کی تائید کرتی ہے اور اس میں مذکور دوسرا کھانا حیسہ/حیس ہے جس پر الگ بحث ہے کیونکہ حیس/حیسہ/ حساء میں گوشت یا اس کے پارچے شامل نہیں ہوتے تھے، وہ غیر لحمی کھانا تھا اور اس کی ترکیب پر بحث الگ آتی ہے)

خزیرہ

بخاری، کتاب الاطعمہ، "باب الخزیرة" میں مذکورہ واحد حدیث: ۵۴۰۱ کا خلاصۂ طعام یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی ایک دعوت آپ ﷺ کے ایک نابینا صحابی حضرت عتبان بن مالکؓ نے کی تھی اور اس میں آپ ﷺ کو خزیرہ کھلایا تھا: "...وحبسناه علىٰ خزيره صنعناه..."۔ حافظ ابن حجرؒ نے مختلف امامانِ حدیث ولغت کے حوالے سے اس کی تشریح کی ہے: صحیح مسلم میں خزیرہ کی جگہ صرف "خزیر" ہے البتہ شرح میں بخاری کا دیا ہوا نام بھی ہے (حدیث: ۲۶۳ (۳۳)۔ اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

- بقول امامِ نحو وحدیث نضر بن شُمیل خزیرہ چوکر یا بھوسی سے بنایا جاتا تھا: "الخزيرة من النخالة"۔

- بقول امام طبری: وہ آمیزہ عصیدہ کی شکل کا ہوتا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ باریک و نفیس لیکن بنتا آٹے سے ہی تھا: "هي مايتخذ من الدقيق على هيئة العَصِيدة لكنه ارق منها"۔ بقول صاحبِ مصباح اللغات عَصِیدہ "ایک قسم کا کھانا جو گھی آٹا ملا کر پکایا جاتا ہے"۔

- بقولِ ابن فارس: وہ آٹا ہوتا ہے جس میں چربی ہوتی ہے: "دقيق يخلط بشحم"۔

- بقول القتبی و جوہری: خزیرہ میں گوشت کو چھوٹا چھوٹا کاٹا جاتا ہے اور اس پر کافی مقدار میں پانی ڈالا جاتا ہے اور جب وہ پک جاتا ہے تو اس پر آٹا بکھیر دیا جاتا ہے، اگر اس میں گوشت نہیں ہوتا تو وہ صرف عَصیدہ کہلاتا ہے: "أن يوخذ اللحم فيقطع صغارا ويصب عليه ماء

کثیر فاذا نضج ذر علیہ الدقیق، فان لم یکن فیھا لحم فھی عصیدۃ"۔ صحیح مسلم کی شرحِ نووی وغیرہ میں اس تشریح کا انتساب امامِ لغت وحدیث ابن قتیبہ کی طرف کیا گیا ہے۔

-ایک قولِ مجروح یہ ہے کہ وہ ایک شوربہ ہوتا ہے جو چوکر کی تری سے صاف کیا جاتا ہے اور پھر اسے پکایا جاتا ہے:"وقیل: مرق یصفی من بلالۃ النخالۃ ثم یطبخ"۔

-دوسرا ضعیف قول ہے: وہ آٹے اور چربی کا آمیزہ ہوتا ہے:"وقیل: حساء من دقیق ودسم"۔

(فتح الباری، ۹/۶۷۲: میں مذکورہ بالا مختلف تعریفات ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے سب صحیح ہیں۔ ان میں سے بعض تعریفات کے مطابق خزیرہ دو قسم کا ہوتا تھا: لحمی اور غیر لحمی۔ قتبی اور جوہری اور ابن قتیبہ کے مطابق وہ لحمی بھی ہوتا تھا۔ بہر حال خزیرہ ایک ایسا کھانا تھا جو حریرہ سے مختلف ہوتا تھا اور ان کی بنیادیں۔ چوکر/آٹا اور دودھ۔ الگ الگ تھیں)

-رسولِ اکرم ﷺ کی عدم موجودگی میں حضرت عائشہؓ نے بنو المنتفق کے وفد کی ضیافت خزیرہ سے ہی کی تھی۔

(ابوداؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الاستنثار، حدیث:۱۴۲: اس میں خزیرہ اور عصیدہ کا فرق بھی بیان کیا گیا ہے اور ترکیبِ طعام بھی)

حریرہ

امام بخاریؒ نے "باب الخزیرہ" قائم کر کے اس کے ترجمۃ الباب میں حضرت النضر بن شُمیل نحوی لغوی مشہور ماہرِ لسانیات ومحدث کا قولِ تفسیری نقل کیا ہے کہ خزیرہ چوکر سے اور حریرہ دودھ سے بنایا جاتا تھا:"الخزیرۃ من النخالۃ، والحریرۃ من اللبن"۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرحِ حدیث میں خزیرہ اور حریرہ دونوں کھانوں کی تفصیل دی ہے۔ خزیرہ کا بہر حال دودھ سے تعلق نہ تھا اس لیے اس کا ذکر لحمی کھانوں کے ضمن میں کیا گیا ہے، البتہ حریرہ دودھ سے بنایا جاتا تھا۔ اس کی تھوڑی تفصیل یہاں دی جا رہی ہے۔ اس باب کی واحد حدیث:۵۴۰۱ کا تعلق صرف خزیرہ سے ہے۔

-ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرات ابوبکر صدیق وحارث بن کلدۃ نامی ثقفی طبیب

رضی اللہ عنہما نے ہدیہ میں آیا ہوا خزیرہ ہی کھایا تھا۔ اس میں اس روایت کے مطابق زہر کی آمیزش تھی لہٰذا دونوں نے ایک ہی دن اس کے سبب وفات پائی۔ (ابن سعد، ۳/ ۱۹۸)

-حضرت سلمیٰؓ کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ ﷺ کو خزیرہ پکا کر کھلایا۔
(اسد الغابہ، ۵/ ۴۸۰)

ہریسہ/ ہریس

اس کھانے کا شمار لحمی کھانوں میں ہوتا ہے۔ صاحب مصباح اللغات کے مطابق وہ "ایک قسم کا کھانا جو گوشت اور کوٹے ہوئے گیہوں کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے"۔ شارحینِ حدیث نے اسی قسم ومعنی کی تشریحات اپنی شروح میں کی ہیں۔ ترکیبِ طعام کے لحاظ سے ہریسہ/ ہریس اصل میں حشیشہ/ دشیشہ سے تھوڑا مختلف ہوتا تھا۔ دونوں میں گوشت کے پارچے بنیادی کھانا تھے اور ہریسہ میں گیہوں کے دانے کوٹے جاتے تھے اور حشیشہ میں ان کو خوب پیسا جاتا تھا۔ بہرحال ہریسہ/ حشیشہ کی ایک غیر لحمی قسم بھی تھی۔ یہاں صرف لحمی ہریسہ/ ہریس کا ایک واقعہ نقل کیا جارہا ہے۔

ہریسہ کا ذکر بعض روایاتِ طہارت کے حوالے سے آتا ہے۔ ان میں سے ایک روایت ابوداؤد کی ہے:

- حضرت ام داؤد بن صالح بن دینار التمارؒ نے اپنی باندی کے ہاتھ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ہریسہ بھیجا۔ باقی تفصیل ہدایائے طعام میں آتی ہے۔ بہرحال اس روایت سے اس قسمِ طعام کا رواج معلوم ہوتا ہے۔ (كتاب الطهارة، باب سور الهرة)

-حضرت ام ابو ایوبؓ زوجہ حضرت ابوایوب انصاری اور رسول اکرم ﷺ کی میزبانہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ان کے شوہر کے گھر میں سات ماہ قیام پذیر رہے۔ ہم آپ ﷺ کے لیے بطور خاص ہریس تیار کرتے تھے اور ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ اسے پسند فرماتے تھے:

"...و كنا نعمل له الهريس، فنراه يعجبهُ ..." (بلاذری، ۱/ ۲۶۷)

غیر لحمی کھانے

گوشت کے علاوہ دوسرے کھانوں میں زرعی اجناس جیسے گیہوں، جو، دالیں، چاول

وغیرہ شامل ہوتے ہیں اور دوسری قسم سبزیوں اور ترکاریوں کی ہے۔ ہیں وہ بھی زراعتی چیزیں لیکن بطور سالن وغیرہ ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ عرب جاہلی سماج سے بہت پہلے سے انسان نے غلہ و اناج کے ساتھ سبزیوں کو پیدا کرنے اور کاشت کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ جزیرۂ نمائے عرب کے میدانی علاقوں، نخلستانوں اور دوسری زرخیز زمینوں میں مختلف اناج اور ترکاریاں اگائی اور کھائی جاتی تھیں، ان کی مختلف علاقوں سے درآمد بھی ہوتی تھی جن میں عرب کے علاقوں کے علاوہ قریبی ممالک شام وعراق وغیرہ شامل تھے۔ اندرونِ عرب مدینہ منورہ، خیبر، اس کی ماتحت بستیاں- فدک، تیماء، وادی القریٰ وغیرہ- خاص زرعی علاقے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے علاقوں میں یمامہ گیہوں کی پیداوار اور برآمد کے لیے بہت مشہور تھا اور گیہوں پر مشتمل کھانوں کے بیان میں اس پر بحث آ چکی ہے، اسی طرح شام وغیرہ سے اناج کی درآمد پر مختصر بحث کی جا چکی ہے۔ بقیہ تجارتِ نبوی کے مطالعہ میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

(ملاحظہ ہو خاکسار کے دو مطالعات: ۱۔ عہد نبوی کی تجارت ۲۔ عہد نبوی میں شامی تجارت)

عہدِ نبوی میں غیر لحمی کھانے/ غذا کا دوسرا طبقۂ طعام تھا اور عرب اس کا استعمال عام کرتے تھے۔ ان کے بنیادی کھانوں میں جو کی روٹی بھی تھی اور گیہوں کی روٹی بھی۔ اور وہ تمام ہی کھانوں میں اصل کھانا ہے جو پیٹ بھرتا ہے۔ لیکن صرف روٹی کامل غذا نہ تھی کیونکہ وہ اپنی خشکی، سختی اور دوسری ناملائم صفات کی بنا پر متعدد دوسری چیزوں کی حاجتمند تھی۔ اس کی مدد کے لیے مختلف سالن (ادم) ہوتے تھے جن میں سبزیوں (بقول/خضروات) کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اور ان سبزیوں کی مختلف قسمیں بھی روایات و احادیث میں بیان کی گئی ہیں جن میں سے بعض بہت عام و محبوب تھیں جیسے دباء (لوکی/ترئی)، سلق (چقندر) وغیرہ۔ ان سے سب سے محبوب سالن سرکہ (خل) بھی بنایا اور کھایا جاتا تھا۔ مدینہ منورہ میں بالخصوص اور دوسرے عرب علاقوں میں بالعموم کھجور غذا کا حصہ تھی بلکہ بسا اوقات کامل غذا کا کام کرتی تھی۔ ان کے علاوہ دودھ سے بنی چیزیں تھیں جن میں پنیر (اقط)، مکھن (ودک)، گھی (سمن) وغیرہ شاملِ غذا تھے۔ خود دودھ / دہی بھی ان عربوں کی خاص غذا تھی جو کسی دوسری چیز کی محتاج نہ تھی، وہ کامل غذا اور مکمل کھانا بھی تھا۔

ثرید غیر لحمی

ثرید کی دوسری بنیادی قسم غیر لحمی تھی کہ اس میں گوشت شامل نہیں ہوتا تھا اور وہ دوسری چیزوں پر مشتمل ہوتی تھی اگرچہ اس قسم ثرید کا ذکر ترکیبِ طعام کے باب میں زیادہ مناسب رہتا تاہم کھانوں کی اقسامِ غیر لحمی میں بھی اس کا مختصر بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ثرید کی کتنی قسمیں تھیں اور وہ کن کن چیزوں سے بنتی تھیں۔ ترکیب سے متعلق روایات کے حصوں کا ذکر اسی باب میں آئے گا۔ یہاں صرف سبزی یا گوشت کے سوا دوسری چیزوں پر مبنی ثریدوں کا اجمالی ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ حدیثِ بخاری: ۵۴۲۰ میں خیاط صحابی کی ثرید کو صرف لو کی (الدباء) پر مشتمل بتایا گیا ہے۔

۲۔ حدیثِ ابوداؤد: ۳۷۸۳: میں ایک روٹی کی ثرید کا ذکر ہے: "الثريد من الخبز"۔

۳۔ اور دوسری ثرید حیس پر مشتمل بتائی گئی ہے: "الثريد من الحيس"۔ اس حیس کا ذکر آگے آتا ہے۔

- ان تین اقسام کے علاوہ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت سعد بن عبادہؓ کا ہدیۂ طعام متعدد اقسامِ ثرید پر مشتمل ہوتا تھا جن میں سے تین مزید غیر لحمی ثریدوں کا ذکر ہے:

۴۔ دودھ کی ثرید: "او ثريد بلبن"

۵۔ سرکہ و تیل کی ثرید: "او ثريد بخل وزيت"۔

۶۔ یا گھی کی ثرید: "... او سمن"

ان کے علاوہ بھی بعض دوسری ثرید کی اقسام تھیں۔ ان میں بنیادی چیز روٹی ہوتی تھی اور دوسری چیزیں اس میں ملائی جاتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی روٹی اس میں شامل نہیں ہوتی تھی لہٰذا اس ثرید کو اس کے بنیادی کھانے سے جانا جاتا تھا جیسے حیس کی ثرید وغیرہ، ترکیبِ طعام کے باب میں ان اجزاءِ طعامی کا ذکر تفصیل کے ساتھ آتا ہے۔

ستو/سویق

ستو اصلاً تو آٹے کی ایک قسم ہے یا دوسرے الفاظ میں وہ جو کے آٹے پر بنیادی طور سے

مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں بعض دوسری چیزوں کو بھی ملایا جاتا ہے تاکہ وہ حلق سے بہ آسانی نیچے اتر سکے اور لذت کام ودہن بھی کر سکے۔ اس کا رواج تمام دیہی معاشروں میں رہا ہے اور غالباً وہ سب سے زیادہ مقبولِ عام، سیدھا سادہ اور معمول کا کھانا سمجھا جاتا رہا ہے۔ وہ فوری ضرورتِ طعام پوری کرنے کا سب سے عمدہ اور مقبول کھانا ہے اور اپنی جگہ کامل کھانا بھی ہے۔ برصغیر پاک وہند کے دیہاتوں میں وہ فوری کھانے کے لیے برابر استعمال کیا جاتا ہے اور سفر میں بھی دیہاتی بالعموم ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کے کئی استعمالات ملتے ہیں: ایک اسے یونہی پھانک لیا جاتا ہے اور اس وقت وہ موٹے آٹے کی شکل کا ہوتا ہے۔

(حدیثِ بخاری: ۲۰۹؛ فتح الباری، ۱/ ۴۰۷ میں آتا ہے: "فلاک ولکناہ" اس کے لغوی معنی ہیں: لقمہ کو آہستہ چبانا اور منہ میں پھرانا تاکہ تر ہو جائے)

دوسرے اس میں پانی-تھوڑا پانی- ملا کر گوندھے ہوئے پتلے آٹے کی طرح بنالیا جاتا ہے اور پھر اسے انگلیوں سے چاٹ لیا جاتا ہے۔

(فتح الباری، ۱/ ۴۰۷-۴۰۸: حدیث بخاری: ۲۱۰: "... فلم یُؤت الا بالسویق، فامر به فثریَ ... ای بُلَّ بالماء لما لحقه من الیبس...)

اور تیسرے اس میں پانی کی مقدار زیادہ کر کے بطور شربت پیا جاتا ہے۔ عہد جاہلی اور دورِ نبوی میں بھی ستو کے یہی استعمالات تھے۔

(حدیثِ ابی داؤد- ۱۹۵ وغیرہ اور کتاب الاشربۃ/ مشروبات کی احادیث میں بھی اس کے بطور شربت پینے کا ذکر آتا ہے)

اس کی ایک تعریف ایک دیہاتی عرب نے خوب کی ہے کہ وہ مسافر کا زادِ راہ، جلدی کا کھانا اور بیمار کا گزارہ ہے: "وقد وصفه الأعرابی فقال: عدة المسافر، وطعام العجلان، وبلغة المریض" (فتح الباری، ۱/ ۴۰۷)

سویق یا ستو کا سب سے معروف ومشہور وہ واقعہ ہے جس نے اپنا نام ایک غزوۂ نبوی کو دے دیا۔ وہ غزوۃ السویق کہلاتا ہے اور غزوۂ بدر کے بعد ہی اکابر وسپاہِ قریش کی مدینہ منورہ کے اطراف پر ایک کارروائی اور تاخت کا کارنامہ تھا۔ سالارِ اعظمِ قریش حضرت ابوسفیان بن حرب اموی نے اپنے ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ حملہ کیا تو ان کا تعاقب اسلامی لشکر نے کیا۔

حملہ آور بڑی افراتفری میں پسپا ہوئے اور اونٹوں کا بوجھ کم کرنے اور ان کو تیز رفتار کرنے کے لیے اپنے زادِراہ میں لائے ہوئے ستو/سویق کے بورے/تھیلے فرار ہوتے ہوئے پھینکتے گئے۔ اسی سے غزوہ کا نام پڑا۔ وہ مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا مگر اس میں سب سے زیادہ اہم جملہ ہماری بحثِ حاضرہ کے لحاظ سے یہ ہے کہ وہی ان کا عام زاد تھا: "وجعل ابوسفیان واصحابه يتخففون فيلقون جُرب السويق، وهي عامة زادهم، فجعل المسلمون يمرون بها فياخذونها"۔

(واقدی، ۱۸۱-۱۸۲؛ زرقانی، شرح المواهب اللدنية، ۱/۵۵۳؛ ابن ہشام، ۲/۴۴-۴۵؛ زادالمعاد، ۱/۹۰-۹۱؛ بخاری، مسلم میں اس غزوہ کا ذکر نہیں ہے البتہ دوسری کتب حدیث وسیرت میں وہ معروف ومشہور واقعہ ہے)

بحیثیتِ عرب اور ان کے عام کھانوں کے اعتبار سے مسلمانانِ مدینہ-مکہ کا نظامِ طعام مختلف نہ تھا۔ ستو/سویق مکی اور مدنی دونوں طبقاتِ مسلمین کا بھی عام زادِراہ تھا اور سفر وحضر میں اس کا استعمال اسی طرح کیا جاتا تھا۔ مسلم افواج اور غزواتِ نبوی کے دوران ستو/سویق کا یہی استعمال تھا اور اس کی متعدد احادیث و روایات ملتی ہیں۔ امام بخاریؒ اور بعض دوسرے محدثینِ کرام نے ستو پر ایک خاص باب-"السويق"- اپنی کتاب الاطعمہ میں باندھا ہے: اس میں صرف ایک حدیث: ۵۳۹۰ بیان کی ہے جس میں حضرت سوید بن النعمانؓ کا یہ بیان ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ خیبر کے اطراف میں صہباء نامی مقام پر تھے جب نماز کے وقت کھانا طلب کیا گیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں صرف ستو پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اور ہم نے اسے ہاتھوں سے پھانک لیا اور پھر کلی کر کے نماز ادا فرمائی اور وضو نہیں کیا: "...فحضرت الصلوة، فدعا بطعام، فلم يجده الا سويقا، فلاك منه، فلكنا معه، ثم دعا بماء فمضمض ثم صلى ..." اسی آخری مسئلہ کی بنا پر اس حدیث کو امام بخاری وغیرہ نے کتاب الطہارۃ میں بھی بیان کیا ہے اور وہیں حافظ ابن حجر نے اس کی تشریح-شرحِ سویق- کی ہے۔ اس میں اور تفصیلات وجہات کے علاوہ ستو بنانے کی ترکیب کا بھی ذکر ہے۔

(بخاری، کتاب الطهارة، حدیث: ۲۰۹؛ فتح الباری، ۱/۴۰۷؛ کتاب الاطعمة، حدیث: ۵۳۹۰ وغیرہ دوسرے ابواب؛ ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب الرخصة فی ذلک؛ حدیث: ۴۹۲ میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ مغرب

کی نماز سے قبل ستو کھایا گیا تھا؛ نیز بخاری، "باب غزوة الحديبية": میں یہی ستو کھانے کا ذکر حضرت سوید بن نعمان کے حوالے سے پھر کیا گیا ہے)

اسی غزوۂ خیبر سے واپسی پر حضرت صفیہ بنت حیؓ سے رسول اکرم ﷺ نے شادی کی تھی اوران کے ولیمہ میں ستو اور کھجور کھلائی تھی: "... أولم علىٰ صفية بنت حي بسويق وتمر"۔

(ترمذی، ابواب النکاح، باب في الوليمة ؛ بخاری، کتاب الاطعمة، باب الحيس ؛ کتاب الجهاد والسير، باب من غزا الخ: متعدد دوسری کتب وابواب؛ مسلم، کتاب النکاح، ۸۸(۱۳۶۵)۔

- حضرت ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ جب مدینہ آیا تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے ملا اور انھوں نے فرمایا کہ میرے گھر آؤ تو میں تمہیں سویق/ستو اور کھجور کھلاؤں: "الا تجئى فأطعمك سويقا وتمرا" (بخاری، مناقب عبداللہ بن سلام)

- حضرت ابوسفیان بن سعید بن المغیرہؓ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھروں کا بھی کھا جاتا تھا اور بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا۔ موصوف گرامی ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے کاشانے میں گئے تو انھوں نے ستو کے ایک قدح سے ان کی تواضع کی: "...انه دخل علىٰ ام حبيبة فسقته قدحا من سويق..." (ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، حدیث:۱۹۵)

- رمضان میں سحری کے کھانے میں بھی ستو اور کھجور کھانے کا ذکر ملتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابہ کرام جیسے حضرت زید بن ثابت خزرجیؓ اور حضرت انسؓ وغیرہ نے ستو کا شربت پی لیا تھا اور آپ ﷺ نے کھجور بھی کھائی تھی۔

(نسائی، کتاب الصیام، باب السحور بالسويق والتمر)

- امام شعبیؒ کا بیان ہے کہ ہم ایک بار حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے گھر گئے تو انھوں نے ہماری ضیافت کھجوروں سے کی اور ستو کا شربت پلایا جو انھوں نے جو سے بنایا تھا: "...وسقتنا سويق سلتٍ..."

(مسلم، حدیث:۴۳(...)۔ اس میں لفظ "سلت" کا استعمال وذکر اہم ہے جو شعیر ہی کا مترادف بتایا گیا ہے لیکن تھوڑا فرق معلوم ہوتا ہے: "سلت" دراصل بغیر چھلکے کا جو ہوتا تھا اور شعیر چھلکے والا۔ مصباح اللغات میں دونوں معانی دیے ہیں)

- حدیثِ ابی داؤد - ۲۰۲۱ کے مطابق ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا: اس

اہلِ بیت کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ لوگوں کو صرف نبیذ پلاتے ہیں جب کہ ان کے بنو عم/ چچازاد عزیز دودھ، شہد اور ستو پلاتے ہیں۔ ایسا بخل یا فقر کی وجہ سے تو نہیں، حضرت ابن عباسؓ نے نبیذ پلانے میں اسوۂ نبوی اور فرمانِ رسولی کی وجہ بتائی۔ اس حدیث سے حاجیوں اور زائروں کو مکہ مکرمہ میں سویق/ستو وغیرہ کے سقایہ کے معمول کا پتہ چلتا ہے۔ اس حدیث نبوی کی تائید سقایہ کی دوسری روایاتِ سیرت وحدیث سے بھی ہوتی ہے۔

ستو/سویق پر تمام روایات اور احادیث جمع کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ وہ الگ کتاب السویق بن جائے گی۔ ان مذکورہ بالا احادیث کو اس غرض سے بیان کیا گیا ہے کہ ستو کو ایک عام ومقبول زادِراہ کے علاوہ زادِ حضر بھی سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مہمانوں کی آمد پر ستو یا ستو کا شربت پلایا جاتا تھا، افطار یا سحری میں ستو کھایا جاتا تھا، عام حالات میں ستو بطور کھانا استعمال ہوتا تھا۔ ستو کو بعض دوسری چیزوں جیسے کھجور، گھی وغیرہ کے ساتھ کھایا جاتا تھا تب اس کی حیثیت بدل جاتی تھی۔ اور عام زادِراہ تو وہ تھا ہی۔

دوسرے شوربے/ سالن

روٹی کے ساتھ گوشت اور اس کے شوربے کے علاوہ کئی دوسرے شوربے (ادم) یا سالن تھے جن کی مدد سے روٹی کھائی جاتی تھی۔ کیونکہ خالی روٹی بالعموم خشک ہونے کے سبب گلے میں پھنستی تھی اور معدے کو نقصان بھی کرتی تھی۔ پانی --سادہ پانی-- کے ساتھ روٹی نگل لینے کی روایت ورواج تقریباً انسانی معاشروں میں رہا، نبوی معاشرہ میں بھی تھا۔ مگر اس کے علاوہ متعدد دوسری چیزیں بطور سالن استعمال کی جاتی تھیں۔ ان میں گھی، مکھن، تیل (زیت) اور سرکہ (خل) وغیرہ شامل تھے۔ موخر الذکر کی تعریف واستعمال میں کئی احادیث وسننِ نبوی ملتی ہیں اور گوشت اور سبزی کے بعد اسی کا درجہ تھا۔

سرکہ (الخل)

ایک حدیثِ نبوی میں اس کو بہترین شوربہ یا سالن کہا گیا ہے: "نعم الادام الخل"۔ اس

کا ذکر بعض واقعاتِ طعام کے حوالے سے بھی آتا ہے:

-حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ کاشانۂ نبوت میں داخل ہوا تو روٹیاں اور سرکہ پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ، سرکہ تو بہترین سالن/شوربہ ہے: "فاذا فلق و خل..." "فلق" روٹی کے ٹکڑوں کے لیے آتا ہے۔

(نسائی، کتاب الایمان والنذور، اذا حلف ان لایاتدم فاکل خبزا بخلٍ)

- رسولِ اکرم ﷺ کے کاشانے میں دوسری دعوتوں کے بیان میں بھی سرکہ کا ذکر بطور سالن آتا ہے۔

- بنفس نفیس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ مبارک میں روٹی/سرکہ کھانے کی روایات ملتی ہیں۔

- صحابہ کرام کی بعض دعوتوں میں بھی سرکہ اور روٹی کا ذکر آتا ہے یا سرکہ کا بطور سالن استعمال ملتا ہے۔

- ہدایائے طعام میں ایک ثرید سرکہ کے ساتھ بنائی جاتی تھی جو روٹی کے ٹکڑوں اور سرکہ پر مشتمل ہوتی تھی۔

- کتب حدیث میں "باب الخل یا باب اکل الخل" ضرور ملتا ہے اور اس میں سرکہ کو بطور مقبول سالن ذکر کیا گیا ہے۔

- حدیث ابن ماجہ: ۳۳۱۸ کے مطابق سرکہ انبیاء سابقین کا بھی شوربہ/سالن رہا تھا اور فرمانِ نبوی کے مطابق جس گھر میں سرکہ ہوتا ہے وہ کبھی فقر کا شکار نہیں ہوتا: ..."فانه كان ادام الانبياء قبل، ولم يفتقر بيت فيه خل" اس سے قبل حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ ﷺ کو روٹی، کھجور اور سرکہ پیش کیا تھا..." (باب الائتدام بالخل)

روٹی اور تیل

عرب معاشرے میں روٹی کو تیل (زیت) کے ساتھ کھانے کی روایت اور سماجی ریت ملتی ہے۔ بخاری وغیرہ کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے، بالخصوص حضرت بریرہؓ کے صدقہ کے گوشت

کے ہدیہ اہل بیت بننے کے ضمن میں کہ رسول اکرم ﷺ کے کاشانہ میں بھی مختلف قسم کے شوربے (ادم / ادام) ہوتے تھے جن میں تیل بھی شامل تھا اور دوسری چیزیں بھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بابِ بخاری ۔''باب الادم''۔ کے علاوہ حضرت بریرہؓ کے قصۂ طلاق میں ان سالنوں سے بحث کی ہے جو واقعاتی، دینی، فقہی اور اخلاقی جہات وابعاد رکھتا ہے۔ ادم کی تعریفِ جمہور یہ ہے کہ روٹی جس چیز کے ساتھ کھائی جاتی ہے اور جو اسے اچھا بنا دیتی ہے خواہ شوربہ (گوشت کا سالن۔مرق) ہو یا کوئی دوسری چیز وہ ''ادم'' میں شمار ہوتی ہے''... فالجمهور انه مايؤكل به الخبز بما يطيبه سواء كان مرقا ام لا ...'' ادم پر اختلاف کا بیان بھی ملتا ہے اور تعریف کا بھی۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب الادم؛ فتح الباری، ۹/ ۶۸۷-۶۸۸؛ کتاب الطلاق، حدیث: ۵۲۸۴ پر بحثِ حافظ، ترمذی، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الزیت میں دو دو صحابہ سے ہدایتِ نبوی مذکور ہے کہ زیتون/ تیل کھاؤ اور لگاؤ: ''كلوا الزيت وادهنوا به'')

بہر حال حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کے گھر میں تشریف آوری پر جو ضیافت ہوئی تھی اس میں روٹی اور تیل ہی پیش کیا گیا تھا: ''... فجاء بخبز وزيت فأكل ...''

(حدیث: ۳۸۵۴: تیل سے مراد بالعموم زیتون کا تیل ہوتا ہے: یہ لغوی معنی بھی ہے اور اصطلاحی بھی: مصباح اللغات: الزیت؛ طعام کے ساتھ زیت کا اشتراک بھی خوب ہے)

۔حضرت سعد بن عبادہؓ کی ایک ثرید زیت/ زیتون کے تیل پر بھی مبنی ہوتی تھی جیسا کہ ذکر آچکا ہے۔

۔روٹی اور تیل/ زیتون کھانے کے دوسرے واقعات وروایات بھی ہیں۔

۔حضرت ابورافع مولائے نبوی کا بیان ہے کہ بسا اوقات مجھے رات کے کھانے پر مدعو کرتے اور فرماتے کہ کھری امیر کے لیے چھوڑ دو اور تیل کی ثرید کھلاتے: ''ربما دعنى الىٰ عشائه فيقول: دع العُراق للامير، فانظر فاذا ثرى بزيت'' (ابن سعد، ۴/ ۳۳۶)

۔ایک مدت کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ ماجدہ نے تین روٹیاں، تھوڑا تیل اور نمک حضرت ابو ہریرہؓ اور ان کے مہمانوں کو کھلایا تھا۔ یہ واقعہ حمید بن مالک بن خثیم کا بیان کردہ ہے کہ میں ان کے ساتھ عقیق میں بیٹھا ہوا تھا جب بعض اہل مدینہ ان کے پاس آئے۔ اس دوران

حضرت ابو ہریرہؓ کا کھانا صرف کھجور اور پانی رہا تھا اور اس طعام کے ملنے پر انھوں نے خاص شکر ادا کیا تھا۔

(موطا، کتاب الجامع، جامع ماجاء فی الطعام و الشراب : غالباً یہ حضرت مروان بن حکم اموی کے زمانے کا واقعہ ہے کیونکہ اس میں دار مروان کا حوالہ موجود ہے)

چربی بطور سالن اور غذا

چربی جانوروں کے گوشت وبدن سے حاصل کی جاتی تھی اور وہ بھی ایک قسم کا سالن/شوربے کا کام کرتی تھی۔ عربی روایات اور احادیث میں اس کے لیے کئی الفاظ ملتے ہیں جیسے شحم اور ودک وغیرہ (مصباح اللغات مع مادہ)۔ اس کا عام استعمال تو بطور آلۂ طعام ہوتا تھا جو روٹی کے ساتھ ہوتا تھا اور کھانے پکانے کے لیے بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن شاید کبھی وہ بھرپور غذا کا کام بھی کرتے تھے جیسا کہ بعض روایاتِ ذیل سے معلوم ہوتا ہے لیکن وہ غیر معمولی حالات کا استعمال لگتا ہے جب کامل غذا نصیب نہ تھی اور بھوک میں اسی پر گذارا کرلیا گیا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا استعمال روٹی کے ساتھ کیا گیا ہو۔

-غزوۂ خیبر کے اموالِ غنیمت میں حضرت عبداللہ بن مغفل مزنیؓ کو چربی کی ایک تھیلی ملی تھی: "جراب شحم" جو خاصی بڑی تھی کہ وہ اسے اپنے کاندھے پر لاد کر اپنے اصحاب کے پاس قیامگاہ پر لے گئے تھے اور ان سب نے مل کر اسے کھایا تھا: فانطلقت به الی رحلی واصحابی فأكلناه"۔

(ابن ہشام، ۲/۳۳۹؛ نیز بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خيبر؛ موخر الذکر میں اور بعض دوسری روایات/احادیث میں اس واقعہ کے دوسرے اطراف بھی ملتے ہیں جن میں استعمال سے گریز کا عندیہ ملتا ہے)

-قربانی کے جانوروں کی کثرت کی وجہ سے یہ رواج ہو گیا تھا کہ لوگ اپنی اپنی قربانی کے جانوروں کی چربی (ودک) جمع کر لیتے تھے اور ان کی کھالوں سے مشکیزے بناتے تھے: "یحملون منها الودک ویتخذون بها الاسقية"۔ عام جانوروں کے ذبیحے کے معاملہ میں بھی بالعموم ایسا ہی کیا جاتا تھا کہ اس کی چربی مختلف کھانوں میں استعمال کے لیے رکھ لی جاتی

تھی۔ اس سے کھانے پکائے جاتے تھے یا اس کو بسا اوقات بطور سالن استعمال کیا جاتا تھا یا روٹی پر چپڑ کر اسے نگلنے کے لائق بنایا جاتا تھا۔ اس قسم کے استعمالات کا ذکر کئی روایات میں آتا ہے۔

(ابوداؤد، کتاب الاضاحی، باب حبس لحوم الاضاحی، نیز دیگر ابواب؛ احادیث: ۲۸۱۲-۲۸۱۳)

-ایک دلچسپ روایت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کے ساتھ شب عروسی منائی تو اس رات گھر میں، جو حضرت ام المساکین کا کبھی رہا تھا، ایک پتھر کی پتیلی میں چربی یا گھی کا ایک کتلہ تھا اور وہی آپ ﷺ اور نئی دلہن کا طعامِ عروسی تھا۔

(بلاذری، ۱/۴۶۴:...واذا رحی وبرمته. وفیها کعب(کتلة من سمن) من اهالة فکان ذلک طعام رسول الله ﷺ الخ)

گھی/سمن

عرب روغنیات میں گھی یا سمن بہت محبوب تھا۔ اس کا ذکر بہت سی احادیث وروایات میں ملتا ہے۔ بالعموم اس کا استعمال کھانا۔ گوشت سبزی۔ پکانے کے تیل کے طور پر کیا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو بعض دوسری چیزوں میں بطور امدادی شے لذت خیز کے استعمال کیا جاتا تھا مثلاً روٹی کے لیے آٹا گوندھا جاتا تو اس میں گھی لطافت ولذت اور نرمی کے لیے ملا دیا جاتا تھا۔ یا روٹی میں گھی/سمن ملا کر اس کی ثرید بنائی جاتی تھی۔ لیکن اس کا ایک اہم ترین استعمال شوربہ کا تھا۔ وہ روٹی کھانے کے لیے دوسرے شوربوں۔ سرکہ، تیل، چربی وغیرہ۔ میں شاید بہترین سمجھا جاتا تھا۔

-حضرت ام سلیمؓ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے روٹی پکائی تو اس میں تھوڑا سا گھی ملا دیا: "صنعت ام سلیم خبزة، وصنعت فیها شیئا من السمن"۔ یہ ان کے گھر کی اجتماعی دعوتِ صحابہ کا واقعہ ہے۔ دیگر حدیثِ بخاری کے مطابق حضرت ام سلیمؓ نے اپنے گھر میں تشریف آوری پر کھجور اور گھی سے تواضع کی تھی۔ (کتاب الصوم، من زار قوما الخ)

-اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے ایک دن عمدہ گیہوں کی سفید روٹی کو گھی سے تربتر کر کے کھانے کا خیال ظاہر فرمایا اور ایک انصاری صحابی نے ایسی ہی روٹی آپ ﷺ کے لیے پکوائی۔

جب رسول اکرم ﷺ ان کے گھر دعوت کے لیے گئے تو معلوم ہوا کہ گھی گوہ کی کپی میں تھا لہٰذا آپ ﷺ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا، کیونکہ گوہ سے آپ ﷺ کو احتراز تھا۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، احادیث: ۳۳۴۱-۳۳۴۲)

- رسول اکرم ﷺ نے حضرت ام مالکؓ کو ایک کپی بھر گھی ہدیہ کیا تھا۔ ان خاتون کے بیٹے آتے اور سالن مانگتے جو ان کے گھر میں ہوتا ہی نہیں تھا تو خاتونِ خانہ اس کپی سے گھی نکال کر بطور سالن کھلا دیتی تھیں۔ مدتوں اس میں برکت رہی جو کپی نچوڑ لینے کے سبب جاتی رہی۔

(مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: ۳۰ (۲۲۸۰)

- بعض ہدایائے طعام اور دعوتوں میں بھی گھی یا سمن کے کھانے کھلانے کا ذکر آ گے آتا ہے۔

- عہدِ فاروقی کا ایک واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ کے گھر پر چربی اور گھی دونوں کا ملا ہوا کھانا کھایا تھا۔ اس میں گوشت کی چربی کا بھی ذکر ہے اور بازار میں گھی کی قیمت کے گراں ہونے کا بھی۔ بعض اور جہات بھی ہیں۔

(ابن ماجہ، حدیث: ۳۳۶۱: کتاب الاطعمۃ، باب الجمع بین السمن واللحم)

سبزی و ترکاری

زرعی فصلوں میں اناج وغلہ کے علاوہ مختلف قسم کی سبزیوں اور ترکاریوں کے کھانے کا رواج بھی رہا تھا۔ مکہ مکرمہ جیسے بے زراعت علاقوں میں کم اور زرعی خطوں اور نخلستانوں جیسے مدینہ منورہ وغیرہ میں بہت زیادہ۔ احادیث وروایات میں سبزیوں/ ترکاریوں کے لیے بقل/ بقول کے علاوہ خضروات وغیرہ کئی الفاظ واسماء ملتے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ-۶۱ میں بنو اسرائیل کے من وسلویٰ جیسی نعمتِ الٰہی سے تنگ آنے کے بعد سبزی کا مطالبہ مذکور ہے اور وہ زرعی پیداوار کے حوالے سے ہے: "واذ قلتم یموسیٰ لن نصبر علیٰ طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلها وقثائها وفومها وعدسها وبصلها ط..." (اور جب کہا تم نے اے موسیٰ! ہم نہ ٹھیریں گے ایک کھانے پر، سو پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ نکال دے

ہم کو جو اگتا ہے زمین سے، زمین کا ساگ۔ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز ...) عرب جاہلی اور عربِ اسلامی دونوں ادوار میں زرعی پیداواروں سے بالخصوص ترکاریوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کی تجارت بھی کرتے تھے، زراعت بھی کرتے تھے اور بطور طعام ان کا استعمال کرتے تھے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب الاطعمۃ میں اور دوسرے محدثین نے بھی متعدد سبزیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حسب ذیل پر امام موصوف نے خاص ابواب باندھے ہیں:

۱۔ باب السلق و الشعیر، ۲۔ باب الدباء، ۳۔ باب القثاء بالرطب، ۴۔ باب القثاء، ۵۔ باب الکباث، وھو ورق الاراک.

ان کے علاوہ لہسن (ثوم)، پیاز (بصل) جیسی بودار سبزیوں/زرعی پیداواروں پر بھی ابواب ملتے ہیں۔ دوسری سبزیوں اور ترکاریوں کا بھی ذکر ملتا ہے اور ان کا امکان تو وسیع تر ہے۔ بہر حال اس باب/فصل میں چند ترکاریوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن پر کھانا مشتمل ہوتا تھا اور جو خالص غیر لحمی تھے، حالانکہ ان کے بعض حوالے پہلے بھی آ چکے ہیں۔

سبزیوں پر مشتمل کھانے

مختلف سبزیوں (بقول/خضروات) پر مشتمل ہوتے تھے اور عام و خاص کے پسندیدہ کھانے تھے:

الدباء (لوکی/ترئی)

۱۔ رسولِ اکرم ﷺ کے ایک میزبان پڑوسی - خیاط - نے اپنی دعوت میں شوربہ دار لوکی کھلائی تھی اور رسول اکرم ﷺ کے رفیقِ دعوت حضرت انس بن مالکؓ خادمِ خاص تھے۔

۲۔ حضرت انسؓ نے اس دن سے سنتِ نبوی کی پیروی میں ہمیشہ لوکی (الدباء) کو پسند فرمایا اور تا عمر کھاتے رہے۔ ان کی حیاتِ مبارک کافی طویل تھی اور وہ پہلی صدی اسلامی کا معمول کا کھانا بن گیا تھا۔

- اس کھانے کو بعض روایات میں ''ثرید'' بھی کہا گیا ہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب من تتبع حوالی القصعۃ مع صاحبہ؛ باب الثرید: قصعۃ فیھا ثرید... فجعل النبی ﷺ یتبع الدباء..." نیز دوسرے ابوابِ بخاری؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی اکل الدباء، حدیث: ۳۷۸۲)

لوکی (الدباء) کے بارے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کا ایک محبوب ترین غیر لحمی کھانا تھا۔ زرعی لحاظ سے لوکی کی کئی قسمیں ملتی ہیں: ان میں سے ایک لمبی موٹی ہوتی ہے، دوسری گول کدو کی طرح ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی اس کی اقسام ہیں۔ بعض اوقات کدو کو بھی لوکی کہا جاتا ہے اور احادیث میں بسا اوقات دونوں الفاظ لوکی/ترئی (الدباء) اور کدو (قرع) الگ الگ ہونے کے علاوہ مترادف بھی سمجھے اور بتائے گئے ہیں۔ وہ ایک خاندانِ نباتات سے ہونے کے باوجود بہر حال جداگانہ ترکاریاں ہیں اور لوکی، ترئی، کدو تین الگ الگ قسمیں ہیں۔ شارحینِ حدیث اور امامانِ لغت کی تشریحات و تعریفات سے ان کا فرق و امتیاز معلوم تو ہوتا ہے لیکن بہت واضح نہیں ہوتا۔

لوکی/کدو (الدباء/القرع)

حدیث و سیرت کی روایات میں لوکی کے لیے "دباء" اور کدو کے لیے "قرع" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مصباح اللغات وغیرہ کی لغوی تشریحات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں متبادل و مترادف الفاظ تھے جو دونوں کے لیے آتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں سبزیوں کا خاندان ایک ہے تاہم ان کی ساخت، قسم، مزہ اور افادیت وغیرہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ ایک خیاط میزبان کی دعوت میں ان دونوں پر مبنی ثرید کا ذکر ملتا ہے اور اس میں گوشت کا بھی اضافہ نظر آتا ہے۔ بہر حال اس واقعۂ دعوت پر مبنی کھانے کا ذکر متعدد کتبِ حدیث کی کتابوں اور ان کے ابواب میں بہت اختلافِ معانی کے ساتھ آیا ہے۔ اس سبزی کے تعلق سے بعض اہم اضافی معلومات مختلف احادیث سے ملتی ہیں جو بشکل نکات درجِ ذیل ہیں:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی (الدباء) بہت پسند آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھاتے رہے۔

۲۔ حدیثِ ابن ماجہ کے مطابق آپ ﷺ کو کدو (قرع) بہت پسند آیا۔ گھریلو کھانوں میں

اس کا استعمال فرماتے تھے۔

۳۔ آپ ﷺ کے شریک طعام آپ ﷺ کے خادم حضرت انسؓ اس کے ٹکڑے آپ ﷺ کے سامنے کرتے رہے۔

۴۔ حضرت انسؓ نے اس کے بعد دباء (لوکی) کو اپنے کھانے کا ایک جزو بنالیا اور خوب کھاتے رہے۔

۵۔ لوکی یا کدو دوسرے صحابہ کرام کی پسندیدہ غذا بن گئی۔

حدیثِ ابن ماجہ: ۳۳۰۳ کے مطابق حضرت جابر بن عبداللہؓ کاشانۂ نبوی میں گئے تو رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے یہ لوکی (الدباء) تھی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے تو فرمایا: یہ کدو ہے (ھذا القرع) یعنی الدباء اور اس کے ذریعہ ہم اپنے کھانے میں اضافہ کرتے ہیں: "نکثر به طعامنا"۔ ان تفصیلات سے ان دونوں سبزیوں/ترکاریوں کے ایک ہونے کا قرینہ بھی ملتا ہے اور اس سے زیادہ اہم اضافہ یہ ہے کہ کدو یا لوکی کھانے (گوشت وغیرہ) میں ڈال کر اس میں اضافہ کرلیا جاتا تھا۔ اس طرح وہ شوربہ میں اضافہ کے مترادف بن جاتی ہے۔ مزید برآں وہ ایک اضافی کھانا معلوم ہوتی ہے جو بالعموم اضافہ کرتی تھی۔ اصل کھانا وہ شوربہ کے ساتھ بنتی تھی جیسا کہ لوکی یا کدو کے کھانے کے واقعات میں اس کے مرق بننے کا ذکر ملتا ہے۔

لہسن/ثوم

ایک زرعی پیداوار ہے اور وہ مدینہ منورہ اور خیبر کے علاقوں میں کافی پیدا ہوتی تھی جیسا کہ احادیث میں آتا ہے۔ وہ ایک بو والی چیز/زرعی فصل ہے۔ کچے لہسن کی بو طبعِ نازک پر بہت گراں گذرتی ہے اور بہت دیر تک جسم وسانس میں بسی رہتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کو طبعی طور سے بدبودار چیزیں ناپسند تھیں اور ان میں سے ایک لہسن بھی تھا۔ اسی بنا پر احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے کچے لہسن کے کھانے کے بعد مسجدوں میں جانے سے منع فرمایا تھا کہ وہ نمازیوں کو تکلیف وایذا دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں حکم تھا کہ مسجد آنے سے پہلے اسے کھایا ہی نہ کریں اور کھانا چاہیں تو پکا کر اس کی بو کو زائل کردیا کریں۔ یہی حکم پیاز کا بھی تھا اور اسی پر دوسری بدبودار

چیزوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے خواہ وہ کھانے کی ہوں یا پینے وغیرہ کی: "انّ رسول اللّٰہ ﷺ قال: من اکل ثوما او بصلا فلیعتز لنا اولیعتز لنا مسجدنا، ولیقعدفی بیتہ الخ"

(نیز دیگر احادیث جن میں اس کی بو ماردینے کا ذکر ہے۔ ان میں سے بعض کا حوالہ آگے آتا ہے)

بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ کی ان ہی احادیث میں لہسن کے عام طور سے کھانے اور رسولِ اکرم ﷺ کے اس سے احتراز کرنے کے بعض واقعات کا بھی ذکر ہے:

۔رسولِ اکرم ﷺ کے پاس بقولِ حضرت جابر بن عبداللہؓ سبزیوں میں بعض تازہ چیزوں پر مشتمل ایک ہانڈی لائی گئی جس سے آپ ﷺ کو بدبو آئی تو آپ ﷺ نے ان کے بارے مین پوچھا اور جب ان سبزیوں کے بارے میں بتایا گیا تو آپ ﷺ نے اسے اپنے اصحاب کی طرف بڑھا دیا۔ صحابہ کو جب آپ کی کراہت کا علم ہوا تو ان کو بھی کھانے میں تامل ہوا لیکن آپ ﷺ نے ان کو کھانے کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ میں اس ذاتِ عالی سے سرگوشی کرتا ہوں جس سے تم نہیں کرتے۔

۔خیبر کی فتح کے بعد رسول اکرم ﷺ کے کچھ صحابہ کو ایک بار صرف لہسن ہی مل سکا۔ بھوکے ہونے کے سبب لوگوں نے اسے خوب کھایا اور پھر جب نماز کے لیے مسجد گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدبو محسوس ہوئی اور آپ ﷺ نے اسے کھا کر مسجد آنے سے منع فرمایا۔

۔حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ کا بیان ہے کہ ایک بار میں لہسن کھا کر مسجد پہونچا تو ایک رکعت نکل چکی تھی۔ میرے داخل ہوتے ہی رسولِ اکرم ﷺ کو اس کی ناگوار بو محسوس ہوئی جس کا اظہار نماز بعد آپ ﷺ نے فرمایا اور حکم دیا۔

۔حضرت ابوایوب انصاریؓ کے خانۂ مبارک میں قیام کے دوران آپ ﷺ نے لہسن پر مشتمل کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا جس سے میزبان کریم کو تشویش ہوئی تھی اور رسول اکرم ﷺ نے بعد میں اپنے احتراز کی وجہ بیان فرمادی تھی۔ بہرحال لہسن خالص کھانے کا بھی ذکر ملتا ہے، سبزیوں/کھانوں میں بطور شوربہ بنانے کا بھی، اور اسے پکا کر کھانے کا بھی۔

(حدیثِ مسلم: ۱۷۰(۲۰۵۳): کتاب الاشربۃ: نیز ۱۷۱(...)؛ ترمذی، الاطعمۃ، باب فی الرخصۃ فی اکل الثوم مطبوخاً؛ نیز مسلم)

پیاز/ بصل

-حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ایک سفر کے دوران صحابہ کرام کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کا گذر پیاز کے کھیت (زراعۃ بصل) سے ہوا۔ آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بعض نے اسے کھایا اور بعض نے نہیں کھایا۔ جب وہ لوگ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس گئے تو آپ ﷺ نے پیاز کھانے والوں کو پیچھے کر دیا اور نہ کھانے والوں کو آگے رکھا۔ حتیٰ کہ اس کی بو جاتی رہی۔

-حضرات شیخینؓ اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے خطبوں میں ان لوگوں کو سرزنش کی جو پیاز و لہسن جیسی خبیث چیزیں کھاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ میں نے دیکھا جب رسول اکرم ﷺ ان دونوں میں سے کسی کی بدبو کسی شخص کے پاس سے آتے پاتے تھے تو اسے مسجد سے بقیع کی طرف نکال دیا کرتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ جب کوئی ان دونوں کو کھائے تو ان کو پکا کر ان کی بو مار دے۔ موخر الذکر ہدایت حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے۔

-بایں ہمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کا آخری کھانا پیاز پر مشتمل تھا: "ان آخر طعام اکله رسول الله ﷺ طعام فيه بصل".

-مسلم کی ایک روایت میں اور باب میں بھی کرّاث نامی سبزی نہ کھانے کا ذکر ہے۔ اس کا اردو نام گندنا ہے اور وہ بھی بدبودار ہوتا ہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب مایکره من الثوم والبقول الخ...؛ فتح الباری، ۹/۷۱۱-۷۱۲ میں بھی "کراث" کا حوالہ ہے؛ مسلم، کتاب المساجد الخ؛ باب نهى من اكل ثوما اوبصلا او كراثا او نحوها: متعدد احادیث: ۶۸ (۵۶۴-۷۸) (۵۶۸)؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الثوم وغیرہ، احادیث: ۳۸۲۲-۳۸۲۹؛ حدیث مسلم: ۷۲ (۵۶۴) میں حضرت جابرؓ نے صحابہ کرام کے مجبوری میں پیاز اور گندنا کے کھانے کے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوایوب کے سوانحی خاکہ اسد الغابہ اور سیرت میں اس کا ذکر ہے)

چقندر/سلق

اس سبزی/ترکاری کے ساتھ جو (شعیر) کے ملانے کا ذکر ملتا ہے جس کا بیان ترکیبِ طعام میں آتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب الاطعمہ میں ایک خاص باب - باب السلق والشعير -

کے عنوان سے باندھا ہے اور اس میں صرف ایک واقعہ طعام کا ذکر کیا ہے مگر دوسری احادیث سے بعض اور واقعات بھی مل جاتے ہیں:

- حدیثِ بخاری: ۵۴۰۳ کے مطابق حضرت سہل بن سعد ساعدی خزرجیؓ کا بیان ہے کہ ہم جمعہ کے دن کا بڑی خوشی سے استقبال کرتے تھے کہ اس دن ایک بزرگ خاتون ان کو اور ان کے دوستوں کو چقندر کی جڑوں اور جو کے دانوں پر مشتمل کھانا کھلاتی تھیں۔ وہ بعد نماز جمعہ ہر ہفتہ کا یا معمول کا کھانا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر دوسری کتب میں بھی ہے۔

- دوسرا واقعہ ایک اور دعوت ہی کا ہے کہ، ترمذی اور ابوداؤد کی احادیث کے مطابق، رسولِ اکرم ﷺ حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت ام المنذرؓ کے گھر تشریف لے گئے تو خاتونِ خانہ نے چقندر اور جو (سلقا و شعیرا) پر مبنی کھانا تیار کیا اور رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھی اس کھانے میں شریک فرمایا کہ وہ ان کی صحت - بیماری کے بعد صحت - کے لیے بھی مناسب تھا، جب کہ اس سے قبل آپ ﷺ نے ان کو کھجور کی ایک خاص قسم کھانے سے روک دیا تھا کہ وہ ان کے لیے مضر تھی۔

(ترمذی/ ابوداؤد، کتاب/ ابواب الطب، باب فی الحمیة؛ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آشوب چشم میں امہات جرازین نامی کھجوریں نقصان دہ ہوتی ہیں جن سے حضرت علیؓ کو روکا گیا تھا۔ کھجور کے باب/ فصل میں ان کی متعدد اقسام کا ذکر آتا ہے)

اگرچہ دیگر کتب حدیث اور ان کی روایات میں بیشتر چقندر/ سلق کا ذکر ان ہی مذکورہ بالا واقعات کے حوالے سے آتا ہے تاہم یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چقندر کی سبزی ایک عام اور پسندیدہ چیز تھی۔ وہ بطور کامل غذا بھی استعمال ہوتی تھی اور اس کے اضافے سے سالن/ شوربہ بھی بنایا جاتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ کچھ کھانوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہو اور لوکی، کدو اور ترئی کی طرح اس سے سالن یا کھانے میں اضافہ کرنے کا کام لیا جاتا ہو۔ بخاری کے باب السلق والشعیر سے ایسا ہی گمان ہوتا ہے۔ (فتح الباری، ۹/۶۷۴-۶۷۵)۔ حافظ ابن حجرؒ کے مطابق حضرت امامؒ نے اس کا ذکر مختلف ابواب و کتب میں کیا ہے مگر سب میں واقعہ صرف ایک ہی ہے۔ البتہ فتح الباری میں چقندر کی غذائی افادیت پر خاصا کلام کیا گیا ہے کہ وہ دل و جسم کے لیے کافی مفید ہے۔

تلبینہ

یہ کھانا بھی روٹی پر مشتمل ہوتا تھا یا بھوسی سے یا آٹے سے بنایا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل ترکیب میں آتی ہے۔ لغوی اعتبار سے تلبینہ "بھوسی، دودھ، شہد سے بنا ہوا حریرہ" ہوتا تھا (مصباح اللغات)۔ دوسری تعریفات ترکیب میں آتی ہیں۔ واقعاتِ طعام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ثرید سے بھی تھا، بلکہ وہ ثرید کی تیسری قسم تھی: روٹی اور حیس کی ثرید کے علاوہ۔ مزید یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ثرید پر "اضافہ" کی حیثیت بھی رکھتا ہے کیونکہ اسے ثرید پر ڈال کر کھایا جاتا تھا۔ بہر حال اس کھانے کی نوعیت وحقیقت اس کے بنانے کی ترکیب سے زیادہ واضح ہوتی ہے جس پر محدثین کرام بالخصوص حافظ ابن حجرؒ نے کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں چند واقعاتِ طعام تلبینہ بیان کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے:

- بخاری کے باب التلبینۃ کی واحد حدیث: ۵۴۱۷ سے اس کھانے کی سماجی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کسی گھر میں موت ہو جاتی تھی تو اس غمی کے موقعہ پر عورتیں جمع ہوتی تھیں اور جب وہ سب چلی جاتیں اور صرف میت کے اہل اور خاص لوگ رہ جاتے تو تلبینہ کی ہانڈی چڑھائی جاتی، پھر ثرید بنائی جاتی اور اس ثرید پر تلبینہ ڈالی جاتی اور پھر سب عورتیں مل کر اسے کھاتیں۔ اس کی ایک خاصیت فرمانِ نبوی کے مطابق یہ تھی کہ وہ کھانا مریض کے دل کے لیے باعثِ سکون ہوتا تھا اور غم کا کچھ حصہ بھی دور کر دیتا تھا: "امرت ببرمة من تلبينة فطُبخت، ثم صُنع ثريد فُصبت التلبينة عليها، ثم قالت : كلن منها، فاني سمعت رسول الله ﷺ يقول: التلبينة مجمة لفواد المريض، تذهب ببعض الحزن"۔ اس حدیثِ بخاری کے دو مزید اطراف ہیں: ۵۶۸۹، اور ۵۶۹۰ اور وہ دونوں ان کی کتاب الطب کے باب التلبينة للمريض کی احادیث ہیں، ان میں صرف یہ بیانِ حضرت صدیقہؓ ہے کہ وہ تلبینہ مریض کے لیے بنانے کا حکم دیا کرتی تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسی جگہ اس کی شرح کی ہے اور اس میں اس کی ترکیب وافادیت پر زیادہ بحث کی ہے۔ دوسری احادیث اور ان کی کتب کے حوالے سے یہ بھی بتایا ہے کہ اس کھانے کا قریبی تعلق حساء/حیس سے بھی ہوتا تھا

کیونکہ ایک فرمانِ نبوی کے مطابق حساء کو تیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس کی افادیت بیان کی گئی تھی جس کا اوپر بھی حوالہ آچکا ہے۔

حیس

عربوں کا ایک پسندیدہ کھانا ''حیس'' نامی تھا۔ وہ کھجور، گھی اور ستو پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان تینوں چیزوں کو ملا کر جو آمیزہ تیار ہوتا تھا اسے حیس کہا جاتا تھا۔ اس کو بعض احادیث میں ثرید کی ایک قسم بھی بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ کھانوں میں سے ایک تھا: ''كان احب الطعام الى رسول الله ﷺ ... الثريد من الحيس ...''

(مسلم، كتاب الاطعمة، مذکورہ بالا؛ ابوداؤد، كتاب الاطعمة، باب فى اكل الثريد، حدیث ۳۷۸۳؛ مسلم، كتاب الصيام، باب جواز صوم النافلة الخ، حدیث ۱۶۹: کے مطابق ایک ہدیہ میں حیس آیا تھا اور آپ ﷺ نے نفل روزہ توڑ کر اسے تناول فرمالیا۔ یہاں یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کے نزدیک نفل روزے توڑنے پر قضا واجب ہوجاتی ہے جس کی اصل حدیثِ عائشہ وحفصہؓ میں ہے۔ ابوداؤد وغیرہ نے اس معنی کے ابواب باندھے ہیں)

حیس کا دوسرا نام حیساء بھی روایت میں ملتا ہے۔ اس کے کھانے کے بعض واقعات کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت فروہ بن عمرو بیاضیؓ کے مولیٰ حضرت ابوہندؓ نے خدمتِ نبوی میں غزوۂ بدر کے بعد حیس سے بھری ایک مشک پیش کی تھی۔ (ابن ہشام، ۱/۶۴۴)

۲۔ حضرت صفیہ بنت حیؓ سے شادی کے ولیمہ نبوی میں حیس کھانا ہی کھایا اور کھلایا گیا: ''صنع حيساً''۔

(حدیث بخاری، ۵۴۲۵؛ فتح الباری، ۹/ ۶۸۵، كتاب الاطعمة، باب الحيس، میں صرف یہی حدیث ہے؛ دوسری کتبِ حدیث نیز فصل برسویق/ستو میں اس پر کافی گفتگو کی جاچکی ہے۔ مزید ترکیبِ طعام میں آتی ہے)

۳۔ حضرت زینب بنت جحش اسدیؓ کی شادی پر حضرت ام سلیمؓ نے حیس/حیسہ کا ہدیہ بھیجا تھا۔ (بخاری، كتاب النكاح، باب الهدية للعروس)

۴۔ ترمذی کی ایک حدیثِ حضرت عائشہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ حساء کا کھانا بیماری میں دیا جاتا تھا کہ وہ باعث سکون تھا: "... اذا اخذ اھلہ الوعک امر بالحساء، فَصُنِعَ .." اس میں تلبینہ سے مشابہت ملتی ہے۔ (ابواب الطب، باب مایطعم المریض)

۵۔ بعض ہدایائے طعام کے ضمن میں حیس کے کاشانۂ نبوی میں آنے اور آپ ﷺ اور اہل بیت کے کھانے کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر بابِ ہدایا میں کیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ہدیہ میں آیا ہوا حیس پیشِ خدمت کیا اور آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا:

(ترمذی، ابواب الصوم، باب فی افطار الصائم المتطوع؛ ابوداؤد؛ حدیث: ۲۴۵۵)

دودھ/ دہی

تمام انسانی سماجوں کی مانند عربِ جاہلی اور اسلامی نبوی معاشرے میں اس نعمتِ الٰہی کا چلن عام تھا۔ وہ مویشیوں کے پالنے کے فن کے ساتھ مربوط ہے کہ وہ بھی زراعتی کاروبار کا ایک حصہ اور اس سے خاص طور سے متعلق ہے۔ زراعت کی ترقی سے قبل قبائلی اور دیہاتی سماج کے لوگوں کا غذائی انحصار صرف جانوروں کے دودھ پر تھا یا اس کے علاوہ وہ پھل پر انحصار کرتے تھے اور اس کے ساتھ گوشت ہی ان کا دوسرا غذائی مرحلۂ ارتقا بن جاتا تھا۔ دودھ دہی کے لیے خاص طور سے مویشیوں-اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری- پالنے کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا۔

(مکی عہدِ نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، باب/فصل چرواہی؛ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابہ کے واقعاتِ چرواہی؛ نیز ابن سعد، ۱/ ۱۲۵-۱۲۶: رسول اکرم ﷺ کی چرواہی کی احادیث و واقعات)

عرب جاہلی سماج میں مویشی پالنے اور ان کے دودھ سے استفادہ کرنے کی بہت روایات ملتی ہیں۔ کتبِ حدیث و سیرت و تاریخ میں اس پر اتنا مواد ملتا ہے کہ کئی ضخیم مقالے یا کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ اس کا استعمال بالعموم ایک مشروب کے طور پر کیا جاتا تھا اس لیے محدثین کرام نے کتاب الاشربہ میں اس پر اپنے ابواب باندھے جیسے بخاری کی کتاب الاشربہ میں "شرب اللبن وقول اللہ عزو جل . لبنا خالصا سائغا" اور "شرب اللبن بالماء وغیرہ"۔ دوسری

کتابوں کی کتاب الاشربہ کے ابوابِ لبن کا ذکر آگے آ تا رہے گا۔

(بخاری، ایضا؛ فتح الباری، ۱۰/ ۸۸-۹۸ و مابعد؛ نیز مفصل بحث کے لیے اگلا باب مشروباتِ نبوی ملاحظہ ہو؛ فتح الباری، ۶/۶۹۰ میں حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی زوجہ محترمہ کا کھانا گوشت کے ساتھ دودھ بھی تھا جیسا کہ حدیثِ ابی جہم میں ہے)

دودھ سیال ہونے کے سبب بلاشبہ ایک مشروب بن جاتا ہے لیکن اس کی ایک غذائی افادیت اور کھانے کی حیثیت بھی ہے۔ عرب جاہلی معاشرہ ہو یا اسلامی نبوی سماج، دونوں میں دودھ بطور طعام استعمال ہوتا تھا۔ مذکورہ بالا آیتِ قرآنی -سورۂ نحل:۶۶- کی تفسیری روایات اور دوسری احادیث میں بھی اسے ایک غذا کہا گیا ہے۔ مشروب کی حیثیت سے اس کا ذکر اپنے مقام پر آتا ہے۔ یہاں اس کی طعامی یا غذائی حیثیت کا مختصر ترین ذکر کیا جاتا ہے۔ دودھ میں غذائی عناصر اتنے ہوتے ہیں کہ وہ ایک پورے کھانے -کامل طعام- کا کام دیتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور دوسرے عرب عوام وخواص صرف دودھ کے کھانے پر قناعت کر لیتے تھے جیسا کہ متعدد روایات وواقعات بتاتے ہیں۔

دودھ/ دہی سے بنی غذائیں

دودھ سے متعدد دوسرے کھانے (طعام) تیار کیے جا سکتے ہیں اور عرب سماج میں کیے جاتے تھے۔ ان میں سب سے خالص اور اول دہی تھا۔ اس کی تیاری کا طریقہ بہت سادہ تھا کہ دودھ کو کسی طرح جمالیا جاتا تھا اور وہ بطور غذا/ طعام استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں کسی خاص چیز کے ملانے یا کسی مشکل ترکیب کی ضرورت نہ تھی۔ دہی کا ایک استعمال دودھ کی طرح یہ بھی تھا کہ وہ اصل طعام/غذا کی ایک امدادی چیز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا یعنی گوشت، سبزی وغیرہ میں دہی کا اضافہ کر کے اس کا شوربہ بڑھالیا جاتا تھا اور کھانے کی نوعیت بدل دی جاتی تھی۔ قدیم روایات واحادیث میں دہی کے نام واستعمالِ عام کا تذکرہ ذرا کم ملتا ہے۔ اس سے شک پیدا ہوتا ہے کہ اس کا چلن نہ تھا لیکن یہ شک وقیاس بے معنی ہے کہ دودھ کو بطور غذا استعمال کرنے والے معاشروں کے لوگ اس کے متنوع استعمالات کے علاوہ اس سے متعدد غذائیں بنانے کا

فن جانتے تھے اور ان غذاؤں کو استعمال کرتے تھے۔ لغوی اعتبار سے دودھ کے لیے صرف اللبن کا ذکر آتا ہے جس کی جمع البان ہے البتہ تھوڑے دودھ کو لَبَنَۃ بھی کہتے ہیں۔

(مصباح اللغات، دہی کے لیے لبن کا استعمال نہیں مل سکا مگر جدید عربی میں لبن کے معنی اب دہی کے ہیں اور دودھ کے لیے حلیب استعمال ہوتا ہے)

حدیث وسیرت کی روایات میں ان لبنی/ دودھ کی بنی ہوئی غذاؤں میں سے متعدد کا ذکر آتا ہے:

"اقـط": پنیر کا استعمال اور بطور غذا نام بہت معروف تھا اور وہ مقبول کھانا بھی تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے: وهو جبن اللبن المستخرج زبده" (وہ اس دودھ کا کھوجڑ ہوتا ہے جس کا مکھن نکال لیا جاتا ہے)۔ اس کی دوسری تعریفات اور تراکیب کا بھی ذکر ملتا ہے اور بطور غذا استعمالِ عام کا بھی۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ ہمارا کھانا جو، پنیر، کھجور اور خرما ہوتا ہے: "كان طعامنا الشعير والزبيب والاقط والتمر"۔

"سـمـن": گھی، دودھ سے بنی ہوئی اور اس سے نکالی ہوئی چکنائی ہوتی ہے جو مختلف طرح سے کام آتی ہے۔ اسے روٹی وغیرہ کے ساتھ بطور سالن کھایا جاتا تھا اور اس کو گوشت، سبزی وغیرہ پکانے کے لیے بطور تیل بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

"زبد": مکھن جو دودھ کے اوپر آجاتا ہے۔ وہ بالائی پر بھی مشتمل ہوتا ہے اور گھی کی طرح دودھ سے نکالا بھی جاتا ہے۔

"ودک": چربی کے معنی میں اصلاً آتا ہے لیکن بسا اوقات اس کا ذکر بطور مکھن یا گھی بھی آتا ہے۔ بہر حال چربی حاصل کرنے کے دو طریقے تھے: ایک جانوروں کی چربی ہوتی تھی اور دوسرے دودھ سے حاصل کی جاتی تھی اور تیسری قسم بھی تھی جو سرسوں وغیرہ مختلف زرعی فصلوں سے حاصل کی جاتی تھی۔

اقط/ پنیر

بخاری، کتاب الاطعمة، باب الاقط، حدیث: ۵۴۰۲ کے علاوہ ترجمۃ الباب میں اقط

کی حدیث بھی ہے۔ ترجمۃ الباب میں حضرت انسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں کھجور اور گھی کے علاوہ پنیر بھی تھا: "فالقیٰ التمر والاقط والسمن"۔ حدیثِ دیگر میں ایک ہدیہ کا ذکر ہے جو ام المومنین کی بہن اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک خالہ حفیدہ بنت الحارثؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو ہدایائے طعام پیش کیے تھے ان میں پنیر بھی تھا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پنیر کھایا تھا: "اھدت خالتی الی النبی ﷺ ضبابا واقطا ولبناً ... واکل الاقط"۔

(بخاری، مذکورہ بالا؛ فتح الباری، ۹/۶۷۴: اقط پر حضرت حافظ کی مذکورہ بالا تعریف اسی مقام پر ہے اور اس کی مفصل تفسیر باب زکوۃ الفطر وغیرہ میں ہے)

- حدیثِ بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ قبل العید: وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ پنیر (اقط) اہلِ مدینہ کا عام اور معروف کھانا تھا۔ دوسری احادیث اس کا تائیدی بیان پیش کرتی ہیں۔ اگلے مباحث میں ان کا ذکر آتا ہے۔

- ذیل کے واقعہ اور دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پنیر اہلِ مکہ اور قریش کا بھی ایک پسندیدہ کھانا تھا۔

- دراصل پنیر تمام مویشی پالنے والے معاشروں کا ایک پسندیدہ کھانا ہے اور سبزی خوروں کے ہاں بہت مقبول ہے۔

- حمس پر دورانِ حج جن پابندیوں کا ذکر عرب جاہلی روایات میں آتا ہے ان میں سے بعض کا تعلق کھانے سے بھی ہے۔ دورانِ حج وعمرہ یا بحالتِ احرام ان پر واجب تھا کہ وہ اس مدت میں نہ تو پنیر بنائیں اور نہ ہی گھی نکالیں۔ اسی طرح حِل کے علاقوں سے آنے والے حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ حلال مقامات سے لایا ہوا اپنا کھانا کھائیں: "لاینبغی للحمس ان یاتقطوا الاقط، ولایسلئوا السمن وھم حُرُمٌ ... لاینبغی لاھل الحل أن یاکلوا من طعام جاء وا بہ معھم من الحل الی الحرم..." (ابن ہشام، ۱/۲۰۲)۔
یہ پابندیاں خودساختہ تھیں جو اسلامی عہد میں ختم ہوگئیں لیکن ان سے چند واقعات کا ثبوت ملتا ہے اور ان میں کھانا پکانے/ بنانے اور کھانے وغیرہ کی روایاتِ عرب بھی شامل ہیں۔

مکھن

دودھ ویسے ہی رسول اکرم ﷺ کو مرغوب تھا اور عام عربوں کا سب سے عام اور مقبول کھانا/ کھاجا تھا۔ اس سے بنی ہوئی بہت سی اشیاء بھی مرغوب کھانوں میں آتی تھیں اور ان میں مکھن (زبد) بہت ہی پسندیدہ تھا۔ مکھن کا استعمال بطور شوربہ اور سالن بھی کیا جاتا تھا کہ روٹی اور گوشت میں اس کو ملا کر اس کی لذت بڑھائی جاتی تھی اور بعض دوسری چیزوں کے ساتھ بھی اس کو کھایا جاتا تھا۔ عربوں میں شاید قدیم سے رواج چلا آ رہا تھا کہ وہ کھجور کے اندر یا اس کے ساتھ ملا کر مکھن کھاتے تھے۔ اس کی کئی احادیث وروایات ملتی ہیں اور بیشتر کا تعلق ہدایا سے ہے یا دعوتوں سے۔ ان میں سے بعض کا ذکر بطور طعام یہاں کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان کے اپنے مقام پر آتی ہے:

- آیتِ کریمہ: "ان شجرة الزقوم" (دخان:۴۴) کی شانِ نزول کے حوالے سے ایک واقعہ وتفسیر ملتی ہے۔ اس کے لغوی معنی "دردی الزیت" ہیں اور ابوجہل مخزومی نے قریش کے لوگوں کو مکھن اور کھجور (زبد وتمر) کی دعوت دی تھی اور اسی کو زقوم کہا تھا۔ (بلاذری، ۱/ ۱۲۷)

- حدیثِ ابن ماجہ: ۳۳۳۴ کے مطابق رسول اکرم ﷺ کے ایک زیارتی دورے کے دوران مکھن اور کھجور کا کھانا پیش کیا گیا تھا اور آپ ﷺ مکھن بہت پسند کرتے تھے: "... وکان یحب الزبد، ﷺ"۔ ایسا لگتا ہے کہ مکھن کو کھجور کے اندر گٹھلی نکال کر کھانے کا رواج عہد نبوی سے پہلے سے تھا اور رسول اکرم ﷺ نے بھی اسے پسند کیا۔ حضرت بسر سُلمیؓ کے دو فرزندوں نے رسول اکرم ﷺ کو اس سے قبل مکھن اور کھجور پیش کی تھی جو آپ ﷺ نے تناول فرمائے۔

- بعد کے زمانے میں جب مرفہ الحال اور دولتمند مسلمانوں نے مکھن کے ساتھ کھجوریں کھانے کا عمل جاری رکھا تو اسے مالداری کا تکبر قرار دیا گیا جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ وہ کھجوروں کی عمدہ اقسام اور مکھن (الوان التمر والزبد) کھاتے تھے: حدیث مسلم: ۳۴ (۲۹۷۷)

- روٹی کے ساتھ مکھن کھانے یا مکھن کو بطور سالن استعمال کرنے کی روایت بھی عہد نبوی

میں رائج و موجود تھی۔ اور روٹی کے آٹے میں بھی اسے ملا کر روٹی پکانے کا طریقہ بھی خوشحال طبقات میں موجود تھا جیسا کہ ہدیۂ حضرت ام سلیم سے معلوم ہوتا ہے۔

شیریں کھانے

انسانی نظامِ معاشرت بالخصوص کھانے پینے کے رسوم وروایات میں میٹھی چیزوں کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ وہ بالعموم اصل کھانوں سے الگ، ممتاز اور مخصوص کھانے تھے جن کو ایک لحاظ سے اضافاتِ طعام بھی کہا جا سکتا ہے اور سننِ طعام بھی کہ وہ کھانے کی تکمیل کرتے ہیں اور بالعموم کھانا کھانے کے بعد کھائے جاتے ہیں یا کسی اور وقت میں بطور تفکہ تناول کیے جاتے ہیں۔ ان میں زیارتوں اور ملاقاتوں کے اوقات کے علاوہ صبح وشام کا ہلکا پھلکا اُکل ونُقل بھی شامل ہے اور لذتِ کام ودہن کا تقاضا بھی۔ ان میں سے اکثر وبیشتر بلکہ کھجور اور پھلوں کے سوا باقی میں غذا۔ بھرپور غذا یا طعامی عنصر۔ نہیں ہوتا لہٰذا وہ پیٹ نہیں بھرتے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ شارحین نے رسول اکرم ﷺ کے میٹھا (حلویٰ) پسند کرنے کے یہی معنی لکھے ہیں کہ آپ ﷺ اس کو بطور تفکہ تناول فرماتے تھے اور اس سے پیٹ نہیں بھرتے تھے۔

(فتح الباری، ۶۸۹/۹ ومابعد: بخاری، باب الحلویٰ والعسل کی احادیث)

عرب معاشرہ میں بالخصوص مدنی سماج میں کھجور کا چلن بہت تھا۔ وہ بطور شیرینی بھی کھائی جاتی تھی اور بطور طعام بھی کیونکہ کھجوروں کی بہتات اور عمدہ اقسام کے سبب اس کو عام اور معمول کے کھانوں کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں کھانا سمجھ کر کھایا جاتا تھا جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث سے اہل بیتِ نبوی کے طعامِ روزمرہ کا ذکر ملتا ہے کہ دو دو مہینے اسی پر گذارا ہوتا تھا۔ بہت سے صحابہ کرام بھی اسی طرح کھجور پر دن گذارتے تھے اور اناج وغلہ اور گوشت سبزی وغیرہ کی جگہ اس کو کھاتے تھے۔ اسی طرح دعوتوں میں اور زیارتوں میں کھجور کھانے اور کھلانے کا رواج عام تھا۔ ان کا ذکر ان مباحث میں آتا ہے۔ یہ بطور تفکہ تھا۔

دوسری میٹھی چیزوں میں شہد کا مقام دوسرا تھا۔ اس کی غذائی افادیت، جسم وجان کے لیے شفا ہونے کی خصوصیت اور عام دستیابی کی صورت نے اس کو مقبولِ عام شیرینی بنا دیا تھا۔

صبح وشام اس کا استعمال بطور تفکہ ملتا ہے یا زیارتوں میں اس کا مشروب یا خالص استعمال بھی عام تھا۔ خاص تقریبات جیسے سقایۂ حجاج پر بھی اس کا چلن تھا۔

عام میٹھی چیز۔ حلویٰ/ حلوا۔ کا ذکر بھی کھانوں میں آتا ہے اور وہ بھی سنتِ طعام یا قسمِ تفکہ معلوم ہوتی ہے، اصل کھانا نہیں، وہ کھجور یا شہد وغیرہ قدرتی چیزوں سے بنی ہوئی چیزوں اور کھانوں پر مشتمل ہوتی تھی جیسے نبیذ، تلبینہ، حیس وغیرہ۔ محدثین نے، اوران سے زیادہ شارحین نے وضاحت کی کہ مصنوعی میٹھے عام یا معروف نہ تھے لہٰذا شکر/ قند وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا۔ امام لیث کے مطابق حلویٰ ہر میٹھی کھانے والی چیز کو کہا جاتا تھا: ”وھو کل حلو یو کل “ مگر امام خطابی کا کہنا ہے کہ جب تک اس میں بنانے کی صنعت شامل نہ ہو اس پر حلویٰ نام کا اطلاق نہیں ہوتا: ”اسم الحلویٰ لایقع الاعلی ما دخلته الصنعة“۔ ابن سیدہ کا بیان ہے کہ ہر کھانا جس میں میٹھا ملایا جائے: ”ھی ماعولج من الطعام بحلاوۃ “ اور پھل پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

(فتح الباری، ۹/۶۸۹)

کھجور

مدینہ منورہ میں بالخصوص کھجور رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے ساکنانِ شہر کا خاص کھانا بن گئی تھی کیونکہ وہ مقامی پیداوار بھی تھی اور اس کی بہت سی اقسام بھی تھیں جن میں سے بعض بہترین اقسام صرف مدینہ میں پیدا ہوتی تھیں۔ ترمذی وغیرہ میں ہے کہ مدینہ میں لوگوں کا کھانا جو اور کھجور تھا: وکان الناس انما طعامھم بالمدینة ”التمر والشعیر“ (تفسیر القرآن، سورۃ النساء)۔ مکی عہد اور معاشرہ میں کھجور کو یہ مقامِ خاص حاصل نہ تھا کہ وہ مقامی پیداوار نہ تھی اور مدینہ وغیرہ سے وہاں درآمد کی جاتی تھی۔ تاہم وہ قریشِ مکہ اور دوسرے اعلیٰ طبقات کی بہر حال پسندیدہ غذا تھی اور وہ اس کو بطور خاص مدینہ منورہ سے درآمد کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے والد ماجد کو ایک روایت کے مطابق مدینہ سے کھجوریں لانے ہی بھیجا گیا تھا اور اسی سفر میں ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ جس طرح دوسرے مقاماتِ عرب کے لوگ اس کو درآمد کرتے تھے اور اپنی غذا کا خاص حصہ بناتے تھے جو غیر معمولی کھاجاتا تھا۔ مدنی سماج میں البتہ وہ عام، مقبول ترین

اور دستیاب غذا تھی اور بسا اوقات واحد غذا بن جاتی تھی جب دوسری غذائیں یا کھانے مہیا نہیں ہوتے تھے۔ احادیث میں اسی کھجور اور پانی پر مشتمل کھانے کو "الاسودین" (دوسوادوں) کا نام دیا گیا ہے۔ محدثینِ کرام نے اس کی مقبولیت اور شمولیت کی عمومیت کے مدنظر اپنی اپنی کتب الاطعمہ میں "باب التمر" ضرور قائم کیا ہے۔ اور اس کے تحت کھجور کے استعمال کے واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ واقعات دوسرے ابواب وکتبِ حدیث میں بھی ملتے ہیں۔

(بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی ﷺ واصحابه الخ: "الاسودان: التمر والماء"؛ نیز کتاب الاطعمة، باب من اکل حتی شبع، باب الرطب والتمر وغیرہ؛ نیز دیگر ابواب؛ ابوداؤد، باب الاقران فی التمر عند الاکل وغیرہ ؛ابن سعد، ۱/۲۱: مضر کے ایک قافلہ کی ملاقاتِ نبوی کے دوران دونوں کے پاس صرف اسودان ہی کا زادِ راہ تھا: مالنا زاد الا الاسودان الخ)

ان احادیثِ اسودین کا پس منظر بھی بہت اہم ہے جو مختلف بیاناتِ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر مبنی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پورا ماہ گذر جاتا جس میں گھر میں چولھا نہ جلتا سوائے اس کے کہ تھوڑا سا گوشت مل جایا کرتا تھا: "کان یاتی علینا الشهر مانوقدفیه نارا، انما هو التمر والماء، الا ان نوتیٰ باللُحیم" ۔ دوسری روایت میں ہے کہ دو ماہ میں ہم تین تین ہلال (نئے چاند) دیکھ لیتے اور رسولِ اکرم ﷺ کے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی... ہمارا کھانا کھجور اور پانی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ رسول اکرم ﷺ کے انصاری پڑوسی تھے جن کے پاس دودھاری اونٹنیاں تھیں اور وہ اپنے گھروں سے دودھ کے عطایا بھیجا کرتے تھے اور ہم کو ان سے شاد کام کرتے تھے۔ اس پس منظر میں خود ان احادیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

(بخاری، کتاب الادب/ کتاب الرقاق، کیف کان عیش الخ وغیرہ؛ نیز مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کی احادیث اور ان کی شرح)

کھجور کی اقسام

احادیث میں بالخصوص کھجور کی متعدد اقسام کا ذکر آتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا نام بھی الگ الگ ہے۔ بخاری کی کتاب الاطعمہ میں کھجوروں کے کھانے سے متعلق متعدد ابواب ہیں جیسے باب الرطب والتمر الخ، باب اکل الجمّار، باب العجوۃ، باب القِران فی التمر۔

اوران کے کھانے کی سنتوں کے علاوہ ان کے سماجی پس منظر و اقدار بھی ہیں۔ ان اقسام کے معنی میں اوران کی قیمتِ طعام میں خاصا فرق ملتا ہے۔ ان کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ تمر: خرما، واحد: تمرۃ ج تمرات وتمور وتمران (مصباح اللغات)۔ کھجور کا عام عربی نام ہے۔

۲۔ البُسر: تازہ یا گدر کھجور، واحد: بُسرۃ ج بسار. (مصباح اللغات/ترمذی، ابواب الزہد)

۳۔ الرطب: پختہ تازہ کھجور، واحد: رطبۃ ج رطاب وارطاب.

(مصباح اللغات/ بخاری: التمر والرطب)

۴۔ "الجمار والجمور": "درختِ خرما کا گوند جو چربی کی طرح سفید ہوتا ہے"

(مصباح اللغات/ بخاری: الجمار)

۵۔ العجوۃ: عمدہ قسم کی کھجور (مصباح اللغات)۔ وہ مدینہ منورہ کی بہترین کھجور ہے اور سب سے زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔

۱:۲۔ اولین باب میں حدیثِ بخاری: ۵۴۴۲: میں ہے کہ عہد نبوی میں ہم "اسودین" یعنی تمر/ خرما اور پانی سے سیراب ہوتے تھے۔

- رطب کے حوالے سے حدیثِ بخاری: ۵۴۴۳ میں بیان ہے کہ حضرت جابرؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو پختہ تازہ کھجوریں کھلائیں۔

۳۔ بُسر کا ذکر حضرت ابو الھیثم بن التیہان انصاریؓ کی دعوت کے حوالے سے ترمذی نے ابواب الزھد میں کیا ہے۔

بلاذری کی روایت میں رطب کی تین اقسام- عجوۃ، ابن طاب اور امہاتِ جراذین- کا ذکر ان ہی صحابیؓ کے حوالے سے ہے۔

۴۔ ۵۴۴۴ کی حدیثِ بخاری میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک درختِ خرما کا گوند لایا گیا جو آپ ﷺ نے تناول فرمایا۔

۵۔ عجوہ کے باب میں حدیثِ بخاری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہر دن سات عجوہ نامی کھجوریں کھالیں تو اس دن اسے کوئی زہر یا جادو نقصان نہ پہونچا سکے گا:

"من تصبح کل یوم سبع تمرات عجوۃ لم یضرہ فی ذلک الیوم سمٌّ ولا سحرٌ"۔

۶۔ آخری بابِ بخاری کی حدیث: ۵۴۴۶ کے مطابق لوگ مختلف قسم کی کھجوریں ملا کر کھا رہے تھے تو حضرت ابن عمرؓ نے اس کی ممانعتِ نبوی بیان کی۔

(بخاری، مذکورہ بالا؛ فتح الباری، ۹/ ۷۰۰-۷۰۸؛ آخری باب پر بحثِ حافظ کافی طویل ہے؛ نیز دیگر کتبِ حدیث)

کھجور کھانے کے واقعات

اس موضوع پر تمام روایات واحادیث کا احاطہ کر کے بحث و تجزیہ کیا جائے تو پوری کتاب التمر مرتب ہو جائے گی۔ واقعاتِ طعام کے لحاظ سے صرف چند روایات و احادیث کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ایک حصہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے کھجور کھانے کے واقعات ہیں اور دوسرے میں صحابہ کرام اور صحابیاتِ طاہرات کے نمونے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کے مطابق ہمارا کھانا جَو تھا یا سوکھا انگور یا پنیر یا کھجور: وکان طعامنا الشعیر والزبیب والاقط والتمر"۔

(بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ قبل العید؛ نیز حدیثِ ترمذی مذکورہ بالا کہ مدینہ کے لوگوں کا کھانا کھجور اور جو تھے)

سنتِ تمر

-حضرت جابرؓ کے ساتھ ایک انصاری خاتون کے گھر تشریف لے گئے تو گوشت کھانے کے بعد تازہ کھجوروں (رطب) سے بھری تھالی پیش کی اور آپ ﷺ نے اس سے تناول فرمایا: ترمذی، حدیث: ۸۰۔

-عید الفطر کے دن عیدگاہ جانے سے قبل چند کھجوریں (تمرات) کھا کر تشریف لے جاتے تھے۔

(ترمذی حدیث: ۵۴۳؛ دوسرے باب ماجاء مایستحب علیه الافطار میں رطبات، تمیرات کا ذکر ہے)

-رسولِ اکرم ﷺ کے کھانے کے ہدایا میں کھجوروں (تمر، رطب) وغیرہ کے ہدایا بھی آتے تھے جیسے حضرت ام سلیمؓ نے حضرت انسؓ کے ہاتھ ایک پیمانہ بھر کھجوریں بھیجی تھیں۔

("بمکتل فیه رطب": حدیثِ ابن ماجہ: ۳۳۰۳)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مطابق اہل بیت نے فتحِ خیبر تک کھجوروں کو آسودہ ہو کر نہیں کھایا۔ (بخاری، باب غزوۃ خیبر)

- رسول اکرم ﷺ اور اہل بیت اپنے زائروں اور مہمانوں کو بسا اوقات کھجوریں کھلاتے تھے جیسا کہ حکم بن حزن کلفیؓ کا تجربہ ملتا ہے۔ (حدیثِ ابوداؤد: ۱۰۹۶)

- زیاراتِ نبوی کے دوران بھی رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کو کھجوروں کا توشہ پیش کیا جاتا تھا جیسے حضرت ابو الھیثم کی دعوت میں میزبان مکرم نے "رطب وبسر" دونوں سے ان کی تواضع کی تھی (ترمذی، ابواب الزھد، باب فی معیشۃ اصحاب النبی)۔ حضرت ام سلیمؓ نے رسول اکرم ﷺ کو کھجور اور گھی کھلایا۔ (بتمر وسمن)

- حضرت ابو الھیثم کی ایک دعوتِ زیارت میں تازہ کھجوروں کی تین قسموں کا ذکر ہے:
"واتی بالوان من الرطب : عجوۃ، وابن طاب وامھات جراذین"۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور میزبانوں کے ساتھ آپ ﷺ نے ان کو تناول فرمایا تھا۔ (بلاذری، ۱/۵۳۵)

- عقیقہ کے ابواب میں نومولود بچوں اور بچیوں کو کھجوروں سے تحنیک فرماتے تھے۔

(بخاری/مسلم، کتاب العقیقہ۔ تحنیک)

حضرت ابن زبیر کی تحنیک اسی طرح کی گئی تھی اور متعدد دوسرے بچوں کی تحنیک میں رسولِ اکرم ﷺ کھجور وغیرہ میٹھی چیز کو اپنے دہن مبارک میں نرم کرتے تھے پھر اس کا گودا نومولود کو چٹاتے تھے اور اس سے برکت حاصل کی جاتی تھی۔

(مسلم، حدیث: ۲۴ (۲۱۴۵)، ۲۵ (۲۱۴۵)، ۲۷ (۲۱۴۷) حضرت ابراہیم بن ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن زبیر اور عام بچوں کی تحنیک کے واقعات: "یؤتی الصبیان ... ویحنکھم")

تمر کھانے کے واقعاتِ صحابہ

ان واقعات کو بلا کسی ترتیبِ زمانی وطعامی کے پیش کیا جا رہا ہے اور صرف کھانے پر ارتکاز کیا جا رہا ہے تاکہ اس ثمرِ طیبہ کی روایاتِ طعام جمع ہو جائیں اور ان کی سماجی اور تہذیبی روایات واقدار بھی کسی قدر سامنے آجائیں:

- حدیثِ مسلم : ۱۴۷(۲۶۲۹) کے مطابق حضرت عائشہؓ کے پاس ایک عورت اپنی دو بچیوں کے ساتھ آئی اور کھانے کا سوال کیا۔ حضرت صدیقہؓ کے پاس صرف ایک کھجور اس وقت تھی، وہی اسے دے دی۔ عورت نے اس کے دو ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو دے دیے اور خود کچھ نہ کھایا اور اٹھ کر چلی گئی۔

- اگلی حدیثِ مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایک مسکین عورت کو تین کھجوریں دیں: ایک ایک اس کی دو لڑکیوں کو، لڑکیوں نے اپنی کھجوریں کھالیں اور ماں سے پھر مانگا۔ عورت اپنی کھجور کو توڑ کر اپنے منہ تک لے گئی تھی کہ اس کے دونوں ٹکڑے لڑکیوں کو دے دیے اور خود کچھ نہ کھایا۔

- دعائے نبوی کی برکت سے حضرت ابو ہریرہؓ کی لائی ہوئی چند کھجوروں میں خوب اضافہ ہوا اور وہ اس میں سے مدتوں کھاتے اور صدقہ کرتے رہے۔

(ترمذی، مناقب ابی هریرہ؛ یہ سلسلۂ برکت حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس سے عہدِ برکت کا خاتمہ مراد لیا ہے)

- حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے حضرت ابو بُردہ اشعریؒ کو ستو کے ساتھ کھجوریں (تمر) کھلائی تھیں۔ (بخاری، مناقب عبد اللہ)

- حضرت علیؓ کو اور حضرت صہیبؓ کو آشوبِ چشم میں جس کھجور کو کھانے کی ممانعت کی گئی تھی وہ امہات جراذین نامی تھی۔ (بلاذری، ۱/۱۸۲ اور مابعد)

- حضرت علیؓ نے سخت بھوک میں ایک یہودی کے باغ میں ڈول سے پانی نکالا اور ہر ڈول پر ایک کھجور پائی اور جب ہتھیلی بھر گئی تو ان کو کھالیا اور کام چھوڑ دیا۔ (ترمذی، ابواب صفة القیامة، ۲/۱۰۴-۱۰۵)۔ اسی میں ہے کہ صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ایک کھجور دی۔

- غزوات کے دوران صحابہ کرام بالعموم کھجوریں (تمر) کھاتے تھے جیسے سریۂ خبط کے آخر میں ایک ایک کھجور حصہ میں آئی تھی (موطا، کتاب الجامع)۔ اسیرانِ بدر کو روٹی کھلانے کے بعد انصاری صحابہ صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔ (ابن ہشام، ۱/۶۴۵)۔

-حضرت نضرؓ نے اور بعض روایات کے مطابق ایک گمنام صحابی نے جنت کی بشارت پاکر اپنے ہاتھ کی کھجوریں پھینک دی تھیں اور غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تھے۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة احد؛ نیز مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة ... وغیرہ)

-غزوات کے دوران بالعموم کھجوریں ہی کھانے کا سب سے بڑا حصہ ہوتی تھیں اور اجتماعی کھانوں میں ان کا جزو اعظم ہوتا تھا: بخاری و مسلم، احادیث غزوات/غزوہ خیبر وغیرہ۔

-حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نے اپنے زائروں کو "رطب ابن طاب" نامی کھجوریں کھلائیں تھیں: حدیث مسلم: ۱۲۰ (۲۹۴۲)

-بعد کے زمانے میں بقولِ حضرت نعمان بن بشیرؓ مسلمان کھجوروں کی عمدہ اقسام اور مکھن (الوان التمر والزبد) کھاتے تھے: حدیثِ مسلم: ۳۴ (۹۷۷)۔

کھجور اور ککڑی

بخاری کی کتاب الاطعمہ میں اس پر دو ابواب ملتے ہیں: باب القثاء، باب القثاء بالرطب۔ ان دونوں میں ایک ہی معنی کی دو احادیث ہیں: ۵۴۴۰، ۵۴۴۷۔ ایک تیسرے باب: "جمع اللونین- او الطعامین بمرة" کی حدیث: ۵۴۴۹ بھی اسی معنی کی ہے۔ لیکن حضرت امام کے دو اولین ابواب کی حکمت یہ ہے کہ انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ککڑی کھانے کے واقعہ کو اسی حدیث سے ثابت کیا ہے حالانکہ حدیث میں کھجوروں کے ساتھ اسے کھانے کا ذکر ہے۔ متنِ حدیث یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ککڑی کے ساتھ کھجوریں ملا کر کھانے کا مشاہدہ کیا تھا: "رایت النبی ﷺ/ رسول اللہ ﷺ یاکل الرطب بالقثاء"۔ ترمذی کے باب اکل القثاء بالرطب میں بھی اسی کی تصدیق ملتی ہے اور دوسرے ابواب و کتبِ حدیث سے بھی۔ کھانے کا طریقۂ نبوی ایک دوسری روایت یا تشریح سے یہ ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنے جانب ککڑی رکھی تھی اور بائیں طرف کھجوریں تھی: ایک مرتبہ اُدھر سے تناول فرماتے اور دوسری طرف اِدھر سے۔

-ککڑی کی افادیت، صحت کی دین اور طبی خصوصیت کا ذکر حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث

میں آیا ہے۔ اس کی سماجی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے اور تمدنی ریت و رواج کا بھی اس میں ایک خاص عنصر ہے جو طبی صلاحیت پر مبنی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صدیقہؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو وہ ایک کمسن اور دبلی پتلی بچی تھیں اس لیے ان کی رخصتی میں تاخیر کی گئی۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کی والدہ ماجدہ کو حضرت عائشہؓ کی رخصتی کی فکر ہوئی لہٰذا ان کو خیال آیا کہ دولہن کو جلدی موٹا/فربہ کریں تاکہ وہ رخصتی کے بعد کے فرائض ادا کرنے کے لائق بن سکیں لہٰذا ان کو ککڑی کے ساتھ کھجوریں خوب کھلائی گئیں اور حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں خوب فربہ ہوگئی۔ اس معنی و مفہوم کی بعض اور روایاتِ نسائی کے علاوہ ابونعیم و ابن ماجہ سے نقل کی ہیں:

"ارادت امی تعالجنی للسمنة لتدخلنی علی النبی ﷺ، فما استقام لها حتی اکلت الرطب بالقثاء فسمنت کاحسن سمنة..."

(فتح الباری، ۹/ ۶۹۸-۷۰۰ نیز ابن ماجہ وغیرہ کی روایاتِ قثاء)

خربوزہ/ البطیخ

بعض موسمی اور زرعی پھلوں میں خربوزہ (بطیخ) کا ذکر ملتا ہے مگر عام طور سے کھجوروں کے ساتھ اسے کھانے کا ذکر آتا ہے اور اسی دوگانہ طعام کے عنوان سے مختلف کتبِ حدیث میں اس کے ابواب باندھے جاتے ہیں جیسے ترمذی میں ہے: حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ کھجوروں کے ساتھ کھاتے تھے: "أن النبی ﷺ کان یاکل البطیخ بالرطب"۔ اور باب کا عنوان ہے: باب فی اکل البیطخ بالرطب"۔ اس عنوان سے اور شارحین کے بعض بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خربوزہ یا دوسری چیزوں میں کھجوریں لذت بڑھانے کی خاطر ملا کر کھائی جاتی تھیں، شاید ان کی شیرینی کم ہوتی ہو۔ اسی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بہرحال خربوزہ ایک موسمی پھل تھا اور اس کا خالص استعمال بھی کیا جاتا تھا کہ وہ مدینہ منورہ وغیرہ میں بکثرت پیدا ہوتا تھا۔ محدثینِ کرام نے ککڑی، خربوزہ وغیرہ میں کھجوریں ملا کر کھانے کے ابواب اس لیے قائم کیے ہیں کہ دو طرح کے کھانوں یا پھلوں کے جمع کرنے کا جواز نکالیں اور دینی جہت بیان کریں۔

کھجور کے ساتھ خربوزہ کھانے کی متعدد روایات واحادیث کتبِ حدیث وترجمہ وغیرہ میں ملتی ہیں جن کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے:

- حافظ ابونعیم کی کتاب الطب میں حضرت انسؓ سے ایک حدیث یہ نقل کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ دائیں ہاتھ سے کھجوریں اور بائیں جانب سے خربوزہ تناول فرماتے تھے کہ وہ دونوں اسی طرح رکھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کو خربوزہ بہت پسند تھا: "کان یاخذ الرطب بیمینه والبطیخ بیساره، فیاکل الرطب بالبطیخ وکان احب الفاکهة الیه"۔

- اسی سند ومعنی کی ایک حدیثِ نسائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھجوروں اور خربوزے کو ملا کر کھاتے تھے: "رأیت رسول الله ﷺ یجمع بین الرطب والخربز"۔ یہ روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی مروی ہے۔

- خربوزہ کے پسندیدہ ترین پھل ہونے کا جملہ بتاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ بالخصوص اور دوسرے لوگ بالعموم صرف خربوزہ بھی کھایا کرتے تھے کہ اس کی افادیت اور لذت دونوں معروف تھیں۔ (فتح الباری، ۹/ ۶۹۸-۷۰۱ نیز بخاری، کتاب الاطعمہ کے دیگر ابواب وترمذی وغیرہ کی احادیث)

کھجور اور دودھ

میٹھے کھانے یا شیرینی کے استعمال کا ایک اور زاویہ یہ ہے کہ کھجور کو دودھ کے ساتھ ملا کر کھایا جائے۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک سنتِ طعام یہ بھی تھی، اور غالباً عام عرب دستور تھا کہ کھجور کو بعض دوسری چیزوں / کھانوں کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔ پانی کے ساتھ کھجور کھانا تو خالص غذائی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے اور پورا کھانا سمجھا جاتا ہے۔ محدثینِ کرام بالخصوص امام بخاری اور ان کے شارح حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے دونوں کھانوں یا ایک میوہ (فاکہہ) کے ساتھ کسی دوسرے شے کے ملا کر کھانے کی سنت کو غذائی معاملہ یا سماجی طریقہ نہیں سمجھا ہے بلکہ اس کے جواز کا دینی زاویہ قرار دیا ہے۔ امام نووی کا ایک تبصرہ وقول اسی جوازِ طعامین یا دواشیا کو ملا کر کھانے کے بارے میں ملتا ہے جسے ابن حجرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ اسی کے تحت یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابوخالدؓ کسی شخص (صحابی) کی خدمت میں گئے تو وہ کھجور کو دودھ کے ساتھ جمع

کرر ہے تھے۔ انھوں نے حضرت ابو خالدؓ کو بھی شرکت کی دعوت دی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو پاک ترین (الاطیبین) قرار دیا ہے۔ "...وھو یجتمع لبنا بتمر، فقال: ادن، فان رسول اللہ ﷺ سماھما الاطیبین" (فتح الباری، ۹/۱۰/۷)۔ اس روایت میں مضمر طور سے رسول اکرم ﷺ کے دودھ کے ساتھ کھجوریں کھانے کا ذکر ملتا ہے۔ صراحت کے ساتھ بھی بعض روایات میں اس کا ذکر آتا ہے۔

شہد / عسل

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو میٹھی چیزیں بہت زیادہ مرغوب تھیں: "کان یحب الحلویٰ"۔ اور ان میٹھی چیزوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ شے شہد تھی جس کا عربی نام عسل ہے۔ قرآن مجید میں شہد کی اس کی مکھیوں کے ذریعہ بناوٹ اور اس کی انسانی جسم کے لیے افادیت، شفاء اور غذائیت کا ذکر ہے۔

(سورۂ نحل-۶۹ "...یخرج من بطونها شراب مختلف الونه فیه شفاء للناس": نکلتی ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے کئی رنگ ہیں الخ۔ اس میں اگرچہ عسل کی بجائے شراب/مشروب کہا گیا ہے تاہم جنت میں صاف شہد کی نہروں کا ذکر ضرور کیا گیا ہے: "عسل مصفی" "سورۂ محمد-۱۵)۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الاطعمہ میں حلویٰ اور شہد کا متحدہ باب باندھا ہے: "باب الحلویٰ والعسل"، اس کی اولین حدیث: ۵۴۳۱ میں ان دونوں مرغوب چیزوں کی محبوبیت کا ذکر ہے: "کان رسول اللہ ﷺ یحب الحلویٰ والعسل"۔ اپنی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ رسول اکرم ﷺ روزانہ ایک پیالہ شہد پانی سے ملا ہوا نوش فرمایا کرتے تھے۔: "انه کان یشرب کل یوم قدح عسل یمزج بالماء"۔ ان کی بحث میں دوسرے بعض نکات بھی ہیں جیسے قدرتی طور سے میٹھی چیزیں مثلاً کھجور، شہد وغیرہ مرغوب تھیں، مصنوعی حلوے اس زمانے میں معروف نہ تھے اور میٹھی چیزیں دوسری چیزوں میں ملا کر کھا۔تے تھے جیسے کھجور دودھ کے ساتھ، کھجور اور مکھن، شہد اور پانی وغیرہ۔

- حدیثِ بخاری: ۵۴۳۲ میں ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ مساکین اور مہمانوں کی

خوب ضیافت کرتے تھے حتی کہ گھر میں کچھ نہ ہوتا اور صرف شہد کی کپی ہوتی تو اسی کو پیش کر دیتے اور بقول حضرت ابو ہریرہؓ ہم لوگ اسی کو چاٹ لیتے۔

-حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم مغازی/غزوات کے دوران شہد اور انگور پا جاتے تو ان کو کھا لیتے تھے اور سرکاری خزانہ مغانم میں جمع نہیں کرتے تھے: "کنا نصیب فی مغازینا العسل والعنب فناکله ولا نرفعه..."۔

(بخاری، فرض الخمس، باب مایصیب من الطعام فی ارض الحرب ؛ ترمذی، ایضا، باب حب النبی ﷺ الحلواء والعسل)

ضیافتِ خاص کا ایک حصہ صرف شہد پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا ذکر ازواجِ مطہرات کے حوالے سے بھی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کے باغاتِ طائف سے شہد آتا تھا اور وہ اسے خاص طور سے رسولِ اکرم ﷺ کے لیے رکھ چھوڑتی تھیں اور روزانہ جب رسول اکرم ﷺ اپنے ازواج مطہرات کے پھیرے میں ان کے گھر پہونچتے تھے تو شہد سے ضیافت کرتی تھیں۔ بعض دیگر احادیث وروایاتِ بخاری وغیرہ میں ام المؤمنین کا نام حضرت زینب بنت جحشؓ کا دیا گیا ہے۔ یہ دونوں صحیح ہو سکتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی تاخیر ہو جاتی اور دوسری ازواجِ مطہرات کو اپنی حق تلفی کا شکوہ ہوتا تھا۔ اس کے تدارک کے لیے حضرت عائشہ اور حضرت حفصہؓ نے ایک دن مل کر رسولِ اکرم ﷺ کے دہنِ مبارک سے مغافیر کی بو آنے کی بات الگ الگ کہی۔ بو آپ ﷺ کو ناگوار تھی لہذا شہد نہ پینے/کھانے کی قسم کھالی جس کا ذکر سورۂ تحریم کی اولین آیتِ کریمہ اور اس کی تفسیر میں ہے: "یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک..."

(تفسیر سورۂ تحریم؛ بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ التحریم: "کان رسول یشرب عسلاً عند زینب بنت جحش..."؛ مسلم، کتاب الطلاق، باب وجوب الکفارۃ الخ، حدیث: ۲۰ (۱۴۷۴) وغیرہ؛ بلاذری، ۱/۴۲۵، کان رسول اللہ ﷺ یاتی ام سلمة فی غیر یومها فتخرج له عکة عسل، فیلعق منها..." اسی میں بقیہ تفصیلات بھی ہیں۔ "غیر یومها" کی شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ان کی باری کے علاوہ دوسرے دن صرف شہد کی خاطر تشریف لے جاتے تھے یا روزانہ دورے پر جاتے تھے)

-حُجاج اور عمرہ کرنے والوں کے رفادہ اور سقایہ کے لیے مکہ مکرمہ کے صاحبانِ خیر سبیلیں

لگایا کرتے تھے اور ان میں سے بعض اصحابِ خیر بالخصوص حضرتِ ابن عباسؓ کے بنو اعمام لوگوں کو دودھ اور ستو کے علاوہ شہد بھی پلایا کرتے تھے جیسا کہ حدیثِ ابوداؤد :۲۰۲۱ میں ایک حوالہ آتا ہے اور کتبِ سیرت میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

-شہد کا کھانے سے زیادہ مشروبات میں شمار ہوتا ہے کیونکہ بالعموم اس میں پانی ملا کر اسے پیا جاتا تھا اگرچہ صرف چاٹ لینے کا ذکر بھی روایات میں آتا ہے پھر بھی وہ طعام/کھانا نہیں کہلایا جاسکتا جس طرح کھجور طعام بن جاتی تھی۔ امام بخاریؒ جیسے عبقری محدثین نے اسے کتاب الاطعمہ میں ضرور ذکر کیا ہے مگر حلوئی کے ساتھ اس کے اشتراک کے سبب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیرینی کی ایک چیز تھی اور ہے اور کھانے کے بعد بطور تکملہ، فاکہہ یا سنت کے کھائی جاتی ہے۔ بعض دعوتوں میں میٹھی چیز کے کھانے کھلانے کا ذکر اسی سنتِ طعام کے طور پر کیا گیا ہے اور وہ ہے بھی ایسی ہی سنتِ طعام۔ یا وہ زیارت کے مواقع پر بطور تفکہ کھائی اور کھلائی جاتی ہے جیسا کہ روایات ومباحثِ زیارت ودعوت میں اس کا بعض دوسری شیرینیوں کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔

بیر/ کباث

بخاری، کتاب الاطعمة، باب الكباث الخ کی حدیثِ واحد: ۵۴۵۳ کی زمانی توقیت سب سے اہم ہے اور اس کے چننے اور کھانے کی سماجی قدر بھی اور اس قدر کا دوسرے سماجی رواج - چرواہی - سے گہرا تعلق ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ ہم صحابہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مرالظہران نامی مقام پر تھے اور بیر چن رہے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تم لوگ اس میں سے کالے توڑو کہ وہ زیادہ/سب سے زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔ عرض کیا گیا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکریاں چراتے تھے؟ فرمایا: ہاں اور تمام انبیاءِ کرام نے بکریاں چرائی ہیں: "... كنا مع رسول الله ﷺ بمر الظهران نجني الكباث فقال: عليكم بالاسود منه فانه أيطب. فقيل: أكنت ترعى الغنم؟ قال: نعم، وهل من نبى الارعاها" ۔ حافظ ابن حجر نے ترجمۃ الباب اور بعد میں حدیث کی شرح پر کافی کلام کیا ہے۔ اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

- رسولِ اکرم ﷺ نے بعثت سے بہت پہلے اپنے لڑکپن میں اہلِ مکہ کی بکریاں قراریط کی اجرت پر چرائی تھیں۔

- اسی چرواہی کے زمانے میں آپ ﷺ نے بیروں کی اقسام سے واقفیت حاصل کی تھی اور سیاہ بیروں کو سب سے عمدہ اور میٹھا پایا تھا۔

- اس قسم کے تمام پھلوں اور پودوں/ درختوں کے ثمرات کو کھانا جائز ہے بشرطیکہ وہ مضر نہ ہوں۔

- کباث اور ورق الاراک وغیرہ کی مختلف تشریحات وتفصیلات مختلف شارحین کے حوالے سے کی گئی ہیں۔ (فتح الباری، ۹/۷۱۲-۷۱۳؛ نیز کتب حدیث وسیرت)

✪✪✪

کھانے کے اوقات

طعام صبح - غداء

عام طور سے احادیث نبوی اور روایاتِ سیرت میں صرف دو اوقاتِ طعام - غداء، عشاء - کا حوالہ مکی اور مدنی دونوں ادوار میں ملتا ہے۔ ہجرت کے سفر میں مدینہ سے ایک برید پہلے قیام کر کے آپ ﷺ نے اپنے رفقاء کے ساتھ بکری کا سوکھا گوشت غداء میں کھایا تھا۔ وہ راستہ میں ذبح کی ہوئی بکری کا بقیہ حصہ تھا (ابن سعد، ۳۱۲/۴)۔ مدنی دور میں اس کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے بعض احادیثِ صیام میں ذکر آتا ہے کہ صبح صبح آپ ﷺ گھر میں باہر سے تشریف لاتے اور صبح کا کھانا - غداء - طلب فرماتے اور وہ موجود نہ ہوتا تو روزۂ نفل رکھ لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے ''غداء'' نہ ملنے کی صورت میں نفل روزہ رکھ لیا اور پھر کہیں سے طعامِ صبح آ گیا تو تناول فرمالیا۔ اسی طرح بعض صحابہ کرام کے صبح کے کھانے - غداء - کا ذکر متعدد روایات میں آتا ہے۔ اور وہ اس کو معمول کا وقتِ طعام بتاتا ہے۔

(بخاری، کتاب الصوم، باب اذانوی بالنهار صوما ؛ فتح الباری، ۱۸۰/۴-۱۸۳ و مابعد۔ شارح گرامی نے مرفوع روایات بھی بیان کی ہیں اور حضرات صحابہ میں حضرات ابوالدرداء، ابوطلحہ، ابوہریرہ، ابن عباس اور حذیفہ کا تعامل بھی ترجمۃ الباب میں ملتا ہے؛ ترمذی، ابواب الصیام، باب فی افطار الصائم المتطوع:... کان النبی ﷺ یاتینی فیقول: أعندکِ غداء؟ ابوداؤد، باب الرخصۃ فی ذلک؛ ابن ہشام، ۶۴۵/۱ کے مطابق اسیرانِ بدر کو دونوں اوقاتِ طعام - غداء اور عشاء - میں صحابہ کرام بالخصوص انصاری صحابہ روٹی کھلاتے تھے اور خود کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے کیونکہ ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت نبوی تھی)

غداء عام طور سے دوپہر سے قبل کا کھانا ہوتا تھا مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصلاً دن کا کھانا تھا جو روزانہ دوپہر سے قبل کھالیا جاتا تھا مگر جمعہ کے روز بالعموم جمعہ کی نماز کے بعد ہی کھایا جاتا تھا۔ وہ سنتِ نبوی بھی تھی اور تعاملِ صحابہ بھی۔ حضرت سہل خزرجیؓ نے اپنی روایت میں، جس میں چقندر کے عمدہ کھانے کا ذکر ہے، اس کی صراحت کی ہے: ''ما کنا نقیل ولا

نتغدّی الا بعد الجمعة (زاد ابن حجر) فی عهدرسول الله ﷺ"۔

(مسلم، کتاب الجمعة، باب صلاة الجمعة الخ؛ حدیث: ۳۰(۸۵۹)

۔حضرت ام سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ حضرت عائشہ کے پاس تشریف لائے اور "غداء" طلب فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: ہمارے پاس روٹی، کھجور اور سرکہ ہے: "عندنا خبز وتمر وخل"، آپ ﷺ نے سرکہ کی تعریف کی۔ (حدیث ابن ماجہ: ۳۳۱۸)

۔بنو عبداللہ بن کعب کے ایک شخص نے حضرت انس بن مالکؓ سے بیان کیا کہ ہم پر اسلامی لشکر نے حملہ کیا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو غداء کھاتے ہوئے پایا، رسول اکرم ﷺ نے ان کو بھی کھانے میں شرکت کی دعوت دی حالانکہ ان کا نفلی روزہ تھا: "...فاتیت رسول الله ﷺ فوجدته یتغدّیٰ، فقال، ادن فکل الخ"

(ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی الصوم الخ؛ ابوداؤد، کتاب الصیام، باب اختیار الفطر وغیرہ)

صحابہ کرام کے کھانے کے اوقات

عرب سماج کے دستور کے مطابق صحابہ کرام اور دوسرے اکابر کے دونوں اوقاتِ طعام کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ بخاری کے ترجمۃ الباب میں اوپر متعدد صحابۂ کرام کا ذکر آیا ہے اور ان میں سے اکثر میں غداء۔دن کے کھانے۔کا حوالہ آیا ہے۔

غداء کے واقعات

۱۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ایک بار دن کے کھانے میں مرغی تناول کی اور حاضرین میں سے ایک شخص کو، جو بھوکا تھا، اپنے "غداء" میں شامل ہونے کی دعوت دی لیکن ان کو اس کھانے میں تردد ہوا تو حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا: آؤ، میں نے رسولِ اکرم ﷺ اسے کھاتے دیکھا ہے:

"..وانا لجلوس عنده، وهو یتغدیٰ دجاجا، وفی القوم رجل جالس فدعاه الی الغداء، فقال: انی رأیته یاکل شیئا فقذرته، فقال: هلّم، فانی رایت النبی ﷺ یاکله..."

(بخاری، باب قدوم الاشعریین الخ؛ کتاب الایمان والنذور، باب لاتحلفوا بآبائکم ..؛ کتاب

الصوم، باب اذا نویٰ بالنهار صوما؛ فتح الباری، ۴/۱۸۰-۱۸۳ کے متعدد مباحث واحادیث)

۲۔ حضرت ثمامہ بن اثال حنفیؓ کی اسلام سے قبل گرفتاری اور قید کے زمانے میں حکمِ نبوی کے مطابق مدنی صحابہ کرام ان کو صبح وشام کا کھانا پہونچاتے اور کھلاتے تھے: "... ان یُغدیٰ علیہ بھا ویُراح..." اس دوران وہ بہت زیادہ کھاتے تھے اور اسلام لانے کے بعد ان کا کھانا بہت کم ہوگیا تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی حدیثِ شریف کہ کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن صرف ایک آنت میں: "ان الکافر یاکل فی سبعة امعاء، وان المسلم یاکل فی معی واحد" اسی واقعہ کے بعد نازل ہوئی۔

(ابن ہشام، السیرۃ، ۲/۶۳۸-۶۳۹؛ بخاری، کتاب الاطعمة، باب الواحد یکفی الاثنین وغیرہ؛ مسلم، کتاب الاشربة وغیرہ؛ فتح الباری کے متعلقہ مباحث: حدیث بخاری: المومن یاکل فی معی واحد والکافر یاکل فی سبعة امعاء..." وغیرہ)

۳۔ حضرت ابوہریرہ دوسیؓ بے مال ومنال شخص تھے اور طلبِ علم کے جوش میں ہر وقت صحبتِ نبوی میں رہتے تھے لہٰذا کھانے کے لیے بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر منحصر تھے۔ وہ بالعموم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دن کا کھانا کھاتے تھے اور اس کے فوت ہوجانے کے خدشے سے بسا اوقات دوسرے کام ٹال جاتے تھے جیسا کہ موطا وغیرہ کی روایات واحادیث بتاتی ہیں:

"... ثم فرقت ان یفوتنی الغداء مع رسول اللہ ﷺ فآثرت الغداء مع رسول اللہ ﷺ.. (موطا، ماجاء فی قراءۃ قل ھو اللہ احد الخ؛ تنویر الحوالک، ۱/۲۱۱-۲۱۲)

۔نفل روزہ سے دن شروع ہونے اور دن کا کھانا مل جانے پر افطار کر لینے کا واقعہ ایک اور ہے۔ وہ دو امہات المومنین۔ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ صادقہ رضی اللہ عنہما۔ کے بارے میں ہے کہ ہدیے میں کھانا آنے پر انھوں نے افطار کرلیا تھا۔ یہ غداء کا واقعہ تھا۔ مگر اس افطارِ نفل پر رسولِ اکرم ﷺ نے ان دونوں کو روزہ کی قضا رکھنے کا حکم دیا تھا۔

(موطا، کتاب الصیام، قضاء التطوع؛ تنویر الحوالک، ۱/۲۸۴-۲۸۵؛ ابوداؤد، حدیث: ۲۴۵۷؛ ترمذی، ابواب الصوم، باب فی ایجاب فی القضاء علیه؛ امام ابوداؤد نے نفل روزہ کی قضا کا مسلک بیان کیا ہے)

۔حضرت زینب بنت جحش اسدیؓ سے شادی پر ولیمہ کا اہتمام دن میں کیا گیا تھا جب سخت

دھوپ تھی "حین اشتد النهار..."

(مسلم، کتاب النکاح، حدیث:۸۹(۱۴۲۸)؛ کتاب النکاح، حدیث:۸۷(۱۴۲۸) وغیرہ؛ بخاری، کتاب الاطعمة، فاذا طعمتم الخ: فاشبع الناس خبزا ولحما/ واطعم عليها يومئذ خبزا ولحما / بنی علی النبی ﷺ بزینب ابنة جحش بخبز ولحم" وغیرہ متعدد احادیث)

- رسولِ اکرم ﷺ کی بہت سی دعوتیں صحابہ کرام کے گھروں میں دن میں کی گئی تھیں اور زیارات کی دعوتیں بالعموم دن کی ہوتی تھیں جن کا ذکر دعوتوں کے باب میں آ رہا ہے۔

بخاری کے باب اذا نوی بالنهار صوما کے تحت ترجمہ الباب میں حضرات صحابہ کے اس تعامل کا ذکر آ چکا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ان صحابہ کرام میں سے، جن کے غداء کا واضح ذکر کیا ہے، وہ ہیں:

- حضرت ابوالدرداءؓ: "كان ابو الدرداء يغدونا احيانا ضحىً فيسأل الغداء..." چار احادیث میں مذکورہ بالا میں وقت ضحیٰ بیان ہوا ہے اور تیسری میں نصف النہار کا وقت ہے: "... حين ينتصف النهار..."۔

- حضرت ابوطلحہؓ: "..كان ياتي اهله فيقول : هل من غداء..." الخ۔

- حضرت معاذ بن جبلؓ: "وكان معاذ بن جبل يفعله..."۔

حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں پہلے حدیث گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے تعامل میں لفظ غداء کا واضح ذکر نہیں ہے۔

- تاہم متعدد دوسری احادیث وروایات سے حضرات صحابہ کرام کے غداء کھانے یا نہ کھانے کے بہت سے شواہد ملتے ہیں جو اس کو متواتر بنا دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بعض صحابہ کرام کے کھانا کھلانے کے واقعات میں ان دونوں اوقاتِ طعام- غداء/عشاء- کا ذکر ملتا ہے جیسے حضرت ابو برزہ اسلمی کے پیالۂ ثرید کے واقعہ میں ہے۔

رات کا کھانا: عشاء

دوسرا معمول کا کھانا رات کا تھا جو غالباً نمازِ عشاء کے قریب کھانے کے سبب اس نام سے موسوم ہوا تھا۔ اسی بنا پر ایک محاورہ عربی زبان میں اور ایک اسلامی حکم شریعت میں ایجاد ہوا:

"اَلعَشاء قبل العِشاء" یعنی رات کا کھانا نمازِ عشاء سے پہلے۔ یعنی رات کو بھوک لگی ہو اور نمازِ عشاء کا وقت آ جائے تو پہلے کھانا کھانا چاہیے اور نمازِ عشاء بعد میں ادا کرنی چاہیے کیونکہ نماز کی ادائیگی کے لیے سکونِ خاطر ضروری ہے اور تمام توجہ ہٹانے والی چیزوں سے فراغت ہونی لازمی ہے، اسی لیے دوسری ضروریات جیسے حوائج ضروریہ سے فراغت بھی نماز سے قبل کر لینی چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے شدید متبعِ سنت نبوی بھوک کے وقت پہلے کھانا کھا لیتے تھے اور مسجد میں نمازِ جماعت ہوتی رہتی تھی۔ اور وہ امام کی قراءت بھی سنتے رہتے تھے، تاہم نماز بعد فراغت ہی ادا کرتے تھے کہ یہی اسلامی وفطری حکم ہے۔ اور اس معنی کی احادیثِ نبوی اور آثار بھی مختلف کتبِ حدیث میں ملتے ہیں۔

(موطا، کتاب الجامع... والبدأ بالاکل قبل الصلاۃ":... ابن عمر کان یقرب الیہ عشاؤہ فیسمع قراءۃ الامام الخ)

(مصباح اللغات، مادہ عشو کے تحت مختلف مشتقات جیسے عشی یعشو عشوا، عشی العشاء، عشّیٰ تعشیۃ، اعشی اعشاء، تعشّی، العشاء / ج اعشیۃ وغیرہ کے معنی رات کا کھانا، کھانا کھانا اور کھلانا ہیں۔ مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب کراھۃ الصلاۃ بحضرۃ الطعام: "عن انس بن مالک... اذا حضر العشاء واقیمت الصلوٰۃ فابدؤا بالعَشاء"؛ نیز دوسری نمازوں اور اثرِ حضرت ابن عمرؓ وغیرہ: احادیث: ۶۴ (۵۵۷)، ۶۵ (۵۵۸)، ۶۶ (۵۵۹)، ۶۷ (۵۶۰) وغیرہ مع ان کے مکررات وغیرہ کے۔ بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب اذا حضرت العشاء الخ، حدیث: ۵۴۶۳: اذا وضع العَشاء واقیمت الصلوٰۃ فابدؤا بالعَشاء؛ فتح الباری، ۹/۷۲۳-۷۲۴ "...وقرب العشاء فکلوا ثم صلوا"۔ رات کے کھانے کی ضرورت وفضیلت بھی بعض روایات میں آتی ہے کہ ضرور کھانا چاہیے خواہ تھوڑا ہی ہو: تعشوا ولو بکف من حشف فان ترک العشاء مھرمۃ "ترمذی، کتاب الاطعمۃ، باب فی فضل العشاء)

رات کے کھانے اور کھلانے کے متعدد واقعات کا ذکر ان احادیثِ نبوی اور روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔ ان میں رسولِ اکرم ﷺ کے رات کے کھانے کے واقعات شامل ہیں اور صحابہ کرام کے کھانے کے معمولات بھی۔ ان کا ذکر مختصر ذیل میں دیا جا رہا ہے:

نبوی طعامِ شب

مختلف مسائلِ شریعت اور احکامِ معاشرت کے حوالے سے نبوی طعامِ شب کا ذکر آتا ہے:

۱۔ پردہ (حجاب) کے حکم اور عورتوں کے لیے کام سے باہر نکلنے کے حوالے سے ایک

حدیثِ بخاری ہے کہ رسول اکرم ﷺ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ حضرت سودہ بنت زمعہ ام المومنین نے آ کر حضرت عمرؓ کی شکایت کی کہ وہ میرے باہر نکلنے پر معترض ہوتے ہیں، آپ ﷺ نے ضرورت سے باہر نکلنے کی آزادی عطا فرمائی "... وھو فی حجرتی یتعشی"، (بخاری، کتاب النکاح، باب خروج النساء لحوائجھن)

اس کھانے میں وضاحت یہ ملتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے دستِ مبارک میں اس وقت "عرق"/شوربہ تھا، اس پر بحث کھانے کی اقسام میں آ چکی ہے۔

۲- مہمانوں کی اچانک آمد پر رسولِ اکرم ﷺ نے ضیافت کے لیے ان کو اپنے اصحاب میں مختلف لوگوں کے حوالے کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان میں سے تین کو اپنے گھر پہونچا آئے اور فرزند حضرت عبداللہ اور اہلیہ کو ان کی ضیافت کی ہدایت کر دی اور خود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا جیسا کہ ان کا روزانہ معمول معلوم ہوتا ہے:

"...وان ابابکر تعشی عند النبی ﷺ، ثم لبث حتی صلی العشاء، ثم رجع فلبث حتی تعشی رسول اللہ ﷺ..."

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب من اکل حتی شبع؛ فتح الباری، ۹/۶۵۲ ومابعد؛ نیز دوسرے ابواب وکتب بخاری؛ مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف وفضل ایثاره)

۳- مکی دور کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ غارِ ثور کے قیام کے دوران حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ دونوں مہاجرین- رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ- کے لیے رات/شام کا کھانا اپنے گھر سے لایا کرتی تھیں جو ان کے لیے مناسب اور کافی ہوتا تھا۔

(ابن ہشام، السیرة، ۱/۴۸۵-۴۸۶)

عشاء کے واقعات

صحابہ کرام میں سے بعض کے رات کے کھانے کا ذکر بہت اہتمام سے کیا جاتا ہے کہ اس میں دوسرے دینی اور سماجی مسائل وامور کا ذکر بھی آ تا ہے۔ ان کا پس منظر بھی بہت دلچسپ سماجی مطالعہ رکھتا ہے:

- حضرت ابوطلحہؓ کا ایک بچہ بیمار تھا اور اسی دوران وہ گھر سے باہر گئے تو بچے نے داعیٔ اجل

کو لبیک کہا۔ حضرت ابوطلحہؓ نے واپس آ کر بچہ کی صحت کے بارے میں اہلیہ سے پوچھا تو انھوں نے بڑا صابرانہ جواب دیا کہ وہ پہلے سے زیادہ سکون سے ہے پھر اہلیہ نے ان کو رات کا کھانا دیا اور انھوں نے نوش فرمایا: "فقربت الیه العشاء فتعشیٰ..."

(بخاری، کتاب العقیقة، باب تسمیة المولود الخ؛ مسلم، کتاب الادب، باب استحباب تحنیک المولود الخ؛ نیز دیگر کتب حدیث وسیرت وتراجمِ صحابہ)

-حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بعض مہمانوں کی ضیافت کی اور ان کی ضیافت کی ذمہ داری صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ کے سپرد کی مگر مہمانوں نے میزبان کی موجودگی کے بغیر کھانے سے انکار کر دیا حالانکہ گھر والوں نے ان سے بہت اصرار کیا بھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رات کا کھانا رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تناول کیا جیسا کہ ان کا دستور ومعمول تھا۔ بہر حال دیر سے گھر پہونچے تو مہمانوں کو بھوکا پا کر فرزند گرامی پر ناراض ہوئے اور اصل صورت حال جانی تو ان کے ساتھ پھر رات کا کھانا کھایا۔

(بخاری، کتاب الادب، باب مایُکرہ من الغضب الخ، نیز باب قول الضیف لصاحبه الخ؛ ابوداؤد، کتاب الایمان والنذور، باب فیمن حلف علی طعام لایاکله؛ فتح الباری، ۱۰/ ۶۵۷ ومابعد نیز مابعد باب؛ بخاری ومسلم کی احادیثِ عشاءِ نبوی)

-ایک اور انصاری صحابی کا واقعہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے ارشاد پر وہ ایک شخص کو اپنا مہمان بنا کر کھانا کھلانے لے گئے۔ بیوی نے بتایا کہ صرف بچوں کا کھانا باقی رہ گیا ہے۔ فیاض صحابی نے اہلیہ سے کہا کہ کھانا تیار کرو، اور بچوں کو سلا کر چراغ بجھا دو۔ اہلیہ شاکرہ نے یہی کیا۔ کھانا مہمان کے سامنے رکھا اور چراغ کی لو ٹھیک کرنے کے بہانے اسے بجھا دیا اور اندھیرے میں دونوں ہاتھ چلاتے رہے اور مہمان نے پیٹ بھر کر رات کا کھانا کھالیا۔ انصاری صحابی کی ادا ایسی پسند آئی کہ قرآن میں ان کی تعریف اتری۔

(بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب ویوثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة: "... اذا ارادوا عَشاء ...")

-مشہور تابعی حضرت ربیعہ بن عبداللہ بن الہدیرؒ نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور نماز پڑھ لی اور تازہ وضو نہیں کیا: "... انه تعشّی مع عمر بن الخطاب ثم

صلی ولم یتوضا" (موطا/تنویر، ۱/ ۴۸)

-مختلف وفود کی آمد پر رسولِ اکرم ﷺ ان کے ارکان کی دعوت کرتے تھے یا صحابہ کرام کے گھروں پر ان کی ضیافت کا اہتمام فرماتے تھے۔ ان میں سے بیشتر بالعموم رات کے کھانے ہوتے تھے جیسے حضرت ابوبکر صدیق کی دعوت کا واقعہ۔ ان کے علاوہ بعض رات کے کھانوں کی ضیافتیں تھیں جن کا مفصل ذکر دعوتوں کے باب میں آرہا ہے، کچھ کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

۱۔ وفد بنی المنتفق کی رات کے کھانے پر خاص ضیافت رسول اکرم ﷺ نے کی تھی

(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب في الاستنثار، حدیث:۱۴۲)

۲۔ حضرت ربیعہ عنسی کو رات ہی کا کھانا آپ ﷺ نے کھلایا تھا۔ (اسد الغابہ، ۲/ ۱۶۸)

صحابہ کرام کے رات کے کھانے -عشاء- کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں سے چند کا اوپر ذکر کیا گیا۔ ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عشاء کا ذکر اس موضوع کی تمہید میں اور نماز عشاء کے حوالے سے آچکا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے متعدد حوالے ہیں جیسے:

-خیاط صحابی کی دعوت رات کے کھانے -عشاء- کی تھی۔

-ایک فارسی صحابی نے رسول اکرمؐ اور حضرت عائشہؓ کی دعوت رات کے کھانے پر کی تھی۔

-حضرت فاطمہؓ نے رات کے کھانے پر رسول اکرم ﷺ اور بعض صحابہ کرام کو مدعو کیا تھا۔

اسی طرح کھانے کے ہدایا میں بالعموم عشاء ہی کا ذکر آتا ہے۔ ان میں حضرات سعد بن عبادہ خزرجی، اسعد بن زرارہ خزرجی، سعد بن معاذ اوسی اور متعدد دوسرے صحابہ کرامؓ کے گھروں سے رات کا کھانا آیا کرتا تھا۔ ان سب کا ذکر مع ان کے حوالوں کے اپنے اپنے مقام پر آتا ہے۔

غیر رسمی اوقاتِ طعام

دن اور شام کے دو مستقل کھانوں کے اوقات کے علاوہ بعض دوسرے اوقات میں کھانے پینے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ عہدِ نبوی یا جاہلی دور کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ انسانی فطرت و ضرورت سے وابستہ اور روایاتِ معاشرت سے پیوستہ ہیں۔ انسان سماجی حیوان ہونے کی وجہ سے اپنی بیداری کے اوقات میں جسم و بدن کے تقاضوں سے اور لذتِ کام و دہن کی خاطر بھی کھاتا ہے۔

سماجی روایات اور تہذیبی اقدار بھی اس قسم کے غیر رسمی کھانے پینے کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ اصلاً اوقاتِ نُقل وخورش ہیں اور صبح سے رات تک مختلف اوقات میں ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اوقاتِ صبح: ہمارے جدید معاشرتی نظامِ اکل وشرب میں صبح کا مشروب-صبوحی- اور ناشتہ-فطور-شامل ہے۔ عرب جاہلی سماج اور اسلامی نبوی معاشرے میں ان کا باقاعدہ ذکر نہیں ملتا، صرف قرائن سے اسے جانا جاسکتا ہے۔ البتہ صبح صبح شہد کا پانی ملا ہوا پیالہ پینا غالباً عہد نبوی کی روایت تھی اور سنت بھی۔ ممکن ہے کھجور وغیرہ کھانا بھی معمول رہا ہو جیسے عیدین پر بالخصوص عید الفطر میں صبح صبح کھجور یا کوئی میٹھی چیز کھا کر نماز عید کے لیے جانے کا حکمِ نبوی اسی صبوحی خورش کا قرینہ فراہم کرتا ہے۔ صبح کی زیارات میں بھی ایسے ہلکے پھلکے کھانے یا پینے کا ذکر ملتا ہے۔ واقعات اور حوالوں کا ذکر آگے آتا ہے۔

طعامِ زیارت: حدیثِ حضرت عائشہؓ سے اور متعدد دوسری احادیثِ زیارت سے روزانہ زیارت کے دو اوقات معلوم ہوتے ہیں: ایک صبح سویرے یعنی دن چڑھنے سے پہلے پہلے جب دھوپ میں تمازت زیادہ نہیں ہوتی اور دوسرے شام کے وقت یا رات کے اولین حصہ میں۔ انھیں اوقاتِ زیارت میں زائر اور مہمان کی خاطر تواضع کے لیے میزبان اور صاحبِ خانہ کچھ نہ کچھ سامانِ نُقل پیش کرتے تھے۔ ان میں کھجور یا کوئی دوسری کوئی میٹھی چیز بھی ہوسکتی تھی اور ہوتی تھی یا کھانے کی کوئی ہلکی پھلکی قسم کی چیز جو باقاعدہ کھانے سے الگ ہوتی تھی۔ ان اوقاتِ زیارت میں دودھ، دودھ ملا ہوا پانی، شربت، نبیذ یا کوئی دوسرا مشروب یا خالص ٹھنڈا پانی بھی پیش کیا جاتا تھا۔ ایسے خاص یا معمول کے اوقات کے علاوہ ضرورت کے اوقات کی تحدید کرنی مشکل ہے کہ ضرورت بری بلا ہے، کسی وقت کچھ بھی کھلا پلا سکتی ہے اور کھلاتی پلاتی تھی۔ زیارات کے کھانوں میں واقعات اور حوالے بکثرت ملیں گے۔

اوقاتِ طعام کا دورانیہ

غداء

دن اور رات کے دونوں معمول کے کھانوں کے دورانیہ کے بارے میں مختلف اوقات کا

ذکر ملتا ہے۔ غداء/ دن کے کھانے کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کے کھانا نہ ملنے کی صورت میں روزہ ٔنفل رکھنے کے واقعات چاشت کا وقت یا نصف النہار سے قبل کا وقت مقرر کرتے ہیں۔ صحابہ کرام اور دوسرے اکابرِ قریش وانصار بھی بالعموم انہیں اوقات میں کھاتے تھے۔ صحابہ کرام کے غداء کے واقعات میں حافظ ابن حجرؒ نے جو احادیث نقل کی ہیں ان میں نصف نہار کا واضح ذکر ملتا ہے اور دوسروں میں نمازِ ظہر کا۔ بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دن کے کھانے (غداء) کا وقت نمازِ ظہر کے قریب ہوتا تھا جو اول وقت میں پڑھی جاتی تھی۔ جمعہ کے دن کم از کم مدینہ منورہ میں دن کے کھانے کا وقت بعدِ نماز ظہر/ جمعہ تھا جیسا کہ حضرت سہل بن سعد خزرجی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ بھی خاص، دلچسپ اور اہم ہے کہ جمعہ سے قبل کھانا کھانا سستی لاتا ہے جس کے سبب قیلولہ کرنا پڑتا ہے اور وہ قیلولہ جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کے بعد ہوتا تھا۔ یہی سنتِ نبوی بھی تھی اور تعاملِ صحابہ بھی۔ اگرچہ وہ انفرادی عادات کا معاملہ ہے تاہم اندازہ یہی ہوتا ہے کہ نصف النہار سے پہلے کے وقت سے بعد نماز ظہر کا دو تین گھنٹوں کا دورانیہ غداء کا تھا۔

عشاء

رات کے کھانے کے بھی کئی اوقات روایات وآثار میں ملتے ہیں جو اس کے دورانیہ کو لمبا کر دیتے ہیں۔ عام اور معمول کا وقت تو وہی نمازِ عشاء یعنی ایک تہائی رات کے وقت تھا جیسا کہ لغوی اور لسانی حوالہ بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نمازِ عشاء سے پہلے یا اس کے قریب کھانا کھانے کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے مہمانوں کے کھانے کی ضیافت کے واقعہ اور حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کے ایثارِ ضیافت سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ نمازِ عشاء کے بعد بھی کھانا کھانے کے وقت کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ حضرت صدیقؓ کے واقعہ میں نبوی طعامِ شب میں ان کی شرکت ہوئی تھی۔ بعدِ نماز عشاء کھانے کے دوسرے واقعات بھی ہیں لیکن زیادہ تاخیر دوسری احادیث واحکام سے ممنوع معلوم ہوتی ہے کیونکہ نمازِ عشاء یعنی تہائی شب کے بعد سو جانے کے نبوی حکم کے آثار وثبوت بہت ہیں۔ ایک قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز مغرب سے قبل بھی عشاء کھالیا جاتا تھا جیسا

کہ اونٹ کے گوشت کی دعوت کے واقعہ میں ملتا ہے۔ غزوۂ خیبر کے زمانے میں سویق (ستو) وغیرہ کھا کر نماز مغرب کے لیے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے جانے کا واقعہ بھی ملتا ہے (موطا/تنویر، ۱/ ۴۸) بہر حال نمازِ مغرب سے ذرا پہلے سے لے کر ایک تہائی رات میں نمازِ عشاء کے متصلاً بعد کا تین چار گھنٹے کا دورانیہ عشاء کا ہوتا تھا۔

سحری وافطار کے اوقات

تحقیق سے اب ثابت ہو چکا ہے کہ مکی عہد نبوی میں اور اولین مدنی عہد میں ماہانہ تین دنوں کے روزے فرض تھے اور سالانہ عاشوراء کے روزے فرض تھے اور ان کی یہ فرضیت دین حنفی سے محمدی شریعت میں اولین مکی روز سے آئی تھی۔ ۳ ہجری/ ۶۲۵ عیسوی میں رمضان کے پورے ماہ کے روزوں کی فرضیت ہوئی اور اس نے ماہانہ اور سالانہ روزوں کی فرضیت ۔صرف فرضیت۔ منسوخ کردی۔ رسول اکرم ﷺ نے تسلسلِ دینی اور ارتباطِ تشریعی کی خاطر ان کی سنیت باقی رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی محمدی شریعت میں ہر ماہ ایامِ بیض۔۱۳/۱۴/۱۵/۔ کے اور عاشوراء کا ایک روزہ مسنون ہے۔

(بخاری، کتاب الصوم، مختلف ابواب بالخصوص باب صیام البیض الخ، صیام یوم عاشوراء؛ فتح الباری، ۴/ ۲۸۷ ما بعد اور ۳۰۹ ما بعد؛ مفصل بحث کے لیے: مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، باب روزہ؛ ''احادیث عاشورا۔ ایک درایتی تجزیہ'' مذکورہ بالا)

ظاہر ہے کہ روزوں کے ایام میں کھانے پینے کے اوقاتِ معمول بدل جاتے تھے کیونکہ دن میں کھانا پینا ممنوع ہو جاتا تھا۔ اس زمانۂ امساک میں اوقاتِ طعام بالعموم دو ہی رہتے تھے: ایک سحور/ سحری کا اور دوسرا افطار/ افطاری کا۔ سحری کا وقت غروبِ آفتاب کے بعد سے طلوعِ صبح صادق تک رہتا تھا اور رہتا ہے اور مستحب ومسنون وقت صبح صادق سے قبل کا ہے جب صبح کا ذب رہتی ہے، بالعموم نمازِ فجر کے وقت کے شروع ہونے سے ڈیڑھ گھنٹے قبل کا وقت ہوتا ہے۔ سحری رات میں کسی وقت بھی کھائی جا سکتی ہے مگر اس میں تاخیر وقت/ سحور مسنون ومستحب ہے جیسا کہ اسوۂ نبوی رہا تھا اور افطار کا وقت آفتاب کے غروب ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے اور اس میں بھی مستحب ومسنون تعجیل وقت ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام عہد نبوی میں اور بعد کے

تمام ادوار میں روزہ دار مسلمان ان ہی دو اوقات میں کھاتے پیتے رہے ہیں۔
(بخاری، کتاب الصوم ،مختلف ابواب بالخصوص:باب تعجیل السحور، باب قدر کم بین السحور وصلاۃ الفجر، باب تعجیل الافطار ؛فتح الباری،۴/۱۷۶-۱۷۷اومابعد،۲۵۳-۲۵۴وغیرہ؛نیز دوسرے ابواب وفصول میں سحر وافطار کے عام کھانوں کے حوالے)

سحری وافطار کے کھانے

اگر چہ ان کا ذکر کھانوں کی اقسام میں کرنا منطقی لگتا ہے لیکن وہ معمول کے کھانے پینے ہی ہوتے تھے اس لیے ان کا اسی تسلسل اوقات میں ذکر کرنا زیادہ موزوں ومناسب ہے۔اس سے ان خاص اوقات کے کھانوں کی نوعیت بھی معلوم ہوجائے گی اور واقعاتِ سحور وافطار کا پتہ بھی لگ جائے گا۔محدثین کرام نے بھی اپنی کتب الصوم/ الصیام ہی میں سحور وافطار کے کھانوں کا ذکر کیا ہے اور دوسرے ابواب وکتب میں ان کا ذکر کسی اور سلسلۂ کلام ہی میں آیا ہے۔ان کھانوں یا سحری وافطار کے ضمن میں بھی دو طرح کے کھانوں کا ذکر ملتا ہے:ایک عمومی ذکر طعام،دوسرا طعام ومشروب کا نام بہ نام ذکر۔حسبِ معمول نبوی سحور وافطار کا بھی ذکر آتا ہے اور صحابہ کرام کے سحری وافطاری کا بھی اور ان دونوں کا ہدایا کے حوالے سے مشترکہ ذکر بھی۔

عمومی ذکرِ طعام سحور وافطار

سحری کے عام حوالے یہ ہیں:۱۔حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث ہے کہ میں اپنے اہل وعیال میں سحری کرکے جلدی سے جاتا تھا کہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نماز فجر پالوں۔
۲۔حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ ہم نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سحری کھائی اور پھر آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔(احادیث بخاری:۱۹۲۰-۱۹۲۱)

-رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام صبح صبح نہار منہ گھر میں آتے اور طعام/ غداء طلب کرتے اور نہ ملتا تو نفل روزہ رکھ لیتے۔یہ سحری کا بدل/ متبادل تھا۔

(حدیثِ بخاری:۱۹۲۴اور اس کا ترجمۃ الباب اور غداء کے واقعات وروایات مذکورہ بالا)

-حدیثِ بخاری:۱۹۵۴-۱۹۵۸ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے سورج غروب ہوتے

ہی مشروب/ پانی نوش فرمایا۔

-حدیثِ بخاری: ۱۹۶۸ کے مطابق حضرت سلمان فارسیؓ کے اصرار پر حضرت ابوالدرداءؓ نے نفل روزہ توڑ کر کھانا کھالیا تھا۔

-احادیثِ ابوداؤد: ۲۱۱۰، ۲۳۱۳-۲۳۱۴ وغیرہ میں رات کے کھانے یا افطار میں صرف طعام ومشروب کا عام ذکر ہے۔

-بعض ثقفی صحابہ کرام کا بیان ہے کہ رمضان کے باقی دنوں میں ہم اسلام لائے تو حضرت بلالؓ رسول اکرم ﷺ کے پاس سے ہماری سحری وافطاری لاتے تھے اور رسول اکرم ﷺ اس پیالے سے کھاتے تھے۔ (ابن ہشام، ۲/ ۵۴۱: یضع یدہ فی الجفنۃ)

سحور وافطار کے خاص کھانے

بالعموم ان دونوں خاص اوقات کے کھانے وہی معمول کے کھانے ہوتے تھے جن میں گوشت روٹی، سبزی وغیرہ کے علاوہ سامانِ نقل جیسے کھجور، گھی، شہد وغیرہ شامل ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض روایات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بعض دیگر روایات کا ذکر دوسرے حوالے سے کھانے کی اقسام وانواع وغیرہ کے باب میں کیا جاچکا ہے جیسے رسول اکرم ﷺ حضرت ام سلیمؓ کے گھر تشریف لے گئے اور انھوں نے کھجور وگھی (تمر وسمن) پیش کیا اور آپ ﷺ نے ان کو نہیں تناول فرمایا کہ روزے سے تھے۔ (حدیث بخاری: ۱۹۸۲، ۶۳۳۴-۶۳۳۸ وغیرہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افطار میں بالخصوص رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام تعجیل کی خاطر صرف کھجور پر اکتفا فرمالیتے تھے یا اسی طرح کے کسی اور کھانے اور مشروب پر اور پھر بعد میں رات کا کھانا -عشاء- معمول کے مطابق تناول فرماتے تھے:

-حضرت انسؓ کا مشاہدہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نمازِ مغرب سے قبل چند تازہ کھجوریں (رطبات) کھالیتے، وہ نہ ملتیں تو عام کھجوروں (تمرات) پر گذارا کرلیتے اور وہ بھی نہ ہوتیں تو چند چلو پانی ہی نوش فرمالیتے تھے: "... حسا حسوات من الماء" (حدیث ابی داؤد: ۲۳۵۶)

✪✪✪

کھانے پکانے کی ترکیبیں

روایاتِ سیرت واحادیث میں کھانا تیار کرنے یا بنانے کے لیے ''صَنَعَ'' کا لفظ بالعموم ملتا ہے۔بعض اور الفاظ بھی اسی بنانے کے معنی کے ملتے ہیں جیسے جَعَلَ۔ان میں پکانے کا مفہوم ومعنی شامل نہیں ہوتا۔ بلکہ وضاحت ملتی ہے کہ بعض اشیاء کو ایک دوسرے میں ملا کر ایک خاص قسم کا کھانا تیار کرلیا جاتا تھا۔گذشتہ بحث میں ایسے کھانوں کا ذکر بھی آیا ہے اوران کی تراکیب کا بھی حوالہ آ گیا ہے۔ان سے اس تیاری کی نوعیت اجاگر ہوتی ہے جیسے حیس نامی کھانے میں اور بعض اقسامِ ثرید میں بھی کھانے بنانے کا عمل ملتا ہے اور آگ پر پکانے کا نہیں ملتا۔مزید مثالیں آگے اس خاص مبحث میں آرہی ہیں۔

دوسرا لفظ وطریقہ پکانے کا ہے جس کے لیے عربی لفظ ''طبخ'' اوراس کے مشتقات آتے ہیں۔ان کا واضح مطلب ومعنی یہ ہوتا ہے کہ ایسے کھانے آگ پر پکائے جاتے تھے جیسے گوشت، شوربہ، روٹی وغیرہ۔ان دونوں بنیادی طریقوں میں ایک فرق وامتیاز یہ ملتا ہے کہ پکانے کے عمل میں وقت، محنت اور صلاحیت درکار ہوتی ہے جب کہ بنانے کے طریقے میں ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی، صرف تناسب وتوازن کا خیال رکھنا کافی ہوتا ہے اوبس۔لغوی طور سے بھی ان دونوں الفاظ اوران میں شامل تراکیب ومعانی کا فرق وامتیاز ملتا ہے جو زبانِ عربی کی وسعت کا غماز ہے۔

(مصباح اللغات:طَبَخَ (ف ن)طَبْخاً و طبَخ. الطعامَ: گوشت پکانا۔صَنَعَ (ف)صَنعا و صُنعاً الشي: بنانا)

اگرچہ کھانوں کی متعدد مروج اقسام کے بیان میں بعض کھانوں کی نوعیت اجاگر کرنے کی خاطر اقوالِ علماءِ لغت وشارحینِ حدیث کا ذکر کرنا گزیر ہو گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ان کے بنانے یا پکانے کی ترکیبیں بھی زیرِ بحث آ گئیں تاہم مشہور ومروج کھانوں کے بنانے یا پکانے کی ترکیبوں پر الگ سے بحث کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ عرب واسلامی تمدن کے اس پہلو

پر بھی روشنی پڑ جائے۔ اس سے عرب اقسامِ طعام کی تراکیب کا پتہ تو چلے گا ہی انسانی تمدن کی بعض روایات کا تسلسل بھی ملے گا، اشتراک بھی اور ارتقاء بھی جو نبوی تمدن کے اہم ترین ابعاد تھے۔

اس بحث میں دونوں طریقوں۔ بنانے اور پکانے۔ پر الگ الگ بحث کرنی مشکل ہے کہ بسا اوقات متعدد کھانوں میں ان دونوں کا اشتراک ملتا ہے۔ آگ پر پکی ہوئی ایک شے کا جوڑ دوسرے کھانے سے کیا جاتا تھا جو پکا ہوا نہیں ہوتا تھا یا جسے پکانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ پکی ہوئی چیز کی ترکیبِ طعام بیان کی جاتی ہے مثلاً روٹی پکانے کا پورا عمل خاص ترکیب اور سلسلہ وار عمل کا تقاضا کرتا ہے اور اس کے بعد ہی وہ تیار ہوتی اور کھانے کے لائق ہوتی تھی۔ اب اس روٹی کو اگر تیل یا سرکہ وغیرہ کے ساتھ کھایا جاتا تھا تو اس میں سالن بنانے کا عمل بیان میں نہیں آتا حالانکہ خود سرکہ اور تیل بھی ایک خاص طریقۂ عمل سے گذر کر اپنی اصل حالت وشکل اختیار کرتا ہے۔ البتہ بعض کھانوں کے ضمن میں ان کے سالن بنانے کا عمل یا طریقہ بھی بیان کیا جاتا ہے جو ایک دلچسپ مطالعۂ ترکیب ہے۔

روٹی پکانے کی ترکیب

روٹی پکانے کا عمل آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ اس سے قبل اناج / غلہ میں سے گیہوں یا جو کے دانوں کو پیسنے، چھاننے، آٹا بنانے، گوندھنے اور ان کے پیڑے بنانے کے مرحلے ہوتے ہیں اور پھر تنور یا چولھے پر روٹی پکانے کا آخری عمل آتا ہے۔

طحن / پیسنا: گیہوں یا جَو ہی دو اناج تھے جن کی روٹی عرب جاہلی اور اسلامی تمدن میں رواج پذیر تھی۔ غلہ پیسنے کے لیے عربی لفظ "طحن" اور اس کے مشتقات عرب اسلامی روایاتِ طعام میں استعمال ہوتے ہیں۔ پیسنے کے عمل کا ذکر آگے بعض روایاتِ طعام اور ان کی تراکیب میں آتا ہے جیسے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی اہلیہ محترمہ نے ایک صاع (تین کلو ٦٠٠ گرام) جَو کو پہلے پیسا تھا۔ اس میں چکی کا ذکر نہیں ہے جس میں وہ پیسے جاتے تھے مگر چکی عام گھریلو استعمال کی شے تھی اور اس کا ذکر بہت سی روایات میں ملتا ہے اور اس پر بحث اپنے مقام پر آتی ہے۔

سرِ دست حضرت فاطمہ بنت رسولِ اکرم ﷺ کی چکی اور آٹا پیسنے کے عمل کا یہاں حوالہ دینا کافی ہے کہ وہ مشہور ہے۔

(حدیثِ بخاری: ۱۰۱/۴۱:... "وطحنت الشعیر" حضرت جابر کی اہلیہ محترمہ کے جَو پیسنے کے لیے؛ حدیثِ ابوداؤد و مسلم وترمذی وغیرہ کے سابقہ حوالے جن میں پیسنے (طحن) کا ذکر آ چکا ہے)

آٹا چھاننا

چکی وغیرہ میں جو یا گیہوں کے دانوں کو پیسنے کے بعد اس کا آٹا (دقیق) تیار ہو جاتا ہے۔ اس آٹے میں چوکر یا بھوسی ملی ہوتی ہے جو ہضم کے لیے مفید نہیں ہوتی اور نفیس طبع کے لوگوں کے مذاقِ طعام پر گراں گذرتی ہے۔ اس لیے چوکر یا بھوسی کو آٹے سے الگ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اس کے دو عام طریقے رائج تھے: ایک یہ کہ پھونک مار کر یا پٹک کر بھوسی اڑا دینا جس میں اس کی تھوڑی مقدار باقی رہ جاتی ہے اور وہ آٹا ہی رہتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چھلنی (منخل) سے آٹا چھانا جاتا اور بھوسی اور چوکر کی کافی مقدار نکل جاتی اور آٹا زیادہ صاف، باریک اور عمدہ ہو جاتا تھا اور اس کی روٹی عمدہ اور باریک پکائی جاسکتی تھی اور لذت میں بہتر و برتر ہوتی تھی۔ تیسرا طریقہ بھی ملتا ہے کہ آٹے کو بار بار چھانا جاتا چھلنی سے اور کپڑے۔ باریک کپڑے۔ سے بھی۔ اس طریقہ میں آٹا لطیف ترین بن جاتا اور اسے میدہ بھی کہا جاتا تھا (حواری)۔ اس کی روٹیاں خوشحال و دولتمند کھاتے تھے۔ بالعموم یہ گیہوں کے آٹے میں "چھاننے پھر چھاننے" کا عمل ملتا ہے کہ اس میں لطافت کا عنصر پہلے سے ہوتا ہے جو بڑھتا جاتا ہے۔ جَو کے آٹے میں خاصی خشکی اور کثافت قدرتی طور سے رہتی ہے لہٰذا بار بار چھاننے کے بعد بھی زیادہ لطافت نہیں آتی البتہ بھوسی یا چوکر بالکل دور کیا جاسکتا ہے۔ ایک تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ساری بھوسی نکل جانے سے جَو کے آٹے میں لَس نہیں رہتا۔

آٹا چھاننے (نَخل نَخلاً) کے عمل اور اس کے آلہ۔ چھلنی۔ کے وجود سے بعض اہلِ علم نے انکار کیا ہے۔ انھوں نے بعض روایات واحادیث اور رسول اکرم ﷺ کی سنتِ تواضع سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اس عہدِ مبارک میں چھلنی تھی نہ چھاننے کا عمل، صرف پھونک مار کر چوکر اڑا دیا

جاتا تھا۔ مولانا شبلی جیسے عبقری نے صرف ایک روایت کی بنا پر لکھا ہے کہ "ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا" (سیرۃ النبی، ۱/۱۱۸)۔ یہ صرف ایک روایت پر انحصار کا نتیجہ ہے ورنہ تمام متعلقہ روایات و احادیث کا مجموعہ بتاتا ہے کہ اس عہدِ مبارک میں چھلنیاں بھی تھیں اور آٹا چھانا ہی نہیں، خوب چھانا جاتا تھا اور میدہ بھی بنایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ذکر گذر چکا ہے کہ شامی تاجر درمک نامی آٹا لاتے تھے جو مدینہ میں مقبول تھا کہ بہت عمدہ میدہ ہوتا تھا۔

بھوسی پھونک مار کر اڑانے کا طریقہ

نبوی تمدن میں سب سے زیادہ معروف ومقبول تھا کہ وہ سادگی کا تمدن تھا۔ مولانا شبلیؒ کی بیان کردہ حدیثِ ترمذی کے علاوہ اور کئی احادیث وروایات پھونک کر چوکر اڑانے کے طریقے کو بیان کرتی ہیں جیسے حدیثِ بخاری: ۵۴۱۰ میں ہے کہ حضرت ابوحازمؒ نے حضرت سہل بن سعد ساعدی خزرجیؓ سے پوچھا: کیا رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں عمدہ چھنا ہوا آٹا - گیہوں کا - (النقی) ہوتا تھا۔ فرمایا: نہیں۔ پھر پوچھا کہ آپ لوگ جَو (کے آٹے) کو چھانتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں، لیکن اس کو پھونک مار کر اڑا دیتے تھے: "حدثني ابو حازم انه سأل سهلاً هَلْ رأيتم في زمان النبي ﷺ النقي؟ قال: لا؛ فهل كنتم تنتخلون الشعير؟ قال: لا، ولكن كنا ننفخه"۔ اس کے دوسرے طرفِ حدیث: ۵۴۱۳ میں پھونک سے بھوسی اڑانے کا واضح ذکر ملتا ہے اور چھلنی کے رسول اکرم ﷺ کے دیکھنے کے واقعہ کا بھی: "... هل كانت لكم في عهد رسول الله ﷺ مناخل؟ قال ما رأى رسول الله ﷺ مُنْخُلا من حين ابتعثه الله حتى قبضه الله. قال: قلت: كيف كنتم تاكلون الشعير غير منخول؟ قال: كنا نطحنه وننفخه، فيطير ماطار، ومابقي ثرّيناه فاكلناه". امام بخاری کے دونوں تراجم ابواب معنی خیز ہیں۔ اس میں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جو کے آٹے کو پھونک کر بھوسی اڑانے کا عمل بیان کیا گیا ہے جو عام معمول تھا۔ گیہوں اس سے مستثنیٰ تھا۔

(باب النفخ في الشعير، وباب ما كان النبي ﷺ واصحابه ياكلون؛ فتح الباری، ۹/۶۷۸-۶۸۱

وغیرہ: اس روایت میں بعثت کے بعد کا مشاہدہ حضرت سہل مدنیؓ سے بیان کیا گیا ہے جو صحیح ہے۔ مکی دور میں چھلنی بھی تھی اور اس کا استعمال بھی)

چھلنی سے آٹا چھاننے کا طریقہ

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے رسولِ اکرم ﷺ کے چھلنیاں نہ دیکھنے کے واقعہ پر بحث کی ہے کہ حضرت سہلؓ کا یہ بیان بعثت سے وفات تک کے زمانے سے متعلق ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اس زمانے میں صرف مکہ، طائف اور مدینہ منورہ تک محدود رہے تھے اور ایک بار تبوک تک تشریف لے گئے تھے لہٰذا اس دوران آپ نے چھلنیاں نہیں دیکھیں۔ لیکن بعثت سے قبل آپ ﷺ نے شام کے کئی اسفار کیے تھے اور وہاں عمدہ آٹا بھی عام تھا اور چھلنیاں بھی مروج تھیں۔ حافظ موصوف کا واضح بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے بلاشبہ ان کے پاس چھلنیاں اور دوسرے اسبابِ عیش دیکھے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو ضرور ملاحظہ فرمایا تھا۔ اس قیاس کی تائید بعد کی دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے اور واقعات سے بھی جن میں ایک حضرت ام ایمنؓ کے آٹا چھان کر روٹی - عمدہ باریک روٹی - پکانے کا ذکر ہے اور دوسروں میں چھنے ہوئے آٹے اور میدے (النقی، الحواری وغیرہ) کا بھی بیان ملتا ہے۔ الحواریٰ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ وہ خالص آٹا جو بار بار چھانا جاتا ہے: "والحواری: الخالص الذی یُنخل مرة بعد مرة" اور وہ صحابہ کرام بالخصوص حضرت انسؓ کھاتے تھے۔ (فتح الباری، ۹/ ۶۵۷-۶۵۸)

آٹا گوندھنے کا عمل

پانی ملا کر آٹا گوندھا جاتا تھا جس کے لیے فعل "عَجَنَ" اور اس کے مشتقات روایت میں آتے ہیں۔ اور گندھے ہوئے آٹے کے لیے لفظ "العجین" وغیرہ بھی آتا ہے۔ لغوی لحاظ سے اس عمل کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔

(عَجَنَ (ن ض) عَجناً، الدقیق، آٹا گوندھنا...؛ اِعتَجَن الدقیق: آٹا گوندھنا، تَعَجَّن: گندھ جانا، خمیر ہونا؛ العجین: گندھا ہوا آٹا۔ مصباح اللغات: نیز العجینة: گندھے ہوئے آٹے کا ایک پیڑا؛ المعجن و المعجنة: آٹا گوندھنے کا برتن وغیرہ۔ ان پر بحث سامانِ زیست کے باب میں آگے آتی ہے کہ وہی ان کا صحیح مقام ہے)

روٹی کے باب میں -اس کے پکانے اور گھر میں کھانا تیار کرنے- کے حوالے سے آٹا گوندھنے کا ذکر آچکا ہے تاہم یہاں چند روایات کا حوالہ یہاں صرف گوندھنے کے عمل کے لیے دیا جاتا ہے:

-حضرت عائشہ صدیقہؓ کے واقعہ افک میں حضرت ام مسطحؓ اور دوسرے واقعہ کے گواہ حضرت بریرہؓ کے آٹا گوندھنے کا ذکر ہے اور گندھے ہوئے آٹے کا بھی۔

-حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ شادی کے بعد آٹا تو گوندھ لیتی تھیں مگر روٹی اچھی طرح نہیں پکاتی تھیں۔ ان کی روٹیاں ان کی پڑوسی انصاری لڑکیاں پکا دیا کرتی تھیں جو بہت اچھی خواتین تھیں۔ (حدیثِ بخاری: ۵۲۲۴)

-حضرت حسانؓ نے ہجوِ قریش میں اجدادِ نبوی کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک تمثیل استعمال کی تھی: لاسلنک منهم كما تُسل الشعرة من العجين.

(بخاری، کتاب بدء الخلق، باب من احب ان لایسب نسبه)

-حضرت جابر بن عبداللہ خزرجیؓ کی اہلیہ کے آٹا گوندھنے کا ذکر آگے آتا ہے۔

-غزوۂ تبوک میں حجر نامی کنوئیں کے پانی کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ بعض صحابہ نے اس سے آٹا گوندھا تو اس کو پھینکوا دیا گیا۔ اس روایت میں آٹا گوندھنے کے عمل کے لیے "عجنا" اور گندھے ہوئے آٹے کے لیے "العجین" استعمال کیا گیا ہے۔

(بخاری، کتاب بدء الخق، باب قول اللہ تعالیٰ: والی ثمود اخاهم صالحا)

-ایک غزوۂ نبوی کے دوران ایک صحابی کے پاس سے ایک صاع آٹا نکلنے اور اس کے گوندھے جانے کا ذکر بھی آتا ہے۔

-ان کے علاوہ متعدد احادیث وروایات میں آٹا گوندھنے کی شہادت ملتی ہے اور قیاس ومنطق بھی اس کی تائید میں ہے۔

-آٹا گوندھنے کے بعد تھوڑی دیر اسے رکھا رہنے دیا جاتا تھا جس سے وہ نرم ہو جاتا تھا اور روٹی پکانے میں سہولت ہوتی تھی۔

خمیر اٹھانے کا عمل: بھی عرب اور نبوی تمدن میں معروف تھا کہ آٹے کو گوندھنے کے بعد

کافی دیر تک رکھا جاتا تھا اور اس کا خمیر اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے لیے لفظ "خمر" آتا ہے اور لغوی استناد بھی اس کو اسی طرح حاصل ہے۔ خمیر اور خمیرہ عربی کے الفاظ ہیں جن کے معنی خمیر کے بھی ہیں اور خمیری روٹی کے بھی اور "خُمرة" خمیر کرنے کے برتن کو کہتے ہیں (مصباح اللغات)۔ خمیر اٹھانے کے بعض واقعات کا اوپر ذکر آچکا ہے جیسے حضرت زینب بنت جحشؓ خمیر اٹھا رہی تھیں جب حضرت زید گئے تھے۔

(مسلم، کتاب النکاح، باب زواج زینب بنت جحش الخ؛ "وهي تخمر عجينها") اور دوسرے واقعات کا ذکر تراکیبِ طعام میں آگے آتا ہے۔

پیڑے بنانا

آٹا گوندھنے اور اس میں کبھی خمیر اٹھانے کے بعد کا عمل اس کے چھوٹے یا بڑے پیڑے بنانا ہے۔ ان ہی پیڑوں کو ہاتھ سے - دونوں ہاتھوں سے - روٹی کی شکل میں گول یا کسی اور طرح سے پھیلایا جاتا ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جس کے بغیر روٹی کی شکل نہیں بنائی جاسکتی۔ عربی زبان اور اسلامی روایات میں ان کے لیے الفاظ ہیں۔ پیڑے کو "العجينة" کہا جاتا ہے اور روٹی بنانے یا پیڑے کو روٹی کی شکل دینے کا ذکر روایات واحادیث میں ملتا ہے۔

روٹی پکانا

عہدِ نبوی میں روٹی پکانے کے دو طریقے ملتے ہیں: ایک تنور یا چولھے پر گھروں کے اندر ہی پکائی جاتی تھی جیسا کہ بعض ازواجِ مطہرات - حضرت عائشہ، حضرت زینب بنت جحشؓ وغیرہ - کے حوالے سے اس کا ذکر آتا ہے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روٹیاں ان کی پڑوسی انصاری لڑکیاں پکا دیتی تھیں (بخاری: ۵۲۲۴)۔ دوسرا طریقہ سانجھے چولھے پر محلہ کے کسی اجتماعی مقام پر روٹی پکانے کا تھا۔ محلّہ کا یہ سانجھا چولھا بڑا تنور ہوتا تھا اور خواتینِ بیت و اہل بیت اپنے اپنے گھروں سے گندھا ہوا آٹا لاتی تھیں اور وہاں پیڑے کاٹ کاٹ روٹی پکاتی تھیں۔ خاندانِ نبوت کی خواتین یا دوسرے اکابر کی عورتیں بالعموم

سانجھے تنور پر نہیں جاتی تھیں، ان کی باندیاں یا خادمائیں جاتی تھیں۔ ایک اور طریقہ اجتماعی اور بڑے کھانوں کے ضمن میں یہ ملتا ہے کہ خاتونِ خانہ کے ساتھ ایک پیشہ ور اجیر روٹی پکانے والی بلالی جاتی تھی اور وہ خاتونِ خانہ کے ساتھ ساتھ روٹی پکاتی جاتی تھی جیسا کہ خابزہ/ خباز کے بارے میں لکھا گیا اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی اہلیہ کے ساتھ ایک خابزہ (روٹی پکانے والی) نے بھی روٹی پکائی تھی۔ یہ فوری ضرورت یا ہنگامی تقاضے کا معاملہ لگتا ہے۔ پہلے سے طے شدہ دعوتوں میں روٹیاں پکا کر رکھ لی جاتی تھیں جیسا کہ حضرت زینبؓ کے نکاحِ نبوی میں نظر آتا ہے۔ دوسرے واقعات آگے آتے ہیں۔

ستو/ سویق بنانے کی ترکیب

ستو کے کھانے کے واقعات کا ذکر بہت سی روایات و احادیث میں ملتا ہے جن کا ذکر اس کے مقام پر گذر چکا۔ ستو کے بنانے کا یا اس کے اجزاء کا ذکر بالعموم شروح اور روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔ ان سے حسب ذیل معلومات ہوتی ہیں:

۱۔ ستو بالعموم جَو سے بنایا جاتا تھا۔ وہ گیہوں کا بھی ہوتا تھا۔ جو یا گیہوں کے دانوں کو پہلے خوب کوٹا جاتا تھا پھر پیس لیا جاتا تھا اور صرف پانی یا گھی یا شہد ملا کر کھایا جاتا تھا:
"السویق: قمح اوشعیر یقلی ثم یطحن فیتزود به ملتوتا بماء اوسمن اوعسل" (واقدی، کتاب المغازی، ۱۸۱-۱۸۲؛ زرقانی، شرح المواهب اللدنیه، ۱/ ۵۵۳)

۲۔ امام داؤدی کے مطابق ستو جَو کا آٹا ہوتا تھا یا جو کے کوٹے ہوئے دانے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسروں کا خیال ہے کہ وہ گیہوں کا بھی ہوتا تھا: "هو دقیق الشعیر او السلت المقلی، وقال غیره: ویکون من القمح"۔
(فتح الباری، ۱/ ۴۰۷؛ ۹/ ۶۶۱-۶۶۲؛ السلت المقلی کا مفہوم یہ ہے کہ چوکر سے صاف جو کا آٹا/ درے ہوئے دانے)

۳۔ حدیثِ بخاری: ۵۳۹۰ وغیرہ سے اس کے بنانے اور کھانے کے تین طریقے معلوم ہوتے ہیں:

-آٹے یا کوٹے ہوئے دانوں کی شکل میں ستو ہوتا تو اسے خشک/سوکھا پھانک لیا جاتا تھا۔حدیثِ بخاری:۵۳۹۰:"فلم یجده الاسویقا، فلاک منه فلکنا معه..."

-ستو میں تھوڑا پانی ملا کر یا دودھ یا شہد ملا کر گاڑھا گاڑھا آمیزہ تیار کیا جاتا اور اسے انگلیوں سے چاٹ لیا جاتا۔حدیثِ بخاری:۲۰۹:فثرّی ای بُلّ بالماء لما لحقه من الیبس.. فاکلناه.. فلکنا معه.."

-پانی کی کافی مقدار ملا کر ستو کو شربت بنالیا جاتا اور اسے ایک مشروب کی طرح پیا جاتا۔ وہ اس صورت میں شربتِ عام سے زیادہ گاڑھا ہوتا تھا۔حضرت فاطمہ بنت قیسؓ اور بعض امہات المومنین نے اسی طرح ستو کا شربت پلایا تھا۔اس کے بعض واقعات کا ذکر اوپر آچکا اور بعض کا مشروبات کے باب میں مزید آتا ہے۔

جَو کی روٹی اور گوشت

غزوۂ خندق کے ہنگامی موقعہ پر رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی دوسری دعوتوں کے ضمن میں اور تراکیب بھی ملتی ہیں۔دوسرے مخیّر صحابی حضرت جابر بن عبداللہ خزرجیؓ اور ان کی اہلیہ حضرت سُہیلہ بنت مسعود انصاریؓ کی دعوت کا واقعہ ہے۔خاتونِ خانہ نے ایک تھیلی میں سے جَو نکالے جو وزن میں ایک صاع تھے (موجودہ وزن کے مطابق وہ ساڑھے تین کلو سے اوپر تھے)۔اس کو پیس کر آٹا بنایا اور پھر اس کو گوندھا۔حضرت جابرؓ نے ایک بکری کا بچہ، جو سال بھر سے چھوٹا تھا، ذبح کیا۔اس کے بعد رسولِ اکرم ﷺ اور بعض صحابہ کرام کو کھانے کی دعوت دی۔رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو ہدایت دی کہ گوشت کی ہانڈی/پتیلی جو خاصی بڑی تھی (دیگ نما) چولھے پر چڑھی رکھی جائے اور تنور سے روٹیاں نہ نکالی جائیں بلکہ آپ ﷺ کی آمد پر پکائی جائیں۔ہدایت پر عمل کیا گیا۔رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے تو روٹی پکانے کے لیے ایک پکانے والی کو بھی بلوالیا۔خاتونِ خانہ اور روٹی پکانے والی روٹی پکاتی جاتی تھیں اور رسول اکرم ﷺ تنور سے نکلنے والی روٹی پر بند ہانڈی سے سالن ڈالتے جاتے تھے۔بعض روایات میں ملتا ہے کہ سالن کے لیے آپ ﷺ نے رکابیاں یا طباق بھی طلب فرمائے تھے اور روٹی پر یا رکابی میں سالن ڈال

کر صحابہ کرام کی ایک جماعت کو کھلاتے جاتے تھے اور اس طرح باری باری سے کئی جماعاتِ صحابہ کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا اور برکتِ نبوی سے ہانڈی کا سالن اور تنور کی روٹیاں اسی طرح موجود رہیں۔ بعد میں خاتونِ خانہ نے پڑوسیوں اور عزیزوں کو اس نبوی کھانے سے شاد کام کیا۔

اس پورے واقعہ میں مختلف تراکیب ملتی ہیں۔

۱۔ ایک صاع جو ایک تھیلے (جراب) سے نکال کر پیسے گئے اور اس کا آٹا بنایا گیا: "وطحنت الشعیر"۔

۲۔ آٹا گوندھا گیا اور تھوڑی دیر کے لیے اسے چھوڑ دیا گیا کہ وہ نہ صرف نرم ہو جائے بلکہ اس میں خمیر اٹھ جائے "لانَ ورطب وتمکن منه الخمیر"... والعجین قدانکسر"۔

۳۔ ایک سال کی بکری ایک حدیث کے مطابق (العناق) اور دوسری کے مطابق گھر میں پلی ہوئی اور چراگاہ نہ جانے والی بکری (بھیمة داجن) کو ذبح کر کے اس کی بوٹیاں بنائی گئیں اور مصالحہ لگا کر/ ڈال کر ہانڈی میں اس کا سالن پکایا گیا۔ بوٹیاں بنانے کے عمل کے لیے حدیث میں لفظ خاص (قطعتھا) استعمال کیا گیا ہے۔ ایک بکری کا گوشت بہرحال آٹھ دس کلو تو رہا ہی تھا۔

۴- سالن/گوشت کی ہانڈی (البرمة- پتھر کی ہانڈی) یا دھات کی پتیلی (قدر) کو چولھے پر رکھا گیا۔ وہ دیگ نما/ دیگ لگتی ہے جسے پتیلا بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک بکری کا گوشت پکایا گیا تھا۔

۵- چولھا تین پتھروں کو رکھ کر بنایا گیا تھا (اثافی)۔

۶- روٹی پکانے کے لیے تنور کا استعمال کیا گیا۔ دونوں خواتین نے مل کر اس میں روٹیاں لگائیں۔ اس سے پہلے آٹے کے پیڑے کاٹے گئے تھے۔

۷- مدعو صحابہ کرام کے کھانے کے بڑے اور چوڑے پیالے (صحاف) ہدایت نبوی پر مستعار لیے گئے۔

احادیثِ بخاری کے متون بھی مختلف ہیں اور دوسری احادیث وروایات کے بھی۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الگ الگ واقعاتِ طعام ہیں، صرف ایک واقعہ سے متعلق نہیں ہیں۔ ذیل

میں ان کے بعض متون ملاحظہ کے لیے درج ہیں:

حدیثِ بخاری:۴۱۰۱:"... فقالت : عندی شعیر وعناق، فذبحت العناق وطحنت الشعیر حتی جعلنا اللحم بالبرمة، ثم جئتُ النبیﷺ، والعجین قد انکسر، والبرمة بین الاثافی قد کادت ان تنضج... قالﷺ: قل لها: لاتنزع البرمة ولا الخبز من التنور حتی آتی. فجعل یکسر الخبز ویجعل علیه اللحم، ویخمر البرمة والتنور اذا اخذ منه..."۔

حدیثِ بخاری:۴۱۰۲:"... فاخرجت الیّ جرابا فیه صاع من شعیر، ولنا بهیمة داجن، فذبحتُها، وطحنت الشعیر، ففرغت الی فراغی، وقطعتها فی برمتها... فقال رسول اللهﷺ : لاتنزلنّ برمتکم ولا تخبزنّ عجینکم حتی اجیٔ ... فاخرجت له عجینا، فبصق فیه وبارک، ثم عمد الی برمتنا، فبصق وبارک ثم قال: ادع خابزة فلتخبز معی... واقدحی من برمتکم ولا تنزلوها..."۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق، مذکورہ بالا؛ فتح الباری، ۷/۴۹۴-۴۹۹ ومابعد؛ نیز دوسری کتب؛ مسلم، کتاب الاشربة، باب جواز استتباعه وغیرہ)

بُھنا گوشت روٹی

اتفاق سے اس واقعہ کا تعلق بھی ایک غزوۂ نبوی سے ہے جس میں مردوں کے کھانا پکانے کا ذکر ہے۔ اور یہ ایک اور سماجی پہلو ہے۔ غزوات میں خواتین وصحابیات بھی اس قسم کی خدمات کے لیے جایا کرتی تھیں لیکن اس واقعہ میں ان کی بجائے رسولِ اکرمﷺ اور صحابہ کرام کے کھانا پکانے کا ذکر ملتا ہے۔ ترکیب طعام کا حصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص کے پاس طعام ہو تو وہ نکالے۔ ایک صحابی نے ایک صاع طعام نکالا یا صاع سے کچھ کم۔ اس طعام سے مراد آٹا ہے اور غالباً جَو کا آٹا کیونکہ مدنی اصطلاح میں اسی کو طعام کہا جاتا تھا۔ اس آٹے کو گوندھا گیا۔ پھر ایک مشرک توانا گڈریے سے ایک بکری خریدی گئی، اس کو ذبح کر کے اس کے پارچے بنائے گئے۔ پھر رسول اکرمﷺ کے حکم پر "سوادبطن" (بکری کے پیٹ کے حصوں جیسے کلیجی (کبد) وغیرہ کو بھونا گیا اور رسولِ اکرمﷺ نے اس سوادِ بطن سے نوچ نوچ کر تناول فرمایا۔

گوشت بھی شاید بھونا گیا تھا اس لیے کہ وہاں سالن والے گوشت پکانے کا ذکر ملتا ہے اور نہ موقع تھا۔ اس واقعہ میں ترکیبِ طعام کا ایک متن یہ ہے:

"... فقال النبی ﷺ هل مع احدمنكم طعامٌ؟ فاذا مع رجل صاع من طعام اونحوه، فعُجن... فاشترىٰ منه شاة فصُنِعت، فامر النبی ﷺ بسواد البطن يشوىٰ... قد حزّ له حُزّة من سواد بطنها..."۔

(بخاری، حدیث: ۵۳۸۲؛ فتح الباری، ۹/۶۵۳-۶۵۵، حضرت حافظ نے ترکیبِ طعام پر کوئی بحث نہیں کی۔ البتہ کتاب الھبہ کی حدیث: ۲۶۱۸ کی شرح میں یہ تشریح ضرور کی ہے کہ "سوادبطن" سے مراد کلیجی (کبد/ دل وغیرہ) ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد تمام اندرونِ خانہ چیزیں ہیں اور ان میں کلیجی، دل، گردہ، پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں)

ایک قیاس یہ ہے کہ جَو کے آٹے کے گوندھے جانے کا ذکر تو ہے مگر اس کی روٹی/ روٹیاں پکانے کا ذکر نہیں ہے لہٰذا خیال یہ ہے کہ اس گندھے ہوئے آٹے کو سوادِبطن میں رکھ کر پوری بکری بھون لی گئی ہو اور سوادِبطن کو الگ سے بھونا گیا ہو۔ بالعموم بعض قبائلی اور دیہی علاقوں میں اسی طرح گوشت روٹی پکانے کا رواج ملتا ہے۔ مشرقی یوپی میں بھَنوری نام کی روٹی کے اندر سبزی وغیرہ کو رکھ کر پکا لیا جاتا ہے اور وہ خاصی موٹی اور لذیذ روٹی ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں آٹا اندرِبطن رکھا گیا ہوگا۔

ہریسہ کی ترکیب

ہریسہ نامی کھانے کی جو لغوی تشریح ملتی ہے اس میں اس کی ترکیب بھی شامل ہے۔ مصباح اللغات کے مطابق "ایک قسم کا کھانا جو گوشت اور کوٹے ہوئے گیہوں کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ ہریس کے معنی ہیں: باریک کوٹا ہوا"۔ حضرت سعد بن عبادہؓ کے ہدایائے طعام میں اس کا ذکر آتا ہے۔ یہ کھانا شام کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر آتا تھا جہاں رسول اکرم ﷺ قیام پذیر تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت ابوایوب انصاریؓ دوسرے پانچ دس حضرات کے ساتھ اس میں شریک ہوتے تھے۔ بعد میں میزبان اصلی نے رسول اکرم ﷺ کے لیے بطور خاص ہریسہ پکوانا شروع کر دیا تھا۔ اس میں گیہوں کے دانوں کو خوب کوٹ کر خالص گوشت میں ڈالا جاتا تھا۔ اس میں ظاہر ہے کہ کچھ چکنائی اور مسالہ بھی ہوتا تھا۔ اس طرح وہ انتہائی لذیذ کھانا بن

جاتا تھا۔ ہریسہ نامی کھانے کے باب میں اس کی دو قسمیں: لحمی اور غیر لحمی ملتی ہیں۔ لہٰذا وہ گوشت پر بھی مبنی ہوتا تھا اور دوسری قسم بغیر گوشت کی ہوتی تھی۔ (ابن ہشام، ۱/ ۴۹۸-۴۹۹)

کھانوں کی اقسام کے بیان میں کئی اور کھانوں کے پکانے یا بنانے کی ترکیب کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ ان میں حسب ذیل شامل ہیں:

۱۔ خزیرہ: حضرت عتبان بن مالکؓ کی دعوت کی حدیث کے حوالے سے۔

۲۔ حشیشہ/ دشیشہ: کاشانۂ نبوی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی دعوتِ صحابہ کے ضمن میں۔

۳۔ حریرہ: جو خزیرہ کی دوسری نوعیت تھی یا دوسرا نام تھا۔ بہرحال وہ ایک مستقل کھانا تھا۔

لحمِ مَشْوِیْ

عربی لغت میں "شـوّی" اور اس کے مشتقات کے معنی ہی بھنا ہوا گوشت کھانا اور کھلانا ہے۔ اور صرف شَوَی یَشْوِی شیاً کے معنی گوشت کو آگ پر بھوننا ہے اور الشوِیّ کے معنی بھنا ہوا گوشت ہے۔ (مصباح اللغات)

احادیث وروایاتِ سیرت میں اس گوشت کے بھوننے کا ذکر بھی ملتا ہے اور اس کی ترکیب کا بھی۔ حدیثِ بخاری: ۵۳۸۲ میں بکری کے سواد البطن کے بھوننے کا ذکر کیا گیا ہے جس کا اوپر اور دوسری جگہ حوالہ آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ جزور (اونٹ) کے گوشت کو بھوننے او رکھانے کا ذکر متعدد احادیث وروایات میں آتا ہے اور بکری کے لحم مَشْوِی کا حوالہ تو بہت سے مقامات پر ملتا ہے۔ محدثینِ کرام نے تو اپنی اپنی کتاب الاطعمہ میں اس پر الگ ابواب قائم کر کے ان کے تحت بعض واقعاتِ لحم مَشْوِی بیان کیے ہیں۔ سیرت نگاروں میں ابن اسحاق/ ابن ہشام وغیرہ نے بھنی ہوئی بکری (شـاة مَصلِية) کے شانے کے گوشت کا ذکر کیا ہے جو یہودی عورت نے خیبر میں زہر آلود کر کے کھلانا چاہا تھا۔

(ابن ہشام، ۲/ ۳۳۷-۳۳۸: "أهدت لـه زينب بنت الحـارث، امراة سلام بن مشكم، شاة مصلية..." الخ۔ حضرت عمار بن یاسرؓ نے بھی شـاة مصلية کا گوشت تناول فرمایا تھا اور ان کے بعض دوستوں نے بھی (ترمذی، ابواب الصوم، باب في كراهية الصوم يوم الشك)

امام بخاریؒ نے اپنے "باب الشواء" میں قول اللہ تعالیٰ: "فجاء بعجل حنيذ" (ہود: ۲۶)

میں اسے مشوی ہی بتایا ہے اور ترجمۃ الباب کے علاوہ حدیث: ۵۴۰۰ میں گوہ کے بھنے ہوئے گوشت کے کھانے کا واقعہ نقل کیا ہے۔ بخاری اور شارح ابن حجر عسقلانی نے حَنِیذ/ نَضِیج وغیرہ کے معانی مَشْوِی ہی کے بتائے ہیں اور امامانِ تفسیر ولغت سرخسی، نسفی، طبری، سُدّی، خلَیل اور ابن بطال وغیرہ کے اقوال وتفسیرات نقل کی ہیں۔ ان میں سے بعض میں بھوننے کی ترکیب ونوعیت کا ذکر ہے جو دو طرح کا ملتا ہے:

۱۔ وہ بھنا ہوا گوشت جو گرم پتھر میں بھونا جاتا ہے: "الحنیذ المشوی فی الرضف ای الحجارۃ المحماۃ"۔

۲۔ حَنِیذ کے دوسرے معنی یا جہت یہ ہے کہ بھوننے کے بعد جس سے پانی ٹپکتا رہے: "الذی یقطر ماؤہ بعد ان یشوی"۔ گوشت کھانے کے باب میں متعدد احادیث اس معنی کی گذر چکی ہیں جیسے حدیث مسلم: ۹۴ (۳۵۷): ابورافعؓ کے بطن الشاۃ بھوننے کی۔

(فتح الباری، ۹/ ۶۷۱ ومابعد؛ ترمذی، باب فی اکل الشواء: حضرت میمونہؓ نے پہلو کا بھنا ہوا گوشت (جنباً مشویا) رسول اکرم ﷺ کو پیش کیا اور آپ ﷺ نے تناول فرمایا۔ بکری کے شانے (کتف) کا گوشت کھانے کی بہت سی روایات ہیں اور وہ غالباً بھنے گوشت کی مثالیں ہیں، حدیث مسلم: ۹۱ (۳۵۴)، ۹۳ (۳۵۶) وغیرہ؛ اسی طرح دست (ذراع) کے گوشت میں اس کا امکان ہے)

لحمِ مسموط

احادیثِ بخاری: ۵۳۸۵، ۵۴۲۱ اور ۶۳۵۷ وغیرہ کے علاوہ متعدد دوسری احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایسا گوشت کبھی تناول نہیں فرمایا۔ بالعموم احادیث میں "شاۃ مسموطۃ" کی ترکیب آتی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بکری کا گوشت یا سالم بکری اس خاص ترکیب سے پکائی جاتی تھی۔ مسموط کے عام معنی تو بھنے ہوئے (مشوی) کے ہیں اور محدثین کرام نے گوہ وغیرہ سے متعلق احادیث اسی کے ذیل میں نقل کی ہیں۔ شارحینِ کرام نے بالخصوص حافظ ابن حجرؒ نے اسی معنی کی تصدیق وتائید کی ہے اور بعض دوسرے اضافات بھی کیے ہیں۔

اصلاً تو وہ بھی بھنا ہوا گوشت ہوتا تھا مگر اس کی ترکیب ذرا مختلف تھی۔ جانور (بکری وغیرہ) کے بالوں کو تیز گرم یا کھولتے ہوئے پانی سے صاف کر دیا جاتا تھا اور اس کی کھال سمیت

اس کو بھون لیا جاتا تھا یا پکا لیا جاتا تھا۔ عام طور سے یہ ترکیب یا طریقہ کم عمر چھوٹے جانوروں اور ان کی تازہ راسوں میں اختیار کیا جاتا تھا۔ امام موصوف کے مطابق وہ مالدار وخوشحال لوگوں کا فعل تھا۔ لیکن امام ابن بطال کا قطعی بیان ہے کہ مسموط کے معنی مَشوی کے ہیں: "المسموط الذی ازیل شعره بالماء المسخن وشُوی بجلده اویطبخ، وانما یُصنع ذلک فی الصغیر السن الطری، وهو من فعل المترفین... وقد جزیٰ ابن بطال ان المسموط المشوی..."۔ اس لحاظ سے مترفین کا طنز بے معنی ہے کیونکہ مشوی تو عام رواج میں تھا اور رسول اکرم ﷺ نے بھی اسے تناول فرمایا تھا جیسا کہ باب بخاری سے واضح ہوتا ہے۔

بخاری کے دوسرے باب کا عنوان معنی خیز ہے اور اہم ترجمی: "باب شاة مسموطة والکتف والجنب" اس کے تحت حدیث: ۵۴۲۱ میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے کبھی "شاة سمیطة بعینه" (پوری بھنی بکری) نہیں دیکھی۔ جب کہ حدیث: ۵۴۲۲ میں ہے کہ آپ ﷺ نے بکری کے شانے کا گوشت تناول فرمایا۔ ایسی تمام احادیث اوران پر مباحثِ شارحین سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پوری بھنی ہوئی بکری تو بلاشبہ آپ ﷺ نے نہیں دیکھی مگر اس کے مختلف پارچے بھنے ہوئے تناول فرمائے۔ حافظ ابن حجر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بہرحال وہ عہدِ نبوی کا ایک پسندیدہ کھانا تھا اگر چہ مالداروں کا تھا۔ اس کھانے کا چلن بھی تھا اور اس کی ترکیب بھی معلوم تھی۔ اس کی تائید بھنی ہوئی کھری (کراع) کے کھانے سے بھی ہوتی ہے جو بقول حافظ موصوف صرف مسموط ہی کھائی جا سکتی ہے: "ثبت انه اکل الکراع، وهو لایوکل الامسموطا" (فتح الباری، ۹/ ۶۵۸، ۶۸۲-۶۸۳)

شوربہ دار گوشت

متعدد احادیث وروایاتِ سیرت وتفسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ جاہلی عرب اور عہد نبوی دونوں میں گوشت کی بوٹیاں بنالی جاتی تھیں اور پھر ان کو پانی، نمک اور بعض مسالوں وغیرہ کے ساتھ پکایا جاتا تھا جس کے نتیجہ میں وہ شوربہ والا گوشت بن جاتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کو شوربہ پسند بھی تھا چنانچہ روایت گذر چکی کہ آپ ﷺ اور حضرت علیؓ نے گوشت کھانے کے بعد شوربہ

نوش بھی فرمایا تھا۔ ''باب المرق'' میں اس کی دوسری مثالیں بھی ہیں۔ شوربہ کا اضافہ لذتِ کام ودہن کے لیے بھی کیا جاتا تھا اور کھانے کی مقدار بڑھانے کے لیے بھی جیسا کہ متعدد احادیث میں حکمِ نبوی ہے کہ پڑوسیوں اور عزیزوں کو شادکام کرنے کے لیے گوشت میں تھوڑا شوربہ بڑھا دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ شوربہ دار گوشت کا بہرحال ایک الگ مزہ تھا اور ہے۔ عہدِ نبوی میں اس کی مثالوں کے علاوہ اس کی ترکیبیں بھی ملتی ہیں۔

مثالوں میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی دعوت میں جو گوشت پکا تھا وہ شوربہ دار ہی تھا۔ حضرت بریرہؓ کا گوشت جو صدقہ میں آیا تھا اور رسول اکرم ﷺ کے لیے ہدیہ بنا تھا وہ بھی شوربہ دار گوشت تھا۔ خیاط صحابی کی دعوت میں اگرچہ لوکی اور سوکھے گوشت پر مشتمل کھانا تھا مگر اس میں وافر پانی ڈال کر شوربہ بنایا گیا تھا۔ باب المرق میں اس کی وضاحت ملتی ہے اور دوسری روایات کا حوالہ بھی حافظ ابن حجرؒ نے دیا ہے۔

(فتح الباری، ۹/۶۹۶: "فقرب خبز شعیر ومرقاً فیه دباء وقدید؛ واذا طَبَختِ قدرا فأكثِر مرقته، واغرف لجارك منه؛ فاكل رسول الله ﷺ وعلى من لحمها وشربا من مرقها"۔ نیز فتح الباری، ۹/۶۹۱ و مابعد: رایت النبی ﷺ أتى بمرقة فيها دباء وقديد..." وغیرہ۔ یہ صرف چند احادیث وواقعات ہیں ورنہ ان کی تعداد بہت ہو سکتی ہے)

ابن ہشام اور بلاذری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کے گھر سے جو ''طفیشل'' نامی کھانا خدمتِ اقدس میں آتا تھا اس میں گوشت کے ساتھ شوربہ ہوتا تھا۔ رسول اکرم ﷺ کو وہ پسند آتا تھا۔ اس زمانے میں آپ ﷺ کے مستقل میزبان حضرت ابوایوب انصاریؓ تھے۔ خاطرِ نبوی دیکھی تو وہ بھی اپنے گھر میں وہی کھانا تیار کرانے لگے۔ حضرت ابوایوبؓ کے گھر میں شوربہ بنانے کے لیے یا مسالہ کی خاطر لہسن کا استعمال ہوتا تھا جس سے آپ ﷺ نے احتراز فرمایا تھا۔ (فتح الباری، ۹/۷۱۱-۷۱۲، حدیث: ۵۴۵۱-۵۴۵۲؛ ابن ہشام اور بلاذری، مذکورہ بالا)

سوکھا گوشت/ قَدِید

مختلف ابواب وکتب میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ عرب جاہلی میں سوکھا گوشت (قدید) کھایا جاتا تھا جیسے رسولِ اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ کے بارے میں حدیث آ چکی ہے اور

دوسرے ابواب میں صحابہ کے سوکھا گوشت کھانے کا ذکر ہے۔ بالعموم قربانی خاص کر عمرہ وحج کے دوران مکہ مکرمہ میں قربانی کرنے کے بعد جانوروں/مویشیوں کا گوشت محفوظ کرلیا جاتا تھا۔ اور وہ پندرہ دن تک چلتا تھا اور بسا اوقات مکہ مکرمہ کے ذبیحوں کا گوشت مدینہ تک زادِ راہ کا کام دیتا تھا اور مدینہ میں بھی اس کو کھایا جاتا تھا۔ مسافر اور غازی بالعموم سوکھا گوشت ساتھ رکھتے تھے۔ لغوی معنی بھی یہی ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم قربانی کے گوشت کو نمک لگا کر محفوظ کرلیتے تھے اور اسے رسولِ اکرم ﷺ کے لیے مدینہ لایا کرتے تھے۔ یہ صحابہ کرام کا عمل تھا۔

(مصباح اللغات: القدید: کاٹا ہوا اور خشک کیا ہوا گوشت..."؛ بخاری، باب القدید اور دوسری کتب کے ابواب؛ ابن سعد، ۱/۲۳: بی بی آمنہ کے قدید کھانے کی روایت: کانت تاکل القدید؛ بخاری، کتاب الاضاحی، باب مایؤکل من لحوم الاضاحی: "... الضحیة کنا نُملّح منه فنقدم به الی النبی ﷺ بالمدینة..." نیز اسی کتاب کے ابواب کی احادیث مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

دوسرے انسانی معاشروں اور عہدِ حاضر کے سماجوں کی مانند عہدِ نبوی میں بھی گوشت کو سکھانے کے طریقے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ آگ پر گوشت کے پارچوں کو اس طرح سکھالیا جاتا تھا۔ یہ عام رواج بھی تھا۔ حدیث اور اس کی شرح سے بالعموم یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ غرباء و مساکین کا کھانا تھا جو شوربہ یا پکانے کے دوسرے لوازم کی استطاعت نہیں رکھتے تھے جیسا کہ بی بی آمنہ بنت وہب زہری کے سوکھے گوشت کی تائید وتشریح میں کہا جاتا ہے۔ مگر اصلاً وہ گوشت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ تھا اور غالباً سب سے سادہ، سستا اور لذت آگیں اور مزیدار نسخہ تھا۔ دھوپ میں سکھایا ہوا گوشت چربی، گھی وغیرہ کے عناصر سے پاک ہونے کے علاوہ مدتوں محفوظ رہتا ہے اور اسے بعد میں سبزی اور مسالہ وغیرہ کے اضافہ سے پکایا بھی جاسکتا تھا اور پکایا بھی جاتا تھا۔ اور یوں بھی سوکھا گوشت کھایا جاتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے کھری (کراع) کھانے کی احادیثِ عائشہ صدیقہؓ اس کے پندرہ پندرہ دنوں تک محفوظ رہنے کا ذکر کرتی ہیں۔ جس طرح حضرت ثوبان مولائے نبوی کے اصلاح شدہ گوشت کے مدتوں محفوظ رہنے اور استعمال کرنے اور کھلانے کا ذکر ملتا ہے۔

(فتح الباری، ۹/۶۸۳، حدیث کراع: ۵۴۲۳؛ حدیث اصلاحِ قربانی؛ دعوت خیاط میں قدید ہی کا شوربہ لوکی سے بنایا گیا تھا؛ حافظ موصوف نے تصوف پسند شارحین پر نقد بھی کیا ہے کہ عہد نبوی میں گوشت سکھانے کا معاملہ کسی زہد

وفقر کے سبب نہ تھا جیسا کہ ان کا خیال ہے بلکہ وہ گوشت محفوظ کرنے کا ایک مقبول عام طریقہ تھا۔ اس سے زندگی اور معیشت کی سختی کا نتیجہ نکالنا غلط ہے)

روٹی اور گھی/مکھن

حدیثِ بخاری: ۴۱۰۱، ۳۵۷۸ وغیرہ کے علاوہ دوسری روایاتِ سیرت میں اس کھانے کی تیاری کی ترکیب ملتی ہے۔ حضرت اُم سلیم انصاریؓ نے اپنے شوہر نامدار حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی فرمائش پر جو کھانا غزوۂ خندق کے موقعہ پر رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے لیے تیار کیا تھا اس میں اس کی ترکیب کا بہت خوبصورت اور واضح ذکر ملتا ہے: خاتونِ خانہ نے جو کی ٹکیاں/ روٹی کے ٹکڑے نکالے اور ان کو اپنے دوپٹہ کے ایک کونے میں باندھ دیا اور کپڑے کے نیچے ان کو خوب پیٹا اور ایک دوسرے کو مسل کر چور چور کر لیا: ''... فاخرجت اقراصا من شعير، ثم اخرجت خمارا لها، فلفّت الخبز ببعضه، ثم دسّته تحت ثوبى وردّتنى ببعضه...'' یہ کھانے کی تیاری کا اولین مرحلہ معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام کی تشریف آوری کے بعد حضرت ام سلیمؓ نے اس روٹی کو بحکمِ نبوی مزید چور چور کیا اور حضرت ام سلیمؓ نے گھی/مکھن کی ایک کپی سے اس پر چکنائی ٹپکا کر سالن بنایا: ''فاتت بذلک، فامر به ففتّ، وعصرت عليه ام سليم عكّة لها فادمته...''

دوسری حدیث بخاری: ۳۵۷۸ کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے ایک اور ترکیب طعام لکھی ہے: ''حضرت ام سلیمؓ نے ایک مد یا نصف مد جَو کو پیسا اور اس سے کھانا بنایا: ''عمدت الى مد من شعير جرشته ثم عملته''۔ اس کا ایک دوسرا زاویہ حدیث حضرت ابوطلحہؓ کے حوالے سے ہے کہ وہ ایک مُد جو لائے اور اس کو بنانے کا حکم دیا اور اس کا کھانا بنایا گیا: ''اتى ابو طلحه بمد من شعير فامر به فصنع طعاما'' ۔ یہ وضاحت امام مسلمؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کی روایات و احادیث پر مبنی ہے۔ ان تمام روایات میں خاصا اور بنیادی ترکیب کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال ان تمام روایات سے جَو کو پیسنے، آٹا بنانے، اسے گوندھنے اور پیڑے بنا کر روٹی بنانے کے تمام مراحل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ مختلف واقعات کا بیان ہے، صرف واقعۂ خندق کے ایک معاملہ سے متعلق نہیں۔ حضرات ابوطلحہ انصاریؓ اور ان کی اہلیہ محترمہؓ صاحبانِ خیرات ومبرات تھے اور برابر دعوتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک قسم کی روایات میں روٹی کے ٹکڑوں کو کوٹنے پیسنے کا ذکر ہے جو ایک مدجو کے پیسنے سے بالکل علحدہ واقعہ ہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، مذکورہ بالا احادیث؛ فتح الباری، ۹/۶۵۳-۶۵۵: بعض احادیث میں ترکیب طعام کا ذکر نہیں ہے)

روٹی اور تیل

عام اور چلتے ہوئے کھانے کا ایک نام تھا: روٹی اور تیل۔ یعنی روٹی کو تیل کے ساتھ کھالیا جاتا تھا۔ یہ دراصل روٹی کو مختلف سالنوں جیسے گھی، مکھن، سرکہ، شوربہ، کھجور وغیرہ کے ساتھ کھانے کا معاملہ ورواج ہے۔ اس میں روٹی کے لیے ایک سیال یا نرم کرنے والی چیز کو بطور سالن یا امدادی کھانے کے استعمال کیا جاتا تھا۔ غزوۂ خندق کے واقعاتِ طعام سے متعلق اس عام اور سادہ کھانے کا ذکر حدیثِ بخاری: ۴۱۰۰ وغیرہ میں آتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ خندق کی کھدائی کے دوران مہاجرین وانصار کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دومشت یا تھوڑا سا جَو یا جَو کا آٹا لایا جاتا اور اس کو کسی طرح پکالیا جاتا پھر اس کے لیے کسی تیل، گھی، چربی وغیرہ سے شوربہ بنایا جاتا۔ اکثر وہ تیل پرانا اور بدبودار ہوتا اور اس کی مدد سے بھی روٹی حلق سے اتارنی مشکل ہوتی کہ روٹی حلق میں پھنس پھنس جاتی تھی۔ بہرحال اس طرح انصار ومہاجرین نے اس ہنگامی زمانے میں کسی کسی وقت کچھ کھالیا تھا: "...یوتون بملء کفی من الشعیر فیصنع لهم باهالة سخنة توضع بین یدی القوم، والقوم جیاع، وهی بشعة فی الحلق، ولها ریح منتن"۔ رسولِ اکرم ﷺ نے جس زمانے میں اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس جَو کے لیے رہن رکھی تھی اس زمانے میں حضرت انسؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو جو کی روٹی اور گرم چربی کا کھانا کھلایا تھا۔ اس کھانے کے دوسرے حوالے بھی ہیں۔

(بخاری، مذکورہ بالا؛ فتح الباری، ۷/۴۹۰-۴۹۳؛ کتاب الرهن، باب الرهن فی الحضر: ... بخبز شعیر واهالة سخنة"؛ نیز دیگر کتب حدیث)

لغوی طور سے اھـالة کا معنی ہے: پگھلی ہوئی چربی یا ہر وہ روغن جس کو بطور سالن استعمال کیا جائے اور سخنة کے معنی ہیں: گرم، لہٰذا وہ گرم روغن ہوا۔ (مصباح اللغات: اھالة/ سخنة) ظاہر ہے کہ ٹھنڈی چربی جمی ہوئی ہوتی ہے، اس سے روٹی کھائی تو جا سکتی ہے مگر مشکل سے ہی کھائی جا سکتی ہے۔ گرم چربی یا روغن سے روٹی میں نرمی بھی پیدا ہوتی ہے اور لذت بھی بڑھ جاتی ہے اور سب سے بڑی بات کہ آسانی سے حلق سے اترتی ہے۔ تیل کے ساتھ روٹی کھانے کے دوسرے واقعات بھی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر آگے آتا ہے۔

جَو اور چقندر

چقندر کی سبزی اور جو کے دانوں (سلق وشعیر) کے مرکب سے ایک لذیذ کھانا ایک گمنام صحابیہ بناتی تھیں اور اسے حضرت سہل بن سعد ساعدی خزرجیؓ اور ان کے ساتھی ہر نمازِ جمعہ کے بعد کھایا کرتے تھے: حدیثِ بخاری: ۵۴۰۳ میں اس کھانے کی ترکیب ذرا تفصیل سے ملتی ہے:

۱۔ خاتونِ مکرمہ کا ایک کھیت (مــــزرعة) تھا جس میں چھوٹی چھوٹی کیاریاں تھیں اور وہ مینڈوں سے گھری تھیں۔

۲۔ ان مینڈوں میں وہ چقندر (سـلق) بو دیا کرتی تھیں اور جب اس کی گانٹھیں تیار ہو جاتیں تو نکال لیتی تھیں۔

۳۔ چقندر اور اس کی جڑوں کو ایک پتیلی میں ڈال کر چولھے پر رکھ دیتی تھیں اور ان کو خوب گلاتی تھیں۔

۴۔ جب وہ گل جاتیں تو مٹھی بھر جَو کے دانے دَرْ کر یا پیس کر اس میں ڈال دیتی تھیں اور پھر خوب پکاتی تھیں۔

۵۔ چقندر اور اس کی جڑیں (اصـول السـلق) اس میں شوربہ (عرقة) بن جاتی تھیں اور دانے بھی گل جاتے تھے۔

۶۔ اس میں چربی یا گھی (شــحـم ولا ودک) وغیرہ کچھ نہ ڈالتی تھیں۔ صرف شوربہ تمام لذتوں کا خزانہ تھا۔

۷۔ یہ نہایت لذیذ کھانا بن جاتا تھا اور غالباً ان ہی صحابیہ کی ایجاد یا خاص عطیہ تھا۔
(بخاری، مذکورہ بالا کے علاوہ کتاب الجمعة، حدیث: ۹۳۹؛ فتح الباری، ۲/ ۵۴۹-۵۵۰ میں صرف ترکیب کا ذکر ہے: بعض دوسری کتبِ وابواب میں بھی اس کے کچھ نکات ہیں جس طرح دوسری کتب حدیث کی روایات میں بھی ان کا حوالہ ملتا ہے)

حیس/حیسہ کی ترکیب

احادیث وروایات میں اس کھانے کے کئی نام ملتے ہیں: حیس، حیسہ/حیساء، حساوغیرہ۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ملانے کے ہیں۔ الحیس ایک قسم کا کھانا جو گھی، کھجور اور ستو سے تیار کیا جاتا تھا (مصباح اللغات)۔ یعنی ثرید کی طرح اس میں بھی بعض کھانوں یا چیزوں کو ملا کر ایک نیا کھانا/آمیزہ تیار کر لیا جاتا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے وضاحت کی ہے کہ حیس کی اصل یہ ہے کہ کھجور، پنیر اور گھی سے ملا کر اسے بنایا جاتا تھا، اور کبھی کبھی پنیر کی جگہ چورا یا آٹا بھی ڈالا جاتا تھا: ”واصل الحیس ما یتخذ من التمر والاقط والسمن، وقد یجعل عوض الاقط الفتیت او الدقیق“
(فتح الباری، ۹/ ۶۸۵، حدیث بخاری: ۵۴۲۵: حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں حیس بنایا گیا: ”صنع حیسا فی نطع..“)
اس حیس کی تفصیل یا ترکیب حدیثِ بخاری: ۴۲۱۱-۴۲۱۳ میں ملتی ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ اس کے مطابق اس میں نہ روٹی تھی اور نہ گوشت، چمڑے کی چادروں پر کھجور، پنیر اور گھی بکھرا دیا گیا اور وہ حیس تھا: ”وما کان فیها من خبز ولا لحم، وما کان فیها الا أن امر بلالا بالانطاع فبُسطت، فالقی علیها التمر والاقط والسمن..“ اس میں اس کا نام مذکور نہیں مگر وہ حیس ہی تھا جیسا کہ مذکورہ بالا دوسری حدیث میں ہے۔
(فتح الباری، ۷/ ۵۹۷-۶۰۰؛ کھجور، پنیر اور گھی کو ملا کر ایک قسم کا حیس بنایا جاتا تھا، دوسری قسم وہ ہے جس میں گھی، کھجور اور ستو کو باہم آمیز کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی روایات کم ملتی ہیں اور کھجور، پنیر اور گھی کی حیس کی زیادہ)
اسی کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جس کے مطابق حضرت ام سُلیمؓ نے حضرت زینب بنت جحشؓ سے رسول اکرم ﷺ کی شادی کی خوشی میں جو کھانا بھیجا تھا وہ حیس/حیسہ یا حساء تھا: اس میں کھجور، گھی اور پنیر کو ایک ہانڈی میں خوب ملا دیا گیا تھا۔ اس کی تیاری کی ترکیب کا بیان

حدیث میں یوں ہے: "... فعمدت الیٰ تمر وسمن واقط فاتخذت حیسة فی برمة فارسلتْ بها معی الیه..."

(بخاری، کتاب النکاح، باب الهدیة للعروس؛ حدیث: ۵۱۶۳؛ فتح الباری، ۹/۲۸۲-۲۸۶ وغیرہ)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیس مختلف قسم کے کھانوں کا آمیزہ ہوتا تھا۔ اصل میں تو کھجور، گھی اور پنیر پر مبنی ہوتا تھا مگر بعض دوسری چیزیں جیسے پنیر کی جگہ چورا اور آٹا وغیرہ بھی ڈالا جاسکتا تھا یا ستو/سویق کا استعمال کیا جاسکتا تھا۔

ثرید کی تراکیب

لغت میں الثرید/ الثریدة کے معانی ملتے ہیں: شوربے میں ترکی ہوئی روٹی، اس کی جمع ثرائد اور ثرود ہے (مصباح اللغات)۔ رسولِ اکرم ﷺ کے جد امجد ہاشم بن عبد مناف کی ثرید کا واقعہ بہت مشہور ہے جس کے مطابق انھوں نے روٹی کو چورا کر کے شوربے میں ملایا تھا اور حجاج کو کھلایا تھا۔ روایات میں چورا کرنے کے سبب ان کا نام ہاشم پڑا لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ مگر ثرید سے متعلق روایات سیرت واحادیث میں اس کے مختلف معانی ومفاہیم بھی ملتے ہیں۔ غالباً اصل معنی لغوی ہیں۔ چونکہ روٹی کو شوربے میں ترکر دیا جاتا تھا یا ملا دیا جاتا تھا لہٰذا کسی دوسرے سالن یا کھانے کی چیز میں اس کو ملا دیا جاتا تھا تو وہ بھی ثرید کہلاتی تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی لغوی اعتبار سے ثرید کی یہی تعریف کی ہے کہ وہ گوشت کے شوربے میں ملی ہوئی روٹی ہوتی ہے: "وهو ان یثرد الخبز بمرق اللحم"۔ اس کی دوسری شکل ان کے قول کے مطابق یہ بھی ہوتی تھی۔ اس شوربے میں کبھی گوشت بھی ہوتا تھا: "وقد یکون معه اللحم"۔ اسی بنا پر عربوں میں ثرید کو ایک گوشت قرار دیا گیا: "والثرید احد اللحمین"۔ اس کی افادیت اور ترکیبِ طعام دونوں کے بارے میں مزید لکھا ہے کہ وہ بسا اوقات پکے ہوئے یا بھنے ہوئے گوشت سے زیادہ نفع بخش اور قوت دینے والی ہوتی جب اسے اس گوشت کے سالن میں ملا دیا جاتا تھا: "وربما کان انفع واقویٰ من نفس اللحم النضیج اذا ثرد بمرقته..."

(فتح الباری، ۹/۶۸۲؛ ۱۰/۱۸۲ وغیرہ؛ نیز دوسرے امامانِ لغت وشارحین حدیث کے بیانات واقوال)

- حدیثِ مسلم: ۳۲۸ کے مطابق ثرید کی ایک قسم وہ تھی جس میں گوشت ہوتا تھا بلکہ دست جیسا بڑا پارچہ بھی: "وصنعت بین یدی رسول الله ﷺ قصعة من ثرید ولحم فتناول الذراع، وکانت احب الشاۃ الیه"۔

(ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الثرید، حدیث: ۳۷۸۳: غالباً گوشت کے بڑے بڑے پارچے بھی ڈالے جاتے تھے)

- مختلف کھانوں یا کھانے کی چیزوں کو باہم ملا کر ان کا آمیزہ تیار کرلیا جاتا تھا۔ روایات میں اسے بھی ثرید کہا گیا ہے۔

- ایک روٹی کی ثرید ہوتی تھی (الثرید من الخبز)، حدیثِ ابوداؤد: ۳۷۸۳۔

- دوسری حیس کی ثرید ہوتی تھی (والثرید من الحیس) ۔ حدیث ابوداؤد، ۳۷۸۳ جیسا کہ گذر چکا کہ حیس میں کھجور، گھی اور پنیر کو زیادہ تر اور پنیر کی جگہ آٹا، چورا یا ستو وغیرہ کمتر استعمال کیا جاتا تھا اور اس آمیزہ کو بھی ثرید کہا جاتا تھا۔

- گوشت اور کدو کو ملا کر ثریدہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے بنائی گئی تھی: "وصنع ثریدۃ بلحم وقرع"، ابن ماجہ۔

- یہ ثریدہ دراصل اس خیاط صحابی کی دعوت میں کھلائی گئی تھی جس کے بارے میں روایات میں بہت تنوع ہے: مثلاً وہ لوکی اور گوشت کی ثرید تھی جس میں خوب پانی ڈالا گیا تھا، یا صرف کدو اور پانی کی ثرید تھی۔

- لوکی اور گوشت کا شوربہ تھا جس میں گوشت نہ تھا۔ اسے بھی ثرید کہا گیا ہے۔

- حضرت صفیہؓ کی شادی کے ولیمہ میں جو کھانا مختلف چیزوں سے تیار کیا گیا تھا اسے بھی ثرید کہا گیا ہے۔

- تلبینہ کے بیان میں ملتا ہے کہ پہلے ثرید بنائی جاتی پھر اس پر تلبینہ ڈالا جاتا تھا۔ گویا تلبینہ کی بنیاد ثرید تھی۔

- حجۃ الوداع کے لیے اور طویل سفر میں رسول اکرم ﷺ نے زادِ راہ کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ ایک اونٹ پر، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تھا، زاد- آٹا اور ستو (دقیق و سویق) ۔ لدوایا

تھا اور اس کے پیچھے ایک شخص کو نگراں مقرر کیا تھا لیکن وہ سواری عین کھانا کھانے کے وقت گم ہوگئی تو صحابہ کرام نے حیس کا ایک بڑا پیالہ پیش کیا اور اس سے رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل وعیال کے علاوہ صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بعض حاضرین کرام نے خوب سیر ہوکر تناول فرمایا: "..حملوا جفنة من حيس فأقبلوا بها... فأكل رسول اللهﷺ واهله وابوبكر و كل من كان معه.."۔

(واقدی، کتاب المغازی، ۱۰۹۴-۱۰۹۵: اگلے صفحہ پر ایک نئے کھانے کے ہدیے کا ذکر ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ابواء میں "لیاء مقشی" تناول فرمایا جو ودان سے ہدیہ آیا تھا۔ نہایہ کی تشریح کے مطابق لیاء ایک اناج/ حب ہوتا ہے حمص (چنے) کی مانند اور مقشی کے معنی ہیں چورا کیا ہوا: واللياء حب كالحمص، ولياء مقشى اى مقشور، النہایہ، ۳/۲۵۶؛ مصباح اللغات میں ہے: "اللیا" ایک قسم کا سفید غلہ")

تَلْبِینہ کی ترکیب

تلبینہ نامی کھانا آٹے یا چوکر سے بنایا جاتا تھا اور کبھی اس میں شہد بھی ڈال دیا جاتا تھا۔ اس کا نام تلبینہ اس لیے پڑا کہ وہ سفیدی اور رقت (باریکی) میں دودھ کے مشابہ تھا۔ اس کی دو قسمیں تھیں: ایک رقیق جو خوب پکا ہوا ہو اور دوسرا گاڑھا اور سخت۔ یہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے تشریح کی ہے جن کے الفاظ ہیں: "... طعام يتخذ من دقيق او نخالة، وربما جعل فيها عسل، سميت بذلك لشبهها باللبن فى البياض والرقة والنافع منه ماكان رقيقا نضيجا، لاغليظا نيئا" (فتح الباری، ۹/۶۸۱)۔ حدیث بخاری: ۵۴۱۷ کے مطابق تلبینہ دوسرا کھانا تھا اور اس کی بنیاد میں ثرید ہوتی تھی اور دونوں کو ملا کر مریض یا غمگین/غمزدہ کو کھلاتے تھے کہ وہ اس کے دل کے لیے مفید اور غم دور کرنے والا بن جاتا تھا۔ اس کی افادیت پر اور بھی روایات ملتی ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے کتاب الطب میں اس کی تراکیب متعددہ کا ذکر کیا ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/۱۸۰-۱۸۲)

تلبینہ کی ترکیب یا اس کے اجزاءِ طعام کے بارے میں حافظ موصوف نے متعدد امامانِ حدیث ولغت کی آرا جمع کر دی ہیں:

۱۔ امام اصمعیؒ کے مطابق وہ آٹے یا چوکر اور شہد سے بنایا جاتا تھا: "هى حساء يعمل من

دقیق او نخالة ویجعل فیه عسل ..." اس میں اس کو حساء بھی کہا گیا ہے۔

۲۔ دوسری رائے کے مطابق شہد کی جگہ دودھ ڈالا جاتا تھا۔

۳۔ امام ابونعیم اصفہانی کی کتاب الطب کے مطابق وہ خالص آٹا (دقیق بحت) ہوتا تھا۔

۴۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس میں چربی (شحم) یا چکنائی ہوتی تھی۔

۵۔ امام داؤدی کا بیان ہے کہ بلا خمیر والا آٹا لیا جاتا تھا اور اس کا پانی نکال کر اسے خشک اور چورا کر لیا جاتا تھا اور اس میں اور کوئی شے نہیں ملائی جاتی تھی۔ اس بنا پر اس کا نفع بہت ہوتا تھا: "یؤخذ العجین بلا خمیر فیخرج ماؤہ فیجعل حسوا فیکون لا یخالطه شيء، فلذلک کثر نفعه"۔

۶۔ امام موفق بغدادی کے مطابق تلبینہ اصل میں حساء ہے جو دودھ کے قوام میں ہوتا تھا: "التلبینة الحساء ویکون فی قوام اللبن"۔

۷۔ ان کے علاوہ متعدد دیگر ائمہ جیسے امام احمد، ابن ماجہ، ترمذی، قاضی عیاض وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور ان کا سارا زور حساء پر ہے۔

طباخ وخانساماں

عہدِ جاہلی اور عہدِ نبوی میں عام روزانہ کھانا پکانے کا کام گھریلو خواتین بالخصوص بیویاں انجام دیتی تھیں۔ کاشانۂ ہائے نبوی میں یہ فریضۂ محبت ازواجِ مطہرات کے سپرد تھا اور وہی بالعموم تمام کھانا اور اس کے لوازمات تیار کرتی تھیں۔ ان کی مدد کے لیے گھریلو باندیاں اور خادمائیں بھی ہوتی تھیں۔ وہ آٹا گوندھنے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ باندیاں، انائیں اور خادمائیں اور خدام بھی کھانا پکانے کا کام کرتے تھے اور بعض اوقات وہ مستقل طباخی کرتے تھے۔ ان میں حضرت بریرہؓ کے آٹا گوندھنے اور حضرت ام ایمنؓ کے روٹی پکانے کے واقعات کا ذکر بعض مباحث میں آ چکا ہے۔ ازواجِ مطہرات کے روٹی پکانے اور کھانا تیار کرنے کے بعض واقعات وروایات کا ذکر کیا جا چکا ہے اور بعض کا آگے دعوتوں کے ضمن میں آتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض خدام، موالی اور غلاموں کے بارے میں ذکر ملتا ہے کہ وہ کھانا

پکانے کا کام کیا کرتے تھے۔ بعض پیشہ ور کھانا پکانے والے یا پکانے والیاں تھیں۔ ان میں سے ایک اجیر خابزہ (روٹی پکانے والی) کا اور حضرت انس بن مالکؓ کے خباز (روٹی پکانے والے) کا ذکر بھی گذر چکا ہے۔ حضرت انسؓ کے خباز محض روٹی پکانے والے خانساماں نہ تھے بلکہ وہ سالن اور طرح طرح کے کھانے بھی پکاتے تھے۔ لہٰذا اصلاً وہ طباخ اور خانساماں تھے۔ عہد جاہلی کے حوالے سے جناب ہاشم نے ایسے ہی پیشہ ور خانساموں سے اونٹ کا گوشت پکوا کر اہل مکہ کو کھانا کھلایا تھا: ''طہاۃ'' گوشت پکانے والے ماہر طباخوں کو کہا جاتا ہے۔

(ابن سعد، ۱/۷۵-۷۶: ''ثم امر الطهاة فطبخوا ؛ مصباح اللغات: طهایطهو؛'' ایسے ماہرین طباخ/گوشت پکانے والے عام تھے)

رسولِ اکرم ﷺ کے بعض موالی کا ذکر بطور طباخ وخانساں بھی ملتا ہے۔ ان کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ حضرت ابو عبیدؓ رسول اکرم ﷺ کے ایک مولیٰ تھے اور وہ رسول اکرم ﷺ کے لیے کھانا پکایا کرتے تھے: ''کان یطبخ للنبی ﷺ''۔ کھانا پکانے کا ان کا ایک واقعہ ابن اثیرؒ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے لیے ایک ہانڈی میں گوشت پکایا۔ ان کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مجھ سے دست طلب کی جو میں نے خدمتِ اقدس میں پیش کردی، دوبارہ آپ ﷺ نے دست مانگی وہ بھی حاضر کردی۔ تیسری بار طلب فرمانے پر میں نے سوال کردیا کہ بکری میں کے دست ہوتی ہیں؟ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم خاموش رہتے اور حکم کی تعمیل کرتے رہتے تو جتنی دست میں طلب کرتا وہ تمھیں عطا کی جاتیں۔

(اسد الغابہ، ۵/۲۴۸: دست سالم کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلم پکایا گیا تھا یا بڑے بڑے پارچے دست جیسے تھے)

یہ واقعہ محض معجزہ واعجاز کا نہیں ہے بلکہ تعمیلِ ارشاد کے وجوب کا ہے اور طباخی کا تو ہے ہی۔ ممکن ہے کہ اور بھی طباخ وخانساماں ہوتے ہوں۔

امام محب الدین طبری، امام ابن سید الناس اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے ''نبوی آداب سفر'' کے باب میں گوشت پکانے کے ایک اجتماعی طریقے کا دلچسپ ذکر کیا ہے۔ ایک سفر کے دوران رسول اکرم ﷺ نے ایک بکری بنانے کا حکم دیا (فامر باصلاح شاۃ)۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اسے ذبح کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں اس کو بناؤں گا (علیّ سلخها) اور

تیسرے نے عرض کیا میں اسے پکاؤں گا (علیّ طبخها) ۔رسولِ اکرم ﷺ نے باصرار جلانے کی لکڑی جمع کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ (شاہ ولی اللہ کا رسالہ سیرت، ۸۴ومابعد)

بعض افراد وشخصیات کی فن طباخی میں مہارت کا ذکر روایات واحادیث میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پیشہ ور نہ تھے بلکہ اپنے گھروں اور اپنے کھانوں میں اپنی طباخی کی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ا۔ امہات المومنین میں حضرت صفیہ بنت حیؓ کے بارے میں ازواج مطہرات اور دوسرے صحابہ کا مشاہدہ ملتا ہے کہ وہ ماہر فن طباخ تھیں اور بعض کھانے تو بہت عمدہ پکاتی تھیں اور ان جیسی ماہر خاتون طباخہ نہیں دیکھی گئی۔ ابو داؤد وغیرہ کی روایت میں ان کی حیس پکانے کے بارے میں مہارت کا ذکر حضرت عائشہؓ کی زبان سے ہے۔ وہ دوسرے کھانے بھی عمدہ پکاتی تھیں۔

۔جن گمنام فارسی صحابی نے، جو رسول اکرم ﷺ کے پڑوسی بھی تھے، آپ ﷺ کی دعوت بطیب خاطر اور حضرت عائشہؓ کی بہ اصرار نبوی کی تھی، ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بہت عمدہ شوربہ پکاتے تھے: كان طيّب المرق. (حدیث مسلم: ۱۳۹ (۲۰۳۷)

۔مشہور دشمن اسلام عبداللہ بن خطل تیمی کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے اپنے مسلم انصاری رفیقِ سفر کے مولیٰ کو ایک پہاڑی بکرے/ نر ہرن کو ذبح کر کے کھانا پکانے کا حکم دیا تھا اور ان کی عدم تعمیل پر اس قدر برافروختہ ہوا کہ ان کو قتل کر دیا اور مرتد ہو کر فرار ہو گیا۔ ابن خطل مسلمان ہو گیا تھا اور عاملِ صدقات مقرر کیا گیا تھا مگر اس نے یہ ظلم وزیادتی کی اور قتل کا مستحق بنا۔ بہر حال انصاری صحابی کا مولیٰ ان کا خادم تھا اور طباخ بھی...: "وامر المولىٰ ان يذبح له تيسا فيصنع له طعاما..."

(ابن ہشام، ۴/ ۲۹؛ مصباح اللغات: "التيس: بکرا، جنگلی بکرا، نر ہرن جمع: تيوس، اتياس وتيسة..."

✪✪✪

دعوتوں کا باب

کاشانۂ نبوی میں دعوتیں اور کھانے

ایک حدیثِ نبوی میں لوگوں کو کھانا کھلانے کا حکم آیا ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے معاً بعد دیے گئے اولین خطبہ میں اس کا ذکر ہے: ایها الناس ! افشوا السلام، واطعموا الطعام، وصلوا والناس نیام، تدخلوا الجنة بسلام۔

اسے جنت میں داخلہ کے پروانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دنیا میں اسے باہمی محبت کا نسخہ بتایا گیا ہے۔ اور وہ ہے بھی دنیا و آخرت میں کامیابی کی کنجی۔ کتبِ سیرت وحدیث میں ایسی احادیث واحکام کی کمی نہیں۔ محدثین کرام نے کھانوں کی کتاب (کتاب الاطعمة) کے عنوان سے پورے پورے باب لکھے ہیں۔ وہ دراصل کتابوں کے بدل ہیں۔ ان میں کھانے کی اقسام، کھانا کھلانے کے فضائل، کھانا کھانے کے آداب وغیرہ پر کافی موادِ اسلامی موجود ہے جن پر تحقیقی مقالات بلکہ کتابوں کا انبار لگایا جا سکتا ہے۔

حدیث کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ جو کچھ ارشاد فرماتے تھے اس پر عمل بھی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے قول و عمل میں کسی قسم کا تضاد و تصادم نہ تھا، وہ تو دور کی بات، ان دونوں میں کوئی معمولی سا اختلاف بھی نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے تھے۔ یہی حدیث وسنت کا باہمی ارتباط بھی ہے۔ اسی سے نبوی اسوہ ابھرتا ہے: وہ اسوہ جو سب کے لیے قابلِ فخر اور قابلِ تقلید نمونہ بنتا ہے۔ احادیثِ قولی کی تشریح و تعبیر میں اعمالِ نبوی سے اعانت کا چلن ذرا کم ہے۔ دونوں میں ظاہری فرق و امتیاز نظر آنے کی صورت میں قولی حدیث کو عملی سنت پر ترجیح دینے کا اصول خود ساختہ ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سیرت وحدیث کے مآخذ اور ان کی معتبر روایات و احادیث سے رسولِ اکرم ﷺ کے

لوگوں کو کھانا کھلانے کی بہت شہادتیں ملتی ہیں۔ آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً صحابہ کرام اور دوسرے معاصرین کی دعوتیں کیں۔ ان کو بلا کر کھانا کھلایا، مہمانوں کی ضیافتیں فرمائیں، کھانا کھاتے ہوئے زائرین وزائرات کو شریک طعام کرلیا۔ بچوں کو ساتھ کھلایا، بڑوں کو دستر خوان پر بٹھایا۔ اور اپنی حدیث پر خود عمل فرمایا۔ ان سننِ طعام سے مختلف احکام وآداب نکلے، رنگا رنگ تہذیبی علامات ابھریں اور کھانے اور دعوت کرنے کے اسلامی طریقے طے ہوئے۔ موجودہ مطالعہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے خانۂ مبارک میں دوسروں کی دعوتوں کا ذکر کیا جارہا ہے تاکہ حدیث کو سنت بنتا دیکھا جاسکے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معیشت نبوی۔ مدینہ منورہ میں۔۲، ۱۵۔۱۸؛ نیز مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء؛ رسول اکرم ﷺ اور خواتین)

مکی دعوتیں

مکی دورِ نبوی میں رسولِ اکرم ﷺ کی بعض دعوتوں اور ضیافتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے سب سے اہم وہ دعوتِ طعام ہے جو رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے خاندانِ بنو عبد مناف کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے آراستہ کی تھی۔ بلاذری نے اس دعوت کا خاص ذکر کیا ہے۔ اپنی چہیتی اور سمجھ دار پھوپھیوں کے مشورے پر رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے گھر میں بنو عبد مناف کے تقریباً پینتالیس مردوں کو جمع کیا اور ان کے لیے کھانا پکوایا اور ان کی ضیافت و مدارات کرنے کے بعد اسلام کا پیغام سنایا جس کو ابولہب ہاشمی نے اپنی بے جا ضد سے نہیں سنا اور نہ دوسروں کو سننے دیا اور دعوت درہم برہم کردی۔ آپ ﷺ شکستہ خاطر نہ ہوئے اور دوسرے دن پھر پھوپھیوں کے مشورے پر دوسری دعوتِ طعام پر ان کو بلایا اور جب سب کھا پی چکے تو آپ ﷺ نے اپنا پیغام پیش کیا۔ اس بار ابولہب ہاشمی کی حرکاتِ ناشائستہ کے باوجود دوسرے اقرباء نے اسے سنا اور سننے کے بعد نرمی سے غور کرنے کا وعدہ کیا۔

دعوتِ اسلام دینے کے ضمن میں کھانے پینے کی دعوت پر ایک محدثانہ اعتراض کیا گیا ہے اور وہ ہے حضرت علیؓ کے ذریعہ دعوت کا انتظام کرنے اور اس میں ان کے اعلان واظہارِ تعاون

وامداد کرنے سے متعلق۔ مولانا شبلی نے اسے نقل کیا ہے مگر سید سلیمان ندویؒ نے اس پر روایت کے لحاظ سے نقد کیا ہے کہ وہ موضوع و بے سروپیر روایت ہے۔ بلاذری کی روایات اس کے علاوہ ہیں۔ مسئلہ دعوت کا نہیں ہے بلکہ حضرت علیؓ کے اعلانِ حق اور اظہار امداد کا ہے جو درایتی لحاظ سے صحیح بھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال بلاذری کی ان دو روایات پر وہ محدثانہ/ روایتی نقد وارد نہیں ہوتا۔

اگرچہ دوسری مکی دعوتوں کا ذکر نہیں ملتا تاہم یہ طے ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ دوسرے صحابہ کرام کو ہی نہیں غیر مسلم اعزہ واقرباء اور دوسرے باشندگانِ مکہ بالخصوص ان کے اکابر کو دعوتِ طعام دیتے رہے تھے۔ کیونکہ اول تو وہ عربوں کی سخاوت وجُود کا معاملہ تھا اور آپ ﷺ سخیوں کے سخی تھے، دوم رسول اکرم ﷺ کھانا کھلانے کو ایک ضروری سماجی اور دینی کام سمجھتے تھے اور اس کی تبلیغ فرماتے تھے تو بنفس نفیس اس پر عمل کیوں نہ فرماتے۔ سوم دعوتِ طعام اسلامی پیغام کو عام کرنے اور اندرونِ خاطر میں اتارنے کا ایک موثر ذریعہ تھا اور آج بھی ہے۔ چہارم آپ ﷺ اور زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ دوسروں کے گھروں پر کھانے بھیجا کرتے تھے لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے گھروں میں دعوتیں نہ فرماتے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دلائل وشواہد ہیں۔ اور تلاش سے بعض روایات بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ غیر دعوتی دعوتوں میں حضرت خدیجہؓ سے شادی پر ولیمہ کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح حضرت سودہؓ کے ولیمہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مدنی دعوتیں

ہجرتِ مدینہ کے بعد ہی آپ ﷺ کے گھروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ شروع شروع میں نبوی گھر کمرے نما تھے: ایک ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اور دوسرا ام المومنین حضرت سودہؓ کے لیے، آپ ﷺ باری باری سے ان دونوں گھروں میں رہتے تھے۔ پھر ازواج مطہرات سے مختلف اوقات میں شادی ہوتی گئی اور ان کے لیے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے گئے اور آخر زمانے تک ان کی تعداد نو ہوگئی۔ رسولِ اکرم ﷺ باری باری سے ان گھروں میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ قیام فرماتے تھے اور ان میں سے کسی نہ کسی گھر میں صحابہ کرام اور دوسرے زائرین کی دعوت فرماتے تھے۔ بعض دعوتوں کے حوالے سے گھروں کا ذکر مل جاتا ہے لیکن اکثر کے بارے میں

صرف یہ صراحت آتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے گھر میں دعوت تھی یا رسولِ اکرم ﷺ کھانا تناول فرما رہے تھے اور مہمان تشریف لائے اور آپ ﷺ نے ان کو شریکِ طعام کرلیا۔ بہر حال بعض مکانات کے حوالے سے جن دعوتوں کا ذکر ملتا ہے ان کا بیان پہلے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں

اصحابِ صفہ اگرچہ اپنی روزی روٹی کا انتظام کرتے تھے مگر ناداری کے سبب کبھی کبھی دوسروں کے گھر دعوت کھانے پر مجبور ہو جاتے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا طریقہ و معمول تھا کہ ان کے کھانے پینے کی فکر کرتے تھے۔ آپ ﷺ تو دراصل سب کے لیے ہی کوشاں و سرگرداں رہتے تھے۔ ان کی تعداد زیادہ ہوتی تو مختلف صحابہ کرام کے ہاں ان کو ایک ایک دو دو کر کے بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ بھی آپ ﷺ کی حکیمانہ فطرت تھی کہ کسی ایک پر زیادہ بار نہ پڑے۔ باقی حضرات کو اپنے گھر لے آیا کرتے تھے۔ حضرت طخفہ بن قیس غفاریؓ کا بیان ہے کہ وہ اصحاب الصفہ میں تھے اور ایک دن سب حضرات صحابہ میں تقسیم ہو گئے مگر پھر بھی پانچ اصحابِ صفہ بچ گئے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہمارے ساتھ عائشہؓ کے گھر چلو اور جب ہم وہاں پہونچے تو آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کھانا کھلانے کو فرمایا۔ ام المومنین حریرہ (حیسۃ) لائیں، وہ ہم نے کھایا پھر فرمائشِ نبوی پر دودھ کا پیالہ (عس) پلایا اور آخر میں ایک دودھ کا قدح لائیں اور ہم نے دودھ نوش کیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: چاہو تو سو جاؤ (یہاں) اور اگر چاہو تو مسجد چلے جاؤ۔ ہم نے کہا کہ ہم مسجد جاتے ہیں اور ہم مسجد چلے گئے اور وہاں سو گئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ باری باری سے کھانے پینے کا سامان بنفس نفیس صحابہ کرام کے لیے لاتی رہی تھیں۔ متعدد بار اصحاب صفہ کو کھانا کھلایا۔ ایک بار حشیشہ نامی کھانا کھلایا تھا۔

(اسد الغابۃ، ۳/ ۶۸؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ؛ ابن ماجہ، کتاب المساجد و الجماعات، باب النوم فی المسجد)

اصحابِ صفہ کو مختلف اوقات میں اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلانے یا کھانے پینے کی چیزوں سے تواضع کرنے کے کئی واقعات ملتے ہیں۔

- حضرت ابوہریرہ دوسیؓ مستقل رکنِ صفہ تھے۔ وہ آپ ﷺ کے ساتھ مستقل دوپہر کا کھانا (غداء) کھایا کرتے تھے۔ اس کا بہت دلچسپ واقعہ وہ خود بیان کرتے ہیں (موطاء، باب ماجاء فی قراءۃ قل ھو اللہ احدالخ وغیرہ؛ نیز اسد الغابہ وغیرہ میں تراجم وسوانح صحابی)۔ اس کے علاوہ ان کو کبھی دودھ پلایا اور کبھی اصحاب صفہ کے ساتھ ان کو گھر بلا کر دودھ وغیرہ کی دعوت کی۔ امام بخاریؒ نے ان کی ایک دعوت کا بہت دلچسپ بیان دیا ہے۔ بھوک کے مارے حضرت ابوہریرہؓ بے حال تھے، انھوں نے حضرت عمرؓ سے ایک آیت کریمہ کے بارے میں سوال کیا یہ سوچ کر کہ وہ انھیں گھر لے جا کر بتائیں گے اور کچھ کھلائیں پلائیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ ناتوانی سے راستہ میں رہ گئے اور رسول اکرم ﷺ نے ان کی حالت دیکھ کر سب بات سمجھ لی اور ان کو اپنے گھر لے جا کر دودھ سے خوب سیراب فرمایا۔

(کتاب الاطعمۃ، باب اول: حدیث: ۵۳۷۵؛ فتح الباری، ۹/۶۴۱-۶۴۵)

- بنوالمنتفق کے نمائندہ (وافد) حضرت لقیط بن صبرہؓ ابوعاصم کی دعوت کا واقعہ بہت اہم ہے لہٰذا کچھ تفصیل کے ساتھ بیان ہے: ان کا اپنا بیان ہے کہ میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا لیکن آپ ﷺ تشریف فرما نہ تھے، حضرت عائشہؓ نے ہمیں کھجور کھلائی اور شربت پلایا۔ اسی اثنا میں رسول اکرم ﷺ تشریف لے آئے اور آتے ہی ہمارے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ ہم بات چیت کر رہے تھے کہ چرواہے نے بکریوں کو دروازے/ پھاٹک کی طرف ہانکا اور اس کے ہاتھوں پر گندگی لگی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا کیا بکری نے بچہ دیا ہے۔ اس نے جواب اثبات میں دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو اچھا ایک بکری ذبح کرلو۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا: آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے بکری آپ کی وجہ سے ذبح کی ہے، کیونکہ ہم ایک سو سے زیادہ بکریوں کی تعداد نہیں بڑھنے دیتے۔ جب اور جیسے ہی تعداد زیادہ ہوتی ہے یا کوئی بکری بچہ دیتی ہے تو ہم ایک بکری ذبح کر دیتے ہیں۔

(اسد الغابہ، ۴/۲۶۶؛ ابوداؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الاستنثار نیز دیگر کتب حدیث وسیرت)

- حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بالعموم شام/ رات کا کھانا - عشاء - کھایا کرتے تھے حتی کہ ایک بار اصحاب صفہ میں سے تین کو اپنے گھر بطور مہمان پہنچا آئے مگر کھانا

رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کھایا: "وان ابابکر تعشّی عند النبی ﷺ.."

(بخاری: حدیث ۳۵۸۱؛ فتح الباری، ۶/ ۷۲۸)

- حضرت عبداللہ بن سرجس مزنیؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضری دی تو آپ ﷺ نے ان کو روٹی گوشت کھلایا۔ بعض دوسری روایات کے مطابق ان کو ثرید بھی کھلائی گئی تھی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ یہ دو واقعات کے کھانے رہے ہوں۔ اس لیے مہمان کئی کئی دن قیام کرتے تھے۔ (اسد الغابہ، ۱/ ۱۷۱، مسلم، کتاب الفضائل؛ معیشت نبوی - مدینہ منورہ میں -۲، ۱۷)

- حضرت لقیط بن صبرہؓ بیت نبوی میں آئے تو حضرت عائشہؓ نے مدارات کی پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آمد کے بعد بکری ذبح کر کے کھلائی۔ (اسد الغابہ، ۴/ ۴۲۱)

- حضرت عمیرہ بنت مسعود انصاریؓ اپنی بہنوں کے ساتھ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئیں۔ وہ پانچ خواتین تھیں اور بیعت کرنا مقصود تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کو کھانا تناول کرتے ہوئے پایا جو سوکھے گوشت (قدید) پر مشتمل تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک ٹکڑا (قدیدۃ) دہن مبارک میں چبا کر ان کو عطا فرمایا اور انھوں نے آپس میں اسے بانٹ کر ایک ایک ٹکڑا کھالیا۔ تازندگی برکتِ نبوی یہ حاصل رہی کہ ان کے دہنوں میں نہ بو پیدا ہوئی اور نہ ہی ان کو منھ کی کوئی تکلیف ہوئی۔ یہ روایت حافظ ابن اثیر نے حافظ ابونعیم اور حافظ ابوموسیٰ سے لی ہے۔ (اسد الغابہ، ۵/ ۵۱۲-۵۱۳)

حضرت میمونہؓ کے گھر میں

دوسری ام المومنین حضرت میمونہؓ ہیں جن کے گھر میں صحابہ کرام کے کھانے یا دعوت کا ذکر روایات میں ملتا ہے: حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیؓ کی ایک بہن حضرت ہزیلہ یا حفیدہ بنت حارث ہلالیؓ تھیں جو بدوی اعراب میں بیاہی گئی تھیں۔ انھوں نے ایک بار حضرت میمونہؓ کے پاس گوہ، پنیر اور گھی (الضباب والاقط والسمن) کا ہدیہ بھیجا۔ رسول اکرم ﷺ ان کے گھر میں تشریف لائے تو ام المومنین نے گوہ پیش کیا جس میں انڈے بھی تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرات عبداللہ بن عباس اور خالد بن ولیدؓ بھی ساتھ آئے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ کہاں سے آئی۔ حضرت میمونہؓ نے دونوں صحابہ کرام سے فرمایا کہ تم

دونوں کھاؤ۔ انھوں نے دریافت کیا: آپ نہیں تناول فرمائیں گے۔ ارشاد فرمایا: میرے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک آنے والا آتا رہتا ہے۔

(اسد الغابہ، ۵/ ۵۵۸: "انی یحضرنی من الله تعالیٰ حاضر"؛ نیز ۲/ ۹۵ یہی واقعہ/ حدیث مذکور ہے)

کتبِ حدیث بالخصوص صحیح بخاری سے یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے مگر اس میں چند خوبصورت اضافے اور تصریحات بھی ہیں:

- اول یہ کہ حضرت میمونہؓ کے گھر میں بھنی ہوئی گوہ موجود تھی: "فوجد عندھا ضبا محنوذاً"۔

- دوسرے یہ کہ وہ بطور ہدیہ ان کی بہن حفیدہ بنت حارث نجد سے لائی تھیں: "قد مت به اختها حفیدة بنت الحارث من نجد"۔

- اس موقعہ پر چند دوسری عورتیں بھی موجود تھیں اور ان میں سے ایک نے کہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا تو دو کہ وہ کیا چیز ہے؟

- بعض شارحین نے حضرت ام المومنین میمونہؓ کا اسم گرامی بتانے اور خبر کرنے والے کے طور پر لیا ہے۔

- کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ نے معمول کے خلاف ہاتھ بڑھا دیا تھا مگر جیسے ہی معلوم ہوا کہ گوہ ہے ہاتھ کھینچ لیا۔

- حضرت خالدؓ نے دریافت کیا کہ کیا وہ حرام ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ حرام نہیں، لیکن وہ میری قوم کی سرزمین پر نہیں ہوتی اس لیے مجھے اس سے رغبت نہیں: "لا، ولکن لم یکن بارض قومی، فاجدنی اعافه"۔ یہ جملہ بہت اہم اور قابلِ غور ہے اور اسی بنا پر بخاری کا ترجمۃ الباب بھی نہایت اہم ہے۔

- حضرت خالدؓ نے اس کو کاٹ کاٹ کر کھایا اور رسولِ اکرم ﷺ ملاحظہ فرماتے رہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب ما کان النبی ﷺ لا یاکل حتی یسمّٰی له فیعلم ماھو، حدیث: ۵۳۹۱؛ اطراف: ۵۴۰۰، ۵۵۳۷؛ فتح الباری، ۹/ ۶۶۲ نیز ماقبل ومابعد: ۹/ ۶۷۱ وغیرہ، ۶۷۴؛ موطا، کتاب الجامع، باب ماجاء فی اکل الضب؛ بخاری، کتاب الھبة، باب قبول الھدیة؛ ترمذی، ابواب الاطعمة، باب فی اکل الضب وغیرہ)

حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں

بعض روایات میں حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کے گھر میں زائر صحابہ کرام کی دعوتیں کرنے کا ذکر ملتا ہے:

- حضرت عکراش بن ذؤیب تمیمیؓ کا بیان ہے کہ میں اپنے قبیلہ بنومرہ بن عبید کے صدقاتِ اموال لے کر رسولِ اکرم ﷺ کے پاس مدینہ حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ انصار و مہاجرین کے بیچ تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے حضرت ام سلمہؓ کے گھر لے گئے اور کھانا طلب فرمایا۔ ہمارے پاس ایک بڑا پیالہ (جفنۃ) لایا گیا جس میں بہت سا ثرید اور مکھن تھا۔ ہم کھانے لگے اور رسولِ اکرم ﷺ اپنے سامنے سے تناول فرما رہے تھے جب کہ ہمارے ہاتھ پیالے کے ہر طرف گردش کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا دایاں ہاتھ تھاما اور پھر فرمایا: عکراش! ایک جگہ سے کھاؤ کیونکہ وہ ایک ہی کھانا ہے۔ پھر ہمارے پاس ایک بڑا طباق لایا گیا جس میں طرح طرح کی کھجوریں تھیں۔ میں صرف اپنے سامنے سے کھانے لگا جب کہ رسولِ اکرم ﷺ جا بجا سے تناول فرما رہے تھے اور پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہاں سے چاہو کھاؤ کیونکہ وہ ایک جیسا کھاجا نہیں ہے۔ پھر پانی آیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے دستِ مبارک دھونے کے بعد اس کی تری سے چہرہ اور ہاتھوں کو پونچھا اور فرمایا: عکراش! آگ پر پکی ہوئی چیزوں سے یہی وضو کیا جاتا ہے۔ (اسد الغابہ ۴/۴)

دیگر ازواجِ مطہرات کے گھروں میں

روایات واحادیث میں دیگر ازواجِ مطہرات کے گھروں میں نبوی دعوتوں کا ذکر ذرا کم ملتا ہے یا ان روایات پر ہماری نظر نہیں پڑی۔ بہر حال ان کے عدمِ ذکر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے گھروں میں کھانا نہیں کھلایا۔ پھر بعض دوسری نبوی دعوتوں کا ذکر دوسرے عناوین سے کیا گیا ہے مثلاً حضرت زینب بنت جحش اسدیؓ کے ولیمہ کا کھانا ان کے خانۂ مبارک ہی میں صحابہ کو کھلایا تھا اور اس کا ذکر ولیمہ نبوی کے باب میں آیا ہے۔ اسی طرح

عام بیوت نبوی کے حوالے سے متعدد دعوتوں کا ذکر آ رہا ہے۔ ان تمام جہات اور شواہد کی بنا پر یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی خانگی زندگی کے اول روز سے تادمِ آخر ازواج مطہرات کے گھروں میں صحابہ کرام و صحابیات کی دعوتیں کی تھیں اور ان کا سلسلہ اولین زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ سے آخری زوجہ مطہرہ حضرت میمونہؓ کے گھروں تک ایک عظیم و جلیل اور درخشاں اور ضوفشاں کہکشاں کی مانند پھیلا ہوا تھا۔

بیتِ نبوی کے عام حوالے

احادیث وروایات میں رسولِ اکرم ﷺ کے گھر کا عمومی حوالہ آتا ہے اور بہت کثرت سے آتا ہے کہ صحابہ کرام کو آپ ﷺ نے کھانا کھلایا، ان کی بطور خاص دعوت کی، یا بوقتِ طعام حاضرین و زائرین کو اپنے دسترخوان پر بٹھالیا۔ یہ رسولِ اکرم ﷺ کی ایک مستقل سنت تھی۔ ایسی دعوتوں کے واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کا نمائندہ ذکر کیا جاتا ہے اور خاصے اختصار کے ساتھ:

-حضرت جابر بن طارق احمسیؓ کا بیان ہے کہ میں خدمت اقدس میں آپ کے گھر حاضر ہوا تو کھانے میں لوکی (الدباء) موجود تھی۔ میرے سوال پر لوگوں نے بتایا کہ یہ ترکاری کدو (قرع) ہے جس سے ہم کھانے میں اضافہ کرتے ہیں: "القرع نكثر به طعامنا.."۔

(اسد الغابہ، ۱/۲۵۵؛ نیز کتب حدیث مذکورہ بالا: باب الدباء/ القرع)

-حضرت جنادہ بن ابی امیہ ازدیؓ سات افراد کے ساتھ رسولِ اکرم ﷺ کے گھر آئے تو رسول اکرم ﷺ نے ان کو کھانا پیش کیا۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم روزہ سے ہیں۔ فرمایا: کیا کل بھی روزہ رکھا تھا؟ مقصد یہ تعلیم کرنا تھا کہ صرف جمعہ کا روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔

(اسد الغابہ، ۱/ ۲۹۸؛ ۳۸۸-۳۸۹: میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان کے دوسرے دن/ سنیچر کا بھی روزہ رکھنے کے ارادے کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ کل کے روزہ کا ارادہ نہیں تو فرمایا کہ آج افطار کرو۔ یعنی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ اور انھوں نے کھانا کھایا)

-حضرت حمزہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا

کھایا تو آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ بسم اللہ کر کے داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ یہی واقعہ حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے بھی مروی ہے اور زیادہ مشہور ہے۔ موخر الذکر رسول اکرم ﷺ کے سوتیلے فرزند تھے۔

(اسد الغابہ، ۲/۵۱؛ بخاری، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام الخ، حدیث: ۵۳۷۶؛ فتح الباری، ۹/۶۴۵-۶۴۹ و مابعد)

- حضرت ربیعہ بن رواء العنسی حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ ﷺ کو رات کا کھانا کھاتے ہوئے پایا اور آپ نے ان کو شریکِ طعام کیا۔

(اسد الغابہ، ۲/۱۶۹: وہ کھانے کے بعد اسلام لائے اور اس سے قبل غیر مسلم تھے، روایت میں اس کی تصریح خود حضرت ربیعہؓ کی زبان سے ہے)

- حضرت شیبان بن مالک انصاری سُلمیؓ خدمتِ نبوی میں اذان فجر کے بعد آئے مگر آپ ﷺ سحری کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو سحری میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے کہا میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''میرا بھی یہی ارادہ ہے، موذن نے وقت سے پہلے اذان دے دی ہے کیونکہ اس کی آنکھ میں کچھ تکلیف ہے اور وہ صحیح وقت کا اندازہ نہیں کر سکا۔ لہٰذا ابھی سحری کھانے کا وقت ہے اور تم بھی کھاؤ'' (اسد الغابہ، ۳/۶-۷ نیز ۳/۱۰۲)

- اصحاب صفہ کا آخری ملجا و ماویٰ بیت نبوی ہی تھا۔ حضرت واثلہ بن اسقع لیثیؓ کا بیان ہے کہ ہم بیس آدمی تھے اور ہمیں بھوک نے تنگ کر رکھا تھا تو رسولِ اکرم ﷺ کے گھر لوگوں نے بھیج دیا۔ آپ ﷺ روٹی کے ٹکڑے اور تھوڑا دودھ لے آئے اور ٹکڑوں کو خوب باریک کوٹا یا مسلا اور اس پر دودھ ڈالا اور اسے ایک قسم کی ثرید بنا کر کھلایا: ''.. كسرة او كسر وشي من لبن..''

(بلاذری، ۱/۲۷۲ مابعد)

رسولِ اکرم ﷺ کی یہ متواتر سنت اور مسلسل معمول تھا کہ گھر میں وارد ہونے والوں کی مسلسل ضیافتیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کچھ تناول فرما رہے ہوتے تھے تو اس میں شریک ضرور کرتے تھے خواہ وہ معمولی شے ہو یا عمدہ اور اچھا کھانا ہو۔ اس عام دعوتِ نبوی میں مرد و عورت کی کوئی قید نہیں تھی۔ اوپر کی متعدد مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ عورتوں کے حوالے سے بعض اور مثالیں مزید پیش کی جاتی ہیں کہ ہماری اسلامی فکر میں عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کا

معیار دوسرا ہو گیا ہے اور طرزِ عمل تو غالباً بالکل بدل گیا ہے۔ اس باب خاص میں اسوۂ نبوی کو سامنے رکھنا ضروری ہے:

-حضرت اسماء بنت یزیدؓ گھر میں آئیں تو آپ ﷺ کھانا تناول فرمارہے تھے۔ ان کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

(ابن ماجہ، ابواب الصوم، باب ماجاء فی الصوم فی الرخصة فی الافطار؛ کتاب الاطعمة، باب عرض الطعام وغیرہ؛ نیز رسول اکرم ﷺ اور خواتین)

-ایک کھانے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ حضرت حذیفہؓ وغیرہ اصحاب کے ساتھ موجود تھے۔ کھانا لگ چکا تھا کہ ایک اعرابی اس طرح آیا جیسے کوئی اسے دھکا دے رہا ہو اور اس نے آتے ہی کھانے پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر آپ ﷺ نے اس کو روک دیا۔ اس کے بعد ایک عورت اسی طرح آئی اور اس نے بھی کھانے پر ہاتھ ڈالنا چاہا آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر فرمایا کہ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرو۔ ان دونوں کو شیطان دھکا دیتا ہوا لایا تھا تاکہ کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جاسکے اور برکت جاتی رہے۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ، کتاب الاطعمة، باب التسمیة علی الطعام)

ایسی اور بھی بہت سی روایات واحادیث ملتی ہیں جن میں رسولِ اکرم ﷺ کے مختلف گھروں میں سے کسی ایک گھر کا حوالہ ملتا ہے جیسے حضرت مسعود بن خالد کو بکری ذبح کر کے کھلائی (اسد، ۲/ ۸۷)، حضرت عباد بن شیبانؓ کو غداء مبارک کھلایا (اسد، ۳/ ۱۰۲) حضرت عبداللہ بن سرجس مزنیؓ نے آپ ﷺ کے ساتھ گوشت روٹی کھائی تھی (اسد، ۳/ ۱۷۱)

اپنے گھر میں کھانا

یہ عنوان کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اپنے گھر میں سب لوگ ہی کھانا کھاتے ہیں، یہ ایک فطری سماجی روایت ہے جو روزِ اول سے چلی آرہی ہے۔ بلاشبہ اسی فطری انسانی روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ بھی اپنے گھروں میں کھانا تناول فرمایا کرتے تھے۔ لہٰذا اس کی خاص اہمیت نہیں نظر آتی۔ لیکن یہ سطحی نظر ہے۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول اور آخری اسلامی شریعت

کے لانے والے بھی تھے لہٰذا اس عام فطری انسانی ریت میں بھی آپ ﷺ کی نسبت و حوالے سے ایک حسنِ فطرت اور حسنِ اسوہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ان معمول کے واقعات سے بعض ایسے احکام و اقدار اور سماجی معیارات وجود میں آتے ہیں جو انسانی زندگی میں حسن و جمال کے ساتھ ارتفاع و افتخار بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی دینی جہات بھی ہیں۔ اور کچھ بھی نہ ہو تو سیرتِ نبوی کا یہ ایک اور پہلو تو ہے ہی جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کی ایک ایک ادا اور ایک ایک طریقہ اور ایک ایک کام اہلِ بصیرت کے کام و دہن کے لیے ذوق لاتا ہے اور روح کو سرشار کرتا ہے۔ ان روایات و سنن کو جمع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کہیں دوسرے ابواب و مباحث سے یہ مفروضہ قائم نہ ہو جائے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنے گھر میں تو خاصہ تناول ہی نہیں فرماتے تھے۔

روایات و احادیث میں ایک طبقہ یا حصہ ایسا بھی ملتا ہے کہ جو یہ بتاتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں مہینوں چولھا نہیں جلتا تھا اور مدتوں کھانا نہیں پکتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا گیا ہے کہ اہل بیت کی گذر بسر فقر و فاقہ پر تھی اور رسول اکرم ﷺ بھی بیشتر اوقات فاقے سے بسر فرماتے تھے۔ اس کا ایک اور لازمی نتیجہ نکال لیا گیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی اصل تعلیم فقر و فاقہ ہے اور غنا مردود و ناروا ہے۔ یہ ایک طویل اور تحقیق طلب بحث ہے مگر یہاں مختصراً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ بلاشبہ رسولِ اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور اہل بیتِ نبوی کو بسا اوقات فقر و فاقہ کا بھی سامنا رہا۔ لیکن یہ فقر و فاقہ غنا کے بعد کا ہے اور اختیاری ہے، مجبوری اور حاجت کا فاقہ تھا اور نہ فقر، سب کو کھلانے، سیر کرنے کے بعد فقر و فاقہ اوڑھ لینے کا وہ قرآنی اسوہ تھا جو دوسروں کی حاجت کو اپنی حاجات پر ترجیح دلواتا ہے۔ یہ ایثار و قربانی سے بھرپور فقر تھا۔ اس فقرِ نبوی اور فاقۂ اہل بیت کے معیار و مقام کا اندازہ ان واقعاتِ اکل و شرب کے بعد ہی صحیح طور سے لگایا جا سکتا ہے جو حیاتِ طیبہ اور اہل بیت کی سماجی زندگی کے اس پہلو سے اجاگر ہوتے ہیں۔ خانۂ نبوی میں طعام کے منفرد واقعات سے حقیقت کے دونوں پہلوؤں کی تفہیم میں بھی مدد ملے گی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے گھروں میں کھانا کھانے کے واقعات مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مشاہدے کی بنا پر بیان کیے تھے۔ ان راویانِ کرام میں کئی خواتین و صحابیات بھی شامل ہیں اور رسول اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات بھی جو گھر کے مشاہد کا درجہ رکھتی

ہیں۔ان واقعاتِ درون خانہ کو بلا کسی ترتیب و تنظیم کے پیش کیا جا رہا ہے:

- اپنے ربیب (پروردہ) حضرت عمر بن ربیعہؓ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے کہ صاحبزادے کو آدابِ طعام سکھائے کہ اپنے سامنے سے کھاؤ اور بسم اللہ کہہ کر کھاؤ۔ یہ واقعہ کئی بار پیش آیا اور مختلف فرزندوں، عزیزوں کے علاوہ دوسرے صحابہ و صحابیات کو بھی ان آداب کی تعلیم دی۔اور یہ تعلیم کھانا کھانے کے وقت عملی طور سے دی گئی۔ ان میں حضرت عمر بن ابی سلمہ بھی شامل تھے، حضرت عکراشؓ بھی اور دوسرے بھی۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام والاكل باليمين ؛ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب الاكل باليمين؛ ترمذی، ابواب الاطعمة، باب في التسمية الخ؛ نیز معیشت نبوی۔مدینہ منورہ میں۔ا)

- حضرت سودہؓ کے گھر میں ہڈی کا گوشت (عرق) تناول فرمایا۔حضرت عائشہؓ کے گھر میں بھی ہڈی کھانے اور شوربہ تناول فرمانے کے واقعات ہیں۔

(بخاری، کتاب التفسیر، سورة الاحزاب اور فتح الباری کے متعلقہ مباحث)

- حضرت زینب بنت جحشؓ کے گھر میں اکثر و بیشتر شہد نوش فرماتے تھے۔

(بخاری، کتاب التفسیر، سورة تحریم اور کتب سیرت کے حوالے؛ معیشت نبوی-مدینہ منورہ میں-۱، ۲۸)

- حضرت عائشہؓ کے ساتھ گوشت تناول فرمایا۔ایک بار ان کی چوسی ہوئی ہڈی کو دوبارہ چوسا۔یہ آپ ﷺ کا معمول تھا۔(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب في مواكلة الحائض ومجامعتها)

- روٹی پر کھجور رکھ کر تناول فرمایا۔ایک بار آپ ﷺ نے ککڑی (قثاء) کے ساتھ کھجور کھائی۔یہ بھی معمول تھا۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب الرطب بالقثاء؛ ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب في الجمع بين لونين في الاكل)

- روٹی اور سرکہ آپ ﷺ کو بہت پسند تھا۔سرکہ کو بہترین شوربہ فرماتے تھے۔اس کے کئی بار کھانے کا ذکر ملتا ہے۔حضرت جابر بن عبداللہؓ کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں تین ٹکیاں اور سرکہ تھا جسے آپ ﷺ نے مل بانٹ کر تناول فرمایا۔

(مسلم، کتاب الاشربة، باب فضيلة الخل والتادم به: کئی احادیث نیز ترمذی، باب في الخل)

-ثرید بہت پسند تھی اور اسے خاص اور بہترین کھانا قرار دیتے تھے۔ اکثر استعمال فرماتے تھے۔ ثرید کے باب میں واقعات کا ذکر آچکا۔

(بخاری، کتاب بدء الخلق، باب قول اللہ تعالیٰ: وضرب اللہ مثلا الخ؛ کتاب الاطعمۃ، باب الثرید؛ مسلم وترمذی کی احادیث)

-حضرت عائشہؓ وغیرہ کے گھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھری/ پائے (کراع) کھاتے تھے بالخصوص بقرعید کے مواقع پر یا قربانی کے بقیہ گوشت سے۔ دوسری ازواج مطہرات بھی اسی طرح قربانی کا گوشت بچا کر رکھتی تھیں صرف آپ ﷺ کی تواضع کے لیے۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب القدید)

-حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لائے تو کھانا طلب فرمایا۔ روٹی، اور کھجور اور سرکہ کا استعمال فرمایا۔ (حوالہ جات سابقہ سرکہ کے بارے میں/ ابن ماجہ، باب الائتدام بالخل)

-حضرت ام ایمنؓ نے ایک بار باریک چپاتی (رغیف) پکادی، کھالی مگر دوسری بار موٹی روٹی پکانے کی ہدایت فرمائی۔

(ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب الحوّاریٰ: بقول انا محترمہ یہ ان کے علاقے کا کھانا تھا جو انھوں نے آپ ﷺ کے لیے بطور خاص پکایا تھا)

-حضرت عائشہؓ کے گھر میں کھانا کھا رہے تھے جو گوشت سالن پر مشتمل تھا کہ حضرت سودہؓ آئیں اور حضرت عمرؓ کی روک ٹوک کی شکایت کی۔ کھاتے ہی میں وحیِ حدیث اتری جس میں عورتوں کو ضرورت کی بنا پر گھروں کے باہر جانے کی اجازت دی گئی۔

(بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الاحزاب؛ کتاب النکاح، باب خروج النساء لحوائجھن وغیرہ دیگر ابواب)

-مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے فرزند حضرت یوسفؓ نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے روٹی کا ایک ٹکڑا لیا، اس پر ایک کھجور رکھی اور فرمایا: یہ اس کا شوربہ (ادام) ہے اور ان دونوں کو تناول فرمایا۔ (اسد الغابہ، ۱۳۲/۵)

-حضرت عائشہؓ کے گھر میں ایک اور کھانے کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے غلام نے ان کے لیے ایک بکری ذبح کی۔ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے پھر مسجد میں جاکر

دو رکعات نماز پڑھی اور پھر بستر پر آرام فرما کر دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ ہم نے ایک طباق میں جو کی روٹی کے ساتھ اوجھ (کرش) کا ایک ٹکڑا اور ایک دست بھی پیش کی۔ حضرت عائشہؓ نے اوجھ/کرش کھائی اور آپ ﷺ نے بھی کھانا تناول کیا۔ حضرت ابورافع خادم خاص آپ ﷺ کے لیے بطن الشاۃ (کلیجی وغیرہ) بھونتے تھے جو آپ ﷺ کو بہت پسند تھی۔ اس کا ذکر کئی روایات میں ملتا ہے۔

(اسد الغابہ، ۵/ ۵۵۵-۵۵۶؛ مسلم، کتاب الایمان، باب نسخ الوضوء مما مست النار؛ کتاب الحیض، باب جواز اکل المحدث الطعام)

-حضرت میمونہؓ کے گھر میں آپ ﷺ کے بکری کے شانے کا گوشت کھانے کا ذکر کئی احادیث کے حوالے سے ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب الوضوء، باب من مضمض الخ؛ ترمذی، ابواب الدعوات، باب مایقول اذا أکل طعاما)

-حضرت ام حکیم بنت دینارؓ نے اپنی مولاۃ (آزاد کردہ باندی) ام اسحاقؓ سے ایک روایت بہت دلچسپ نقل کی ہے۔ راویہ فرماتی ہیں کہ میں رسول اکرم ﷺ کے پاس موجود تھی کہ ثرید کا ایک پیالہ حاضرِ خدمت کیا گیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ میں نے اور حضرت ذوالیدینؓ نے کھایا پھر رسول اکرم ﷺ نے حضرت ام اسحاق کو ہڈی کا گوشت (عرق) عطا فرمایا کہ اس میں سے بھی کھاؤ۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں تو روزے سے تھی۔ میرا ہاتھ شل سا ہو گیا کہ نہ آگے بڑھتا تھا اور نہ پیچھے ہٹتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے استفسار پر عرض کیا کہ میں تو روزے سے تھی اور بھول کر کھانا کھا لیا۔ حضرت ذوالیدینؓ بول پڑے: اب جب کہ تم پیٹ بھر کر کھا چکی ہو؟ مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو رزق الٰہی تھا جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

(اسد الغابہ، ۵/ ۵۶۵: یعنی بھول کر کھا پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس مسئلہ کی تعلیم دی)

-حضرت اسماء بنت یزیدؓ کی حدیث ہے کہ ہم موجود تھے جب کھانا خدمت نبوی میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے ہمیں مدعو کیا مگر ہم نے معذرت کر دی کہ خواہش نہیں ہے۔ فرمایا: بھوک اور جھوٹ کو جمع نہیں کرنا چاہیے۔ (حدیث ابن ماجہ: ۳۲۹۸)

-حضرت ام عامر بنت کعب انصاریؓ کا واقعہ اسی جیسا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: آؤ اور کھانا کھاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو روزہ دار ہوں۔ فرمایا: ملائکہ اس روزہ دار پر سلام و درود بھیجتے رہتے ہیں جس کے پاس کھانا کھایا جاتا ہے۔ (اسد الغابہ، ۵/ ۵۹۷)

رسولِ اکرم ﷺ کے اپنے گھر میں کھانا کھانے کے صدہا واقعات ملتے ہیں اور ان کا احاطہ واستقصاء مقصود نہیں ہے۔ چند واقعات کو بلا کسی ترتیب و تنظیم کے یہاں جمع کر دیا گیا تا کہ یہ دعویٰ مدلل اور یہ تاریخی واقعہ مستند ہو سکے کہ رسول اکرم ﷺ اپنے گھروں میں کھانا تناول فرمایا کرتے تھے۔

صحابہ کرام کے گھروں میں دعوتِ نبوی

سماجی میل جول اور اسلامی آدابِ محبت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرام رسولِ اکرم ﷺ کی دعوتیں کرتے تھے، اور آپ ﷺ ان کے گھروں میں کھانا کھانے تشریف لے جاتے تھے۔ یہ عام کھانوں یا دعوتوں کا سماجی طریقہ تھا جو مکی دور سے مدنی دور میں جاری رہا۔ مکی دعوتوں کی روایات ذرا کم یاب ہیں کیونکہ ہمارے سیرت نگاروں کی توجہ زیادہ تر تبلیغ واشاعتِ دین کے کام پر مرکوز رہی تھی۔ البتہ مدنی عہد کی دعوتوں کا ذکر بہت سی روایات میں آتا ہے۔ ان کو بلا کسی خاص ترتیب کے پہلے بیان کیا جاتا ہے۔ ان سے نتائج بعد میں اخذ کیے جائیں گے۔ سردست یہ تاریخی واقعہ اور سماجی رویہ اجاگر کرنا مقصود ہے کہ سماج کے طبقات باہمی دعوتوں کی روایت پر عمل پیرا تھے۔

(معیشت نبوی- مدینہ منورہ میں نیز مکہ مکرمہ میں، مذکورہ بالا میں مزید بحث ہے نیز مندرجہ ذیل کتب حدیث کی روایات میں شارحین کی تفسیر بھی ہے)

-ایک خیاط صحابی نے رسولِ اکرم ﷺ کے لیے کھانا پکایا اور دعوت کی۔ حضرت انس خادم خاص بھی ساتھ تھے ان کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو پیالے کے کناروں سے لوکی (کے ٹکڑوں) کو تلاش کرتے دیکھا اور اس دن سے مجھے لوکی بہت پسند آئی۔ "إن خياطا دعا رسول الله ﷺ لطعام صنعه. قال انس : فذهبت مع رسول الله ﷺ، فرأيته يتتبع

الدباء من حوالی القصعة، قال: فلم ازل احب الدباء من یومئذ۔'' (بخاری، کتاب الاطعمة، ۴-باب؛ حدیث ۵۳۷۹؛ فتح الباری، ۹/ ۶۵۰-۶۵۲)۔ حافظ ابن حجرؒ کو ان صاحبِ طعام کا اسم گرامی نہیں معلوم ہو سکا لیکن ثمامہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ایک مولیٰ یا غلام تھے۔ حافظ موصوف کے مطابق یہ کھانا ثرید پر مشتمل تھا۔ دوسری روایاتِ حدیث اور احادیثِ بخاری سے بھی اس کی تفصیلات ملتی ہیں جو یہ ہیں: دعوت کا کھانا جو کی روٹی اور شوربے دار سالن پر مشتمل تھا جس میں لوکی اور سوکھا گوشت تھے (فیه دباء وقدید).

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب من یتبع حوالی القصعة وغیرہ دوسرے ابواب؛ نیز مندرجہ ذیل حوالے؛ اس دعوت کے کھانے پر کئی بار اوپر بحث آچکی ہے)

حدیثِ مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے ایک مولیٰ نے آپ ﷺ کی دعوت کی اور آپ ﷺ کے لیے کھانا پکایا۔ حضرت انسؓ کو ان کی ماں حضرت ام سلیمؓ نے ایک پیمانہ بھر کھجور آپ ﷺ کے لیے دے کر بھیجا تھا مگر آپ اپنے کاشانے میں نہیں ملے تو خادم موصوف تلاش میں دعوت گاہ تک جا پہونچے۔ رسولِ اکرم ﷺ اس وقت کھانا تناول فرما رہے تھے اور بلا کر حضرت انسؓ کو شریک طعام کیا۔ وہ کھانا گوشت اور لوکی کی ثریدہ پر مشتمل تھا (ثریدة بلحم وقرع)۔ آپ ﷺ کو قرع (کدو) کی سبزی بہت پسند تھی کیونکہ فرمانِ نبوی کے مطابق وہ آپ ﷺ کے بھائی حضرت یونس علیہ السلام کا درخت ہے (انها شجرة اخی یونس)۔ شارح موصوف نے اور بحث بھی کی ہے۔

- ایک انتہائی خوبصورت روایت اور حسین وجمیل واقعہ اور قابلِ تقلید اسوہ پر مبنی روایت کا ذکر ایک فارسی صحابی کی دعوت میں ملتا ہے۔ آپ ﷺ کے ایک پڑوسی تھے۔ وہ ایرانی تھے۔ وہ سالن بہت اچھا پکاتے تھے۔ ایک بار حاضرِ خدمت ہوئے اور رسولِ اکرم ﷺ کو کھانے کی دعوت دی۔ حضرت عائشہؓ سامنے موجود تھیں۔ آپ ﷺ نے داعی سے پوچھا کہ عائشہؓ کی بھی دعوت ہے۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے بھی انکار کر دیا۔ وہ چلے گئے۔ تھوڑی دیر پھر حاضر ہوئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی اور پھر وہی صورت حال پیش آئی۔ بہرحال تیسری بار وہ حاضرِ خدمت ہوئے اور دونوں کو دعوت دی۔ تب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ ان کے گھر کھانا کھانے گئے۔

(مسلم، کتاب الاشربة، باب مایفعل الضیف اذا تبعه غیر من دعاه صاحب الطعام؛ نووی وغیرہ شارحین مسلم کی تشریحات)

-ایسا ہی ایک اور دلچسپ دعوت کا واقعہ ہے جس میں ایک غیر مدعو مہمان بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک انصاری صحابی ابوشعیبؓ نامی تھے۔ ان کا ایک غلام گوشت کا کام کرتا (لحام) تھا۔ حضرت ابوشعیبؓ نے اس غلام کو کھانے تیار کرنے کا حکم دیا تا کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے علاوہ چار مزید شخصوں کے ساتھ دعوت کریں۔ حاضر خدمت ہو کر انھوں نے صرف پانچ اشخاص کی دعوت کو کہا مگر ایک شخص بلا دعوت ساتھ لگ لیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے میزبان سے فرمایا: یہ شخص ہمارے ساتھ چلا آیا ہے، چاہو تو اجازت دو، چاہو تو اسے منع کر دو۔ میزبانِ گرامی نے ان کو بھی اجازت دے دی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیثِ بخاری کی تشریح دیگر کتبِ حدیث سے خوب کی ہے۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب الرجل یتکلف الطعام لاخوانه؛ حدیث: ۵۴۳۴؛ فتح الباری، ۹/۶۹۱-۶۹۵؛ دیگر ابواب بخاری؛ جیسے کتاب البیوع، باب ماقیل فی اللحام و الجزّار وغیرہ)

-مشہور صحابی حضرت براء بن معرور خزرجی کی اہلیہ محترمہ حضرت ام بشرؓ نے تحویلِ قبلہ (منگل ۱۵/شعبان ۲ھ) سے پہلے رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کی اور کھانا پیش کیا۔ حضرت براءؓ کے بارے میں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ وہ تحویل کے حکم سے قبل ہی خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کے حق میں تھے اور نہ صرف حق میں بلکہ اس کے داعی بھی تھے۔ صرف حکم نبوی پر انھوں نے بیت المقدس کو قبلہ ماننا قبول کیا تھا۔

(بلاذری، ۱/۲۴۶: شاید یہ دعوت اسی خواہش کے پورا ہونے کی خوشی میں ہوئی تھی مگر صاحبِ خواہش اس وقت زندہ نہ تھے)

-دختر نیک اختر حضرت فاطمہؓ اور داماد مکرم حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ نے ایک بار رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کی اور بعض دوسرے صحابہ کو بھی شریک طعام کیا۔ اصلاً یہ دعوت میزبانوں نے اپنے ایک مہمان کے آنے پر آراستہ کی تھی اور اس میں آپ ﷺ کو بھی بلایا تھا۔

(ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی طعام المتبارین)

معجزاتی دعوتیں

-کھانے پینے کی ان دعوتوں میں کئی معجزات کا بھی ظہور ہوا۔ان کو معجزاتی دعوتیں کہنا بالکل مناسب ہوگا۔ان کے بعض واقعات کو بہت دلچسپ انداز سے حضرات محدثین کرام نے بیان کیا ہے:

-حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے اپنی اہلیہ حضرت ام سلیمؓ کو کچھ کھانا تیار کرنے کا حکم دیا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی آواز سے ہی آپ ﷺ کی بھوک کا اندازہ کرلیا تھا۔ان کے سوتیلے فرزند حضرت انس بن مالکؓ کو بھیجا گیا کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کو بلالائیں۔آپ ﷺ اس وقت صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے۔جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے گھر کھانے کی دعوت ہے تو سب موجود صحابہ کرام کو ساتھ لے گئے۔حضرت ابوطلحہ کو اتنے لوگ دیکھ کر تشویش ہوئی۔بہرحال رسولِ اکرم ﷺ کے فرمانے پر دس دس کے گروہ کو کھانے کے لیے اندر بلایا گیا اور وہ یکے بعد دیگرے کھا کھا کر اور سیراب ہوکر نکلتے گئے۔تمام آسودگانِ طعام کی تعداد اسّی مردوں پر مشتمل تھی۔

(بخاری، مذکورہ بالا، حدیث: ۵۳۸۱؛ فتح الباری، ۹/۶۵۲-۶۵۵؛ معیشت نبوی-مدینہ منورہ میں، ۲۰: ”روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے گھر میں آپ ﷺ نے کئی بار کھانا تناول فرمایا، صرف غزوۂ خندق کے دوران ہی نہیں، جس کا ذکر روایات میں زیادہ آتا ہے۔بلاشبہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اور ان کی اہلیہ ماجدہ حضرت ام سلیم بنت ملحان انصاریؓ رسولِ اکرم ﷺ کی مسلسل دعوتیں کرتے تھے)

-حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ ہمارا دستہ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سوتیس اشخاص پر مشتمل تھا۔آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا کسی شخص کے پاس کچھ کھانا (طعام) ہے؟ تو ایک صحابی نے ایک صاع طعام یا اس کے بقدر پیش کیا۔اس کے بعد ایک مشرک شخص سے، جو گذر رہا تھا، آپ ﷺ نے ایک بکری خریدی اور وہ پکائی گئی۔رسول اکرم ﷺ نے اس کھانے سے تمام لوگوں کو اپنے معجزے سے آسودہ وسیراب فرمادیا۔اس کے بعد بھی کھانا دو بڑے پیالوں (قصعتین) میں بچ رہا جو لادا گیا۔

(بخاری، مذکورہ بالا، حدیث: ۵۳۸۲؛ فتح الباری، ۹/۶۵۳-۶۵۵؛ حافظ موصوف نے مختلف کتب حدیث کی روایات بھی دی ہیں)

-حضرت جابر بن عبداللہ خزرجیؓ نے غزوۂ خندق کے دوران رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کی اور آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ شریک ہوئے اور تھوڑے کھانے میں برکات الٰہی کا ظہور ہوا۔ یہ واقعہ نبوی معاشرے کی صالحیت اور رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی جفاکشی کا بھی مظہر ہے۔ صحابہ کرام نے بھوک کی شدت دور کرنے کے لیے اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر باندھ رکھا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ سے شکوۂ درد کیا تو آپ ﷺ نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا ہٹایا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، حضرت جابر بن عبداللہؓ بیتاب ہو گئے، اور گھر آ کر کھانے کا انتظام کیا۔ ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور اہلیہ محترمہ نے جو پیس کر روٹی کا انتظام کیا۔ حضرت جابرؓ نے دو چار آدمیوں کے لیے کھانا تیار کرایا تھا اس لیے چپکے سے رسولِ اکرم ﷺ کے کان میں آ کر گھر چلنے کی درخواست کی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے کھانے کی مقدار معلوم کرنے کے بعد حضرت جابر کو ہدایت دی کہ گھر جا کر اپنی اہلیہ کو بتائیں کہ چولھے سے پتیلی نہ اتاریں اور آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل روٹی بھی نہ پکائیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے تمام رفقاء کرام کو ساتھ لیا اور حضرت جابرؓ کے گھر پہونچے۔ پتیلی میں لعابِ دہن سے برکت کا انتظام فرمایا اور لگ بھگ ایک ہزار لوگوں نے باری باری سے کھانا کھایا اور پھر بھی بچ گیا۔ وہ پسماندہ گھر والوں اور دوسرے بھوکوں نے کھایا۔ حضرت جابرؓ نے ہدایت نبوی پر دوسرے حضرات وخواتین کو کھانے کا تحفہ بھیجا تھا۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق نیز مباحث گذشتہ)

آمد پر ضیافت

باقاعدہ دعوت دے کر کھانا کھلانے کے علاوہ صحابہ کرام کی خدمتِ نبوی کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ جب بھی ان کے ہاں کسی کام سے تشریف لے جاتے تو صاحبِ خانہ آپ ﷺ کی ضیافت ضرور کرتے کہ وہ اکرامِ مہمان کے علاوہ سعادتِ دارین لوٹنے کا ایک آسان ذریعہ بھی تھا۔ وہ ایسے نادر موقع کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے۔ اس کے علاوہ عرب ضیافت اور روایت مہمان نوازی بھی اسی خاطر مدارات کا تقاضا کرتی تھی۔ ایسے واقعاتِ محبت اور دعوتِ طعام تو بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر بہت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے تا کہ دعوتوں کا یہ نظامِ نبوی اور خاطر مدارات کا یہ طریقِ صحابہ بھی اجاگر ہو جائے۔

-حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے اوپر ایک یہودی کا قرض تھا اور وہ مصر تھا کہ اسی فصل پر اس کا قرض اتارا جائے۔ آپ ﷺ فیصلہ کے لیے کھجور کے باغ میں موقعہ پر تشریف لے گئے۔ اس کا قرض اتروایا۔ حضرت جابرؓ نے بعد میں کھجوروں سے ہی آپ ﷺ کی مدارات کی۔ حضرت جابرؓ نے متعدد بار آپ ﷺ کی مدارات کی، ایک بار روٹی اور گوشت کھلایا تھا۔ وہ مدینہ کے مخیّر وفیاض لوگوں میں تھے اور رسول اکرم ﷺ کے جاں نثار۔

(بخاری، کتاب الاطعمہ، حدیث:۵۴۴۳؛ فتح الباری، ۹/ ۷۰۰-۷۰۴)

-حضرت انس بن مالکؓ کی دادی حضرت مُلیکہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے کھانا کھلایا۔ (موطا، کتاب الجامع، مسلم، ابن ماجہ اور ابوداؤد کے حوالے حضرت ام سلیمؓ کے تحت ملاحظہ ہوں)

-حضرت عتبان بن مالک انصاریؓ نابینا ہو گئے تھے۔ رسول اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ ان کے گھر تشریف لاکر ایک جگہ نماز پڑھا دیں تو وہ اسے مصلّٰی بنالیں۔ آپ ﷺ تشریف لے گئے تو انھوں نے خاطر مدارات کی، کھانا کھلایا اور آپ ﷺ نے ان کے گھر میں ایک خاص جگہ ان کے گھر والوں کو نماز پڑھائی۔

(مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب الرخصۃ فی التخلف عن الجماعۃ بعذر؛ بخاری، حدیث:۵۴۰۱: "وحبسناہ علی خزیرۃ صنعناہ.."؛ فتح الباری، ۹/ ۶۷۲-۶۷۳؛ نیز ابن ماجہ، کتاب المساجد والجماعات، باب المساجد فی الدور وغیرہ)

-حضرت ام سلیمؓ والدۂ حضرت انسؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو وہ کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ ایک بار تشریف فرما ہوئے اور خاتون خانہ نے گھی اور کھجوریں پیش کیں تو ان کو ان کی جگہ رکھنے کا حکم دیا اور تناول نہیں فرمایا کہ اس دن روزہ سے تھے۔ وہ مسلسل دعوتیں کرتی تھیں۔

(بخاری، کتاب الصوم، باب من زار قوما فلم یفطر عندھم؛ نیز دوسرے ابواب بخاری؛ موطا کتاب الجامع، جامع مسجد الضحیٰ وغیرہ؛ مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب جواز الجماعۃ فی النافلۃ؛ ابوداؤد، کتاب الطہارۃ؛ باب اذا کانوا ثلاثۃ کیف یقومون؛ معیشت نبوی-۲۰)

-حضرت ام حرام بنت ملحان انصاریؓ حضرت ام سلیم کی بہن اور حضرت انس بن مالکؓ کی حقیقی خالہ تھیں۔ وہ قباء میں رہتی تھیں۔ رسول اکرم ﷺ ہر ہفتے کے دن قبا تشریف لے جاتے اور ان کے گھر قیام فرماتے اور وہ خدمت کرتیں اور کھانا کھلاتیں۔

(بخاری، کتاب الجهاد، باب الدعاء بالجهاد اور مختلف ابواب؛ وحی حدیث: ۱۰۱-۱۱۰؛ مسلم، کتاب الامارة، باب فضل الغزو فی البحر؛ موطا، کتاب الجهاد، باب الترغیب فی الجهاد)

-حضرت ام عمارہؓ ایک اور انصاری خاتون تھیں جن کے گھر آپ ﷺ پابندی سے جاتے تھے اور وہ آپ ﷺ کو کھانا کھلاتی تھیں۔

(اسد الغابۃ، ابن سعد، ترجمہ صحابیہ؛ ترمذی، ابواب الصوم، باب فی فضل الصائم اذا اکل عنده)

-مشہور صحابی حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ کے گھر آپ ﷺ حضرات شیخین کے ساتھ تشریف لے گئے تو انھوں نے ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت پکوایا اور اپنے مہمانوں کی دعوت کی۔ موطا کی روایت میں ہے کہ کھانے میں جَو کی روٹی بھی شامل تھی۔ بعد میں کھجوریں بھی پیش کی گئی تھیں۔

(مسلم، کتاب الاشربة، جواز استتباعه الخ؛ ترمذی، ابواب الزهد، باب فی معیشة اصحاب النبی ﷺ؛ موطا، کتاب الجامع، جامع ماجاء فی الطعام والشراب۔ یہ واقعہ بالکل ابتدائی دور کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آپ ﷺ اور شیخین کے بھوک سے بیتاب ہو کر کھانے کی تلاش میں نکلنے کا ذکر ہے: معیشت نبوی-۱)

-حضرت عبداللہ بن بسرؓ کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے کھانے اور کھجور وغیرہ سے آپ ﷺ کی مدارات کی۔

(مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب وضع النویٰ خارج التمر الخ؛ ابن ماجہ، کتاب الاطعمة، باب التمر بالزبد: اس آخری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجوروں کی گٹھلی نکال کر اس کی جگہ شگاف میں مکھن بھر دیتے تھے اور یہ بہت پسندیدہ کھاجا سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی یہ رواج پایا جاتا ہے)

-حضرت مغیرہؓ نے ایک دعوت میں بکری کے پہلو (جنب) کا گوشت بھون کر پیش کیا۔

(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب فی ترک الوضوء مما مست النار)

-شیخِ خزرج اور حاتمِ مدینہ حضرت سعد بن عبادہؓ آپ ﷺ کی مستقل دعوت بھی کرتے تھے، ہدایا بھی بھیجتے تھے اور جب بھی آپ ﷺ ان کے گھر جاتے تھے تو وہ آپ ﷺ کو عمدہ کھانے کھلاتے تھے کہ وہ صاحبِ دل بھی تھے اور صاحبِ مال بھی۔ خدمتِ نبوی میں وہ غالباً سب سے آگے تھے۔

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان :ان کی دعوتوں کے علاوہ زیارات نبوی پر کھانا کھلانے کے کئی واقعات ہیں)

-حضرت ام ہانی بنت ابو طالب ہاشمیؓ کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے روٹی سرکہ کے ساتھ کھلائی۔ یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔

(ترمذی، کتاب الاطعمۃ، باب فی الخل :سرکہ روٹی کھانے کی متعدد احادیث ملتی ہیں اوران میں سے کئی کا تعلق دعوتوں سے ہے)

-حضرت ام المنذرؓ کے گھر حضرت علیؓ کے ساتھ تشریف لے گئے تو انھوں نے بھی کھانے سے ضیافت کی۔ وہ سوکھی کھجوروں (دوال) پر مشتمل تھا۔

(ترمذی، کتاب الاطعمۃ، ابواب الطب، باب فی الحمیۃ؛ نیز ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الحمیۃ)

- حضرت بُسر سُلمی کے دو بیٹوں کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے مکھن اور کھجور (تمر و زبد) کھلائے۔ (ابن ماجہ)

- بنو سلمہ کے ایک شخص نے آپ ﷺ کی آمد پر اونٹ (جزور) ذبح کر کے گوشت پکایا اور خاطر مدارات کی۔ (مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب استحباب التبکیر بالعصر)

-حضرت ابو الہیثم بن التیہانؓ کی ایک اور دعوت کا ذکر ان کے پیش کردہ مشروبات اور ٹھنڈے پانی وغیرہ کے حوالے سے ہے۔ اس کا حصۂ طعام یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ آپ ﷺ تشریف لائے تو حضرت ابو الہیثم نے تازہ کھجوروں میں عجوہ، ابن طاب اور امہات جراذین نامی کھجوریں پیش کیں۔ پھر اس کے بعد ثرید سے بھرا ایک پیالہ پیش کیا جس کے اوپر ہڈی کا گوشت تھا۔ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ہی ہم نے کھایا: .. بجفنۃ مملوءۃ ثریدا علیھا العراق..'' (بلاذری، ۱/۵۳۵)

-رسولِ اکرم ﷺ کی خواہش سن کر ایک انصاری صحابی نے آپ کو روٹی (خبز) کی دعوت دی جو قبول فرمائی گئی (ابن ماجہ)۔ راستے سے گذرتے ہوئے ایک صحابی کو دیکھا کہ کھانا پکا رہے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ ہانڈی پک گئی۔ صحابی نے اثبات میں جواب دیا اور آپ ﷺ نے اس میں سے ایک ٹکڑا نکال کر تناول فرمایا اور مسجد تشریف لے گئے۔

(ابوداؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی ترک الوضوء مما مست النار وغیرہ)

- ایک جنازے میں شرکت کے بعد واپس تشریف لا رہے تھے کہ ایک خاتون نے دعوتِ طعام دی جو آپ ﷺ نے قبول فرمالی۔ اس دعوت میں بکری کا گوشت شامل تھا اور آپ ﷺ کے بعض اصحاب بھی شریکِ دعوت تھے۔ اس کا واقعہ بہت دلچسپ ہے اور کسی قدر تفصیل کا طالب۔ (ابوداؤد، کتاب البیوع، باب في اجتناب الشبهات)

- ایک بار ایک گھر میں آپ ﷺ کی زیارت کے دوران شانہ کا گوشت (کتف) پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے اسے برغبت کھایا۔

(بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ وفضلها، باب اذا دعی الامام الی الصلاۃ؛ موطا، ۱/ ۴۸؛ مسلم، کتاب الحیض، باب نسخ الوضوء مما مست النار وغیرہ متعدد احادیث نبوی)

- اسی طرح ایک بار آپ ﷺ کو ذراع (دست) کا گوشت پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے اسے پسند فرمایا، تناول کیا اور وضو تازہ نہیں کیا۔

(بخاری، کتاب التفسیر، باب سورۃ بنی اسرائیل وغیرہ)

- ایک اور انصاری خاتون کے گھر زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو انھوں نے بکری ذبح کر کے اس کے گوشت سے ضیافت کی اور بعد میں کھجوروں سے منہ میٹھا کرایا۔

(ترمذی، ابواب الطهارۃ، باب فی ترک الوضوء مما غیرت النار؛ مزید زیارات نبی اور ان کے دوران ضیافت صحابہ کے لیے ملاحظہ ہو: ''رسول اکرم ﷺ اور خواتین''؛ رسولِ اکرم ﷺ خواتین کے گھر میں اور مدنی خواتین کے گھروں میں'' ۱-۳۰)

صحابہ کرام کی باہمی دعوتیں

عرب جاہلی تمدن اور اسلامی نبوی ثقافت دونوں کی ایک حسین سماجی روایت یہ تھی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو کھلاتے رہتے تھے۔ دوستوں، عزیزوں اور احباب اور مہمانوں کی آمد پر ان کو کھلاتے پلاتے تھے اور خاصا اہتمام کرتے تھے۔ ان کی خاص طور پر کبھی کبھی دعوتیں کیا کرتے تھے اور ان کا اہتمام اور زیادہ ہوتا تھا۔ ان تمام باہمی دعوتوں میں طرح طرح کے کھانے، سامان نقل اور مشروبات پیش کیے جاتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی دعوتوں کے ضمن میں آپ ﷺ کے رفقاء کرام کی مہمان داری کا ذکر آ چکا ہے اور مہمان خانہ ایوبی میں رسول اکرم ﷺ

کے ساتھ ہر شام کھانے پر پانچ سے دس صحابہ کرام کے جمع ہونے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان تمام دعوتوں یا کھانوں میں اصلاً مہمان رسول اکرم ﷺ ہوتے تھے اور رفقاء کرام آپ ﷺ کے طفیلی۔ ان کے علاوہ متعدد دوسری دعوتوں کا ذکر ملتا ہے جن میں اصل مہمان صحابہ کرام میں سے ہی کوئی فرد یا کوئی جماعت ہوتی تھی:

-حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوالدرداء انصاری رضی اللہ عنہما دونوں ایک دوسرے کے دینی مواخاۃ کے بھائی تھے اور ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ دونوں کا باہمی زیارتوں کا سلسلہ بھی تھا۔ حضرت ابوالدرداءؓ کے دینی تقشف کی خبر پا کر حضرت سلمان فارسیؓ ان کو سمجھانے ان کے گھر تشریف لے گئے مگر میزبان مکرم اس وقت موجود نہ تھے۔ خاتون خانہ نے حضرت سلمانؓ کی ضیافت کی اور رات میں حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے آنے کے بعد ان کو دن کا کھانا کھلایا: "... فجاء ابو الدرداء فصنع له طعاما.."

(بخاری، کتاب الادب، باب صنع الطعام والتکلف للضیف؛ فتح الباری، ۱۰/۶۵۶: بخاری کا ترجمۃ الباب معنی خیز ہے جس میں اور شرح حافظ میں بھی یہ ادب اسلامی بیان کیا گیا ہے کہ مہمان کے لیے تکلف واہتمام بھی کرنا چاہیے حالانکہ تکلف کی ممانعت بھی ہے؛ بخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علیٰ اخیه الخ؛ فتح الباری، ۴/۲۶۶-۲۷۱ میں حدیث: ۱۹۶۸ کی زیادہ شرح و تفصیل ہے۔ ایسی دوسری زیارتوں کی دعوتوں کا ذکر نبوی دعوتوں کے ضمن میں بھی ملتا ہے اور صحابہ کرام کی زیارات صحابہ وصحابیات کے حوالے سے بھی)

-حضرت سلمان فارسیؓ کا ایک اور واقعۂ دعوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بھائیوں/دوستوں کے لیے کھانا تیار کیا۔ اسی دوران ایک سائل آ گیا تو کسی مہمان نے اسے ایک چپاتی (رغیف) دینی چاہی تو حضرت سلمانؓ نے اسے ہدایت کی کہ روٹی رکھ دو تمھیں صرف کھانے کے لیے بلایا گیا ہے۔ حضرت شعبہؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلمان ہانڈی ڈھانک کر رکھا کرتے تھے۔

(بلاذری، ۱/۴۸۸: "صنع سلمان طعاما لاخوانه، فجاء سائل فاراد بعضهم ان يناوله رغيفا" مہمان کو سائل کو روٹی دینے سے اس لیے منع کیا تھا کہ وہ حق میزبان کا تھا)

-حضرت عمرہ بنت رواحہؓ نے اپنی بیٹی کے ہاتھ اپنے شوہر حضرت بشیر بن سعد اور بھائی عبداللہؓ بن رواحہ کے لیے ایک کپڑے میں تھوڑی سی کھجوریں بطور غداء بھیجیں۔ راستے میں رسول اکرم ﷺ سے اس لڑکی کی ملاقات ہوگئی تو اس نے وہ کھجوریں آپ ﷺ کے دست مبارک میں

دے دیں۔ آپ ﷺ کی برکت و معجزہ سے وہ اتنی ہو گئیں کہ کپڑے کے کناروں سے گرنے لگیں اور سب نے ان سے اپنا پیٹ بھرا اور پھر بھی وہ بچ رہیں۔ (ابن ہشام ۲/ ۲۱۸)

-مہمانوں، زائروں اور دوسرے لوگوں کی آمد پر رسولِ اکرم ﷺ ان کو متعدد صحابہ کرام پر تقسیم فرما دیتے تھے تاکہ کسی ایک دو شخص پر بوجھ نہ پڑے اور مہمانوں کی ضیافت و تواضع بھی شاندار طریقے سے ہو جائے۔ ان میں سے متعدد دعوتوں کا ذکر اوپر مختلف حوالوں سے آچکا ہے اور وہ باہمی دعوتوں ہی کا ایک باب ہے۔

-اسی طرح اصحابِ صفہ کی وقتاً فوقتاً صحابہ کرام کے ہاں دعوت یا کھانا پلانا ہوتا تھا۔ کبھی رسولِ اکرم ﷺ کے حکم و فرمائش پر اور کبھی صحابہ کرام کی اپنی اسلامی اخوت، انسانی ہمدردی اور فیاضانہ فطرت کے تقاضوں کے سبب۔ ان میں سے بھی کئی کا ذکر آچکا ہے۔ بعض روایات کا اس خاص فصل میں مزید ذکر کیا گیا ہے۔

-صحابہ کرام ایک دوسرے کی زیارتوں کے لیے برابر جایا کرتے تھے۔ یہ ایک سماجی رواج اور تمدنی ریت تھی جس کو اسلامی شریعت اور قرآن و حدیث کی تائید بھی حاصل ہے۔ ان تمام زیارات کے دوران صحابہ کرام اپنے زائروں کو کھلاتے تھے جیسے حضرت ابو موسیٰؓ نے مرغی کے غذاء میں اپنے زائر کو شریک کیا تھا یا حضرت ابن عمرؓ اپنے کھانے میں مہمانوں کو شریک کرتے تھے۔

بہرحال ان تمام روایات و واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ جاہلی اور دورِ نبوی اسلامی دونوں میں صحابہ کرام اور دوسرے عرب بھی اپنے اقربا و احباب کی وقتاً فوقتاً دعوتیں کیا کرتے تھے۔ ان میں ہر طرح کی دعوتیں شامل تھیں: زیارات پر کھانا پلانا، خاص طور سے دعوت پر بلانا، حکم و فرمانِ نبوی پر دعوت کرنا، خاص تقریبات پر دعوت کرنا اور ہدایائے طعام بھیجنا۔

اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے فرزند حضرت ابو بردہؓ کو اپنے گھر بلا کر کھجور اور ستو سے شاد کام کیا تھا۔

-حضرت علیؓ نے ایک شخص کی دعوت کی اور ان کے لیے کھانا پکایا اور حضرت فاطمہؓ کے مشورے پر رسولِ اکرم ﷺ کو بھی بلایا تھا۔ (حدیث ابوداؤد: ۳۷۵۵)

-رسولِ اکرم ﷺ کے جسمانی آثارِ متبرکہ اور دوسرے متروکہ آثارِ بابرکات میں سے کئی

تبرکات بعض صحابہ کرام کے پاس تھے۔ان میں سے ایک حضرت انس بن مالکؓ خادم خاص کے پاس پیالہ تھا جس میں وہ دوسرے صحابہ کو عہد نبوی میں اور بعد کے دور میں بھی مشروبات پلایا/کھانے کھلایا کرتے تھے۔اسی طرح حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا بھی ایک تبرک نبوی کے سلسلہ میں صحابہ وتابعین کو مدعو کر کے کھلانے پلانے کا طریقہ و معمول رہا تھا۔

(مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہوں دو مقالاتِ خاکسار: جسمانی آثار نبوی سے تبرک صحابہ/متروکہ آثار نبوی سے عقیدت وتبرک صحابہ'' ؛ مآخذ میں بخاری ومسلم کے ابواب وکتب مذکورہ بالا)

بعض صحابیات طاہرات کے گھروں میں صحابہ کرام کی آمد ورفت رہتی تھی اور وہ ان کی خاطر مدارات کرتی تھیں۔ان میں شامل تھیں:

۱۔ حضرت ام شریک عامریہ قریشیہ۔

(اسد الغابہ، ۵/۵۹۴-۵۹۵؛ مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقة ثلاثا؛ رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین، ۱۶۴)

۲۔ حضرت ام ایمن برکہ حبشیہ رسولِ اکرم ﷺ کی انا کے ہاں رسول اکرم ﷺ کے علاوہ خلفاء ثلاثہ اور دوسرے صحابہ زیارات کو جاتے تھے تو وہ ان کی مدارات کرتی تھیں۔

۳۔ حضرت شہیدہؓ کے گھر میں اسی طرح صحابہ کرام کی آمدِ زیارت رہا کرتی تھی کہ اسے سنت نبوی کی پیروی سمجھا جاتا تھا

(رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین، ۱۷۰؛ نیز دوسرے حوالے جیسے اسد الغابہ، ۵/۵۲۶: حضرت شہیدہ کا نام/کنیت ام ورقہ تھی۔اسد الغابہ کی کتاب النساء میں مذکور صحابیات کے گھروں میں صحابہ کرام کے جانے، زیارت کرنے اور کھانے پینے کے بہت واقعات ملتے ہیں)

۴۔ حضرت ابوہریرہ دوسیؓ اکثر وبیشتر حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کے مہمان بنا کرتے تھے اور وہ انہیں کھلاتے پلاتے تھے۔اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ کسی صحابی سے کسی آیت کریمہ کا معنی ومطلب پوچھتے تھے کہ وہ ان کو اپنے گھر لے جا کر کچھ کھلائیں پلائیں گے۔حضرات ابوبکر وعمرؓ نے ایسے ہی کسی پیمبری وقت میں ان کی آرزو پوری نہ کی تھی۔

(بخاری، باب مناقب جعفر بن ابی طالب؛ بخاری، کتاب الرقاق، کیف کان عیش النبی ﷺ واصحابه الخ)

صحابہ کرام کے کھانے

عہدِ نبوی کے دونوں ادوار- مکی اور مدنی - میں رسول اکرم ﷺ کے کھانے اپنی نوعیت اور معیار کے لحاظ سے گوناگوں تھے۔ مکی دور میں یا مکی اور قریشی صحابہ کرام اور دوسرے باشندگانِ حرم کا کھانا نوعیت کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتا تھا۔ وہ بالعموم گوشت اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ روٹی جو کی بھی ہوتی تھی اور گیہوں کی بھی اور اسی طرح گوشت اونٹ، بھیڑ، بکری اور گائے سے بھی حاصل کیا جاتا تھا۔ ان کے تمام اناج پر مشتمل کھانے خالص برآمدی اشیاء پر مشتمل ہوتے تھے کہ مکہ وادی غیر ذی زرع (بے پیداواری آراضی) تھی اور وہاں گیہوں یمامہ سے آتا تھا اور جو وغیرہ دوسرے علاقوں سے۔ مکی تاجرانِ غلہ اس جنسِ تجارت میں طاق تھے اور خصوصی شغف رکھتے تھے کیونکہ تجارتِ طعام سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار تھا۔ وہ شام و یمن اور دوسرے اسواقِ عرب (بازار ہائے عرب) سے اجناس فراہم کرتے تھے۔ ان کے علاوہ شامی، یمنی اور دوسرے کاروانی تجارِ آفاقی بھی ان اجناس کو مکہ لاتے تھے اور خوب نفع کماتے تھے۔ طائف سے البتہ بعض پھل پھلاری اور سبزی وغیرہ آجایا کرتی تھیں کہ قریبی شہرِ زراعت بھی تھا اور قریشی اکابر کے اپنے باغات وغیرہ بھی وہاں بکثرت تھے۔

مدنی دور میں اور اس علاقے کے صحابہ کرام ایک زرعی علاقے کے باسی تھے جہاں بکثرت جو، سبزی اور دوسرے اناج پیدا ہوتے تھے مگر گیہوں وہاں کی زرعی پیداوار نہیں تھا جس طرح بعض دوسری اجناس، پھل اور سبزیاں وغیرہ وہاں بالعموم نہیں اگائے جاتے تھے۔ ان اشیاءِ نایاب کی فراہمی بالعموم تاجروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ مسلم تجارِ غلہ اور کاروانیانِ اناج بھی مختلف بازاروں سے مختلف اناج لاتے تھے۔ حضرت ثمامہ بن اثال حنفیؓ اور ان کے علاقہ یمامہ کے کاروانی مکہ مکرمہ کے ساتھ مدینہ منورہ کو بھی گیہوں فراہم کرتے تھے اور بعض دوسرے اناج بھی لیکن وہاں زیادہ تر اناج اور خاص کر گیہوں، گیہوں کے عمدہ آٹے (درمک) وغیرہ کی فراہمی شام کے خاص تاجرانِ غلہ (ضافطہ، الانباط) کیا کرتے تھے۔ ان غلہ تاجروں سے سامانِ زیست کی خریداری کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ ان میں گیہوں کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔

گوشت کے لیے مختلف قسم کے مویشی مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ منورہ میں بھی بکثرت دستیاب تھے اوران کی فراہمی بھی برآمد کے ذریعہ کی جاتی تھی۔

کھانوں کی دو بنیادی تقسیمیں

معیار کے لحاظ سے کھانے دو طرح یا قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں: ایک آسودہ حال طبقہ کا کھانا تھا، دوسرا عوامی کھانا۔ مکہ مکرمہ میں بالعموم معمولی کھانا جیسے روٹی، تیل وغیرہ عوامی کھانا تھا اور گوشت ان کو کبھی کبھار ہی دستیاب ہوتا تھا۔ دودھ ان کی بھرپور غذا تھی۔ مدنی علاقوں میں عام کھانا تو کھجور اور جَو پر مشتمل ہوتا تھا۔ کھجوریں کھا کر پانی پی لینا ایک دو وقت نہیں مدتوں کفایت کرتا تھا۔ جَو کی روٹی اور ستو وغیرہ البتہ ان کو بخوبی دستیاب تھے۔ روایات میں صاف آتا ہے کہ عام اور معمول کا کھانا صرف کھجور اور جو ہی پر مشتمل ہوتا تھا البتہ پنیر بھی اس میں شامل کرلیا جاتا تھا مگر وہ معمولی کا طعام نہ تھا۔ یہ مدنی صحابہ کرام کا بیان ضرور ہے مگر وہ نوعیت طعام کے لحاظ سے محدود ہے۔ البتہ امراء، آسودہ حال اور دوسرے صاحبانِ استطاعت گیہوں کی روٹی اور گوشت بھی تناول کرتے تھے اور جو کی روٹی اور دوسرے سالن بھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ تجزیہ یہ ملتا ہے کہ صاحبانِ استطاعت جب کبھی گیہوں کے عمدہ آٹے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے تو وہ اسے اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے اور ان کے اہل وعیال بھی جو کی روٹی اور کھجوروں ہی پر گذر کرتے تھے، یہ سماجی رویہ ہمیشہ رہا ہے۔

(ترمذی، تفسیر القرآن، سورۃ النساء: وكان الرجل اذا كان له يسار... ابتاع الرجل منها (من الدرمک) فخص بها نفسه واما العيال فانما طعامهم التمر والشعير..)

دودھ البتہ سب کا من بھاتا کھاجا تھا اور غریب وامیر سب ہی اسے بطور غذا استعمال کرتے تھے کہ دودھاری مویشیوں کی کمی نہ تھی۔ ہر گھر میں اونٹ/اونٹنی اور بھیڑ بکری ضرور ہی رہتی تھی۔ امراء اور آسودہ حال لوگوں کے پاس بڑے بڑے ریوڑ رہتے تھے اور اس کے علاوہ ان کے پاس نقد رقوم اور سونے چاندی کے سکے بھی بافراط ہوتے تھے جن سے وہ اشیائے خوردنی خرید کرسکتے تھے اور کرتے تھے۔

(خریداری کے واقعات اور اجناس کی فراہمی کے لیے ملاحظہ ہو: عہدِ نبوی کی تجارت؛ معیشت نبوی۔ مکہ ومدینہ میں اور اس کتاب کے اولین ابواب؛ طعامِ مدینہ کے بارے میں احادیث حضرت ابوسعید خدریؓ وغیرہ)

گوشت کی فراہمی کے سلسلہ میں شکار کا ایک طریقہ ہی نہیں بلکہ پیشہ اور کاروبارِ زیست بھی تھا۔ بہت سے اکابر کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامی لوگ بھی شکار کر کے گوشت حاصل کیا کرتے تھے۔ صحرا اور ریگستان میں بھی بہت شکار بھرا پڑا رہتا تھا۔ حضرت حمزہؓ کے بارے میں روایات کا اتفاق ہے کہ وہ مکہ مکرمہ کے بڑے شکاریوں میں سے تھے اور خاصا شکار اپنے ہر اقدام پر لایا کرتے تھے۔ مدنی دور کے مدنی صحابہ اور دوسرے علاقوں اور بدوی قبائل کے صحابہ کے بارے میں وضاحت سے یہ بیان ملتا ہے کہ وہ شکار کرتے تھے اور شکار کا گوشت لایا کرتے تھے۔ بہت سی روایات و احادیث میں شکار کے ذریعہ گوشت کی فراہمی اور بطور غذا استعمال کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے۔

(حضرت حمزہؓ کے شکار کے بارے میں ان کا واقعۂ اسلام ملاحظہ ہو نیز ابن سعد، اصابہ، اسد الغابہ اور کتب سیرت میں ان کا خاکہ؛ عام شکار کی عرب روایات کے لیے ملاحظہ ہوں: بخاری، مسلم وغیرہ کے کتب الصید و الذبائح وغیرہ)

صحابہ کرام کے کھانوں کی اقسام

اگرچہ رسولِ اکرم ﷺ کے حوالے سے بہت سے صحابہ کرام اور صحابیاتِ طاہرات کے مختلف کھانوں کا ذکر آ چکا ہے مگر خاص ان کے گھروں کے حوالے سے ان کے اپنے معمول کے یا غیر معمولی کھانوں کا ذکر ذرا کم آیا ہے اور وہ بھی دوسرے نکتوں کے ضمن میں، اس لیے ان کے کھانوں کا بہت واضح تصور نہیں بنتا ہے۔ صرف اس پہلوئے خاص کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف صحابہ و صحابیات کے خاص کھانوں کا ذکر روایات و احادیث کی مدد سے ذیل میں کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے کھانوں کی تفصیل، ان کا تنوع، نوعیت، معیار اور اصناف بھی واضح ہو جائیں۔ ان کا ذکر مختلف عناوین کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اوپر جن کھانوں میں ان کی شرکت کا ذکر آ چکا ہے ان کا بس حوالہ ہی دیا جا رہا ہے۔

گوشت روٹی

بلاشبہ تمام مہاجرین و انصار میں سے بیشتر آسودہ حال لوگوں کا کھانا تھا اور کمتر آمدنی

والے حضرات وخواتین بھی کھا ہی لیتے تھے۔ مہاجرین میں حضرات ابوبکر وعمر وعثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ وزبیر اور متعدد دوسرے مالدار اور تجارت پیشہ افراد بالعموم گوشت روٹی اور دوسرے عمدہ کھانے کھاتے تھے۔ ان بزرگوں کے بعد کے ادوار کے کھانوں کا ایک پورا سلسلہ ملتا ہے جو ان کے بہترین کھانوں کا تذکرہ کرتا ہے اور عہدِ نبوی میں بھی یہی حال تھا۔ انصارِ کرام میں مالدار صحابہ میں حضرات اسعد بن زرارہ، ابوایوب خالد بن زید، سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ، ابوطلحہ، جابر بن عبداللہ، اسید بن حضیر وغیرہ اور صحابیاتِ طاہرات میں حضرت ام حرام اور ان کی حقیقی بہن حضرت ام سلیم بنت ملحان کے علاوہ حضرت ام عمارہؓ اور دوسری خواتین کے کھانوں کا ذکر آ چکا ہے۔

(صحابہ کرام کی دعوتوں اور ہدایائے طعام کی دونوں فصول ملاحظہ ہوں نیز اگلے مباحث بھی)

گوشت کے سلسلہ میں سب سے اہم نام اونٹ کا آتا ہے اور پھر بھیڑ بکری کا، کبھی کبھی گائے اور حمارِ وحشی وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ صحابہ کرام کے گوشت روٹی/لحمیات پر مشتمل کھانوں میں گھریلو/ پالتو مویشیوں کے علاوہ وحشی جانوروں کا شکاری گوشت بھی شامل ہوتا تھا۔ ان میں خرگوش (ارنب)، گوہ/ سانڈے (ضب)، حمارِ وحشی اور دوسرے گدھوں کا ذکر شامل ہے۔ بعض روایات سے گھوڑے کے گوشت کا استعمال بھی ثابت ہوتا ہے جیسے حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کی حدیث ہے کہ عہد نبوی میں ہم نے ایک گھوڑے کو قربان/ ذبح کر کے اس کو کھایا: "نحرنا علی عهد النبی ﷺ فرسا فأكلناه" (حدیث: ۵۵۱۰، اطراف حدیث: ۵۵۱۱، ۵۵۱۲، ۵۵۱۹؛ فتح الباری، ۹/۹۲-۷۹۴)۔ اسی کے ساتھ دجاجہ (مرغی) اور بعض پرندوں کے گوشت کھانے کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ وہ رسول اکرم ﷺ کے کھانے میں بھی شامل رہا تھا۔

(فتح الباری، ۹/۹۴-۸۱۰: مختلف احادیث بالخصوص ۵۵۱۷: "رأیت النبی ﷺ یاکل دجاجاً" گھریلو گدھوں کا گوشت البتہ ممنوع ہو گیا تھا)

دوسرے کھانے

ثرید، گھی (سمن)، سرکہ (خل)، مکھن (زبد/ ودک)، دودھ دہی (لبن) اور سبزیوں میں لوکی (دباء)، ککڑی (قثاء) اور دوسری زرعی پیداواروں میں لہسن (ثوم)، پیاز (بصل) اور بعض

دالوں کے کھانوں کا بھی صحابہ کرام میں چلن تھا۔ مدینہ منورہ میں کھجور اور پانی اور کھجور کے ساتھ بعض دوسری چیزیں جیسے ککڑی وغیرہ یا روٹی سے کھجور کھانے کا طریقہ صحابہ میں رائج تھا۔ حضرات اسعد بن زرارہ، سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، ابوایوب اور عمارہ بن حزم وغیرہ رضی اللہ عنہم متعدد صحابہ کرام کے گھروں سے جو کھانا رسول اکرم ﷺ کے لیے بطور ہدیہ آتا تھا یا رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری پر وہ جو کھانا پیش خدمت کرتے تھے ان سب میں ان اشیاءِ خوردنی کی شمولیت ملتی ہے۔ یہی حال جو کی روٹی اور گیہوں کی روٹی کا ہے۔ دراصل رسولِ اکرم ﷺ کے کھانے پورے عہد نبوی کے کھانوں کی بڑی نمائندہ عکاسی کرتے ہیں۔ اس لیے مثالوں اور واقعات میں سے صرف چندئی روایات کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لیے کھانا تیار کیا اور بلاکر کھلایا: "صنع لنا طعاما فدعانا.."، متن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ ان کے بعض اصحاب بھی تھے جو دعوت میں مدعو تھے۔

(ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، من سورة النساء: اس میں جامِ شراب کی گردش کا ذکر اس کی تحریم کے حوالے سے ہے)

۲۔ رسولِ اکرم ﷺ اپنے چھ صحابہ کرام کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک ایک اعرابی وارد ہوا اور سارا کھانا صرف دو لقموں میں چٹ کر گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس نے بسم اللہ کہا ہوتا تو وہ سب کے لیے کافی ہوتا۔ (حدیث ابن ماجہ: ۳۲۶۴)

۳۔ حضرت ام عاصمؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم سب لوگ ایک پیالے سے کھا رہے تھے کہ مولائے نبوی حضرت نُبیشہؓ آئے اور فرمان نبوی سنایا کہ جو لوگ پیالہ صاف کر کے کھاتے ہیں، پیالہ/ برتن ان کے لیے استغفار کرتا ہے۔ (حدیثِ ابن ماجہ: ۳۲۷۱)

۴۔ حضرت عبداللہ بن حارث زبیدیؓ کا بیان ہے کہ ہم صحابہ عہد نبوی میں مسجد کے اندر روٹی گوشت کھاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کا فرمانا ہے کہ ہم چلتے ہوئے بھی کھا لیتے تھے اور کھڑے کھڑے پانی وغیرہ پی لیتے تھے۔ (حدیث ابن ماجہ: ۳۳۰۰-۳۳۰۱)

۵۔ متعدد دوسرے حوالوں سے صحابہ کرام کے کھانوں کا عمومی حوالہ آتا ہے یا خاص کھانوں کا

ذکر واضح طور سے روایات میں ملتا ہے مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو روزہ کے زمانے میں کھانا پیش کیا گیا اور ان کو حضرت مصعبؓ بن عمیر کی شہادت یاد آ گئی اور انھوں نے غم میں کھانا ترک کر دیا۔

(بخاری، باب غزوۃ احد، حضرت علیؓ نے نبوی ہدی کی قربانی کا گوشت وغیرہ صدقہ کر دیا تھا (حدیث مسلم: ۳۴۸ (۱۳۱۷)، حضرت معاویہؓ کو رسول اکرم ﷺ نے کتابت کے لیے حضرت ابن عباسؓ کے ذریعہ بلوایا تو وہ کھانا کھا رہے تھے (بلاذری، ۵۳۲/۱؛ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات، ۲۸)۔ حضرت رفاعہ بن زید انصاریؓ جیسے مدینہ منورہ کے مالدار ترین لوگوں کا کھانا ''درمک'' تھا جو نبطی تاجروں سے خرید کر کھاتے تھے اور ان کے اہل وعیال نانِ جویں پر گذارا کرتے تھے (حدیث ترمذی، تفسیر نساء)۔ تحریم خمر سے قبل حضرت سعد بن وقاص زہریؓ کو انصار و مہاجرین کے گروہ نے اونٹ کا بھنا ہوا سر (راس جزور مشوی) کھلایا تھا (حدیث: ۴۳ (۱۷۴۸)

اجتماعی کھانے

سورۂ نور-۶۱ کے مطابق اہل اسلام کو تنہا اور ساتھ دونوں طرح سے کھانے کی اجازت ہے۔ واضح رہے کہ یہ مباح ہے۔ بہتر اور سنت یہ ہے کہ سب لوگ مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا کریں۔ اس کی ایک ظاہری حکمت یہ ہے کہ تھوڑا کھانا زیادہ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حدیثِ شریف میں اسی کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ دو کا کھانا تین کے لیے اور تین کا کھانا چار کے لیے کفایت کرتا ہے۔ دو تین اور چار صرف اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بیان فرمایا گیا کہ تھوڑے کھانے میں کافی لوگ سیر ہو سکتے ہیں۔ اسی کو اندرونی حکمت کے لحاظ سے برکت کہا جاتا ہے۔ ایک حدیثِ نبوی سے بھی اس کی صراحت ہوتی ہے کہ تنہا تنہا کھانے سے سیرابی نہیں ہوتی اور ساتھ ساتھ کھانے سے سب شادکام ہو جاتے ہیں۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب طعام الواحد يكفي الاثنين؛ حدیث: ۵۳۹۲: طعام الاثنين كافي الثلاثة، وطعام الثلاثة كافي الاربعة؛ فتح الباری، ۶۶۲/۹-۶۶۴۔ اسی بحث میں حضرت شارحؒ نے رسول اکرم ﷺ کا ایک حکم برکت نقل کیا ہے: ''کلوا جمیعا ولا تفرقوا الخ''۔ اسی برکتِ اجتماع سے برکتِ طعام پیدا ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سنتِ مستقلہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ ساتھ ساتھ کھانا کھاتے تھے)

پھر بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اجتماعی کھانے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ ان میں اسفار، مہمیں، غزوات وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن دورانِ حضر بھی ان اجتماعی کھانوں کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام کے دوران ہر شام آپ ﷺ کے ساتھ پانچ سے دس صحابہ جمع ہو جاتے تھے (بلاذری، ۱/ ۳۱۷)۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سفر کے دوران دو چار اشخاص اپنے اپنے تھوڑے تھوڑے کھانے یا اشیاءِ خورد و نوش جمع کر لیں تو متعدد دوسروں کا بھلا ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ خود صاحبانِ طعام کو کھانوں کی گوناگونی سے مختلف ذائقے ملتے ہیں اور اجتماعیت کا ذائقہ اس پر مستزاد ہوتا ہے۔ عہدِ نبوی میں ایسے اجتماعی کھانوں کا ذکر بالعموم غزوات وسرایا اور دوسری بیرونی مہموں اور اسفار کے حوالے سے ملتا ہے۔ اور یہ تذکرہ اسلامی اخوت، ایمانی ایثار اور فطری انسانی اجتماعیت کے نادر و نایاب نمونوں کو سامنے لاتا ہے جو محبت کی جان ہیں۔

(فتح الباری کی مذکورہ بالا بحث کے علاوہ اجتماعی کھانوں کی متعدد احادیث وروایات جن کا ذکر آگے آتا ہے؛ نیز معیشت نبوی-۱، ۲۳-۲۵)

غزوات واسفار کے ساجھے کھانے: ۱۔ مخیّرین کی فراہمی طعام

غزوات کے دوران بعض اجتماعی کھانوں کا ذکر صحابہ کرام کی دعوتوں کے حوالے سے آچکا ہے۔ وہ صحابہ کرام کے گھروں کی دعوتیں تھیں اگرچہ وہ بھی اجتماعی کھانے تھے مگر اس خاص فصل میں ان کھانوں کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے جو گھروں سے دور عالمِ بے سروسامانی میں کھائے گئے۔ مہمات اور جنگوں کے زمانے میں سامانِ رسد کی فراہمی کا ایک خاص نظام ہوتا ہے لیکن قرونِ وسطیٰ میں وہ مخیّر اکابر قوم کی اجتماعی ذمہ داری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکابرِ قریش اپنی اپنی گرہ سے اور سخاوت وفیاضی سے اپنے لشکروں کو کھلاتے پلاتے تھے اور "المطعمون" کے لقب سے سرفراز ہوتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ اسلامی افواج کے سالارِ اعظم کی حیثیت سے خورونوشِ لشکر کا انتظام فرماتے تھے لیکن کبھی کبھی چندے کے کھانے بھی مزہ دے جاتے تھے۔

(قریشی المطعمون کا ذکر سیرت ابن ہشام وغیرہ میں خاص غزوۂ بدر کے حوالے سے ملتا ہے اور بغدادی کی کتاب المحبر وغیرہ میں معروف مطعمون کی فہرستیں ہیں)

خواتین/صحابیات کی خدماتِ طعام

غزواتِ نبوی کے دوران خواتینِ شہر کی خدمات اس ضمن میں بہت اہم تھیں۔ وہ

اسلامی فوج کی خورونوش کے شعبہ کی ذمہ دار تھیں۔ غزوۂ بدر کے دوران ان کی کارکردگی کا زیادہ حوالہ نہیں ملتا، مگر غزوۂ احد سے غزوۂ تبوک تک تمام غزوات واسفار حج وعمرہ میں ان کی شرکت کے پکے ثبوت ملتے ہیں۔ ان تمام خواتین نے کافی بڑی تعداد میں شرکت کی تھی خاص طور سے دور کے غزواتِ خیبر، فتح مکہ، حنین، اوطاس اور طائف وتبوک میں۔ ان کی شرکت کی اجازت میں جس خدمت کا ذکر آتا ہے وہ دو ہیں: کھانا پکانا اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا۔ حضرت ام عطیہ جیسی خواتین جہاد کے بارے میں صراحت سے ذکر آتا ہے کہ وہ مجاہدین کے لیے کھانا پکایا کرتی تھیں۔ حضرت ام عطیہؓ کے بارے میں مسلم کی ایک حدیث میں ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے سات غزوات میں کھانا مجاہدین کے لیے پکایا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک دو خواتین کے کھانا پکانے سے تو کام نہیں چل سکتا تھا لہٰذا یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ دوسری شریک غزوہ خواتین بھی یہ کار خدمت انجام دیتی تھیں اور یہ محض قیاس نہیں ہے کہ بلکہ روایات واحادیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

(بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب غزوة خيبر؛ الحديبية؛ مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب النساء الغازيات الخ ؛مذکورہ بالا حوالے وتراجم، مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: ''رسول اکرم ﷺ اور خواتین'' میں غزوات نبوی میں خواتین کی شرکت کی بحث)

نبوی فراہمیٔ طعام

اجتماعی کھانوں کی دوسری جہت یہ تھی کہ رسول اکرم ﷺ مویشیوں کو خرید فرماتے تھے اور ان کے گوشت سے مجاہدین کی تواضع فرماتے۔ مختلف غزوات کے حوالہ سے رسول اکرم ﷺ کی اس سنت اور اجتماعی کھانوں کی اس روایت کا پتہ چلتا ہے۔ بعض مثالیں درج ذیل ہیں:

- غزوۂ غابہ کے زمانے میں رسولِ اکرم ﷺ نے ایک گائے خریدی اور ذبح کی اور اس کے گوشت سے مسلم سپاہ کی بھوک مٹائی۔

(بخاری، كتاب الجهاد، باب الطعام عند القدوم ؛ نیز ابن اسحاق/ ابن ہشام اور واقدی وابن سعد وغیرہ کی کتب سیرت کے متعلقہ مباحث)

- صلح حدیبیہ کے اختتام پر آپ ﷺ نے ابوجہل مخزومی کے قیمتی اونٹ کو ذبح کر کے مسلم مجاہدین کی ضیافت کی۔ (ترمذی، ابواب الحج، باب فی ماجاء کم حج النبی ﷺ)

-غزوۂ خیبر کے دوران ایک موقعہ پر رسول اکرم ﷺ نے ایک مشرک بکروال سے ایک بکری خریدی تھی اور اس کے گوشت سے سب کی ضیافت کی۔

(بخاری، کتاب الھبة، باب قبول الھدیة من المشرکین اور دیگر ابواب؛ مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ)

-رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے بعض عمروں اور آخری حج کے دوران بھی مسلمانوں کو ہدی کی قربانی کے گوشت سے نوازا تھا۔ (کتب حدیث میں متعلقہ ابواب)

مدنی صحابہ کی فراہمی

اسی طرح بعض صحابہ کرام بالخصوص انصاری مخیّر حضرات نے متعدد غزوات وسرایا میں مسلم افواج کے کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا۔ ان میں مدینہ منورہ کے دو بزرگ نجّاری حضرات -سعد بن عبادہ خزرجی اور ان کے فرزند گرامی حضرت قیس- کے کئی واقعاتِ حسنات ومبرات کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے حضرت سعد بن عبادہؓ نے غزوہ بنی النضیر میں مسلمانوں کو کھجوریں پہونچائی تھیں اور ان کو اپنے گماشتوں سے مدینہ سے منگوایا تھا۔ ان کے فرزند حضرت قیس بن سعد خزرجیؓ نے غزوہ ذی قرد کے دوران دس اونٹ (جزائر) مدینہ کی کھجوروں کے بدلے میں ادھار خریدے اور ان کو ذبح کر کے مسلمانوں کی لذتِ کام ودہن بلکہ ان کی بھوک مٹانے کا انتظام کیا۔ ان دونوں صحابیوں کے علاوہ متعدد دوسرے صحابہ کرام کے عطایا کا ذکر ملتا ہے۔

(واقدی، ۵۴۷، ۵۷۷ وغیرہ؛ ابن سعد، اصابہ، اسد الغابہ وغیرہ میں مذکورہ بالا صحابہ کرام کے تراجم (خاکے)

ازواد کو جمع کرنے کی روایت

ان اجتماعی کھانوں کی ایک تیسری جہت- اور غالباً سب سے پیاری جہت- یہ تھی کہ صحابہ کرام اور شرکاءِ غزوات وسرایا اپنے اپنے معمولی کھانے یا کھانے کی اشیاء کو ایک جگہ جمع کر لیتے تھے اور اس سے "سانجھا کھانا" تیار ہوتا تھا جسے صحابہ کرام مختلف دسترخوانوں پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ مسلم مجاہدین کی ایک متواتر سنت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے دو چار دن کا

زادِراہ لے کر ضرور نکلتے تھے۔ بسا اوقات زیادہ دنوں کا آذوقہ ساتھ ہوتا تھا۔ اس میں گیہوں یا جَو کا آٹا، ستو، کھجور اور دوسری خشک چیزیں اکثر و بیشتر ہوتی تھیں کہ ان کا نقل و حمل نسبتاً آسان ہوتا تھا۔ سوکھا گوشت، خواہ بکری، بھیڑ، اونٹ وغیرہ کا ہو یا شکار کے جانوروں میں ہرن وغیرہ کا، ساتھ لے جانے کا رواج تھا جیسا کہ حضرت زبیر کے طریقہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی مہمات کے دوران شکار وغیرہ یا خرید کے ذریعہ گوشت وغیرہ کا بھی انتظام بسا اوقات کر لیتے تھے۔ اور کبھی کبھی فضل الٰہی انہیں کھانا کھلا دیتا تھا مثلاً حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہریؓ کے سریۂ سیف البحر کے دوران مجاہدین اسلام اپنے ساتھ کھجوریں لے گئے تھے مگر اس میں توقع سے زیادہ وقت لگ گیا تو دن بھر میں صرف ایک کھجور رسد رہ گئی اور بسا اوقات وہ صرف گٹھلی چوس کر رہ جاتے تھے کہ ان کو کسی طرح دوسرا سامان نہیں ملا۔ بالآخر ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ایک بڑی مچھلی عنبر نامی عطا فرمائی جو سمندر سے اچھل کر ساحل پر آ گئی تھی اور وہ تین سو مجاہدوں کے خوب کام آئی۔

(بخاری، کتاب الجهاد، باب حمل الزاد علی الرقاب؛ نیز کتب سیرت میں غزوہ/سریہ خبط)

متعدد صحابہ کرام کے غزوات میں اپنے زادراہ (ازواد) ساتھ لے جانے کا ذکر ملتا ہے:

حضرت جابر اور ان کے ساتھی نے ایک مہم کے دوران رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ کھجوروں کا کھانا کھایا۔ یہ کھجوریں صحابہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ (ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی طعام الفجاة)

-غزوۂ خیبر کے دوران رسول اکرم ﷺ نے کئی مواقع پر صحابہ کرام کو اپنے اپنے کھانے (طعام)، زادِراہ (ازواد) اجتماعی دسترخوان پر لانے کا حکم دیا اور صحابہ کرام نے ان کو جمع کر دیا۔ ان میں کبھی ستو (سویق) ہوتا تھا جس میں پانی ملا کر چاٹ لیا جاتا تھا، کبھی دوسری کھانے کی اشیاء ہوتی تھیں جنھیں آپس میں ملا کر حیس یا ثرید قسم کی چیزیں تیار کر لی جاتی تھیں۔ ان میں کھجور، جَو کے آٹے، گھی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب الجهاد؛ باب غزوة خيبر؛ باب حمل الزاد فی الغزو ؛موطا،۱/ ۴۸؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الدليل الخ)

-صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ایک بار کئی اصحابِ نبی ﷺ نے شکار کا گوشت پیش کیا اور

آپ ﷺ نے اس کو قبول کر کے تناول کیا اور دوسرے صحابہ کرام کو بھی کھانے کی ہدایت فرمائی۔ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے خود نہیں کھایا لیکن دوسرے غیر مُحرموں کو اس کے کھانے کی اجازت عطا کی۔

(بخاری، کتاب الهبة وفضلها، باب قبول هدية الصيد ؛مسلم، کتاب الحج، باب تحريم الصيد للمحرم؛ ابوداؤد، کتاب المناسک، باب لحم الصيد للمحرم وغیرہ)

نقد رقوم اور غذا کے ہدایائے صحابہ

اجتماعی زادِ راہ اور کھانوں کی ایک اور اسلامی جہت یہ تھی کہ مالدار صحابہ کرام اور دوسرے مخیّر حضرات وخواتین نقد رقوم اور اسلحہ وغیرہ کے علاوہ کھانے کی چیزیں بھی فراہم کرتے تھے۔ فوجی مہمات میں اس سامانِ رسد کی موجودگی بہت ضروری ہوتی تھی اور بسا اوقات مقاماتِ جنگ وجدال میں سامانِ رسد کی فراہمی نہیں ہو پاتی تھی جس سے متعدد مسائل اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور ان میں سب سے اہم بھکمری ہوتی تھی۔ لہٰذا رسولِ اکرم ﷺ بطور حکمتِ عملی اور بطور سنتِ نبوی بھی اپنے ساتھ غزوات میں اور سرایا میں مسلم مجاہدین کے لیے سامانِ رسد فراہم کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ علاقے کے مسلم اور غیر مسلم طبقات بھی مسلم مجاہدین بالخصوص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زادِ راہ اور رسد کا عطیہ دیتے تھے۔

- صلحِ حدیبیہ کے سفر کے آغاز میں جب رسول اکرم ﷺ ابواء نامی مقامِ حسرت پر پہونچے تو ایک صحابی حضرت ایماء بن رحضہ خزاعیؓ نے اپنے فرزند حضرت خفافؓ کے ہمراہ مسلم مجاہدین کے لیے چند اونٹ، ایک سو بکریاں اور دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر دودھ بھیجا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور اس زادِ راہ سے تمام مسلمانوں کے کھانے کا انتظام و انصرام فرمایا۔

(واقدی، ۵۷۷، نیز ترجمہ حضرت ایماء بن رحضہ خزاعی وحضرت خفاف: کتب سیرت ابن ہشام وابن کثیر وغیرہ)

- غزوۂ تبوک کے نازک موقعہ پر متعدد صحابہ کرام نے اپنی اپنی بساط سے زیادہ مال ودولت اور عطایا پیش کیے تھے۔ ان میں نقد رقوم وغیرہ کے علاوہ متعدد صحابہ کرام نے کھانے

کے عطایا حاضر کیے تھے جو ان کے خیال میں سب سے ضروری تھے اور وہی ان کی ملکیت بھی تھے جیسے:

- حضرت عاصم بن عدیؓ نے نوے وسق کھجور (تمر) فراہم کی تھی۔
- حضرت یامین نضریؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے بھی کھجوروں یا کھانے کی اشیاء پیش کی تھیں۔
- بنو عریض کے یہودیوں نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ہریس کا تحفہ پیش کیا تھا جسے آپ ﷺ نے قبول کر لیا تھا۔

(واقدی، ۹۹۱: اور اس کے بدلے میں رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو مفتوحہ علاقے کی ایک متعین پیداواری مقدار بطور طُعمہ عطا فرمائی تھی۔ نیز ایضاً، ۱۰۰۶)

غزوات و سرایا میں بطور مال غنیمت کھانے پینے کی چیزیں ہاتھ آتیں تو ان کو تقسیم نہ کیا جاتا بلکہ سب کے لیے عام کر دی جاتیں اور لوگ ضرورت بھر اس ذخیرۂ طعام سے کھانے لے لیتے تھے جیسا کہ غزوۂ خیبر میں بعض بیانات صحابہ اور عام حدیث ابن عمرؓ سے معلوم ہوتا ہے۔

اجتماعی کھانوں میں برکت

غزوۂ تبوک میں صحابہ کرام کے عطیاتِ طعام سے اجتماعی کھانے ہی وجود میں آتے تھے۔ سب مل بانٹ کر ساتھ ساتھ کھاتے تھے۔ تاہم ایک بڑے لشکر۔تیس ہزار نفری پر مشتمل انبوہِ عظیم۔کے لیے وہ عطایا کافی کم رہے۔ حسب معمول انفرادی طور سے مجاہدین اپنے کھانے ساتھ لے گئے تھے۔ جب پیمبری وقت پڑا تو رسولِ اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے اپنے اپنے زادِ راہ کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا: آپ ﷺ نے اس مقصد کے لیے ایک بڑا دسترخوان بچھوایا۔ تعمیل ارشاد میں کوئی ایک مٹھی جوار لایا، کوئی ایک مٹھی گیہوں، کوئی ایک مٹھی کھجور اور کوئی روٹی کے چند ٹکڑے لے آیا۔ اس طرح تھوڑا سا کھانے کا سامان جمع ہو گیا۔ پھر رسولِ اکرم ﷺ نے برکت کی دعا کی اور لوگوں سے فرمایا کہ اب اپنے اپنے برتن کھانے سے بھر لو۔ مجاہدین نے اپنے برتنوں میں کھانا بھرنا شروع کیا اور تمام دستیاب برتن بھر گئے اور دسترخوان پر بھی کھانا اُتنا کا اُتنا

موجود رہا۔اس معجزۂ نبوی کا نتیجہ سب کی شکم سیری کی شکل میں نکلا۔

(مسلم، کتاب الایمان، من لقی اللہ بالایمان الخ: رسولِ اکرم ﷺ نے بعض مجاہدین کی درخواست پر کہ کھانا ختم ہوگیا ہے اونٹوں کو ذبح/نحر کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ حضرت عمرؓ کو قربان ہونے والے اونٹوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ سواری کے جانور کم پڑ جائیں گے اور فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے لہٰذا رسولِ اکرم ﷺ سے ازوادِ قوم جمع کروا کر اس پر دعائے برکت کرنے کی درخواست کی تھی جو قبول ہوئی۔ اور اسی کے نتیجہ میں کھانے میں برکت کا معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ ظاہر ہے کہ دو چار اونٹ جو نحر کیے جا چکے تھے ان کا گوشت بھی پکا کر کھایا گیا ہوگا اور وہ بھی اجتماعی دسترخوان کی زینت بنا ہوگا۔ یہ صرف ایک غزوہ کا واقعہ نہیں ہے۔ متعدد غزوات میں اس طرح تھوڑے تھوڑے کھانے کو جمع کر کے اجتماعی کھانا تیار کیا گیا تھا اور رسول اکرم ﷺ کی دعائے برکت سے تھوڑے کھانے نے سب کی شکم پُری کی تھی۔ اسی کو طعام غیب کہا جاتا ہے جس کے حصول کے لیے ایمان شرط ہے، ترمذی، ابواب المناقب؛ آیات نبوۃ النبی ﷺ: حدیث حضرت سمرہ بن جندب؛ نیز بخاری، آیات/علامات النبوۃ فی الاسلام وغیرہ)

طعامِ منافقت

اس کے برخلاف ایک منافقانہ رویہ بھی سامنے آتا ہے اور جس کا اظہار ہر عصر میں بالخصوص ہمارے معاصر سماج میں بھی خوب ہوتا ہے کہ کچھ خسیس لوگ اپنے اپنے کھانے روک لیتے ہیں اور الگ کھاتے ہیں اور اجتماعی کھانے میں شرکت نہیں کرتے۔ غزوۂ مریسیع کا واقعہ ہے، جو دوسرے غزوات میں بھی پیش آیا تھا، کہ صحابہ کرام کھانے کے وقت رسول اکرم ﷺ کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ سردارِ منافقین نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ جب صحابہ چلے جائیں تو رسول اکرم ﷺ کے پاس کھانا لے جانا اور آپ ﷺ کے علاوہ جو دو چار لوگ رہ جائیں صرف ان کو کھلانا: "...وکانوا یحضرون رسول اللہ ﷺ عند الطعام. فقال عبد اللہ (بن ابی) اذا انفضوا من عند محمد فاتوا محمدا بالطعام فلیاکل ھو ومن عندہ..." یہ دو صحابہ حضرت جابر اور حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے۔ (ترمذی، تفسیر القرآن، سورۃ المنافقون)

تقریبات اور تیوہار پر کھانے

اسلامی تقریبات میں عیدین کے علاوہ ولادت پر عقیقہ اور شادی پر ولیمہ اور برات وغیرہ

کے کھانے کی روایت ملتی ہے۔ ولیمہ وغیرہ یعنی شادی کے کھانوں پر ایک الگ فصل میں بحث آتی ہے۔ بقیہ تقریبات کے حوالہ سے چند دعوتوں یا کھانوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔ یہ اسلامی روایت کے ساتھ ساتھ ایک سماجی قدر اور معاشرتی ریت بھی ہے اور ہر سماج وتہذیب میں اس کی رعائت و پیروی کی گئی ہے۔ فطری طور سے خوشی کے مواقع پر اپنی مسرتوں کے اظہار کا ایک رجحان ومیلان ہوتا ہے اور انسان اس میں دوسرے اہلِ قرابت وقربت کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان تقریبات میں کھانے پینے کے اہتمام اور دوسروں کو شریک کرنے سے محبت ومودت کی فضا پیدا ہوتی ہے جو اسلام کا ایک اہم سماجی پہلو اور ایک لازمی دینی جہت بھی ہے۔ اسلامی شریعت میں اسی بنا پر تقریبات کے لیے خاص اہتمام کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ پھر ان تقریبات میں ایک دوسرے کے لیے دعا اور خیر وبرکت کی خواہشات کا اظہار بھی ہوتا ہے جو مبارک بادی کی روایت کے آئینہ سے جھلکتا ہے۔

(معیشت نبوی - مدینہ منورہ میں -۲، ۱۹-۲۰؛ کتاب الاضاحی وغیرہ کے ابواب نیز روایات مندرجہ ذیل؛ اسلامی احکام کا ارتقاء وغیرہ)

عید الفطر کی خاص تقریب تو نمازِ عید ہے اور اس سے پہلے ایک سماجی روایت یہ قائم کی گئی کہ نماز گاہ جانے سے قبل کوئی میٹھی چیز کھائی جائے اور اسے سنت/مستحب قرار دیا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام مدینہ منورہ میں عید الفطر کے موقعہ پر کھجوریں ضرور کھاتے تھے۔ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی آتا تھا تو اسے بھی "تمرات" (کھجوریں) پیش کی جاتی تھیں اور گھروں میں اہتمام سے کھانا بھی پکایا جاتا تھا۔

(مالک، موطا، کتاب العیدین؛ باب الامر بالاکل قبل الغدو فی العید: "انه کان یاکل یوم عید الفطر قبل ان یغدو"؛ بخاری، کتاب العیدین، باب الاکل یوم الفطر قبل الخروج؛ حدیث: ۹۵۳: "کان رسول اللہ ﷺ لا یغدو یوم الفطر حتی یاکل تمرات"؛ فتح الباری، ۲/ ۵۷۵ ومابعد)

عید الاضحیٰ میں نمازِ خاص کے بعد قربانی کی سنت جاری ہوئی۔ رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے صاحبِ استطاعت صحابہ قربانی کرتے تھے۔ ایک بقرعید میں رسولِ اکرم ﷺ نے ازواج مطہرات کی طرف سے بھی ایک گائے قربان/ذبح کی اور اس کا گوشت لوگوں میں تقسیم کیا اور خاص اہتمام سے کھانا پکوایا اور لوگوں کو شریک کیا۔ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کے کالے

بکرے یا کالے مینڈھے اور اونٹ کی قربانی کا ذکر ملتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے گوشت میں صحابہ کرام کی شراکت کا بھی اور بعض لوگوں کی دعوت کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام بھی خاص اہتمام سے قربانی کرتے تھے اور گوشت اہل وعیال کے علاوہ اہلِ قرابت وقربت کو کھلاتے تھے اور کھانے بھی کھلاتے تھے۔

(بخاری، مسلم، ترمذی اور موطا کے ابواب عید الاضحی؛ کتاب الضحایا، باب مایستحب من الضحایا؛ الشرکة فی الضحایا؛ نیز کتاب صلوٰة العیدین ۔ فتح الباری، ۲/ ۵۷۷ ومابعد: ایک انصاری صحابی نے قربانی کر کے اس کا گوشت اپنے پڑوسیوں کو بھیجا تھا۔ دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دن گوشت کا انتظار وخواہش کی جاتی ہے: "ھذا یوم یشتھیٰ فیه اللحم"۔ یہ اہل ضرورت کی فطری اور آفاقی فطرت کا اظہار نبوی ہے)

عہدِ نبوی کے ولیمے

مکی عہد اور مدنی دور میں رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے بہت سوں کی شادیاں ہوئیں اور سنت کے مطابق ان کے بعد ولیمے بھی ہوئے۔ شادی کے دراصل دو کھانے ہوتے تھے جیسا کہ آج بھی مسلم معاشرے میں رواج پایا جاتا ہے: ایک شادی یا نکاح کے دن دولہن والوں کی طرف سے کھانا دیا جاتا ہے اور دوسرا دولہا والوں کی طرف سے ولیمہ ہوتا ہے جو دولہن کی رخصتی کے بعد دولہا کے گھر پر ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی پہلی شادی حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ سے کی تھی اور شادی/ برات کی دعوت لڑکی والوں نے کی تھی۔ ولیمہ رسول اکرم ﷺ نے یا آپ ﷺ کے چچا نے کیا تھا۔ اسی بنا پر قدیم عرب رواج سنتِ نبوی بن گیا اور بعد میں اسلامی روایت بھی۔

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، موطا وغیرہ کتب حدیث میں کتاب النکاح وغیرہ کے ابواب ولیمہ نیز دوسرے ابواب مکررات؛ مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء- باب نکاح؛ برات لے جانے والے دولہا اور اس کے بزرگ اپنے براتیوں کی قبل نکاح بھی ضیافت کرتے تھے)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دیگر ازواج مطہرات سے شادیوں پر ولیمے کی سنت ادا فرمائی۔ ان میں سے بعض کا ذکر بہت صراحت کے ساتھ ملتا ہے اور بعض کا ذکر نہیں ملتا۔ پہلے

رسول اکرم ﷺ کی شادی کی دعوتوں اور ولیموں کا ذکر کیا جاتا ہے:

- حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیقؓ سے رسول اکرم ﷺ کی دوسری شادی بھی مکہ مکرمہ ہی میں ہوئی لیکن رخصتی مدینہ منورہ میں ہوئی۔ نکاح کے دن شادی کے کھانے کی روایات تقریباً عنقا ہیں لیکن رخصتی کے دن حضرت عائشہؓ کی والدہ ماجدہ حضرت ام رومانؓ کی دعوتِ شادی کا ذکر بہرحال ملتا ہے۔ روایاتِ حدیث میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے وقت ان کے بناؤ سنگھار اور سہیلیوں کے وداع کرنے کا بھی حوالہ آتا ہے۔

(بخاری، کتاب النکاح کے مختلف ابواب اور دوسرے کتب وابواب؛ مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وغیرہ؛ فتح الباری، متعلقہ بحث)

- حضرت ام سلمہؓ سے شادی کے ولیمہ میں بیت المساکین میں جو کھانا کھلایا وہ جو اور گھی وغیرہ کے حیس پر مشتمل تھا۔ (بلاذری، ۱/۴۳۱)

- حضرت صفیہؓ سے نکاح کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے ولیمہ کیا۔ خادم نبوی حضرت انس بن مالکؓ نے مسلمانوں کو آپ ﷺ کے ولیمہ کی دعوت دی۔ چمڑے کی چادریں (انطاع) بچھائی گئی تھیں اور ان پر کھجور، پنیر اور مکھن (التمر و الاقط والسمن) پھیلا دیا گیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ چادر میں ملیدہ تیار کیا گیا (ثم صنع حیسا فی نطع)

(بخاری، مذکورہ بالا، حدیث: ۵۳۸۷؛ فتح الباری، ۹/ ۶۵۷-۶۶۱ نیز اجتماعی کھانے وغیرہ/ کھانے کی اقسام کے ابواب)

- حضرت زینب بنت جحشؓ سے شادی کے بعد ولیمہ کی دعوت ایک صحابی خاندان نے بہت حسین وجمیل طریقے سے کی۔ حضرت انس بن مالکؓ کی والدہ ماجدہ حضرت ام سلیم بنت ملحان انصاریؓ نے شادی کی دوسری صبح رسول اکرم ﷺ کی شادی کا تحفہ بھیجا جو ایک کھانے پر مشتمل تھا۔ ایک برتن میں کھجور، گھی اور پنیر کا ملیدہ بنایا اور خدمتِ اقدس میں روانہ کیا۔ یہ تحفہ شادی قبول فرمالیا (کھانے کی قسم۔ حیس/ حساء میں ذکر وحوالہ)

- اسی جیسے واقعہ کا ذکر حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان امویؓ کی رسولِ اکرم ﷺ سے شادی کے بارے میں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے سفیر ووکیل حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کی معرفت حضرت ام حبیبہؓ کو شادی کا پیغام بھیجا جو اس وقت حبشہ میں تھیں۔ حضرت نجاشیؓ نے ان کا

نکاحِ غائبانہ پڑھایا، شادی/ نکاح کی دعوت میں عمدہ کھانا کھلایا اور اسے سنتِ انبیاء بتایا۔ انھوں نے خواتین، دلہن اور دوسری خادماؤں کو تحفے تحائف بھی دیے اور رسول اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت ام حبیبہؓ کا مہر بھی ادا کیا۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ نے اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ کا نکاح خود رسول اکرم ﷺ سے کیا تھا۔

(مسلم، باب فضائل ابی سفیان؛ اسی باب میں حضرت معاویہؓ کے کاتب وحی اور حضرت ابوسفیانؓ کے سپہ سالار بنائے جانے کا ذکر بھی ہے؛ نیز کتب سیرت بالخصوص بلاذری، انساب الاشراف؛ واقعہ شادی؛ ترجمہ حضرت ام المومنین اور حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ وغیرہ)

۔حضرت زینب بنت جحش اسدیؓ کی شادی پر اصل ولیمہ رسول اکرم ﷺ نے بنفس نفیس تیار کرایا تھا۔ وہ گوشت اور روٹی (لحم وخبز) پر مشتمل تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے شادی کے تحفہَ ام سلیمؓ کو طعامِ ولیمہ میں ملا دیا۔ بعض روایات سیرت کے مطابق آپ ﷺ نے ایک بکری ذبح کروائی تھی کہ یہ عین حدیث نبوی کے مطابق تھا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ حضرت زینبؓ کے گھر میں صحابہ کرام کی مختلف جماعتوں کو بلا بلا کر ان کی دعوت کی۔ سنتِ نبوی یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ دس دس مدعوئین کو کھلاتے تھے۔ اس بار بھی دس دس کی ٹکڑیوں کو باری باری سے کھلایا اور کافی حضرات نے کھانا کھایا پھر بھی وہ برکتِ الٰہی اور دعائے نبوی سے کافی بچ رہا۔ اس کو بھی معجزاتی دعوتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ حضرت انسؓ راوی حدیث کا یہی خیال ہے۔ اس ولیمہ میں آدابِ طعام میں تسمیہ، داہنے ہاتھ سے کھانے اور اپنے سامنے سے لقمہ اٹھانے وغیرہ کے علاوہ یہ اضافہ ہوا کہ کھانے کی دعوت ہو تو کھانا کھانے کے بعد جلد دعوت گاہ، خانۂ میزبان سے روانہ ہو جانا چاہیے کیونکہ زیادہ دیر بیٹھنا میزبان اور ان کے اہل خانہ کے لیے باعث تکلیف ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت زینبؓ اسی کمرے میں پیٹھ موڑے دیوار کی طرف رخ کیے بیٹھی رہیں اور رسول اکرم ﷺ بار بار گھر کے باہر اور اندر آتے رہے مگر حضرات صحابہ میں سے چند لوگ باتوں میں منہمک وہیں جمے رہے۔ اسی واقعہ پر سورۂ احزاب: ۵۳-۵۸ نازل ہوئیں۔

(بخاری، کتاب النکاح، باب الھدیۃ للعروس؛ نیز کتاب الاستیذان و کتاب التفسیر وغیرہ؛ فتح الباری، متعلقہ مباحث؛ مسلم، کتاب النکاح)

۔حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیؓ سے رسول اکرم ﷺ نے عمرۃ القضاء کے بعد

۷ھ/ ۶۲۹ء میں نکاح کیا تھا۔ احادیث اور کتبِ احادیث میں زیادہ بحث اس نکتہ پر مرکوز ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے نکاح بحالتِ احرام کیا تھا یا احرام اتارنے کے بعد۔ بہرحال بیشتر علماء ومحدثین کا خیال وفیصلہ ہے کہ نکاح احرام اتارنے کے بعد کیا تھا لیکن اس وقت آپ ﷺ حدودِ حرم ہی میں تھے۔ سیرت ومغازی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس نکاح کے بعد بھی ولیمہ پر حضرات صحابہ کرام کو کھانا کھلایا تھا۔ اس ولیمہ کی ایک اور سماجی اور دینی اہمیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مشرک قریشی اکابر کو بھی دعوتِ طعام دی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بالعموم انھوں نے دعوت میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ ایک امکان بہرحال یہ ہے کہ بعض اکابرِ مکہ وعلاقہ نے شرکت کی ہو۔

اس ولیمہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا واقعہ ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے: صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ اور مسلمانان مدینہ کو قضائے عمرہ کے دوران صرف تین دن قیام کی اجازت ملی تھی۔ چوتھے دن رسولِ اکرم ﷺ حضرت سعد بن عبادہؓ اور دوسرے انصار کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ دو قریشی اکابر۔ سہل بن عمرو عامری اور حُویطب بن عبدالعزیٰ۔ مجلسِ نبوی میں پہونچے اور رسولِ اکرم ﷺ سے مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے کو کہا کہ مدتِ قیام ختم ہو چکی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہارا کیا حرج ہے اگر تم مجھے اپنے درمیان شادی کی رات گذارنے کا موقع دو اور میں تمہارے لیے کھانا بنواؤں؟ ان دونوں نے بدبختی سے کہا کہ ہمیں آپ کے کھانے کی کوئی حاجت نہیں، آپ بس تشریف لے ہی جائیں کہ مدت ختم ہو چکی: ”... **فقال النبی ﷺ: و ماعلیکم لوتر کتمونی فاعرست بین اظهر کم، فصنعت لکم طعاما؟ فقالا: لاحاجة لنا فی طعامک..**“۔

(واقدی، ۷۳۹-۷۴۰؛ ابن سعد، ۸/ ۱۳۲-۱۴۰؛ اسد الغابہ، ۵/ ۵۵۱ ”... **فقال ﷺ: دعونی أبتنی باهلی واصنع لکم طعاما، فقالوا: لاحاجة لنا لطعامک، فخرج فبنیٰ بها بسرف قریب مکة**؛“ نیز دیگر کتب حدیث وسیرت وتراجم)

ولیمۂ نبوی کے بارے میں بعض سیرت نگاروں اور شارحینِ حدیث کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ دراصل وہ حضرت انس بن مالکؓ کی ایک حدیث کی صحیح تفہیم کی کمی کے سبب پیدا ہوئی ہے۔

وہ غلط فہمی یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے سب شادیوں پر ولیمہ نہیں کیا، صرف بعض نکاحوں کے بعد کیا۔ یہ خیال بالکل صحیح نہیں ہے، کیونکہ روایات سیرت وحدیث سے آپ ﷺ کے ولیمہ کرنے کی سنت متواترہ ثابت ہوتی ہے۔ پھر رسول اکرم ﷺ اپنے فرمان کہ "ولیمہ کرو خواہ ایک بکری پر ہی ہو" کے خلاف خود کیسے جاسکتے تھے۔ جس حدیثِ انسؓ کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے اس کا مفہوم قطعی دوسرا ہے اور وہ ولیموں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یعنی بعض ولیموں میں رسولِ اکرم ﷺ نے کسی مجبوری کے سبب روٹی گوشت کا انتظام نہیں فرمایا جیسے حضرت صفیہ وغیرہ سے شادی کے زمانے میں آپ ﷺ غزوات واسفار کے دوران بے سروسامان تھے۔ دوسرے ان احادیثِ حضرت انسؓ کا مفہوم ودائرہ مختلف ہے۔

امام بخاریؒ کے "باب الوليمة ولو بشاة" کے تحت تین احادیثِ صحیحہ نقل کی گئی ہیں جو ولیمہ نبوی کے متعلق ہیں۔ اول حدیثِ حضرت انسؓ ہے جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات میں سے کسی کا ولیمہ ایسا نہیں کیا جیسا حضرت زینب بنت جحشؓ کا کیا کہ ان کی شادی پر ایک بکری کا ولیمہ کیا: "ما اَولَم النبی ﷺ علیٰ شيء من نسائه ما اولم علیٰ زينب، أولم بشاة"

(حدیث: ۵۱۶۸؛ یہی بات دوسرے باب کی حدیث: ۵۱۷۱ میں بھی ہے اور اس میں حضرت زینب بنت جحشؓ کی تزویج کی صراحت ہے۔ ان دونوں پر حافظ ابن حجرؒ کی بحث مفصل اور مبسوط ہونے کے علاوہ کافی شافی ہے)

باقی دو حدیثوں کا ذکر بھی حضرت انسؓ کی سند ہی سے ہے: حدیث ۵۱۶۹: میں حضرت صفیہ کی شادی پر حیس سے ولیمہ کرنے کا ذکر ہے: "واولم عليها بحيس" اور حدیث: ۵۱۷۰ میں ایک خاتون سے نکاحِ نبوی کے بعد لوگوں کو کھانے کے لیے حضرت انسؓ کے بلانے کا ذکر ہے۔ ان تمام روایاتِ حدیث سے اور دیگر آثار سیرت سے یہ بلا شبہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ہر شادی پر ولیمہ ضرور کیا۔ کسی پر صرف ثرید، حیس وغیرہ کا انتظام ہوسکا کہ بے سروسامانی کے عالم میں اور سفر میں رواں دواں تھے۔ حضرت صفیہ بنت شیبہؓ کی حدیث: ۵۱۷۲ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے بعض/کسی زوجہ کی شادی پر صرف دو مُدّ جَو پر ولیمہ کیا: "بِمدّين من شعير" اور کسی میں گوشت روٹی پکوا کر باقاعدہ ولیمہ کیا۔ ان دونوں قسم کے ولیموں

میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ صرف انتظام کی سہولت و وقت کا معاملہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بکری کے ولیمہ پر بحث میں واضح کیا ہے کہ ایک بکری کا ذکر کم سے کم ولیمہ کے لیے شرط نہیں ہے بلکہ وہ صرف مالدار اور صاحب ثروت کے لیے وجہ تشجیع ہے، ولیمہ دراصل شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ (فتح الباری، ۹/۲۹۲ و مابعد)

بعض دوسرے ولیمے

ولیمۂ نبوی کے علاوہ عہدِ نبوی کے دوسرے ولیموں کا ذکر روایاتِ حدیث و سیرت میں آتا ہے کہ وہ دراصل ایک سماجی ریت تھی۔ اور عربوں کے علاوہ دوسری قوموں میں بھی قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ انبیائے کرام کی سنت ہونے کی بنا پر وہ عرب حنفی معاشرے میں آئی۔ جاہلی عربوں میں بھی ان دعوتوں اور ولیموں کا ذکر ملتا ہے۔ جناب ہاشم بن عبد مناف نے مدینہ منورہ کے بنو النجار میں شادی کی تو اکابر قریش و یثرب کو شاندار ولیمہ دیا۔ دادا جناب عبد المطلب ہاشمی اور والد ماجد جناب عبداللہ بن عبد المطلب ہاشمی کے ولیموں کا ذکر بھی مآخذ میں پایا جاتا ہے اور بعض دوسرے اکابرِ قریش کے ولیموں کا بھی۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاحِ نبوی کے بعد کا ولیمہ اسی قبلِ بعثت زمانے سے متعلق تھا۔

(مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: عبد المطلب ہاشمی۔ رسولِ اکرم ﷺ کے دادا: بحث از دواج عبد المطلب و ہاشم وغیرہ)

عہدِ اسلامی اور عہد نبوی کے دونوں ادوارِ مکی و مدنی میں یہ پرمسرت رواج قائم رہا اور شریعت نے اس کا احترام کیا۔ مکی دور کے ولیموں کا ذکر نسبتاً کم ملتا ہے مگر مدنی دور کے شادی طعاموں کی بہت دھوم دھام ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے ولیمے اس کا ثبوت ہیں۔ بعض صحابہ و صحابیات کے ولیموں کا بھی مختصر ذکر کیا جاتا ہے کہ اس سماجی ریت اور معاشرتی و تہذیبی روایت کا صحیح ادراک ہو سکے۔ پھر اس کی ایک دینی جہت اور اہمیت بھی تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابہ کرام کو جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ نمایاں ترین شخصیت ہیں، ولیمہ کرنے کا حکم دیا تھا، خواہ ایک بکری کے گوشت ہی پر اکتفا کیا جائے: "أولم ولو بشاة"۔

(بخاری و مسلم، کتاب النکاح، باب الولیمة ولو بشاة، باب الولیمة حق وغیرہ؛ احادیث: ۵۱۶۶، ۵۱۶۷-۵۱۷۰ وغیرہ؛ دیگر کتب حدیث، فتح الباری، ۹/۲۸۶-۲۹۹ و مابعد)

نہ صرف ولیمہ کرنا سنت ٹھہرا بلکہ ولیمہ کی دعوت دی جائے تو اس کو قبول کرنا بھی ضروری ہے۔ امام بخاریؒ نے تو اس کے وجوب کا باب باندھا ہے: **باب حق اجابة الوليمة والدعوة** الخ جس کے تحت حدیث: ۵۱۷۳ میں یہ فرمانِ نبوی موجود ہے: "**اذا دُعی احدكم الى الوليمة فليأتها**" اور بعض دوسری احادیث وآثار میں بھی ان کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول تھا کہ ولیمہ میں بلائے جاتے تو ضرور جاتے تھے خواہ کسی معذوری کے سبب کھانا نہ کھا سکیں۔ دوسرے صحابہ کرام کا بھی یہی معمول تھا۔ اس کی احادیث وروایات بھی کافی ملتی ہیں۔

(بخاری، مذکورہ بالا، باب اجابة الداعی فی العرس وغیرہ؛ حدیث: ۵۱۷۹؛ فتح الباری، ۹/۳۰۶)

۔حضرت ابو اسید ساعدیؓ نے جب شادی کی تو انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو دعوت دی اور نہ ان کے لیے کھانا پکایا اور نہ کوئی خاص تقریبِ ضیافت کی۔ صرف یہ ہوا کہ ان کی دولہن حضرت ام اسیدؓ نے پتھر کے ایک برتن میں کھجوریں رات ہی کو بھگو دی تھیں اور وہی ان کو پیش کر دیں۔ لیکن اس روایت کے آخر میں یہ وضاحت بھی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فراغتِ طعام کے بعد اس تحفۂ شادی سے شادکام ہونا پسند فرمایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانے (طعام) کا انتظام تھا۔ خواہ وہ کھانا کچھ بھی رہا ہو: "**لما عرّس ابو اسيد الساعدی دعا النبی ﷺ واصحابه، فما صنع لهم طعاما ولا تقرّبه اليهم، الا امرأته ام اسيد بلّت تمرات فی تور من حجارة من الليل، فلما فرغ النبی ﷺ من الطعام اماثته له فسقته تتحفه بذلك**"۔

(بخاری، کتاب النکاح، باب قيام المرأة على الرجال فی العرس وخدمتهم بالنفس؛ حدیث: ۵۱۸۲؛ فتح الباری، ۹/۳۱۱-۳۱۳ نیز حدیث: ۵۱۸۳، باب النقیع والشراب الخ؛ حافظ ابن حجرؒ اور بعض دوسرے شارحین نے اس "کھانے" (طعام) پر کوئی بحث نہیں کی ہے اور بعض شارحین نے تو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس ولیمہ میں کھانا تو تھا ہی نہیں، صرف شربت ہی شربت تھا۔ حالانکہ روایتِ بخاری سے واضح ہے کہ شربتِ تمر کھانے کے بعد پیش کیا گیا تھا؛ اسد الغابہ، ۵/۵۶۵ وغیرہ دوسری کتب حدیث وابواب)

۔حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ نے دخترِ نبوی حضرت فاطمہؓ سے شادی کے بعد اپنے خرچ سے ولیمہ کیا تھا جس کا ذکر اوپر کھانے کی اقسام میں اونٹنی/ اونٹ کے گوشت کے ضمن میں گذر چکا۔

۔ حضرت اشعث بن قیس کندیؓ قبیلہ کندہ کے ایک بہت بڑے سردار تھے اور سنہ ۱۰ھ/۶۳۲ء میں مدینہ آئے۔ وہ اپنے علاقے کے قبائل کے نمائندے (وافد) تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اعزاز واکرام کیا اور ان کی دعوتیں بھی اپنے گھروں میں کیں۔ ان کے ولیمہ کا واقعہ ذرا بعد کا ہے لیکن عہد نبوی سے متصل اور بہت دلچسپ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ان کی شادی اپنی ایک بہن سے کردی۔ حضرت اشعثؓ نے اپنی تلوار کھینچی اور اونٹوں کے بازار گئے اور جو اونٹ نظر آیا اسے قربان وذبح کرڈالا۔ لوگوں کے احتجاج پر ان کا ہاتھ رکا تب تک کئی اونٹ نحر (ذبح) ہوچکے تھے۔ انہوں نے سب مالکوں کو قیمت ادا کی اور اونٹوں کے گوشت پر شاندار ولیمہ کیا۔ ساتھ ہی یہ فرماتے جاتے کہ اگر ہمارے علاقے میں ولیمہ ہوتا تو اس سے زیادہ شاندار ہوتا۔ (اسد الغابہ، ۱/ ۹۸)

۔ حضرات سلمہ بن سلامہؓ دونوں ایک ولیمہ میں شریک ہوئے۔ حضرت سلمہؓ کا وضو تھا لیکن انھوں نے ولیمہ کا کھانا کھا کر پھر وضو کیا۔ دوسرے صحابہ کرام اور حضرات مدعوئین دعوت کھانے کے بعد جب باہر آئے تو حضرت سلمہؓ سے کہا کہ آپ کا تو وضو تھا پھر کیوں تازہ وضو کیا۔ فرمایا کہ ایک بار رسولِ اکرم ﷺ بھی باوضو تھے مگر آپ ﷺ نے دعوت کھانے کے بعد وضو کیا تھا۔ یہ حکم بعد میں بدل گیا جیسا کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ نئے نئے معاملات پیش آتے ہیں۔ بہر حال اس واقعہ میں ایک ولیمہ میں شرکتِ نبوی کا ثبوت ملتا ہے۔ (اسد الغابہ، ۳/ ۳۲۷)

۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے شہید بھائی حضرت زیدؓ کی بیوی عاتکہؓ سے سنہ ۱۲ھ/۶۳۴ء میں شادی کرلی۔ ان کے لیے اس موقعہ پر ولیمہ کا انتظام کیا اور ایک جماعتِ صحابہ کرام کو بلایا۔ ان میں حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی شامل تھے۔ حضرت علیؓ نے اس موقعہ پر حضرت عاتکہؓ سے حضرت عمرؓ کی اجازت سے ان کے اشعار کے سلسلہ میں دروازے کی اوٹ سے کلام بھی کیا۔ (اسد الغابہ، ۵/ ۴۹۸-۴۹۹)

عہد نبوی میں نبوی ولیموں کے علاوہ دوسرے عام ولیموں کے ضمن میں بعض نکات آخر میں بیان کرنے ضروری ہیں:

۱۔ ولیمہ کرنا حدیث وفرمان بھی ہے اور سنت وعمل نبوی بھی۔ لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام

نبوی شادیوں پر ولیمے کیے گئے تھے۔

۲۔ رسولِ اکرم ﷺ کے صحابہ کرام اور صحابیات طاہرات کی اس عہدِ خیر میں جتنی شادیاں ہوئی ان سب کا ولیمہ ضرور کیا گیا۔

۳۔ روایات و احادیث میں ولیموں کا ذکر نہ ملنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ولیمے کیے ہی نہیں گئے تھے۔

۴۔ ولیمہ کا معمول و مسنون کھانا گوشت روٹی ہوتا تھا، جو بالعموم بکری کے گوشت پر مشتمل ہوتا تھا اور اونٹ وغیرہ کے گوشت پر بھی کہ یہی سنت و فرمان نبوی تھا۔

۵۔ حالات کی پریشانی اور لوگوں کی مالی تنگی وغیرہ کے سبب معمولی کھانوں جیسے حیس/ثرید وغیرہ پر بھی ولیمہ کیا جاتا تھا۔

۶۔ ولیمہ میں اقربا اور اعزہ بلائے جاتے تھے اور ان کا تعلق بالعموم ان کے اپنے سماجی طبقات سے ہوتا تھا۔

۷۔ مالداروں اور اعلیٰ طبقات کے ولیموں میں بالعموم فقراء و غرباء کو نظر انداز کر دینے کا رجحان تھا جس کی بنا پر ولیمہ کو بدترین کھانا بھی کہا گیا۔

عقیقہ کی دعوتیں

ولیمہ کے علاوہ تقریبات میں سے ایک اور تقریب عقیقہ کی ہوتی ہے جو ولیمہ کی فطری توسیع، قدرتی نتیجہ اور لازمی ثمرہ بھی ہے۔ بچے/بچی کی ولادت کے بعد ساتویں دن عقیقہ کی تقریب منانی سنت ہے اور وہ سنتِ انبیاء ہے جو اسلام کے روزِ ازل سے جاری چلی آرہی ہے۔ دوسرے انبیاء کرام کے علاوہ خود رسولِ اکرم ﷺ کی تقریب عقیقہ آپ ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب ہاشمی نے بڑے جوش و جذبے سے منائی تھی۔ کیونکہ وہ ان کے دینِ حنیفی کی ایک سماجی اور دینی روایت تھی۔ اور عرب جاہلی کے دوسرے تمام اکابر اور صاحبانِ استطاعت عقیقہ ضرور کرتے تھے۔ دوسری رسوم اور رواج کے علاوہ عقیقہ کے دن بچے بچی یعنی نومولود کی جانب سے دو بکرے یا ایک بکری کی قربانی کی جاتی تھی اور اقرباء و اعزہ اور دوسرے اہلِ قربت کو قربانی

کا گوشت بھیجا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بعض مخصوص احباب واعزہ کی کھانے کی دعوت بھی کی جاتی تھی۔ اسلامی شریعت اور دین محمدی میں عقیقہ کی روایت بھی برقرار رہی اور قربانی اور دعوت کی ریت بھی۔ صرف چند اصلاحات کردی گئیں: ان میں سے ایک یہ تھی کہ قربانی میں لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کی جائے۔ بعض فقہائے صحابہ وعلماء نے دونوں کے لیے ایک بکری کافی سمجھی ہے۔ دوسرے گوشت کے تین حصے کیے جائیں: ایک فقراء و مساکین کے لیے ہو اور دوسرا اعزہ واقرباء کے لیے اور تیسرا صاحب عقیقہ اور ان کے گھر والوں کے لیے۔

(موطا امام مالک، کتاب العقیقة، کے آخر میں امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ عقیقہ واجب نہیں، مستحب ہے اور ایک بکری کرنی چاہیے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ احناف کے نزدیک دو بکرے/ بکریاں لڑکے کی طرف سے اور ایک لڑکی کی طرف سے کرنا سنت ہے، اور اسی طرح گوشت کی سہ گانہ تقسیم بھی۔ ایک بکرے/ بکری کی بھی اجازت ہے۔ مسالک فقہی کے لیے بحث حافظ ابن حجر کے علاوہ مصفیٰ - مسویٰ کے متعلقہ مباحث؛ مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، باب ولادت الخ، عقیقہ نبوی کے لیے: ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۲/۲۶۵: "..وعمل له دعوة جمع قریشا علیها؛ عبدالمطلب ہاشمی، ۷۱-۷۲)

رسول اکرم ﷺ کے تمام بچوں بچیوں کا عقیقہ کیا گیا اور حضرت سلمٰی باندی نبوی رضی اللہ عنہا اس کا اہتمام کرتی تھیں اور ان کی طرف سے حسبِ سنت دو بکرے یا ایک بکری کی قربانی کرتی تھیں یہ قبل بعثت دین حنیفی کا طریقہ تھا۔ ظاہر ہے کہ گوشت کی تقسیم اور اہلِ قرابت وقربت کی دعوتوں کا سلسلہ بھی ضرور جاری رہا تھا اور یہ صرف فرزندانِ ودخترانِ نبوی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ تمام عربوں کا رواج رہا تھا جس کے لیے مزید ثبوت وشواہد تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

(مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، باب دعوتِ عقیقہ؛ ابن سعد، ۴/۱۳۳: ".. وکانت تعق عن کل غلام بشاتین")

بنفسِ نفیس رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے آخری فرزند گرامی حضرت ابراہیمؑ کا عقیقہ کیا تھا اور دعوت کا کھانا بھی کھلایا تھا۔ اسی طرح اپنے دونوں چہیتے نواسوں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی ولادت پر ان کی طرف سے عقیقہ میں مینڈھے (کبش) کی قربانی کرکے دعوت کھلائی تھی۔ رسول اکرم ﷺ کے ادا کردہ ان تینوں عقیقوں میں مینڈھے (کبش) کی قربانی کا ذکر ملتا ہے۔

نواسوں کی طرف سے قربانی کی ایک دلچسپ اور معنی خیز اور دلپذیر سنت بھی ملتی ہے کیونکہ اسلامی شریعت و دین کے مطابق عقیقہ کی قربانی اور دعوت وغیرہ نومولود کے باپ کا کام ہے۔

(مالک، موطا، کتاب العقیقة، باب ماجاء فی العقیقة: باب العمل فی العقیقة ؛ابوداؤد، کتاب الاضاحی، باب فی العقیقة ؛نسائی، کتاب العقیقة، باب کم یعق عن الجاریة: حضرات عبداللہ بن عمرو عروہ بن زبیر لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف سے صرف ایک ایک بکری کا عقیقہ کرتے تھے: کان یعق عن بنیه الذکور والاناث بشاة بشاة"؛ نیز بلاذری، ۱/ ۴۴۹؛ ابن سعد، ۴/ ۱۳۴-۱۳۵)

غمی کے کھانے

انسانی فطرت ہے کہ وہ سکھ کے ساتھ دکھ سے بھی گذرتا ہے کہ زندگی انہیں دونوں سے ہی عبارت ہے۔ اسلام، اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب نے ان دونوں فطری احوال کی رعائت کی ہے اور سب اچھی روایتوں کو قبول کیا ہے۔ جس طرح شادی مسرت کا موقعہ ہے اور اس مسرت کے موقعہ پر شادی، برات اور ولیمہ وغیرہ کے کھانے کھائے جاتے ہیں اسی طرح عہدِ نبوی میں بھی اور آج بھی موت، غم اندوہ اور دکھ کا ایک حال ہے جس سے مرنے والے کے پسماندگان گذرتے ہی رہتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں اور بعد کے اسلامی ادوار میں بھی ایسے غمگین مواقع پر خاص کھانے پکتے تھے اور غمزدوں اور میت والوں کے گھر بھیجے جاتے تھے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے بعض مواقعِ غم واندوہ پر بنفس نفیس بھی کھانا پکوا کر دکھ کے ماروں کے گھروں میں بھیجا تھا اور صحابہ کرامؓ کو ہدایت بھی کی تھی کہ وہ ایسے دکھ وغم کے حالات میں اپنے عزیزوں اور پڑوسیوں کے گھر کھانا پکوا کر بھیجا کریں۔ زبانی ارشاد اور قولی احادیث میں سے ایک وہ ہے جو آپ ﷺ نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی غزوۂ موتہ ۸ھ/ ۶۳۰ء میں شہادت کے موقعہ پر ارشاد فرمائی تھی کہ غم نے ان کے اہل وعیال کو آ لیا ہے اور ایسی ابتلاء وآزمائش میں ان کے لیے کھانا پکوا کر بھیجو۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے گھر والوں - اہل بیت - سے فرمائش کر کے حضرت جعفرؓ اور ان ساتھی شہید صحابہ کرام - حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما - کے گھروں میں کھانا پکوا کر بھجوایا تھا اور دوسرے شہداء کے گھر بھی۔ دوسرے صحابہ کرام نے بھی اس

فرمان نبوی کی پیروی کی تھی۔ دراصل یہ صرف ایک واقعہ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ غمی کے مواقع پر کھانے پکوا کر بھیجنے کی ایک مستقل نبوی سنت اور تعاملِ صحابہ کرام تھا، خواہ اس کی روایات وواقعات کا ذکر ملے یا نہ ملے۔

''تلبینہ'' غمی کے خاص کھانوں میں سے ایک تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث ہے کہ جب ان کے خاندان کے لوگوں میں سے کسی کا انتقال ہوتا تو اس موقعہ غم پر عورتیں جمع ہو جاتیں اور جب وہ چلی جاتیں اور صرف ان کے خاندان والے اور خاص عورتیں یا سہیلیاں رہ جاتیں تو وہ تلبینہ کی دیگچی پکانے کا حکم دیتیں۔ وہ پکائی جاتی پھر ثرید بنائی جاتی اور اس پر تلبینہ ڈالی جاتی۔ وہ فرماتیں: اسے کھاؤ کیونکہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ تلبینہ مریض کے دل کو تسلی دینے والی ہے اور تھوڑا غم بھی غلط کرتی ہے: ''عن عائشة زوج النبی ﷺ انها قالت اذامات الميت من اهلها فاجتمع لذلک النساء ثم تفرقن – الا اهلها و خاصيتها– امرت ببرمة من تلبينة فطُبِحت، ثم صنع ثريد فصُبّتْ التلبينة عليها ثم قالت: كلن منها، فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول: التلبينة مجمة لفواد المريض، تذهب ببعض الحزن''۔

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب التلبينة، حدیث: ۵۴۱۷؛ فتح الباری، ۹/ ۶۸۱؛ اطراف حدیث: ۵۶۸۹-۵۶۹۰، کتاب الطب وغیرہ؛ یہ صرف حضرت عائشہؓ کے گھر/ اہل کے درمیان غمی کا موقعہ اور اس کا ذکر نہیں بلکہ وہ پورے عہد نبوی اور عہد اسلامی کی سماجی اور دینی روایت کا ذکر ہے)

- حضرت ام سلمہؓ نے حضرت ولید بن ولید مخزومیؓ کی شہادت پر مجلسِ بکاء برپا کی اور عورتیں جمع ہوئیں۔ بعد میں ان کے لیے کھانا پکایا گیا اور ان کو کھلایا گیا۔ (بلاذری، ۱/ ۲۱۱)

✪✪✪

کھانے کے ہدایا

اسلامی معاشرت اور اس سے قبل عرب جاہلی روایت میں ہدیے دینے کا ایک سماجی طریقہ صدیوں سے جاری تھا۔ اسے محبت بڑھانے، باہمی ارتباط پیدا کرنے، سماجی میل ملاپ روبعمل لانے اور صلہ رحمی کرنے کا ایک انتہائی موثر ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہدایا میں مختلف اشیاء کا تبادلہ وعطیہ ہوتا تھا لیکن کھانے کی بحث میں صرف کھانے کے ہدایا وعطایا کا ذکر کیا جائے گا۔ رسول اکرم ﷺ نے اس قدیم انسانی سماجی طریقۂ محبت کو اور مستند و مستحکم بنایا اور اس کو ایک دینی جہت بھی عطا فرمائی۔ مسلمانوں کو ہدایت و وعظ فرمایا کہ وہ اپنے کھانوں میں مختلف طریقوں سے دوسروں کو شریک کریں اور ان کو کھانے کے ہدایا بھیجا کریں۔ خواتین اور اہل خانہ کو نصیحت فرمائی کہ وہ گوشت یا دوسری چیز کے سالن میں تھوڑا پانی بڑھا دیا کریں اور پڑوسیوں اور عزیزوں کو کھانا بھی دیا کریں خواہ ایک دو بوٹی اور تھوڑا سا سالن ہو، خواہ صرف ایک کھری (کُراع) ہی کیوں نہ ہو، خواہ صرف ایک روٹی اور معمولی تیل کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف آپ ﷺ نے انسانی فطرت پر حکیمانہ انداز سے ضرب لگا کر تحقیر و تذلیل کے رویے کا سدّباب فرمایا کہ کوئی شخص کسی ہدیہ کو معمولی اور حقیر نہ سمجھے اور اسے رد نہ کرے۔ کیونکہ بالعموم ہدیے دینے والا اور ہدیے لینے والا دونوں ان کے لیے قیمتی ہونا شرط سمجھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے سمجھایا کہ ہدیہ علامتِ محبت و علامتِ ایمان و ہمدردی ہے، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اسے بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ خود آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے ایک دست یا ایک کھری ہی کی دعوت دی جائے تو قبول کر کے جاؤں گا اور گھر بھیجے جائیں تو ان کو قبول کر کے بخوشی کھا لوں گا۔ اس طرح آپ ﷺ نے ہدایا۔ معمولی ہدایا۔ دینے والے غرباء کے لیے تو راستہ کھولا ہی، عام روزمرہ کے ہدایا کی کثرت سے لین دین کا اسوہ قائم فرمایا۔ اور اس نے میل ملاپ، سماجی ارتباط اور صلہ رحمی، انسانی ہمدردی اور مساوات و

مواساۃ کا قابل تقلید طریقہ استوار کیا۔

(بخاری، حدیث: ۲۵۶۸: ''...لو دُعیت الی ذراع او کراع لأجبت، ولو اهدی الیّ ذراعٌ او کراع لقبلت ...''؛ فتح الباری، ۵/ ۲۴۶ نیز خاکسار کا مضمون: ''معیشت نبوی - مدینہ منورہ میں''، تحقیقات اسلامی علی گڈھ، اکتوبر - دسمبر ۱۹۸۹ء اور جنوری - مارچ ۱۹۹۰ء (دو اقساط میں)

معیشتِ نبوی اور معاشِ عہد کے لحاظ سے کھانے کے ہدایا کے لین دین اور تسلسل و تواتر کا ایک سلسلۂ زریں نظر آتا ہے۔ صحابہ کرام خدمتِ نبوی میں اسلامی تقاضوں سے کھانے کے ہدایا تو بھیجتے ہی تھے، اپنے محبوب و مکرم رسول ﷺ کے لیے محبت و عقیدت کے اظہار میں بھی توشے روانہ کرتے تھے۔ پھر وہ رسولِ اکرم ﷺ کی خاطر مبارک کا بھی خیالِ خاص رکھتے اور پیاری خاطر کی رعائت کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف رسولِ اکرم ﷺ بھی ان کو کھانے کے ہدیوں سے نوازا کرتے تھے۔ اور عزیزوں، دوستوں، رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کو کھانے بھیجا کرتے تھے۔ تیسری جہت یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ اور دوسرے مسلمان اور عرب و غیر عرب باشندگان ایک دوسرے کو کھانے کے ہدایا سے نوازتے تھے کہ عرب سخاوت اور اسلامی محبت کا انتہائی دلنشیں تقاضا تھا۔ اسی کی چوتھی جہت یہ تھی کہ غیر مسلم عرب مسلمانوں اور مسلمان غیر مسلموں کو کھانے کے ہدایا بھیجتے تھے۔

خدمتِ نبوی میں صحابہ کرام کے ہدایائے طعام

مکی دور

مکی دور میں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ گرامی میں قریشی عزیزوں اور دوستوں کے گھروں سے کھانے کے ہدایا آنے کی مثالیں ذرا کم ملتی ہیں لیکن ان کا توڑا بالکل نہیں ہے۔ ان سے زیادہ اہمیت ان ہدایائے طعام و خوردنی اشیاء کی ہے جو غیر مسلموں نے پیش کیے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ طائف سے واپسی کے سفر میں رسولِ اکرم ﷺ نے دو شیوخِ قریش عتبہ و شیبہ فرزندانِ ربیعہ کے باغ میں پناہ لی تو انھوں نے اپنے نصرانی غلام حضرت عداسؓ کے بدست آپ ﷺ کی خدمت میں انگوروں کے گچھے بھیجے تھے جو آپ ﷺ نے قبول کر کے بشکریہ تناول

فرما لیے تھے۔ آپ ﷺ کے چچا اور پھوپھیوں اور دوسرے رشتہ داروں کے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں بطور ہدیہ آتی رہتی تھیں اور دوسرے احباب اور دوستوں کے ہاں سے بھی۔ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد ان کے گھروں سے یا ان کی رشتہ دار خواتین اور سہیلیوں کے پاس سے کھانے کے ہدایا برابر آتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہؓ اور ان کی بہن بھی ہدایائے طعام آپ ﷺ کے لیے لایا کرتی تھیں اور آپ ﷺ ان کی تواضع فرماتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضرت حلیمہ کی بہن اور ایک خاتون آپ ﷺ کے گھر آئیں تو آپ ﷺ کے لیے دونوں خواتین کھانے کی چیزیں لائیں۔

(خاکسار کا مضمون، معیشت نبوی مکہ مکرمہ میں، تحقیقات اسلامی، علی گڈھ، جولائی - ستمبر ۱۹۹۰ء؛ رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین: ۳۳ "وہ پنیر اور گھی کا تحفہ لائی تھیں")

مدنی عہد

مدنی دور میں صحابہ کرام اور دوسرے لوگوں کے ہدایائے طعام کے خدمت نبوی میں آنے کے اتنے واقعات ہیں کہ ان پر پوری ایک کتاب لکھی اور ایک دفتر تیار کیا جا سکتا ہے۔ ان واقعات اور ان سے متعلق روایات واحادیث کو بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد آپ ﷺ کا قیام وطعام حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں ایک مدت تک رہا اور اس سے پہلے قبا میں اولین قیام ایک کم معروف صحابی حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے مہمان خانے میں رہا تھا جہاں وہ آپ ﷺ کی تمام ضروریات فراہم کرتے رہے تھے۔ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر رسول اکرم ﷺ کی محبت وعقیدت میں جوش کھا کر انتہائی لگن اور عزت کے ساتھ آپ ﷺ کی مدارات کرتے تھے لیکن اس دورِ مہمانی میں بھی جو اہم بات ہے وہ یہ کہ عقیدت ومحبت نبوی کے مارے صحابہ کرام اس زمانے میں بھی کھانوں کے خوان کے خوان خدمت گرامی میں بھیجا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو ان کھانوں کی ذرا بھی احتیاج نہیں کہ آپ ﷺ کے میزبانِ گرامی ہی کی مہمان نوازی بیکراں و بے حساب ہے لیکن صحابہ کرام کی اپنی محبت وعقیدت، اسلامی صلہ رحمی اور سماجی ذمہ داری چین نہ

لینے دیتی اور وہ ہر روز بلا ناغہ کھانے بھیجا کرتے۔ اخلاقِ عالی کا یہ حال تھا کہ کسی کی دل شکنی منظور تھی اور نہ کسی کے خاطر پر غبار کی گرد کی برداشت، سب کے ہدایائے طعام قبول فرما لیتے، تھوڑا سا کھا لیتے یا ضرورت بھر چکھ لیتے اور باقی اپنے میزبان عزیز اور دوسرے صحابہ کرام کی لذت کام ودہن کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔

(بلاذری، ۱/۲۶۷: منزل ابی ایوب انصاری میں قیام کے بعد بنو النجار کے لوگ باری باری خدمتِ اقدس میں کھانے حاضر کرتے۔ حضرت ام یزید بنت ثابتؓ نے گھی اور دودھ پر مشتمل ثرید ایک دن حاضر خدمت کی اور آپ ﷺ نے استعمال فرمائی۔ حضرت ابو ایوبؓ کے گھر سے اتنا کھانا آتا تھا کہ حاضرین مجلس بھی اس سے سیراب ہوتے تھے اور حضرت اسعد بن زرارہؓ کا پیالہ ایک دن کے ناغے سے آتا تھا جس کا آپ ﷺ انتظار فرماتے تھے اور فرمائش کر کے کبھی طلب کرتے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن ہشام، ۱/ ۴۹۵-۴۹۹؛ مسلم، کتاب الاشربة، باب اباحة اکل الثوم الخ؛ بلاذری، بخاری، اور دوسری کتب حدیث وسیرت؛ معیشت نبوی - مدینہ منورہ میں-۱)

حضرت سعد کا ہدیہ مسلسل

حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کا دستر خوان بہت وسیع تھا اور اس سے زیادہ ان کا دل بہت عالی اور مخیر تھا۔ وہ بلا ناغہ روزانہ رسول اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں کھانے کا ایک بڑا پیالہ بھیجا کرتے تھے اور یہ سلسلہ روزِ اول سے شروع ہوا اور وفاتِ نبوی تک برابر جاری رہا۔ اس بے مثال خدمت، بیکراں محبت اور اتھاہ عقیدت کا سلسلۂ عالی تو کیا ٹوٹتا اس میں ذرہ برابر بھی کبھی فرق نہیں آیا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام نبوی کے دوران بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک بار طفیشل نامی کھانا بھیجا جس میں شوربہ تھا۔ وہ پسند خاطر ہوا تو حضرت ابو ایوب نے اسے روزانہ پکوایا۔ ان کے ہدیہ طعامِ مسلسل میں کبھی گوشت ہوتا، کبھی دودھ ہوتا، کبھی ثرید وسمن ہوتا اور کبھی کچھ اور۔ وہ گونا گوں کھانوں کا ایک گردش کرتا ہوا سلسلہ تھا جس میں یکسانی کی پیدا کردہ اکتاہٹ دور کرنے کا نسخہ غذا کی گونا گونی اور کھانے کی بوقلمونی میں تلاش کر لیا گیا تھا۔ ان کی محبت وعقیدت کا شکرانہ یہ تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ ان کے دستر خوانِ محبت کا انتظار فرمایا کرتے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ازواجِ مطہرات بھی کیونکہ حضرت سعد خزرجیؓ خاطرِ مبارک کی رعائت سے اپنا ہدیۂ طعام روزانہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے زوجہ مطہرہ کے اس گھر میں بھیجا

کرتے تھے جہاں آپ ﷺ کا قیام ہوتا تھا۔ بقول ابن سعدؒ حضرت سعدؓ کا پیالہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہتا تھا: "وكان سعد لما قدم رسول الله ﷺ يبعث اليه في كل يوم جفنة فيها ثريد بلحم او ثريد بلبن اوثريد بخل وزيت اوسمن، وأكثر ذلك اللحم، فكانت جفنة سعد تدورمع رسول الله ﷺ في بيوت ازواجه..."

(ابن سعد، ۳/۶۱۴؛ اسد الغابہ، ۲/۲۸۳۔ حافظ ابن اثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ اوس وخزرج میں کوئی ایک گھر/ خاندان ایسا نہیں تھا جس میں چار چار پیڑھیوں میں مُطعِمون (کھانا کھلانے والے) رہے ہوں سوائے حضرت سعد بن عبادہؓ کے گھر کے۔ ان کے فرزند گرامی حضرت قیسؓ بھی اسی طرح ہدایائے طعام بھیجا کرتے تھے اور صاحب خیرات ومبرات تھے۔ نیز بلاذری، ۱/ ۲۶۷ ومابعد؛ ابن ہشام، ۱/ ۴۹۸-۴۹۹ وماقبل اور حضرت ابو ایوب انصاری وحضرت سعد بن عبادہ سے متعلق دوسری کتب سیرت وسوانح)

حضرت عائشہ کی باری پر ہدایائے طعام کی بارش

صحابہ کرامؓ رسولِ اکرم ﷺ کی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شیفتگی سے خوب واقف تھے اور اس کی خوب رعائت کرتے تھے۔ ان "رعایات" میں سے ایک یہ تھی کہ رسول اکرم ﷺ جس دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں قیام فرما ہوتے تھے اس دن کثرت سے صحابہ کے کھانوں کے ہدایا ان کے گھر میں آتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس دن دستر خوانوں پر خوانوں کی بارش ہو جاتی تھی۔ امام بخاریؒ کی حدیث ہے کہ صحابہ کرام حضرت عائشہ صدیقہؓ کے باری کے دن کا انتظار کیا کرتے تھے تاکہ اس دن اپنے ہدایا خدمت میں بھیج کر خوشنودئ رسول حاصل کریں: "ان الناس كانوا يتحرّون بهداياهم يوم عائشة يبتغون بها — او يبتغون بذلك — مرضاة رسول الله ﷺ"

(حدیث: ۲۵۷۴؛ اطراف حدیث: ۲۵۸۰، ۲۵۸۱، ۳۷۷۵؛ فتح الباری، ۵/ ۲۵۰-۲۵۳ ومابعد۔ اس حدیث کی راویہ خود صاحبۂ بیت حضرت عائشہؓ ہیں۔ اس لحاظ سے یہ حدیث بہت اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ دیگر روایات سیرت وحدیث سے بھی اس واقعہ کی کامل تصدیق اور سماجی رجحان کی تائید ہوتی ہے)

ایک خاص سماجی زاویۂ طعام

صحابہ کرامِ کے اس سماجی رویے نے ایک انتہائی دلچسپ صورتِ حال پیدا کردی جسے

خانگی جماعت بندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، بلکہ اسے خانگی چپقلش کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ "جماعت بندی ازواج" تو پہلے سے موجود، کارفرما اور کارگذار رہی تھی۔ اطرافِ حدیث: ۲۵۸۰ اور ۲۵۸۱ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے دو دھڑے تھے: ایک دھڑے میں حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت صفیہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہن تھیں۔ دوسرے دھڑے میں حضرت ام سلمہؓ اور دوسری بیویاں تھیں۔ اگر صراحت کے ساتھ نہیں ہے تاہم یہ مضمر حقیقت ہے کہ اول الذکر جماعت کی سربراہ حضرت عائشہؓ تھیں اور دوسری جماعتِ ازواج کی سرداری حضرت ام سلمہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت ام سلمہ والی جماعت میں بقول ابن حجر شامل ہیں: زینب بنت جحش اسدی، ام حبیبہ بنت ابی سفیان اموی، جویریہ خزاعیہ اور میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہن"۔

بہر حال مسلمان عام طور سے یہ جانتے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے خاص محبت و شیفتگی ہے لہٰذا ان میں سے کسی کو کوئی ہدیہ بھیجنا ہوتا تھا تو اسے روکے رکھتا اور جس دن رسولِ اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف فرما ہوتے اس دن صاحب ہدیہ اپنا ہدیہ خدمتِ گرامی میں بھیجا کرتا۔ حضرت ام سلمہؓ کے حزب نے حضرت ام المومنینؓ سے یہ درخواست کی کہ وہ رسول اکرم ﷺ سے اس باب میں بات کریں اور آپ ﷺ کے درِ دولت سے یہ فرمانِ عالی الیشوع/ جاری کرائیں کہ جس کو جو ہدیہ دینا ہو وہ رسول اکرم کے پاس بھیجا کریں خواہ آپ ﷺ کسی بھی زوجہ مطہرہ کے گھر میں سکونت پذیر ہوں (یعنی وہ حضرت عائشہؓ کے گھر جانے کی باری کا انتظار نہ کیا کریں)۔ حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ کو تمام دیگر ازواج کی خواہش پہونچائی اور جب آپ ﷺ ان کی باری پر ان کے گھر تشریف لائے تو بھی عرض کی مگر آپ ﷺ نے کچھ نہ ارشاد فرمایا۔ ازواجِ مطہرات کے اصرار پر حضرت ام سلمہؓ نے پھر عرض معروض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری کسی بیوی کے بستر میں وحی نہیں آئی سوائے عائشہ کے بستر ولباس میں لہٰذا مجھے عائشہ کے بارے میں تنگ نہ کیا کرو۔ بعد میں حضرت فاطمہؓ کو ازواجِ حزب نے بیچ میں ڈالا اور ان کے وفد کے ناکام ہونے کے بعد حضرت زینب بنت جحشؓ کو "قاصدِ احتجاج" بنا کر بھیجا اور انھوں نے خاصی سخت کلامی سے کام لیا تو حضرت عائشہؓ نے بھی اپنے جواب میں

ترکی بہ ترکی والا معاملہ رکھا اور حضرت زینبؓ کولا جواب کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ یہ سارا سوتیا چاہ کا منظر نامہ ملاحظہ فرماتے رہے اور خوش ہوتے رہے اور آخر حضرت عائشہؓ کے دنداں شکن اور حوصلہ شکن جواب پر تحسین فرماتے ہوئے ارشاد کیا کہ آخر وہ ابوبکر کی بیٹی ہے نا: ''انھا بنت ابی بکر''۔ امام بخاریؒ اور امام عروہ کے مطابق یہ سارا خانگی مجادلہ صرف صحابہ کرام کے ہدایائے خاص نے مچایا تھا جو حضرت عائشہ کے گھر میں قیام نبوی کے انتظار میں انھیں روکے رکھتے تھے:

''کان الناس یتحرون بھدایاھم یوم عائشۃ...''۔

(فتح الباری، ۵/۲۵۳-۲۵۷؛ ابن ہشام، ۲/۶۴۴؛ شبلی، ۲/۴۰۴-۴۰۹؛ معیشتِ نبوی۔ مدینہ منورہ میں ۱۷ و مابعد)

دودھ کے ہدایا

انصاری صحابہ کرام رسول اکرم ﷺ کے لیے عام کھانوں یا ٹھوس غذا پر مشتمل کھانوں کے علاوہ دودھ کے ہدایا بھی کثرت سے بھیجتے تھے۔ بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ ان کے پاس دودھاری اونٹنیاں (منائح) اور دوسرے دودھاری جانور/مویشی تھے اور ان کے دودھ کے ہدایا سے وہ ہماری تواضع کیا کرتے تھے: ''...أنہ قد کان لرسول اللہ ﷺ جیران من الانصار کانت لھم منائح، وکانوا یمنحون رسول اللہ ﷺ من البانھم فیسقینا''۔

(بخاری، حدیث: ۲۵۶۷؛ اطراف حدیث: ۶۴۵۸-۶۴۵۹؛ فتح الباری، ۵/۲۴۳-۲۴۶ و مابعد۔ بقول حافظ ابن حجرؒ منیحہ اگرچہ دودھاری اونٹنی کو کہتے ہیں لیکن وہ بکری کے لیے بھی مستعار لیا جاتا ہے اور اس سے مراد ہر قسم کے دودھاری مویشی ہیں)

کھجور و طعام کے ہدایا

ان صحابہ کرام کے ہاں سے کھانے پینے کی متعدد چیزیں آیا کرتی تھیں۔ ان میں کھجوروں کے تحفے مستقل طور سے آتے تھے، جن میں نئی اور پرانی دونوں شامل ہوتیں۔ صحابہ کرام میں سے مہاجرین کے گھروں سے کبھی طائف کے انگور بھی تحفے میں آتے تھے۔ اور عمدہ گرم پکا ہوا کھانا (طعام سخن) تو اکثر و بیشتر ہوتا تھا۔ ایک بار ایسا کھانا کھا کر شکرِ الٰہی ادا کیا کہ مدتوں کے بعد ایسا

کھانا نصیب ہوا تھا۔

(بخاری، کتاب الھبة وفضلھا، مسلم، کتاب الزھد والرقائق، ترمذی، ابواب صفة القیامة؛ ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب معیشة آل محمد؛ ابن سعد، ۳/۶۱۴؛ بلاذری، ۱/۲۶۷ وغیرہ)

ان انصاری اصحابؓ میں تو بہت سے بلکہ ان گنت لوگ شامل تھے مگر ان میں سے رسولِ اکرم ﷺ کے خاص پڑوسی تھے۔ ان مخیّر صحابہ کرام اور صاحبانِ الطاف میں بقول ابن سعدؒ حضرات سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ، عمارہ بن حزم اور ابوایوب انصاریؓ پیش پیش تھے کہ وہ آپ ﷺ کے سب سے قریبی پڑوسی تھے: "کان الانصار یکثرون الطاف رسول اللہ ﷺ سعد بن عبادة وسعدبن معاذ وعمارة بن حزم وابوایوب، وذلک لقرب جوارھم من رسول اللہ ﷺ" (فتح الباری، ۵/۲۵۴ بحوالہ طبقات النساء) لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دوسرے صحابہ کرام اور صحابیاتِ طاہرات اپنے ہدایائے طعام بھیجنے میں کوتاہ دستی کرتے تھے۔

تقریبات پر ہدایائے طعام

خاص کھانوں اور تقریبات ولیمہ وغیرہ کے کھانوں کے ضمن میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کی حضرت زینب بنت جحشؓ سے شادی کی صبح خاص کھانا بھیجا تھا۔ وہ ہدیہ عروس اور عروسی طعام بھی کہا جا سکتا ہے۔ ویسے وہ مسلسل ہدایائے طعام بھیجا کرتی تھیں۔ در اصل ان کے شوہر نامدار حضرت ابوطلحہ انصاریؓ بڑے مخیّر، بڑے صاحبِ دل اور بڑے عاشق نبوی تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ مالدار ترین انصار میں تھے۔

عام ہدایائے انصار

ان کے ہدایائے طعام ایک مسلسل عمل کا درجہ رکھتے ہیں اور اسی طرح بعض دوسرے انصار بھی اسی زمرہ میں شامل تھے جیسے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ، اور تو اور خواتینِ انصار بالعموم رسول اکرم ﷺ کے مختلف گھروں میں ہدایا بھیجا کرتی تھیں اور ان میں مختلف قسم کے کھانے شامل ہوا کرتے تھے:

-حضرت ام مالکؓ اکثر و بیشتر آپ ﷺ کے لیے گھی (سمن) کا ہدیہ بھیجا کرتی تھیں۔
(مسلم، کتاب الفضائل)

-حضرت ام عطیہ انصاریہؓ نے کئی بار بکری کا گوشت ہدیہ میں بھیجا۔

-ایک انصاری گھر سے رسول اکرم ﷺ کے لیے روٹی گوشت کا ہدیہ آیا۔ تناول فرمالیا اور کلی کر کے نماز کے لیے گئے۔

-حضرت عائشہؓ کے گھر میں حیس نامی کھانے پر مشتمل ہدیہ آیا تو اسے تناول فرمالیا۔ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک پڑوسی کے گھر سے گوشت آیا، ایک بار انگور کا ہدیہ آیا۔ اور ایک بار ہدیہ آیا تو حضرت حفصہ کے ساتھ انھوں نے تناول کر لیا حالانکہ روزہ سے تھیں۔ آپ ﷺ نے اس کی قضا کا روزہ رکھوایا۔

-حضرت ام سلیمؓ کے ہدیہ سمن کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ انھوں نے اپنی بکری کے دودھ سے گھی بنایا اور اس کی ایک کپی اپنی خادمہ حضرت زینبؓ کے ہاتھ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجی کہ آپ ﷺ اس سے شوربہ بنایا کریں (لعله یاتدم بها)۔ رسولِ اکرم ﷺ نے کپی سے گھی نکلوالیا اور حضرت زینب کو کپی واپس کردی۔ وہ گھر گئیں تو مالکہ موجود نہ تھیں۔ انھوں نے کپی ایک کھونٹی سے ٹانگ دی۔ حضرت ام سلیم آئیں تو دیکھا کہ کپی لٹکی ہوئی اور اس سے گھی ٹپک رہا ہے کیونکہ کپی پوری طرح اس سے بھری تھی۔ وہ خادمہ پر ناراض ہوئیں تو خادمہ نے ان کے حکم کی تعمیل کا قصہ سنایا مگر وہ نہ مانیں اور پھر دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں۔ حضرت ام سلیمؓ کے تعجب کو رسولِ اکرم ﷺ نے یہ کہہ کر دور فرمادیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیۂ خاص ہے۔

(اسد الغابہ، ۵/ ۴۷۱-۴۷۲؛ نیز بخاری، کتاب الهبة، باب قبول الهدية؛ ابن ہشام، ۲/ ۶۴۴؛ موطا امام مالک، کتاب الصيام، قضاء التطوع)

باندیوں کے ہدایائے طعام

کھانے کے ہدایا میں غالباً سب سے دلآویز اور دلکش اور اہم وہ کھانے ہوتے تھے جو غریب غرباءِ کے گھروں سے آتے تھے۔ بالخصوص بے آسرا و بے سہارا اور غریب و مسکین

باندیاں رسولِ اکرم ﷺ کے لیے کھانے کے ہدیے لے کر آتیں اور آپ ﷺ ان کو ضرور قبول فرماتے اور تناول فرماتے۔ ان میں سے متعدد باندیوں کو صدقہ میں گوشت اور دوسری چیزیں ملا کرتی تھیں لیکن وہ اپنے رسول مکرم و محبوب ﷺ کو اس طعامِ مجبوری میں بھی شریک کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ وہ ان کے لیے صدقہ ہوتا تھا لیکن وہ جب دوسروں کو اس میں سے دیتی تھیں تو وہ دوسروں کے لیے ہدیہ بن جاتا تھا۔

-رسولِ اکرم ﷺ کو اسی طرح حضرت بریرہؓ نے اپنے صدقہ کے گوشت میں کھانا پکا کر بھیجا تو آپ ﷺ نے ہدیہ قرار دے کر تناول فرمایا۔ یہ واقعہ غالباً بار بار پیش آیا تھا۔ اس لیے احادیث و روایات میں حضرت بریرہ کے صدقہ کے ہدیۂ نبوی بننے کا ذکر بار بار ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب الهبة، باب قبول الهدية ؛ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب قبول النبی ﷺ الهدية ورده الصدقة وغیرہ؛ موطا، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الخیار)

-حضرت ام عطیہؓ کے ہدیہ لحم کے بارے میں یہی آتا ہے کہ وہ صدقہ کا گوشت تھا مگر آپ ﷺ نے قبول فرمایا اور دلچسپی سے فرمایا کہ ''بکری اپنی صحیح جگہ پہونچ گئی'' (بخاری، کتاب الھبۃ وغیرہ مذکورہ بالا حوالے)

-حضرت ام داؤدؓ کی ایک باندی (مولاۃ) نے ہریسہ کا ہدیہ حضرت عائشہ کے گھر بھیجا تھا جسے بخوشی لے لیا گیا اگرچہ بعد میں اسے بلی کھا گئی لیکن وہ ایک مسئلہ بتا گئی کہ اس کا جھوٹا پاک ہے اور اس کے جھوٹے پانی سے وضو جائز ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الطهارۃ، باب سور الهرۃ)

-اور تو اور غریب و مسکین حضرت ابوہریرہؓ کو کہیں سے کھجوریں مل گئیں تو وہ آپ ﷺ کے پاس ہدیہ لائے اور دونوں نے مل کر کھائیں۔ (ترمذی، ابواب المناقب، مناقب ابی ہریرۃ)

-حضرت جویریہ ام المومنینؓ کے گھر میں ان کی باندی کے لیے گوشت کا صدقہ آیا اور باندی نے بطور ہدیہ خدمت گرامی میں پیش کیا اور آپ نے اسے قبول فرما کر تناول کیا۔

(مسلم، کتاب الزکوۃ، باب اباحة الهدية للنبی ﷺ ۔ دو روایاتِ ہم معنی)

باہمی ہدایائے طعام

ازواجِ مطہرات کے مکانات دو سے بڑھتے بڑھتے گیارہ تک پہونچ گئے اور ان میں

سے بعض کی تعداد کم بھی ہوگئی جیسے ام المساکین حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی وفات سے ان کا گھر خالی ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ گھٹتی بڑھتی تعدادِ مکانات کا قصہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں یہ صورت حال نہیں پیدا ہوئی کہ وہاں صرف ایک ہی زوجہ محترمہ رہیں۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدیؓ کے بعد صرف حضرت سودہ بنت خزیمہ مخزومیؓ نے ان کی جگہ اور ان کا گھر سنبھال لیا۔ مدینہ منورہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی اور دوسری ازواج طاہرات سے شادی کے بعد ان مکانات کی تعداد بڑھی اور بیک وقت نو دس مکانات ازواج رہے کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کا بھی ایک مکان تھا۔ ہدایائے طعام کا سلسلہ ازواجِ مطہرات کے درمیان بھی جاری ہوا۔ وہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں کھانا بھیجا کرتی تھیں اور ظاہر ہے کہ باری والے دن وہ کسی نہ کسی زوجۂ عالیہ کے گھر ہی پہونچتا تھا اور بعض اوقات سوتیا ڈاہ یا سوکن جلاپے کا اظہار بھی کرا جاتا تھا۔ غالباً یہ ازدواجی فطرت اور نسائی کشاکش کا مظاہرہ ''حریف جماعت'' کے گھروں سے ہدایا کے آنے کی بنا پر ہوتا تھا۔ کیونکہ حلیف جماعت میں شدید بہناپا تھا اور تعلقاتِ عامہ استوار تھے۔ حریف کی حرکتِ شائستہ بھی کبھی اندرون کے کسی ظالم جذبے کو باہر لے آتی تھی۔

اس سلسلے میں حضرت انس بن مالکؓ کی ایک حدیث بہت دلچسپ، نمائندہ، اہم اور دلآویز و دلکش ہے۔ رسول اکرم ﷺ اپنی کسی زوجہ مطہرہ کے گھر میں تھے۔ امہات المومنین میں سے ایک نے اپنے خادم کے ہاتھ کھانے کا ایک پیالہ خدمت اقدس میں بھیجا۔ باری والی ام المومنین کو غصہ آ گیا اور انھوں نے اپنا ہاتھ ایسا مارا کہ پیالہ گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے پیالہ اٹھا لیا اور کھانا اکٹھا کر کے اس میں ڈالا اور فرمایا: کھاؤ۔ کھانے سے فراغت تک رسولِ اکرم ﷺ نے خادم اور پیالے دونوں کو روکے رکھا۔ پھر صحیح پیالہ خادم کے حوالے کیا اور ٹوٹا ہوا روک لیا۔ اس واقعہ کے بعض اور نکات دوسری احادیث میں ملتے ہیں۔

(بخاری، کتاب المظالم، باب اذا کسر قصعة او شیئا لغیرہ؛ حدیث: ۲۴۸۱، طرف حدیث: ۵۲۲۵؛ فتح الباری، ۵/۱۵۴ وغیرہ)

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی تشریح و تفسیر میں کئی واقعات نقل کیے ہیں، ان کا ذکرِ مختصر ضروری ہے:

۱۔ حضرت زینب بنت جحشؓ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت گرامی میں حیس نامی کھانے پر مشتمل ایک بڑا پیالہ (جفنة) حضرت عائشہؓ کے گھر بھیجا کہ اس دن رسول اکرم ﷺ کی وہاں باری تھی۔ ابن حزم، المحلّٰی، بروایتِ انس۔

۲۔ حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہؓ رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے لیے ایک طباق (صحفة) میں کھانا لے کر آئیں۔ حضرت عائشہؓ ایک کپڑے کو خوب کس کر باندھے ہوئے تشریف لائیں اور ان کے پاس دوا یا مسالہ پیسنے کا پتھر (فھر) تھا جس سے انھوں نے طباق الٹ دیا (اس حدیث پر بحث محدثین وناقدین ہے جو روایت کی بنیاد پر ہے)۔ نسائی، بروایت حضرت ام سلمہؓ۔

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ کچھ صحابہ کرام تھے اور حضرت عائشہؓ ان کے لیے عجلت سے کھانا تیار کر رہی تھیں۔ اسی دوران حضرت ام سلمہؓ کے گھر سے گوشت روٹی کا ایک طباق آ گیا۔ راوی حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگوں نے ہاتھ بڑھائے اور کھانا کھالیا اور جب فارغ ہوئے تو حضرت عائشہؓ آئیں اور انھوں نے حضرت ام سلمہؓ کا طباق اٹھایا اور اسے توڑ ڈالا۔ طبرانی، الاوسط بروایت حضرت انسؓ۔

۴۔ حضرت عائشہؓ کے گھر میں رسولِ اکرم ﷺ بعض اصحابِ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے اور کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی دوران راوی حضرت عمران بن خالد کے خیال کے مطابق حضرت حفصہؓ ایک طباق (صحفہ) لائیں جس میں ثرید تھی اور اس کو رکھا ہی تھا کہ حضرت عائشہؓ نکلیں، اور یہ حجاب سے قبل کا واقعہ ہے، انھوں نے ہاتھ مار کر طباق توڑ دیا۔ دار قطنیؒ۔ حافظ ابن حجرؒ کا اس پر یہ تبصرہ ہے کہ راوی عمران کا خیال کہ وہ حضرت حفصہ تھیں صحیح نہیں بلکہ وہ حضرت ام سلمہ تھیں جیسا کہ اوپر گذر چکا۔ مگر حافظ موصوف کو اعتراف ہے کہ حضرت حفصہؓ کے ساتھ بھی یہ واقعہ/قصہ پیش آیا تھا مگر وہ دوسرا ہے۔

۵۔ حضرت حفصہؓ کا واقعہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنے اصحاب کرام کے ساتھ تھے۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ان کے لیے میں نے کھانا بنایا اور حضرت حفصہؓ نے بھی بنایا اور وہ مجھ پر سبقت لے گئیں۔ میں نے جاریہ (باندی/بچی) سے کہا کہ تو جا اور ان کا پیالہ اوندھا دے،

اس بچی نے پیالہ اوندھایا تو وہ ٹوٹ گیا اور کھانا بکھر گیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے کھانے کو چمڑے کی ایک چادر پر جمع کیا اور پھر سب نے کھایا۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے میرا پیالہ حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور فرمایا: ''اپنے برتن کی جگہ یہ برتن قبول کرو''۔ ابن ماجہ وابن ابی شیبہ۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس قصہ کو دوسرا اور صحیح اس لیے قرار دیا ہے کہ اول تو اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، دوسرے اس واقعہ میں بچی یا باندی نے پیالہ توڑا تھا جب کہ دوسرے واقعہ میں خود حضرت عائشہؓ کے پیالہ/طباق توڑنے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

- حضرت صفیہ بنت حی قرظیہؓ کے بارے میں ایک اور واقعہ ہے اور وہ بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے۔ حضرت صفیہؓ جیسی کھانے پکانے والی کوئی دوسری عورت میں نے نہیں رکھی۔ انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے لیے ایک برتن میں کھانا بھیجا، مجھے اپنے نفس پر قابو نہیں رہا اور میں نے وہ برتن توڑ دیا۔ پھر میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اس کا کفارہ کیا ہے؟ فرمایا: ''ان کے برتن جیسا برتن اور کھانے کی طرح کھانا''۔ ابوداؤد، نسائی بروایتِ حضرت عائشہؓ۔

- حافظ ابن حجرؒ نے بعض اور ان جیسے قصوں کی طرف اشارہ کیا ہے مگر ان کو بیان نہیں کیا۔ اصل حدیثِ بخاری کی شرح میں بعض دوسری روایات سے بعض جزئیات بھی نقل کی ہیں۔ مثلاً ابن علیہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ پیالہ ٹوٹ گیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے اس کے ٹکڑے جمع کر کے ان کو دبا کر صحیح کیا اور اسی میں کھانا اکٹھا کیا اور فرمایا: تمھاری ماں کو غیرت آ گئی: ''غارت امکم''۔ امام احمد کی روایت میں پیالے کے دو ٹکڑے ہونے کا ذکر ہے اور ابوداؤد ونسائی کی ایک روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ بعض میں ہے کہ کئی ٹکڑے ہو گئے تھے۔ حافظ موصوف نے پھر مختلف ائمہ وفقہاء کے حوالے سے فقہی بحث کی ہے اور امام شافعی وغیرہ کے بعض افکار پر نقد بھی کیا ہے۔ (۱۵٦/۵)

بہر حال ان تمام روایات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے سوتیا چاہ کے کئی واقعات پیش آئے تھے جن میں کلیدی کردار حضرت عائشہؓ کا تھا کہ واقعاتِ جوش انگیز ان کے گھر آنگن میں پیش آئے تھے اور وہ اپنے ہیجان پر قابو نہیں رکھ سکی تھیں۔ اس سے قطعِ نظر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے مختلف امہات المومنین اپنے گھروں سے کھانے پکا کر آپ ﷺ کے

باری والے گھر میں بھیجا کرتی تھیں۔ ان ازواجِ مطہرات میں حضرت حفصہ، حضرت زینب، حضرت ام سلمہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہن کے باقاعدہ اسماءِ گرامی مذکور ہیں۔ بعد کے رواۃ کرام میں سے جناب عمران بن خالد نے کم از کم اس واقعہ کو حجاب سے قبل قرار دینے کی کوشش کی ہے جو تکلف وتعمقِ بیجا کے سوا کچھ نہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے اصحاب کرام گھروں میں آتے جاتے تھے اور حجاب کے احکام کے بعد بھی اور حضرت عائشہؓ تو بعد میں بھی صحابہ کرام کے علاوہ بعض تابعین کے سامنے بھی آتی رہی تھیں۔ ان میں سے ایک حضرت ایمن ؒ بھی تھے جنھوں نے حضرت عائشہ کی قطری قمیص دیکھی تھی اور ان کے حکم پر ان کی باندی کا لباس بھی ملاحظہ کیا تھا۔ (حدیث: ۲۶۲۸؛ فتح الباری، ۵/ ۲۹۷؛ نیز ملاحظہ کتاب خاکسار خواتین عہد پر)

دورانِ سفر ہدایائے طعام

اپنی سنتِ مبارکہ اور طریق معلّٰی کے مطابق رسول اکرم ﷺ دورانِ سفر بھی کھانے پینے کے ہدیے بخوشی قبول فرما لیتے تھے۔ اس قبولیتِ طعام میں خاطرِ صحابہ اور دلداریٔ عطا کنندہ کی رعائت تو مقصود ہوتی ہی تھی متعدد اسلامی احکام وآداب کی تعلیم بھی دینی مطلوب ہوتی تھی۔ ان ہدایائے طعام کا ذکر اسی خاص وجہ سے الگ سے کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا اس کے صرف بعض واقعات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ ایک سفرِ حج کے دوران صحابی جلیل حضرت انس بن مالکؓ نے ایک خرگوش شکار کیا۔ اس کو لے کر اپنے مربی والد حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے پاس لائے اور انھوں نے اسے ذبح کر کے اس کے گوشت کا ہدیہ حضرت انس کے ہاتھ خدمتِ اقدس میں بھیجا اور آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ (بخاری، حدیث: ۲۵۷۲؛ اطراف حدیث: ۵۴۸۹-۵۵۳۵؛ فتح الباری، ۵/ ۲۴۹-۲۵۰ ومابعد)

۲۔ اسی سفرِ حج کا واقعہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو آپ ﷺ کی چچی حضرت ام الفضل لبابہ کبریٰؓ، زوجۂ حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی، نے دودھ کا ہدیہ بھیجا اور آپ ﷺ نے اسے قبول فرما کے نوش کر لیا۔ اس کا ایک دینی پس منظر یہ تھا کہ وہ عرفہ کا دن تھا اور صحابہ کرام میں آپ ﷺ کے روزہ دار ہونے نہ ہونے کے بارے میں مباحثہ ہو گیا تھا۔ حضرت ام الفضلؓ کے ہدیہ

نے مسئلہ طے کر دیا کہ آپ ﷺ اس دن روزے سے نہ تھے۔

(موطا، کتاب الحج، باب صیام یوم عرفة؛ واقدی، ۱۱۰۴)

۳۔ ایک عمرہ کے سفر کے دوران رسولِ اکرم ﷺ مُحرم تھے یعنی احرام باندھے ہوئے تھے۔ ایک صحابی مکرم نے گوشت کا ہدیہ نذر کیا، قبول فرمایا اور تناول کیا۔ حضرت ابوقتادہؓ نے یہ شکار کیا تھا اور وہ بحالت احرام نہیں تھے اس لیے ان کا شکار کرنا جائز تھا۔

(اسد الغابہ، ۲/ ۲۱۹؛ بخاری، کتاب الذبائح و الصید، باب ماجاء فی التصید؛ حدیث: ۵۴۹۰-۵۴۹۱؛ فتح الباری، ۹/ ۵۹۷ نیز مابعد اور دوسری احادیث)

۴۔ ایک اور صحابی نے دورانِ سفرِ عمرہ ایک مویشی/ جانور کا شکار کیا اور اس کا گوشت ہدیہ کیا۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا مگر دوسرے صحابی حضرت صعب بن جثامہ سلمیؓ کے حمارِ وحشی کا گوشت نہیں قبول فرمایا کہ اس کا کھانا جائز نہیں سمجھا۔ (فتح الباری، ۵/ ۲۵۰)

۵۔ غزوہ/ عمرہ حدیبیہ کے سفر کے دوران خدمت نبوی میں کئی قسم کے کھانے پیش کیے گئے تھے۔ (۱) ان میں سے ایک معیش نامی کھانا تھا جس میں روٹی ہوتی تھی اور بعض اور چیزیں بھی۔ لغوی معنی تو گذارے کا کھانا ہے۔ (۲) عتر، جو نہایہ کے مطابق، ایک نبات ہوتی ہے اور جب وہ لمبی ہو جاتی ہے اور اس کو جڑ سے کاٹا جاتا ہے تو اس میں دودھ جیسا مادہ نکلتا ہے اور (۳) اضغابیس جو اصل میں چھوٹی ککڑی (صغار القثاء) ہوتی ہے۔ دونوں موخر الذکر چیزیں آپ ﷺ کو پسند آئیں اور آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کو بھی کھلائیں۔ (واقدی، ۵۷۷)

غیر مسلموں کے ہدایائے طعام

رحمتِ عالم ﷺ کی ایک دلنواز سنت اور ایک دل جیتنے والا طریقہ یہ بھی تھا کہ سب سے حسنِ اخلاق وسلوک کا معاملہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ سب کے لیے، سارے جہانوں کے واسطے اور ان میں بسنے والے سارے انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ جس طرح آپ ﷺ اہل اسلام وصاحبانِ ایمان کے رسولِ مکرم تھے اسی طرح آپ ﷺ غیر مسلموں، یہودیوں اور نصرانیوں کے لیے بھی پیغمبر اعظم تھے۔ ان ہی اسبابِ عظمت اور

عناصرِ جلالت کے سبب آپ ﷺ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے محبت بھرے، مخلصانہ ہدایا بھی قبول فرما لیتے تھے۔ بس ان کے لیے شرط یہ تھی کہ وہ ناجائز و حرام اشیاء نہ ہوں، بتوں کے چڑھاوے نہ ہوں اور شرک و نجاست سے پاک رسولِ اکرم ﷺ کے لائق ہوں۔

مکی دور میں رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے بہت سے مشرک عزیزوں، دوستوں اور اہلِ قرابت و قربت کے کھانے اور ان کے ہدیے قبول کیے تھے۔ ان میں چچا ابو طالب ہاشمی سرِ فہرست تھے اور دوسرے بنو ہاشم اور قریش کے اکابر بھی شامل تھے۔ مشہور دشمن اسلام ابی بن خلف جمحی کی دعوت کھائی تھی۔ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ عبشمی کے ہدیہ انگور کو شرف قبول بخشا تھا۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے متعدد مشرکوں اور غیر مسلموں کے ہدایائے طعام تھے۔

مدینہ منورہ میں بھی رسولِ اکرم ﷺ کی رحمت للعالمینی جاری اور غیر مسلموں کے ہدایائے طعام کے قبول ہونے کے لیے دروازے کھلے رہے۔ اس دور کا سب سے اہم، ہنگامہ خیز، ایمان و جان طلب ہدیہ طعام ایک یہودی عورت مسماۃ زینب کا تھا جو اس نے غزوۂ خیبر کے دوران پیش کیا تھا۔ اس نے زہر آلود بکری کا گوشت بطور ہدیہ پیش کیا، رحمت عالم ﷺ نے قبول فرمایا، دستر خوان پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک صحابی حضرت بشر بن براء خزرجیؓ بھی تشریف لے آئے اور دعوتِ نبوی پر کھانے میں شریک ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وحیِ الٰہی نے کھانے کے زہر آلود ہونے سے باخبر کر دیا۔ آپ ﷺ جب تک حضرت بشرؓ کو روکیں تب تک وہ کئی لقمے کھا چکے تھے اور زہر نے ان کا کام کر دیا۔ رحمت عالم ﷺ نے اس یہودیہ کو قتل نہیں فرمایا۔ امام بخاریؒ نے اس واقعۂ فاجعہ کو بڑے معنی خیز باب کے تحت دوسری احادیث و واقعات کے ساتھ بیان کیا ہے جو مشرکوں کے ہدیے کے جواز کو بتاتا ہے۔

(بخاری، باب قبول الهدية من المشركين ؛ حديث: ۲۶۱۷؛ فتح الباری، ۵/ ۲۸۶؛ حافظ موصوف نے مشرکوں کے ہدایا قبول نہ کرنے کی توجیہ کی ہے؛ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری، ۷/ ۶۲۲-۶۲۳ جس میں روایات کا اختلاف ملتا ہے؛ "وحی حدیث" میں وحی الٰہی کا خاص ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض ہدایائے طعام مشرکوں سے قبول کیے تھے۔ ایک خیال ہے کہ حضرت صفوان بن امیہؓ کے قبولِ اسلام سے قبل آپ ﷺ نے ان کا ہدیہ طعام قبول کیا تھا جس میں دودھ، انڈے، پیوسی/کھیس شامل تھے: "صفوان بن امية بعثه بلبن ولباء وضغابيس الى النبی ﷺ.." ترمذی، ابواب الاستيذان والآداب؛ باب التسليم قبل الاستئذان)

-حضرت نعیم بن مسعود اشجعیؓ بنو قریظہ کے یہود کے ساتھ کھجوریں کھاتے تھے: کان ...یاکل مع یهود بنی قریظة تمرا (ابن سعد،۲/ ۲۷۸ومابعد)

غزوات نبوی کے دوران بہت سے ہدایائے طعام غیر مسلموں نے خدمت نبوی میں پیش کیے اور آپ ﷺ نے قبول فرمائے اور بسا اوقات ان ہدایائے غیر مسلمین کے بارے میں بعض شکوک وشبہات کا اظہار بھی کیا گیا مگر آپ ﷺ نے ان کی اسلامی صورت گری فرمائی۔

-غزوہ تبوک کے دوران ایک ''حمیت'' نامی کھانا پیش کیا گیا جس میں کھجور، گھی اور پنیر کو ملایا گیا تھا۔ وہ ایک طرح کا ''حیس'' تھا جیسا کہ حضرت صفیہؓ کی شادی کے ولیمہ میں رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو کھلایا تھا: "... حمیت... من تمر معجون بالسمن والاقط."

(واقدی،۱۰۱۸؛ صحاح جوہری میں اسے الزق یا السمن کہا ہے)

-تبوک میں ایک عیسائی/ غیر مسلم سے رسولِ اکرم ﷺ نے اسی بحینہ حمیت نامی کھانا قبول فرمایا۔ بعض صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ کھانا ایرانی/ فارس تیار کرتے ہیں اور ہمیں خدشہ ہے کہ اس میں مردار کی آمیزش نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں چھری رکھو یعنی اسے اس طرح ذبح کرلو اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اسے کھالو: "اتی برسول الله بحینة بتبوک... ان هذا طعام تصنعه فارس، وانا نخشی ان یکون فیه میتة. فقال رسول الله ﷺ: ضعوا فیه السکین واذکروا اسم الله علیه..." (واقدی،۱۰۱۹)

-اسی غزوہ کے دوران ایک یہودی کا پیش کردہ ہریس/ ہریسہ نامی کھانا اور اس کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کا ذکر مختلف روایات سیرت وحدیث میں آتا ہے۔ کھانے کی اقسام میں اس کی تعریف وتفصیل گذر چکی ہے۔ (واقدی،۱۰۰۶)

نبوی ہدایائے طعام

رسولِ اکرم ﷺ کی ایک مستقل ومتواتر سنتِ ہدایا تھی۔ آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں جو ہدیہ پیش کیا جاتا آپ ﷺ ہمیشہ اس سے بڑھ کر، عمدہ تر، بہتر ہدیہ عطا فرماتے تھے۔ متعدد احادیث وروایاتِ سیرت سے اور ان کے واضح بیانات سے یہ سنت اجاگر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے

کہ ہدایائے طعام کے بارے میں بھی رسولِ اکرم ﷺ کی یہی سنت متواترہ پوری زندگی میں جاری رہی تھی۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کا ایک اور طریقہ آپ ﷺ کی تعلیمات کے عملی اظہار کے روپ میں نظر آتا ہے۔ کہیں سے ہدیہ طعام آئے یا نہ آئے آپ ﷺ اپنے گھر میں پکنے والے یا تیار ہونے والے کھانے میں عزیزوں، قریبوں اور پڑوسیوں کو ضرور شامل کرتے تھے اور خاص مواقع پر جب عمدہ اور بہتر کھانا تیار ہوتا تو چن چن کر دوسروں کو کھانے کے ہدایا سے نوازتے تھے۔

(بخاری، کتاب الھبة، باب المکافاة فی الھبة ،حدیث: ۲۵۸۵:... کان رسول اللہ ﷺ یقبل الھدیة ویثیب علیھا ...؛ فتح الباری، ۲۵۹/۵؛ نیز دیگر کتب حدیث اور ان کے ابواب ہدایا؛ کتب سیرت بالخصوص مختصراتِ سیرت میں اخلاق نبوی کے ابواب وغیرہ)

مکی دور میں رسولِ اکرم ﷺ کا ایک مستقل طریقِ مدارات یہ تھا کہ جب بھی بکری ذبح فرماتے یا کوئی دوسرا عمدہ کھانا تیار کراتے تو حضرت خدیجہؓ کی رشتہ دار خواتین اور سہیلیوں کے ہاں ضرور بھیجتے تھے۔ ام المومنینؓ کی حیاتِ طیبہ میں یہ صلہ رحمی کے تقاضے سے تھا اور ان کی وفات کے بعد اس میں دردِ الفت کی بھی آمیزش ہوگئی تھی۔ احادیثِ نبوی میں بہت وضاحت سے اس درد واندوہ کی لہریں سنی اور دیکھی جاسکتی ہیں۔ امام بخاریؒ کی ایک حدیث کا ایک حصۂ دلنشیں ہے:

"... وان کان لیذبح الشاة فیھدی فی خلائلھا منھا مایسعھن"۔ حدیث: ۳۸۱۶

(بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی ﷺ خدیجة وفضلھا رضی اللہ عنھا ؛ اطراف حدیث: ۳۸۱۷، ۳۸۱۸، ۵۲۲۹، ۶۰۰۴، ۷۴۸۴؛ فتح الباری، ۱۶۷/۷ وما بعد؛ حدیث بخاری: ۵۴۹۹ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت زید بن عمرو بن نفیلؓ کو اپنے دسترخوان کے طعامِ لحم میں شرکت کی دعوت قبل بعثت دی تھی؛ (فتح الباری، ۷۷۹/۹)

حضرت خدیجہؓ کی عزیز و قریب خواتین کو ہدایائے طعام سے نوازنے کا سلسلہ صرف مکی دور میں ہی جاری نہیں رہا بلکہ وہ مدنی دور میں بھی قائم رہا۔ دراصل رسولِ اکرم ﷺ صلہ رحمی اور قرابت و قربت کے تعلقات و روابط کی رعائت فرمانے میں سب کے امامِ عالی مقام تھے۔ قدیم تعلقات کے نباہنے میں بھی آپ ﷺ بے مثال و بے نظیر تھے۔ روایات کے مطابق اپنی دو رضاعوں ماؤں- جناب ثویبہ اور حضرت حلیمہ سعدیہ- کے ساتھ آپ ﷺ کے حسنِ سلوک میں

ہدایا کا بھی ذکر آتا ہے۔ اور دوسرے قیمتی ہدایا کے علاوہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا گھرانہ ان کی خاطر مدارات بھی کرتا تھا اور کھانے پینے کی اشیاء لیے مالا مال کرتا تھا۔ اور یہ صرف مکی اور مدنی دور میں قدیم تعلقات والوں سے ارتباط کا معاملہ نہ تھا بلکہ تمام دوسرے لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا یہی انداز تھا۔ مختلف مقامات اور مختلف اوقات پر آپ ﷺ نے اپنے اہل قرابت وقربت کو ہدایائے طعام سے نوازا تھا۔ اس کی صرف چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

- حضرت مقداد بن عمروؓ اور ان کے دو بے سہارا اور بھوکے رفیقوں کے لیے آپ ﷺ نے تین اونٹنیوں کا دودھ مخصوص کر دیا تھا اور ان تینوں کی شکم پری کا یہی انتظام تھا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مستقل انتظام تھا جو ان کے لیے مدتوں جاری رہا تھا۔

(مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف وفضل ایثاره؛ ترمذی، ابواب الاستیئذان، باب کیف السلام..)

- دو انصاری صحابی حضرت عباد بن بشر اور حضرت اسید بن حضیرؓ حاضرِ خدمت ہوئے اور کسی دینی مسئلہ پر بحث کی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بحث رسولِ اکرم ﷺ کے لیے تکدر کا باعث بنی ہے۔ وہ مجلس نبوی سے شکستہ خاطر اٹھے اور تھوڑی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ان کے پاس رسولِ اکرم ﷺ کا ایک قاصد پہونچا اور ان کو دودھ کا پیالہ پیش کیا اور بتایا کہ یہ ہدیہ نبوی ہے، اس سے انھوں نے جانا کہ آپ ﷺ ناراض نہ تھے۔

(ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورة البقرة؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب فی مؤاكلة الحائض ومجامعتها)

- حضرت ابو الطفیلؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو جعرانہ میں گوشت تقسیم کرتے دیکھا: "رأيت النبي ﷺ يقسم لحما بالجعرانة" (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی برالوالدین، حدیث: ۵۱۴۴-۵۱۴۵)۔ ان میں حضرت حلیمہؓ اور ان کے شوہر وفرزند کے آنے کا ذکر ہے، اگرچہ نام کسی کا نہیں مذکور ہے۔ شارحین نے ان سے انہیں بزرگوں کو مراد لیا ہے۔

- اور یہ صرف ایک جعرانہ کے موقعہ پر رسول اکرم ﷺ کے گوشت وغیرہ تقسیم کرنے کا ایک مخصوص واقعہ نہیں ہے۔ متعدد ومتواتر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ حج وعمرے

کے دوران قربانی فرماتے یا عقیقہ وولیمہ میں بکری وغیرہ ذبح کرتے یا عام کھانے کے لیے ذبح کرتے تھے تو صحابہ کرام بالخصوص اقرباء اور پڑوسیوں اور دوسرے اہل قربت وقرابت کو ہدایا ضرور بھیجتے تھے۔ ان روایات واحادیث کا ذکر کیا گیا ہے پہلے بھی اور دوسرے عناوین سے تمام کتب حدیث میں بہت آتا ہے۔

-وفود میں آنے والے صحابہ کرام اور دوسرے لوگوں (غیر مسلموں) کو بھی ہدایائے طعام سے نوازتے تھے۔ ان میں کھانے یعنی گوشت روٹی کے کھانے بھی ہوتے تھے جیسے رمضان میں سحور وافطار کے حوالے سے ثقفی وفد کو نوازا تھا یا دوسرے ہدایائے نُقل ہوتے تھے جیسے کھجور کا اتنا بڑا ہدیہ حضرت حکم بن حزن کلفی اور سات یا نو اصحاب کو دیا تھا کہ وہ کئی دن تک اس پر گذارا کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوران ان کو عام کھانے بھی بھیجے تھے۔

(ابوداؤد، حدیث: ۱۰۹۶، کتاب الطهارة، باب الرجل يخطب علىٰ قوس ،اسی طرح حدیث: ۱۶۲۷ میں ہے کہ بنو اسد کے لوگوں کو آپ ﷺ نے جو یا کھجور کے ہدیے عطا فرمائے تھے؛ ایسی روایات واحادیث بہت ہیں)

غیر مسلموں کو نبوی ہدایائے طعام

رحمتِ عالم ﷺ نے صرف اپنے مسلم اہل قرابت وقربت کو اپنے نبوی ہدایائے طعام سے نہیں نوازا تھا بلکہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں اور دوسرے اہلِ قرابت وقربت کی خاطر داری کے لیے ان کو وقتاً فوقتاً کھانوں کے ہدیے بھیجا کرتے تھے۔ یہ عام سنت نبوی تھی۔ غیر مسلموں کو دوسرے ہدایا کا باب تو بہت سی تفصیلات رکھتا ہے اور وہ خاص ایک دفتر و کتابِ تحقیق کا موضوع بھی ہے مگر کھانوں کے ہدایا کی روایات نسبتاً کم ہیں تاہم عنقا نہیں۔

-پڑوسی کے حقوق کے ضمن میں رسولِ اکرم ﷺ مسلم وغیر مسلم کا فرق نہیں فرماتے تھے اور بطور پڑوسی ان کے بھی وہی حقوقِ مدارات تسلیم کرتے تھے اور ان کی رعائت کرنے کی مسلم صحابہ وصحابیات کو تاکید فرماتے تھے۔ اسی طرح غیر مسلم اقرباء واعزہ کی صلہ رحمی کے حقوق کی رعائت وتبلیغ فرماتے تھے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کی والدہ ماجدہ مدت تک غیر مسلم رہیں اور رسول اکرم ﷺ نے حضرت اسماء کو ان کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ صلہ رحمی

کرنے کا حکم دیا۔ اور صرف حضرت اسماء کا معاملہ نہیں دوسرے صحابہ کے لیے بھی یہی حکم تھا۔ خود رسولِ اکرم ﷺ کی سنتِ متواترہ یہی تھی کہ وہ اپنے غیر مسلم اہل قرابت وقربت کے ساتھ ہمیشہ فیاضانہ نبوی سلوک فرماتے تھے۔

-ترمذی اور بعض دوسری کتبِ حدیث وسیرت کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنے ایک یہودی پڑوسی کو گوشت کا ہدیہ برابر بھیجا کرتے تھے۔ یہ صرف ایک بار کا واقعہ نہیں ہے۔ اپنے اہل خاندان کو بھی یہی ہدایت فرماتے تھے کہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کا خیال رکھیں۔

(ترمذی، ابواب البر والصلة)

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک بار ایک بکری آپ ﷺ کے اہل میں ذبح کی گئی اور آپ ﷺ نے اس کا گوشت یہودی پڑوسی کے گھر ہدایت دے کر بھجوایا تھا۔

اجماعی طعامِ خیر

عرب پس منظر

عرب جود وسخاوت کا ایک خوبصورت، دلکش اور قابلِ تقلید اظہار کھانا کھلانے میں ہوتا تھا۔ یہ عام کھانا کھلانا یا مشروب پلانا نہیں تھا اور نہ ہی اس کا تعلق زائروں، مہمانوں کی ضیافت ومیزبانی سے تھا۔ اس کا تعلق وسلسلہ باہمی دعوتوں اور تقریبات پر کھانا کھلانے سے بھی نہیں تھا، بلکہ وہ اجماعی طعامِ خیر کہا جاسکتا ہے۔ اس میں غرباء ومساکین کو کھلانے اور بھوکوں کا پیٹ بھرنے کا خیراتی کھانا بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ طبقہ ومعاشرے، واردین وصادرین، زائرین وحجاج کی عام وخاص ضیافتوں کے علاوہ باشندگانِ شہر کی آسودگی کا ایک اجماعی مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ اس کا امکان ہے کہ کبھی اس اجماعی کھانے کھلانے کے اظہار میں دکھاوا بھی کام کر جاتا ہو لیکن عام طور سے انسانی ہمدردی، قومی محبت، ملی مواسات اور دوسرے جذباتِ خیر واحسان کی کارفرمائی ہوتی تھی۔

عربی شاعری میں اس کا ایک اظہار استعارے کی شکل میں ہوتا تھا کہ کس کے خیمہ یا گھر کے سامنے زیادہ بڑا راکھ کا ڈھیر لگتا ہے۔ اس کی بڑائی سے اس صاحبِ خیمہ یا مالکِ مکان کے

کھانا کھلانے کی کمیت ناپی جاتی تھی۔ یہ قبائلی اور قومی افتخار ضرور تھا مگر اسی کے ساتھ خالص جودوسخاوت اور اس کے تحت فیاضی و ہمدردی کا مظاہرہ بھی تھا۔ اسی قبائلی، قومی اور ملی سخاوت کا ایک اظہار ابوجہل (ہشام بن عمرو) مخزومی نے اپنے ناقدانہ تبصرہ میں کیا تھا: ''بنوعبد مناف اور ہم (بنومخزوم) نے برابر برابر کھلایا، ساتھ ساتھ لوگوں کو سواریاں عطا کیں اور دوسرے فیاضانہ احسانات ومبرات کیے اور جب دونوں کے گھوڑے برابر برابر دوڑنے لگے تو بنوعبد مناف نے دعویٰ کردیا کہ ہم میں ایک نبی مبعوث ہوگیا ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے مگر ہم ان کے اس دعوے کو بھی نہیں تسلیم کریں گے''۔ یہ اسلام اور رسولِ برحق کی مخالفت اور قبائلی عداوت کا اظہار ضرور ہے مگر اسی میں ان کے جودوسخا کی ملی خدمات کا ثبوت بھی موجود ہے۔ اور یہ صرف ایک دو خاندانوں کا معاملہ نہ تھا، قریش اور مکہ مکرمہ کے دوسرے عرب خاندانوں کا وطیرہ تھا۔ اور عرب کے دوسرے قبائل وبطون اور ان کے خاندان بھی اس جودوفیاضی اور سخاوت کے اظہار میں کسی سے ہیٹے نہ تھے۔

-جدامجد نبوی جناب ہاشم بن عبدمناف کے طعامِ خیر کا واقعہ، جو ان کے نام کی وجہ تسمیہ بنا، بہت مشہور ہے۔ اس میں کھانے کی تفصیل یہ ملتی ہے کہ قریش مکہ کو قحط کے زمانے میں جناب ہاشم نے روٹی اور سالن/گوشت کا کھانا کھلایا تھا، شام میں انہیں قحط کی اطلاع ملی تو ایک روایت کے مطابق انھوں نے وہیں بہت سی روٹیاں پکوائیں اور ان کو چنگیریوں میں ایک اونٹ پر لاد کر مکہ لائے، پھر ان روٹیوں کو چورا چورا کرکے ان کی ثرید بنائی اور اس اونٹ کو نحر/ذبح کرکے اس کا گوشت پکوایا اور پھر بہت سی ہانڈیوں سے بڑے بڑے طباقوں میں ان کا گوشت اونڈھا دیا اور اہل مکہ کو شادکام کیا: ''... فامر بخبز كثير فخبز له، فحمله في الغرائر على الابل حتى وافى مكة فهشم ذلك الخبز، يعني كسره وثرده ونحر تلك الابل ثم امر الطهاة فطبخوا، ثم كفأ القدور على الجفان فاشبع اهل مكة...'' (ابن سعد، ۱/۷۵-۷۶)

-ابوجہل ابن ہشام مخزومی اور اس کے بھائی حارث بن ہشام مخزومی دونوں جاہلی اور اسلامی دور کے فیاضوں میں شامل تھے۔ حارث بن ہشام مخزومی کے کھانا کھلانے اور مہمانوں کی ضیافت کرنے کا واقعہ ذرا آگے آتا ہے کہ وہ مدنی دور کا ہے۔ ابوجہل مخزومی کی ضیافت کا واقعہ

دو سلمی بھائیوں کا بیان کردہ ہے اور غالباً مکی دور کا ہے اور ممکن ہے کہ جاہلی دور کا ہو۔ دونوں مکہ عمرہ کرنے گئے تو وہاں نہ مہمان نوازی ملی اور نہ خرید وفروخت کے ذریعہ کھانا دانہ۔ بہرحال اسی دوران ایک قوم کو جاتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک گھر میں کھانا کھانے جارہے ہیں، ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو ایک شخص کو سیاہ حلہ میں ملبوس ایک تخت پر رونق افروز پایا اور اس کے سامنے بڑے بڑے طباق تھے جو روٹی گوشت سے بھرے تھے "... واذا جفان مملوءة خبزا ولحما..." بہرحال ان دونوں کو خوب سیر ہو کر کھانا کھلایا اور میزبان نے بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ (کتاب المحبر، ۱۴۰)

بغدادی نے ان کے علاوہ جاہلی فیاضوں میں قبیلہ بہ قبیلہ اشخاص کا ذکر کیا ہے: بنو جمح کے خلف بن وہب اور اس کے دو کا فرزند ابی وامیہ، صفوان بن امیہ کے علاوہ متعدد دوسرے شامل تھے، ان کے علاوہ بدوی/ غیر قریشی قبائل کے لوگ بھی تھے جیسے حاتم طائی وغیرہ۔

(کتاب المحبر، ۱۴۱-۱۴۶)

اسلامی فیاضوں میں حضرت عبید اللہ بن عباسؓ بعد کے دور کے ہیں۔ عہد نبوی کے جواد تھے: سعید بن العاص امویؓ جو ہر دن ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتے: "وكان ينحر كل يوم جزورا يطعمها الناس"، حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی، جو حضرت طلحۃ الخیر کہلاتے تھے، اور متعدد دوسرے۔ ان کے بارے میں ایک عمدہ تبصرہ یہ ملتا ہے کہ ہر جواد کھانا کھلانے والا تھا: "كل جواد مطعم للطعام..." (ایضا، ۱۴۶-۱۵۶)

متعدد افراد نے بھی انفرادی طور سے جود وسخاوت کا ایسا بے مثال مظاہرہ کیا تھا کہ اس کے پیکر سمجھے جانے لگے۔ شمالی عرب کے قبیلہ بنو طے کے سردار اور علاقے کے حکمراں حاتم طائی عرب تاریخ و معاشرہ میں ایسے ہی پیکرِ جود وسخا تھے۔ ان کی شہرت و نیک نامی کے اسباب دوسرے ہیں لیکن دوسرے فیاضوں اور سخیوں سے عرب کی سرزمین خالی نہ تھی۔ اس گمنام و بدّو بوڑھیا کی فیاضی وسخاوت حاتم طائی کی فیاضی سے کچھ کم نہ تھی جس نے اپنے ایک مہمان کی خاطر تواضع کے لیے اپنا واحد سرمایۂ زیست - ایک اونٹ - ذبح کر دیا تھا۔ دیکھا جائے تو اس مسکین کی عطا سب سے عظیم تھی۔

عرب جاہلی معاشرے میں متعدد قبائل کے افراد و شخصیات نے کھانا کھلانے کی تاریخ عظمت رقم کی تھی۔ مورخین اور سیرت نگاروں کے ایک خاص طبقہ نے، جن میں ابن قتیبہ دینوری، محمد بن حبیب بغدادی اور بعض دوسرے شامل ہیں، کھانا کھلانے والے افراد کی ان کے عہد و علاقے کی نسبت سے فہرستیں تیار کی ہیں اور ان کا سرنامہ ''المطعمون'' رکھا ہے۔ ان میں عرب جاہلی کے ذرا قدیم تر زمانے کے قصی بن کلاب، عبد مناف بن قصی اور ہاشم بن عبد مناف جیسے اجداد نبوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں تو عرب جاہلی کے قریب بعثت کے زمانے اور خالص نبوی عصر کے متعدد قریشی و غیر قریشی شخصیات بھی شامل ہیں۔

(محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، اجواد الجاهلية ۱۳۷/اجواد الاسلام ۱۴۶ و مابعد؛ ابن ہشام، ۲۶۴-۲۶۶: غزوہ بدر کے دوران مطعمون قریش)

ان سب کی تفصیل و توضیح تو طول کلام کا باعث ہوگی، ان میں سے صرف عہد نبوی کی بعض شخصیات اور مطعمون کا ذکر ان کے کھانوں کی تفصیل و تشریح کے ساتھ بہت اختصار سے کیا جا رہا ہے۔

- مشہور قریشی سردار سہیل بن عمرو عامریؓ مکہ میں لوگوں کو ثرید کھلایا کرتے تھے: "كان يطعم الناس الثريد بمكة" (بلاذری، ۱/۳۱۰)

- حضرت شماس بن عثمان مخزومیؓ کے ایک نگڑ دادا ''ہرمی بن عامر بن مخزوم'' اپنے زمانے میں لوگوں کو شہد پلایا کرتے تھے: "كان يسقي الناس العسل بمكة" اور ان کے اس کارِ خیر کے سبب ان کی چوتھی پشت کے فرزند ''ابن ساقی العسل'' (شہد پلانے والے کے فرزند) کے نام سے معروف تھے۔ خود حضرت شماس بھی ساقی العسل تھے۔ (بلاذری، ۱/۲۰۷)

- حضرت ابوذرؓ نے حارث بن ہشام مخزومی کی سخاوت کا ذکر بہت مفصل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب میں ان کی ضیافت سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کے پاس پہونچا تو ان کے سامنے روٹی اور گوشت کے بڑے بڑے طباق تھے اور دستر خوانوں پر کھجوریں تھیں۔ وہ نہ صرف مجھے کھلائی بلکہ سارا سامان بھی بخش دیا: "...جفان فيها خبز ولحم وأنطاع عليها زبيب..." یہ مدنی عہد کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے تین دن بعد مدینہ مراجعت کی تو رسول

اکرم ﷺ کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور آپ ﷺ نے ان کی تعریف کی۔

(کتاب المحبر، ۱۳۹-۱۴۰ نیز المطعمون فی بدر، ۱۶۱ و مابعد)

رفادہ وسقایہ کی جاہلی اسلامی روایات

شہر مکہ کے معمار جدید اور قریش کے قبیلے کے جمع کرنے والے شیخ عصر قصی بن کلاب نے ایک اور اجماعی طعام خیر کا اہتمام کیا۔ تعمیر کعبہ کے بعد ہی سے ساکنانِ حرم نے بالعموم اور سرداران مکہ نے بالخصوص بیت اللہ کے زائرین کو ضیوف اللہ سمجھ لیا تھا۔ وہ ان کی اپنی بساط بھر ضیافت و مہمانداری کرتے تھے، حاجیوں، عمرہ کرنے والوں اور دوسرے زائروں کو کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے تھے۔ یہ انفرادی اور اس سے بڑھ کر خاندانی مساعی خیر تھیں۔ قصی بن کلاب نے چوتھی صدی عیسوی کے آغاز ہی میں ان کو اجماعی بنا دیا۔ تمام قریشی اور دوسری مکی اکائیوں-خاندانوں، قبیلوں اور بطون وغیرہ- سے وہ نقد وجنس رفادہ کے لیے جمع کرتے تھے اور اجماعی طور سے دوران حج ان کے کھانے پینے کا اہتمام وانصرام کرتے تھے جس کو بالترتیب رفادہ وسقایہ کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فرد واحد اور شیخ قریش کے اکیلے بس کا کام نہ تھا لہٰذا اس اجماعی فراہمی طعام میں تمام شیوخ شریک ہو گئے تھے۔ ان کے فرزند جناب ہاشم بن عبد مناف قریش کے مالداروں کے ساتھ مل کر اس رفادہ کا انتظام کرتے تھے (ابن سعد، ۱/ ۷۸)۔ یہ اجماعی کھانوں کا سلسلہ پورے جاہلی دور میں قائم اور جاری ساری رہا۔ خالص پانی بھی مکہ میں ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ مہمانان الٰہی کے اعزاز واکرام میں اپنے سقایہ میں شہد، نبیذ/ کھجور کا شربت اور دوسری چیزیں شامل کرنے لگے۔ ٹھوس کھانوں میں ستو کا ذکر بھی ملتا ہے اور ستو کے شربت کا بھی جو کامل غذا کا کام بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ثرید بنیادی کھانا تھا جو زائرین کو کھلایا جاتا تھا کہ مجمع زیادہ ہوتا تھا۔ گوشت کی متعدد اقسام خاص کر اونٹ کا گوشت کھلانا بھی ان کا طریقہ تھا۔ بہرحال کھانوں کی اقسام وانواع سے قطع نظر رفادہ وسقایہ کا ایک اجماعی طعام کے بطور خاص مقام ومرتبہ تھا جیسا کہ ابن سعد، ابن اسحاق/ ابن ہشام اور دوسرے مورخین اسلام کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ رفادہ)

اسلامی نبوی زمانے میں پورے تیرہ سالہ مکی دور میں اور لگ بھگ آٹھ سالہ مدنی دور میں رفادہ اور سقایہ کا انتظام انہیں مخیّر وصاحب حسنات شیوخِ قریش ومکہ کے ہاتھوں میں رہا۔ اس دور میں ان کا ایک اہم سماجی رویہ یہ بھی رہا کہ مجموعی مخالفت اسلام اور عناد رسول ﷺ کے باوجود انھوں نے مسلم مکی اور مدنی حاجیوں اور زائروں کے ساتھ کبھی امتیازی سلوک نہیں برتا اور امیہ بن خلف جمحی جیسے دشمن اسلام نے حضرت سعد بن معاذ اوسی جیسے مسلم وشیدائے رسول ﷺ کی ذاتی ضیافت میں کسر نہ اٹھا رکھی اور یہی وطیرہ دوسرے شیوخ مکہ اور صاحبان دل کا رہا کہ وہ قدیم دوستانہ تعلقات اور برادرانہ روابط کو نبھاتے رہے۔

مکی نبوی عہد

بعثتِ نبوی کے ماقبل اور مابعد زمانے میں کھانا کھلانے کے خالص عرب اظہار کا ایک عظیم رجحان ملتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ متعدد یا بعض مخیّر وسخی شخصیات عوامی کھانے کھلانے کے لیے ایک اجماعی نظم واہتمام کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک عظیم جاہلی شخصیت عبداللہ بن جدعان تیمی کی تھی جو عہد نبوی کے اولین حصہ کے ایک خاص سردار قبیلہ اور شخصیت مکہ تھے۔ دوسری خصوصیات کے علاوہ ان کا کھانا کھلانے کا ایک عجیب وغریب انداز وطریقہ اور اسوہ تھا۔ وہ اپنے گھر پر اجماعی دعوتیں کیا کرتے تھے جن میں اکابر قریش کے علاوہ نوجوانان قبیلہ اور دوسرے اہم لوگ مدعو ہوتے تھے۔ ان کی ایسی ہی ایک دعوت میں رسول اکرم ﷺ نے شرکت فرمائی تھی۔ نوجوانی کی ترنگ میں ایک اور شریکِ دعوت ہشام بن عمرو مخزومی نے رسولِ اکرم ﷺ سے کسی بات پر بدتمیزی کی اور نوبت جنگ وجدال اور مار دھاڑ تک پہونچ گئی۔ اسی آویزش میں رسولِ اکرم ﷺ نے اس دشمنِ آگہی کے پیر پر ایسی ضرب لگائی جس کا نشان تا عمر اس پر رہا اور بالآخر اسی ضرب نبوی وکاری سے میدان بدر میں اس کے کھیت رہنے کے بعد اس کی مسخ شدہ لاش کو پہچانا گیا تھا۔

(ابن ہشام، ۱/ ۶۳۵؛ ابن کثیر، السیرۃ، بیروت ۱۹۷۱، ۱/ ۱۱۷: "... فانی ازدحمت یوما انا وهو علی مادبة لعبد الله بن جدعان" نیز ملاحظہ ہو: Ch. Pellat کا مقالہ "عبداللہ بن جدعان" اردو دائرۂ معارف اسلامیہ" جس میں شاندار ضیافتیں کھلانے میں ان کی دریا دلی ضرب المثل بن گئی تھی، بحوالہ الاغانی والثعالبی/ ثمار)

اس سے زیادہ اہم جناب عبداللہ بن جدعان تیمی کی وہ دیگ/عظیم ترین پیالہ یا برتن تھا جس میں اجتماعی کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا جاتا تھا۔ وہ اتنا بڑا ظرف تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ قریش کی ایذا دہی کے زمانے میں اس کے سایے میں بیٹھ کر آرام فرماتے اور عبادت کرتے تھے اور قریشی موذیوں کے تکلیف دہ جملوں اور ایذاؤں سے محفوظ رہتے تھے۔

مکی مسلم معاشرے کے قیام کے بعد مکہ مکرمہ میں رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے حسب سابق رفادہ وسقایہ کے اجتماعی طعام اور مشروبِ خیر میں برابر حصہ لیا۔ اگرچہ اس تعاون اسلامی کے واقعات وروایات کا فقدان ہے تاہم اسلامی تعلیم کے اصول تعاون علی الخیر سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور دوسرے مسلمانوں نے بھی اس کارخیر میں برابر حصہ لیا تھا۔ یہ عرب سماج اور دینِ حنیفی میں اشتراک کا نیک ثمرہ تھا کہ دین کے اختلاف نے خیر وثواب کے کاموں میں تعاون ومعاونت کی راہ کھوٹی کی اور نہ اس میں رخنہ ڈالا۔ اس کے بعض شواہد بھی اور ٹھوس تاریخی حقائق بھی موجود ہیں۔

سقایہ کے باب میں یہ تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمیؓ عہد جاہلی سے سقایہ کے منتظم ووالی تھے اور یہ منصب خیران کو ان کو اپنے بڑے بھائی سے وراثت میں ملا تھا جس کو انھوں نے اور وسیع تر کر دیا۔ بعض مشہور روایات کے مطابق حضرت عباسؓ قدیم مکی مسلم تھے اور اپنے اسلام کو خفیہ رکھتے تھے، ذاتی وخاندانی وجوہ سے۔ اگرچہ تاریخی طور سے یہ خیال وفکر صحیح نہیں ہے تاہم عہد جاہلی میں وہ بطور غیر مسلم اس کا اہتمام کرتے رہے اور اسلام لانے کے بعد وہ والی سقایہ بنے رہے اور لوگوں کو پانی اور نبیذ پلاتے رہے۔ ان کے فرزند گرامی ابن عباسؓ کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ وہ یعنی ان کے خاندان والے نبوی ہدایت کے مطابق سادہ سقایہ کا اہتمام کرتے تھے اور ان کے بنو اعمام پر تکلف سقایہ کا۔

فتح مکہ کے بعد کا زمانہ خاصا مختصر ہے تاہم اس دور میں رفادہ کا کام انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر جاری رہا۔ دوسرے انفرادی صاحبان تخت کی طرح ایک خاص شخصیت حضرت حکیم بن حزام اسدیؓ کی تھی جو دوسرے مبرات وحسنات کے علاوہ اجتماعی کھانوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے افراد وشخصیات بھی اس اجتماعی طعام خیر کے اہتمام

میں مشغول تھے۔ انفرادی کوششوں کے علاوہ اسلامی ریاست نے اور اس کے والی کی حیثیت سے والی مکہ حضرت عتاب بن اسید امویؓ نے رفادہ کا سرکاری منصب سنبھال لیا تھا اور وہ سرکاری سطح پر بھی زائرین وحجاج کے کھانے کا انتظام وانصرام کرتے تھے۔ تاہم یہ خاص موقعہ کا اور سالانہ اہتمام بھی اکیلی حکومت کے بس کا نہ تھا لہٰذا انفرادی اور قبائلی سطحوں پر اجماعی طعام خیر کا کام ہوتا رہا اور حج وعمرہ کے علاوہ عام زندگی اور پورے سال کے تمام بارہ مہینوں میں بلکہ روزانہ اس کا اہتمام ہوتا تھا۔

مسجد میں کھانے کا اہتمام

مدنی دور میں خاص مدینہ منورہ میں عام مسلمانوں کے لیے بالعموم اور غرباء کے لیے بالخصوص ایک دوسرے اجماعی طعام خیر کا اہتمام نظر آتا ہے۔ یہ ایک خالص نیا اسلامی رجحان اور نبوی معاشرہ کا صالح ارتقاء تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ عام اسلامی تعلیمات کے علاوہ اور دلی جذباتِ خیر پر مستزاد نبوی تحریک سے متعدد صاحبان خیر کو اس کار خیر کی تحریک ملی۔ کھجور کے باغات کے خوشحال مالکوں نے مسجد نبوی کے ستونوں سے کھجوروں کی پوری پوری ڈاریں لٹکانی شروع کردیں۔ نماز کے اوقات میں یا عام حالات میں ضرورت مندان خوشوں سے کھجوریں کھالیا کرتے تھے اور پیٹ کی آگ بجھالیا کرتے تھے۔ روایات تاریخ وسیرت اور احادیث نبوی میں ان اجماعی طعام خیر کے اہتمامات کا ذکر ملتا ہے اور بسا اوقات ان کے مالکوں کا ذکر نہیں آتا لیکن بعض روایات میں کسی نہ کسی کا ذکر خاص مل جاتا ہے۔ وہ اتنا بہرحال ضروری نہیں جتنا اس خاص قسم کے اجماعی طعامِ خیر کے رجحان وارتقاء کا ہے۔ عمدہ اخلاق کے حامل مالکان باغات عمدہ قسم کی کھجوروں کی ڈاریں مسجد نبوی کے ستون یا ستونوں سے آویزاں کرتے تھے اور کھانے والے ان کو کھاتے، شادکام ہوتے اور ان کو دعا دیتے تھے۔

بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے باقاعدہ حکم جاری کیا تھا کہ ہر باغ نخیل سے ایک کھجور کا گچھا مسجد نبوی میں لٹکایا جائے: ”إن النبی ﷺ امر من کل حائط بقنو یعلق فی المسجد“۔ جو ظاہر ہے کہ مساکین کے لیے خاص تھا۔ ایک اور روایت میں ہے

کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اس کے افسر خاص تھے یعنی اس کی حفاظت یا تقسیم کے: "وکان علیها معاذ بن جبل، ای علیٰ حفظها او علیٰ قسمتها"۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں باب تو اسی کا قائم کیا: "باب القسمة وتعلیق القنو فی المسجد" لیکن مذکورہ بالا احادیثِ نسائی بیان نہیں کیں اگرچہ ترجمۃ الباب میں القنو کی العذق سے تعریف کی ہے اور اس کی تثنیہ و جمع بتائی ہے۔

(فتح الباری، ۱/ ۶۶۷-۶۶۹: العذق کے معنی بھی کھجور کا خوشہ ہیں دوسرے معانی کے علاوہ۔ مصباح اللغات)

- اسی کے ساتھ انسانی خست اور بشری جبلت کا بھی بعض اطراف سے قابل اعتراض مظاہرہ بھی ہوا۔ بعض لوگوں نے ردی کھجوروں کے خوشے (القنو) مسجد کے ستونوں سے لٹکانے شروع کر دیے اور اچھی کھجوروں کو اپنے لیے بچا لیا۔ رسول اکرم ﷺ نے اس ردی رجحان اور میلے ارتقاء پر فوراً نقد فرمایا اور ایسے کھجور کے مالکوں کو سخت سرزنش کی۔ ان کو اپنے فرمان سے ایسے ردی کام سے قطعی روک دیا جیسا کہ آپ ﷺ کا حکیمانہ طریقہ اور واعظانہ وطیرہ تھا۔ ان کو سمجھایا کہ خیر و اعانت اور صدقہ و احسان میں چیزوں کا عمدہ ہونا بھی ضروری ہے، ردی چیزوں کا اس میں بھی گذر نہیں۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب القسمة وتعلیق القنو فی المسجد؛ ترجمۃ الباب؛ فتح الباری، ۱/ ۶۶۷-۶۶۹، بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقة من کسب طیبا الخ: حدیث: ۱۴۱۰:... ولا یقبل الله الا الطیب.. ؛ فتح الباری، ۳/ ۳۵۱-۳۵۲؛ بالخصوص حدیث ابوداؤ: ۱۶۰۸ میں مسجد کے اندر کسی شخص کے ردی کھجور لٹکانے اور اس پر نقد نبوی کا ذکر ہے:... وقد علق رجل منا حشفا فطعن بالعصا فی ذلک القنو..." الخ.)

مسجد میں اجماعی کھانے

اصحابِ صفہ اور بعض دوسرے صحابہ کرام کے مسجد میں خاص کھانا - اجماعی کھانا - کھانے کی ایک روایت بھی تھی۔ ان میں رسول اکرم ﷺ بھی بسا اوقات شریک ہوا کرتے تھے۔ اور صحابہ کرام کے اجماعی کھانوں کا تو ایک زریں سلسلہ قائم تھا۔ بعض صحابہ کرام کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ وہ عہد نبوی میں مسجد میں کھانا کھایا کرتے تھے اور اس طرح اسے سنت نبوی کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے واقعات و روایات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا ذکر

بہت اختصار کے ساتھ یہاں اس نکتہ یا روایت کو اجاگر کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے:

۱۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک بار صحابہ کرام کے ساتھ مسجد میں بھنا گوشت (شواء) تناول فرمایا۔ (اسد الغابہ، ۳/۱۴۳)

۲۔ حدیث ابن ماجہ: ۳۳۰۰ میں گذر چکا کہ حضرت عبد اللہ بن حارث زبیدیؓ دوسرے اصحاب کے ساتھ مسجد میں باجماعت گوشت روٹی پر مبنی کھانا کھاتے تھے۔

کمزور طبقات کے کھانے کا اہتمام

شہری عربوں بالخصوص بعض مالدار افراد وطبقات پر قرآن مجید نے نقد کیا ہے کہ وہ یتیموں، مسکینوں اور غریبوں کو کھانا کھلانے سے کتراتے ہی نہیں بلکہ دوسروں کو اس کارِ خیر سے روکتے بھی ہیں (سورہ ماعون وفجر وغیرہ کی آیات)۔ اس کے باوجود عرب جاہلی روایات اور تاریخ اور سیرت نبوی کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی جاہلی معاشرہ میں متعدد افراد وطبقات ایسے بھی تھے جو کمزور طبقات کو نہ صرف کھلاتے پلاتے تھے بلکہ اس کا خاصا اہتمام کرتے تھے اور وہ اپنی ان خصوصیاتِ بندہ پروری اور اوصافِ ذرہ نوازی کے لیے عرب جاہلی معاشرے میں معروف ومشہور بھی تھے۔

ان مخیّر حضرات وطبقات کے اطعامِ مساکین کے بارے میں دو طرح کے بیانات روایات واحادیث میں ملتے ہیں: ایک عمومی بیانات ہیں جو افراد وطبقات کی عام غریب پروری کے علاوہ ان کے کھانا کھلانے کا ذکر محض کرتے ہیں جیسے رسولِ اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف کہ حضرت خدیجہؓ نے اولین تنزیلِ قرآن کے وقت فرمایا تھا کہ آپ ﷺ غرباء کو کھلاتے ہیں یا جیسے شیخ قارہ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صفاتِ ذرہ نوازی میں ان ہی تمام اوصاف نبوی کا ذکر اپنے لہجے میں کیا تھا۔ طبقات میں جس طرح بنو عبد مناف اور بنو مخزوم کے کھانا کھلانے کے عام بیانات بلا تفصیل طعام کے روایات میں ملتے ہیں۔

دوسرے وہ بیانات ہیں جو افراد وطبقات کے خاص کھانا کھلانے کی تفصیلات وجزئیات بھی پیش کرتے ہیں۔ ان روایات کی زیادہ اہمیت ہے کہ وہ کھانے کی اقسام اور بسا اوقات

دوسری تفصیلات بھی مہیا کر کے اپنے کو مستند کرتی ہیں مکی جاہلی معاشرہ کے بعد نبوی اسلامی معاشرہ کے قیام کے بعد اطعامِ مساکین وغرباء کی بعض اور جہات کا اضافہ ہوا عملِ خیر اور اجر وثواب کا تصور تو جاہلی معاشرہ میں بھی تھا جو ان کے وسیع تر تصورِ تحنث میں دین ابراہیمؑ سے آیا تھا۔ لیکن اسلامی نبوی تعلیمات نے احتساب اور ثواب کمانے کی جہات کو اور بھی مستحکم کر دیا تھا۔ گناہوں اور زیادتیوں کے کفارہ میں کھانا کھلانے کے علاوہ عام اجر وثواب کی خاطر صاحبانِ ایمان ودل کو ابھارا تھا کہ وہ خلوص سے، للّٰہیت سے خود فقراء کو کھلایا کریں۔

- حضرت ابن عمرؓ کا معمول تھا کہ اہل وعیال کے ساتھ ہر رات کھانا کھاتے تھے اور اکثر وبیشتر کسی مسکین کی آواز سنتے تو روٹی اور گوشت کا اپنا حصہ اسے خود جا کر دے دیتے تھے، دوسروں سے نہ دلواتے اور نہ ان کا حصہ دیتے تھے۔

(ابن سعد، ۴/۱۶۵ "... فربما سمع بنداء مسکین فیقوم الیہ بنصیبہ من اللحم والخبز.")

- ایک نابینا صحابی حضرت عتبانؓ نے اپنے ہاتھ سے فقیر ومسکین کو کھانا/صدقہ دینے کی فضیلت سنی تو اپنے کمرے سے گھر کے دروازے تک ایک رسی باندھ لی اور اس کے سہارے چلتے ہوئے دروازے پر کھڑے مسکین کو کھانا دیتے تھے۔

- حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسجد میں ایک سائل کو مانگتے پایا تو اپنے فرزند عبدالرحمٰن کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا لے کر اسے عطا کر دیا: "... فوجدت کسرۃ خبز فی ید عبد الرحمن فاخذتھا منہ ودفعتھا الیہ" (حدیث ابوداؤد: ۱۶۷۰: باب المسألۃ فی المسجد)

- حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کا ایک روزانہ کا معمول تھا کہ وہ دن کے کھانے کے وقت ایک پیالہ ثرید اور اسی طرح رات کے کھانے کے وقت ایک پیالہ ثرید بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کے کھلانے کے لیے بطور خاص بھیجا کرتے تھے یا خود لے جاتے تھے۔

(ابن سعد، ۴/۲۹۹: "کانت لابی برزۃ الاسلمی جفنۃ من ثرید غدوۃ وجفنۃ عشیۃ للارامل والیتامیٰ والمساکین")

- یتیموں کے والی، غریبوں کے ملجا اور بیواؤں اور کمزوروں کے آقا کا تو سارا کھانا اور اہل بیت کا آذوقہ روزانہ ہی ان کمزور طبقات کے لیے خاص ہو کر رہ گیا تھا۔ آپ ﷺ کے

عطایائے طعام کے علاوہ ازواج مطہرات کے صدقات طعام احادیث وروایات میں اتنے مذکور ہیں کہ ان کا استقصاء نہیں کیا جاسکتا اوران کا تفصیلی ذکر بھی ضروری نہیں کہ وہ معلوم ومعروف ہیں۔

-ان انفرادی عطایائے طعام سے زیادہ اہم وہ اجماعی طعام خیر ہے جس کا سلسلہ عرب جاہلی سے اسلامی معاشرہ تک وسیع ہے۔ان میں رسولِ اکرم ﷺ کا وہ خاص عظیم وکبیر پیالہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے جس کو چار مردان کار اٹھاتے تھے اور جو روزانہ ہی کھانے کی قسما قسم انواع سے بالخصوص ثرید سے بھرا جاتا تھا اور اس پر ہجوم ٹوٹتا تھا اور اپنے رسول مکرم ﷺ کے ساتھ کھاتا تھا۔

قیدیوں کا کھانا

سورۂ یوسف: ۲۷ میں دو قیدیوں کے جس طعام جیل کا ذکر ہے وہ کسی خاص عہد اور معاشرہ کا نہیں ہے۔قیدیوں اور اسیروں کو کھلانے پلانے کا بہرحال رواج رہا ہے اور عرب جاہلی اور نبوی اسلامی دونوں معاشروں میں بھی تھا۔اسلام میں اور نبوی تعلیمات کے تحت ان بلا کشانِ انسانیت اور اسیران بلا کے ساتھ حسنِ سلوک کا بے مثال مظاہرہ کیا جاتا تھا جیسا کہ اسیران بدر کے ضمن میں کافر قیدیوں کا اعتراف فضل تھا کہ ان کو قید کرنے والے انصاری اور مہاجر افراد خود کھجوریں کھالیتے تھے اور ان کو باقاعدہ کھانا-گوشت روٹی وغیرہ-کھلاتے تھے۔یہ دراصل ان تعلیماتِ الٰہی کا نتیجہ تھا جو ان کو اللہ تعالیٰ نے دی تھیں جیسا کہ سورۂ انسان/ دہر کی آیات کریمہ: ۸-۹ میں ہے کہ تم کو (مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو) اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں۔

(ابن ہشام، ۱/ ۶۴۵؛ تفسیر سورۂ یوسف وسورہ دہر/ انسان؛ نیز دوسرے مآخذ حدیث جیسے بخاری ومسلم وغیرہ، عہد نبوی میں تمام اسیروں کے ساتھ یہی حسن سلوک کیا گیا تھا۔ان میں حضرت ابو العاص عبشمیؓ، حضرت عدی بن حاتم طائی وغیرہ کی بہن شامل ہیں)

مکی عہد میں قریش کے بعض اکابر نے اپنے مسلم فرزندوں اور دختروں کو بھوکا بھی مارا تھا اور بعض دوسروں نے کھلایا پلایا بھی تھا اور یہ رجحان اسلامی دعوت وقبولیت کے دوران ابھر کر سامنے آیا تھا۔

مکی دور میں شعب ابی طالب کے محاصرہ کے زمانے میں بنو ہاشم اور بنو مطلب کے

مسلمانوں اور غیروں دونوں کے لیے بعض نیک طینت افراد نے پکا ہوا کھانا بھی بھیجا تھا اور غلہ واناج کی جنس سے بھی مدد کی تھی۔ ان میں حضرت حکیم بن حزام اسدی نے حضرت خدیجہؓ کے لیے بھیجا تھا۔ اسی طرح بنو عامر بن لوی کے ہشام بن عمرو نے بھی اپنے اونٹ پر لاد کر گیہوں وغیرہ کی رسد پہونچائی تھی۔ (ابن ہشام، ۱/۳۵۴، ۳۷۴-۳۷۵)

-حضرات عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی اور ہشام بن العاص سہمیؓ کو چھڑانے کے لیے جب حکم نبوی پر حضرت ولید بن ولید مخزومیؓ مکہ پہونچے تھے تو ان دونوں قیدیوں کے لیے ایک عورت کھانا لا رہی تھی اور اسی کی نشاندہی پر وہ دونوں کو چھڑانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

(ابن ہشام، ۱/۴۷۶)

-اسی طرح حضرت خبیبؓ اور ان کے بعض رفقاء کو قید کے زمانے میں ان کے قریشی قاتلوں نے کھانا بہرحال کھلایا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص انگوروں کے خوشوں سے نوازا تھا۔ ان کے دوسرے رفقاء میں ایک حضرت زید تھے اور ایک اور صحابی۔

(حدیث بخاری: ۴۰۸۶؛ فتح الباری، ۷/۴۷۳-۴۷۷ ومابعد، شرح حافظ میں ان کے نام ہیں: زید بن الدثنہ اور عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہما)

✪✪✪

عہدِ نبوی کے مشروبات

انسانی زندگی کی بقا اور ارتقاء دونوں کے لیے پانی شاید سب سے پہلی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر جینا ہی محال ہے۔ غذا بھی ضرورت ہے مگر دوسری کہ اس کے بغیر طویل تر مدت کے لیے جیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ دونوں بنیادی انسانی ضرورتیں ہیں۔ یہ دونوں اسی تناسب اور نسبت سے حیوانات اور نباتات کے لیے بھی ضروری ہیں اور انسان کا تو ان دونوں سے گہرا ارتباط ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمام زندہ چیزوں کو ہم نے پانی سے پیدا کیا ہے: "... وجعلنا من الماء کل شئی حی" (سورہ انبیاء۔۳۰)۔ جب ہر زندہ شے کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے تو اس کی زندگی کی بقا کا مدار بھی پانی ہی ٹھہرے گا۔

مرکزِ اسلام، مصدرِ دین و شریعت، شہرِ خانہ کعبہ اور وطنِ مالوفِ نبوی ﷺ کی نسبت سے پانی اور گراں قدر بنا۔ کیونکہ وہ صرف وادیٔ غیر ذی زرع ہی نہیں ہے بلکہ بے آب و گیاہ بھی تھا۔ ایسے علاقہ وجہان میں پانی آبِ حیات بن کر رہتا ہے۔ انسانی کاوشوں سے پہلے اور ان کے علاوہ بھی حیاتِ انسانی کا مدار قدرتی آب رسانی اور ان کے ذرائع و وسائل پر ہی تھا۔ بارش رحمتِ الٰہی سے کہیں کم تھی اور جب بھی ہوتی زندگی کو کھلا دیتی اور اس کے پانی کو گڑھوں، تالابوں اور برتنوں میں بھر لیا جاتا، صحراؤں اور ریگستانوں میں قدرت سے چشمے رواں ہوتے اور رواں ہوتے ہی بے آب ہو جاتے۔ البتہ شاداب علاقوں میں ان سے شادابی قائم رہتی۔

مکہ مکرمہ کی آبادی تو قدیم ترین رہی ہے اور اس کی بستی روزِ ازل سے وجود رکھتی ہے کہ اولین خانۂ الٰہی کی امین ہے۔ اس کی سیرابی کے لیے دعائے ابراہیمؑ نے رحمت کے دروازے کھٹکھٹائے اور پیاسے اسمٰعیلؑ کی بے تاب ایڑیوں کی رگڑ نے انہیں چوپٹ کھول دیا۔ فرشتۂ غیب نے حضور میں آ کر زمزم کے چشمۂ حیواں کی نعمت سے انسانیت کو نوازا اور آج تک نوازتا

جارہا ہے۔انسانی حرص وہوس نے اس کے چشمۂ جاری کو بند کردیا تو مخلص انسانوں کے طبقات نے شہرِ الٰہی میں کنوؤں کے جال سے بچھادیے۔ اور اسی کے ساتھ ایک مرد کار نے اسمٰعیلی وراثت کی سب سے قیمتی متاع کو اپنے بل بوتے پر پھر کھود نکالا۔ یہ چشمۂ زمزم کی بازیافت تھی۔

مکہ مکرمہ کے کنوئیں

رسولِ اکرم ﷺ کی مکی حیاتِ طیبہ ہو یا مدنی زندگی مبارک، دونوں میں کنوؤں اور ان کے پانی کی بہت اہمیت نظر آتی ہے۔ وہ آبِ رسانی کے ذرائع بھی تھے اور انسانی ضرورت پوری کرنے کے حیات بخش وسائل بھی۔ قبل بعثت کے زمانے میں بلکہ قدیم جاہلی دور میں بعض قریشی اکابر اور مکی خاندانوں نے مختلف علاقوں میں کنویں (البئار – جمع بئر) کھودے تھے۔ وہ تھے تو ان کی ملکیت مگر استفادہ کا حق سب کو تھا۔ کنوؤں کا یہ سلسلہ چاہ زمزم کے گم ہونے سے قبل شروع ہوا تھا کہ اپنی تمام تر آفاقی صلاحیتِ سیرابی کے باوجود وہ دور کے باسیوں کی پیاس نہیں بجھا سکتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے اسباب تھے۔ جاہلی دور کے سوانح نگاروں اور سیرت نگاروں نے ان کنوؤں کا ذکر کیا ہے۔

(مقالہ ''بئر'' اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں کافی مفصل بحث ہے۔ لفظ بئر کے معنی اور آراضی پر اس کے اطلاق کے سلسلے میں، یہ تاریخی بحث ہے)

۱۔ **الطوی:** عبد شمس بن عبد مناف نے بالائی مکہ میں واقع محلہ البیضاء میں کھودا تھا۔ وہ ایک بڑا کنواں تھا۔

۲۔ **بذر:** ہاشم بن عبد مناف نے شعب بنی ہاشم/ ابی طالب کے دہانے/ درے کے قریب کھودا تھا۔

۳۔ **الحفر:** امیہ بن عبد شمس نے اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کھودا تھا۔

۴۔ **سجلۃ:** اسد بن ہاشم کا کندہ کنواں تھا مگر بنو نوفل کے مطعم بن عدی نے اسے خرید لیا تھا۔ بنو ہاشم اسے ہدیہ سمجھتے تھے۔

۵۔ **سقیۃ:** بنو اسد بن عبد العزیٰ کے خاندانِ قریش کا کنواں تھا اور ان کے علاقے میں تھا۔

۶۔ ام احراد: عبدالدار کے خاندانِ قریش کا کنواں تھا اور ایک خاتون کے نام سے منسوب تھا۔

۷۔ السنبلۃ: قریش کے خاندان بنو جمح کے سردار خلف بن وہب کا کھودا ہوا کنواں تھا۔

۸۔ الغمر: قریش کے ایک اور خاندان بنو سہم کا کنواں تھا جو ان کے اکابر نے کھودا تھا۔

ان تمام کنوؤں کے بارے میں دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک، وہ مکہ مکرمہ کے اندرونی علاقوں میں ان کے مالکوں کے خطوں میں واقع تھے۔ دوسرے، قریش کے تمام اہم خاندانوں نے اپنے اپنے کنوئیں کھودر کھے تھے: بنو عبد شمس، بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو اسد، بنو نوفل، بنو عبدالدار، بنو جمح، اور بنو سہم کے آٹھ خاندانوں کا ذکر صاف آتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے خاندانوں نے بھی اپنے اپنے کنوئیں کھودر کھے ہوں۔ مکہ کے بیرونی علاقوں میں بنو مرہ بن کعب کے کنوئیں۔ رم ورم۔ اور بنو کلاب بن مرہ کے کنوئیں۔ خم وخم۔ کا ذکر ملتا ہے اور وہ قدیم کنوئیں تھے اور زم زم کے آہنگ سے موسوم تھے۔

(ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۱/ ۱۵۹-۱۶۲؛ سہیلی، ۲/ ۱۰۰-۱۰۹؛ ''عبدالمطلب ہاشمی'' ۵۵-۵۶؛ نیز مقالہ بئر کے تحت مختلف بحار مکہ وغیرہ کا تذکرہ جیسے بئر میمون جو مکہ کے نواح میں منیٰ کے قریب تھا اور عہد نبوی میں موجود تھا۔ یا بئر معونہ وغیرہ جو مضافات میں تھے: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور)

چاہ زمزم کی بازیافت

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیاس بجھانے کے لیے جو چشمۂ فیض غیب سے وجود میں آیا تھا وہ زم زم کہلایا۔ یہ نام پیاسے اور بے تاب اسمٰعیلؑ کی ماں حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے عطا فرمایا تھا۔ جب پانی زمین کے طبقات کو توڑ کر پھوٹ بہا تو حضرت ہاجرہؓ کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا: زم زم (رک جا، رک جا) اور انھوں نے اس کو روکنے کے لیے اس کے ارد گرد ایک مینڈھ باندھ دی، وہ اپنی چار دیواری میں رک گیا اور پھر زمزم کے نام سے ہی موسوم ہوا۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ وہ اگر اسے نہ روکتیں تو وہ چشمۂ جاری اپنی وسعت اور پھیلاؤ سے سب کو سیراب کرنے کا سبب بن جاتا۔ یہ ایک معنی حدیث ہے، دوسرے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ وہ

کثیر پانی کے سبب زمزم کہلایا: "وسمیت زمزم لکثرتھا، یقال: ماء زمزم ای کثیر" حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کے دوسرے معانی بھی بتائے ہیں۔

(بخاری، کتاب الحج، باب ماجاء فی زمزم ؛ فتح الباری، ۳/ ۶۲۲-۶۲۳؛ بخاری، کتاب احادیث الانبیاء ؛ باب یزفون الخ، حدیث: ۳۳۶۲: "یرحم اللہ ام اسمٰعیل لولا انھا عجلت لکان زمزم عیناً معیناً" نیز مفصل حدیث: ۳۳۶۴ جس میں پوری تاریخ زمزم مذکور ہے: حدیث: ۳۳۶۵؛ فتح الباری، ۶/ ۴۷۸-۴۹۲ و مابعد؛ "مقالہ زمزم" اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بحوالہ معجم البلدان)

عہدِ اسماعیلی کے بعد سے مدتوں زمزمِ اہل مکہ اور دوسرے زائرین بیت اللہ کی پیاس بجھاتا رہا۔ تاآنکہ بنو جرہم کی غفلت سے وہ پٹ گیا۔ دراصل خزاعہ نے بنو جرہم کو جب شہرِ الٰہی سے جلاوطن کیا تو ان کو سزا دینے کے لیے بنو جرہم نے جان بوجھ کر اس کو پاٹ دیا تھا: "...وکانت جرھم دفنتھا عند اخراج خزاعۃ ایاھامن مکۃ" (بلاذری، ۱/ ۷۸؛ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/ ۲۴۴)۔ وہ ایک طویل عرصے تک ایسا نابود ہوا کہ اس کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ اور لوگوں کی سماعت میں اس کا وجود صرف ایک گونج بن کر رہ گیا تھا۔

رسولِ اکرم ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب ہاشمی نے ایک خواب ورویائے صادقہ میں بشارت پا کر اس کا سراغ پایا اور اسے اپنی محنت ومشقت اور چاہ اور لگن سے کھود نکالا۔ اس کام میں ان کے فرزندِ اکبر جناب حارث نے ان کی مدد کی تھی۔ اس وقت جناب عبدالمطلب ہاشمی کے وہی اکلوتے فرزند تھے اور ان کی اپنی عمر مبارک نبوی عمر کے برابر چالیس سال تھی۔ چاہِ زمزم کی یہ بازیافت چھٹی صدی عیسوی کے چوتھے عشرے یعنی ۵۴۰ء کے قریب ہوئی تھی۔ پھر وہ حجاج کے سقایہ اور تمام لوگوں کی پیاس بجھانے کے کام آیا۔

(ابن ہشام، ۲/ ۱۲-۱۴؛ تفصیل کے لیے عبدالمطلب ہاشمی، ۵۳-۵۵؛ نیز ازرقی، تاریخ مکۃ، ۱/ ۲۷۹-۲۸۲ و مابعد؛ مقالہ "زمزم")

آبِ زمزم سے استفادۂ نبوی وصحابہ

اگرچہ کنوؤں سے بالخصوص چاہِ زمزم سے رسول اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور دوسرے اہلِ مکہ اور حجاج وزائرین کے پیاس بجھانے اور اس کا پانی استعمال کرنے کا واقعہ ایسا ہے جو سورج

کی روشنی کی طرح واضح و ثابت ہے اور اس کے اثبات کے لیے مزید کسی ثبوت و سند کی ضرورت نہیں، تاہم بعض احادیث و روایات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کئی اسباب اور وجوہ ہیں: اول پانی پینے کے چند آداب ہیں، وہ اسلامی بھی ہیں اور فطری بھی۔ ان کا سنتِ نبوی سے گہرا تعلق ہے اور آبِ زمزم کی تقدیس سے بھی کہ وہ عام پانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا چشمہ عام کنواں۔ دوم انفرادی استعمال کے علاوہ اس کا ایک اجتماعی استعمال بھی تھا۔ زائرین بیت اللہ کے لیے سقایہ کی قدیم عرب روایت سخاوت کے روپ میں، سوم پانی کے استعمال کے یعنی بطور مشروب کے اس کے مختلف طریقے بھی ہیں۔ لہٰذا چند احادیث سے مختصراً ان مختلف استعمالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

آبِ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو زمزم کا پانی پلایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کھڑے پیا: "... سقیت رسول اللہ ﷺ من زمزم فشرب وھو قائم"۔

(بخاری، کتاب الحج، باب ماجاء فی زمزم، حدیث: ۱۶۳۷؛ اطراف حدیث: ۵۶۱۷؛ فتح الباری، ۳/۶۲۲-۶۲۳: ایسی متعدد احادیث دوسری کتب حدیث میں بھی ہیں)

حافظ ابن حجرؒ نے فضائلِ آبِ زمزم میں مسلم وغیرہ کی احادیث نقل کی ہیں کہ وہ کھانے کا کھانا ہے (انہا طعام طعم) اور بیماری کی شفا ہے (وشفاء سقم)۔

- بطور غذا حضرت ابوذر غفاریؓ نے اسلام قبول کرنے کے واقعہ میں بیان کیا ہے کہ وہ مسجد میں رہتے تھے اور زمزم کا پانی پیتے رہے تھے۔ اسی پر کئی دنوں تک گذارا کیا تھا: "... واشرب من ماء زمزم"

(حدیث بخاری: ۳۵۲۲؛ کتاب المناقب، باب قصة اسلام ابی ذر الغفاریؓ الخ؛ طرف حدیث: ۳۸۶۱؛ فتح الباری، ۶/۶۷۱-۶۷۲ نیز حدیث بخاری: ۳۳۶۴-۳۳۶۵ وغیرہ جن میں اس کے غذا ہونے کا ذکر ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ کی بعض مرفوع احادیث میں بھی اس کے غذائیت سے بھرپور ہونے کا اثبات ہے)

بطور مشروب عام آبِ زمزم پینے پلانے کے بہت سے واقعات، روایات اور آثار ملتے

ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ باشندگانِ حرم اور زائرین کرام مختلف اوقات میں چاہِ زمزم پر آ کر پانی پیتے تھے۔ کبھی طواف پورا کرنے کے بعد کہ وہ بھی ایک سنتِ نبوی ہے۔

(بخاری، حدیث: ۵۶۱۷: "شرب النبی ﷺ قائما من زمزم"۔ اس باب میں حضرت علیؓ کے کھڑے ہوکر پینے کی احادیث بھی ہیں)

کبھی مسجد حرام آتے جاتے، کبھی نماز کے مختلف اوقات کے دوران، کبھی صبح اور کبھی دوپہر وشام، کہ اس کا چشمۂ رواں ہر وقت پیاس بجھانے کو تیار تھا۔

آبِ زمزم گھروں کو لے جانا

عہد نبوی کے مسلم اور غیر مسلم مکی طبقات اور بعد میں دوسرے لوگ بھی اپنے گھروں کو جاتے تو مسجد سے زمزم کا پانی بھر کر لے جاتے تھے اور گھروں میں اس کو استعمال کرتے تھے۔ یہ استعمال بطور مشروب ہی ہوا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے استعمالات بھی ہوں۔

حجاج وزائرین کا آب زمزم لے جانا بھی ثابت ہے۔ آبِ زمزم کی فضیلت اور عظمت کے سبب وہ مکہ مکرمہ سے لے جانے والا سب سے بڑا ہدیہ ہوتا تھا۔ مکہ آنے والے نہ صرف اسے لے جاتے تھے بلکہ اپنے گھروں میں برکت کے لیے اسے رکھا کرتے تھے۔

(ترمذی، کتاب الحج، باب ماجاء فی حمل ماء زمزم)

مدینہ منورہ بھی لے جانے کا ذکر بعض روایات میں آتا ہے۔ حجاج اور زائرین کرام تو اپنے اپنے علاقوں کو واپسی کے وقت آب زمزم لے ہی جاتے تھے۔ بعض احادیث وآثار سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے بطور خاص مکہ سے مدینہ منورہ آب زمزم لے جایا جاتا تھا۔ (ترمذی، مذکورہ بالا؛ ازرقی، ۲/۵۲)

مدینہ منورہ کے کنوئیں

ہجرت کے بعد رسول اکرم ﷺ کا دس سالہ قیام مدینہ منورہ میں رہا اور اس دوران آپ ﷺ نے شہر عالی کے متعدد کنوؤں کا پانی استعمال فرمایا جس طرح مکہ مکرمہ کے ترپن سالہ

قیام وسکونت کے دوران آپ ﷺ نے چاہِ زمزم اور دوسرے کنوؤں کا پانی نوش فرمایا تھا۔ مدینہ منورہ کے اندرونی علاقوں اور بیرونی حصار میں اور باہر بھی متعدد کنوئیں تھے جن کا پانی بہت میٹھا، ٹھنڈا اور لذیذ و دل پسند ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض کنوئیں خاصے مشہور تھے اور بعض اتنے معروف نہ تھے۔ وہ سب کے سب نجی اور شخصی ملکیت میں تھے اور ان کے مالکان میں سے بعض ان کے پانی کو بیچتے تھے اور بعض کنوؤں کا پانی اگرچہ خرید وفروخت کی چیز نہ تھا تاہم اس کا حصول مالکان کی اجازت پر منحصر ہوتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے پانی پینے کے حوالے سے ان کنوؤں کا ذکر آتا ہے۔ اس مشروبِ خاص کا تقاضا ہے کہ ان کا مختصر ذکر ضرور الگ سے کیا جائے تاکہ حیاتِ نبوی میں کنوؤں کی اہمیت کا باب مکمل ہو جائے۔

بَیرُحاء: انصار میں سب سے زیادہ کھجوروں کے اموال پر مشتمل مالک آراضی حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کا وہ سب سے محبوب مال تھا اور وہ مسجد کے سامنے تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ وہاں اکثر تشریف لے جاتے اور اس کے نہایت پاکیزہ پانی کو نوش فرمایا کرتے تھے۔ سورۂ آل عمران کی آیتِ کریمہ-۹۲:"لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" (ہرگز نہ پہنچو گے نیکی کی حد کو جب تک نہ خرچ کرو کچھ ایک جس سے محبت رکھتے ہو) نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا محبوب ترین مال "بیرحاء" راہِ الٰہی میں صدقہ ہے اور اس کا اجر وثواب میں اللہ تعالیٰ کے پاس پانے کی امید کرتا ہوں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صدقہ کو نفع بخش مال قرار دیتے ہوئے ان کی تحسین فرمائی اور اس کو ان کے قریب ترین رشتہ داروں میں تقسیم کرنے یعنی صدقہ ووقف کرنے کا حکم دیا اور حضرت ابوطلحہؓ نے اپنے اقارب اور چچازادوں میں اس کو بانٹ دیا (بخاری، باب استعذاب الماء، حدیث:۵۶۱۱؛ فتح الباری، ۱۰/۹۳-۹۴)۔ حافظ ابن حجرؒ نے دیگر کتبِ حدیث سے مختلف دوسرے کنوؤں کا ذکر کیا ہے جس پر ابھی بحث آتی ہے۔ اور میٹھے پانی کی خواہش وطلب پر کلام فرمایا ہے کہ وہ جائز ومباح ہے اور نمکین وکھارے پانی میں کوئی فضیلت نہیں۔ مگر بیرحاء کے بارے میں مزید کوئی تفصیل نہیں دی ہے۔ دوسری روایات حدیث وسیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک کنواں نہیں تھا جیسا سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ ایک وسیع وعریض آراضی تھی جس میں ایک کنواں بھی واقع تھا جس کا پانی

ٹھنڈا اور میٹھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھا۔ (واقدی، ۴۳۸)

بئر رومہ: دوسرا مشہور ترین مدنی کنواں تھا۔ وہ وادیٔ عقیق میں واقع تھا جو مدینہ منورہ کی اصل بستی کے قریب ہی تھی۔ اس کی ملکیت کے بارے میں اختلاف روایات ہے: بعض کے مطابق وہ قبیلہ مزینہ کے کسی شخص کی آراضی میں واقع تھا اور بعض کے مطابق وہ حضرت رومۃ الغفاریؓ کی ملکیت تھا۔ اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔ مالکوں نے کنوؤں پر ڈول اور رسی وغیرہ رکھ کر ایک مزدور (اجیر) کو پانی پلانے پر مامور کر دیا تھا۔ وہ پیسے لے کر پانی لوگوں کو دیتا تھا۔ غالباً مالکوں کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ یہی تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کو اس کا میٹھا پانی بہت پسند تھا اور اکثر وبیشتر آپ ﷺ اس پر پانی نوش فرمانے کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایسے ہی کسی موقعہ پر آپ ﷺ نے اس خواہشِ نبوت کا اظہار فرمایا کہ کاش کوئی صالح مسلمان اسے خرید کر فی سبیل اللہ وقف کر دے اور لوگوں کی بے معاوضہ سیرابی کا انتظام کر دے۔ حضرت عثمان بن عفان امویؓ کو رسولِ اکرم ﷺ کی پسند معلوم تھی اور جب خواہش وتمنا کا علم ہوا تو اسے فوراً خرید کر وقفِ عام کر دیا۔ اس کی قیمتِ خرید پر بھی تھوڑا سا اختلاف ہے: ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اسے چار سو دینار میں خریدا اور دوسری روایت میں اس کی قیمت محض پینتس (۳۵) ہزار درہم بتائی گئی ہے۔ ان دونوں قیمتوں میں زمین آسمان کا نہ سہی کافی فرق ہے: چار سو دینار کا مطلب ہے چالیس ہزار درہم یا اس سے زیادہ۔ دوسری قیمت اس کے مقابلے میں کافی کم ہے۔ غالباً دوسری روایت مرجوح ہے اور چار ہزار دینار ہی اس کی صحیح قیمت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دینار ودرہم کی شرح تبادلہ کے اختلاف اور بازار کے اتار چڑھاؤ نے یہ فرق دو مختلف ادوارِ روایت میں پیدا کر دیا ہو۔

(بلاذری، ۱/۵۳۶: ...فاشتراها عثمان بن عفان باربع مائة دينار فتصدق بها...'' ؛ اسد الغابہ، ۲/۱۹۰: ... فاشتراها بخمسة وثلاثين الف درهم...'')

اس تاریخی کنوئیں کی خریدِ عثمانی کا ایک سماجی وتہذیبی پس منظر بھی ہے۔ روایات کے مطابق مہاجرین جب مدینہ آئے تو ان کو مدینہ کا پانی اچھا نہیں لگا (استنكروا الماء)۔ صحابی غفاریؓ کے رومہ نامی کنوئیں کا پانی میٹھا تھا اور مہاجرین کو بھی پسند آیا۔ صحابی مالک ایک مشکیزہ

پانی ایک مُدّ کے عوض بیچا کرتے تھے (کان یبیع عنها القربة بالمُدّ) ۔رسول اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس کنوئیں کو میرے ہاتھ جنت کے کنوئیں کے بدلے میں فروخت کردو۔ مالک نے عاجزی سے عرض کیا کہ میرے اور میرے عیال کے لیے اس کے سوا اور کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے لہٰذا میں ایسا نہیں کرسکتا۔ حضرت عثمانؓ کو رسول اکرم ﷺ کی بات پہونچی تو انھوں نے اسے خرید کر وقفِ مسلمین کردیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے بیر حاء اور دوسرے اموالِ انصار کے حوالے سے بعض اور کنوؤں کے میٹھے پانی سے رسولِ اکرم ﷺ کے لطف اندوز وسیراب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ وہ متعدد دوسری احادیث وسوانح وتاریخ کی روایات پر مشتمل اور ان سے مستفاد ہے۔ ان کا ایک ترتیب سے ذکر کیا جاتا ہے۔

بئر جاشم: مشہور سابقینِ اولین میں اہم ترین انصاری صحابی حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ کا کنواں تھا جو ان کے باغ (حائط) کے درمیان میں واقع تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کنوئیں سے استفادۂ نبوی کی روایت واقدیؒ سے ایک صحابی کی سند پر لی ہے۔ وہ صحابی حضرت الھیثم بن نصر اسلمیؓ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت سے چپک گیا۔ آپ ﷺ کے لیے میں بئر جاشم سے پانی لاتا تھا جو ابوالھیثم بن التیہان کا کنواں تھا اور جس کا پانی عمدہ تھا: "... فكنت آتيه بالماء من بئر جاشم- وهي بئر ابى الهيثم بن التيهان، وكان ماؤها طيباً..." (فتح الباری، ۱۰/۹۶)۔ حافظ موصوف نے مسلم کی ایک روایت کا مختصر حصہ یہ نقل کیا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار حضرت ابوالھیثم بن التیہان کے گھر پہونچے اور ان کے بارے میں دریافت کیا تو ان کی بیوی نے کہا کہ وہ ہمارے لیے میٹھا پانی لانے کے لیے گئے ہیں: "ذهب يستعذب لنا من الماء"۔

(فتح الباری، ۱۰/۹۴ و مابعد؛ طعامِ زیارت کے باب میں رسول اکرم ﷺ کے متعدد بار اس کنوئیں کے پانی سے استفادے کا ذکر ملتا ہے۔ ایک بار آپ ﷺ اور حضرات شیخینؓ بھوک کے عالم میں صحابی موصوف اور ان کی اہلیہ محترمہ کی ضیافت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ دوسری بار صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔

حضرت ابوالہیثم کا یہ کنواں ان کی آراضی کے درمیان میں ایک استراحت گاہ بھی تھا جہاں آپ ﷺ نے طعام وشروب کے بعد قیلولہ اور آرام فرمایا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ وہاں مستقل تشریف لے جایا کرتے تھے)

بیوت السقیاء نام کا ایک اور عمدہ، میٹھے ٹھنڈے پانی کا کنواں یا چشمہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا میٹھا پانی فراہم کیا جاتا تھا حالانکہ وہ امام قتیبہ کے بقول مدینہ منورہ سے دودن کی مسافت پر واقع تھا (ھی عینٌ بینھا و بین المدینۃ یومان) ۔ یہ امام ابوداؤد کی روایت ہے جو سندِ جید سے ہے اور جس کی تصدیق وتصحیح امامِ حاکم نے بھی کی ہے۔ روایات کے مطابق حضرت اسماءؓ کے فرزندانِ گرامی قدر ۔ انس، ہند اور حارثہ رضی اللہ عنہم ۔ بیوت السقیاء سے پانی لا دلا دکر ازواج مطہرات کے گھروں میں پہونچاتے تھے اور کبھی غلام نبوی حضرت رباح الاسودؓ باری باری سے ایک بار بیوت السقیاء سے اور بئر دوسری مرتبہ عرس سے پانی لاتے تھے..

(فتح الباری، ۱۰/۹۳-۹۴)

بئر عرس بھی ایک کنواں تھا جو کافی میٹھا پانی رکھتا تھا۔ غالبًا وہ بھی کافی فاصلے پر واقع تھا۔ حضرت رباح حبشیؓ غلام نبوی کے اس سے پانی لانے کا ذکر بیوت السقیاء کے بیان میں آچکا ہے۔ اس کی مزید تفصیل نہیں مل سکی۔

بئر مالک بن النضر انصاری اپنے مالک کی طرف نسبت رکھتا تھا اور ان کے نام سے جانا جاتا تھا، اس کا کوئی اور مخصوص نام نہ تھا۔ اس کے مالک مشہور خادمِ نبوی صحابی حضرت انس بن مالکؓ کے والدِ ماجد اور حضرت ام سلیم بنت ملحان انصاریؓ کے پہلے شوہر تھے۔ وہ غالبًا حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان کے قریب واقع تھا کیونکہ حضرت ابوایوبؓ میزبانِ نبوی کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کنوئیں سے پانی لایا کرتے تھے اور غالبًا پورے سات ماہ کے قیامِ نبوی کے دوران برابر اس کے میٹھے پانی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیراب کرتے رہے تھے: "کان ابو ایوب حین نزل عندہ النبی ﷺ یستعذب لہ الماء من بئر مالک بن النضر والد انس..." یہ دلچسپ اور اہم روایت بھی حافظ شارح نے واقدیؒ کی روایت سے نقل کی ہے جو حضرت ابورافعؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت سلمیٰؓ کی سند پر مروی ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/۹۴)

بلاشبہ مدینہ منورہ میں بہت سے دوسرے بئر (بـــــار) کنوئیں اور چشمے تھے۔ مقالہ نگار "المدینه المنوره" نے چوبیس سے زیادہ پانی کے چشمے بتائے ہیں جن میں اہم ترین "العین الزرقاء" ہے جس کا اجراء امیر معاویہ کے حکم سے ہوا تھا۔ مدینہ کا پانی ہلکا، سرد اور شیریں ہے"

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور۔ ان سب کا احاطہ واستقصاء مقصود نہیں ہے)

مدینہ منورہ کے مذکورہ بالا کنوئیں صرف اتنے ہی نہ تھے۔ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور اس کا ذکر متعدد کتابوں میں ملتا ہے۔ یہاں صرف ان کنوؤں کا ذکر کیا گیا جن سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا براہ راست واسطہ وتعلق نظر آیا اور جن کا میٹھا پانی آپ ﷺ کو پسند تھا۔ اور وہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے لیے مدینہ منورہ لایا جاتا تھا۔ جہاں آپ ﷺ خود بھی تشریف لے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے قیامِ مدینہ کے زمانے میں اور خاص کر اپنے اسفار ومغازی کے دوران دوسرے کنوؤں کا پانی ضرور نوش فرمایا تھا جیسے غزوۂ بدر کے دوران بدر کے مختلف اور آخر میں صرف بڑے کنوئیں کا پانی نوش کیا تھا۔ اور دوسرے مسلمانوں اور صحابہ کرام نے بلاشبہ بہت سے کنوؤں کا پانی پیا تھا۔

ان تمام مدنی کنوؤں کے پانی کے استعمالِ نبوی اور استفادۂ صحابہ کرام کے بارے میں چند اہم نکات ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو میٹھا اور ٹھنڈا پانی پسند تھا۔ ایسے پانی کو مختلف کنوؤں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

۲۔ ٹھنڈا، میٹھا اور عمدہ پانی پینا اور اس کی طلب وخواہش کرنا زہد وفقر کے خلاف ومنافی نہیں ہے، بلکہ وہ عین نعمتِ الٰہی کی طلب ہے۔

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجر وثواب کے وعدے پر کم از کم دو کنوؤں کے پانی کو تمام مسلمانوں کے لیے وقفِ عام کرایا۔

۴۔ حضرات ابوطلحہ انصاریؓ اور عثمان بن عفان امویؓ نے فرمانِ الٰہی اور فرمانِ نبوی سننے کے بعد قیمتی آراضی اور کنوئیں وقف کردیے۔

۵۔ میزبان اولین حضرت ابوایوب انصاریؓ نے پورے قیامِ نبوی کے دوران اپنے مہمان

گرامی کی خاطر میٹھے پانی کا اہتمام وانتظام کیا۔

۶۔ خدامِ نبوی دور دور کے کنوؤں سے رسولِ اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کے لیے میٹھا پانی لاتے تھے۔

۷۔ حضرت انس اور ان کے بھائی رسول اکرم ﷺ کی خدمتِ گرامی کے لیے مختلف کنوؤں سے میٹھا اور عمدہ پانی روزانہ ہی لایا کرتے تھے۔

۸۔ بئر رومہ کے وقف کرنے کے سلسلے میں ایک عمدہ اسلامی حکم سامنے آتا ہے۔ اس کے مالک نے اپنے فقر یا واحد ذریعۂ آمدنی کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے خواہش نبوی کے برعکس اسے وقف کرنے سے احتراز کیا تھا اور رسول اکرم ﷺ نے ان کا عذر قبول کر لیا تھا۔ اسی کے بعد حضرت عثمانؓ نے اس کی قیمت مالک کو ادا کی تھی تاکہ موخر الذکر کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی تلاش کر سکیں۔

مشروبِ عام: پانی

عام سادہ پانی پینے کے واقعات تو بے انتہا اور بے حد و بیکراں ہیں کہ وہ روز کا معمول تھا بلکہ شب روز کا مسلسل معمول تھا۔ پانی پیاس بجھانے کے لیے پیا جاتا تھا۔ مگر اس کے کچھ آداب واحکام بھی مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بیٹھ کر پانی پینے کا ادب ہے۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کھڑے کھڑے پانی پینے کا بھی معمولِ نبوی تھا۔ اور اس کے لیے کسی معقول یا غیر معقول عذر کی توجیہ نہیں ملتی۔ امام بخاریؒ نے کھڑے ہو کر پانی پینے کا ایک باب قائم کیا ہے: "باب الشرب قائما" اور اس کے تحت تین احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہی ہے جو آبِ زمزم کے کھڑے ہو کر پینے کے بارے میں آئی ہے اور باقی دو کا تعلق حضرت علیؓ کے معمول کے مبنی بر سنتِ نبوی ہونے سے ہے۔ ان دونوں میں یہ صراحت ہے کہ خلیفۂ چہارم نے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا اور وضاحت کی کہ رسول اکرم ﷺ نے بھی میری طرح کھڑے کھڑے پیا تھا لیکن حضرت علیؓ کے عمل کا بنیادی محرک اس خیالِ خام کی تردید کرنا تھا جو لوگوں نے اسی مبارک عہد میں پیدا کر لیا تھا۔ حدیثِ شریف کا جملہ ہے کہ کچھ لوگ کھڑے کھڑے پانی پینے

کومکروہ سمجھتے تھے:"ان نا سا یکر ھون الشرب قائما"۔ عام سادہ پانی پینے اور وضو کا بچا ہوا پانی پینے کے دونوں واقعات سے متعلق یہ دو احادیث ہیں اور حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے شارحین کرام نے سادہ پانی کھڑے ہو کے پینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ حدیث و اثر حضرت ابن عمرؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں چلتے پھرتے اور کھڑے کھڑے کھانے پینے کا معمول بھی تھا اور اس پر کوئی نکیر نہیں کی جاتی تھی۔

(بخاری، حدیث: ۵۶۱۵-۵۶۱۶؛ فتح الباری، ۱۰/۱۰۱-۱۰۷: حافظ موصوف نے بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کھڑے کھڑے پانی پینے اور کھانے کا جواز بہرحال ہے لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر کھایا پیا جائے۔ حضرت علیؓ کے عمل کو لوگوں کا ردِ عمل قرار دیا ہے کہ اس سے جواز ثابت کرنا ہی مقصود ہے۔ بہرحال متعدد احادیث دیگر سے کھڑے ہو کر پانی پینے کا معمول نبوی ملتا ہے۔ اس مسئلہ پر علماء کے مختلف مسالک کا ذکر بھی کیا ہے۔ حضرات صحابہ میں حضرات عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عائشہ صدیقہ، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور زبیر بن عوام وغیرہ رضی اللہ عنہم کھڑے کھڑے پانی یا مشروب پینے کو برا نہیں سمجھتے تھے (موطا، کتاب الجامع، "یشرب الرجل وھو قائم"۔ بعض محدثین نے اس کی کراہت کے ابواب باندھے ہیں ان میں مسلم، ترمذی وغیرہ شامل ہیں)

- ایک صحابیہ حضرت کبشہ انصاریہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو ایک آویزاں مشکیزے سے کھڑے کھڑے پانی نوش فرمایا۔

- حضرت ام ہانیؓ رسول اکرم ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں کہ آپ ﷺ کے پاس پیالۂ مشروب آیا اور آپ ﷺ نے پی کر انہیں عطا کر دیا اور انھوں نے پی لیا حالانکہ وہ روزے سے تھیں۔

(ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی افطار الصائم المتطوع)

پانی یا مشروب پینے کے باب میں بعض دوسرے آداب ہیں جیسے برتنوں/مشکیزوں وغیرہ کے منہ (فم) کو توڑ کر نہ پینے کا حکم، برتن/مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پانی وغیرہ پینے کی ممانعت، پانی/دودھ وغیرہ پیتے وقت برتن ہٹا کر کم از کم تین سانسوں میں پینے کی ہدایت، سونے چاندی کے برتنوں میں پینے اور کھانے کی ممانعت، رسولِ اکرم ﷺ کے استعمال کردہ برتنوں/پیالوں سے پینے کی سعادت اور برکت وغیرہ۔

(فتح الباری، ۱۰/۹۹-۱۲۷؛ مسلم، کتاب الاشربۃ، باب کراھۃ التنفس فی نفس الاناء واستحباب

النفس ثلاثا خارج الاناء، نیز ابوداؤد، ترمذی کے ہم معنی ابواب وغیرہ؛ ابوداؤد، باب الشراب من فی السقاء، حدیث: ۳۷۱۹/باب فی اختناث الاسقیۃ وغیرہ)

دودھ: بطور مشروب: دودھاری مویشی

دودھ کا دہرا استعمال ملتا ہے: وہ غذا کی حیثیت سے بھی ''کھایا'' جاتا تھا اور بطور مشروب بھی پیا جاتا تھا۔ دراصل دودھ میں غذائیت کے عناصر بہت ہوتے ہیں بالخصوص گاڑھے دودھ میں۔ ان میں اونٹنی کا دودھ بہت گاڑھا اور مقوی ہوتا تھا۔ احادیثِ زمزم کے باب میں یہ تاریخی واقعہ گذر چکا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے گھرانے کا کھانا گوشت کے علاوہ دودھ پر بھی مبنی تھا۔ دوسرے مویشیوں میں بھیڑ بکری اور گائے کا دودھ بھی استعمال ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ شہادتیں اونٹنی اور بکری کے دودھ کی ملتی ہیں۔ تقریباً ہر گھر میں ایک آدھ بکری اسی مقصد سے ضرور ہی پالی جاتی تھی اور یہی حال اونٹنی کا بھی تھا۔ متمول اور کھاتے پیتے گھرانوں میں دودھاری مویشیوں کے ریوڑ کے ریوڑ ہوتے تھے جن کو گھروں میں چارا دیا جاتا تھا اور اونٹنیوں کو بالخصوص چراگاہوں میں چرائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ گھریلو چارے پر پرورش پانے والی بکریاں ''داجن/داجنۃ'' کہلاتی تھیں جو اچھے چارے کے سبب خاصی فربہ اور اتنی ہی دودھاری ہوتی تھیں۔ چرائی پر پلنے والے مویشی بھی خاصے فربہ اور دودھاری ہو جاتے تھے بشرطیکہ ان کی چَرائی اچھی چراگاہوں اور عمدہ چارے پر کی جائے۔ اس روایتِ عرب کی بنا پر مختلف مقامات میں چراگاہیں (حمیٰ) وجود میں آئی تھیں جو اپنے اپنے مالکوں کی ملکیت ہوتی تھیں۔ بطور سربراہ ریاستِ اسلامی رسولِ اکرم ﷺ کی محفوظ چراگاہیں (حمیٰ) بھی تھیں جن میں باقاعدہ محافظ، افسر و کارکن رکھے جاتے تھے۔ نبوی منائح (دودھاری اونٹنیوں) کی ایک بڑی تعداد کا ذکر روایاتِ حدیث و سیرت میں ملتا ہے۔ ان کا دودھ روزانہ صبح و شام کاشانۂ نبوت میں لایا جاتا تھا۔ بلاشبہ ازواجِ مطہرات کے نان نفقہ میں ان اونٹنیوں کے دودھ کی رسد کا بھی ایک بڑا حصہ تھا۔ اسی طرح دوسرے عربوں اور صحابہ و صحابیات کے گھروں میں اونٹنیاں پلی تھیں اور زیادہ ہوتیں تو وہ بھی چراگاہوں یا باڑوں (مرابض) میں رکھی جاتیں۔ دودھاری جانوروں اور گوشت کے

مویشیوں کی خاطر اجیروں اور محنت کشوں کا ایک خاص طبقہ ''چرواہی'' (راعی – رعاۃ) وجود میں آ گیا تھا۔

دودھ پینے کی ایک فضیلت اور اس کی ایک دینی جہت بھی ہے۔ امام بخاریؒ نے دودھ پینے کے باب (شرب اللبن) کو آیت کریمہ: ''من بین فرث ودم لبنا خالصاً سائغا للشٰربین'' ۔نحل-۶۶'' (گوبر اور لہو کے بیچ میں سے ستھرا دودھ، رچتا پینے والوں کو) سے مربوط کیا ہے اور اس کے تحت پہلی حدیث: ۵۶۰۳ نقل کی ہے جس میں یہ ذکر خیر ہے کہ اسراء کی رات رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں دودھ کا پیالہ اور شراب کا جام پیش کیا گیا اور حدیث: ۵۶۱۰ کے تحت آپ ﷺ نے دودھ کے پیالے کا انتخاب فرمایا اور نوش فرمالیا۔ اس انتخابِ نبوی کو صحیح اقدام اور ہدایت یافتہ کہا گیا اور اسی سے پوری امتِ محمدیہ کی مجموعی ہدایت یابی کی فالِ نیک لی گئی۔ (بخاری مذکورہ بالا؛ فتح الباری، ۱۰/ ۸۸-۹۳؛ نیز دیگر کتب حدیث)

سیرت نگاروں میں بلاذری نے بطورِ خاص رسول اکرم ﷺ کی اونٹنیوں (منائح) کی تفصیل دی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ غابہ کی چراگاہ میں رسول اکرم ﷺ کی متعدد دودھاری اونٹنیاں (لقائح) تھیں اور ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک کے لیے ایک اونٹنی مخصوص تھی۔ حضرت ام سلمہؓ کے لیے مخصوص اونٹنی کا نام ''العریس'' تھا جبکہ حضرت عائشہؓ کی اونٹنی کا نام ''السمراء'' تھا، اور حضرت سودہؓ کی اونٹنی ''البغوم'' کہلاتی تھی۔ دوسری لقائح کے نام تھے: ''الحنّاء، السعدیة، الیسیرة، الریاء، الشقراء، عجوة، زمزم، سقیاء، برکة، ورسة، اطراف اور اطلال''۔ رسولِ اکرم ﷺ کی سواری کی اونٹنی القصواء/ العضباء کہلاتی تھی۔

مختلف چراگاہوں کے حوالے سے ان دودھاری اونٹنیوں کی تعداد بھی ملتی ہے اور ان کے حصول کے ذرائع کا بھی علم ہوتا ہے۔ غابہ میں دس دودھاری جانور تھے جن میں سے تین اونٹنیاں حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ نے خرید کر آپ ﷺ کو ہدیہ کی تھیں۔ وہ بنوعقیل کے ریوڑ میں سے خریدی گئی تھیں اور اپنی خوبصورتی اور دوسری صفات کے لیے مشہور تھیں، باقی سات اونٹنیاں آپ ﷺ نے خرید فرمائی تھیں۔ ان میں سے بعض کے جماء کی چراگاہ میں اور بعض کے قباء کے قریب واقع ذوالجدر نامی چراگاہ میں چرانے کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک اور

اونٹنی بنو عقیل کے ریوڑ سے خرید کر ہدیہ کی تھی۔ اس کا نام ''مہرۃ'' تھا۔ وہ سب دودھاری (غزر) تھیں اور ان سب کی خوب دیکھ بھال ہوتی تھی۔ روایات سیرت وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو عقیل عمدہ جانوروں، مویشیوں، وغیرہ کے تاجر تھے اور خاص نسل کے مویشیوں کی پرداخت کے لیے مشہور تھے۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابیؓ نے ''بردہ'' نامی ایک اونٹنی ہدیہ کی تھی۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی تھیں کہ میں نے ایسی خوبصورت اور اتنی دودھاری اونٹنی نہیں دیکھی۔ وہ دو اونٹنیوں کے برابر دودھ دیتی تھی۔ اور مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے مخصوص تھی کہ اس کا دودھ سب سے عمدہ ہوتا تھا۔ یہ آخری جملہ یا تبصرہ بہت عمدہ اور معنی آفریں ہے کہ ایک اونٹنی کا دودھ مہمانوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور یہ پرانا عرب سماجی رواج بھی تھا۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ذاتی ملکیت میں سات اونٹنیاں (اعنز) تھیں جن کو حضرت ام ایمن چراتی تھیں۔ ایک دوسرے صحابی کے مطابق آپ ﷺ کی اونٹنیوں کو کبھی احد کے علاقے میں، کبھی الجماء کی چراگاہ اور کبھی ذوالجدر کے علاقے میں چرانے کے لیے بھیجا جاتا تھا اور سر شام ان کو ان کے باڑوں میں پہونچا دیا جاتا تھا۔ وہ رات وہاں گذارتی تھیں، اور دوسری صبح پھر ان کو ان کی چراگاہوں میں لے جایا جاتا تھا۔ ان ہی چراگاہوں میں سے ایک میں عکل نامی قبیلہ کے آٹھ افراد کو رسول اکرم ﷺ نے رکھ کر اونٹوں کے دودھ سے ان کی پرورش کی تھی اور ان کی بیماری دور کی تھی۔ اس کا صلہ انھوں نے یہ دیا کہ افسر نبوی کو قتل کر کے اونٹوں کو ہنکا لے گئے۔ جس کی بعد میں ان کو سخت سزا ملی۔

(بخاری، کتاب الجهاد، باب اذا فرق المشرک المسلم الخ؛ کتاب المحاربين وغیرہ؛ ترمذی، ابواب الطهارة، باب ماجاء في بول مايو كل لحمه وغیرہ)

ان نبوی لقائح / منائح وغیرہ کو صبح وشام دونوں وقت دوہا جاتا تھا اور ان کا دودھ بڑے برتنوں / مشکوں میں بھر کر لایا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق دو بڑی مشکوں میں ان کا دودھ ازواجِ مطہرات کے گھروں میں آتا تھا۔ بعض دوسری مقدار کی روایات بھی ملتی ہیں۔ باڑوں سے دودھ گھروں تک پہونچانے والے کئی حضرات تھے جن میں موالی نبوی شامل تھے۔ ان میں سے ایک حضرت ابو رافعؓ بھی تھے جو دو مشکیزے لاتے تھے۔ بہر حال ایک صراحت یہ بھی ملتی ہے

کہ ذوالجدر اور غابہ کی اونٹنیوں کا دودھ بالعموم رات ہی کو لایا جاتا تھا اور دوسروں کا صبح وشام دونوں وقت۔ بردہ نامی اونٹنی کے بارے میں وضاحت ملتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے مہمانوں کے لیے بطور خاص اسے دونوں وقت دوہا جاتا تھا۔ بلاذری کے بیان کی تصدیق دوسرے مورخین اور سیرت نگاروں سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں ابن اسحاق وابن ہشام، ابن سعد، واقدی کے علاوہ متعدد دوسرے شامل ہیں۔ محدثین کرام کی بعض روایات واحادیث بھی اس کی تصدیق وتائید کرتی ہیں۔

بلاذری کے مطابق رسول اکرم ﷺ کے پاس دوسرے دودھاری مویشی بھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان میں بھیڑ بکریاں (غنم) دونوں تھیں۔ ان کے ضمن میں ایک دلچسپ بیان یہ ملتا ہے کہ ان کے دودھ پر حضرت ماریہ قبطیہؓ اور ان کے فرزندِ گرامی حضرت ابراہیم کی پرورش وپرداخت ہوتی تھی۔ یہ صرف حضرت ماریہ اور فرزند حضرت ابراہیم علیہما السلام کا معاملہ نہیں تھا۔ دوسری ازواجِ مطہرات اور ان کے اہلِ خانہ کے علاوہ رسول اکرم ﷺ کے غنم کے دودھ کے استعمال کے شواہد ملتے ہیں۔ وہ بطور مشروب ایک عام عرب پسندیدہ کھاجا تھا اور آج بھی ہے۔

بہر حال ان دودھاری مویشیوں کے دودھ کا استعمال بطور غذا بھی ہوتا تھا اور بطور مشروب بھی۔ ازواجِ مطہرات میں سے کئی شخصیات کا اور ان کی باندیوں کا بیان ہے کہ ہمارا زیادہ تر کھانا اور غذا (عیشنا) اونٹ اور بھیڑ بکری (غنم) کے دودھ پر مشتمل تھی۔ حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ ہمارا زیادہ تر کھانا دودھ پر مشتمل ہوتا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی دودھ میں سے تھوڑا سا حصہ بطور غذا اور بطور مشروب استعمال فرماتے تھے اور آئے گئے کو بھی پلاتے تھے۔ ازواجِ مطہرات بھی روزانہ صبح وشام اس دودھ کو استعمال فرماتی تھیں۔ یہ عام غذا تھی۔

(بلاذری، ۱/ ۴۴۹-۴۵۰؛ ۵۱۲-۵۱۴؛ واقدی، ۵۶۸-۵۷۰؛ ابن ہشام، ۲/ ۲۸۱-۲۸۷؛ نیز بخاری، کتاب الجهاد، باب من رأى العدو فنادىٰ باعلىٰ صوته: ياصباحاه؛ باب غزوة ذات القرد؛ كتاب الوضوء، باب ابوال الابل؛ فتح الباری کے مباحث متعلقہ؛ متعدد روایات سیرت واحادیث سے بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ دودھ بطور غذا بھی خوب استعمال ہوتا تھا، نیز معیشت نبوی: مدینہ منورہ میں-۲، ۲۱-۲۳؛ اور اس کے حواشی وتعلیقات)

دودھ بطور مشروبِ نبوی

مکی دورِ حیات میں قبل بعثت کا سب سے بڑا واقعہ اس باب میں یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیراط کی اجرت پر بکریاں چراتے تھے۔ اس واقعہ اور سنتِ انبیاء کی مختلف تاویلات وتشریحات کی گئی ہیں مگر صحیح ترین توجیہ یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اجرت پر یہ کارِ انبیاء علیہم السلام انجام دیا تھا جیسے آپ ﷺ سے قبل دوسرے اور نبیوں نے معاوضہ اور اجرت پر بکریوں کی چرواہی کی تھی۔ محدثین کرام بالخصوص امام بخاریؒ نے اس سنتِ محمدی ﷺ کو اجرت کے باب میں لاکر اس توجیہ وتاویل کی لاجواب تصدیق کر دی ہے جو ان کے ترجمۃ الباب کی فقہی، دینی اور تشریحی بصیرت کی دلیل ہے اور باقی کسر حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تشریحات سے پوری کردی ہے۔

- حضرت انسؓ کی ایک حدیث مدنی زمانے کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک بکری کو دوہا اور اس کا دودھ پیا پھر پانی سے کلی کر کے فرمایا کہ دودھ میں چکنائی ہوتی ہے: "حلب رسول اللہ ﷺ شاۃ وشرب من لبنھا.." (ابن ماجہ، حدیث: ۵۰۱ نیز ماقبل)۔ اس میں بطور خاص آپ ﷺ کے دودھ دوہنے (حلب) کا ذکر ہے جس کا تعلق چرواہی کے کام سے ہے۔

چرواہی کے کارِ نبوت سے دودھ کے بطور مشروب پینے کا ایک واضح، براہ راست اور سماجی وتہذیبی ارتباط ہے۔ بلاشبہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی اس چرواہی کے دوران اپنی بکریوں کا دودھ نوش فرمایا تھا اور یہ سلسلہ تا زندگی جاری بھی رہا تھا۔ بعد نبوت کے بعض واقعات معجزاتی انداز سے رسولِ اکرم ﷺ کے بکری کے دودھ پینے یا بطور مشروب استعمال کرنے کا اثبات کرتے ہیں:

- مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی چرواہی کا کام کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے ریوڑ کی ایک پٹھور بکری کے تھن سے بطور معجزہ دودھ نکال کر نوش فرمایا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس میں شرکت کی سعادت پائی تھی۔

- مکہ سے مدینہ کی ہجرت کے دوران حضرت ام معبد خزاعیؓ کے خیمہ میں اسی طرح معجزاتی

طور سے ایک بکری کے دودھ پینے کا واقعہ ملتا ہے۔ اس بار بھی حضرت ثانی اثنین ؓ شریکِ سعادت رہے تھے۔

۔بعض دوسرے مواقع پر اور اس سفرِ ہجرت کے دوران حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے بطور خاص اور بعض عربوں نے رسول اکرم ﷺ کی تواضع بکری کے دودھ سے کی تھی۔ ان سب واقعات میں دودھ پینے کے ضمن میں پیاس کا ذکر ضرور ملتا ہے۔

(بخاری، حدیث:۵۶۰۷: ''...قال ابوبکر: مررنا براع — وقد عطش رسول اللہ ﷺ — .. فحلبت کثبة من لبن فی قدح، فشرب ...'' فتح الباری،۱۰/ ۸۸-۹۱؛ نیز حدیثِ مسلم،۹۰ (۲۰۰۹) اگلی حدیث مسلم:۹۱ میں حضرت سراقہ بن جعشم کے تعاقب کے بعد دودھ کا ہدیہ دینے کا واقعہ بھی ہے)

دودھ بطور مشروب رسول اکرم ﷺ کو بہت مرغوب تھا اور ازواجِ مطہرات کی رغبت وپسند میں بھی وہ سرِ فہرست تھا۔ متعدد احادیث وروایات میں اس کی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ محدثین کرام نے اپنی اپنی ''کتاب الا شربة'' میں دودھ پینے کے خاص ابواب باندھے ہیں۔ ان ابواب میں رسول اکرم ﷺ کے دودھ کے استعمال کے مختلف مواقع واحوال ملتے ہیں۔ اسے آپ ﷺ نے اپنے گھروں میں بطور مشروب پیا اور پلایا، دورانِ سفر/ اسفار اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ صحابہ وصحابیات کے ہدایائے دودھ کو قبول کر کے استعمال فرمایا، زیاراتِ معاشرتی کے دوران دودھ کو نوش فرمایا۔ مجالسِ نبوی میں بھی دودھ کے پیالے گردش میں آئے۔ ان احوال کو ان کے خاص پس منظر میں بیان کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام میں بطور خاص اصحاب صفہ کو رسول اکرم ﷺ اکثر وبیشتر اپنے گھر بلا کر دودھ پلایا کرتے تھے اور دوسرے مہمانوں کو اس عام مشروب کے پلانے کا ذکر ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب الاستئذان، باب اذا دُعی الرجل الخ وغیرہ: عن ابی ہریرة قال: دخلت مع رسول اللہ ﷺ فوجد لبنا فی قدح ...الخ نیز دیگر احادیث)

انفرادی مشروب

رسولِ اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر دودھ کو بطور مشروب نوش فرمایا اس کے چند واقعات

ذیل میں درج ہیں:

-حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دودھ نوش فرمایا اور صرف کلی کرلی اور فرمایا کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے: "ان رسول اللہ ﷺ شرب لبنا فمضمض، وقال: ان له دسماً" (بخاری، حدیث:۵۶۰۹؛ فتح الباری، ۱۰/۸۸-۹۱)۔ اس روایت و حدیث اور سنتِ نبوی کا تعلق دراصل اس سلسلۂ روایات سے ہے جو یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ دودھ پینے سے تازہ وضو کرنے کی ضرورت نماز وغیرہ کے لیے پیش نہیں آتی۔ اس کے پینے کے بعد صرف کلی کرنا کافی ہے کیونکہ اس کی چکنائی منہ میں رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی فقہی مسئلہ بتانا تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں کے استعمال سے تازہ وضو کرنا یا سابق وضو کا نقض لازم نہیں آتا بالعموم تازہ دودھ پیا جاتا تھا مگر بسا اوقات ٹھنڈے دودھ یا رکھے ہوئے دودھ کو گرم کرکے نیم گرم پیا جاتا تھا۔ یہ مسئلہ انہیں سے متعلق ہے جیسا کہ بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی احادیثِ گذشتہ منسوخ ہیں اور وضو نہ کرنے کی احادیث ناسخ ہیں، متعدد دوسرے محدثین کرام نے حضرت ابن عباسؓ کی یہی حدیث یا اس کی ہم معنی دوسری احادیث دوسری اسناد سے اسی سبب سے نقل کی ہیں۔ یہ ان احادیث نبوی اور ان کے احکام کی توسیعات ہیں جن میں آگ پر پکے ہوئے کھانوں کے کھانے سے نقض وضو کی منسوخیت بتائی گئی ہے۔

(بخاری، کتاب الوضوء، هَلْ یمضمض من اللبن؟ ؛ابوداؤد، باب فی الوضوء من اللبن ؛ترمذی، ابواب الطهارة، باب فی المضمضةمن اللبن وغیرہ)

-ایسا ہی ایک فقہی مسئلہ اور دینی معاملہ دودھ کے پیالے نے حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن حل کیا تھا۔ صحابہ کرام کو شک تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ روزے سے ہیں یا نہیں؟ آپ ﷺ کی چچی حضرت ام الفضلؓ نے آپ ﷺ کی خدمتِ گرامی میں دودھ کا پیالہ بھجوایا اور آپ ﷺ نے سب کے سامنے اسے نوش فرمالیا۔ جس نے ثابت کردیا کہ یوم عرفہ کا روزہ ضروری نہیں بلکہ سنت بھی نہیں ہے۔

(بخاری، حدیث:۵۶۰۴؛ فتح الباری، ۱۰/۸۸-۹۳ وغیرہ؛ بعض صحابہ کرام نے عرفہ کا روزہ رکھا تھا اس لیے اسے مستحب قرار دیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا تھا۔ بعض علماء اسے سنت بتاتے ہیں)

دعوتوں میں دودھ کا استعمال عام

عرب معاشرہ اور اسلامی نبوی تمدن میں دودھ کو دعوتوں میں استعمال کرنے کا ایک عام رواج بھی تھا اور سماجی رویہ بھی۔ وہ دعوتیں خواہ مہمانوں کو اپنے گھروں میں بلا کر کی جاتیں جیسے رسول اکرم ﷺ نے اصحاب صفہ کو بالخصوص اور دوسرے صحابہ کو بالعموم دعوت دے کر بلایا اور ان کو دودھ کا مرغوب اور غذائیت سے بھرپور کھاجا یا مشروب پلایا۔ یہ ایک مستقل سنت نبوی تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو متعدد بار گھر یا منزل پر لے جا کر دودھ کے پیالے سے سیراب فرمایا (بخاری، کتاب النکاح، باب قول اللہ تعالیٰ: کلوا من طیبات الخ)۔ اسی طرح خود حاضر خدمت ہونے والے مہمانوں اور وفود کے اراکین کو بھی دودھ سے سیراب و شادکام کیا جاتا تھا جیسا کہ طعام کے باب میں کئی وفود بالخصوص بنو المنتفق کے ارکان وفد کی ضیافتِ حضرت عائشہؓ کے ضمن میں گذر چکا ہے اور بعض دوسرے واقعات بھی ہیں۔ ان کے علاوہ خود رسالتمآب ﷺ اپنی ازواج کے گھروں یا ان کی دعوتوں میں دودھ کا استعمال فرماتے تھے جیسا کہ گوہ (ضب) کے گوشت والے واقعہ کے بیان میں یہ ذکر آتا ہے کہ آپ ﷺ نے گوشت سے تو احتراز فرمایا تھا مگر دودھ نوش فرما لیا تھا اور پنیر کھالی تھی: "شرب اللبن و اکل الاقط"

(بخاری، کتاب الاطعمة، باب ما کان النبی ﷺ لا یاکل حتی یسمّی له.. الخ اور دوسرے ابواب)

-ایک دلچسپ اصول و قاعدۂ طعام ہے کہ "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں"۔ اس کے حوالے سے دودھ کی ضیافت کا واقعہ موطا کی کتاب الجامع / ماجاء فی معی الکافر میں یہ آیا ہے۔ ایک کافر رسول اکرم ﷺ کا مہمان ہوا تو رسول اکرم ﷺ نے اس کی ضیافت کے لیے ایک بکری کا دودھ پلایا مگر وہ سیر نہ ہوا لہٰذا تابڑ توڑ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا تو شادکام ہوا۔ دوسری صبح اس نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر اسے دودھ پلایا گیا اور ایک بکری کا دودھ تو پی لیا مگر دوسری کا وہ پورا پی نہ سکا۔ اس واقعہ میں اس حدیث و فرمانِ نبوی کا واقعاتی پس منظر بھی ہے اور حدیث کی شانِ وسبب نزول بھی۔ وہ دونوں مل کر معانی کی تعیین کرتے ہیں۔

-دودھ پینے کے دوسرے واقعات "طعامِ لبن" کے باب میں بھی بیان کیے گئے ہیں اور

بعض کی تکرار بھی یہاں ہوگئی ہے تاکہ صحابہ کے دودھ پینے کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔

دودھ کے پیالے کی داہنی گردش

۔مجلسِ نبوی میں رسولِ اکرم ﷺ کا طرزِ عمل یا سنتِ متواترہ یہ بھی تھی کہ مشروب تھوڑا ہو یا زیادہ، نوش فرمانے کے بعد اسے دائیں طرف کے صحابی جلیل کی طرف بڑھا دیتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ کی ایک اور سنتِ ثابتہ یہ تھی کہ ہر کام دائیں جانب سے کیا جائے: (الایمن فالایمن) اور پھر وہ پیالہ گردش کرتا ہوا حلقۂ یارانِ نبی ﷺ کی بائیں جانب پہونچتا تھا اور پھر آخری نقطۂ اتصال پر اپنی گردش تمام کرتا تھا۔ اس سنت یا سنن کے مجموعی تناظر نے بعض اوقات دلچسپ صورتِ حال پیدا کی۔ اس کا ذکر بعض بے انتہا معنی خیز احادیث کے ذریعہ ملتا ہے۔ ان کا ذکر مختلف احادیث کے مجموعہ اور ان کی روایات کے ذریعہ کیا جاتا ہے:

۔حضرت انس بن مالکؓ خادمِ نبوی کی روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو گھر تشریف لاتے دیکھا تو میں نے ایک بکری دوہی اور اس میں کنوئیں کا ٹھنڈا پانی ملایا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پیالہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے اسے نوش فرمایا۔ مجلس میں اتفاق سے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ ﷺ کے بائیں جانب تشریف فرما تھے اور داہنی جانب ایک اعرابی صحابی تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے: الایمن فالایمن فرماتے ہوئے پیالہ پہلے اعرابی کو دے دیا جس نے آپ ﷺ کا بچا ہوا دودھ پیا اور پھر اس اعرابی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیالہ دیا۔

(بخاری، حدیث: ۵۶۱۲؛ فتح الباری، ۱۰/۹۴-۹۶: روایت میں اعرابیؓ کے حضرت ابوبکر صدیق کو پیالہ دینے کا حوالہ نہیں ہے لیکن وہ مضمر حقیقت ہے، ورنہ الایمن فالایمن کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ البتہ دوسری روایات واحادیث سے اس واقعیت کی تصدیق بھی ہوتی ہے)

۔حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ نوجوان صحابی تھے۔ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے دائیں بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کے بائیں کچھ بزرگ تشریف رکھتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے نوجوان سے پوچھا کہ دودھ یا شراب (مشروب) کا پیالہ ان بزرگوں کو دے دوں؟ مگر غلام (نوجوان) نے بڑی صلابت سے عرض کیا کہ آپ ﷺ سے عطا ہونے والی سعادت کے بارے میں کسی اور کو

ترجیح نہیں دے سکتا۔ آپ ﷺ نے پیالہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ امام بخاریؒ نے اگرچہ اس حدیث کو دوسرے باب میں ایک دوسرے حکم کے تحت نقل کیا ہے مگر ہے وہ بھی داہنے سے آغاز کرنے کے مسئلہ و معاملہ میں۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حق تو دائیں ہاتھ والے کا ہے، اگر وہ اجازت دے دے تو بائیں سے شروع کیا جا سکتا ہے لیکن اجازت ہی کا تو مسئلہ ہے۔

(بخاری، حدیث: ۵۶۲۰؛ فتح الباری، ۱۰/ ۱۰۸-۱۱۰: اصل تعلیم یہ دینی معلوم ہوتی ہے کہ مجلس میں جام و پیالہ کی گردش داہنی طرف سے ہونی چاہیے۔ اگر اجازت بھی کوئی داہنی طرف والا دے دے تو بھی الایمن فالایمن کا اصول سنت نہیں توڑا جا سکتا)

مجلسِ نبوی میں مشروب

بعض مجالسِ نبوی کے حوالے سے دودھ بطور مشروبِ مجلس ہونے کے اہم اور دلچسپ اور معنی خیز واقعات ملتے ہیں: ان سے بعض آداب و احکام نکلتے ہیں جیسے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انفرادی مشروب کے واقعات و روایات سے برآمد ہوتے ہیں۔ یہ بات بلکہ یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول اور ہر عمل حکم و وحیٔ الٰہی پر مبنی ہوتا تھا اور وہ اسلامی احکام و آداب ہر مقام اور ہر چیز میں بتاتا رہتا تھا۔ ان معاشرتی معاملات میں بھی سنتیں اور نوافل چھپے ہوئے تھے لہٰذا سماجی اعمال کے ساتھ ساتھ ان کے دینی مضمرات کو بھی ہمیشہ مدنظر رکھنا ضروری ہے، ورنہ نبوی اعمالِ معاشرت کی صحیح تفہیم ہو سکے گی اور نہ ہی اس پر صحیح عمل ہو سکے گا۔

دودھ کے برتن کو ڈھانکنا

۱۔ حضرت ابو حمید انصاریؓ نقیع کے مقام سے دودھ کا پیالہ/ برتن لائے تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اسے ڈھانکا کیوں نہیں؟ اس پر صرف ایک لکڑی ہی رکھ لیتے۔ یہ حدیث دو مختلف و ہم معنی متون کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ان دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دودھ کا پیالہ رسول اکرم ﷺ کی خدمتِ گرامی میں لایا گیا تھا، اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور یہ حدیث

دراصل اس مستقل سنت اور مستقل حکم کا ایک اظہارِ محض ہے جس کے تحت تمام کھانے پینے اور دوسری چیزوں کے برتنوں کا ڈھکا رہنا ضروری ہے، دینی لحاظ سے بھی اور صحت کے اعتبار سے بھی، بلکہ صحت کے معاملات ہی نے اسے دینی حکم کا رخ دیا ہے اور وہ مصالحِ بندگان کو عللِ احکام قرار دیتا ہے۔ (بخاری، حدیث: ۵۶۰۵-۵۶۰۶؛ فتح الباری، ۱۰/ ۸۸-۹۱)

حافظ ابن حجرؒ نے مسلم کی دو احادیث بیان کی ہیں: ایک تو حضرت ابوحمید ساعدیؓ کی یہی دودھ لانے کی حدیث ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبیذ کا پیالہ اسی طرح بلا ڈھکے پیش کیا تھا جس پر آپ ﷺ نے اسے ڈھانکنے کی ہدایت دی تھی۔ ان دونوں احادیث کی تفہیم میں حضرت شارحؒ ابہام و الجھن کا شکار ہیں۔ وہ بلاشبہ دو واقعات ہیں کیونکہ ایک میں نبیذ کا ذکر ہے اور دوسرے میں دودھ کا۔ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ مشروباتِ مجلس میں اس پر مزید بحث آتی ہے۔

(بخاری، باب تغطية الانـاء، حدیث: ۵۶۲۳-۵۶۲۴ میں برتنوں کے ڈھانکنے کے علاوہ بعض اور آداب معاشرت ہیں جن کا ذکر اپنے مقام پر آتا ہے؛ نیز مسلم، کتاب الاشربة، باب الامر بتغطية الانـاء وايكاء السقـاء الخ میں متعدد امور و آداب کا ذکر ہے؛ ابوداؤد، کتاب الاشربة، باب ایکاء الآنية، احادیث: ۳۷۳۱-۳۷۳۵ وغیرہ؛ نیز مسلم، باب فی شرب النبيذ، تخمير الانـاء)

دودھ میں پانی ملانا

بطور مشروب دودھ پینے کا ایک عرب طریقہ یہ بھی تھا کہ تازہ دودھ کی گرمی نکالنے کے لیے اس میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی بھی ملا دیا جاتا تھا۔ اس سے حدتِ لبن میں کمی آ جاتی تھی اور شاید لذت بھی بڑھ جاتی تھی۔ شارحینِ احادیث نے اس پر ذرا کم کلام کیا ہے۔ بہر حال متعدد روایات میں اس عرب رواج کا ذکر ملتا ہے اور اسی کو اسلام اور دین کا ایک نفلی حکم بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تقریرِ نبوی سے ثابت ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے اسی بنا پر شاید اس قسم کی احادیثِ نبوی کو جس باب کے تحت بیان کیا ہے اس کا عنوان ہی یہ ہے: پانی ملا کر دودھ پینے کا باب: "بـاب شـرب اللبـن بـالمـاء"۔ شارحِ گرامی نے حدت و حرارت توڑنے کی مختصر بات کہی ہے مگر لذت کے

اضافے سے متعلق کوئی بات نہیں کہی۔ البتہ ان کی شرح میں یہ تنبیہ بہت اہم ہے کہ بیچنے کے لیے دودھ میں پانی ملانا دھوکہ دھڑی (غش) ہے لہٰذا حرام ہے۔ اس کے تحت بخاری میں دو احادیث ملتی ہیں:

۱۔ حضرت ابوبکر اور ایک اعرابیؓ کی مجلس نبوی میں دودھ پینے کی گذشتہ روایت جس میں داہنی گردش کا ذکرِ خیر آیا ہے۔ (بخاری، حدیث: ۵۶۱۲؛ فتح الباری، ۱۹/۹۴ومابعد وغیرہ)

۲۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک صاحب کے ساتھ ایک انصاری صحابی کے کھیت/ باغ (حائطه) میں داخل ہوئے تو وہ نالیوں میں پانی ادھر سے ادھر کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گذشتہ رات کا باسی پانی طلب فرمایا اگر وہ ان کے مشکیزے میں ہو، ورنہ کنوئیں/ نالی کا پانی چلو سے نوش فرمالیں۔ انصاری صحابی نے عرض کیا کہ باسی ٹھنڈا پانی ہے اور انھوں نے ایک پیالہ میں پانی ڈالا اور پھر اس پر اپنی گھریلو پالتو بکری (داجن) کا دودھ دوہا۔ خدمتِ اقدس میں وہ پانی ملا دودھ پیش کیا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابی نے نوش کیا۔

(بخاری: حدیث: ۵۶۱۳؛ فتح الباری، ۱۰/۹۴-۹۸: حضرت شارح نے واقدیؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ کے باغ میں تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے دودھ میں برفاب ملا کر پیش کیا تھا: "... فاتاه بشحب فيه ماء كانه الثلج فصبّه على لبن عنز له وسقاه" ۔انھوں نے مختلف رطب سے بھی ضیافت کی تھی اور ان کی التجا پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی جھونپڑی (عریش) میں قیلولہ بھی فرمایا تھا۔ یہ تین چار تمدنی معاملات کا ذکرِ خیر ہے)

۳۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سفرِ ہجرت کے دوران ایک راعی سے جو دودھ لیا تھا اس میں بھی پانی ملا کر اس کی حدت تمام کی تھی۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسری روایات واحادیث اس عرب اسلامی روایت کو بیان کرتی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کی توجیہ مختلف انداز سے کی ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/۹۷؛ بخاری، كتاب اللقطة، بابٌ ؛ كتاب الاشربة، باب شرب اللبن)

دودھ میں شہد

ایک اور عرب اسلامی تہذیبی روایتِ نائو نوش یہ ملتی ہے کہ دودھ میں شہد ملایا جاتا تھا۔ وہ پانی کی آمیزش سے بہتر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ شہد بہت پسندیدہ اور مرغوب اور افضل شے تھی اور اس کے مقابلے میں پانی اپنی تمام تر ناگزیریت کے باوجود ایک عام شے تھا۔ پھر دودھ بھی ایک افضل اور بہتر و پسندیدہ تر مشروب سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں بہترین کی آمیزش اسے دوآتشہ بناتی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ کو بھی یہ آمیزشِ افضلین خاص پسند تھی کیونکہ شہد تو آپ ﷺ کو بہت مرغوب و پسند تھا اور اس کی فضیلت میں کئی احادیث ملتی ہیں جیسا کہ شہد کے استعمالِ خالص کی فصل خاص میں ذکر آتا ہے۔ اس کے علاوہ شہد کی مٹھاس سے دودھ کی لذت بڑھ جاتی تھی۔

- نبیذ کے باب میں ذکر آچکا ہے کہ بنو عباس کے چچازاد خاندان کے لوگ سقایہ حج میں دودھ اور شہد پلاتے تھے۔ اس کے علاوہ عرب جاہلی کے بارے میں بھی روایات آتی ہیں کہ بعض اکابر قریش کا سقایہ شہد اور دودھ پر مشتمل ہوتا تھا جس طرح وہ شہد اور پانی پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔

حضرات صحابہ کرامؓ سنتِ نبوی اور عرب ریت پر عمل پیرا تھے۔ وہ خود بھی دودھ میں شہد ملا کر پیتے تھے اور دوسروں کو پلاتے تھے۔ حضرت ابن شبرمہ کی شہادت ہے کہ حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے ہاں جب بھی کوئی شادی (عُرس) ہوتی تو وہ دودھ اور شہد ہی پلاتے تھے:

”اذا کان فیھم عرس کان طلحۃ والزبیر یسقیان اللبن والعسل“۔

(نسائی، کتاب الاشربۃ، ذکر الاشربۃ المباحۃ)

شہد بطور مشروب

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میٹھی چیزیں اور شہد بطور خاص بہت پسند تھا: ”کان النبی ﷺ یعجبہ الحلواء والعسل“ (بخاری، حدیث ۵۶۱۴)۔ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو مشروبات کے ضمن / باب کے تحت ہی بیان کیا ہے: ”باب شراب الحلواء والعسل“۔ حافظ ابن حجرؒ نے مختلف شارحینِ کرام سے اس کی تشریح بیان کی ہے اور اس

کا محوری نکتہ یہ ہے کہ حلواء سے مراد ہر میٹھی چیز ہے: "الحلویٰ کل شی حلو" ۔اور یہاں بالخصوص شربت مراد ہے کہ میٹھی چیز سے وہی بنتا ہے (فتح الباری، ۱۰/ ۹۸ ومابعد)۔ ان تمام میٹھی چیزوں میں شہد ممتاز ترین ہے۔ اور اس کے استعمال میں خاص اور پسندِ خاطر کے کئی واقعات احادیث وروایات میں مذکور ہیں:

-حضرت ام سلمہؓ کی طائف کی جائداد سے شہد آتا تھا اور رسول اکرم ﷺ کی بطور خاص وہ اس سے تواضع کرتی تھیں۔ اس لیے آپ ﷺ ان کی باری کے علاوہ بھی ان کے گھر صرف شہد کی خاطر تشریف لے جاتے تھے کہ وہ آپ ﷺ کو بہت پسند تھا۔ (بلاذری، ۱/ ۴۲۵)

-حضرت زینب بنت جحش اسدیؓ کے پاس طائف سے شہد آتا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ شہد رسول اکرم ﷺ کو مرغوب ہے لہٰذا نمازِ عصر کے بعد جب آپ ﷺ ازواجِ مطہرات کے گھروں کے دورے پر نکلتے تھے تو ان کے گھر میں بھی پہونچتے اور وہ شہد سے خاطر کرتیں۔ اس میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ حضرت زینبؓ رسولِ اکرم ﷺ کی مدارات کرنے کے علاوہ آپ ﷺ کی مجلس کو طول دینے کے لیے بھی ایسا کرتی تھیں کہ محبوبِ رسول اور چہیتے شوہر کو جتنی دیر ساتھ اور پاس بٹھا سکیں بٹھا لیں، ان کی بیکراں محبت کا یہی فطری تقاضا بھی تھا۔ مگر دوسری ازواجِ مطہرات کو یہ محبت بھری تاخیر کھلتی تھی کہ ان کا وقت مارا جاتا تھا، آخر وہ بھی تو مجلسِ نبوی و ملاقات کی اتنی ہی متمنی تھیں۔ اسی کشاکش نے تحریم کا واقعہ جنم دیا۔ بہر حال رسولِ اکرم ﷺ نے شہد کا استعمال تا عمر مبارک جاری رکھا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔

(بخاری، کتاب الطلاق، باب لم تحرم ما احل اللہ لک؛ حدیث: "ان النبی ﷺ کان یمکث عند زینب بنت جحش ویشرب عندھا عسلا"؛ مسلم، کتاب الطلاق، باب وجوب الکفارۃ؛ ابوداؤد، کتاب الاشربۃ، باب فی شراب العسل؛ وغیرہ دیگر احادیث ترمذی، نسائی وغیرہ)

حضرات صحابہ بھی شہد کا استعمال کرتے تھے اور بطور مشروب کرتے تھے۔ حضرت عبیدہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے طرح طرح کے مشروبات نکال لیے ہیں لیکن میرے مشروبات بیس سال سے پانی، دودھ اور شہد ہی رہے ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں بھی یہی مروی ہے۔ حضرت ابن شبرمہ خود تو صرف پانی اور دودھ استعمال کرتے تھے مگر بعض اصحاب کرام کے

بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ دودھ وشہد پیتے پلاتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث گذر چکی ہے کہ ہم اپنے مغازی میں عسل وعنب (شہد وانگور) پاتے تھے تو ان کو کھا لیا کرتے تھے۔

(نسائی، کتاب الاشربة، ذکر الاشربة المباحة؛ مسلم، کتاب الاشربة، باب جواز شرب اللبن وغیرہ؛ بخاری، کتاب الجهاد والصید؛ کتاب فرض الخمس، باب مایصیب من الطعام فی ارض الحرب؛ عکل نامی قبیلہ کے باغیوں کو رسول اکرم ﷺ نے اپنی ایک چراگاہ میں رکھ کر ان کی ضیافت اونٹ کے دودھ سے کی تھی)

نبیذ بطور مشروب

عہدِ نبوی میں نبیذ ایک بہت پسندیدہ مشروب تھا۔ رسول اکرم ﷺ کو بطور خاص بہت پسند تھا اور وہ آپ ﷺ کے لیے مستقل بنایا جاتا تھا۔ دوسرے صحابہ کرام اور عرب طبقات بھی اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ خاصا مفرح اور ہلکا ہوتا تھا۔ اس کے بنانے کا طریقہ بہت آسان تھا۔ ایک برتن میں پانی بھر کر اس میں تازہ کھجوریں (تمر) مَسَل دی جاتی تھیں اور وہ صبح سے شام تک یا شام/ رات سے صبح تک بھیگتی رہتی تھیں۔ شام یا صبح کو ان کو اچھی طرح ملا کر پیا جاتا تھا۔ فوری نبیذ بنانے کا بھی طریقہ رائج تھا مگر عمدہ نبیذ وہی کہلاتی تھی جو مخصوص مدت کے بعد پی جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے اسی طرح صبح وشام والی نبیذ بناتی تھیں۔

سوکھی کھجوروں (زبیب) کی نبیذ بھی اسی طرح بنائی جاتی تھی اور وہ بھی خاصی لذیذ، فرحت بخش اور عمدہ ہوتی تھی۔ البتہ دونوں تمر وزبیب کو بیک وقت ایک برتن میں ملا کر بنانے کی ممانعت بعض روایات واحادیث سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح کھجوروں کی دوسری اقسام- بُسر وغیرہ- کی نبیذ بھی الگ بنانے کے احکام ملتے ہیں۔ دراصل قاعدۂ مشروب یہ بنتا ہے کہ صرف ایک قسم کی کھجور کی نبیذ بنائی جائے اور دو یا دو سے زیادہ اقسام کی کھجوروں کو ملا کر نبیذ نہ بنائی جائے۔ غالباً ان کے پانی میں اختلاطِ مشترک سے نشہ/سکر کا کوئی عنصر درآتا تھا۔

(مسلم، کتاب الاشربة، باب کراهة انتباذ التمر والزبیب مخلوطین؛ ترمذی، کتاب الاشربة، باب فی الخلیطین؛ ابوداؤد، کتاب الاشربة، باب فی الخلیطین، باب فی نبیذ البسر وغیرہ؛ بخاری، کتاب

الاشربة، باب من رای ان لا یخلط البسر والتمر وغیرہ؛ فتح الباری، ۱۰/۸۴-۸۷ و مابعد)

اسی طرح شروع زمانے میں جب شرابِ ناب کی حرمت کا نفاذ نہیں ہوا تھا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب بنانے یا پینے کے برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کردی تھی۔ چمڑے کے برتنوں میں بھی ان کے بنانے کی ممانعت بھی کچھ مدت تک رہی۔ پھر تمام برتنوں میں نبیذ بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ رسول اکرم ﷺ کے لیے بسا اوقات پتھر کے برتن (تور من حجارۃ) میں نبیذ بنائی گئی۔

(بخاری، کتاب الاشربة، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعیة والظروف بعد النهی؛ فتح الباری، ۱۰/۷۲-۷۸)

نبیذ کے لیے شرط یہ بھی تھی کہ صبح کو بنا کر شام کو پی جائے یا شام/ رات میں بنا کر صبح پی جائے، اس میں نشہ نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ نشہ/سکر کا آغاز یعنی بلبلوں کا بننا بھی اس کے حرام ہونے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ ہر نشہ/سکر حرام ہے خواہ مقدار میں کم ہو یا زیادہ۔ اس پر بحث شرابِ ناب کے ضمن میں آتی ہے۔

(مسلم، کتاب الاشربة، باب النبی عن الانتباذ فی المزفت الخ وغیرہ؛ ترمذی، ابواب الاشربة، باب فی نبیذ الجر وغیرہ؛ ابوداؤد، کتاب الاشربة، باب فی الاوعیة وغیرہ؛ نیز بخاری/ فتح الباری مذکورہ بالا)

نبیذ: مشروبِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے نبیذ پینے اور آپ ﷺ کے لیے اس کے بنائے جانے کے بعض بہت اہم واقعات ملتے ہیں:

-حضرت عائشہؓ رسول اکرم ﷺ کے لیے نبیذ بناتی تھیں۔ صبح کو ایک برتن میں پانی اور کھجور ملا کر رکھ دیتیں۔ وہ آپ ﷺ شام کو نوش فرماتے اور رات کو بناتیں تو صبح کو نوش کر لیتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ بعض صحابہ کرام نے بھی یہی طریقہ بیان کیا ہے:

۱۔ "عن عائشة: کنا ننبذ لرسول اللہ ﷺ فی سقاء، یوکی اعلاہ ولہ عزلاء، ننبذہ غدوۃ فیشربہ عشاء، وننبذہ عشاء فیشربہ غدوۃ..."۔

۲۔ ''عن ابن عباس : كان رسول الله ﷺ ينبذ له اول الليل فيشربه اذا اصبح يومه ذلک والليلة التي تجئ والغدو الليلة الاخرىٰ والغد الى العصر، فان بقي شئ سقاه الخادم او امر به فصبّ..''۔

-ایک حبشی باندی (جارية حبشية) تھی جو حضرت عائشہؓ کی باندی تھی۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نبیذ بناتی تھی۔ حضرت ثمامہ بن حزن قشیریؓ کی دریافت پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس حبشی خادمہ کو بلا کر اس سے نبیذ بنانے کی کیفیت یا ترکیب بیان کروائی تھی۔ ان کے مطابق ''میں آپ ﷺ کے لیے رات میں ایک برتن میں نبیذ بناتی اور اس کا منہ کپڑے سے ڈھانپ کر لٹکا دیتی تھی، جب صبح ہوتی تو آپ ﷺ اسے نوش فرمالیتے تھے: ''كنت انبذ له في سقاء من الليل، واوكيه واعلقه، فاذا اصبح شرب منه''.

(مسلم، كتاب الاشربة، باب اباحة النبيذ الذي لم يشتد، لم يصر مسكرا)

-مشروبات زیارت میں آگے حضرت انسؓ کا بیان آتا ہے کہ وہ ایک پیالے سے رسول اکرم ﷺ کو تمام مشروبات پلایا کرتے تھے جن میں شہد اور پانی اور دودھ کے علاوہ نبیذ بھی شامل تھی۔ یہ عام معمول نبوی اور مستقل خدمت خادم نبوی تھی۔ تکرار سے بچنے کی خاطر اس کو مشربات زیارت میں بیان کیا گیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کو وہ صرف زیارتوں کے دوران ہی پلایا کرتے تھے۔ وہ خادم خاص ہونے کی وجہ سے پوری مدنی زندگی میں دس سال تک برابر خدمت نبوی میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے تھے لہٰذا اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ان تمام مشروبات اربعہ کو پلانے کی خدمت وہ مسلسل انجام دیتے رہے تھے۔ یہ محض قیاس نہیں ہے، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا دونوں احادیث سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہے۔

نبیذ: مشروب صحابہ کرام

عربوں میں نبیذ کا رواج زمانہ قدیم سے تھا اور صحابہ کرام اور دوسرے مسلمان وغیر مسلم طبقات میں وہ پسندیدہ مشروب تھا۔ اس کے عام وخاص استعمال کے بہت سے شواہد وآثار ملتے ہیں:

-مشروبات زیارت میں حضرت سہل بن سعد ساعدی نے آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کو نبیذ پلائی تھی۔

-حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا بیان ہے کہ ایک اور زیارت کے دوران ایک صحابی (غالبا ابوحمیدؓ) نے رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کی ایک جماعت کو نبیذ پلائی تھی۔

-حضرت عبید کے مشروبات میں پانی، دودھ اور شہد کے علاوہ دوسرے مشروبات کا ذکر ہے جن میں نبیذ شامل تھی۔

-پہلے ممنوعہ اور شراب خانہ خراب کے بنانے والے برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی گئی تھی اور پھر وہ ممانعت ختم کر کے ان ممنوعہ برتنوں میں نبیذ بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبیذ صحابہ کرام کی ایک پسندیدہ چیز تھی اور وہ عام وخاص تمام برتنوں میں نبیذ بناتے تھے۔

-ایک نئی شادی شدہ دولہن کے گھر رسول اکرم ﷺ تشریف لے گئے تو خاتون خانہ نے اپنے شوہر کے لیے نبیذ بنا رکھی تھی اور اسی نبیذ سے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی بھی ضیافت کی تھی۔ یہ دونوں حضرت ابو اسید اور ان کی نئی دولہن حضرت ام اسید تھیں۔

آبِ زمزم کی نبیذ: حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی عہد نبوی میں بنو ہاشم کے منصب سقایہ کے ذمہ دار اور منصب دار تھے۔ ان سے قبل یہ منصب خدمت جناب ابو طالب بن عبد المطلب ہاشمی کو حاصل تھا اور ان سے پہلے ان کے بڑے بھائی جناب زبیر بن عبد المطلب ہاشمی کو۔ یہ تینوں اعمامِ نبوی -رسول اکرم ﷺ کے چچا- اس منصب پر قائم رہے اور بعثت کی زندگی سے قبل اسے انجام دیتے رہے تھے۔ غالبًا حضرت عباس سے کچھ مدت قبل ابو طالب کو بھی نبوی زندگی میں یہ منصب ملا ہو۔ جناب عبد المطلب ہاشمی بہرحال چاہ زمزم کی بازیافت کے بعد حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کو زمزم کے پانی میں کھجور ملا کر پلایا کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ نے بھی اس کو بحکم وبارشاد نبوی جاری رکھا۔ حضرت عباسؓ کے بعد ان کے فرزند گرامی قدر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے بھی لوگوں کو زمزم ملی نبیذ ہی پلائی تھی، بلکہ پلاتے رہے تھے۔ اس کا سماجی اور دینی پس منظر یہ تھا کہ حضرت عباسؓ نے حضرت رسول اللہ ﷺ کو نبیذ زمزم پلائی تو آپ ﷺ

نے نوش فرمانے کے بعد اپنا جھوٹا (فضلہ) اپنے ردیف حضرت اسامہ بن زیدؓ کو پلایا اور آپ ﷺ نے ان کی تحسین فرمائی اور ارشاد کیا کہ اسے ایسے ہی جاری رکھو۔

(مسلم، کتاب الحج، باب وجوب المبیت بمنیٰ لیالی ایام التشریق؛ حدیث:۳۴۷(۱۳۱۶))

نبیذ کو پکانا یا گرم کرنا

"السکر" کے معنی اور اس کے مشروبات پر اطلاق میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے متعدد مکاتب فکر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان سب کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ وہ دو طرح کے ہیں: ایک شراب وغیرہ نشہ آور چیزیں جن کا پینا پلانا قطعی حرام وممنوع ہے جیسا کہ سورہ النحل-۶۷: "تتخذون منه سكرا ورزقا حسنا" میں بیان فرمایا ہے۔ اور اس میں "الرزق الحسن" کا جوذکر ہے وہ حلال مشروبات کا ہے۔ بعض شارحین کرام نے بعض حلال مشروبات کو بھی اس میں شمار کرلیا ہے جیسے امام شعبی وغیرہ کا قول کہ السکر سے مراد زبیب (کھجور) کا میٹھا پانی (نقیع) ہے جب تک اس میں شدت نہ پیدا ہو جائے اور دوسرا اطلاق سرکہ پر ہوتا ہے۔ بہرحال اس پس منظر میں یہ مسئلہ مشروب بیان کیا جاتا ہے کہ جب تک نبیذ میں بلبلے نہ اٹھنے لگیں اس وقت تک وہ حلال ہے اور اس کی شدت کے بعد اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا حرام ہے۔ اسی پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ایک اصولی قول: "ان الله لم يجعل شفاء كم فيما حرم عليكم" کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے ان میں تمہاری شفاء نہیں رکھی ہے۔ اس ضمن میں ایک عمدہ اور معنی خیز واقعۂ سیرت بیان کیا ہے جو ہمارے اس مبحث کا اصل نکتہ ہے:

-امام ابویعلیٰ نے روایت بیان کی ہے، جس کی تصحیح امام ابن حبان نے کی ہے اور اس کا تعلق حضرت ام سلمہؓ کی ایک حدیث سے ہے۔ ام المومنین کا بیان ہے کہ میری ایک بیٹی بیمار ہوگئی تو میں نے اس کے لیے ایک کوزہ (کوز) میں نبیذ بنائی۔ وہ آگ پر پھدپھدا رہی تھی کہ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا اور میں نے حقیقت عرض کی تو یہی ارشاد فرمایا: اس طرح یہ قول حضرت ابن مسعودؓ نہیں رہ جاتا بلکہ مرفوع

حدیث بن جاتی ہے۔اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے اور سماجی اور تمدنی زاویہ بھی کہ نبیذ کو گرم کرنا یا پکانا نہیں چاہئے کہ اس سے اس میں شدت وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/۹۹—۱۰۰ ومابعد: روایت میں ''کوز'' ہے مگر وہ کور بھی ہوسکتا ہے جس کے معنی مٹی کی انگیٹھی ہوتے ہیں)

مشروباتِ زیارت

عرب اسلامی تہذیب وتمدن کا ایک رواج یہ بھی تھا کہ زائرین وزائرات کی مشروبات سے تواضع کی جاتی تھی۔ان مشروبات میں بلاشبہ ٹھنڈا اور میٹھا پانی سرِفہرست تھا کیونکہ عرب جیسے ملک اور مکہ ومدینہ جیسے شہروں میں وہ لاثانی تحفہ سمجھا جاتا تھا اور آج بھی پانی -عمدہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی- سے زیادہ اور کوئی پسندیدہ مشروب نہیں ہے، بالخصوص پیاس بجھانے کے مقصد کے لیے۔گھروں کی سماجی زیارت کرنے والے بھی سب سے پہلے پانی ہی طلب کرتے ہیں۔ پھر وہ سب سے عام وارزاں اور عظیم ترین نعمتِ الٰہی بھی ہے جس کی فراہمی میں میزبانوں کو کوئی زیادہ تکلف نہیں کرنا پڑتا کہ وہ ان کے اپنے استعمال کے لیے بالعموم گھروں، دکانوں میں موجود ہی ہوتا ہے۔

دوسرے مشروبات- دودھ، نبیذ، شہد ملے دودھ وغیرہ- کی فراہمی میں تکلف بھی کرنا پڑتا ہے اور مشکل بھی ہوتی ہے لیکن میزبانی کی ایک اعلیٰ قدر اور میزبان -اچھے میزبان- کی ایک بلند تر صفت یہ بھی ہے کہ وہ مہمانوں کی خاطرداری کے لیے تکلف بھی کرے۔یہ محض ایک سماجی روایت اور تہذیبی قدر نہیں ہے بلکہ ایک دینی ومذہبی قدرِ شرافت ہے اور حکم وادب بھی کہ خاطرداری میں تکلف کیا جائے جیسا کہ امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین کے بعض تراجمِ ابواب احادیث سے واضح ہوتا ہے۔اس سے مہمان کی قدر افزائی، احترام واکرام ظاہر ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ سے بڑا اور کون مہمان مکرم ہوسکتا تھا لہٰذا صحابہ کرام آپ ﷺ کے لیے بطور خاص اہتمام واکرام سے مشروب پیش کرتے تھے۔

(بخاری، کتاب الادب، باب المداراۃ مع الناس، باب حق الضیف، باب اکرام الضیف الخ، صنع

الطعام والتکلف للضیف وغیرہ کے مختلف ابواب؛ فتح الباری، ۱۰/ ۶۴۸-۶۵۸ و مابعد؛ حدیث حضرت ابوالدرداء وغیرہ کا ذکر طعام میں آچکا ہے)

گذشتہ مباحثِ مشروبات میں بعض زیارات کے دوران مشروبات پیش کرنے اور پیش کیے جانے کا ذکر آچکا ہے۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کے گھر میں مہمان وارد ہوئے تو رسولِ اکرم ﷺ کی غیر موجودگی ہی میں ام المومنینؓ نے ان کی عمدہ دودھ سے تواضع کی۔ حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ کے باغ میں رسول اکرم ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے موسم گرما کی شدت کے سبب ٹھنڈا پانی - یخ برفاب- طلب فرمایا تو انھوں نے پانی میں گھر کی پالتو بکری کا دودھ ملا کر خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح میں بعض علماء شارحین کے حوالے سے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ اکرام ضیف تھا۔ میزبان گرامی نے اپنے گرامی ترین مہمان، جن کی خوشنودی خوشنودیٔ رب تھی اور جس سے سارے جہان کی نعمتیں ملنی تھیں، صرف پانی سے تواضع کو کافی نہیں جانا اور بطور خاص اس میں عمدہ دودھ کی آمیزش کردی اور اسے آپ ﷺ نے نوشِ جان فرمایا کہ دودھ ملا ہوا پانی عمدہ ترین مشروب سمجھا جاتا تھا۔ "...**وصنیع الانصاری لانہ اراد ان لایسقی النبی ﷺ ماء صرفا، فاراد ان یضیف الیہ اللبن، فاحضر لہ ماطلب منہ وزاد علیہ من جنس جرت عادتہ بالرغبۃ فیہ...**" (فتح الباری، ۱۰/ ۹۷)

-حضرت انسؓ نے بھی اسی طرح بعض صحابہ کرام کے ساتھ آپ ﷺ کو تشریف لاتے دیکھ کر پانی میں دودھ ملا کر پیش کیا تھا۔

ایسے ہی بعض اور واقعات و آثار ملتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ بنفس نفیس اور صحابہ کرام اور صحابیات طاہرات اپنے مہمانوں، ملاقاتیوں اور زائروں کی خاطر تواضع کے لیے عمدہ سے عمدہ مشروبات پیش کیا کرتے تھے۔ مختلف مشروبات کے حوالے سے مشروباتِ زیارت کا صرف ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

عام سادہ پانی: سب سے اہم اور سب سے عمدہ مشروب زیارت تھا۔ اور اگر پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہو تو سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ متعدد واقعات و آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ زائرین و

زائرات کی آمد پر ان کی تواضع ٹھنڈے پانی سے کی گئی:

-رسولِ اکرم ﷺ ایک بار کسی کام سے ایک باغِ انصار میں تشریف لے گئے۔اس سے واپسی پر سقیفہ بنی ساعدہ میں ٹھہرے۔آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے بعض صحابہ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت سہل بن سعد ساعدی انصاریؓ سے پانی طلب فرمایا اور نوجوان صحابی نے سب کو ایک پیالہ سے سیراب کیا۔ بعد میں یہ پیالہ حضرت سہل کی متاعِ عزیز بن گیا۔ بطور خاص لوگوں کو اس پیالہ سے پلاتے کہ اس سے رسولِ اکرم ﷺ نے پیا تھا۔اس کو بعد میں خلیفۂ اموی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہدیہ مانگ لیا اور صاحبِ دل مالک نے اسے ہبہ بھی کر دیا۔

(بخاری، کتاب الاشربة؛ باب الشرب من قدح النبی ﷺ و آنیته ؛حدیث:۵۶۳۷؛فتح الباری، ۱۰/۱۲۲-۱۲۶؛نیز مقالہ متروکہ آثار نبوی سے عقیدت وتبرک صحابہ)

-اسی باب کے ترجمہ میں امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن سلام کے پیالے کا ذکر کیا ہے کہ جس سے رسولِ اکرم ﷺ کو انھوں نے پانی پلایا تھا اور پھر برکت وسعادت کی خاطر حضرت ابوبُردہؓ کو یہ کہہ پلایا تھا کہ میں تمھیں اس پیالے سے نہ پلاؤں جس سے رسول اکرم ﷺ نے پیا تھا:''الا اسقیک فی قدح شرب النبی ﷺ فیه؟''.

(فتح الباری،۱۰/۱۲۲؛مقالہ مذکورہ بالا)

دودھ آمیز پانی: سے خاطر تواضع کو بہترین یا گراں قدر سمجھا جاتا تھا۔میزبان اپنے مہمانوں کی عزت واکرام اور توقیر کی خاطر دودھ ملا کر پانی پیش کرتے تھے جیسے حضرت ابوالہیثم بن التیہان انصاریؓ نے رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی آمد پر ان کو دودھ ملا کر پانی پیش کیا تھا۔حضرت انس بن مالکؓ کے گھر جب کبھی آپ ﷺ تشریف لے جاتے،تنہا ہوتے یا صحابہ کے ساتھ،خاطر تواضع میں دودھ آمیز پانی ہی حاضر کیا جاتا۔

دودھ دوسرا اہم مشروبِ زیارت تھا۔مہمانوں کی آمد پر ان کی مدارات خاص کا نشان سمجھا جاتا تھا اور مہمانوں کو بھی اس سے مدارات کیے جانے پر اپنی توقیر کا احساس ہوتا تھا۔ذکر آچکا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک وفد کے ارکان کی تواضع دودھ سے ہی کی تھی۔

-حضرت انس بن مالکؓ کے پاس ایک پیالہ تھا جس کے بارے میں ان کا بیان تھا کہ

اس سے انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو ہر طرح کا مشروب۔شہد، نبیذ، پانی اور دودھ۔ پلایا تھا: "لقد سقيت رسول الله ﷺ بقدحي هذا الشراب كله: العسل، والنبيذ، والماء واللبن"۔

(مسلم، كتاب الاشربة، باب اباحة النبيذ، حدیث: ۸۹(۲۰۰۸): وہ پیالہ ٹوٹ گیا تھا تو اسے چاندی کے تاروں سے باندھ کر جوڑ لیا تھا۔ بخاری، حدیث: ۵۶۳۸؛ فتح الباری، ۱۰/۱۲۳ ومابعد: اس میں بقول ابن سیرین ایک لوہے کا حلقہ تھا جسے حضرت انسؓ نے سونے یا چاندی کے حلقے سے بدلنا چاہا مگر حضرت ابوطلحہ کے مشورے پر نہیں بدلا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی "تعمیر" میں فرق نہ آئے)

دودھ میں شہد ملا کر خاطر مدارات کو سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور اس مشروب کو مشروب افضل کہ دو عمدہ چیزوں کا مرکب تھا۔ حضرات طلحہ وزبیرؓ کے بارے میں ذکر آ چکا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کو تقریبات شادی میں دودھ میں شہد ملا کر پلاتے تھے۔ سقایۂ حجاج میں بھی بعض مخیر اکابر مکہ یہی طریق مدارات اختیار کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کے گھر رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے بعض اصحاب کو اہلِ خانہ نے اسی طرح دودھ ملا کر پانی / شہد پیش کیا تھا۔ اور یہ صرف ایک بار کا واقعہ نہیں ہے بار بار کا معمول تھا۔

نبیذ تمر اور دیگر قسم کی نبیذ سے بھی مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ وہ مہمانوں کی آمد پر بطور اولین مشروب بھی پیش کی جاتی تھی اور کھانا کھانے کے بعد بطور ختام المسک بھی یہ مرغوب مشروب حاضرِ خدمت کیا جاتا تھا۔ حضرت ابو اسید کی شادی میں عروسِ نو نے رسولِ اکرم ﷺ کی کھانے کے بعد ہی اس سے تواضع کی تھی۔ زیارت کے لیے تشریف آوری اور طلب پر بھی نبیذ پینے پلانے کا رواج ملتا ہے۔

۔حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے پانی طلب فرمایا۔ ایک شخص نے عرض کیا: کیا آپ ﷺ کو ہم نبیذ نہ پلائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ وہ آدمی بھاگتا ہوا گیا اور ایک پیالے میں نبیذ لے آیا۔ پیالہ بلا ڈھکے لایا تھا لہٰذا آپ ﷺ نے اسے ہدایت فرمائی کہ پیالہ / برتن کو ڈھک لینا چاہیے۔ پھر آپ ﷺ نے اسے نوش فرمایا۔

(مسلم، كتاب الاشربة، باب في شرب النبيذ وتخمير الاناء؛ اس میں بخاری کی حدیث کی مانند دودھ کا

پیالہ بلاڈھکے لانے کا ذکر بھی ہے)

ہدایا بھی اسی طرح چاروں مشروبات پر مشتمل ہوتے تھے: یعنی پانی، نبیذ، دودھ اور شہد پر۔ پانی کے ہدایا کا ذکر کنوؤں کے باب میں آچکا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے میزبان اور دوسرے حضرات وخواتین کس طرح دور دور سے آپ ﷺ اور ازواج مطہرات کے لیے پانی - ٹھنڈا میٹھا پانی - لاتے تھے بلکہ روز پہونچاتے تھے۔ اسی طرح طلب پر بھی زیارات کے دوران اس کے ہدایا پیش کیے جاتے تھے۔ اس ضمن میں سب سے اہم یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے آنے والے حضرات وخواتین بطور خاص رسول اکرم ﷺ اور دوسرے اہل مدینہ کے لیے آب زمزم کے ہدایا لایا کرتے تھے۔

دودھ کے ہدایا: مدنی دور کے آغاز سے رسول اکرم ﷺ کے پڑوسی انصار برابر خدمت نبوی میں دودھ کے ہدایا بھیجا کرتے تھے اور یہ دس سال تک ان کا مستقل معمول رہا: "قد کان لرسول الله ﷺ جیران من الانصار کانت لهم منائح وکانوا یمنحون رسول الله ﷺ من البانهم.."۔

دودھ کے ہدایا میں سب سے اہم حضرت سعد بن عبادہؓ کا پیالۂ خدمت تھا جو کبھی کبھی صرف عمدہ دودھ پر مشتمل آتا تھا، دوسرے صحابہ کرام کے ہاں سے بالخصوص مخیّر انصاری صحابہ کرام کے گھروں سے دودھ کے ہدایا کے آنے کا ذکر ملتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اکرم ﷺ بھی اپنے دودھاری جانوروں کے ہدایا صحابہ کرام کو عطا فرماتے تھے جیسے حضرات عباد بن بشر اور اسید بن حضیرؓ کو آپ ﷺ نے دودھ بھجوایا تھا۔

(بخاری، کتاب الهبة وفضلها الخ؛ مسلم، حدیث: ۳۱-۳۲ وغیرہ؛ ترمذی، ابواب الولاء والهبة وغیرہ نیز ہدایائے طعام کا باب)

دوسرے ہدایائے دودھ تھے: حضرت صفوان نے رسول اکرم ﷺ کو فتح مکہ میں دودھ کا ہدیہ بھیجا تھا، حضرت ام الفضل نے عرفہ کے دن دودھ کا پیالہ حاضر خدمت کیا تھا، حضرت مقداد بن اسودؓ اور ان کے ساتھیوں کے لیے دودھ کے جانور مخصوص کر دیے گئے تھے۔

(ترمذی، باب کیف السلام وغیرہ)

شہد کے ہدایا میں سب سے دلچسپ وہ ہدیہ تھا جو حضرت زینب بنت جحشؓ کو ان کی قوم کی ایک عورت نے پیش کیا تھا۔ وہ شہد کے ایک کپے پر مشتمل تھا اور اسی سے وہ رسول اکرم ﷺ کی تواضع کیا کرتی تھیں: "اهدت لها امرأة من قومها عكة من عسل.." (بخاری، کتاب الطلاق، باب يايها النبى الخ)۔ ان کے علاوہ دوسرے ہدایائے شہد بھی تھے جن کا تذکرہ روایات واحادیث میں ملتا ہے۔ مشروبات کا ہدیہ دراصل کھانے کے ہدایا کی طرح عام رواج تھا اور اسے روزمرہ کا سماجی رویہ بھی کہا جاسکتا ہے جو اسلامی معاشرہ کا نشان ہے۔

✪✪✪

مبحثِ دوم

عہدِ نبوی ﷺ کے کپڑے اور لباس

آیاتِ قرآنی میں لباس کو انسان کی ایک ضروری تہذیبی، دینی اور سماجی قدر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ جسمِ انسانی کے ستر کو چھپاتا ہی نہیں اسے زیب وزینت سے آراستہ بھی کرتا ہے۔ اسی بنا پر لباس کے لیے ساتر ہونا ضروری ہے اور باعثِ زینت بھی۔ دینی لحاظ سے محض ستر پوشی کافی نہیں ہے زینت کی پوری رعائت بھی لازمی ہے۔ خاص عباداتِ نماز کے وقت زینت اختیار کرنے کا حکم ربانی بہت واضح طور سے موجود ہے۔ حدیث وسنت سے اس کی پوری تصدیق وتائید ہوتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ پورے ساتر وزیب وزینت والے لباس کے ساتھ ہی نمازیں ادا فرماتے تھے۔ یہی صحابہ کرام کا معمول اور ان کے جانشینوں کا عملی اصول بھی رہا ہے کہ یہی مزاج شریعت ہے۔

(سورۂ اعراف: ۲۶: یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سو اتکم وریشا (اے اولاد آدم کی! ہم نے اتاری تم پر پوشاک کہ ڈھانکے تمہارے عیب اور رونق)۔ تخلیق کائنات سے قبل حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے جنتی لباس کا یہی مقصد ستر بتایا گیا ہے: اعراف: ۲۷۔ بعد بعث/ آخرت میں جنتیوں کے لباسوں کا ذکر مختلف آیات کریمہ میں ہے اور ان کی اقسام کا بھی جیسے حریر (ریشم): الحج-۲۳، فاطر-۳۳، سندس/ استبرق کے سبز لباسوں کا بھی ہے: کہف: ۳۱، دخان: ۵۳۔ ان سب کا ذکر اپنے اپنے مقامات پر آتا ہے)

لباس کے لیے دو اور اسلامی قیود وشروط بھی ملتی ہیں: ایک موقعہ ومحل کے لحاظ سے لباس کا استعمال، نماز کے وقت لباسِ زینت کے اختیار کرنے میں حکمِ ربانی موجود ہے اور وہ موقعہ ومحل کی رعایت کا واضح اعلان ہے، ورنہ صرف ساتر لباس کا حکم کافی ہوتا۔ وحی الٰہی کی دوسری شکل- وحیِ حدیث- فرمانِ رسول کی صورت میں ہویدا ہوئی اور اس نے جمعہ وعیدین وغیرہ کے لیے عمدہ، بہترین اور خوبصورت لباس کو سنت قرار دیا۔ یہ بھی موقعہ ومحل کی رعایت کا نشان ہے کہ مواقعِ مسرت واجتماع پر عمدہ لباس پہنے جائیں۔ اسی سنت سے شادی بیاہ اور دوسرے مواقع کے لیے

عمدہ لباس کی سنت نکلی، حتی کہ لباس میت کے لیے سفید کفن کی تاکید اسی خاطر ہے۔

(سورۂ اعراف: ۳۱: یبنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد ...الخ (اے اولادِ آدم کی! لے لو اپنی رونق (آرائش) ہر نماز کے وقت)۔ خاص مواقع اور تقریبات کے لباس/ملبوسات پر مفصل بحث آگے آرہی ہے۔ اس میں اسلامی، دینی اور تمدنی تقریبات دونوں شامل ہیں)

دوسری شرط یہ ہے کہ ہر شخص لباس اپنی مالی، سماجی، دینی اور تہذیبی حیثیت کے مطابق پہنے اور اپنے اہل و عیال کو پہنائے۔ متعدد احادیث و آیات سے یہ حکم اسلامی اور قیدِ لباس واضح ہوتا ہے۔ نان نفقہ کے باب میں قرآنی حکم وارد ہے کہ کھانا پینا اور کپڑا وغیرہ انسان کے معیار و استطاعت کے مطابق ہو۔ ایک مال دار صحابی کو رسول اکرم ﷺ نے عمدہ لباس پہننے کا حکم دیا کہ نعمتِ الٰہی کے آثار اس کے تن پر جھلکیں۔

(حضرت مالک جشمیؓ کے پراگندہ کپڑے دیکھ کر فرمایا تھا: "اذا اتاک اللہ مالا فلیر اثرہ علیک..." فتح الباری، ۱۰/۳۲۰: نفاست و نظافت والے لباس)

علماءِ دین، مقتدایانِ ملت اور حاکمانِ ریاست کے لیے بھی ان کے طبقہ کا لباس ضروری ہے۔ موٹا، گاڑھا اور عام کپڑا علامتِ تقویٰ اور معیارِ فضیلت نہیں۔ عہدِ نبوی کے کپڑوں اور لباسوں بالخصوص رسولِ اکرم ﷺ کے ملبوسات کے مطالعہ سے لباس کے اسلامی احکام واضح ہوں گے۔ اس باب میں عہدِ نبوی کے مختلف کپڑوں اور ان کی قسموں کا ذکر مستقل عنوانات کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت شارع علیہ ﷺ کے ملبوسات کا مفصل ذکر بھی ہوگا اور وہی معیارِ تقویٰ ہے۔

کپڑا/ثوب

"ثوب" عام کپڑے اور سلے ہوئے لباس دونوں معنی میں عربی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع "ثیاب" بھی سب کو محیط ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی کپڑے کے ہیں۔ اسی بنا پر اس کا اطلاق ہر طرح کے کپڑے پر کیا جاتا ہے خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ قرآن مجید میں "ثوب" تو استعمال نہیں ہوا مگر اس کی جمع ثیاب مختلف تراکیب کے ساتھ آئی ہے اور ان سب میں وہ سلے ہوئے کپڑوں کے معنی میں ہے۔ احادیث نبوی اور روایاتِ سیرت و تاریخ میں اس

لفظ کے استعمال کے اتنے شواہد ملتے ہیں کہ ان پر پورا ایک دفتر تیار ہوسکتا ہے۔
(سورہ مدثر-۴: رسول اکرم ﷺ کے کپڑوں کے لیے: "وثیابک فطھر"، عام مسلمانوں/لوگوں کے کپڑوں کے لیے سورہ نور: ۵۸، ۶۰؛ سورہ ھود: ۵؛ اور نوح: ۷)

عہدِ نبوی کے حوالے سے اس عام لفظ کے استعمالاتِ کثیرہ کا محض ایک مختصر سا جائزہ بڑا دلچسپ ثابت ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ذیل میں بلا کسی خاص نوعی ترتیب اور تاریخی تنظیم کے ثوب وثیاب کے استعمالاتِ گوناگوں کا وہ مطالعہ دلنشیں پیش کیا جاتا ہے:

- رسول اکرم ﷺ نے حجرِ اسود کو نصب فرمانے کے لیے ایک ثوب ہی طلب فرمایا تھا اور اسی میں رکھ کر اس کے مقام پر نصب فرمایا تھا۔ (ابن ہشام، ۱/ ۱۹۷)۔

- حمس/ قریشِ مکہ و باشندگانِ حرم اپنے کپڑوں ہی میں آفاقیوں کو طواف کرنے کی اجازت دیا کرتے تھے۔
(ابن ہشام، ۱/ ۲۰۲: "ولا یطوفوا بالبیت اذا قدموا اول طوافھم الا فی ثیاب الحمس ..."؛ مفصل بحث کے لیے: ... اسلامی احکام کا ارتقاء)

- حضرت خدیجہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے اولین وحیِ قرآنی کی آیات کے نزول کا واقعہ سنا تو حضرت ورقہؓ کے پاس جانے کے لیے اپنے کپڑے ہی درست کیے تھے۔
(ابن ہشام، ۱/ ۲۳۸: "... قامت فجمعت ثیابھا ...")

- مشرکینِ عرب جب اسلام قبول کرتے تو اپنے کپڑے دھوتے اور پاک کرتے تھے۔ ان میں حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ جیسے متعدد تھے۔ (ابن ہشام، ۱/ ۳۸۴؛ اسلامی احکام کا ارتقاء)۔

- رسول اکرم ﷺ کو طہارتِ جسمانی کا حکم ربانی ملا تو کپڑوں کو ہی پاک رکھنے اور طاہر بنانے کے حوالے سے ملا تھا۔ (سورۂ مدثر-۴: "وثیابک فطھر"؛ اسلامی احکام کا ارتقاء)

- رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نمازیں ایک کپڑے میں یا دو کپڑوں میں پڑھتے تھے، گرمی کی شدت میں ایک کپڑا اتار دیتے تھے۔
(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ فی الثوب الواحد الخ؛ یہ ایک جواز کا مسئلہ ثابت کرنے کی خاطر بھی تھا اور قلت وفقر کی وجہ سے بھی تھا)

احادیث وروایات میں لباس کے لیے ثوب وثیاب کے استعمالات بلاشبہ ہزارہا ہیں۔

ان میں سے بہت سوں کا ذکر آگے آئے گا۔

لباس کا استعمال بھی کپڑے پر ہوتا ہے مگر وہ ثوب کے مقابلہ میں خاص ہے اور اس سے مراد سلا ہوا کپڑا ہوتا ہے۔ روایاتِ سیرت و تاریخ میں اپنے ادوارِ گوناگوں کے حوالے سے ان گنت لباس کے آثار و شواہد ملتے ہیں اور ان کے استعمالات بھی۔ روایات اور احادیث و سنن کے لیے سب سے بڑا شاہد اگر کوئی ہے تو یہ کہ تمام محدثینِ کرام نے اپنی کتبِ حدیث میں ''کتاب اللباس'' ہی کا عنوان باندھا ہے۔ امامانِ کرام - مالک بن انس، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور بیسیوں دوسروں بلکہ سب نے - کتاب اللباس - کو اپنی کتبِ حدیث کا ایک خاص باب بنایا ہے اور اس کے تحت ثوب و لباس اور کپڑے سے متعلق احادیث و احکام بیان کیے ہیں۔

لباس کی اقسام بھی بہت ہیں - ان میں جامۂ زیریں کے لیے ازار کی قسم سرفہرست بھی ہے اور شاید سب سے عام بھی۔ زیریں بدن ڈھانکنے کے لیے ایک لباس سروال - جمع سراویل - ہوتا تھا، جس کی ابتداء اور استعمال غیر عربی بتائے گئے ہیں۔ بالائی حصہ بدن کے زیب و زینت اور ستر پوشی کے لیے قمیص/ جمع قمص سب سے زیادہ عام اور کثرت سے ملنے والا لفظ ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے اسماء ملتے ہیں اور ان کا مقصد یہی تھا کہ جسم کے بالائی حصہ کو ان سے ڈھانپا جائے اور آراستہ کیا جائے۔ اسی طرح سر عزیز کی حفاظت، خوبصورتی اور زیب کے لیے قلنسوہ، برنس وغیرہ متعدد الفاظ و لباس ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ لباس کے اوپر ایک خاص لباسِ زینت بھی ہوتا تھا جو تمدنی اور سماجی رواج کی عکاسی کرنے کے علاوہ بسا اوقات اکابرِ قوم اور شیوخِ قبائل کے تکبر و افتخار کی علامت بھی تھا۔ رسول اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور صحابیات کے علاوہ بعض دوسرے طبقات اس لباسِ زینت کو علامتِ تمدن سمجھتے تھے۔

مرد و عورت کے مختلف و ممتاز لباسوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ جنس کے اعتبار سے انسانی تمدن و تہذیب نے دونوں کے لباس میں ہمیشہ فرق روا رکھا ہے اور دین و شریعت نے بھی۔ ستر کے لحاظ سے ان کے لباسوں کی تعداد میں بھی فرق ملتا ہے اور زیب و زینت کے اعتبار سے ان کی بناوٹ کا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اور ان دونوں اعتبارات سے مرد و زن کے لباسوں میں ہر طرح

کا امتیاز نظر آتا ہے۔ یہ محض دینی شدت پسندی اور شریعتی تشدد کا معاملہ نہیں ہے، تہذیبی اختلافِ جنس کا معاملہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کے لباسوں کے مواد اور کپڑے کی نوعیت کا فرق بھی رکھا گیا ہے۔ زیب وزینت کا ایک خاص نسائی حق ہے اور اس فطری حق کے سبب ان کو بعض خاص آرائشی کپڑوں کی اجازت ہی نہیں تاکید بھی نظر آتی ہے اور مردوں کے لیے ان کا استعمال ممنوع یا ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ دین وشریعت اور تہذیب وتمدن کے ان مختلف جنسی تقاضوں کا ذکر اور ان کی رعایت ان دونوں کے لباسوں کے ذکر میں ابھرتی رہے گی۔

عہد نبوی کے ملبوسات کا تجزیہ ومطالعہ مختلف جہات سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے موزوں جہت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف لباسوں کے اعتبار سے ان کا تجزیہ کیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ کتنے لباس تھے؟ ان کی نوعیت کیا تھی؟ ان کے استعمالات کیا تھے۔ وہ کن کن چیزوں سے بنتے تھے۔ مختلف لباسوں کے اعتبار سے تجزیہ کرنے میں تمام چیزیں سامنے آجائیں گی اور آخری تجزیہ کرنے میں بھی سہولت رہے گی۔ اس میں بھی بہتر طریق یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملبوساتِ عہد نبوی کو حروف تہجی کے اعتبار سے زیر بحث لایا جائے۔ لیکن اس میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ ہے جسم وبدن کے مختلف حصوں کو ڈھانکنے یا آراستہ کرنے والے ملبوسات کا، اور ان کے اندر ہی حروف تہجی کی ترتیب رکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ترتیبِ ملبوسات ہوگی:

- اقسامِ لباس/مراکزِ پارچہ بافی
- زیریں جامے
- اوپری بدن کے ملبوسات
- عام ملبوسات/لباس کے اوپر لباسِ فاخرانہ
- سرِ عزیز ڈھانکنے کے ملبوسات
- پیروں کے ڈھانکنے کے لباس/جوتے
- ان سب میں مردوں اور خواتین کے الگ الگ ملبوسات کی فصول بھی ہوں گی۔
- ملبوساتِ تقریبات
- ملبوسات سے متعلق اصولی مباحث

پارچہ بافی: اقسام ومراکز

عہدِ نبوی کے کپڑوں میں رنگارنگ اور طرح طرح کے پارچہ جات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کئی اقسام ہیں: بنیادی طور سے دو قسمیں تھیں: ایک سوتی اور دوسرے ریشمی، ان کے ساتھ ایک تیسری قسم اونی کپڑوں کی تھی۔ پھر ان سب کی اعلیٰ اور ادنیٰ اقسام تھیں خاص کر سوتی اور ریشمی کپڑوں کی۔ اونی کپڑوں میں بھی یہ دونوں معیارات بھی پائے جاتے ہیں لیکن ذرا کم۔ تنوع اور نوعیت کے لحاظ سے سوتی اور ریشمی کپڑوں کے مقابلے میں اونی کپڑوں کی قسمیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان تمام اقسام وانواع کے الگ الگ نام تھے، اور اس معاملے میں عربی زبان کی وسعت کا مقابلہ کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی۔ کپڑوں کے ناموں کے ضمن میں یہ دلچسپ بات نظر آتی ہے کہ بہت سوں کے نام ان کے خام مال یا سوت کی بنا پر رکھے گئے تھے اور بہت سی نسبتیں ان کے مقامات ومراکز کی طرف تھیں جہاں وہ کپڑے بنائے جاتے تھے اور جزیرہ نمائے عرب میں درآمد کیے جاتے تھے۔ ان ناموں میں بعض خالص عربی الفاظ ملتے ہیں اور بعض کو غیر عرب/عجمی زبانوں سے معرب قرار دیا گیا ہے۔ وہ مختلف زبانیں ہیں۔ حسب دستور شارحین کا وجوہ تسمیہ میں اختلاف فکر ونظر بھی خوب پایا جاتا ہے۔ حامیانِ عربی ان کے خالص ہونے کے دعویدار ہیں، اور معرب الفاظ واسماء کے قائلین ان کی جڑیں غیر ملکی زمینوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اور تمدنِ عرب کو محض لسانی بنیاد پر عطیۂ غیر قرار دیتے ہیں۔

مراکزِ پارچہ بافی کے لحاظ سے بحث زیادہ مفصل یا طویل نہیں ہے۔ یا تو عرب کے ہی مختلف خطے اور علاقے تھے یا غیر ملکی مقامات۔ عرب علاقوں اور مراکز میں کچھ تو خالص مقامی ہیں کیونکہ تقریباً ہر شہر وقریہ میں گھریلو پارچہ بافی کی صنعت یا حرفت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ لوگ بالخصوص خواتین اپنے گھروں میں اپنی ضرورت بھر کا کپڑا بنا لیا کرتی تھیں۔ ان میں سے

بعض افراد و طبقات کا یہ پیشہ بھی تھا اور اس کے ذریعہ وہ کمائی کرتی تھیں۔ بالعموم ایسے کاریگر مرد و خواتین شہروں اور گاؤں دونوں مقامات پر پائے جاتے تھے۔ اندرونِ ملک بعض مقامات خاص کر جنوبی عرب کے بعض علاقے اور شہر پارچہ بافی کے بڑے مرکز تھے۔ غیر ملکی مراکز میں جزیرہ نمائے عرب کے قریبی اور پڑوسی ممالک جیسے شام و مصر اور ایران و عراق وغیرہ خاص برآمدی علاقے تھے۔ اصلاً یہ بحث صنعت و تجارت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کو وہیں پیش بھی کیا گیا ہے لیکن اقسامِ پارچہ جات کے لحاظ سے ان مراکز کا مختصر حوالہ دیا گیا ہے۔

سہ گانہ اقسام

اس تجزیاتی بحث میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کپڑوں کی اقسام و انواع کے اعتبار سے مطالعہ و تجزیہ کیا جائے۔ اس میں مراکز و مقامات کا ذکر از خود آتا جائے گا۔ اور مختلف کپڑوں کی نوعیت، حیثیت اور قدر و قیمت سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ آغاز سوتی کپڑوں سے کیا جارہا ہے کہ ان کا ذکرِ خیر رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اور دوسرے اکابرِ عرب کے حوالے سے زیادہ آتا ہے۔ ریشمی کپڑوں کا بلاشبہ کافی ذکر اور ان کی رنگا رنگ قسموں کا حوالہ بھی بہت آتا ہے لیکن وہ خاص متمول طبقات کا لباس تھا۔ اونی کپڑوں کا بھی ذکر ملتا ہے مگر وہ محدود ہے اور اس میں تنوع بھی ذرا کم ملتا ہے۔ اس نوعی بحث میں کوئی ترتیب قائم کرنی خاصی مشکل ہے۔

سوتی کپڑے

لباسِ نبوی کے سلسلے میں ایک دلچسپ روایت رسولِ اکرم ﷺ کے ترکے کے بارے میں ملتی ہے۔ بلاذری کے مطابق آپ ﷺ نے دس کپڑے ترکہ میں چھوڑے: ۱- ثوبِ حبرۃ، ۲- ازارِ یمانی، ۳-۴ دو صُحاری کپڑے (ثوبین صحاریین)، ۵- ایک صحاری قمیص، ٦- ایک سحولی قمیص، ۷- ایک یمنی جبہ (جبۃ یمنۃ)، ۸- ایک رنگین اوپری چادر جسے آپ ﷺ اپنی ازواج کے گھروں میں زیبِ تن فرماتے تھے (وملحفۃ مورسۃ، وکان یلبسھا فی بیوت نسائہ)، ۹- ایک مقیش چادر اور سفید ملبوس (خمیصۃ وکساء ابیض) ۱۰- اور تین پیشانی ڈھانک

لینے والی چھوٹی ٹوپیاں (وقلانص صغاراً لاطیة)

- اسی روایت میں اوپری چادر (ملحفة) کے رنگین ہونے کے بارے میں ایک تصدیق دوسری روایت سے ہوتی ہے کہ وہ ورس (گھاس) یا زعفران میں رنگی گئی تھی اور جب آپ ﷺ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو اس پر پانی چھڑک دیتے تھے تا کہ اس کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی رہے: "مصبوغة بورس اوبزعفران، واذا کان یوم احداهن، یعنی نسائه، ذهب بها الیها، ورشّ علیها الماء لتوخذ رائحتها." (بلاذری، ۱/۵۰۷)

یہ سارے کے سارے کپڑے سوتی قرار دیئے گئے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے ملبوسات نبوی ہیں: جامہائے زیریں، اوپری بدن کے ملبوسات، لباس پر چادرِ زینت، عام ضرورت کی چادر اور سرِ عزیز کو زیب و زینت سے آراستہ کرنے والی ٹوپیاں۔ ان میں سے بعض بالخصوص خوشبودار رنگین چادر کا ذکر لائق توجہ ہے کہ وہ کپڑوں کی ایک اور صنعت - رنگریزی - سے متعلق ہے۔ اس پر بعد میں ایک اور مختصر بحث آئے گی۔

- جس لباسِ نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی وہ موٹے سوت کا یمانی ازار تھا اور ایک اوپر کا لباس تھا جسے الملبدہ کہا جاتا تھا: "... ازارا غلیظا من هذه الیمانیة، وکساء من هذه التی یدعونها الملبدة..."۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ

- حضرت ابن عباسؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کے صُحاری، سَحولی، یمنی اور کتان کے کپڑوں کا ذکر کیا ہے: "کان لرسول الله ﷺ اثوابٌ صحاریة وسحولیة ویمنة، وکتان"

- کفنِ نبوی میں بھی سحولی کپڑوں، حبرۃ/حلۃ حبرہ کا ذکر ملتا ہے جن کا رنگ سفید تھا۔

- ٹوپی میں طیلسانِ اسود (سیاہ طیلسان) کا ذکر بھی آتا ہے۔

ان کی تشریح و تعبیر میں کپڑوں کی اقسام اور ان کے مراکز کی تفصیل آتی ہے:

یمنی حبرہ

پسندیدہ ترین لباس/کپڑا تھا جیسا کہ بخاری و مسلم وغیرہ کی احادیث بتاتی ہیں۔ وہ مقبول عام لباس/کپڑا بھی معلوم ہوتا ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے مگر بالعموم وہ یمن کا انتہائی مرغوب و پسندیدہ

کپڑا تھا۔ اکثر و بیشتر روایات میں اس کی نسبت یمن کی طرف کی جاتی ہے، پھر ازار غلیظ (موٹے ازار) کے بارے میں یمانی کی نسبت لگی ہوئی ہے جس طرح یمنی جبہ کے ساتھ ہے۔ یمن انتہائی اہم مرکز تھا۔

- صحاری کپڑوں میں ایک قمیص اور دو مزید صحاری بلا سلے کپڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ صحار بھی ایک جنوبی مرکزِ پارچہ بافی تھا۔

- سحولی کپڑوں کی نسبت بھی ایک مقامِ صنعت سحول کی طرف ہے جو جنوبی عرب ہی کا ایک مشہور صنعتی علاقہ تھا۔

- برد نجرانی: رسول اکرم ﷺ کی چادر مبارک نجران کے علاقہ کی بنی ہوئی تھی جسے ایک اعرابی نے کھینچ کر اپنا مال مانگا تھا۔

نصاریٰ نجران کا وفد حاضر خدمت ہوا تو حبرہ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا جن میں جبے اور چادریں تھیں۔ (ابن کثیر، ۱/۵۷۴)

- عمامہ قطریہ: حدیث ابوداؤد: ۱۴۷ میں نبوی عمامہ کا ذکر ہے جو قطر علاقے کا تھا۔

ریشمی لباس

ریشم (حریر) کو کہتے ہیں اور اس سے بنے ہوئے کپڑوں کی اقسام سوتی کپڑوں کی مانند بہت زیادہ تھیں۔ اگلی بحثوں میں سندس، استبرق وغیرہ کے حوالے بھی آتے ہیں جیسا کہ قرآنی آیات کریمہ کے حوالے سے جنتی ملبوسات کا ذکر پہلے آ چکا۔ اس ریشمی قسمِ لباس میں ہر طرح کے ملبوسات شامل تھے جیسے زیریں جامے (ازار و سروال وغیرہ)، بالائی بدن کے کپڑے جیسے قمیص، عباء، جبہ وغیرہ اور بالائی لباس پر پہننے کی چادریں بالخصوص ریشمی ہوتی تھیں یا ریشم کا جزوِ وافر رکھتی تھیں۔ اسی طرح ٹوپیاں بھی ریشمی ہوتی تھیں، ملبوساتِ نبوی کے علاوہ ملبوسات صحابہ کرام میں سے بعض ریشمی ہوتے تھے بالخصوص حضرات زبیر بن عوام اسدی اور عبدالرحمٰن بن عوف زہری رضی اللہ عنہما ریشمی ملبوسات ہی پہنتے تھے۔ خواتین کے ملبوسات میں بھی بعض ریشمی ہوتے تھے اور بچوں بچیوں کے بھی۔ سر ڈھانکنے کے لباس بھی ریشمی ہوتے تھے۔ بالعموم ان ریشمی

ملبوسات کے مراکز جنوبی عرب کے یمن کے مختلف شہر تھے اور شام وعراق وغیرہ سے بھی ان کو درآمد کیا جاتا تھا۔

اونی لباس

اونی لباس بالعموم بدویت یا بدوی تمدن سے وابستہ سمجھا جاتا ہے اور اسی بنا پر وہ ادنیٰ اور سادہ ترین بھی کہا جاتا ہے۔ بدو عرب اور بعض دوسرے شہری افراد وطبقات کمبل نما اونی کپڑے پہنتے تھے اور ان کا اون ان کے مویشیوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اونٹ کا اون تو عام تھا اور بکریاں (بالوں والی) بھیڑیں بھی اون فراہم کرتی تھیں۔ بعض قسموں کو خالص اون کے لیے پالا جاتا تھا۔ اونی لباس میں زیادہ اقسام نہیں تھیں کیونکہ کمبل نما چوغہ/ لباس سر سے پیر تک ڈھانکنے کے کام آجاتا تھا۔ بہر حال ان کی بعض معمول کی اقسام بھی ہوتی تھیں جو مردوں اور عورتوں اور بچوں/ بچیوں سب کے لیے ہوتی تھیں اور ان کے تن ڈھانکنے کے کام آتی تھیں۔ بعض اونی ملبوسات عمدہ، قیمتی اور نفیس بھی ہوتے تھے اور وہ بالعموم شام اور دوسرے ٹھنڈے علاقوں سے درآمد کیے جاتے تھے۔ معمولی سادہ اونی کپڑوں کی صنعت گھریلو تھی اور بدوی عرب یا شہری طبقات کے افراد ان کو خود ہی بنا لیا کرتے تھے۔

موٹا کھردرا جامہ/ بجاد

لغوی اعتبار سے البجاد کے معنی ہیں ''دھاری دار کپڑا'' جس کی جمع ''بُجُد'' ہے (مصباح اللغات) مگر احادیث وروایاتِ سیرت میں اس کو موٹا کھردرا کپڑا/ لباس بتایا گیا ہے جیسا کہ ابن ہشام کی سیرت میں ہے:''والبجاد الکساء الغلیظ الجافی''۔ دراصل اس کا ایک مشہور صحابی حضرت ذوالبجادینؓ کے مشہور نام یا لقب کی تشریح میں ذکر آیا ہے، اگرچہ اصلاً ان کا نام حضرت عبداللہ المزنی تھا، ان کو ذوالبجادین کا نام اس لیے دیا گیا کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت بڑی شد ومد کے ساتھ دیتے تھے اور ان کی قوم ان کو منع کرتی تھی اور ان کے ساتھ زیادتی کرتی تھی۔ ان کا ظلم یہاں تک بڑھا کہ ان کی سب چیزیں لے لیں صرف ان کے جسم پر ایک

بجاد (دھاری دار چادر/کپڑا) چھوڑا، صحابی موصوف ان سے بھاگ کر رسول اکرم ﷺ کے پاس آئے تو اپنے ''بجاد'' کو دو حصوں میں پھاڑا اور ایک حصہ کا ازار بنالیا اور دوسرے کو اوپری بدن پر لپیٹ لیا اس لیے ان کو ذوالبجادین کہا گیا: "... شق بجاده باثنين، فاتزر بواحد و اشتمل الآخر ثم اتى... فقيل له : ذو البجادين..."

(ابن ہشام، ۲/ ۵۲۸؛ غزوۂ تبوک سے واپسی کے دوران سفر میں ان کی وفات ہوئی اور حضرات شیخینؓ ان کی قبر میں اترے؛ نیز ملاحظہ ہو: اسد الغابہ، ۲/ ۱۳۸: ذوالبجادین/ بجاد کی تشریح کے لیے)

- واقدی اور بعض دوسرے اہل سیر کا بیان ہے کہ غزواتِ حنین وغیرہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر اسی قسم کے موٹے سخت کپڑے سیاہ رنگ کے تھے اور ان کو "البجد السود" کہا گیا ہے۔ (واقدی، ۹۰۵)

کساء غلیظ

کساء (جمع اکسیۃ) عام کپڑے اور لباس کے معنی میں آتا ہے۔ صاحب مصباح اللغات نے کمبل کے معنی بھی دیے ہیں۔ کسا یکسو کے معنی کپڑا پہنانے کے ہیں اور کسِیَ یکسی کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں۔ وہ ایک طرح ثوب کا مترادف بن جاتا ہے۔ روایاتِ سیرت و حدیث میں اس کے ساتھ بعض صفات لگا کر خاص قسم کے کپڑے مراد لئے جاتے ہیں جیسے کساء غلیظ کے معنی ہیں موٹا کپڑا۔ اسی طرح بعض احادیث میں "کساء ملبد" آتا ہے جس کے معنی ہیں: پیوند لگا ہوا کپڑا۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسری صفات ملتی ہیں اور مزید مل سکتی ہیں۔ ان سب میں اصل چیز کپڑا بہ طور نوع آتا ہے اور وہ کبھی لباس بھی بن جاتا ہے۔ ان کی بعض مثالیں اور استعمالات اور اقسام کا ذکر روایات وواقعات کے حوالے سے کیا جاتا ہے:

کساء طارونی ابیض

بعثت سے قبل رسول اکرم ﷺ نے حجر اسود کو اس کے اصل مقام پر نصب کرنے کی خاطر جس کپڑے میں رکھا تھا وہ سفید شامی عمدہ کپڑا تھا اور آپ ﷺ ہی کا کساء مبارک تھا: "وان الحجر

وضع فی کساء طارونی ابیض من نقاع الشام کان للنبی ﷺ..." (بلاذری، ۱/۱۰۰)

کساءِ خیبری

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ ایک بار صبح آپ ﷺ گھر سے کساء خیبری یعنی خیبر کا بنایا ہوا کپڑا پہنے ہوئے برآمد ہوئے۔ (اسد الغابہ، ۳/۱۱)

کساءِ ملبد

مشہور روایت و واقعہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بعد وفات نبوی حضرت ابو بردہ اشعریؓ کو ایک کساء ملبد (پیوند لگا موٹا کپڑا) دکھایا اور فرمایا کہ اسی میں رسول اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تھی۔ دوسرا اضافۂ راوی یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ہم کو ایک موٹا ازار (ازارا غلیظا) دکھایا جو یمن میں بنایا جاتا ہے اور ملبد نامی کپڑا دکھایا: "ازارا غلیظا مما یصنع بالیمن و کساء من هذه التی یدعونها الملبدة"

(بخاری، کتاب الجہاد، باب ماذکر من درع النبی ﷺ؛ کتاب اللباس، باب الاکسیة و الخمائص؛ مسلم، حدیث: ۳۴ (۲۰۸۰) نیز مابعد؛ حدیث ابوداؤد: ۴۰۳۶؛ ترمذی، ابواب اللباس، باب فی لبس الصوف وغیرہ۔ ان تمام تشریحات سے وہ معمولی موٹا کپڑا معلوم ہوتا ہے اور پیوند لگے ہوئے کے لغوی معنی میں نہیں ہے)

قباطی

لغوی طور سے وہ قبط کی طرف منسوب ہو کر القبطۃ یا القبطیۃ کہلاتا ہے جس کی جمع القَباطی و القُباطی ہے۔ "وہ کتان کا کپڑا ہے جو قبط کی طرف منسوب ہے"

(مصباح اللغات؛ الکتان کے لغوی معنی ہیں: السی کا پودا/سبز کائی)

قباطی کا واحد قبطیہ ہے۔ وہ ایک خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا۔ دراصل وہ مصر میں بنایا جاتا تھا اس لیے قباطی (قبطی) کہلاتا تھا۔ اور سفید باریک کپڑا ہوتا تھا: "القباطی، ثوب بیض کانت تصنع بمصر وهی جمع قبطية"، (الروض الانف)۔ اس کا ذکر ایک حدیث میں ہدیہ نبوی کے

ضمن میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت دحیہ کلبی کو ایک قبطیہ دیا جس کے ایک حصہ سے ایک قمیص بنانے کا حکم دیا تھا اور ایک حصہ کا دوپٹہ۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

(ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس القباطی)

- دوسرا حوالہ حضرت خباب بن ارت تمیمیؓ کے بارے میں ملا ہے کہ اسی کا کفن انھیں دیا گیا تھا: "اتی بکفنه قباطی" (بلاذری، ۱/۱۷۸)

- ایک قدیم ترین اور عہد نبوی دونوں ادوار کا حوالہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا غلاف اسی قباطی نامی عمدہ کپڑے سے بنایا جاتا تھا: "کانت الکعبة علی عهد رسول الله ﷺ ثمانی عشرة ذراعا، و کانت تکسی القباطی..." (ابن ہشام، ۱/۱۹۹ حاشیہ از الروض الانف سہیلی)

زیریں جامے

ازار

جسم کے زیریں حصہ- ناف یا کمر سے ٹانگوں تک- کو ڈھانپنے والے لباس/کپڑے کو ازار کہتے ہیں۔ اردو میں اسے تہمد، تہبند یا لنگی کہا جاتا ہے۔ وہ بالعموم ایک چادر نما کپڑا ہوتا ہے جس سے اس حصۂ بدن کو ڈھک لیا جاتا ہے۔ وہ کمر پر اس طرح باندھا جاتا ہے کہ اس کے دونوں سرے/کنارے دونوں ٹانگوں کو لپیٹ لیتے ہیں اور دونوں کناروں کو اینٹھ کر کمر پر کس لیا جاتا ہے۔ وہ بلا سلا کپڑا/لباس ہوتا ہے۔ اس کے کناروں کو بالخصوص اس حصہ کو جو تھان سے پھاڑا جاتا ہے بخیہ کر دیا جاتا ہے تاکہ کپڑے کے پھوسڑ نہ نکلیں۔ ایک رواج اب یہ بھی پایا جاتا ہے کہ دونوں سروں/کناروں کو ملا کر سل دیا جاتا ہے اور اس کی شکل ایک لمبے گول کپڑے کی سی ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ٹانگوں کا کوئی حصہ عریاں نہیں ہوتا۔ لیکن یہ رواج غالباً عہد نبوی میں نہیں تھا۔ کیونکہ ابھی تک اس کے شواہد نہیں ملے اور جو تاریخی واقعات ملتے ہیں وہ اسے بالعموم بلا سلا لباس ہی ثابت کرتے ہیں۔

ازار کی ایک شرعی حد بندی بھی ہے۔ متعدد احادیثِ نبوی سے ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کے ازار کو ٹخنوں کے نیچے نہیں ہونا چاہئے۔ اس حکم شرعی یا نبوی قدغن کا ایک تاریخی، سماجی اور

تہذیبی پس منظر ہے۔ امرائے عرب اور اکابرِ قریش وغیرہ بالعموم تکبر و غرور کے سبب اپنے ازار کو اتنا لمبا اور لٹکتا ہوا رکھتے تھے کہ اس کا نچلا حصہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلتا تھا۔ وہ فخر و غرور اور تکبر کے علاوہ بڑے پن کا نشان بھی تھا۔ اس کے بالمقابل کمزور طبقات یا عوام اور سادہ اشخاص کا ازار اونچا ہوتا تھا جسے ٹخنوں کے اوپر ہی سمجھا جا سکتا ہے بلکہ اس سے اوپر بھی ہوتا تھا۔ اس کی وجہ غربت اور کپڑے کی عدم دستیابی تھی۔ اسلامی شریعت نے مرد کا ستر ناف تا گھٹنا قرار دیا اور ازار کو ٹخنے تک وسیع کر دیا، نیز تقویٰ و طہارت کی خاطرِ عاطر کے سبب نصفِ ساق (پنڈلی کے آدھے حصہ) تک پہونچنے والے ازار کو بہتر اور پسندیدہ تر قرار دیا: "وارفع ازارک الی نصف الساق ..." الازار الی انصاف الساقین..." (ابوداؤد، نسائی کی روایات کی تصحیح حاکم سمیت؛ فتح الباری، ۱۰/۳۱۶)۔ ٹخنے سے نیچے لٹکانے کا معاملہ چونکہ تکبر و ریاکاری اور خودسری و خودنمائی کا تھا اسی لئے وہ ناپسندیدہ ٹھہرا کہ اسلام ایسے رذائل کے خلاف ہے: "... وایاک واسبال الازار فانه من المخيلة، وان الله لا يحب المخيلة" (حوالہ سابق ۱۰/۳۱۶، نیز اسبال ازار پر متعدد احادیث)۔

اس کے علاوہ ایک اور دینی حکمت اور عملی نظافت بھی اس میں مضمر تھی۔ زمین پر گھسٹنے کے سبب کپڑے کے گندگی سے آلودہ ہونے کا احتمال ہی نہیں، یقین تھا لہٰذا وہ کپڑے کے پاک اور طاہر رکھنے کے حکمِ ربانی کے خلاف ہوتا۔ اس لئے بھی اس کی ممانعت کی گئی۔ پھر ہر لباس کی طرح ازار کی لمبائی بھی تو متعین کرنی ہی تھی۔ تمام امکانات و احتمالات کو دیکھتے ہوئے ٹخنے کو آخری حدِ ازار قرار دینے میں یہ بھی ایک وجہِ فطرت تھی۔ اسی بنا پر بہت سی احادیث میں ٹخنے سے نیچے ازار لٹکانے کی مذمت آئی ہے بشرطیکہ وہ فخر و غرور اور تکبر و ریاکاری کے سبب ہو: "...وهذا الاطلاق محمول علىٰ ماورد من قيد الخيلاء وهو الذى ورد فيه الوعيد بالاتفاق..."

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۱۷؛ نیز شرح نووی ۱۰/۳۱۹)

– حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس شخص کی طرف نظر بھی نہیں کرے گا جس نے اپنا کپڑا استکبار و غرور کے سبب لٹکایا: "لا ینظر الله الى من جرّ ثوبه خيلاء" (بخاری، حدیث: ۵۷۸۳؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۱۱-۳۱۳)۔ شارحین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ایسے شخص پر نظرِ رحمت نہیں ڈالے گا۔ یہ تعبیر عقوبت و سزا بتاتی ہے۔

لباسِ تکبر کی تعریف رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں ملتی ہے کہ کبر حق کا رد کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے: "الکبر بطر الحق وغمط الناس"، ورنہ اچھے لباس اور اچھے جوتے پہننا تو جمال میں شامل ہے جو اللہ جمیل کو پسند ہے: "ان الرجل یحب ان یکون ثوبہ حسنا ونعلہ حسنۃ، فقال: ان اللہ جمیل یحب الجمال" (۱۰/۳۲۰)

- حضرت ابو ہریرہؓ کی نبی ﷺ سے روایت ہے کہ جس نے ازار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکایا وہ حصۂ ازار جہنم میں ہوگا: "...ما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار"

(بخاری، حدیث: ۵۷۸۷؛ فتح الباری، ۱۰/۳۱۶-۳۱۷ نیز دوسرے ابواب وصفحات: حدیث: ۵۷۸۸: "لا ینظر اللہ یوم القیامۃ الیٰ من جرّ ازارہ بطراً؛ حدیث: ۵۷۹۱: "من جرّ ثوبہ مخیلۃ لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ۔" احادیث: ۵۷۸۹-۵۷۹۰: میں ایک متکبر شخص کے، جو ازار یا حلہ کو لٹکائے ہوئے تھا، زمین میں دھنسا دینے کے عذاب کا مستحق بتایا گیا ہے۔ حدیث ابوداؤد- ۶۳۸: کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے ایک مسبلِ ازار صحابی کو نماز پڑھتے دیکھا تو نہ صرف اس کی نماز دہروائی بلکہ نیا وضو بھی کروایا)۔

حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے شارحینِ کرام نے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ کبر وغرور کے سبب ازار کا لٹکانا باعثِ عذاب ہے۔ اصل وجہ کبر وغرور ہے، اس کے ساتھ کوئی کام کیا جائے وہ باعثِ عقاب وعقوبت ہوگا۔ اسبالِ ازار (ازار کا لٹکانا) اس زمانے میں نشانِ غرور وتکبر تھا۔ اس لئے اسے ایسی سخت سزا کا مستحق قرار دیا گیا۔ اور جو شخص لاپرواہی یا کسی وجہ سے اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ اس سزا کا مستحق نہیں ہے۔

ان تمام احادیث واحکام اور ارشاداتِ نبوی ﷺ کا مقصود یہ ہے کہ مرد حضرات کو ازار کو ٹخنوں سے اوپر ہی رکھنا چاہئے، اس کو نیچے لٹکانا نہیں چاہئے۔ اور تکبر وغرور کے سبب ان کا لٹکانا ہی باعثِ عذاب اور لائق مذمت ہے۔ روایات واحادیث میں اگرچہ اوپری لباس- حلہ، قمیص وغیرہ- کے ٹخنے کے نیچے لٹکانے کی مذمت بھی ملتی ہے مگر وہ عمومی مصیبت اور عام رواج نہ تھا۔ عربوں کے بعض لباس اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ وہ گردن سے زمین تک آجاتے ہیں۔ اس صورت میں وہ بھی اسی حکم و پابندی کی حد میں آجاتے ہیں۔ ورنہ بالعموم وہ اتنے لمبے نہیں ہوتے۔ ازار چونکہ زیریں لباس ہے اس لئے وہ ہی نیچے لٹکنے کا احتمال زیادہ رکھتا ہے اس لئے اس کا کہیں واضح ذکر ہے اور کہیں ثوب/ کپڑے سے اسی کو مراد لیا گیا ہے۔ ان تمام احادیث میں

بطر (اکڑ)، مخیلہ (دکھاوا)، خیلاء (ریاکاری) اور فخر وغرور واستکبار کے ہم معنی الفاظ ہی کو پابندی کا سبب بتایا گیا ہے۔ اور یہی رذالتِ نفس بنیادی طور سے عذاب وسزا اور الٰہی اعراض کی وجہ بن جاتی ہے۔ یہ تمام کتب حدیث میں ہے۔

(مسلم، کتاب الایمان، حدیث: ۱۷۱ وغیرہ؛ ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاسبال فی الصلوۃ وغیرہ؛ ترمذی، ابواب اللباس، باب کراھیۃ جر الازار۔ نیز فتح الباری کے متعلقہ مباحث کے علاوہ دوسرے ابواب وکتب حدیث مذکورہ بالا وغیرہ)

کسی عذر یا مجبوری کے سبب ازار کا لٹک جانا اور حدِ شریعت سے گذر جانا معاف ہے اور اس کی کوئی سزا اور مذمت بھی نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے معاملہ میں ثابت ہوتا ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ سننے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ میرے ازار کا ایک حصہ نیچے لٹک جاتا ہے، اگر میں اس کا مسلسل دھیان نہ رکھوں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر سے ایسا کرتے ہیں: "... قال ابوبکر : یا رسول اللہ ! ان احد شقی ازاری یسترخی، الا ان اتعاھد ذلک منہ، فقال النبی ﷺ : لست ممن یصنعہ خیلاء" ۔ امام بخاریؒ نے ایک دوسری حدیث اسی باب میں اس کے معاً بعد یہ بیان کی ہے کہ ایک صحابی یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ جلدی مسجد آنے کی دھن میں اپنے کپڑے کو نیچے لٹکائے ہوئے آگئے اور نماز میں شریک ہوگئے: "فقام یجرّ ثوبہ مستعجلا حتی اتی المسجد..." لیکن ان پر نکیر نہیں کی گئی۔ (بخاری، حدیث: ۵۷۸۴، ۵۷۸۵؛ فتح الباری، ۱۰/۳۱۴-۳۱۵)

خواتین اس اسبالِ ازار کے حکم و وعید سے مستثنیٰ تھیں کیونکہ بالعموم ان کا لمبا لباس، جو ان کے پیروں کو ڈھانک لے، پسندیدہ تھا۔ حضرت ام سلمہؓ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ میں لمبا لباس پہنتی ہوں جس کا نچلا حصہ زمین پر رگڑ کھاتا رہتا ہے اور بعض اوقات گندی جگہوں پر بھی چلتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین کا بعد کا صاف حصہ اس گندے کپڑے کو پاک کردیتا ہے۔ "... انی امراۃ اطیل ذیلی و أمشی فی المکان القذر ... الخ" (موطا/تنویر الحوالک، ۱/۴۷؛ ابن ماجہ، حدیث: ۵۳۱ وغیرہ)

ان روایات واحادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ازار ٹخنے سے نیچے لٹک جائے اور اس

کے لئے کوئی عذر ہو تو کوئی حرج نہیں:"... ان کان لعذرٍ فلا حرج علیه..."۔ بلا عذر کا مسئلہ ہی اصل مسئلہ بحث و تمحیص اور قابلِ مواخذہ و مذمت بنتا ہے (۱۰/۱۱۴ و مابعد)۔ شریعت و دین میں اصل سبب پر نظر رہتی ہے اور وہ ہر چیز کی حدود مقرر کر دیتے ہیں۔ ان سے تجاوز مصیبت کا سبب بن جاتا ہے۔

بہر حال اس پوری بحث کا خلاصہ حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ مرد حضرات کے لئے دو احوال ہیں: ایک حالِ استحباب کہ ازار نصفِ ساق تک رہے اور دوسرا حالِ جواز کہ ٹخنوں تک رہے۔ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے تمام قدم بھی ستر بن جاتے ہیں لہٰذا ان کو نہ صرف ٹخنوں کے نیچے اپنے ازار یا کپڑوں یا دامنوں کو لٹکانے کی اجازت ہے بلکہ ایک بالشت بلکہ ایک ہاتھ لمبا لٹکانے کی اجازت ہے، اس لیے ان کے بھی دو احوال ہیں: ایک حالِ استحباب کہ ایک بالشت لٹکائیں اور دوسرا حالِ جواز کہ ایک ہاتھ لمبا کپڑا لٹکا سکتی ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ، حضرت فاطمہؓ اور بعض دیگر خواتینِ اسلام کے حوالے سے خاتون کے ازار کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔

(فتح الباری، ۱۰/۳۱۹-۳۲۰ وغیرہ)

اس مسئلہ کے ضمن میں آخری بات: بقول امام غزالیؒ اب نصفِ ساق تک اونچا ازار ریاکاری اور تکبر کا نشان بن گیا ہے اس لئے ایسے حضرات ریاکار ہیں اور اسی مذمت و سرزنش کے مستحق جو اسبالِ ازار متکبرانہ کے مجرموں کے لئے ہے۔ کیونکہ اصل جرم تو تکبر وغیرہ ہے۔ تہذیبی اور سماجی اعتبار سے بھی ٹخنوں تک ازار کا رہنا مناسب لگتا ہے کہ ہماری اقدارِ حیا و لحاظ میں اس سے اوپر پیروں کے حصہ کا کھلنا معیوب بھی ہے۔ (احیاء علوم الدین، بحث/ کتاب اللباس)

ازارِ نبوی

بہت سی احادیث وروایات میں رسولِ اکرم ﷺ کے ازارِ مبارک کا ذکر ملتا ہے۔ آپ ﷺ ازار ہی استعمال فرماتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مکہ مکرمہ کے سماج میں، جس میں آپ ﷺ کی نشو و نما ہوئی، ازار ہی رائج تھا اور اسی طرح مدینہ منورہ میں اسی کا چلن تھا۔ یہ ایک سماجی، تہذیبی اور معاشرتی قدر کا مسئلہ تھا۔ اس کی دینی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ لباسِ

نبوی رہا ہے لہٰذا کوئی شخص صرف متابعتِ نبوی میں اس کا استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور اسے اچھا/ احسن بھی سمجھا جا سکتا ہے مگر وہ سنت نہیں ہے۔ اسی بنا پر بعض علماء ومحدثین نے سنت کی دو قسمیں کی ہیں: سنتِ تعبدی جس کے کرنے میں اجر وثواب ملتا ہے اور جسے آپ ﷺ نے اسی مقصد سے کیا تھا۔ دوسری سنتِ عادی جو صرف عادت، رسم ورواج، عرف اور معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی بنا پر اختیار کی جائے اور جس میں اجر وثواب کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کی ایک موٹی سی مثال اونٹ کا گوشت کھانے اور اونٹنی کا دودھ پینے کی سماجی روایت عرب تھی، اسے سنتِ طعام نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ازار کے استعمال کا لباس میں معاملہ ہے۔ وہ لباسِ نبوی کا جز و ضرور تھا مگر سنتِ تعبدی نہیں، بلکہ سنتِ عادی ہی رہی تھی۔

(مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو: اسلامی احکام کا ارتقاء؛ سنتوں کا تنوع، بحث سنن تعبد و عادۃ)

معاشرتی لحاظ سے رسولِ اکرم ﷺ کے ازار کے استعمالات کے بعض مواقع کا ذکر بہت اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی:

۔ بعض روایاتِ سیرت کے مطابق اولین ذکرِ ازار حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے گھر میں تربیت کے دوران آتا ہے جب عریانی سے منع کیا گیا تھا۔

۔ غالباً سب سے پہلے ازارِ نبوی کا حوالۂ حدیث اولین قریشی تعمیر کعبہ کے زمانے (۵۸۲ء کے قریب) کا نظر آتا ہے جب آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے مشورے پر اپنے ازار کو کندھے پر رکھنے کی کوشش کی تھی اور ستر سے عاری ہونے کے سبب بیہوش ہو گئے تھے اور اسی عالمِ حواسِ خفتہ میں ہدایت ربانی ہوئی تھی کہ اپنے ازار کو باندھے رکھا کریں اور ستر نہ کھولیں۔ یہ بارہ سال کی عمر میں وحیِ حدیث آئی تھی۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کراھیۃ التعری فی الصلاۃ وغیرھا؛ حدیث: ۳۶۴؛ فتح الباری، ۱/ ۶۱۵؛ وحی حدیث، ۱۹-۲۰: ''... ان رسول اللہ ﷺ کان ینقل معھم الحجارۃ للکعبۃ وعلیہ ازارہ ... الخ'' اطراف حدیث: ۱۵۸۲، ۳۸۲۹ نیز کتاب الحج، باب فضل مکۃ و بنیانھا وغیرہ)

۔ حضرت عکرمہؒ کی روایت سے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے ازار باندھنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو دیکھا کہ وہ اپنا ازار اس

طرح باندھتے تھے کہ اس کے اگلے حصہ کا حاشیہ اپنے دونوں قدموں کے اوپر رکھتے تھے اور اس کے پچھلے حصہ کو اوپر اٹھا دیتے تھے۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح ازار باندھتے دیکھا: "... انه رای ابن عباس یأتزر فیضع حاشیة ازاره من مقدمه علیٰ ظهر قدمیه ویرفع عن مؤخره، قلت: لم تاتزر بهذه الازرة؟ قال: رأیت رسول الله ﷺ یا تزرها" (ابوداؤد، حدیث:۴۰۹۶)

غزوۂ خیبر ۷ھ/۶۲۹ء کے موقعہ پر حضرت انس بن مالکؓ اپنے سوتیلے والد و مربی حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے ردیف تھے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ان کے گھٹنے رسول اکرم ﷺ کی ران سے چھو رہے تھے۔ اسی حالت میں آپ ﷺ نے اپنے ازار کو ران پر سے ہٹایا تو مجھے ران کی سپیدی نظر آئی: "... ان رکبتی لتمس فخذ نبی الله ﷺ ثم حسر الازار عن فخذه حتی انظر الی بیاض فخذ النبی ﷺ ..."

(بخاری، باب ما یذکر فی الفخذ؛ فتح الباری، ۱/۶۲۰-۶۲۳؛ مسلم، کتاب النکاح، باب فضیلة اعتاقة امة الخ؛ کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة خیبر؛ محدثین وشارحین نے ایسی احادیث سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ کسی عارض کے سبب ستر کھل جائے تو وہ حرام وممنوع نہیں ہے مگر گھٹنے سے کمر تک مردوں کا بدن ڈھانکنا لازی ستر ہے جو عام حالات میں رہنا چاہئے۔ بالعموم کھولنا حرام وممنوع ہے)

- رسول اکرم ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے تو اپنا ازار پہنا اور تیل لگایا اور دوسرے زیب وزینت کو اختیار فرمایا۔ اس میں آپ ﷺ کے رداء پہننے کا ذکر ہے اور صحابہ کرام کے بھی ازاروں اور چادروں (الاردیة والازر) کا واضح ذکر کیا گیا ہے...

(بخاری، کتاب الحج، باب ما یلبس المحرم من الثیاب والاردیة والازر ...؛ فتح الباری، ۳/۵۱۰-۵۱۳ نیز دوسرے ابواب)

- رسولِ اکرم ﷺ کی وفات جس لباس میں ہوئی تھی اسے بعد وفات حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو بردہؓ کو دکھایا۔ آپ ﷺ کے جس ازار کو حضرت عائشہؓ نے دکھایا تھا وہ موٹے کپڑے کا تھا جو یمن میں بنایا جاتا تھا اور جس لباس کو ملبدہ کہا جاتا تھا: "...اخرجت الینا عائشة ازاراً غلیظا مما یصنع بالیمن وکساء من هذه التی یدعونها الملبدة..."

(بخاری، کتاب اللباس وباب الاکسیة الخ؛ کتاب الجهاد، باب ذکر من درع النبی ﷺ؛

فتح الباری، ۱۰/ ۳۴۱-۳۴۲؛ نیز ابن سعد، ۱/ ۵۰۸: ازاراً غلیظا من هذه الیمانیة، جس کا ذکر اور بحث اوپر مراکز و اقسام لباس میں آچکی ہے؛ مسلم، کتاب اللباس، باب التواضع فی اللباس؛ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب لباس الغلیظ؛ ترمذی، باب لباس الصوف وغیرہ)

رسول اکرم ﷺ کے متروکہ لباسوں میں ایک یمنی ازار (ازاراً یمانیا) کا ذکر بلاذری وغیرہ نے کیا ہے (انساب، ۱/ ۵۰۷)۔ رسول اکرم ﷺ کے ازار مبارک کا ذکر مزید تلاش و تفحص سے کیا جاسکتا ہے مگر استیعاب مقصود نہیں، صرف ذکرِ ازار مطلوب ہے۔ اگلے مباحث میں بھی ازارِ نبوی کی بعض مثالیں اور ان کے سماجی پس منظر اور تمدنی زاویے آئیں گے جیسے ایک صحابیہ کے چادر کے ہدیہ کو آپ ﷺ نے ازار بنالیا تھا اور دوسرے ہدیہ کو ازار بنانا چاہتے تھے کہ ایک صحابی مکرم نے اسے اپنے کفن کے لیے مانگ لیا تھا اور آپ ﷺ نے بخوشی عطا کر دیا تھا۔

ازارِ صحابہ

مکی اور مدنی دونوں ادوارِ اسلام میں اور ان سے قبل جاہلی معاشرے میں مردوں کا زیریں لباس ازار ہی رہا تھا۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ صحابہ کرام اور دوسرے مردانِ عرب بھی ازار باندھتے یا ازار پہنتے تھے۔ البتہ ان کے ازار پہننے کے بعض واقعات کا ذکر ہر لحاظ سے دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہے: اس سماجی حقیقت کے اثبات کے لئے کہ مردوں کا لباسِ ستر و زینت ازار تھا، ان مواقع کی گوناگونی کے لئے جب وہ باندھا جاتا تھا، شرعی حد کی پابندی اور بعض عذر کے سبب اس کے ڈھیلے بن جانے کے لحاظ سے۔ ان کے علاوہ بھی بعض اور دلچسپ چیزیں ان کے ذکر میں ملیں گی۔

ازارِ مختصر

- غربت و ناداری میں ازار کا طول ہی نہیں ہوتا تھا، وہ ٹخنوں کے نیچے کیا لٹکتا، ستر کے لئے بھی بسا اوقات کافی نہیں ہوتا تھا۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت کثیرہ کا یہ حال ابتدائی ایام میں تھا۔ ان کے ازاروں کا ذکرِ خیر خاص ان کے عمومی ذکر کے ساتھ احادیث میں آتا ہے۔ پھر ازار بالائی بدن کی ستر پوشی کے بھی کام آتا تھا۔ اس لئے اوپری بدن کے لئے دوسرا کوئی لباس

دستیاب نہیں تھا۔ ایسی صورت میں وہ ازار کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے اور بدن کے لباس کے لحاظ سے دونوں حصوں کی حد فاصل مٹا کر ایک قالب میں ڈھال دیتا تھا۔ ایسے چھوٹے ازار میں نماز کی ادائیگی پچھلی صفوں میں کھڑی خاتون نمازیوں کے لئے باعثِ شرم وحیا بن جاتی تھی کہ اگلی صفوں کے نمازیوں کے ستر کھل کھل جانے کا خدشہ ہی نہیں وقوع بھی ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے خواتین کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب تک مرد حضرات اچھی طرح کھڑے یا بیٹھ نہ جائیں وہ اپنے سروں کو سجدے سے نہ اٹھایا کریں۔ قصورِ ازار نے کس طرح دینی وفقہی مسئلہ کو جنم دیا اور تہذیب کی کیسی رعائت کی تھی!

(بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، کتاب الاذان، باب عقد الثیاب وشدھا؛ حدیث:۸۱۴: فتح الباری، ۳۸۶/۲:"... کان الناس یصلون مع النبی ﷺ، وھم عاقدو اُزرھم من الصغر علی رقابھم، فقیل للنساء: لاترفعن رؤوسکن حتی یستوی الرجال جلوساً" ؛ کتاب الصلوٰۃ، باب اذا کان الثوب ضیقا، حدیث:۳۶۱ وغیرہ؛ حدیث:۳۶۲؛ فتح الباری، ۶۱۲/۱-۶۱۳:"عاقدی ازرھم علی اعناقھم کھیئۃ الصبیان" ۔ دوسری حدیثِ بخاری سے یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچے بالعموم اپنی گردنوں میں ازار باندھ لیا کرتے تھے یا ان کی مائیں ان کی گردنوں سے باندھ دیتی تھیں تا کہ ستر پوشی بھی ہو سکے اور دو کپڑوں کی کمی کی تلافی بھی۔ حافظ ابن حجر نے اسی مقام پر اس تنگ اور چھوٹے ازار کی تشریح فرمائی ہے۔ یہ ایک سماجی اور تمدنی روایت کا بیان ہے اور آج بھی بعض مسلم معاشروں بالخصوص روایتی اور غریب علاقوں میں اس پر عمل ہوتا ہے)

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے ایک بار عہدِ نبوی کے بعد صرف ازار میں نماز ادا فرمائی جس کو انھوں نے اپنی گردن میں گدی کی طرف سے باندھ لیا تھا اور ان کے دوسرے کپڑے لکڑی کی تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے تبصرہ کیا کہ آپ نے صرف ایک ازار میں نماز پڑھی؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایسا اس لئے کیا کہ تم جیسا احمق اسے دیکھ لے۔ عہدِ نبوی میں ہم میں سے کس کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے؟"... صلّٰی جابر فی ازار قد عقدہ من قبل قفاہ، وثیابہ موضوعۃ علی المشجب، قال لہ قائل: تصلی فی ازار واحد؟ فقال انما صنعت ذلک لیرانی احمق مثلک. واینا کان لہ ثوبان علی عھد النبی ﷺ"

(بخاری، حدیث: ۳۵۲؛ اطراف: ۳۵۳، ۳۶۱، ۳۷۰؛ فتح الباری، ۱/ ۶۰۵-۶۰۸ ومابعد۔ امام بخاریؒ نے رسول اکرم ﷺ کے صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی کئی احادیث بیان کی ہیں۔ کپڑے کو آپ ﷺ اپنے جسم

پر لپیٹ لیتے تھے: "ملتحفا فی ثوب واحد" ۔ملتحفا کی جگہ مشتملا بھی آیا ہے۔لمبے کپڑے کو دونوں شانوں پر ڈال لیتے تھے کہ ان کے دونوں کنارے ایک سے دوسرے شانہ پر گھوم کر آتے تھے: "القی طرفیه علی عاتقیه/ وخالف بین طرفیه علی عاتقیه"؛ نیز مسلم، کتاب الحیض، باب تستر المغتسل بثوب ونحوه؛ کتاب صلاة المسافرین وقصرھا، باب استحباب صلوة الضحیٰ؛ نیز دیگر کتب حدیث)

- حضرت ماعز بن مالکؓ نے جب رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں اپنے گناہِ زنا کا اعتراف کیا تھا تو اس وقت وہ صرف ازار پہنے تھے اور ان کے بدن پر رداء (چادر) نہ تھی: "... اتی رسول اللہ ﷺ برجل قصیر اشعث ذی عضلات، علیه ازار، وقد زنیٰ ،اس سے قبل والی روایت میں یہ وضاحت ہے: "لیس علیه رداء..."

(مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی وغیرہ)

- حضرت انس بن مالکؓ کی ماں حضرت ام سلیمؓ جب ان کو خدمت اقدس میں لائیں تو انھوں نے اپنے دوپٹے کے نصف حصہ کو پھاڑ کر ان کا ازار بنا دیا تھا اور اسے پہنا کر لائی تھیں: "... وقد أزّرتنی بنصفِ خمارھا وردّتنی بنصفه..." یہ بھی مختصر ازار تھا۔

(مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل انس...")

بعض دیگر بچوں کے ازار کے اسی طرح باندھنے کا ذکر دوسری احادیث میں ملتا ہے۔

عذر سے اسبالِ ازار

بعض احادیث میں بڑے صحابہ میں سے عظیم ترین اشخاص کے عجلت میں ازار کو لٹکانے یا گھسیٹنے کا ذکر ملتا ہے۔ان میں سے ایک حضرت فاروق اعظمؓ ہیں۔حضرت عبداللہ بن زید خزرجیؓ کے اذان کے رویائے صادقہ کو سن کر رسول اکرم ﷺ نے حضرت بلال حبشیؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔اس کی آواز سنی تو حضرت عمر بن خطاب عدویؓ اپنے گھر سے خدمتِ اقدس میں تیزی سے آئے اور ان کا ازار زمین پر/ نیچے گھسٹ رہا تھا: "فلما سمع عمر بن الخطاب نداء بلال بالصلوٰۃ خرج الی رسول اللہ ﷺ وھو یجر ازارہ ..." (ترمذی، باب ماجاء فی بدء الاذان؛ حضرت عمر کے ازار میں پیوند لگے ہونے کا ذکر بھی بہت ملتا ہے (ابن سعد، ۳/ ۳۲۷ کبھی وہ پیوند اون (فرع) کا ہوتا تھا اور کبھی چمڑے کا (مرقوع برقعة من ادم) ۔شہادت کے دن زرد

ازار باندھے ہوئے تھے۔ (ازار اصفر، ۳/ ۳۴۸ وغیرہ)

- حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ازار کے بارے میں پہلے ہی حدیث گذر چکی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے ازار کا ایک کنارہ لٹکا ہی رہتا تھا جس کو ٹھیک کرتے تھے اور ازارِ صدیقی کے لٹکنے کا سبب عذرِ شرعی تھا جس کی بنا پر عمل صدیقی کو آپ ﷺ نے نشان تکبر اور علامتِ مخیلہ نہیں قرار دیا تھا اور وہ عذر یہ تھا کہ کمر اور ناف کے درمیان کے حصہ میں اتنی گہرائی تھی جو ازار کو کھسکا دیتی تھی۔

- حضرت عثمان بن عفان اموی، علی بن ابی طالب ہاشمی اور دیگر صحابہ اکابر کے ازاروں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض کے قطری ازار تھے اور رنگین بھی۔ (تراجم صحابہ در ابن سعد ۳/ متعدد صفحات)

- اسی ضمن میں حضرت عتبان بن مالکؓ کے جرِ ازار (ازار گھسیٹنے) کا ذکر ملتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور ان کو آواز دی۔ صحابی موصوف نداءِ نبوی کے جواب میں اتنی تیزی اور عجلت سے باہر آئے کہ ازار زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔ حضرت عتبان کا مکان قباء میں تھا: "عن ابی سعید الخدری قال: خرجت مع رسول الله ﷺ یوم الاثنین الی قباء، حتی اذا کنا فی بنی سالم وقف رسول الله ﷺ علی باب عتبان فصرخ به، فخرج یجرّ ازاره..." (مسلم، کتاب الحیض؛ باب انما الماء من الماء)۔ اصلاً یہ ازار لٹکانے کا معمول نہ تھا بلکہ رسول اکرم ﷺ یا کسی اور معاملہ کی اجابت میں جلد بازی یا سرعت کے سبب وہ خود لٹک جاتا تھا۔

- حضرت مسور بن مخرمہؓ عہد نبوی میں چھوٹے تھے۔ وہ ایک بار ایک بھاری پتھر لا رہے تھے اور انھوں نے ایک ہلکا ازار باندھ رکھا تھا، ازار اچانک کھل گیا۔ ان کا بیان ہے کہ پتھر اتنا بھاری تھا کہ میں اسے نیچے نہیں رکھ سکا لہٰذا اس کو اس کے مقام پر پہونچایا۔ رسول اکرم ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اپنے کپڑے کو اٹھا کر باندھ لو اور عریاں نہ چلا کرو"... وعلی ازار خفیف..."

(مسلم، کتاب الحیض، باب الاعتناء بحفظ العورة)

صحابہ کرام کے ازار/ عام حوالے

ان مذکورہ بالا مخصوص اسباب اور سماجی اور تمدنی پس منظر کے علاوہ متعدد صحابہ کرام کے

ازاروں کے واقعات ملتے ہیں، اگر چہ وہ عام حوالے ہیں تاہم ان میں بھی کوئی نہ کوئی سماجی منظر نامہ یا تمدنی زاویہ مستور ہوتا ہے جو تمدن عہد کو مزید اجاگر کرتا ہے۔ ان کے بعض واقعاتِ ازار کو مختصراً ذیل میں بیان کیا جارہا ہے:

- حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ کا بیان ہے کہ ایک خاتون نے رسول اکرم ﷺ پر اپنا نفس پیش (ہبہ) کیا مگر آپ ﷺ نے معذرت فرمالی۔ وہاں موجود حاضرین میں سے ایک صحابی نے ان سے اپنی شادی کرادینے کی درخواست کی۔ رسول اکرم ﷺ نے ان سے مہر دینے میں مال کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ یہ میرا ازار ہے جسے پھاڑ کر نصف ان کو دیتا ہوں۔ (مسلم، حدیث: ۷٦(۱۴۲۵)؛ ابوداؤد، حدیث: ۲۱۱۱-۲۱۱۲؛ ترمذی، ابواب النکاح، ماجاء فی مهور النساء)

- حضرت لیلیٰ کی حدیث ابوداؤد: ۴۰۱۲ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے ایک شخص کو اپنا ازار اتار کر نہاتے دیکھا تو منبر سے خطبہ دیتے وقت عام نصیحت کی کہ بلا ازار یا بلا پردہ نہیں نہانا چاہیے۔

- حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ازاروں کا ذکر اسبال اور پیوند کے حوالے سے اوپر آچکا ہے۔

- حضرت علیؓ کا ایک ازار معمولی قیمت صرف پانچ درہم کا تھا اور وہ موٹے کپڑے کا تھا۔ (اسد الغابہ، ۴/۲۳ وغیرہ)

- حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمیؓ کے ملبوسات میں بھی ازار کا ذکر ملتا ہے۔ (اسد الغابہ، ۳/۱۴۲)

- حضرت عبید بن خالد محاربیؓ کے ازار اور بعض دوسرے ملبوسات کا ذکر ہے، اس کے ساتھ اسبالِ ازار کی ممانعت بھی ہے۔ (اسد الغابہ، ۳/۳۴۸)

- حضرت سلیم بن جابر ہجیمیؓ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو ایک ازار قطری پہنے ہوئے تھے۔ (اسد الغابہ، ۲/۳۴۸)

- صحابی جلیل حضرت ابوہریرہ دوسی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ وہ اپنے ازاروں کو اپنی گردنوں سے باندھے رہتے تھے کیونکہ ان کے پاس

کوئی چادر نہیں ہوتی تھی، ستر پوشی کا کل کام ازار ہی کرتے تھے "رایت سبعین من اصحاب الصفة ما منهم رجل علیه رداء، اما ازارٌ و اما کساء، قد ربطوا فی اعناقهم فمنها مایبلغ نصف الساقین ومنها ما یبلغ الکعبین فیجمعه بیده کراهیة أن تریٰ عورته".

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب نوم الرجال فی المسجد)

ازارِ صحابیات

جہاں تک زیریں لباس کا تعلق ہے مردوں کی مانند عورتوں کا بھی لباسِ زیریں ازار ہی ہوتا تھا اور اس کی نوعیت اور باندھنے کی طریقت وغیرہ بھی یکساں ہوتی تھی۔ احادیث وروایات میں خواتین کے ازاروں کے ذکر میں سب سے مجموعی بیان ان کی ماہانہ اذیت اور ماہواری (حیض) اور نفاس وغیرہ کے ضمن میں ملتا ہے جب ان کے ساتھ ان کے مردوں کو ازار سے اوپر اوپر مباشرت کا حق دیا گیا ہے۔ ازاروں کے نیچے نہیں۔ ایسی روایات عمومی اور مجموعی ہیں جو نسائی ازاروں کو ثابت کرتی ہیں:"عن عائشة قالت: کان احدانا، اذا کانت حائضاً، امرها رسول الله ﷺ فتأتزر بازار، ثم یباشرها ..."اس معنی کی دیگر احادیث ہیں۔

(مسلم، کتاب الحیض، مباشرة الحائض فوق الازار؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الرجل یصیب منها ما دون الجماع وغیرہ؛ ترمذی، ابواب الطهارة، باب ما جاء فی مباشرة الحائض)

- اس باب میں امہات المومنین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، اور بعض دیگر ازواج کے ازار کا ذکر ملتا ہے۔

(ترمذی، ابواب الطهارة، باب ماجاء فی مباشرة الحائض: میں ان تینوں امہات المومنین کی احادیث ان کے ازاروں کے حوالے سے ہیں)

- ان کے علاوہ بھی متعدد دوسری احادیث میں ازواجِ مطہرات کے ازاروں کے حوالے باقاعدہ پائے جاتے ہیں:

- حضرت ام سلمہؓ کی جس مذکورہ بالا حدیث میں ان کے ذیل/ دامن کو لٹکانے کی بات کہی گئی ہے وہ ازار ہی سے متعلق ہے کہ اس کو موطا/ ازارا موطا کہا گیا ہے۔ ترمذی کی روایت

میں عورتوں کے لباس کے ذیول کا ذکر عمومی ہے۔ وہ بھی ازار کا ہے۔

(ترمذی، ابواب اللباس، باب فی ذیول النساء: ... فکیف یصنع النساء بذیولهن ...)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ازار کا ذکر اس واقعہ میں آتا ہے جب انھوں نے ایک رات رسول اکرم ﷺ کا تعاقب جنت البقیع جاتے ہوئے کیا تھا: "وتقنعت ازاری..." اس کا پورا واقعہ ردائے نبوی میں آتا ہے۔ بحوالہ حدیث مسلم: ۱۰۳۔ (۹۷۴ متابع)

- حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ حدیث بخاری: ۲۸۸۰ کے مطابق غزوہ احد میں اپنے ازاروں کے پائینچے چڑھائے لوگوں کو پانی پلا رہی تھیں۔

- حضرت ام سلمہؓ کی واضح روایت ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ نے ازارِ مرد کی حد مقرر کی تو میں نے دریافت کیا کہ عورت کے ازار کی حد کس قدر ہونی چاہیے؟ فرمایا کہ وہ اس کو ایک بالشت نیچے لٹکا سکتی ہے اور قدم کھل جانے کی صورت میں وہ ایک ذراع (ہاتھ بھر) لٹکانے کی حقدار ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔ اس میں ازارِ عورت کا واضح ذکر ہے۔

(موطا، کتاب الجامع، ماجاء فی اسبال المرأۃ ثوبها؛ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی قدر الذیل، حدیث: ۴۱۱۹ میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ تمام ازواج مطہرات کے ازاروں کی اسی قدر لمبائی تھی)

سراویل

مختلف احادیث میں ازار کا متبادل لباس سروال (جمع سراویل) آتا ہے۔ اس کا دوسرے کپڑوں کے ساتھ ذکر نماز پڑھنے کے جواز میں آتا ہے، اسی طرح احرام باندھنے والے کے لباس احرام کے ذکر میں بھی آتا ہے جہاں وہ بطور احرام ایک ممنوع لباس ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے سراویل کی انتہائی مختصر تشریح میں صرف یہ لکھا ہے کہ ابن سیدہ کے مطابق سراویل فارسی سے معرب ہے۔ غالباً اس کی اصل شلوار ہے۔ دوسری تشریحات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سلا ہوا لباس ہوتا ہے جس کی دو ٹانگیں (له رِجلان) ہوتی ہیں۔ یعنی دونوں ٹانگوں کو الگ الگ پائنچوں سے جدا کر دیا جاتا ہے جیسے آج کل کے پاجامے، شلواریں وغیرہ ہوتے ہیں۔ بہر حال روایاتِ حدیث میں بالعموم صحابہ کرام کے سراویل کے پہننے کا ذکر نہیں ملتا اور رسول اکرم ﷺ کے بارے

میں بھی یہ صراحت ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے اس کا استعمال نہیں فرمایا۔

بعض صحابہ کرام کی بعد کی زندگی کے حوالے سے ان کے سوانحی خاکوں میں ذکر آتا ہے کہ انھوں نے سراویل پہنا تھا۔ ان میں سے ایک حضرت عمار بن یاسر مذحجیؓ کے سراویل کا ذکر ملا ہے۔ (بلاذری، ۱/ ۱۵۸، بحوالہ محمد بن کعب قرظی؛ ابن سعد، ۳/ ۲۴۸)

لباسِ حیض

مختلف مواقع کے تعلق اور رعائت سے لوگوں کے کپڑے پہننے کا ذکر روایاتِ سیرت و احادیث میں برابر ملتا ہے۔ ان میں خواتین کے مخصوص لباس کی ایک نوعیت ان کی ماہانہ اذیت یا ماہواری کے حوالے سے ملتی ہے کہ وہ ان کا خاص الخاص موقعہ تھا۔ حضرت ام سلمہ ام المومنینؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتینِ عصر اپنے ایامِ ماہواری کے لئے خاص لباسِ حیض پہنا کرتی تھیں جیسا کہ ام المومنین نے ایک موقعہ پر پہنا تھا: "... اذ حضت، فانسللت فاخذت ثیابِ حیضی ..."

(حدیث بخاری: ۲۹۸؛ فتح الباری، ۱/ ۵۲۲-۵۲۳: حافظ موصوف کی بحث وتشریح میں یہ بات واضح ہے کہ زمانہ حیض کے لئے خاص کپڑے تیار کر لئے جاتے تھے: "... اخذت ثیابی التی البسها زمن الحیض / اخذت ثیابی التی اعددتها لالبسها حالة الحیض ...")

بالائی بدن کے ملبوسات: تمہید

تمام مذاہب اور متمدن معاشروں میں بالعموم دو لباسوں پر مشتمل جوڑا پہننے کا رواج قدیم زمانے سے رہا ہے۔ ایک زیریں جامہ اور دوسرا بالائی بدن کا لباس۔ ان دونوں کے جوڑ سے ہی لباس کا جوڑا بنتا ہے جو معمول کا لباس ہے۔ صرف ایک لباس ازار/ زیریں جامہ اور بالائی لباس رداء، بردہ وغیرہ سے ستر پوشی کسی وجہ خاص سے ہوتی تھی۔ اس میں جنگلی پن یا بے تہذیبی سے زیادہ غربت و ناداری کو دخل ہوتا ہے یا ہوتا تھا جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر فطری طور سے انسان، خواہ مرد ہو یا عورت، اپنے بدن کے دونوں حصوں کو مستور و محفوظ کرنا پسند کرتا ہے۔

اسلامی عربی تمدن سے قبل خالص جاہلی تمدن میں بھی اس لباس کے جوڑے کا ذکر بہت ملتا ہے۔ فطرت اور فطری تقاضوں کے علاوہ اس کے رواج میں دین حنفی اور شریعت ابراہیمی۔ اسماعیلی کا بھی خاصا دخل تھا۔ خالص اسلامی نبوی تمدن میں تو لباس کا جوڑا لازمۂ شرافت ہی نہیں لازمۂ دین بن گیا تھا کہ وہ دین فطرت بھی ہے۔ بخاری کی ایک حدیث میں اس خالص اسلامی اور تمدنی اور دینی وتشریعی لازمے کا ذکر بہت خوبصورت انداز میں ملتا ہے۔ ایک کپڑے میں نماز کے جواز کا فتویٰ اور واقعہ ہونے کے باوجود نبی اکرم ﷺ کا حکم وعمل یہی ہے کہ پورے جوڑے میں نماز پڑھی جائے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جب وسعت دی تو انسان/مسلمان اپنے کپڑے اپنے جسم پر جمع کر کے نماز ادا کرتا تھا: ایک شخص ازار و چادر میں، ازار و قمیص میں، ازار و قباء میں، شلوار/پاجامہ اور چادر میں، سراویل وقمیص میں اور سراویل وقباء میں اور تبان وقمیص میں اور بقول راوی حضرت ابوہریرہؓ تبان اور چادر (رداء) میں نماز پڑھتا تھا۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ فی القمیص والسراویل والتبان والقباء؛ فتح الباری، ۱/ ۶۱۶-۶۱۸: التبان کے لغوی معنی ''لنگوٹ، جانگھیا، نیکر'' کے ہیں (مصباح اللغات)، لیکن چونکہ وہ کامل ستر پوشی نہیں کرتا اس لئے بالائی لباس لمبا ہوتا تھا)۔

اس طرح دونوں ملبوسات کے سات جوڑوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں ان کے تنوع کا تو ذکر ہے ہی اس سے زیادہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ کامل ومکمل لباس جوڑے پر بنتا ہے خواہ زیریں جامہ کوئی ہو یا بالائی لباس کچھ بھی ہو۔ حافظ ابن حجرؒ نے تبان کو خارج کر کے ان کے نو جوڑے بنائے ہیں یعنی تین ضرب تین (۳×۳=۹) جو بہت دلچسپ نتیجہ ہے۔ بعض روایات میں دو چادروں پر مشتمل جوڑا بھی نظر آتا ہے اور کثرت سے نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ایک معمول کا لباس تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے اپنے چرواہے کو دو کپڑے دیے جو اس نے تھیلے میں رکھ لئے اور پرانی دھرانی دو چادریں پہنے رہا۔ رسول اکرم ﷺ نے اسے حضرت جابرؓ کے ذریعہ بلوا کر دونوں نئے کپڑے پہنوائے۔ (موطا/تنویر، ۳/۱۰۲)

جبہ/حلہ/قمیص وغیرہ

لغت میں جبہّ کے دو معانی دیے ہیں: جبہ اور زرہ اور اس کی دو جمع ہیں: جُبب اور جباب

(مصباح اللغات)۔ اصطلاحی طور سے جبہ بھی حلہ کی مانند بالائی بدن کا لباس تھا اور وہ اپنے زمانے میں تمام عرب میں اور دوسرے علاقوں میں مقبول تھا۔ اس کی مختلف نسبتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرب وجوار کے علاقوں میں سب سے زیادہ شام میں رائج تھا اس لئے اس کے کئی حوالے ملتے ہیں۔ ان کو کبھی جبہ شامیہ کہا گیا ہے اور کبھی جبہ رومیہ۔ اس کے علاوہ بھی اس کے دوسرے اسماء اور نسبتیں ہیں۔ اپنے عہد کے رائج ملبوسات میں اس کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے علاوہ مختلف اکابرِ عہد کے جبوں کا ذکر ملتا ہے۔ اردو میں جبہ و دستار کا ذکر بالعموم لباسِ فضیلت کے لئے کیا جاتا ہے کہ وہ مذہبی اشراف کے ملبوسات رہے ہیں۔ وہ مختلف ریشوں سے بنتا تھا۔ ان میں اون بھی شامل ہے اور سوت وریشم بھی۔ امام بخاری نے کتاب اللباس میں دو ابواب دینی وفقہی لحاظ سے قائم کئے ہیں: "باب من لبس جبة ضيقة الكمين في السفر اور باب لبس جبة الصوف في الغزو" ۔ ان دونوں میں ایک ہی حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ ہے: ۵۷۹۸ اور ۵۷۹۹۔ اول الذکر میں جبہ شامیہ کا ذکر ہے اور دوم میں "جبۃ من صوف" کا۔ (فتح الباری، ۱۰/۳۳۰-۳۳۱)

جبۂ نبوی

رسول اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں مختلف قسم کے جبے استعمال فرمائے۔ ان کے اعتبار سے بعض کا ذکرِ خیر:

جبۂ سندس (ریشمی کپڑے کا جبہ)

رسول اکرم ﷺ کو اکیدر کے شاہ دومہ نے ہدیہ کیا تھا۔ اس کا ذکر اپنے مقام پر آتا ہے۔

(بخاری، كتاب الهبة، باب قبول الهدية من المشركين وغیرہ دوسری کتب حدیث)

جبۂ صوف

معمولی اون کا جبہ ہوتا تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے وضو

فرمایا۔اس وقت آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر ایک اونی جبہ تھا جسے الٹ کر آپ ﷺ نے اس سے اپنا چہرہ انور پونچھا: "ان رسول الله ﷺ توضأ، فقلب جبة صوف كانت عليه، فمسح بها وجهه..." (ابن ماجہ، کتاب الطهارة...، باب المنديل بعد الوضوء الخ)

- دوسرا جبہ صوف کا ذکر اوپر آچکا ہے مگر اس کی تفصیل بخاری اور دوسری احادیث سے ذیل میں آتی ہے۔

جبہ رومیہ صوف

اون ہی کا ایک اور جبہ تھا جو رومی تھا۔حضرت عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ ایک رات رسول اکرم ﷺ گھر سے برآمد ہوئے اور آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر ایک اونی جبۂ رومی تھا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔آپ ﷺ نے ہمیں اسی لباس میں نماز پڑھائی۔اس کے علاوہ آپ ﷺ کے جسم پر اور کوئی دوسرا لباس نہ تھا: "خرج علينا رسول الله ﷺ ذات يوم، وعليه جبة رومية من صوف، ضيقة الكمين، فصلى بنا فيها، ليس عليه شئ غيرها."

(ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب لبس الصوف)

ان تمام احادیث میں جبہ رومیہ، جبہ شامیۃ، جبہ ضیقۃ الکمین اور جبۂ صوف سب کو ایک ہی قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔بہر حال ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ جبۂ نبوی تنگ آستینوں والا خوب لمبا لباس تھا جس کے بعد کسی دوسرے لباس کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس جبہ کے اوپر کوئی چادر وغیرہ نہ تھی۔ابن ماجہ کی دونوں احادیث مختلف واقعات کو بتاتی ہیں۔کیونکہ ان میں اسے گھر کے اندر پہننے کا ذکر ہے اور احادیث بخاری میں غزوۂ تبوک کے دوران۔

جبہ شامیہ

حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ کی مشہور حدیث ہے کہ غزوہ تبوک کے دوران رسول اکرم ﷺ قضائے حاجت کے بعد تشریف لائے تو میں نے پانی پیش کیا۔اس وقت جسم اطہر پر ایک شامی

جبہ تھا۔ آپ ﷺ نے کلی کرنے، ناک میں پانی ڈالنے اور چہرہ دھونے کے بعد جب ہاتھوں کو دھونا چاہا تو ان کو آستینوں سے نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنی تنگ تھیں کہ نکال نہ سکے تو جبہ کے نیچے سے ہاتھ نکال کر دھوئے: ''... وعليه جبة شامية ... فذهب يخرج يديه من كمیه فكانا ضيقين فاخرجهما من تحت ...'' حضرت مغیرہؓ کی ایک تصریح کے مطابق یہ جبہ بھی اونی تھا یعنی ''جبہ صوف''۔

(بخاری، كتاب الجهاد، باب الجبة في السفر والحرب؛ كتاب اللباس، باب من لبس جبة ضيقة الكمين في السفر وغیرہ؛ فتح الباری، ۱۰/۳۳۰ و مابعد؛ مسلم، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين ؛ ابوداؤد: ۱۵۱ میں ہے: جبة من صوف من جباب الروم ضيقة الكمين۔ یہ حدیث بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ کے بہت سے ابواب میں آئی ہے)

ریشمی جبہ

ہدایائے لباس میں بحث آئے گی کہ حضرت دحیہ کلبیؓ نے رسول اکرم ﷺ کو ایک جبہ پیش کیا تھا۔ (ترمذی، ابواب اللباس، باب في لبس الجبة)

جبہ طیالسۃ کسروانیۃ

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ نے رسولِ اکرم ﷺ بلکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وفات کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کا ایک جبہ صحابہ کرام کو دکھایا جسے انھوں نے ''جبہ طیالسة کسروانية'' کا نام دیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ اس میں دیباج (ریشم) کی پٹی (لبنۃ) لگی ہوئی تھیں۔ اور اس کے دونوں پھٹن (فرجیها) بھی دیباج سے آراستہ تھے۔ وہ جبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ رسول اکرم ﷺ اسے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اب ہم اسے دھوکر مریضوں کو پلاتے ہیں اور اس پانی سے ان کو شفا ہوتی ہے۔ یہ جبہ دکھانے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ ریشمی پٹیاں وغیرہ جائز ہیں یا نہیں کے مسئلہ پر بحث ہوگئی تھی۔

(مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال... الخ؛ ابن ماجہ، كتاب الجهاد، باب لبس

الحریر الخ، حدیث:۲۸۱۹: جبة مزررة بالدیباج)

- ترمذی کی ایک روایت انسؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی ریشم سے کاڑھا/ آراستہ جبہ، جس میں سونا بھی تھا، رسول اکرم ﷺ کو حضرت سعد بن معاذؓ نے ہدیہ کیا تھا، جس کو پہن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر سے خطبہ بھی دیا تھا اور لوگوں کے تعجب پر فرمایا تھا کہ حضرت سعد کے رومال جنت میں اس سے بہتر ہیں۔ ہدایائے لباس میں مزید بحث مع متن آتی ہے۔

(ابواب اللباس، باب بلا عنوان)

- رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں بہت سے ہدایائے لباس آتے تھے۔ ان میں سے متعدد جبے ریشمی اور قیمتی تھے۔ ان کا ذکر ہدایا میں آئے گا۔ البتہ یہ ذکر یہاں کر دینا مناسب ہے کہ بعض کو رسول اکرم ﷺ نے زیب تن فرمایا تھا اور بعض کو مسترد فرما دیا تھا۔

جبہ صحابہ کرام و اکابرِ عرب

متعدد صحابہ کرام اور بہت سے اکابرِ عرب کے جبوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا ذکرِ خیر ان کے بعض استعمالات کے حوالے سے:

- ایک اعرابی صحابیؓ نے اپنے احرام میں لاعلمی میں ایک جبہ پہن لیا۔ آپ ﷺ نے اسے اتارنے کا حکم دیا کہ سلا ہوا کپڑا پہننا بحالت احرام جائز نہیں۔ "... رأى رسول الله ﷺ اعرابیاً قد أحرم وعلیه جبة فامره ان ینزعها..."

(ترمذی، ابواب الحج، باب فی الذی یحرم وعلیه قمیص اوجبة؛ ابوداؤد، کتاب المناسک، باب الرجل یحرم فی ثیابه، حدیث:۱۸۱۹:... "وعلیه جبة" ومابعد؛ یہ عام جبہ معلوم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ جبۂ صوف ہی ہو)

- کندہ کا وفد رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے حبرہ کے جبے پہن رکھے تھے جن کے گریبانوں اور آستینوں پر دیباج کے ٹکڑے لگے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کے اسلام کی تصدیق کرنے کے بعد ان کے جبے اتروا دیے: "... علیهم جباب الحبرة وقد لفّوا جیوبها واکمتها بالدیباج... فخلعوا الجباب" (ابن سعد، ۲۲/۱؛ ابن ہشام، ۵۸۵/۲)

- حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے قدیم وعظیم صحابی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں

نے غزوۂ بدر میں ایک اونی جبہ پہنا تھا اور بعد میں اسی کو ان کی وصیت کے مطابق ان کا کفن بنایا گیا۔ (اسد الغابہ،۲/۲۹۳)

- مشہور صحابی حضرت سہل بن حُنیفؓ کے بارے میں ان کے فرزند کا بیان آتا ہے کہ ایک غزوہ/سریہ کے دوران خرار میں انھوں نے اپنا جبہ اتارا اور غسل فرمایا: ''اغتسل ابی سھل بن حنیف بالخرار فنزع جبة کانت علیه ...'' حضرت عامر بن ربیعہ کے دیکھنے سے ان کو نظر لگ گئی تھی۔ (موطا، کتاب الجامع، الوضوء من العین)

عباء

عباء کا واحد عباءۃ ہے اور وہ لمبے چوغے کے معنی میں آتا ہے۔ اور بالعموم معمولی کپڑے اور اون وغیرہ کا لمبا لباس ہوتا تھا۔ صاحب مصباح اللغات نے العباءۃ کا معنی چغہ دیا ہے اور اس کی مذکر شکل العباء کا بھی معنی چغہ لکھ کر اس کی جمع ''اعبیۃ'' دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عباء/عباءۃ بھی حلہ اور جبہ کے خاندان کا فرد تھا اور اس کا تیسرا مترادف، کیونکہ روایات و احادیث میں ان تینوں - جبہ، حلہ اور عباءۃ/عباء - کو بطور مترادفات استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایک محدث نے اسے حلہ کہا ہے تو دوسرے کے ہاں وہ جبہ ہے اور تیسرے کے ہاں وہ عباء بن گیا ہے۔ اور متعدد گذشتہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع حدیث میں وہ حلہ ہے یا جبہ اور آخرِ حدیث میں وہ اس کے برعکس یا اس کا مترادف بن گیا ہے۔ یہ اصلاً ایک خاندانِ ملبوس کی رکنیت کے سبب ہوتا ہے۔

نبوی عباء

رسول اکرم ﷺ کے عباء پہننے کا ذکر بعض روایات و احادیث میں ہے:

- حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے نومولود فرزند عبداللہؓ کو لے کر جب میں حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ ایک عباء پہنے ہوئے ایک اونٹ کی دیکھ بھال فرما رہے تھے: ''ذھبت بعبد اللہ بن ابی طلحة الی النبی ﷺ حین ولد، والنبی ﷺ فی عباءۃ یھنا بعیرا له ...'' (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء)

اگر یہ حدیث اسی نومولود فرزند کے بارے میں ہے جس کا ذکر احادیث بخاری وغیرہ میں پہلے آچکا ہے اور یکساں واقعہ ہے جیسا کہ تفصیل و پس منظر سے معلوم ہوتا ہے تو یہاں جس کو عباءۃ کہا گیا ہے وہ دوسری احادیث میں خمیصہ کہا گیا ہے اور اس سے زیادہ اہم بات ہے کہ اس کی مسلم وغیرہ دوسری احادیث میں مختلف نسبتیں ہیں جیسے حریثیہ، حوتیہ، حویتکیہ، خیبریہ وغیرہ اور وہ بناوٹ کی بنا پر ہیں یا ان کے مقام طراز کی نسبت کے سبب ہیں۔

- قطیفۂ صحابہ کرام کی فصل میں واقدی کی یہ روایت آتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ غزوۂ ذات السلاسل میں ایک فدکی عباء پہنے ہوئے تھے (عباءۃ فدکیۃ) اور اس سے مراد قطیفہ کو لیا گیا ہے کہ فدکی قطائف مشہور تھے۔ بہرحال اسے متن میں عباء کہا گیا ہے۔

(واقدی، ۷۷۲: یہ ذکر اسماء کی تغیر یعنی ملبوسات کے اسماء کی تغیر کے ضمن میں کیا گیا ہے)

عبائے صحابہ و اکابرِ عرب

احادیث و روایات میں سب سے مشہور وہ عباء ہے جو کرِکرہ نامی ایک مجاہد نے غزوۂ خیبر کے دوران غبن کر لی تھی، جس نے دادِ شجاعت دے کر جان دی تھی مگر غبن کے سبب اسے جہنمی ہونے کی وعید نبوی دی گئی تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس پر خاصی مفصل بحث کی ہے۔

(... فوجدوا عباءۃ قد غلها..." بخاری، کتاب الجہاد، باب القلیل من الغلول؛ فتح الباری، ۶/۲۲۵ ومابعد؛ حدیث: ۳۰۷۴۔ صاحب عباء کے نام کرِکرہ کو دو طرح سے ضبط کیا گیا ہے: کَرْکرہ اور کِرْکِرَہ، یہ امام بخاری نے حدیث کے بعد ابن سلام کے حوالے سے لکھا ہے)

حافظ موصوف کی دوسری فنی اور روایتی اور تشریحی روایات و تشریحات کے علاوہ کرکرہ کے بارے میں واقدی کی روایت کا ذکر اہم ترین ہے۔ جناب کرکرہ ایک سیاہ فام (اسود) تھے جو رسول اکرم ﷺ کی سواری کو قتال میں تھامتے تھے۔ کان اسود یمسک دابۃ رسول اللہ ﷺ فی القتال۔ اور صاحب شرف المصطفیٰ کے مطابق وہ نوبی تھے اور ان کو والی یمامہ ہوذہ بن علی حنفی نے رسول اکرم ﷺ کو ہدیہ کیا تھا۔ ان کی تشریحی بحث کا نکتہ بہت اہم ہے کہ وہ صرف اپنی معصیت کے لئے عذاب جہنم میں گرفتار ہوئے تھے، دوامی دوزخی نہ تھے جیسا کہ شارحین بتاتے

ہیں۔لیکن عام شارحین اسے دوامی عذاب بنا دیتے ہیں۔

- عباء عام محنت کش صحابہ کرام کا لباس معلوم ہوتا ہے۔نمازِ جمعہ کے لئے ان کے اپنے گھروں سے اور علاقہ عوالی سے آنے اور عباء پہنے ہونے کا ذکر ملتا ہے۔لمبی مسافت طے کرنے اور راستہ کے گرد وغبار سے اٹ جانے کے سبب ان کی عباؤں سے خاصی بدبو آتی تھی۔رسول اکرم ﷺ نے اسی بنا پر نمازِ جمعہ سے قبل غسل کرنے کی سنت ادا کرنے کا حکم دیا تھا:"كان الناس ينتابون الجمعة من منازلهم من العوالي فياتون في العباء ويصيبهم الغبار فتخرج منهم الريح ..." (مسلم، كتاب الجمعة، باب وجوب غسل الجمعة على كل بالغ)

- اسی طرح مضر کے لوگوں کے عریاں بدن اور نمار (چمڑے کے لباسوں) اور عباؤں سے عاری خدمتِ اقدس میں حاضری دینے کا ذکر ملتا ہے:"كنا عند رسول الله ﷺ في صدر النار . قال : فجاءه قوم حفاة عراة محتابي النماء او العباء ..."

(مسلم، كتاب الزكاة، باب الحث على الصدقة الخ؛اس حدیث میں ان کو نمار اور عباء سے محروم بتایا گیا ہے۔نمار چمڑے کے لباس یعنی کھالوں کے بھی ہوتے تھے جو غرباء و مساکین پہنتے تھے اور دوسرے نمار نمرۃ کی جمع بھی ہے جو دھاری دار (چیتوں جیسی) چادروں کے معنی رکھتا ہے،ان کا مزید ذکر آگے آتا ہے)

قباء

حافظ ابن حجرؒ کی تشریح میں اسے فارسی سے معرب لفظ بتایا گیا ہے اور خالص عربی لفظ بھی جو "القبو" بمعنی الضم (چپکنے) سے مشتق ہے۔مگر عربی نژاد ہونے کی روایت ان کے نزدیک مجروح ہے کہ وہ مجہول کے صیغے سے بیان کیا گیا ہے جو لفظی دلالتِ ضعف ہے۔اصلاً وہ فارسی معرب لفظ ہے۔وہ ایک لمبا چوغہ نما لباس ہوتا ہے جو پورے بدن کو اوپر سے نیچے تک ڈھانپ لیتا ہے۔قباء کی ایک قسم "فروج حریر" بھی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پیچھے سے چاک ہوتا ہے۔امام بخاریؒ نے اپنے ترجمۃ الباب میں یہی تشریح و تعبیر کی ہے:باب القباء و فروج حرير وهو القباء، ويقال هو الذى له شق من خلفه" (كتاب اللباس :فتح الباری، ۱۰/۳۳-۳۳۲)۔اس لحاظ سے "فروج حریر" ایک مخصوص قباء ہے اور اس کو امامِ لغت ابو عبید اور دوسرے اصحاب الغریب نے اشتقاق کے نقطۂ نظر سے اختیار کیا ہے۔ابن فارس کے مطابق وہ

چھوٹے بچے کی قمیص ہوتی ہے۔ مگر امام قرطبی کا کہنا ہے کہ قباء اور فرّوج دونوں تنگ آستینوں والا ملبوس ہوتا ہے جس کے وسط میں پیچھے کی طرف چاک ہوتا ہے اور وہ سفر اور جنگ کے دوران پہنا جاتا ہے کیونکہ اس سے حرکت و چلت پھرت میں آسانی ہوتی ہے: "العباء والفروج كلاهما ثوب ضيق الكمين، والوسط مشقوق من خلف، يلبس في السفر والحرب لانه اعون على الحركة ..."۔ صاحب مصباح اللغات نے اس کے معنی لکھے ہیں: القباء: "ایک کپڑا ہے جو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے" اور جس کی جمع اقبیة ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام اور معمول کے ستر پوش بالائی لباس کے اوپر قباء کو بطور زینت و تکلف پہنا جاتا تھا۔

نبوی قباء

رسولِ اکرم ﷺ کے قبا پہننے اور فروجِ حریر پہن کر اتار دینے دونوں کی روایات واحادیث ملتی ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر کے بارے میں حدیث کے متن ہی میں (بخاری: ۵۸۰۱) اور دوسری حدیث (۵۸۰۰) کی شرح میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہدیہ میں آئے تھے۔ بہرحال قباء کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک قباءِ ہدیہ کو پہنا تھا اور پھر حضرت مخرمہ بن نوفلؓ کو ہدیہ کر دیا تھا۔ اس میں کراہت کا ذکر ہے اور نہ صحابہ کو ممانعت کا۔ صحابہ کرام نے بھی وہ ہدایائے نبوی کے قبائیں زیب تن کی تھیں (فتح الباری، ۱۰/ ۳۳۱-۳۳۴)۔ ہدایائے لباس کے باب میں ان پر مفصل بحث آتی ہے۔ صرف لباس کی ساخت اور خاندان کا ذکر یہاں کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اصلاً قباء یہاں حلہ/ جبہ/ عباء وغیرہ کے خاندان سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جن روایات میں اسے قباء کہا گیا ہے دوسری روایات میں اسی کو حلہ/ جبہ کہا گیا ہے۔ اصل قمیص/ بالائی بدن کے لباس پر پہنے جانے والے حلۂ عاص بن وائل سہمی کو قباء کہا گیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں احادیث بخاری کی ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے۔

قبائے صحابہ واکابر

صحابہ کرام نے رسول اکرم ﷺ کے عطا کردہ قباؤں سے اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ

کرنے کی سعادت پائی تھی۔ اس کا مفصل ذکر ہدایائے لباس کے ضمن میں آئے گا۔ بہر حال روایات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ متعدد صحابہ کرام نے قباء کا استعمال فرمایا تھا۔ حدیث بخاری: ۵۸۰۰ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے متعدد صحابہ کرام کو قبائیں عطا فرمائی تھیں اور ان میں سے ایک حضرت مخرمہ بن نوفلؓ تھے جن کو بطورِ خاص اپنا پہنا ہوا لباس فاخر۔ قباء۔ عطا فرمایا تھا۔ بہر حال ان میں سے متعدد صحابہ کرام کے اسماء گرامی کا ذکر ملتا ہے مگر حافظ ابن حجرؒ نے ان اکابر صحابہ کا ذکر بالکل نہیں کیا۔ (فتح الباری، ۳۳۲/۱۰ ومابعد)

دراصل قباء میں ریشم کا استعمال ہوتا تھا اس لئے ان کے استعمال سے عام صحابہ کرام بھی احتراز فرماتے تھے۔

- اکابرِ عرب میں سے غیر مسلم اور نو مسلم حضرات ان کو خوب استعمال کرتے تھے۔ چونکہ وہ شاندار لباس ہوتا تھا اس لئے اس کے استعمال میں فخر وزینت کا بھی عنصر پایا جاتا تھا۔ اور بادشاہوں، ان کے امراء اور دوسرے اہلِ ثروت وطاقت کا تو وہ طبقاتی لباس تھا۔

- دومۃ الجندل کے شاہ اکیدر بن عبدالملک کندی کو جب حضرت خالد بن ولید مخزومیؓ نے غزوۂ تبوک ۹ھ/۶۳۱ء کے دوران گرفتار کیا تھا تو اس کے جسم پر دیباج کا قباء تھا جس پر طلائی تار کشی کی گئی تھی: "**وقد كان عليه قباء من ديباج، مخوص بالذهب ...**"۔ حضرت خالدؓ نے اسے خدمتِ نبوی میں ارسال کر دیا تھا جسے دیکھ کر صحابہ کرام عش عش کرتے تھے اور اسے بہت پسند کرتے تھے۔ (ابن ہشام، ۵۲۶/۲)

- شیخِ بنو سہم/مکہ عاص بن وائل سہمی نے حضرت عمرؓ کے گھر جا کر ان کو پناہ دی تھی۔ اس وقت ان کے جسم پر دیباج کی قبا تھی: "**عليه قباء من ديباج**"

(بخاری، باب اسلام عمر بن خطاب؛ دوسری حدیث میں اسی کو حلہ بھی کہا گیا ہے جو غالباً مترادف ہے)

حُلّہ

بدن کے بالائی حصہ کی ستر پوشی کے لئے ایک لمبا اور شاندار لباس حلہ کہلاتا تھا جس کی جمع حُلل آتی ہے۔ لغوی معنی ہیں: نیا کپڑا، کپڑوں کا جوڑا، مگر محاورۂ عرب میں اس کے معنی لباس

کے آتے ہیں جیسے "لبس المحارب حلته وبزّته" میں ہے (مصباح)۔ وہ مختلف چیزوں سے بنتا تھا، جن پر بحث بعد میں آئے گی۔ بہرحال اسی بنا پر حلوں کی مختلف اقسام ملتی ہیں۔ ان میں عمدہ اور قیمتی حلے بھی تھے اور معمولی اور ادنیٰ درجہ کے بھی۔ وہ مروج ملبوسات میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا تھا اس لئے اس کا خاص ذکر ملتا ہے۔ غالباً وہ ازار کی طرح پورے عرب میں مقبول لباس تھا، کیونکہ اس کے استعمالات اور اقسام میں کافی علاقائی گونا گونی ملتی ہے۔ اپنی تاریخی ترتیب میں جناب عبدالمطلب ہاشمی کا حلہ اولین ہے جسے پہنا کر ان کے چچا مطلب بن عبدمناف مجلس قریش میں لے گئے تھے (ابن سعد، ۸۲/۱)۔ ہماری ترتیب کے مطابق پہلے رسول اکرم ﷺ کے حلۂ مبارک اور اس کے استعمالات کا ذکر کیا جاتا ہے، بعد میں صحابہ کرام اور دوسرے عربوں کے حلوں کا ذکر ہوگا۔

حلۂ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے زیرِ استعمال حلوں کی بھی اقسام ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض رنگ کے لحاظ سے ہیں اور بعض بناوٹ اور کپڑے کے لحاظ سے۔ ان میں سے کئی کی نسبتِ علاقائی بھی ملتی ہے لہٰذا ان تمام اعتبارات سے ان حللِ نبوی ﷺ کا ذکر الگ الگ کیا جاتا ہے:

سرخ حلہ/ حلۃ حمراء

حضرت ابو جُحیفہؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کو اپنے سرخ چمڑے کے قبہ سے باہر تشریف لاتے دیکھا۔ اس وقت آپ ﷺ تنِ مبارک پر ایک سرخ حلہ تھا جو خاصا کسا ہوا بندھا تھا "... وخرج النبی ﷺ فی حلة حمراء مشمّراً..."

(بخاری، کتاب الصلوٰة، باب الصلاة فی الثوب الاحمر؛ حدیث: ۳۷۶؛ فتح الباری، ۶۲۹/۱)

- حضرت براء بن عازبؓ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے غزوۂ خندق کے دوران کھدائی کے وقت ایک سرخ حلہ (حلۃ حمراء) پہن رکھا تھا جو آپ ﷺ پر بہت کھل رہا تھا: "ما رایت احدا احسن فی حلة حمراء من رسول الله ﷺ ..." (واقدی، ۴۴۹؛ بلاذری، ۳۹۶/۱)

سوتی حلہ/ حلۂ حبرہ

عام طور پر احادیث میں اس کو حِبَرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ حلّہ یا اس کی جمع حلل نہیں ملتی لیکن وہ تھی حلہ ہی کی ایک قسم اور رسول اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ پسندو ہی لباس تھا کہ سادہ، سوتی اور معمولی مگر نفیس ہوتا تھا جیسا کہ احادیثِ بخاری: ۵۸۱۲-۵۸۱۳ میں گذرا مگر وہاں ان کو یمنی چادروں سے تعبیر کیا گیا ہے اور بردحبرہ کی وضاحت موجود ہے۔ مگر حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تشریح کے آخر میں "حلل الحبرة" کا بھی ذکر کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے "حلل الحبرة" استعمال فرمائے تھے۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۳۴۱)

غزوات میں حلۂ مبارک/ دیگر لباس

رسولِ اکرم ﷺ غزوات میں بعض خاص حُلّوں کا استعمال فرماتے تھے جیسا کہ بعض مورخین اور شارحین کا خیال ہے۔ ان کے مطابق دورانِ جنگ اور عین قتال کے بیچ ریشمی یا خز کے حلّے جسم و بدن کی حفاظت کے لئے زیادہ مفید ہوتے تھے لہٰذا ایسے نازک مواقع پر آپ ﷺ ان خاص ملبوسات کا استعمال فرماتے تھے، اگرچہ اس خیالِ شارحین پر روایتی لحاظ سے کلام بھی کیا گیا ہے۔ بہرحال سیرت نگاروں نے بہت اہتمام سے غزوات کے دوران آپ ﷺ کے ملبوسات کا ذکر ضرور کیا ہے جن میں سے سیاہ عمامے پر بہت زور ہے۔ جسم اطہر کے خاص ملبوسات میں حلہ وغیرہ کا ذکر بھی بہت آتا ہے۔ ان کا ایک مختصر ذکر سیرت نبوی کے ایک خاص پہلو کو اجاگر کرے گا۔

- حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کے پاس جو دیباج سے آراستہ جبہ/ حلہ محفوظ تھا وہ ان کے بیان کے مطابق رسول اکرم ﷺ غزوات میں پہنا کرتے تھے: "... کان النبی ﷺ یلبس هذه [جبة مزررة بالدیباج] اذا لقی العدو۔"

(ابن ماجہ، کتاب الجهاد، باب لبس الحریر والدیباج فی الغزو)

- غزوۂ خندق ۵ھ/ ۶۲۷ء کے زمانے میں نبوی حلہ کا رنگ سرخ تھا (حلّہ حمراء- واقدی، ۴۴۹)

- صلح حدیبیہ ۶ھ/ ۶۲۸ء میں رسول اکرم ﷺ نے صحار/ یمن کے بنے ہوئے دو کپڑے زیب تن فرما رکھے تھے: "لبس ثوبین من نسج صحار" (قریۃ بالیمن- واقدی، ۵۷۳)

- غزوۂ خیبر ۷ھ/ ۶۲۹ء میں رسول اکرم ﷺ نے قطیفہ فدکیہ (فدکی دلائی) کے علاوہ یمنی چادر اور خمیلہ استعمال فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ طیلسانِ اسود کا حلہ/ الساج بھی تھا: "وعليه ممطر سيجان وعليه عمامة..." (واقدی، ۶۸۷: بلاذری، ۱/ ۵۰۸)

- فتح مکہ ۸ھ/ ۶۳۰ء میں شہر میں داخلہ کے وقت بُردِ حبرہ کے نصف حصہ کا عمامہ بنا لیا تھا: "معتجرا بشقة برد حبرة" (واقدی، ۸۲۳)

- غزواتِ حنین وغیرہ میں سخت اعرابی کپڑے جسمِ مبارک پر تھے جن کا نام "البجد السود" لیا گیا ہے۔ (واقدی، ۹۰۵)

- غزوۂ تبوک ۹ھ/ ۶۳۱ء میں "جبہ رومیہ" زیبِ تن تھا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔

(واقدی، ۱۰۱۱-۱۰۱۲: بخاری مذکورہ بالا)

ریشمی حلہ/ حلہ استبرق

ریشمی حلہ کا ایک حوالہ اوپر گذر چکا ہے۔ وہ ہدایائے لباس میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا۔ عام حالات میں ریشمی حلوں کے استعمال نبوی کا ثبوت ملتا ہے:

- حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک شخص کے جسم پر ایک حلۃ استبرق (ریشمی حلہ) دیکھا تو اسے لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اسے خرید فرمالیں اور جب وفودِ عرب آیا کریں تو اسے پہنا کریں مگر رسول اکرم ﷺ نے اس کے حریر (ریشم) ہونے کے سبب مسترد فرما دیا۔ بعد میں رسولِ اکرم ﷺ نے ایسا ہی حلہ حضرت عمرؓ کو ہدیہ کیا جسے صحابی جلیل نے ہدایتِ نبوی پر اپنے کافر ماموں/ بھائی کو ہدیہ کر دیا جو مکہ مکرمہ میں رہتے تھے۔ اس پر مزید بحث ہدایا کے باب میں آئے گی اور ریشم کی بحث میں بھی کلام ملے گا۔ امام بخاریؒ نے بہر حال اس حدیث کو جس باب میں بیان کیا ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ وہ کئی دوسرے کتب وابواب میں بھی آئی ہے۔

(بخاری، کتاب الادب، باب من تجمّل للوفود؛ حدیث: ۶۰۸۱؛ فتح الباری، ۱۰/ ۶۱۴-۶۱۵؛ موطا، کتاب

الجامع، باب ماجاء فی لبس الشباب میں اسے "حلة سیراء" کہا گیا ہے اور اسے باب مسجد کے پاس بیچے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالباً یہ دونوں واقعات ایک ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے تشریح میں موقف اختیار کیا ہے۔ حضرت ام کلثوم بنت رسول اکرم ﷺ کے حلۂ سیراء کا ذکر آگے آتا ہے)

- حضرت علیؓ اپنی یمن کی مہم سے واپس تشریف لائے تو حجۃ الوداع میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ حج کرنے کی سعادت پانے کی خاطر جلد مکہ مکرمہ پہونچ گئے اور اپنی فوج پر اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو امیر بنا دیا۔ قائم مقام امیر صحابیؓ نے تمام مجاہدین کو ذخیرۂ مغانم سے قیمتی حلے نکال کر پہنا دیے۔ جب لشکر مکہ مکرمہ کے قریب پہونچا اور حضرت علیؓ ان سے ملاقات کی خاطر گئے تو دیکھا کہ سب کے جسموں پر حلے ہیں۔ وہ ناراض ہوئے اور سب سے چھین چھین کر سارے حلے ذخیرہ میں پہونچا دیے جس نے کافی احتجاجی صورت اختیار کرلی۔ غالباً یہ حلے بھی ریشمی تھے۔ (ابن ہشام، ۲/۶۰۳)

- حضرت ضمرہ بن ثعلبہ بہزیؓ کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ خدمت نبوی میں حاضری کے وقت دو دو یمنی حلے پہنے ہوئے تھے۔

(اسد الغابہ، ۳/۴۴: بیک وقت دو دو حلوں کا یہ حوالہ اکلوتا نہیں ہے۔ دو لباسوں کا بیک وقت پہننا ایک سماجی رواج بھی تھا جس پر بحث آگے آتی ہے)

- حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہری، عثمان بن عفان اموی اور زبیر بن عوام اسدی اور بعض دوسرے صحابہ کرام کے حلے بہت قیمتی ہوتے تھے۔ وہ چار پانچ سو درہم تک کے ہوتے تھے لہٰذا یہ طے ہے کہ وہ ریشمی ہوتے تھے بالخصوص حضرات عبدالرحمٰنؓ اور زبیرؓ کے حلے جیسا کہ ذکر آتا ہے۔

- حضرت محلم بن جثامہ لیثیؓ نے رسول اکرم ﷺ کے فیصلہ کے باوجود اپنے مقتول بھائی کے قاتل کو قتل کردیا تھا اور فرار ہوگئے، بعد میں تائب ہوکر آئے اور خدمت میں روئے۔ اس وقت ان کے جسم پر ایک حلہ تھا اور اس پر چادر بھی تھی جس پر ان کے آنسو گر رہے تھے۔

(ابن ہشام، ۲/ ۲۲۷-۲۲۸: "... فقام رجل آدم ضربٌ طویل، علیه حلة...")

اور انتہائی نادر روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی بکر صدیقؓ نے کفن نبوی کے لئے ایک قیمتی حلہ سات دینار میں خریدا تھا مگر جب اس میں آپ ﷺ کی تکفین نہ ہوئی تو اپنے کفن کے لئے بھی استعمال کیا، نہ اپنے لباس کے بطور۔ (اسد الغابہ، ۳/۱۹۹)

حلۂ صحابہ کرام و اکابرِ عرب

صحابہ کرامؓ کے حلوں کے بارے میں مختلف اقسام کا ذکر ملتا ہے اور ان میں بعض وہ ہیں جن کا استعمال رسول اکرم ﷺ کو بہت مرغوب تھا اور بعض وہ بھی ہیں جن کا استعمال ناپسندیدہ تھا۔ ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ متقین کے لئے مناسب نہ تھے۔ صحابہ کرام ان کو اجازتِ نبوی سے استعمال کرتے تھے یا ان کے جواز کے زمانے میں۔ دوسرے اکابرِ عرب زیب و زینت کے لئے استعمال کرتے تھے، بالعموم یہ ریشمی حلے ہوتے تھے، اور زیب و زینت والے۔ اور مردوں کے لئے ان کی ممانعت دونوں اسباب سے کی گئی تھی۔ جس پر بحث ریشم کے باب میں آئے گی۔ بہر حال یہاں صحابہ کرام اور دوسرے اکابرِ عرب کے بعض حلوں کا ذکر ان کی اقسام کے اعتبار سے کیا جاتا ہے:

عام حلہ

حضرت ابوذر غفاریؓ جب ربذہ میں مقیم تھے تو ان کے ایک ملاقاتی حضرت معرورؒ نے ان کے اور ان کے غلام کے جسم پر یکساں حلے دیکھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ رسول اکرم ﷺ نے غلاموں کو یکساں کھانا کھلانے اور یکساں لباس پہنانے کا حکم دیا تھا۔

(بخاری، كتاب الايمان، باب المعاصي من امر الجاهلية وغيره؛ مسلم،...باب اطعام المملوک الخ حدیث: ۳۸ (۱۶۶۱)؛ حدیث ابوداؤد: ۵۱۵۷ و مابعد)

حلہ الحبرہ

معمولی، سادہ، سوتی حلہ ہوتا تھا اور اسی کپڑے کی چادریں بھی ہوتی تھیں جو "بردحبرہ" کہلاتی تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ کی تشریح کے مطابق وہ صحابہ کرام کے ملبوساتِ عہد نبوی میں شامل تھے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے بیان کے مطابق ہم صحابہ نے ان کو آپ ﷺ کے عہد میں پہنا تھا: "... ولبسناهن في عهده"۔ حافظِ موصوفؒ نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ روایت

حضرت حسن بصریؒ کی نقل کی ہے جس کے مطابق حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں "حـلـل الـحبـره" کے استعمال پر پابندی لگانے کا ارادہ ظاہر کیا کیونکہ ان کی رنگائی میں پیشاب کی آمیزش ہوتی تھی مگر حضرت ابی بن کعبؓ نے ان کو منع کیا تھا: "ان عـمـر بن الخطاب اراد ان یـنـهی عن حلل الحبرة لانها تصبغ بالبول..." حضرت حسن بصریؒ نے حضرت عمرؓ سے سماعت کا شرف نہیں پایا تھا اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔ (فتح الباری، ۱۰/۳۴۱)

-نصاریٰ نجران کا وفد جب مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں پہونچا تو ان کے ارکان حبرہ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں جبے اور چادریں شامل تھیں: "... عـلـيـهـم ثياب الحبرات، جبب وا ردية..." (ابن ہشام، ۱/۵۷۴)

حلة الحبرة

مشہور مکی سردار عاص بن وائل سہمی نے مکہ مکرمہ میں حضرت عمرؓ کو قبولِ اسلام کے بعد اپنی جوار دی تھی کیونکہ بنو عدی اور بنو سہم ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ جس وقت حضرت عمرؓ اپنے گھر میں پریشان خاطر بیٹھے تھے اس وقت عاص سہمی ان کے پاس پہونچے اور اس وقت وہ "حلہ حبرہ" اور ریشم سے آراستہ قمیص پہنے ہوئے تھے: "عليه حلة حبرة وقميص مكفوف بحرير ..."

(بخاری، باب اسلام عمر بن الخطابؓ)

حلہ عدنیہ

ابولہب ہاشمی منٰی میں جب رسول اکرم ﷺ کی مخالفت کر رہا تھا تو ایک عدنی حلہ (حلہ عدنیہ) پہنے ہوئے تھا۔ (ابن ہشام، ۱/۴۲۳)

حلہ کے خاص نکات

جبہ اور حلہ دونوں یکساں ملبوسات تھے یا ایک قسم ونوع کے تھے جیسے برد، رداء وغیرہ ایک دوسرے کے مترادفات ہیں، کیونکہ بعض احادیث میں ان دونوں کو حلہ بھی کہا گیا ہے اور جبہ بھی۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ نے رسول اکرم ﷺ سے وفودِ عرب کے آنے کے وقت یا عید و جمعہ کی

اسلامی تقریبات کے موقعہ پر جس لباسِ فاخر کو پہننے کی درخواست کی تھی اسے جبہ استبرق بھی کہا گیا ہے اور حلۂ استبرق بھی۔ محدثین کرام کی روایات واحادیث میں ایسے متعدد کپڑوں، لباسوں اور دوسری چیزوں کو مترادفات قرار دے کر بیان کیا گیا ہے جس نے شارحین کرام کے لئے توجیہ وتاویل اور تصویب وتطبیق کا بہت وسیع باب کھول دیا ہے۔

خالص فنی، اصطلاحی اور اصولی تشریحات وتوجیہات سے اس وقت ہمیں بحث کرنی مقصود نہیں ہے۔ ہمارا مقصودِ بحث صرف عہد نبوی میں ملبوسات کے استعمال، ان کی بناوٹ اور ان کے تمدنی تناظر تک محدود ہے۔ دوسرے ابواب ومباحث کی مانند اس خاص ملبوسِ عہد کے بارے میں بعض نکات لائق توجہ ہیں اور ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

- بناوٹ کے لحاظ سے حلہ کی متعدد اقسام تھیں: اس میں بنیادی چیز وہ ریشہ تھا جس سے وہ بنائے جاتے تھے۔ عہد نبوی کے حلوں کے ریشے سوت، ریشم یا اون وریشم اور سوت وریشم یا بعض اور مخلوط ریشوں/ دھاگوں کے بنے تھے۔ ان میں صوف کے حلے تھے، عام حلے تھے، استبرق و دیباج کے حلے تھے یا خالص مخلوط حلے تھے۔ بعض ایسے تھے جن کے اطراف پر ریشمی کام تھا۔

- دوسری چیز بناوٹ میں ان کے ڈیزائن یا اعلام ہیں جن کو دھاگوں یا تانے بانے کے ماہرانہ استعمال سے خاص قسم کے نقش ونگار میں ڈھالا جاتا تھا۔ یہ اعلام یا زیادہ صحیح الفاظ میں نقش ونگار پورے حلے/ کپڑے پر پھیلے ہوتے تھے یا صرف ان کو حاشیہ تک محدود رکھا جاتا تھا۔ آستینوں اور گریبان یا کالر کے علاقے میں کسی دوسرے قیمتی ریشہ کی پٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ اوپر ایسے چند اعلام والے حلوں/ جبوں کا ذکر بھی ہوا ہے اور چادروں میں سے بھی بعض کا۔

- رنگ اور رنگ ریزی/ رنگ سازی، جسے عربی میں ''تلون'' کہا گیا ہے، بھی ان کی اقسام بنانے کی ذمہ دار ہے۔ ان میں سرخ حلہ، سیاہ حلہ اور بعض دوسری روایات میں سبز، زرد و رسیاہ حلوں/ ملبوسوں کا ذکر ملتا ہے۔

- حلہ/ جبہ تنہا پورے بالائی بدن کی ستر پوشی کرنے والا ملبوس/ لباس تھا مگر بعض اکابرِ عرب جاہلی جیسے عاص بن وائل سہمی کے حلہ کو قمیص کے بنیادی ملبوسِ بدن کے اوپر زیب وزینت والا لباس قرار دیا گیا ہے۔

- روزمرہ کے حلوں کا دوسرے ملبوسات کی مانند ذکر بھی ملتا ہے۔ وہ عام سستے اور سادہ حلے تھے جیسے ایک اعرابی کا تھا یا رسول اکرم ﷺ کے بعض اونی حلے تھے یا صحابہ کرام میں سے بعض حضرات کے حلے تھے۔ وہ بالعموم سوتی یا اون کے بنے ہوئے ہوتے تھے اور ان کا روزانہ کا استعمال ان کو واحد بالائی لباس بتاتا ہے۔

- اُونی حلوں (حلۂ صوف) کے بارے میں دو ملاحظات قابلِ لحاظ ہیں: ایک یہ کہ تمام اونی حلے معمولی اور سادہ نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض بہت قیمتی ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یا تو ان کا ریشہ عمدہ ہوتا تھا جیسے مادہ کے پیٹ سے نکالے ہوئے بچہ کا اون جو بہت نرم اور قیمتی ہوتا ہے یا وہ کسی قیمتی ریشہ جیسے دیباج، خز، استبرق وغیرہ کے مخلوط ریشوں سے بنا ہوتا تھا جیسے کہ بعض نبوی حلوں اور صحابہ کرام کے اونی حلوں کے بارے میں روایات بتاتی ہیں۔

دوسرے حافظ ابن حجرؒ کے بقول معمولی اون کے حلے پہننا کوئی تقویٰ و تورع کی علامت اس عہد مبارک میں نہ تھی جیسا کہ بعد کے صوفیہ یا تصوف زدہ اشخاص نے قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ عام معمول کا لباس تھا۔ جس میں تقویٰ کا ریشہ تھا نہ تکبر کا، تقویٰ تو ریشمی اور قیمتی حلوں کے پہننے کے بعد بھی رہتا ہے کہ اس کا مقام حلہ نہیں صاحبِ حلہ کا دل ہے۔

- اسی طرح بعض شوخ رنگوں جیسے سرخ حلوں یا ان کے بعد زرد حلوں کے بارے میں کراہت و جواز کا معاملہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے بعض حالات میں سرخ حلے زیبِ تن فرمائے۔ وہ محض جواز دکھانے کا معاملہ نہیں جیسا کہ بعض محدثین و شارحین نے اپنے ابواب و شروح میں سمجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ وہ خالص نبوی سنت اور ایمانی تقویٰ کا نشان ہے۔ امام بخاری جیسے عبقری محدثین نے اسی بنا پر ان کے تراجم ابواب میں اس کی رعائت کی ہے۔

- ریشمی اور دوسرے قیمتی حلوں کے بیان میں یہ بھی حوالہ آتا ہے کہ خاص تقریبات پر ان کو پہننا چاہیئے یا پہنا جائے جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ کا مشورہ تھا۔ وہ اسلامی نقطۂ نظر اور سنت کے زاویہ سے بھی صحیح ہے۔ مفصل بحث تو بعد میں آئے گی مگر جمعہ، عیدین اور شادی بیاہ وغیرہ کے موقعہ پر عمدہ لباس کی سنت کا کیا معنی ہے؟ پھر عہد نبوی میں تقریبات کے خاص حلے تھے اور بعض آپ ﷺ نے پہنے بھی تھے جیسا کہ حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ کے ہدیہ کردہ حلہ کا معاملہ ہے۔

ان میں غزوات کے دوران ریشمی حلوں کا استعمالِ نبوی اور تعاملِ صحابہ کرام بہت دلچسپ تمدنی، سماجی اور فوجی زاویہ پیش کرتا ہے۔

قمیص

قمیص عام لباس تھا جس سے بدن کا بالائی حصہ ڈھانپا جاتا تھا۔ اور وہ قباء، عباء وغیرہ کے مقابلے میں طول میں چھوٹی ہوتی تھی۔ اگرچہ عرب میں عام لباس ازار اور رداء پر مشتمل ہوتا تھا تاہم قمیص غیر معروف نہ تھی۔ اسی بنا پر حضرت امام بخاریؒ نے اپنے ترجمۃ الباب میں قمیصِ یوسف علیہ السلام کا حوالہ قرآنی آیت کریمہ - یوسف: ۹۳ - کے ذریعہ دیا ہے۔ متعدد احادیث میں قمیص کے استعمالِ عام کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت امامؒ نے قمیص کے استعمالِ نبوی پر باب باندھا ہے اور بعض دوسری تفصیلات بھی دی ہیں۔ ان سے عرب کے عام و خاص کے استعمالِ قمیص کا ثبوت ملتا ہے۔

(کتاب اللباس، باب لبس القمیص، وقول اللہ تعالیٰ حکایۃ عن یوسف: اذھبوا بقمیصی ھذا ... الخ؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۲۷ ومابعد)۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں مختلف قمیصوں (قمص) کی لمبائی کا ذکر ایک رویائے صادقہ میں ملتا ہے جس کے مطابق بعض لوگوں کی قمیصیں صرف ان کے سینے تک پہونچتی تھیں اور بعض کی اس سے بھی چھوٹی تھیں لیکن حضرت عمر فاروقؓ کی قمیص اتنی لمبی تھی کہ زمین پر گھسٹ رہی تھی: "علیه قمیص یجرّہ"۔

(بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل اھل الایمان فی الاعمال؛ فتح الباری، ۱/ ۱۰۱: حدیث: ۲۳؛ اطراف: ۳۶۹۱، ۷۰۰۸، ۷۰۰۹)

عورت کی یا چھوٹی بچی کی گھریلو قمیص کے لئے "درع" کا لفظ آتا ہے اور طویل قمیص کے لئے صفت آتی تھی جیسا کہ حمس کے لباس کے باب میں ہے کہ عورتیں اپنی لمبی قمیصوں میں طواف کیا کرتی تھیں اور باقی سب کپڑے اتار دیتی تھیں: "واما النساء فتضع احداھن ثیابھا کلھا الا درعا مفرجا علیھا ثم تطوف بہ..." (ابن ہشام، ۱/ ۲۰۲)

اسی طرح قمیص کے استعمال کے عدم جواز کا ذکر مُحرم کے احرام کے سلسلہ کی تمام روایات میں ملتا ہے اور بہت کثرت سے تمام کتبِ حدیث میں آتا ہے۔

(کتاب العلم، باب من اجاب السائل الخ؛ کتاب الحج، باب مالا یلبس المحرم من الثیاب ؛فتح الباری، متعلقہ کتب وابواب)

قمیصِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ نے قمیص کا استعمال فرمایا اگر چہ کم فرمایا دوسرے صحابہ کرام کے مقابلہ میں۔ متعدد روایات میں اس کا ذکر آتا ہے:

- سب سے مشہور قمیصِ نبوی وہ ہے جو آپ ﷺ نے راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کے مرنے پر اسے پہنائی تھی کیونکہ اس ظالم نے غزوۂ بدر کے اسیروں میں موجود رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کو اپنی قمیص پہنائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت عباسؓ بہت طویل وتوانا شخص تھے اور صحابہ میں سے کسی کی قمیص ان کے جسم پر ٹھیک نہ بیٹھتی تھی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص ان کو دے دی کہ وہ بھی کافی طویل شخص تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اسی حرکتِ شائستہ کی مکافات میں اس کو اپنی قمیص پہنا دی تھی: "البس عبدالله قمیصه مکافاة لما صنع..."۔ واقدی وغیرہ نے مزید صراحت کی ہے، جس کی تصدیق احادیث سے ہوتی ہے، کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی دو قمیصوں میں سے فرزند مسلم کی درخواست پر اندرونی قمیص عطا فرمائی تھی کہ لمس نبوی کی برکت ملے۔

(بخاری، کتاب الصلوٰة، باب هل یخرج المیت من القبر الخ؛ وغیرہ دوسرے ابواب؛ کتاب اللباس، لبس القمیص ؛فتح الباری، ۱۰/ ۳۲۷-۳۲۸: اس کی روایات بہت زیادہ ہیں اور ان میں سے کسی نہ کسی میں کوئی نہ کوئی اضافی معلومات ملتی ہیں: رسول اکرم ﷺ سے جب مسلم صحابی فرزند نے راس المنافقین کے کفن کے لئے قمیصِ نبوی مانگی تو اس وقت جسمِ اطہر پر دو قمیصیں تھیں: "وکان علی رسول الله ﷺ قمیصان"۔ بخاری، مذکورہ بالا؛ واقدی، ۱۰۵۷)

- حضرت ام سلمہؓ کے مطابق رسول اکرم ﷺ کو تمام ملبوسات میں قمیص سب سے زیادہ پسند تھی: "کان احب الثیاب الی رسول الله ﷺ القمیص"

(ترمذی، ابواب اللباس، باب فی القمیص)

- امام ترمذی کی مذکورہ بالا کتاب و باب میں ایک دوسری حدیث حضرت اسماء بنت یزید السکن انصاریؓ سے مروی ہے جس کے مطابق آپ ﷺ کی قمیص کی آستین آپ کے پہونچے تک پہونچتی تھی: "کان کم ید رسول اللہ ﷺ الی الرسغ..."

(نیز ابوداؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی القمیص: دونوں مذکورہ بالا روایات اسی طرح مذکور ہیں)

- حدیث ابوداؤد: ۵۲۲۴ میں یہ دلچسپ واقعہ مذکور ہے کہ ایک انصاری صحابی بڑے پر مزاح تھے۔ وہ لوگوں کو ایک مجلس میں بیٹھے ہنسا رہے تھے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان کی توندی میں لکڑی چبھائی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے مجھے تکلیف دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدلہ لے لو۔ انھوں نے عرض کیا: آپ ﷺ کے جسم اطہر پر قمیص ہے اور میرے جسم پر قمیص نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی قمیص اوپر کر دی اور صحابی آپ ﷺ سے لپٹ کر جسم اطہر چومنے لگے "... ان علیک قمیصا ولیس علیّ قمیص، فرفع النبی ﷺ عن قمیصه..."۔

- حضرت جابر بن عبداللہؓ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کو صرف ایک قمیص میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا: "انی رأیت رسول اللہ ﷺ یصلی فی قمیص واحد"

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الرجل یصلی فی قمیص واحد؛ دوسری روایات میں اسے ثوب کہا گیا ہے)

- ایک خاتون بہیہؓ نامی فرماتی ہیں کہ میرے والد رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ رسول اکرم ﷺ کی قمیص اٹھا کر چومنے اور چمٹنے لگے: "استاذن ابی النبی ﷺ فدخل بینه وبین قمیصه فجعل یقبل ویلتزم..." (ابوداؤد، مذکورہ بالا، باب مالایجوز منعه وغیرہ)

- حدیث ابوداؤد: ۴۰۸۲ میں ذکر ہے کہ حضرت معاویہ بن قرہؓ جب مزینہ کے وفد کے ساتھ آئے تو رسول اکرم ﷺ کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر خاتم نبوت کو چھوا تھا۔ اس میں ازار و قمیص باندھنے کے طریقہ کا بھی ذکر ہے اور حضرت معاویہ اور ان کے فرزند کے ازار کی سنت کا بھی۔

- حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ چھوٹی آستینوں اور کم لمبائی کی قمیص زیب تن فرمایا کرتے تھے: "کان رسول اللہ ﷺ یلبس قمیصا قصیر الیدین والطول"

(ابن ماجہ، کتاب القمیص، باب کم القمیص کم یکون؟)

کفن کے لئے قمیص نبوی کا عطیہ

متعدد صحابہ کرام کے کفن کے لئے رسول اکرم ﷺ کے اپنی قمیصیں عطا / ہدیہ کرنے کا ذکر روایات میں آتا ہے، اگرچہ ان کا اصل باب ہدایائے لباس ہے تاہم قمیص نبوی کے حوالے سے ان کا مختصر ترین ذکر کیا جاتا ہے جو اسد الغابہ پر مبنی ہے۔

۱- حضرت عبداللہ بن حارث ہاشمیؓ کے لئے (۳/ ۱۳۸)

۲- حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ کے لئے (۳/ ۱۹۹)

قمیصِ صحابہ واکابرِ عہد

عام و خاص کے لباس کی حیثیت سے قمیص کا چلن عہدِ نبوی میں خوب ہو گیا تھا اور وہ شہروں کے علاوہ بدوی علاقوں میں بھی پہنی جاتی تھی۔ روایات میں صحابہ کرام اور دوسرے اکابر کی قمیص کے پہننے کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔ قمیصِ نبوی کے حوالے سے منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کی قمیص کا ذکر آ چکا ہے۔ اس نے حضرت عباسؓ کو اپنی قمیص پہنا دی تھی۔ لہٰذا صحابہ کرام میں کم سے کم ایک صحابی کے پہننے کا ثبوت ملتا ہے جو حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی تھے اور ایک منافق کے قمیص پہننے کا بھی ذکر خاص ہے کہ وہ عبداللہ بن ابی بن سلول خزرجی کی قمیص تھی۔ دوسری روایات بھی دوسرے صحابہ کرام اور دوسرے اکابر کی قمیصوں کا ذکر کرتی ہیں۔ ان کا ذکر کسی خاص ترتیب کے بغیر کیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ وضاحت کرنی بھی ضروری ہے کہ بسا اوقات ان قمیصوں کو دوسری روایات نے دوسرے ملبوسات کا نام بھی دیا ہے:

- حضرت عمر بن خطابؓ جب قبول اسلام کے لئے دارارقم پہونچے تو ایک قمیص پہن رکھی تھی۔ (اسد الغابہ، ۴/ ۵۷ نیز ۶۷)

- حضرت عمرو بن سلمہ کمسن صحابی تھے مگر قرآن کے سب سے بڑے حافظِ قوم تھے لہٰذا وہی امامتِ نماز فرماتے تھے۔ غربت کے سبب ان کی چادر (بردہ) جو گردن سے بندھی رہتی تھی سجدہ میں کھل جاتی تھی اور ستر بھی کھل جاتا۔ مقتدیوں بالخصوص خواتین کی شکایت پر پوری قوم نے ان

کے لئے کپڑا خریدا اور اس کی ایک قمیص بنائی۔ حضرت عمرو بن سلمہؓ فرماتے تھے کہ اس قمیص کو پا کر جتنی خوشی مجھے ہوئی کسی اور شے سے نہیں ہوئی"... فاشتروا لی فقطعوا لی قمیصا، فما فرحت بشئی فرحی بذلک القمیص"۔

(بخاری، فتح مکہ کے ضمن میں باب بلاعنوان؛ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ؟ کے مطابق صحابی صغیر کی پہلی چادر چھوٹی تھی للہذا ان کے لئے ایک عمانی قمیص (قمیصا عمانیا) خرید لی گئی: علیّ بردۃ لی صغیرۃ صفراء فاشتروا لی قمیصا عمانیا، حدیث ابی داؤد: ۵۸۵-۵۸۶)

- حضرات حسنین- حسن بن علی بن ابی طالب ہاشمی و حسین بن علی بن ابی طالب ہاشمی- رضی اللہ عنہما کی قمیصوں کا ذکر بہت دلچسپ اور محبت آمیز ہے۔ حضرت ابو بردہؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام کو خطبہ دے رہے تھے جب حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہما لڑکھڑاتے ہوئے آگئے کہ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان دونوں کے جسم مبارک پر دو سرخ قمیصیں تھیں۔ رسول اکرم ﷺ نے منبر سے نزول فرمایا اور ان کو گود میں اٹھالیا اور فرمایا: فرمانِ حق صحیح ہے کہ تمہارے اموال و اولاد آزمائش ہیں: "کان رسول اللہ ﷺ یخطبنا اذ جاء الحسن والحسین علیھما قمیصان احمران یمشیان ویعتران، فنزل رسول اللہ ﷺ من المنبر فحملھما ووضعھما بین یدیہ ثم قال: صدق اللہ: انما اموالکم واولادکم فتنۃ..."

(ترمذی، ابواب المناقب، مناقب الحسن والحسین ؛ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الامام یقطع الخطبۃ للامر یحدث ؛نسائی، کتاب الجمعۃ، باب نزول الامام الخ)

-**قمیص سلمہ بن الاکوع**: حضرت سلمہ بن اکوعؓ نے ایک بار رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا: میں ایک شکاری شخص ہوں کیا میں ایک قمیص میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں مگر اس کو بند کر لیا کرو چاہے ایک کانٹے ہی سے کیوں نہ کرو: "افاصلی فی القمیص الواحد؟ (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الرجل یصلی فی قمیص واحد)۔ اسی باب میں ایک دوسرے صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ کی قمیصِ واحد کا ذکر ہے جس میں انھوں نے لوگوں کی امامت کی تھی۔ کانٹے سے گریبان بند کرنے کا حکم ہے کہ کھلے حصہ سے ستر کھل سکتا تھا بلکہ کھل ہی جاتا تھا۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ گریبان کے دونوں حصوں کو تکموں اور گھنڈیوں سے بند

کیا جاتا تھا جو خاص ملبوسات میں طریقہ تھا۔

- حضرت وہب بن زمعہ اور ان کے ساتھی رضی اللہ عنہما یوم النحر کی شام کو رسولِ اکرم ﷺ کے پاس حضرت ام سلمہؓ کے خیمہ میں آئے تو دونوں قمیص پہنے ہوئے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان دونوں کی قمیص ان کے سر کی طرف سے اتروا دیں کہ ابھی وہ بحالتِ احرام تھے۔

(ابوداؤد، کتاب المناسک، باب الافاضة فی الحج)

- حضرت ام خالد بنت خالد بن سعید اموی ؓ کا بیان ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی تو میرے جسم پر ایک پیلی قمیص تھی:... "وعلیّ قمیص أصفر"۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حبشی زبان کے لفظ "سنہ سنہ" سے اس کی خوبصورتی کی تعریف کی۔

(بخاری، کتاب الجھاد، باب من تکلم بالفارسیة؛ کتاب الادب، باب من ترک الخ؛ فتح الباری، ۶/۲۲۰ و مابعد، حدیث: ۳۰۷۱ وغیرہ)

- حضرت انسؓ نے حضرت زینب بنت رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی قمیص (قمیص حریر سیراء) پہنے دیکھا تھا۔ (ابن ماجہ، کتاب القمیص، باب لبس الحریر)

- حضرت عمرؓ کے جسم پر رسولِ اکرم ﷺ نے ایک سفید قمیص دیکھی: "رای علی عمر قمیصاً ابیض" تو دریافت فرمایا: ڈھلی ہوئی ہے یا نئی ہے؟ حضرت عمرؓ کے عرض کرنے پر کہ وہ ڈھلی ہوئی ہے، فرمایا: نئی پہنو، تعریف کے ساتھ زندہ رہو اور شہادت کی موت پاؤ: "البس جدیدا، وعش حمیدا، و مت شھیداً۔

(ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب ما یقول الرجل اذا لبس ثوبا جدیدا؛ اس کی اسناد صحیح ہے۔ زوائد)

- حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے فتحِ مکہ کے دن ایک عظیم قریش کے باپ کی ہجرت پر بیعت کرنے کی رسولِ اکرم ﷺ سے آکر سفارش کی تو اس وقت عمِ مکرم قمیص پہنے تھے مگر اس پر چادر نہ تھی: "فخرج العباس فی قمیص لیس علیه رداء"

(ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب ابرار الق

- اکابرِ عرب و شیوخ مکہ میں عاص بن وائل سہمی کی قمیص کا ذکر آچکا ہے۔

حدیث:

- ایک جنازے میں رسولِ اکرم ﷺ نے بعض صحابہ کو دیکھا کہ انھوں نے جاہلی روایت کے مطابق اپنی چادریں اتار دی تھیں اور صرف قمیصوں میں چل رہے تھے: "فرای قوماً قد طرحوا اردیتھم یمشون فی قمص"، رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

(ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب النھی من التسلب مع الجنازۃ؛ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ زوائد)

محدثینِ کرام کی مانند اہلِ سیر نے بھی حضرات صحابہ کرام کی قمیصوں کا ذکر مختلف انداز سے کیا ہے۔ ان کے ذکرِ خیر سے بعض عبرت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور تمدن وتہذیب اسلامی کے نمونے بھی ملتے ہیں:

- حضرت عمرؓ کی قمیص میں ان کی مالداری اور دولت مندی کے باوجود چار چار پیوند لگے ہوتے تھے: "اربع رقاع فی قمیص لہ"۔

- ان کی قمیص سنبلانی سلی جاتی تھی اور اس کی آستین ان کی ہتھیلیوں کے گٹوں سے آگے نہیں جاتی تھی: "کان یخاط لہ قمیص سنبلانی لایجاوز کمہ رسغ کفیہ"۔ وہ اپنی قمیص کو اشنان (ایک قسم کی نباتات) سے دھلواتے تھے۔

(ابن سعد، ۳/ ۳۲۸-۳۳۰؛ مصباح اللغات: "الأشنان و الإشنان: ایک قسم کی نباتات جس کو ہاتھ دھونے میں استعمال کرتے ہیں")

- حضرت عثمان بن عفانؓ کی ایک قوہی قمیص "قمیصا قوھیا" کا ذکر ملتا ہے۔

(ابن سعد، ۳/ ۵۷)

- حضرت علی بن ابی طالبؓ نے ایک بار "قمیص قہز" پہنی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی "قمیصِ رازی" کا بھی ذکر ملتا ہے جس کی آستین ان کے ناخن تک اور لمبائی میں لٹکانے سے نصفِ ساق تک پہونچتی تھی: "علیہ قمیص رازی اذا مدّ کمہ بلغ الظفر فاذا ارخاہ بلغ نصف ساعدہ"۔ ان کی ایک قمیص زابی (قمیصا زابیا) کا بھی ذکر ہے جس کی آستین چھوٹی کر لی تھی۔ ایک قمیص کرابیس بھی تھی اور حضرت موصوف نے ایک قمیص سنبلانی چار درہم کی خرید فرمائی تھی اور خیاط سے اس کی آستین انگلیوں سے اوپر کروائی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور قمیص کرابیس کسکری بھی تھی جو لمبائی میں ٹخنوں سے اوپر تھی اور اس کی دونوں آستینیں انگلیوں تک

تھیں۔ (ابن سعد، ۳/ ۲۶-۳۰۔ اس روایت میں کم از کم چھ قمیصوں کا ذکر ملتا ہے)

- حضرت زبیر بن عوامؓ کو رسولِ اکرم ﷺ نے ریشمی قمیص: ''قمیص حریر'' پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ (ابن سعد، ۳/ ۱۰۳)

- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کو بھی ریشمی قمیص کی اجازت دی تھی۔

- مسلمان عام طور سے ریشمی قمیص/لباس دوران جنگ پہنا کرتے تھے: ''کان المسلمون یلبسون الحریر فی الحرب''

(ابن سعد، ۳/ ۱۳۰، حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ عام لباس ریشم کا ذکر بہت اہم ہے)

درع/ بمعنی قمیص

درع کے لغوی معنی خواہ کچھ ہوں مگر اصطلاحی طور سے وہ عہد نبوی میں مردوں اور عورتوں دونوں کا مشترکہ لباس تھی۔ اس کے اصلی لغوی معنی اس میں بھی کسی حد تک برقرار رہتے تھے کہ وہ قمیص کے معنی میں بہرحال تھی اور مردوں کی قمیص کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ روایاتِ سیرت میں اس کی بعض مثالیں ملتی ہیں:

درع نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کی درع مبارک کا ذکر بعض غزوات اور دوسرے واقعات کے حوالے سے ملتا ہے:

- مشہور واقعہ ہے کہ غزوۂ بنی قینقاع میں جب رسولِ اکرم ﷺ نے یہود بنی قینقاع کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینے کے بعد فیصلہ فرمانا چاہا تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول خزرجی نے آپ ﷺ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر اصرار کیا مگر جب آپ ﷺ نے اعراض فرمایا تو اس نے رسولِ اکرم ﷺ کی درع مبارک کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ بقول ابن ہشام اس درع نبوی کا نام ذات الفضول تھا: ''... فادخل یدہ فی جیب درع رسول اللہ ﷺ، وقال ابن ہشام: و کان یقال لھا: ذات الفضول''۔ بالعموم اس

کا ترجمہ زرہ کیا گیا ہے جو جنگ کے اسباب وسامان میں ہوتی تھی اور یہ صحیح بھی ہے۔

(ابن ہشام، ۲/ ۴۲۸: اسی کے آگے بنو قینقاع کے "تین سو دارع" یعنی درع / زرہ پوش سپاہیوں کا ذکر ابن اسحاق/ ابن ہشام کی روایات میں ہے۔ دوسری کتب سیرت میں بھی ہے)

البتہ امام بخاریؒ نے اپنے ایک باب میں رسولِ اکرم ﷺ کے درع اور قمیص دونوں کے جنگ میں پہننے کا ذکر کیا ہے: "باب ما قیل فی درع النبی ﷺ والقمیص فی الحرب الخ"۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے درع کی تشریح میں لکھا ہے کہ وہ قمیص ہوتی ہے جو حلقوں سے بنائی جاتی ہے: "...درع وھو القمیص اتخذ من الزرد"۔ انھوں نے اس سے زرہ مراد لی ہے اور اس کے استعمال کو خلاف توکل نہیں مانا ہے۔

(فتح الباری، ۶/ ۱۲۱-۱۲۲؛ نیز مندرجہ ذیل ابواب کے لئے ۱۲۳ و مابعد)

بہر حال دوسرے ابواب بخاری جیسے باب الجبة فی السفر والحرب، باب الحریر فی الحرب وغیرہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاص قمیص کا امکان بہر حال ہے، دوسرے درع بمعنی قمیص ایک مشترکہ لباس بھی معلوم ہوتا ہے جو مرد وعورت دونوں پہنتے تھے البتہ ان کی ساخت وغیرہ مختلف ہوسکتی ہے۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

چادرِ ستر وزینت

بردۃ / برد

ازار کی مانند ایک اور لباس عہد نبوی میں تھا جسے بردہ کہا جاتا تھا اور جس کی جمع بُرد ہے اور البرود بھی آتی ہے۔ اسے اردو میں چادر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امامِ لغت جوہری کے مطابق وہ ایک چوکھونٹی چادر ہوتی ہے جس میں طرح طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں اور جسے اعرابی لوگ پہنتے ہیں: "کساء اسود مربع فیه صور تا سه الاعراب"۔ ایک حدیث میں اسے "شملہ" بھی کہا گیا ہے جس کے حاشیہ میں بُنائی ہوتی ہے: "ھی الشملة منسوج فی حاشیتها"۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تعریف میں لکھا ہے: "الشملة ... مایشتمل به من الاکسیة ای یلتحف" (شملہ ان ملبوسات میں سے ہے جن کو لپیٹا جاتا ہے)۔ اور حدیث میں "بُرد" کو رداء

(چادر) سے بھی تعبیر کیا گیا یعنی دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ یہ چادریں مختلف انداز اور مختلف قسم کے کپڑوں کی ہوتی تھیں۔ اور گھروں میں بھی بُنی جاتی تھیں اور دوسرے بازارِ عرب سے بھی خرید کی جاتی تھیں۔ دراصل وہ بالائی جسم کو ڈھانکنے کی چادریں ہوتی تھیں یا لباس ہوتا تھا۔ چادر ہونے کے سبب اسے ازار بھی بنایا جا سکتا تھا۔ ورنہ بالعموم وہ اوپری حصۂ بدن پر اوڑھ لی جاتی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام کے لباس کا وہ ایک دوسرا ضروری حصہ ہوتا تھا۔ اس کا ذکر بہت سی روایات میں ملتا ہے۔

نبوی برد

رسولِ اکرم ﷺ کے لباسِ مبارک میں بُرد کی شمولیت کا ذکر مکی دور میں بھی ملتا ہے اور مدنی حیاتِ طیبہ میں تو بکثرت ملتا ہے۔ امام بخاریؒ نے "باب البرود والحبر والشملة" ترجمة الباب میں حضرت خبّاب بن ارت تمیمیؓ کی خدمتِ اقدس میں ایک شکایت درج کرانے کے ضمن میں ایک حدیث کا مختصر حصہ نقل کیا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چادر سے اپنا سرہانا بنالیا تھا: "وقال خباب: شكونا الى النبى ﷺ وهو متوسد بردة له"۔ دراصل یہ حدیث مرفوع نہ ہونے کے سبب یا امامِ موصوف کی شرط پر پوری نہ اترنے کے سبب ترجمة الباب میں ادھوری آئی ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر دوسری روایات واحادیث میں ملتا ہے اور پھر حضرت امامؒ کا مقصد صرف بُردِ نبوی کا حوالہ دینا تھا۔ (بخاری، ۱۸- باب مذکور/ کتاب اللباس: فتح الباری، ۱۰/۳۳۹)

بہر حال حضرت امامؒ نے اسے دوسری جگہ پوری تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اکابرِ قریش کے مظالم سے تنگ آ کر حضرت خبّاب اور ان کے مکی اصحابؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی اور ان کے لئے عذابِ الٰہی نازل کرانے کی التجا کی۔ اس وقت رسولِ اکرم ﷺ اپنی چادر کا تکیہ/ سرہانہ بنائے ہوئے استراحت فرما تھے۔ آپ ﷺ نے مکی مظلوم صحابہ کو صبر وثبات کا مشورہ دیا"... سمعت خباب يقول: أتيت النبى ﷺ وهو متوسدٌ بردةً وهو فى ظل الكعبة– وقد لقينا من المشركين شدة..."

(بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب ما لقى النبى ﷺ واصحابه من المشركين بمكة؛ حدیث:

۳۸۵۲؛ فتح الباری، ۷/ ۲۰۷-۲۱۰ و مابعد، نیز علامات النبوۃ میں بھی یہ حدیث گذر چکی ہے: کتاب بدء الخلق ، باب مذکورہ؛ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الاسیر یکرہ علی الکفر: اس روایت میں حضرت خبابؓ کے ساتھ ان کے اصحاب کے آنے اور شکوہ کرنے کا ذکر ہے؛ نیز دیگر کتب حدیث وسیرت)

اسی بابِ تعذیبِ مشرکین میں حدیث: ۳۸۵۶ بھی ہے جو رسولِ اکرم ﷺ کے علاوہ بعض مشرکین کے کپڑے/ چادر کا ذکر کرتی ہے۔ لب لباب یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مسجدِ حرام کے مقام حجر میں نماز ادا فرمارہے تھے کہ دشمنِ اسلام و جان عقبہ بن ابی معیط اموی نے اپنی چادر آپ ﷺ کی مبارک گردن میں ڈال کر گلا گھونٹنا شروع کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر اس موذی سے آپ ﷺ کی گردن چھڑائی۔ "... **بینا النبی ﷺ یصلی فی حجر الکعبۃ، اذ اقبل عقبۃ بن ابی معیط فوضع ثوبہ فی عنقہ فخنقہ خنقا شدیدا، فاقبل ابوبکر حتی اخذ بمکنبہ الخ**"۔ اگرچہ اس روایت بخاریؒ میں لفظ ثوب ہے مگر اس سے مراد چادر ہے اور بعض دوسری روایات و احادیث میں چادر ہی کا ذکر آیا ہے۔

(بخاری، حدیث: ۳۸۵۶؛ فتح الباری، ۷/ ۲۰۹-۲۱۴ و مابعد؛ حافظ ابن حجرؒ نے تعذیبِ اکابرِ مکہ کے دوسرے واقعات بھی لکھے ہیں اور ان میں سے بعض میں کپڑوں/ ثیاب اور چادر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً امامانِ حدیث ابویعلیٰ اور ابن حبان کی روایت میں ہے: "... **فقام الیہ عقبۃ فجعل رداء ہ فی عنقہ ثم جذبہ الخ**"۔ دیگر روایاتِ سیرت میں بھی چادر ہی کا ذکر آتا ہے)

برد (چادر) اوپری بدن کا لباس تھا۔ اور ایسا واضح ہوتا ہے کہ بالائی بدن کے لباس قمیص وغیرہ کے اوپر لپیٹا جاتا تھا۔ لہٰذا جب کبھی ضرورت ہوتی تو اسے بطور سرہانہ سر کے نیچے رکھ لیا جاتا جیسا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے چادر کو سرہانہ بنانے کی روایت میں ملتا ہے۔ اس کی تصدیق صحابہ کرام اور دوسرے اکابرِ مکہ و مدینہ کے معمولات وملبوسات سے ہوتی ہے جن کا ذکر بعد میں آتا ہے تاہم یہاں صرف چادر کو تکیہ بنانے کے سماجی طریق کا ذکر کرنے کی خاطر کہا جاتا ہے کہ حضرت صفوان بن امیہؓ جب مدینہ آئے تھے تو اپنی چادر کا سرہانہ بنائے لیٹے تھے کہ ایک چور ان کی چادر لے گیا۔

- حضرت ابوصالحؒ کی روایت ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو سوق ذوالمجاز میں دو سرخ چادریں اوڑھے ہوئے دیکھا: "**رأیت رسول اللہ ﷺ بسوق ذی المجاز بین بردین احمرین**" (بلاذری، ۱/ ۳۹۶)

- ہجرتِ مدینہ کے وقت جب رسولِ اکرم ﷺ دوپہر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف لے گئے تھے تو اپنی چادرِ مبارک کی چہرۂ انور پر نقاب سی ڈال رکھی تھی: "مقبلا متقنعا فی ساعة الخ"۔ امامِ سیرت موسیٰ بن عقبہ کی روایت میں ہے کہ سرِ مبارک ڈھانکے ہوئے تھے "ای مغطیا راسه"۔ یہ بہرحال چادر کے کونے سے ہی کیا گیا تھا۔

(بخاری، مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ و اصحابه الی المدینة، حدیث:۳۹۰۵؛ فتح الباری، ۷/ ۲۸۸-۲۹۳ ومابعد؛ نیز باب التقنع، حدیث:۵۸۰۷؛ فتح الباری، ۷/ ۳۳۷-۳۳۸ میں یہی روایت ہے)

- ایک خاتون صحابیؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو ایک چادر/ بردہ ہدیہ کی تھی جس کو بطور ازار آپ ﷺ نے استعمال کیا تھا۔ اس کا مفصل ذکر ہدایا کے باب میں آئے گا۔ یہاں صرف بتانا مقصود ہے کہ چادر کو بطور ازار بھی استعمال کیا جاتا تھا کہ وہ کھلا ہوا لمبا لباس ہوتا ہے۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب البرود الخ؛ حدیث:۵۸۱۰؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۳۹ ومابعد)

- غزوۂ خیبر میں رسولِ اکرم ﷺ کے ملبوسات میں ایک یمنی چادر (برداً یمانیاً) بھی شامل تھی۔ (واقدی، ۶۸۷)

- غزوۂ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ایک اعرابی کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ رواں دواں تھا۔ اس وقت جسمِ اطہر پر ایک نجرانی چادر تھی جس کا کنارے خاصے سخت تھے۔ ایک اعرابی نے آپ ﷺ کو پکڑ کر اتنی زور سے چادر کھینچی کہ میں نے شانۂ مبارک پر اس کی رگڑ سے بالخصوص سخت حاشیۂ چادر کی رگڑ سے نشان بنتے دیکھے: "... کنت امشی مع النبی ﷺ وعلیه برد نجرانی غلیظ الحاشیة، فادرکه اعرابی فجذبه جذبة شدیدة حتی نظرت الی صفحة عاتق النبی ﷺ قد اثرت به حاشیة الرداء من شدة جذبته ... الخ

(بخاری، کتاب فرض الخمس الخ، باب ماکان النبی ﷺ یعطی المولفة قلوبهم، باب الجزیة وغیره؛ کتاب الادب، باب التبسم والضحک وغیره؛ مسلم، کتاب الزکاة، باب اعطاء من مال الخ: برد کی جگہ رداء ہے)

- مرض الوفاۃ میں رسولِ اکرم ﷺ باہر تشریف لائے تو سر کو چادر کے حاشیہ سے باندھ

رکھا تھا: "وعصب النبی ﷺ علی راسه حاشیة برد" ۔ یہ مجلسِ انصار میں رسولِ اکرم ﷺ کی آخری تشریف آوری تھی جس میں آپ ﷺ نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت کی تھی۔

(بخاری، باب التقنع، ترجمة الباب؛ مناقب الانصار ......؛ فتح الباری، ۷/ ۳۴۰)

- وفات کے وقت چہرۂ انور اور جسم اطہر پر ایک چادر ہی تھی: "برد حبرۃ"۔ حضرت ابو بکرؓ اپنے مسکن سنح (س ن ح) سے آئے تو چہرۂ انور چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر اٹھا کر دیدار کیا اور بوسہ دیا... "وهو مسجی ببرد حبرة فكشف من وجهه ... فقبله ثم بكی"

(بخاری، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت الخ؛ حدیث: ۱۲۴۱-۱۲۴۲؛ فتح الباری، ۳/ ۱۴۷ و مابعد ؛ ۱۰/ ۳۴۰، حدیث: ۵۸۱۴ "ان رسول الله ﷺ حین توفی سُجّی ببرد حبرة؛ ابن ہشام، ۲/ ۶۵۵- دونوں حدیث بخاری کے بہت سے اطراف ہیں)

رسول اکرم ﷺ کی چادر (برد) کے بارے میں بعض اور بہت اہم اور دلچسپ روایات ملتی ہیں اور ان کو مختصر مختصر درج کیا جاتا ہے:

- حضرت ابو رمثہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو جسمِ مبارک پر دو سبز چادریں دیکھیں: "فرأیت علیه بردین اخضرین"۔

(ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی الخضرة)

- حضرت ہلال بن عامرؒ اپنے والد کا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو منٰی میں ایک خچر پر سوار خطبہ ارشاد فرماتے دیکھا، اس وقت آپ ﷺ کے جسمِ مبارک پر ایک سرخ چادر تھی: "رأیت رسول الله ﷺ بمنٰی یخطب علیٰ بغلة، وعلیه بردٌ احمر ..."

(ابوداؤد، مذکورہ بالا، باب فی الرخصة فی ذلک الحمرة)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کے لئے ایک کالی چادر بنائی جسے آپ ﷺ نے زیبِ تن فرمایا۔ جب اس میں آپ ﷺ کو پسینہ آتا تو اون کی بدبو آتی لہٰذا اسے ترک کر دیا کیونکہ آپ ﷺ کو اچھی خوشبو پسند آتی تھی: "...صنعت لرسول الله ﷺ بردة سوداء فلبسها، فلما عرق فیها وجد ریح الصوف فقذفها ... وکان تعجبه الریح الطیبة..." (ابوداؤد، باب فی السوداء)

- حضرت یعلیٰ بن امیہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت جسمِ اطہر پر چادر تھی: "...طاف بالبیت مضطبعا وعلیہ برد..."

(ترمذی، ابواب الحج، باب ان النبی ﷺ طاف مضطبعا؛ ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الاضطباع وغیرہ)

- بخاری کی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے سب سے پسندیدہ کپڑوں میں "حبرہ" تھی۔ یہ روایت حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے۔

(حدیث: ۵۸۱۲-۵۸۱۳؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۴۰-۳۴۱۔ حافظ موصوف نے اس کو یمنی چادر بتایا ہے۔ (نیز ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الحبرۃ، نیز دیگر کتب حدیث؛ اس مسئلہ پر بحث بعد میں بھی آتی ہے)۔

"الحبرۃ بوزن عنبۃ برد یمان" یہ امام لغت جوہری کی تشریح ہے۔ ابن بطال کے مطابق وہ یمنی چادریں ہوتی تھیں جو سوت سے بنائی جاتی تھیں اور اہل یمن کے نزدیک سب سے عمدہ کپڑے میں شمار ہوتی تھیں: "ھی من برود الیمن تصنع من قطن وکانت اشرف الثیاب عندھم"۔ امام قرطبی کے مطابق ان کو حبرہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ گل بوٹوں یا ڈیزائنوں سے آراستہ ہوتی تھیں: "سمیت حبرۃ لانھا تحبر ای تزین..." امام ہروی کے مطابق وہ دھاری دار منقش (موشیۃ مخططۃ) ہوتی تھیں اور امام داؤدی کا کہنا ہے کہ ان کا رنگ سبز ہوتا تھا جو جنتیوں کے لباس کا رنگ ہے: "لونھا اخضر..."۔

صحابہ کرام کی چادریں

برد/ رداء (چادر) کے بارے میں ایک عام تصور یہ ملتا ہے کہ تمام صاحبانِ استطاعت اس کو استعمال کرتے تھے۔ ان میں مشرک اکابرِ مکہ بھی تھے اور مکی اور مدنی اور دوسرے صحابہ کرام بھی شامل تھے۔ ایک طرح سے وہ بالائی لباس علامتِ امتیاز بھی تھا اور طرۂ افتخار بھی۔ اس کو لباسِ مہذب کا ایک لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا اور بالعموم اکابر اور دوسرے بڑے لوگ گھروں سے باہر چادر کے بغیر نہیں نکلتے تھے۔ اگر کسی فوری ضرورت سے نکل بھی آتے تو اسے پہلی فرصت میں اوڑھ لیتے تھے اور بسا اوقات گھر سے منگوا لیتے تھے۔ بعض صحابہ کرام کی چادروں (برد) کا ذکر یہاں اس بات کو اور مستند کر دے گا اور لباسِ خاص کی اہمیت کو اجاگر کر دے گا:

- ذکر آ چکا ہے کہ حضرت صفوان بن امیہؓ مکہ سے مدینہ منورہ آئے تو مسجد نبوی میں لیٹے ہوئے تھے اور سر ہانہ اپنی چادر ''بردہ'' کا بنالیا تھا کہ ایک چور نے اس پر ہاتھ مارا اور لے چلا۔ حضرت صفوان نے اسے چادر سمیت پکڑ لیا اور خدمتِ اقدس میں لے گئے۔ اس لباسِ صفوانؓ کے لئے بعض دوسرے الفاظ جیسے رداء، خمیصۃ بھی آئے ہیں اور اس کی قیمت تیس درہم بتائی گئی ہے۔
(نسائی، کتاب قطع السارق، الرجل یتجاوز للسارق الخ؛ کئی روایات ہیں)

- حضرت عمرو بن سلمہ کم سن تھے مگر انھیں کو اپنی قوم میں سب سے زیادہ قرآن کریم یاد تھا لہٰذا وہ ہی امامِ قوم مقرر کئے گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ میں ان کو نماز پڑھاتا تھا۔ میرے جسم پر ایک کھلی چادر ہوتی تھی: ''وکانت علیّ بردة مفتوحة...'' جس سے ان کا ستر بھی کھل جاتا تھا۔ (نسائی، کتاب القبلة، الصلاة فی الازار)

- اسی غربت کے دور کا واقعہ ہے کہ حضرت عتبہ بن غزوانؓ اور سعد بن مالکؓ کے پاس ازار تک نہ تھی۔ حضرت عتبہ کو ایک چادر مل گئی تو اسے پھاڑ کر دو حصے بنائے۔ ایک حصہ سے حضرت عتبہ نے اپنی ستر پوشی کی اور دوسرے حصہ کو حضرت سعد نے اپنا ازار بنالیا: ''... فالتقطت بردة فشققتها بینی و بین سعد بن مالک، فاتزرت بنصفها واتزر سعد بنصفها...''۔
(مسلم، کتاب الزهد والرقاق، حدیث:۱۴(۲۹۶۷)

- حضرت جابر بن عبداللہؓ کے پاس ایک تنگ اور چھوٹی سی چادر تھی جس کے چھور/کونے (ذباذب) تھے اور اسے کسی غزوہ کے دوران اس طریقہ سے باندھا کہ اس کے دونوں کناروں کو ایک دوسرے کے خلاف کر کے جسم پر لپیٹ لیا اور نماز پڑھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے نماز کے بعد ان کو اصول بتایا کہ اگر چادر لمبی چوڑی ہو تو اس کے دونوں کناروں کو ایک دوسرے کے مخالف جانب ڈال لیا کرو اور تنگ ہو تو اسے گدی پر باندھ لیا کرو: ''... وکانت علی بردة ذهبت اخالف بین طرفیها فلم تبلغ لی، وکانت لها ذباذب، فنکستها ثم خالفت بین طرفیها ثم تواقصت علیها لا تسقط... قال ﷺ: اذا کان واسعا فخالف بین طرفیه، واذا کان ضیقا فاشدد علی حقوک''۔
(ابوداؤد، کتاب الصلوٰة، باب اذا کان الثوب ضیقا یتزر به؛ بخاری، کتاب الصلوٰة، باب اذا کان الثوب ضیقا...)

- حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ مالدارترین تجارِ مکہ و مدینہ میں سے ایک تھے۔ان کا لباس بہت قیمتی ہوتا تھا۔روایات کے مطابق ان کی چادریں چار پانچ سو درہم کی قیمت کی ہوا کرتی تھیں اور ایسے ہی قیمتی ان کے دوسرے ملبوسات ہوتے تھے جن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر آتا ہے:"**کان عبدالرحمن بن عوف یلبس البرد... تساوی خمسمائة او اربعمائة درهم ...**" (ابن سعد،۳/۱۳۱)

- حضرت عثمان بن عفان امویؓ بھی مالدارترین مسلمانوں میں سے تھے اسی لئے غنی کہلاتے تھے جو ایک صفتِ الٰہی بھی ہے۔ان کی ایک چادر یمنی کی قیمت ایک سو درہم بتائی گئی ہے:"**...بردا یمانیا ثمن مائة درهم**" (ابن سعد،۳/۵۷)

- متعدد دوسرے صحابہ کرام کی بردہ کا ذکر مختلف روایات میں ملتا ہے جیسے:

- حضرت سلمہ بن وقش بدریؓ بعثتِ نبوی کی بُشارتِ یہودی سنتے وقت ایک بردہ پہنے ہوئے تھے۔(ابن ہشام،۱/۲۱۲)

- حضرت مصعب بن عمیرؓ کی ان کی چادر (بردہ) میں ہی تکفین کی گئی تھی اور وہ اتنی چھوٹی تھی کہ پورا جسم نہیں ڈھانک سکتی تھی۔(اسد الغابہ،۴/۳۱۶)

- حضرت عبید بن خالد محاربیؓ کے ازار کے ساتھ ان کی ایک سفید و سیاہ رنگ والی چادر (بردۃ ملحاء) کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔(اسد الغابہ،۳/۳۴۸)

متعدد دوسرے صحابہ کرام کی چادروں (برد/ برود) کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ملتا ہے اور ان میں سے بعض کا ذکر اگلے مباحث میں آتا ہے۔

صحابیات کی چادریں

خواتینِ عہد بھی چادروں کا استعمال فرماتی تھیں۔ان کی چادروں کی اقسام بھی کئی تھیں اور ان میں سے ایک برد بھی تھی۔اس کے بعض واقعات و روایات یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

- حضرت ام کلثومؓ بنت رسولِ اکرم ﷺ کے جسمِ مبارک پر حضرت انس بن مالکؓ نے ایک ریشمی چادر (برد سیراء) دیکھی تھی۔"سیراء" اس چادر کے لئے آتا ہے یا اس کے معنی یہ ہیں

کہ وہ ریشم سے مزین و آراستہ کی گئی ہو۔ یہ بہت قیمتی روایت ہے کہ حضرت ام کلثومؓ کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ وہ حضرت عثمان بن عفان امویؓ جیسے مالدار صحابی کی زوجہ محترمہ تھیں اور وہ قیمتی چادریں استعمال کر سکتی تھیں:"عن انس : انه رأى على ام كلثوم بنت رسول الله ﷺ بردا سيراء. قال: والسيراء : المضلع بالقز..."

(ابوداؤد، كتاب اللباس، باب في الحرير للنساء؛ مسلم، كتاب اللباس، باب الحرير للنساء)

- اسی ماخذِ معلومات سے ایک اور دلچسپ رواج اور سماجی ریت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ریشمی چادریں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پہنا کرتے تھے۔ جب مردوں کے لئے ریشم کا استعمال عام ممنوع قرار دیا گیا تو بقول حضرت جابر بن عبداللہؓ ہم لڑکوں کی چادریں چھین لیتے تھے مگر لڑکیوں کو پہنے رہنے دیتے تھے:"كنا ننزعه عن الغلمان ونتركه على الجواری"۔

عہدِ نبوی کے رداء

بالعموم برد اور رداء دونوں کے اردو ترجمے میں فرق نہیں کیا جاتا اور ان دونوں کو چادر ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ لغوی اعتبار سے ان دونوں میں فرقِ معنی ضرور ہونا چاہئے۔ بہر حال مختلف احادیث و روایات میں ان دونوں کو ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ اہم وہ احادیث و روایات ہیں جن میں ایک ہی مقام پر ایک چیز کو برد کہا گیا ہے اور اگلے جملہ میں اسے رداء کہا ہے جیسے حدیث بخاری: ۵۸۰۹۔ رسولِ اکرم ﷺ کے برد اور رداء دونوں کے معاملے میں یہ التزام بھی ملتا ہے اور بعض روایات میں صرف رداءِ نبوی کا ہی ذکر آتا ہے۔ لہٰذا ذیل میں چند احادیث و روایات صرف رداء نبوی کی بیان کی جاتی ہیں:

رداء نبوی

- دشمنِ اسلام عقبہ بن ابی معیط اموی نے رسولِ اکرم ﷺ کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کپڑا استعمال کیا تھا وہ بعض روایات میں رداء کہا گیا ہے۔

(بخاری، فضائل الصحابة، باب مناقب ابی بکر ؛ مقام حجر میں اکابر قریش نے آپ ﷺ کی ردائے مبارک ہی پکڑی تھی؛ ابن ہشام، ۱/۲۹۰)

- غزوۂ بدر کا مشہور واقعہ ہے کہ جنگ کے دوران رسولِ اکرم ﷺ نے اتنی گریہ وزاری اور دعا میں شدت فرمائی کہ شانہ مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آ کر چادرِ نبوی اٹھائی اور آپ کے شانوں پر ڈالی اور پشت سے چمٹ گئے کہ اب بس کریں، اللہ ضرور سنے گا:

"...فهتف بربه مادا يديه مستقبل القبلة حتى سقط رداء ه من منكبيه، فاتاه ابوبكر فاخذ رداء ه فالقاه على منكبيه ثم التزمه ..."۔

(ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورة الانفال؛ اسد الغابہ، ۱۰۳/۳ میں بھی ردائے نبوی کے شانوں سے گرنے کا واقعہ درج ہے)

- مشہور واقعہ ہے کہ غزوۂ حنین سے حاصل شدہ تمام غنائم کو رسولِ اکرم ﷺ نے تقسیم فرما دیا تاہم لوگوں کے ایک جمِ غفیر نے آپ ﷺ کو گھیر گھار کر ایک بیری (سمرة) کے درخت تک پہونچا دیا اور اس ہجوم کی وجہ سے آپ ﷺ کی چادر (رداء) گر گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میری چادر مجھے دے دو۔ اگر اس سے زیادہ بھی مویشی اور مغانم ہوتے تو میں ان کو تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا... (بخاری، کتاب الجهاد، باب الشجاعة فی الحرب الخ وغیرہ؛ اسد الغابہ مذکورہ بالا)

- غزوۂ حنین کے بعد جعرانہ میں قیام کے دوران رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی رضاعی ماں اور دوسرے رضاعی اقرباء کے لئے اپنی چادر بچھا دی تھی۔

- غزوۂ تبوک کے دوران جب اسلامی لشکر مقامِ حجر سے گذرا تو رسولِ اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ظالموں کے مساکن سے تیزی سے گذرنے کا حکم دیا اور اپنی چادر سے اپنا چہرۂ انور ڈھانک لیا: "ثم تقنع بردائه..."

(بخاری، کتاب بدء الخلق، باب قول الله تعالى: والیٰ ثمود الخ)

- رسولِ اکرم ﷺ نے صحابہ کو تعلیم دی کہ نماز میں قبلہ کی طرف نہ تھوکا کریں اور ضروری ہو جائے تو اپنے بائیں یا پیروں کے نیچے تھوک لیا کریں۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی چادر کا کونہ لیا اور اس میں تھوکا اور اس کو تہہ کر دیا: "...ثم اخذ طرف رداء ه فبصق فيه ثم رد بعضه على بعض ..." (بخاری، کتاب الصلوٰة، باب حک البزاق بالید من المسجد وغیرہ)

- حضرت علیؓ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی شکایت کی کہ انھوں نے ان کی اونٹنی

ذبح کر لی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی چادر منگوائی اور حضرات علی بن ابی طالب اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ عمِ مکرم کے گھر تشریف لے گئے: "فدعا النبی ﷺ بردائه ..."

(بخاری، کتاب اللباس، باب الاردية)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ مسجدِ نبوی میں حبشیوں کی سپہ گری دیکھنے کی مشتاق ہوئیں تو ان کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے اپنی چادر سے ان کا ستر کر کے ان کو تماشا دکھایا: "رایت النبی ﷺ یسترنی بردائه" (بخاری، کتاب النکاح، باب نظر المرأة الی الحبش الخ)

نمازِ استسقاء میں دو رکعات پڑھانے کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی چادر کی تحویل کی یعنی اس کے دونوں کنارے اِدھر سے اُدھر کر دیے اور آپ ﷺ کا یہ عملِ تحویل سنت بن گیا: "وحوّل ردائه" (بخاری/ترمذی، باب فی صلاة الاستسقاء)

- نمازِ عصر میں ایک بار صرف تین رکعات پر بھول سے سلام پھیر دیا۔ حضرت ذوالیدینؓ کے استفسار پر خاصے غضبناک گھر سے وارد ہوئے کہ آپ ﷺ کی چادر گھسٹتی آ رہی تھی اور پھر سجدۂ سہو کر کے نماز کی تکمیل کی: "...فخرج مغضبا یجر ردائه"

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب السهو فی سجدتین)

- ایک اعرابی صحابیؓ کو خاصا غصہ آ گیا اور انھوں نے آپ ﷺ کی چادر پکڑ کر دو اونٹوں کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ چادرِ نبوی خاصی کھردری تھی: "وکان رداء خشنا"۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنستے ہوئے ان کا مطالبہ پورا کر دیا اور ان کو کسی قسم کی سرزنش نہ کی۔

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب الحلم واخلاق النبی ﷺ)

حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ حاضر خدمت ہوئے تو ان کے اعزاز میں اپنی چادر بچھا دی۔

(اسد الغابہ، ۳/ ۱۸۸)

- سورج گرہن کے موقعہ پر رسولِ اکرم ﷺ نے بعجلتِ تمام مسجد میں جانا چاہا تو اپنی ردائے مبارک لے جانے کی بجائے اہل بیت کا کوئی دوسرا کپڑا اٹھا لے گئے: "فاخذ درعا حتی ادرک بردائه" بہر حال بعد میں وہ چادر لائی گئی۔

(مسلم، کتاب الکسوف، باب ماعرض علی النبی ﷺ فی صلاة الکسوف)

- حجۃ الوداع میں رسولِ اکرم ﷺ نے جب احرام باندھا تھا تو اس میں ازار کے ساتھ رداء شامل تھی: "ولبس ازاره ورداءه..." (بخاری، کتاب الحج، باب مایلبس المحرم الخ)

- جنت البقیع کو شب میں جانے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بعض ملبوسات اور ان کے رکھنے اور پہننے کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ ذکر ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ میری باری پر میرے گھر میں شب کو قیام فرماتھے۔ آپ ﷺ نے اپنی چادرِ مبارک اتار کر رکھی اور دونوں جوتے اتارے اور ان کو اپنے پیروں کے پاس رکھا اور اپنے ازار کا ایک کونہ اپنے بستر پر پھیلالیا اور لیٹ گئے۔ جب آپ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ میں سوگئی ہوں تو دھیرے سے اپنی چادر لی اور بہت آہستگی سے اپنے جوتے پہنے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر نکل گئے۔ میں نے بھی اپنی گھریلو قمیص (درع) اپنے سر پر رکھی اور چہرہ چھپالیا اور ازار کو خوب سمیٹا اور آپ ﷺ کے پیچھے چل پڑی...

"... لما كانت ليلتي التي كان النبي ﷺ فيها عندي، انقلب فوضع رداءه، وخلع نعليه فوضعهما عند رجليه، وبسط طرف ازاره على فراشه فاضطجع، فلم يلبث الا ريثما ظن اني قد رقدت، فاخذ رداءه رويدا، وانتعل رويدا، وفتح الباب فخرج ثم اجافه رويدا، فجعلت درعي في راسي، واختمرت، وتقنعت ازاري، ثم انطلقت على اثره ...".

(مسلم، کتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخل القبر الخ؛ نسائی، کتاب عشرة النساء، باب الغيرة)

- چادرِ نبوی کا ایک بڑا محبت آمیز واقعہ غزوۂ حنین سے متعلق ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی رضاعی بہن حضرت شیماء بنت حلیمہ سعدیہؓ اسی میدانِ جنگ کے قریب حاضرِ خدمت ہوئیں تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرطِ محبت سے اپنی ردائے مبارک ان کے لئے بچھادی کہ اس پر تشریف رکھیں: "فلما جاءت الشيماء اخت النبي ﷺ من الرضاعة بسط لها رداءه فاجلسها عليه..." (بلاذری، ۱/۹۳)

رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے ایک اور مکرم صحابی کے لئے اپنی چادر بچھادی تھی کہ وہ اس پر بیٹھیں مگر صحابی موصوف نے ردائے مبارک سمیٹ دی اور رو پڑے کہ میرے قدم اس مبارک

چادر پر پڑیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے جذبۂ محبت اور فرطِ عقیدت کی تحسین فرمائی تھی۔ یہ غالباً حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کا ذکر ہے جس کا حوالہ اوپر آ چکا۔

ردائے صحابہ کرام

''برد'' اور ''رداء'' جب مترادف الفاظ یا یکساں لباس کے نام تھے تو وہ صحابہ کرام کے لباس/ملبوسات میں بھی از خود شامل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ برد کے استعمالِ صحابہ پر کافی روایات ذکر کی جا چکی ہیں۔ بہرحال ''رداء'' کے عنوان یا نام سے بھی ان کے لباسِ خاص کی کئی روایات و احادیث ملتی ہیں لہٰذا ان کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

- حضرت عمر فاروقؓ اسلام لانے کے لئے جب دارارقم پہونچے تو رسولِ اکرم ﷺ نے ردائے فاروقی پکڑ کر سوالات فرمائے تھے۔ (ابن ہشام، ۱/۳۴۶)

- حضرت علی بن ابی طالبؓ کی کنیت ابوتراب کی وجہ چادر کی ہی بیوفائی تھی۔ حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ سے کچھ خفگی ہوئی تو جا کر مسجد میں لیٹ رہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کو خبر ہوئی تو مسجد تشریف لائے۔ دیکھا کہ حضرت علیؓ کی چادر ان کی پیٹھ سے سرک گئی ہے اور ان کی پیٹھ میں خاک لگ گئی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی پیٹھ سے مٹی صاف کرنی شروع کی اور فرمایا: ''ابوتراب اب اٹھ بیٹھو:...'' ''دخل عليّ على فاطمة ثم خرج فاضطجع في المسجد... فخرج اليه فوجد ردائه قد سقط عن ظهره وخلص التراب الى ظهره، فجعل يمسح التراب من ظهره فيقول: "اجلس يا ابا تراب" مرتين" (بخاری، مناقب علی بن ابی طالب)

- حضرت ابوہریرہؓ کا واقعہ بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے خدمتِ اقدس میں شکایت کی کہ بہت سی احادیث سنتا ہوں مگر یاد نہیں رہتیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو اپنی چادر (رداء) پھیلانے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے اس میں پڑھ کر پھونک دیا اور صحابی جلیل نے چادر سمیٹ لی اور پھر کبھی ان کو کوئی حدیث نہیں بھولی: ''... قال ﷺ: ابسط رداءک فبسطته، .. فغرف بيديه، ثم قال: ضمه فضممته فما نسيت شيئا بعده''

(بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم؛ کتاب بدء الخلق، علامات النبوة)

- ہجرتِ مدینہ کے معاً بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بنو عمرو بن عوف میں اترے تو لوگ آپ ﷺ کو پہچان نہیں پا رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کے سرِ مبارک پر اپنی چادر سے سایہ کر دیا تو لوگوں نے آپ ﷺ کو پہچانا: "...فاقبل ابوبکر حتی ظلل علیہ بردائہ، فعرف الناس رسول اللہ ﷺ عند ذلک..." (بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ... الخ)

- حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اسلام لانے کی خبر جمیل بن معمر جمحی کو دی تو وہ تیزی میں اپنی چادر گھسیٹتا نکلا اور حضرت عمر نے اس کا پیچھا کیا۔ (ابن ہشام، ۱/۳۴۹؛ اسد الغابہ، ۳/ ۲۲۷)

- حضرت عمر فاروقؓ نے اذانِ بلالؓ پہلی بار سنی تو اپنے گھر سے چادر گھسیٹتے ہوئے برآمد ہوئے۔ (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب کیف الاذان؛ اسد الغابہ، ۳/۱۶۶)

- حضرت عمر فاروقؓ کو جب اپنی زوجہ محترمہ سے معلوم ہوا کہ ازواجِ مطہرات میں حضرت حفصہؓ بھی رسولِ اکرم ﷺ کو جواب دیتی ہیں تو ان کو سخت غصہ آیا اور اپنی چادر اسی وقت لی اور حضرت حفصہؓ کو جا کر نصیحت کی: "... فقام عمر فاخذ رداءہ مکانہ حتی دخل علی حفصۃ ..."

(بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ التحریم وغیرہ؛ حضرت عمرؓ نے اپنی رداء کا ایک بار عمامہ بھی بنالیا تھا: اسد الغابہ، ۴/ ۷۱-۷۵)

- رسولِ اکرم ﷺ حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے تو مجلس عبداللہ بن ابی بن سلول سے گذر ہوا۔ اس ظالم اور امام المنافقین نے سواری کی وجہ سے اٹھتی گرد سے اپنی ناک اپنی چادر سے ڈھانک لی حالانکہ اس گرد سے چہرہ کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں ہی اس کی سعادت تھی۔

(بخاری، کتاب الطب، باب عیادۃ المریض الخ؛ وغیرہ متعدد ابواب و کتبِ بخاری)

- ایک صحابی حضرت محلم بن جثامہ لیثیؓ نے دیت کی ادائیگی کے باوجود قاتل کو قتل کر دیا۔ بعد میں پچھتائے اور خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اتنا روئے کہ ان کے آنسوان کی چادر کے کنارے پر بہنے لگے۔ (ابوداؤد، کتاب الدیات، باب الامام یامر بالعفو فی الدم)

- ایک صحابیؓ کی چادر کو ہوا - تیز ہوا - اڑا لے گئی تو انھوں نے ہوا کو کوسنا شروع کیا مگر

آپ ﷺ نے ان کو لعن طعن سے منع فرمایا۔

- اسی طرح حضرت عائشہؓ کی ایک چادر (برد) چوری ہوگئی تھی۔ اس پر بھی لعن طعن سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی اللعن، باب فیمن دعا علی ظالم، بالترتیب)

- حضرت جابر بن عبداللہؓ نے ازار میں نماز کے ہو جانے کے مسئلہ کو عملی طور سے بتانے کے لئے اپنے تمام دیگر ملبوسات کو ایک تپائی پر رکھ دیا تھا۔ ان میں ان کی چادر بھی تھی: "رداءہ الی جنبہ"

(مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ اور ابوداؤد، کتاب المناسک، باب صفة حجة النبی ﷺ)

- حضرت محمد بن اسلم بن بجرۃؓ کی چادر (رداء) کا ذکر بھی ملتا ہے۔ (اسد الغابہ، ۴/۳۱۰)

- حضرت عوف بن مالکؓ نے اپنے مقتول دشمن کا سلب مانگتے حضرت خالد بن ولید مخزومیؓ کی چادر پکڑ کر کھینچ لی۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عوف کو سرزنش کی اور اپنے امراء کی تعظیم کرنے کا حکم دیا۔ (مسلم، کتاب الجهاد و السیر، باب استحقاق القاتل سلب القتیل)

- حضرت عبداللہ بن عمرو نجاریؓ کی رداء ریشمی تھی: "خز اغبر"

(اسد الغابہ، ۳/۲۳۵؛ نیز رداء لی من لبی بھی ۳/۴۶۰)

- حضرت عمرؓ نے حضرت ہشام بن حکیم اسدیؓ کو سورۂ فرقان کی دوسری قراءت کرتے دیکھا تو ان کی چادر پکڑ کر خدمت نبوی میں لائے تھے "... ثم لببته بردائه فجئت به رسول الله ﷺ ..." (بخاری، کتاب الخصومات، باب کلام الخصوم بعضهم علی بعض)

- اصاغرِ صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن اسود کی چادروں کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت اصحابِ صفہ کی ناداری اتنی تھی کہ ان کے پاس یا تو ازار ہوتی یا اور کوئی کپڑا مگر ان کو رداء (چادر) نصیب نہ تھی: "قال (ابوهریرة): "رأیت سبعین من اصحاب الصفة ما منهم رجل علیه رداء، اما ازارٌ واما کساء، قد ربطوا فی اعناقهم..."

(مسلم، کتاب الصیام، باب ای یوم الصیام فی عاشوراء؛ بخاری، کتاب الادب، باب الهجرة بالترتیب؛ اہل صفہ کے لئے: بخاری، کتاب الصلوٰة، باب نوم الرجال فی المسجد)

خمیصہ

عہد نبوی کے ملبوسات میں ایک لباس کا نام ''خمیصہ'' تھا جس کی جمع ''خمائص'' ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ بھی بالعموم چادر کیا جاتا ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب اللباس میں ایک باب کا عنوان ہی باندھا ہے:''باب الاکسیة والخمائص'' (فتح الباری،۱۰/ ۳۴۱ومابعد)۔ حافظ ابن حجرؒ نے خمیصہ کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ سیاہ اون یا خز کا چوکھونٹا لباس ہوتا ہے جس میں نقش ونگار (اعلام) ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی لباس میں نقش ونگار (علم) نہ ہوں تو اسے خمیصہ نہیں کہا جاتا: ''... وهي كساء من صوف او خز مربعة لها اعلام، ولايسمى الكساء خميصة الا ان كان لها علم'' (۱۰/ ۳۴۲)۔ باب الخميصة السوداء میں امام اصمعی کی بیان کردہ تعریف لکھی ہے کہ وہ ریشم یا اون کے منقش کپڑے ہوتے ہیں جو کالے ہوتے ہیں جب کہ امام ابوعبید کا خیال ہے کہ وہ مربع لباس ہوتا ہے جس کے دو نقش ہوتے ہیں: مربع لـه علمان؛ مصباح اللغات: میں خمیصہ کا ذکر نہیں البتہ خمیلہ کا ہے جس کے معنی چادر لکھے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو معنی ''چادر'' کافی نہیں ہیں۔ خمیصہ ابن حجر عسقلانیؒ کی تعریف کے مطابق وہ اونی یا ریشمی کپڑا ہوتا ہے جس میں نقش ونگار ہوتے ہیں۔ صاحب مصباح اللغات نے الخز کے دو معنی بتائے ہیں: ایک ''ریشم''، دوسرا ''ریشم اور اون کا بنا ہوا کپڑا'' یعنی مخلوط لباس ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے جس میں بیک وقت ریشم اور اون دونوں کے دھاگوں کا اختلاط کیا گیا ہو مگر ابن حجرؒ کی تعریف میں وہ یا تو اون کا ہوتا ہے یا ریشم کا۔''

خمیصۂ نبوی: کا ذکر متعدد روایات واحادیث میں ملتا ہے۔ ان کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور لباس مذکور کے حوالے سے ہی کیا جاتا ہے۔ امام بخاریؒ نے مذکورہ بالا ''باب الاکسیة والخمائص'' کے علاوہ ایک دوسرا باب ''الخميصة السوداء'' کے عنوان سے بھی باندھا ہے۔ جو ان کے تراجم ابواب میں رنگوں کی حکمت یا رنگین کپڑوں کے پہننے کے جواز کی حکمت کو بھی بتاتا ہے:

- ایک بہت مشہور خمیصۂ نبوی وہ تھا جو آپ ﷺ کو حضرت ابوجہمؓ نے بطور ہدیہ دیا تھا۔

اس کا مفصل ذکر ہدایا کے باب میں بھی آئے گا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ام خالد بنت خالد امویؓ کو بھی ایک خمیصہ دیا تھا اس کا بھی ذکر اسی مقام پر آئے گا کیونکہ یہ دونوں ہدایا کے باب کے حصے ہیں، البتہ موخر الذکر کے بارے میں یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاہ رنگ کی چھوٹی چادر تھی: ''خميصة سوداء صغيرة'' اور اسے آپ ﷺ نے پہنا نہیں تھا۔

- رسولِ اکرم ﷺ کی آخری بیماری کے حوالے سے آپ کے خمیصہ کے دو تین حوالے آتے ہیں۔ آخری مجلسِ انصار میں تشریف آوری اور انصار کے حق میں بہتر سلوک کرنے کی وصیت وخطبہ کے ذکر میں آتا ہے کہ اپنے سرِ مبارک کو ایک ''خمیصہ'' سے ہی باندھے ہوئے تھے۔ یہی منقش اونی یا ریشمی چادر تھی۔ (بخاری، كتاب الجمعة، باب من قال في الخطبة بعد الثناء اما بعد؛ فتح الباری، ۲/ ۵۱۷-۵۲۱: ''ملحفة على منكبيه'' کی ترکیب ہے) بعض شارحین نے اس سے خمیصہ مراد لیا ہے جس کا ذکر اگلی حدیث مرض الوفاۃ میں ہے۔ اس کا بہر حال ذکر ''ملحفہ'' میں بھی آتا ہے۔

- شدتِ مرض میں رسولِ اکرم ﷺ اپنی منقش چادر کو کبھی چہرہ انور پر ڈال لیتے تھے اور آرام آتا تو اسے ہٹا دیتے تھے: ''لما نزل برسول الله ﷺ طفق يطرح خميصة له على وجهه، فاذا اغتم بها كشفها عن وجهه...''

(بخاری، كتاب الصلوٰة، باب؛ كتاب اللباس، باب الاكسية والخمائص؛ مسلم، كتاب المساجد الخ؛ باب النهي من بناء المساجد على القبور نیز دوسرے ابواب وکتب بخاری ومسلم ودیگر کتب حدیث؛ فتح الباری کے متعلقہ مباحث)

- حضرت ام سلیم کے یہاں ولادت ہوئی تو انھوں نے نومولود کو رسولِ اکرم ﷺ سے تحنیک کرانے کے لئے حضرت انسؓ کے ساتھ بھیجا۔ حضرت انسؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو ایک باغ میں پایا اور آپ ﷺ کے جسم اطہر پر ایک حریثی خمیصہ (منقش چادر) تھی: ''فغدوت به فاذا هو في حائط وعليه خميصة حريثية...'' (بخاری، كتاب اللباس، باب الخميصة السوداء؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۴۴-۳۴۷)۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تشریح حدیث میں اس منقش چادر کی نسبت کے بارے میں متعدد اختلافات کا ذکر دیگر کتب حدیث سے کیا ہے۔ وہ حریثیہ اس لئے

کہلاتی تھی کہ اس کا بنانے والا (صانع) بنو قضاعہ کا ایک نامی گرامی شخص حریث تھا اور اس کا رنگ سیاہ تھا۔ دوسری نسبتوں میں جونیہ، خیبریہ، حوتیہ، حوتکیہ وغیرہ بھی آیا ہے اور ان کی تشریح بھی کی گئی ہے (نیز مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب جواز وسم الحیوان: "خمیصة حويتية" ہے)۔ ان تشریحات میں حریثیہ کی نسبت اس کے صانع کی طرف ہے اور خیبریہ کی مقام خیبر کی جانب۔ جونیہ کے بارے میں دو خیال ہیں کہ وہ بنوالجون کی طرف منسوب ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اس رنگ کی نسبت ہے کہ عرب سرخ، سیاہ یا سفید میں ہر ایک کو جونیہ کہتے تھے۔ دوسری تشریحات و تفسیرات بھی ہیں۔ بہر حال حدیث بخاری میں وہ حریثیہ ہے۔

- ایک نمازِ استسقاء میں رسولِ اکرم ﷺ کے جسمِ اطہر پر ایک سیاہ منقش چادر تھی جس کی تحویل میں آپ ﷺ کو دقت ہوئی تھی: "...استسقیٰ رسول اللہ ﷺ وعلیہ خمیصة سوداء..." (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ ابواب صلاۃ الاستسقاء الخ)

ان تمام تشریحات و تفسیرات سے چند اہم نکات ابھرتے ہیں:

- "خمیصہ" ایک چوکھونٹا (مربع) لباس / چادر / کساء ہوتا تھا۔ جس میں رنگ برنگی نقش (اعلام) ہوتے تھے جو دو بھی ہوسکتے تھے اور اس سے زیادہ بھی۔ وہ سیاہ، لال، سفید کے علاوہ ہرے بھی ہوسکتے تھے۔

- خمیصہ نبوی کا ذکر اس کے رنگ کے لحاظ سے آیا ہے۔ اس میں بالعموم سیاہ منقش چادر ہی کا مفہوم ہے۔

- مختلف روایات میں دوسری نسبتوں سے یہ خیال گذرتا ہے کہ وہ مختلف واقعات کے مختلف خمائص بھی ہوسکتے تھے: جیسے خمیصہ حریثیہ، خمیصہ جونیہ، خمیصہ خیبریہ، اور خمیصہ حوتکیہ وغیرہ۔ ان سب کو ایک متعین خمیصہ سمجھنے پر اصرار کرنا ناقابل فہم ہے۔ البتہ صرف ایک مخصوص واقعہ میں ایک خمیصہ کے دو مختلف ناموں کا معاملہ روایت کا فرق ہوسکتا ہے جیسے تحنیک کے واقعہ میں مسلم میں لفظ / نسبت "حوتیۃ" ہے۔

- ان خمائص میں بعض کی نسبت ان کے کاریگروں / صانعوں کی طرف ہوتی تھی جیسے خمیصہ حریثیہ۔

بعض کا نام ان کے علاقہ و مرکزِ پارچہ بافی کی طرف منسوب ہونے کا اظہار کرتا ہے جیسے خیبریہ وغیرہ۔ اور بعض کا رنگوں کی طرف جیسے جونیہ، اس میں واضح نسبتِ لون سوداء (سیاہ) ہے۔

خمیصۂ صحابہ کرام

خمیصۂ نبوی کی مانند حضرات صحابہ و صحابیات کے خمائص (منقش چادروں) کا بھی ذکر آتا ہے کہ وہ دونوں کا مشترکہ لباس ہونے کے علاوہ اس زمانے کا ایک مخصوص اور پسندیدہ و مروج لباس تھا اور اہلِ استطاعت اس کو پہنا کرتے تھے۔ ان کا ایک مختصر تذکرہ درج ہے:

- ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک منقش چادر میں لیٹی تھی کہ ماہانہ اذیت کا دور شروع ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر اپنے ماہواری کے کپڑے پہنے اور پھر رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے بلانے پر چادر (خمیلہ) میں لیٹ گئی: "بينا انا مع النبي ﷺ مضطجعة في خميصة ... فاخذت ثياب حيضتي ... فدعاني فاضطجعت معه في الخميلة"

(بخاری، كتاب الحيض، باب من سمّى النفاس حيضا؛ النوم مع الحائض وهي في ثيابها، من اخذ ثياب الحيض سوىٰ ثياب الطهر وغیرہ؛ مسلم، نسائی، كتاب الطهارة، مصاحبة الحائض وغیرہ)

اس حدیث نبوی میں دو طرح کے کپڑوں کا ذکر ہے: ایک حضرت ام سلمہؓ کی منقش چادر (خمیصہ) تھی جو وہ پہنے ہوئے تھیں اور دوسری چادر (خمیلہ) تھی جس میں وہ بعد میں آ کر رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ لیٹ گئیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے دونوں کو ایک لباس بتانے کی کوشش کی ہے۔ اس پر مختصر بحث خمیلہ کے باب میں آ رہی ہے۔ (فتح الباری، ۱/۵۲۳ و مابعد)

- حضرت ابو سلمہؓ حضرت ابو سعید خدریؓ کے دوست تھے۔ دونوں لیلۃ القدر میں ایک باغ میں جب گئے تو حضرت ابو سعید خدریؓ کے جسم پر ایک منقش چادر تھی: "... فخرج وعليه خميصة" (مسلم، كتاب الصيام، باب فضل ليلة القدر، حدیث: ۲۱۶ ...)

- حضرت صفوان بن امیہؓ کی جس قیمتی چادر کی چوری ہو جانے کا ذکر ہے اس کو بعض روایات میں منقش چادر (خمیصہ) کہا گیا ہے۔

(مسلم، کتاب مذکورہ بالا؛ نسائی، كتاب قطع السارق، مايكون حرزا ومالايكون ......)

- ایک عام حدیثِ تذکیر میں رسولِ اکرم ﷺ نے ''دینار و درہم اور قطیفہ و خمیصہ کے بندوں'' کی ہلاکت و بربادی کا اظہار فرمایا کہ اگر ان کو کچھ دے دیا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور نہ دیا جائے تو راضی نہیں ہوتے: "تعس عبدالدینار والدرھم والقطیفة والخمیصة" (بخاری، کتاب الرقاق، باب مایتقیٰ من المال)

خمیلہ

حضرت ام سلمہ ام المومنینؓ کی حدیث میں دو الفاظ دو لباسوں کے لئے آئے ہیں۔ ایک خمیصہ جس میں حضرت ام المومنینؓ لیٹی تھیں پھر جب ان کی ماہانہ اذیت شروع ہوئی تو وہ اس میں سے نکل گئیں اور اپنے حیض کے کپڑے پہن لئے اور بعد میں رسولِ اکرم ﷺ کے حکم پر آپ ﷺ کے ساتھ خمیلہ میں لیٹ گئیں۔ حدیث بخاری: ۲۹۸ کے تین اطراف ہیں: ۳۲۲، ۳۲۳ اور ۱۹۲۹۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی تشریح میں مختلف اماموں کی تعریفات دی ہیں۔ ان میں سے خمیصہ کی تعریف اوپر گذر چکی۔ حافظ موصوف کا مزید بیان یہ ہے کہ صرف اس روایت میں لفظ خمیصہ آیا ہے۔

اصحاب یحییٰ اور اصحابِ ہشام سب کے مطابق تمام روایات میں خمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے جو آخر حدیث کے مطابق و موافق ہے کہ ان کے بعد میں صحبت نبوی میں لیٹنے کے لباس کو خمیلہ ہی کہا گیا ہے۔ خمیلہ کے بارے میں خاصا اختلاف ہے: ''مجروح اقوال (قیل) سے بیان کئے گئے ہیں: ۱- خمیلہ قطیفہ ہے: "الخمیلة القطیفة"، ۲- خمیلہ طنفسہ ہے: "قیل الطنفسة"۔ امامِ لغت خلیل کا قول ہے کہ خمیلہ وہ کپڑا ہوتا ہے جس میں خمل (رواں) یعنی جھور (ھدب) ہوتا ہے: "...الخمیلة ثوب له خمل ای ھدب - اس بنا پر امام ابن حجر نے خمیصہ اور خمیلہ کو ایک ہی کپڑا تسلیم کیا ہے کہ دونوں ایک سیاہ لباس ہوتے ہیں جن کے جھور ہوتے ہیں: "وعلیٰ ھذا لامنافاة بین الخمیصة والخمیلة فکانھا کانت کساء اسود لھا اھداب"۔ صاحبِ مصباح اللغات کی تشریحاتِ ''خمل وھدب'' سے اس کی نوعیت اجاگر نہیں ہوتی کہ وہ رواں دار تھے یا جھور والے۔ اگلی بحث قطیفہ کے بارے میں ہے۔ اس میں خمیلہ، خمیصہ اور قطیفہ تینوں کو

مترادفات قرار دینے کی مساعی ائمہ و شارحین نقل کی گئی ہے۔ لیکن ان کے الگ الگ نام اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ تینوں الگ الگ لباس تھے۔

قطیفہ

ایک لباس کا نام ہے۔ ابن حجرؒ نے صرف اتنی تشریح کی ہے: "والقطیفة كساء"۔ اس کے بنانے کی جگہ کی طرف نسبت کر کے اس کو روایات میں "قطیفة فدكية" کہا گیا ہے۔ فدک خیبر کے قریب ایک یہودی بستی تھی جہاں وہ لباس بنایا جاتا تھا۔ اس کے عام استعمال کا ذکر کئی احادیث و روایات میں آتا ہے۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چادر کی ایک قسم تھی جسے اوڑھا جاسکتا تھا۔ صاحب مصباح اللغات نے اسے جھوردار چادر بتایا ہے جس کی دو جمع ہیں: ایک قُطف اور دوسری "قطائف"۔ موخر الذکر کے بارے میں ایک دلچسپ یہ وضاحت کی ہے کہ "القطائف": "ایک قسم کا کھانا جو آٹے سے تیار کیا جاتا ہے اور وہ چونکہ جھوردار ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو قطائف کہتے ہیں۔" خمیلہ کے باب/ بحث میں یہ بات گذر چکی کہ ایک قول میں خمیلہ بھی قطیفہ ہے۔ اس طرح تین مترادفات ایک قسم کے کپڑے کے لئے ہیں۔

قطیفۂ نبوی

ہجرتِ مدینہ کے معاً بعد رسولِ اکرم ﷺ حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کی عیادت کو تشریف لے گئے تو جسم اطہر پر ایک "قطیفه فدکیه" تھا۔ بعض محدثین و شارحین کرام نے اسے سواری کے جانور پر ڈالا جانے والا گدا قسم کا لباس سمجھا ہے۔ احادیثِ بخاری میں بالعموم گدھے پر سوار ہونے اور اس پر قطیفہ فدکیہ ہونے کا جملہ ہے: "ركب على حمار عليه قطيفة فدكية ..." حدیث: ۶۲۰۷۔ لیکن وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری روایات و احادیث سے اس کے ایک انسانی لباس ہونے کا پکا ثبوت ملتا ہے۔ دوسری احادیث بخاری وغیرہ میں قطیفہ فدکیہ/ غیر فدکیہ کو رسولِ اکرم ﷺ اور بعض صحابہ کرام کے جسموں کا لباس/ لبادہ بیان کیا گیا ہے۔

(بخاری، کتاب الجہاد، باب الردف علی الحمار؛ کتاب الطب، باب عیادۃ المریض؛ فتح الباری، ۱۵۹/۶ و مابعد؛

۱۰/۱۵۱-۱۵۲؛ مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فی دعاء النبی ﷺ؛ ابن اسحاق/ابن ہشام، ۳/۴۲۲-۴۲۳: قطیفة فدکیة مختطمة بحبل من لیف وغیرہ دوسری کتب حدیث وابواب: حدیث بخاری: ۲۹۸۷ کے چار اطراف ہیں: ۴۵۶۶، ۵۶۶۳، ۵۶۶۴، ۶۲۰۷: اولین حدیث کا متن ہے: "ان رسول الله ﷺ رکب علی حمار علی اکاف علیه قطیفة..." دوسری/تیسری میں ہے: "علی اکاف علیه قطیفة فدکیة..."

- روایات تفسیر و حدیث کے مطابق غزوۂ بدر کے دن ایک سرخ قطیفہ کھو گئی، لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید نبی اکرم ﷺ نے لے لی ہو۔ اس خیال خام پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ: "وما کان لنبی ان یغل الخ: (آل عمران-۱۶۱): اور نبی کا کام نہیں کہ کچھ چھپا رکھے" نازل فرمائی: عن ابن عباس: نزلت هذه الآیة... فی قطیفة حمراء افتقدت یوم بدر، فقال بعض الناس: لعل رسول الله ﷺ اخذها".

(ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورہ آل عمران؛ ابوداؤد، کتاب الحروف: القراءات)

- بعض روایات کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے عرفات میں کسی موقعہ پر قطیفہ جولانیہ زیب تن فرما رکھی تھی۔ (اسد الغابہ، ۱/۱۸۶)

- کئی احادیث میں ایک سرخ قطیفہ کے رسولِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک میں آپ ﷺ کے نیچے بچھائے جانے کا ذکر ملتا ہے: عن ابن عباس: "جعل فی قبر رسول الله قطیفةٌ حمراء" (مسلم، کتاب الجنائز، باب جعل القطیفة فی القبر؛ ترمذی، ابواب الجنائز، باب ماجاء فی الثوب الواحد الخ: ... طرحت القطیفة تحت رسول الله ﷺ فی القبر؛ دوسری حدیث مانندِ مسلم)

ان تمام روایاتِ سیرت و حدیث سے ثابت ہوتا کہ وہ ایک چادر ہوتی تھی جسے لباس کی طرح بدن پر ڈالا جاتا تھا۔ اور اسے بوقت ضرورت چادر کی طرح اوڑھا بھی جاتا تھا جیسا کہ صحابہ کرام بالخصوص حضرات زید بن حارثہ اور اسامہ بن زیدؓ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

قطیفہ صحابہ کرام

بعض اکابرِ صحابہؓ کے "قطیفہ فدکیہ" کے استعمال کا ذکر احادیث و روایات سیرت میں بہت تواتر سے ملتا ہے:

- حضرت ابوبکر صدیقؓ غزوۂ ذات السلاسل میں ایک فدکی عبا پہنے ہوئے تھے (عباءۃ فدکیۃ)۔ اس سے مراد شاید قطیفہ ہے (واقدی، ۲،۷۷۲: مگر اس کا امکان ہے کہ عباءۃ دوسری شے ہے۔ بہرحال ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے)

- حضرات زید بن حارثہ کلبیؓ اور ان کے فرزندِ گرامی اسامہ دونوں ایک قطیفہ اوڑھے ہوئے اس طرح محوِ خواب تھے کہ ان کے سر ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے پیر کھلے ہوئے تھے۔ مشہور قیافہ شناس مجزز مدلجیؓ نے ان کے پیروں کو دیکھ کر کہا کہ وہ مشابہ ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے یہ پورا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آ کر بخوشی بیان فرمایا کیونکہ دونوں صحابہ کی رنگت کے سبب بعض شبہات کا اظہار ہوا تھا۔ وجہ حافظ ابن حجرؒ نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت اسامہ کا رنگ شاید ان کی ماں حضرت ام ایمن حبشیہؓ کی وجہ سے سانولا تھا۔ مگر یہ ضروری نہیں، کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ "...فقال: یا عائشہ! الم تری ان مجززا المدلجی دخل فرأی اسامۃ وزیدا وعلیھما قطیفۃ قد غطّیا رؤوسھا وبدت اقدامھما، فقال: ان ھذہ الاقدام بعضھا من بعض"

(بخاری، کتاب الفرائض، باب القائف؛ فتح الباری، ۱۲/ ۶۸-۷۰: ۶۷۷۱ حدیث؛ مسلم، کتاب الرضاع، بابُ العمل بالحاق القائف الولد؛ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی القافۃ)

بہرحال ان تمام روایات میں قطیفہ کو ایک انسانی لباس بتایا گیا ہے جسے بالائی بدن پر بطور چادرِ زینت بھی استعمال کیا جاتا تھا اور سونے یا لیٹنے کے وقت اسے چادر کی طرح اوڑھ بھی لیا جاتا تھا جیسا کہ ان دونوں صحابہ کرام کے بارے میں واضح ہوتا ہے اور یہی صورت آخری واقعہ میں بھی معلوم ہوتی ہے۔

- حضرت ام ورقہ بنت نوفلؓ کو رسولِ اکرم ﷺ نے "الشہیدہ" کا خطاب عطا فرمایا تھا کیونکہ انھوں نے غزوہ بدر میں جانے، مریضوں کی خدمت کرنے کی درخواست کی تھی اور شاید اللہ تعالیٰ ان کو شہادت نصیب فرمادے۔ آپ ﷺ نے ان کو گھر ہی میں رہنے کا حکم دیا مگر شہادت کی بشارت دے دی۔ ان کے دو پروردہ غلام و باندی نے بعد کے زمانے میں ان کی قطیفہ سے ان کو دبا کر مار ڈالا۔ یہ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ بہرحال ان دونوں قاتلوں

کو پھانسی پر چڑھادیا گیا اور حضرت ام ورقہ شہیدِ قطیفہ بن گئیں۔

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء کی دو احادیث: ۵۹۱-۵۹۲۔ شارحین نے اس سے مراد چادر ہی لی ہے)

شملہ/ چادر

صاحب مصباح اللغات نے شملہ/ جمع شملات کو بھی ایک قسم کی چادر ہی بتایا ہے اگر چہ اس کی تعریف میں یہ وضاحت خاص بھی ہے کہ وہ جسم کو "ڈھانکنے والی چادر" ہوتی تھی اور شاید لمبی اور طویل ہوتی تھی۔ حدیث بخاری: ۱۲۷۷ وغیرہ میں بردہ کی تعریف شملہ سے کی گئی ہے جو زیادہ معروف تھی۔ ہدایائے لباس میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس چادر کے دو تین حوالے روایات سیرت وحدیث میں ملے ہیں جو اسے قطیفہ، خمیلہ، خمیصہ اور بردہ ورداء کی قبیل سے ثابت کرتے ہیں۔ ان روایات سیرت میں سے ایک میں اسے شملہ نبوی بتایا گیا ہے اور دوسری حدیث میں بھی وہ شملہ نبوی ہی قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں کا ذکر ان کے متون وحواشی اور تشریحات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(بخاری، کتاب الجنائز، باب من استعد للکفن الخ، حدیث: ۱۲۷۷ کے اطراف ہیں: ۲۰۹۳، ۵۸۲۰، ۶۰۳۶؛ فتح الباری، ۳/ ۱۸۳ و مابعد)

شملۂ نبوی

- حضرت جابر بن سلیمؓ کا بیان ہے کہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو رسولِ اکرم ﷺ ایک چادر میں احتباء فرمائے ہوئے تھے اور اس کے جھور آپ ﷺ کے قدمین شریفین پر لٹک رہے تھے: ...وھو محتب بشملة، وقد ھدبھا علیٰ قدمیه

(ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی الھدب؛ حدیث: ۴۰۷۵)

- اسد الغابہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کی شملہ کا رنگ سیاہ تھا: "شملة سوداء"

(۳/ ۲۴۱: نیز فتح الباری، ۱۰/ ۳۴۱: میں اسے یا اس کی ایک قسم کو النمرۃ کہا گیا ہے جو "دھاری دار چادر" ہوتی ہے یا ایسی اون کی چادر جس میں سیاہ وسفید دھاریاں ہوں"

(مصباح اللغات: النمرۃ/ ج نمار......)

- امام بخاری نے ایک باب کا عنوان باندھا ہے:"باب البرود و الحبر و الشملة" اوران تینوں کے تحت ایک ایک حدیث بردہ، حبرہ اور شملہ بیان کی ہے بلکہ حبرہ کی کئی ہیں۔شملہ کی حدیث بخاری: ۵۸۱۰ جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک عورت نے اسے ہدیہ کیا تھا اور صاحب روایت صحابی حضرت سہلؓ نے اس کی یہ تعریف کی تھی کہ شملہ وہ ہوتی ہے جس کے حاشیہ میں بناوٹ ہوتی ہے:"الشملة منسوج فی حاشیتها" ۔اس پر مزید بحث ہدایائے لباس میں آتی ہے۔البتہ حافظ ابن حجر کی مختصر تشریح دی جاتی ہے کہ وہ ان کپڑوں میں سے تھی جو اوڑھی جاتی ہیں:"الشملة ... من الاكسية اى يلتحف" ۔اسے بردہ بھی کہا گیا ہے اور کتاب الجنائز کے باب من استعد للكفن میں اس کی مزید/ سابق تشریح کی ہے (فتح الباری، ۱۰/ ۳۳۹-۳۴۱)۔ حدیث بخاری: ۵۸۱۱ میں حضرت عکاشہ بن محصن اسدیؓ کی چادر کو نمرہ کہا گیا ہے۔وہ بھی شملہ کی ایک قسم تھی جو ایسی رنگین دھاریاں رکھتی تھی گویا کہ چیتے کی کھال سے لی گئی ہیں اور اس کا نام رنگ میں اشتراک کی وجہ سے پڑا:"النمرة .. هی الشملة التی فیها خطوط ملونة كانها اخذت من جلد النمر لاشتراكهما فی اللون." حضرت مصعب بن عمیر کو جس چادر میں کفن دیا گیا تھا اسے بھی ایک روایت میں نمرہ کہا گیا ہے۔

(بخاری، كتاب الرقاق، باب فضل الفقر)

دھاری دار چادریں/نمرۃ، نمار

نمرہ کی جمع نمار ہے اور لغوی معنی ہیں: ایسی کالی پیلی/سفید دھاری دار چادر جو چیتے کی دھاریوں سے مشابہ ہو۔روایات واحادیث میں وہ بالعموم ایک معمولی، سادہ اور غالباً خاصی چھوٹی چادر نظر آتی ہے کہ لباسِ غربت وفقر معلوم ہوتی ہے جیسے حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ غزوۂ احد میں اسی معمولی چادر (نمرہ) میں ملبس تھے اور شہادت کے بعد اسی میں کفنائے گئے تھے۔

(بخاری، كتاب المناقب، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدينة؛ كتاب الرقاق، باب فضل الفقر)

- دوسرے صحابی حضرت عکاشہ بن محصنؓ اسدیؓ تھے جن کی چادر نمرہ تھی۔اس کا مشہور

پس منظر یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت کے ستر ہزار لوگ جنت میں داخل ہوں گے اوران کے چہرے چاند کی مانند چمک رہے ہوں گے۔ حضرت عکاشہؓ نے اپنی نمرہ اپنے اوپر درست کرتے ہوئے عرض کیا کہ یارسول اللہ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں ان میں سے ہو جاؤں۔ آپ ﷺ نے ان کے لئے دعا کی اور دوسرے صحابی انصاری نے بھی یہی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی ان میں سے ہو مگر عکاشہ تم پر سبقت لے گئے۔

(حدیث مسلم: ۳۶۹(...) یہ بلا حساب و کتاب داخلۂ جنت فقر کی بنا پر تھا، عام طور پر دوسرے صحابیؓ کے بارے میں صحیح مفہوم حدیث نہیں بتایا جاتا۔ حضرت عکاشہؓ کے سبقت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اولین جنتیوں میں ہوں گے اور تم ان کے بعد کے لوگوں میں ہو گے۔ یہ بھی حدیث فقر ہے)

شملۂ صحابہ کرام

چادروں کی اقسامِ دیگر کی مانند صحابہ کرام بھی اس کی خاص قسم شملہ پہنتے اوڑھتے تھے۔ وہ عام لباس معلوم ہوتا ہے جس طرح اس کی دوسری اقسام بردہ/ برد، خمیصہ، خمیلہ، رداء وغیرہ عام ملبوساتِ شرفاء تھے۔ وہ بالائی بدن کو ڈھانکنے یا اس کی ستر پوشی کا لباس تھا۔ بالعموم روایات میں بیک وقت صرف ایک شملہ پہننے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن صحابہ کرام میں سے بعض کے پاس دو دو شملہ تھیں جن کو وہ بیک وقت استعمال کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک روایت درج ذیل ہے:

- حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان ہے کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ ﷺ بقیع الغرقد میں ایک جنازے کی مشایعت میں تشریف لائے ہوئے تھے اور صحابہ کرام کے ایک گروہ کے درمیان موجود تھے۔ حضرت سلمان کے بیان کے مطابق ان کے جسم پر اس وقت ان کی دو چادریں تھیں: "وعلیّ شملتان لی"۔ انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو سلام کیا اور پشت مبارک کی طرف گئے تاکہ مہر نبوت کا دیدار کرسکیں جس کی توصیف ان کے "صاحب" نے کی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے میرا ارادہ بھانپ لیا تو اپنی مبارک پشت سے اپنی چادر مبارک (رداءہ) گرادی اور میں نے مہر دیکھ لی۔ (ابن ہشام، ۱/۲۲۰ مبحث اسلام سلمان فارسیؓ)

حضرت عمرو بن سلمہؓ کی چادر (بردہ) حدیث ابی داؤد: ۵۸۵-۵۸۶ کو حدیث: ۵۸۷ میں شملہ کہا گیا ہے۔

مِلحفہ / اوپری بدن کی چادر

صاحب مصباح اللغات نے مِلحفہ کے معنی اوپری بدن کی چادر کے بتائے ہیں جس کی جمع ملاحف ہے۔ اس کا قریبی لغوی تعلق لحاف سے ہے جو رضائی کے معنی میں آتا ہے اور جس کا ذکر مکانات اور اس کے گھریلو اسباب میں آتا ہے۔ اس نوع چادر کا بطور زیب وزینت استعمال روایات واحادیث میں ملتا ہے جسے چادرِ زینت بھی کہا جاسکتا ہے۔ دو ایک روایات میں اس کا سادہ یا عام ذکر آتا ہے مگر بعض روایات میں وہ رنگین چادر کہی گئی ہے۔ جس کے زعفران سے رنگے جانے کا بہت باقاعدہ اظہار کیا جاتا ہے۔ ان روایات کا ان کے سماجی اور تمدنی تناظر میں ذکر ان کے معانی کو اجاگر کردے گا۔

سب سے پہلے ملحفہ نبوی کا ذکر جو پہلے اقسام ملبوسات میں مختصراً آچکا ہے۔ وہ گھریلو چادر کے بطور بیان کی گئی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اس کو اپنی ازواج مطہرات کے گھروں میں پہنا / اوڑھا کرتے تھے۔ وہ ورس نامی گھاس سے رنگی ہوئی تھی۔ مصباح اللغات کے مطابق وہ گھاس تل کے مانند ہوتی ہے اور اس سے رنگائی کا کام لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے رنگ بھی استعمال میں تھے۔ اس کا تمدنی مظہر بہت خوبصورت و دلنشیں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ جب ازواج کے گھروں کا روزانہ بعد عصر دورہ فرماتے تو اس پر پانی چھڑک لیتے تھے اور اس سے بھینی بھینی خوشبو اٹھتی تھی۔ اس تمدنی مظہر پر الگ سے ایک مختصر بحث آتی ہے (بلاذری، ۱/ ۵۰۷) اس میں ورس کے علاوہ زعفران سے بھی رنگے جانے کا ذکر ہے: "مصبوغة بورس او بزعفران..." اس کا مطلب ہے کہ نبوی ملاحف ورس سے رنگے جاتے تھے یا زعفران سے۔ یہ دونوں رنگ عام بھی تھے اور پسندیدہ بھی۔

- حضرت سعد بن عبادہؓ کی ملحفہ کے زعفران سے رنگے جانے کا واضح ذکر ملتا ہے اور وہ اسے بالائی چادر کے بطور پہنتے تھے۔ (اسد الغابہ، ۲/ ۲۸۳)

- حضرت قیس بن سعدؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے تو ہم نے آپ ﷺ کے لئے پانی رکھا۔ آپ ﷺ نے غسل فرمایا: پھر ہم نے آپ ﷺ کی خدمت

میں ایک ورس سے رنگی ہوئی چادر پیش کی جس کو آپ ﷺ نے اپنے کاندھے پر خاص انداز سے ڈال لیا اور میری نگاہ میں اب تک آپ ﷺ کے شانۂ مبارک پر ورس کا اثر نظر آ رہا ہے:"... أتانا رسول الله ﷺ فوضعنا له ماء فاغتسل، ثم اتيناه بملحفة ورسية فاشتمل بها فكاني انظر الى اثر الورس على منكبه" حدیث ابن ماجہ: ۴٦٦: اشتمال کے معنی ہیں: کپڑے کو سارے جسم پر لپیٹنا۔ (مصباح اللغات)

چادر اوڑھنے اور دوسرے تمدنی استعمالات

اگرچہ اس بابِ تمدن کا براہ راست ذکر اسبابِ زیست اور گھریلو سامان کے باب سے ہے، اور اسی میں ان کا ذکر مفصل آتا ہے، تاہم یہاں صرف چند اشارات ان کی طرف بالخصوص ملبوسات کی طرف کئے جاتے ہیں۔ گذشتہ مباحث میں ان میں سے بعض کے اوڑھنے کے سامان کی حیثیت سے بھی ذکر آ چکا ہے لہٰذا صرف مختصر توجہ کرنی ضروری ہے۔ خمیصہ، قطیفہ، رداء، برد وغیرہ جیسے بالائی بدن کے ملبوسات کے بارے میں بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان کو اوڑھا گیا، جیسے حضرات زید بن حارثہ کلبی اور ان کے فرزند گرامی حضرت اسامہؓ دونوں ایک ہی قطیفہ اوڑھے ہوئے سو رہے تھے: ۷۷۱: ٦؛ یا رسولِ اکرم ﷺ اپنی چادر اوڑھے ہوئے استراحت فرماتے یا حضرت خبابؓ کی شکایت کی حدیث بخاری: ۳۸۵۲ میں اسے (چادر کو) تکیہ بنا کر اس پر ٹیک لگانے یا لیٹنے کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت صفوان بن امیہؓ کی چادر کے بھی تکیہ بنانے کا ذکر آ چکا ہے۔ دراصل چادر اور اس کے قبیلے کی تمام انواع کو اوڑھنے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ بلکہ اس سے زیادہ اس کے اور سماجی و تمدنی استعمالات تھے جیسے چادر کے کونے سے چہرہ ڈھانک لیا، گرمی کے وقت یا روشنی سے بچنے کے لئے یا شناخت سے بچنے کی خاطر۔ متعدد روایات میں رسولِ اکرم ﷺ کے "تقنع" کا ذکر ملتا ہے۔ خاص طور سے سفرِ ہجرت کے وقت مکانِ صدیقی پر جاتے وقت، اس چادر سے سر درد کے وقت پیشانی / ماتھے / سر کو بھی کونے سے باندھ لیا جاتا تھا جیسا کہ مرض الوفاۃ میں آپ ﷺ نے کیا تھا۔ دشمنی پر اتر آئے لوگ تو اسی چادر کو گلے کا پھندا بنا دیتے تھے جیسا کہ دشمنانِ اسلام نے مکہ میں بوقتِ طواف آپ ﷺ کے ساتھ کیا تھا۔

منافقین میں سے ایک نجاری منافق رافع بن ودیعہ کو حضرت ابوایوب انصاریؓ نے اسی کی چادر میں لپیٹ کر پیٹا تھا اور مسجد سے نکالا تھا (ابن کثیر، ۲/۳۵۰)، ناراض ساتھی اسی چادر کے ذریعہ گھسیٹ کر اپنی بات منوا سکتے تھے جیسا کہ ایک اعرابی نے آپ ﷺ کو تکلیف دی تھی۔ اس کا ایک اہم انتہائی نادر اور اہم استعمال نبوی یہ تھا کہ جس خاتون کو آپ ﷺ اپنی زوجہ مطہرہ کا شرف عطا فرماتے ان پر اپنی چادر ڈال دیتے تھے اور سب سمجھ جاتے تھے، غرض کہ اس کے بہت سے سماجی استعمالات تھے۔ ان میں سے ایک دھوپ یا ضرورت کے وقت بطور سائبان تان لینا بھی تھا جیسے رسولِ اکرم ﷺ کے مدینہ آنے پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنی چادر اکرام تان دی تھی یا وحی کے نزول کے وقت آپ پر چادر تان دی جاتی تھی۔

مردوں کے مخصوص ملبوسات

جنسِ قوی کے بھی بعض خاص ملبوسات ہوتے تھے جیسے آج کل ہوتے ہیں اور مردانہ زنانہ لباسوں کا فرق ہمیشہ رہا ہے۔ ان میں بدن کے زیریں اور بالائی حصوں کی ستر پوشی کرنے والے بعض ملبوساتِ مردانہ کا ذکر ان کی مختلف اقسام کے اعتبار سے کیا جاچکا ہے۔ ان میں بسا اوقات دونوں کے مشترکہ ملبوسات ہوتے تھے بس ان کی تراش خراش اور کبھی کبھی کپڑے کی نوعیت مختلف ہوتی تھی جیسے حلہ/ جبہ/ قباء/ عباء وغیرہ خالص مردانہ ملبوسات تھے مگر قمیص دونوں صنفوں کی مشترکہ چیز تھی البتہ قمیصِ زن خاص تراش خراش رکھتی تھی۔ سرِ عزیز کو ڈھانپنے کے الگ ملبوسات ہوتے تھے اور وہ دونوں کے مختلف ہوتے تھے۔ مردانہ لباسِ سر میں ٹوپی تھی جس کی مختلف قسمیں تھیں اور عمامہ تھا جس کے مختلف رنگ تھے۔ محدثین کرام نے بالعموم اپنی اپنی کتاب اللباس میں باب العمائم ضرور قائم کیے ہیں۔ اور امامان سیرت مختلف حالات و واقعات بالخصوص غزوات کے ابواب میں رسولِ اکرم ﷺ کے عماموں کا ذکر کرتے ہیں اور دوسروں کے عمائم کا بھی۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب العمائم، حدیث: ۵۸۰۶؛ فتح الباری، ۱۰/۳۳۶-۳۳۷ میں محرم کے ممنوع لباسوں کے حوالے سے ہے)

عمامہ کا اردو ترجمہ پگڑی بھی ملتا ہے مگر اب عربی لفظ ہی زیادہ مستعمل ہے اور دونوں میں تھوڑا سا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ کپڑے کا ایک لمبا چادر نما ٹکڑا ہوتا تھا جسے سر کے گرد ایک خاص انداز سے لپیٹا جاتا تھا کہ پیشانی پر ایک قوس ومحراب سی بن جاتی تھی اور اس کا ایک کونا - چھوٹا سا کونا - پچھلے حصۂ سر پر گدی یا شانے تک لٹکتا تھا جسے شملہ کہا جاتا تھا۔ رنگوں اور کپڑوں کی گونا گونی اس کی خوبصورتی، جلال اور عظمت میں اضافہ کرتی تھی۔ وہ عرب اور اسلامی تمدن کا ایک اہم حصہ اور خاص نشان رہا ہے۔ عرب جاہلی اور اسلامی ادوار دونوں میں اس کے استعمال کے بڑے ثبوت ملتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ مشرکین اور مسلمین میں فرق عمائم کا ہے۔ ابوداؤد وترمذی کی یہ روایت قابلِ لحاظ ہے مگر تاریخی شواہد کے خلاف ہے۔ دوسری حدیث میں عمامہ باندھنے سے حلم میں اضافہ کی خبر ہے: "اعتموا تزدادوا حلما"۔ طبرانی اور ترمذی کی اس روایت کو امام بخاری نے ضعیف کہا ہے (فتح الباری، ۱۰/۳۳۶)۔ ایک فرق اور بتایا گیا ہے کہ مسلمین ٹوپی پر اپنے عمامے باندھتے ہیں اور مشرکین بلا ٹوپی۔

(ترمذی، ابواب اللباس، باب فی ترقیع الثوب: ان فرق ما بیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس)

بلا تفریق تمام اکابرِ مکہ وقریش اور دوسرے شیوخِ عرب اپنے سروں پر عمامے باندھتے تھے۔ شیخِ قریش ابواُحیحہ سعید بن العاص اموی کے بارے میں روایات کا اتفاق ہے کہ وہ جس دن کسی رنگ وروپ کا عمامہ باندھتے تھے دوسرے افراد واکابر اس جیسا عمامہ اس دن باندھنے سے احتراز کرتے تھے: "... کان اذا اعتم، لم یعتم احد بمکۃ بعمامۃ علیٰ لون عمامتہ اعظاما لہ، فکان یدعی، ذاالتاج"۔ دوسرے تمام اکابرِ قریش کے عماموں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مردانہ لباس کا وہ ایک جزوِ لاینفک تھا لہٰذا اس کے نہ ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ (بلاذری، ۱/۱۴۱)

عمامۂ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کا عمامۂ مبارک آپ ﷺ کے لباسِ مردانہ کا ایک ناگزیر حصہ تھا۔ آپ ﷺ عمامہ ہمیشہ باندھتے تھے۔ اس میں مکی اور مدنی دور یا بعثت سے قبل وبعد کا سوال ہی

نہیں اٹھتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مکی عماموں کے حوالے قریب قریب صفر ہیں، مدنی دور کے عمامۂ نبوی کی روایات واحادیث بہت ہیں اور آپ ﷺ کے اسفارِ دینی اور غزوات کے حوالے سے ان کا ذکر مستقل ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ عمامہ آپ ﷺ کو بہت پسند تھا اس لئے اہم مقامات اور غیر معمولی حالات میں اسی کے آثارِ مبارک زیادہ ہیں۔ دوسرے رنگوں کے عمامے بھی آپ ﷺ نے باندھے ہیں۔ اور ان عماموں کے کپڑے بھی مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے مذکورہ بالا حدیث بخاری: ۵۸۰۶ کی شرح میں مسلم کی حدیث حضرت عمرو بن حریثؓ نقل کی ہے جس میں سیاہ عمامہ نبوی اور اس کے شملہ کے شانوں کے درمیان لٹکانے کا ذکر ہے: "... وعليه عمامة سوداء قد أرخىٰ طرفها بين كتفيه" (۳۳۶/۱۰)

امام ترمذی کی ایک روایت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ جب عمامہ باندھتے تھے تو اپنے دونوں شانوں کے درمیان اپنے عمامہ کو رکھتے تھے: "كان رسول الله ﷺ اذا اعتم سدل عمامته بين كتفيه"۔ اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ صحابہ وتابعین میں حضرات ابن عمر، قاسم اور سالم بھی یہی کرتے تھے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس طریق سے عمامہ باندھتے میں نے صرف حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز اموی کو دیکھا ہے۔

(فتح الباری، ۳۳۷/۱۰؛ ترمذی، ابواب اللباس، باب فی العمامة السوداء)

سیاہ عمامۂ نبوی کا ذکر تقریباً تمام غزواتِ نبوی میں ملتا ہے۔ بعض محدثینِ کرام نے اسی بنا پر سیاہ عمامے باندھنے کا باب ہی قائم کیا ہے۔ بالعموم مکہ مکرمہ کی فتح میں آپ ﷺ کے سیاہ (سوداء) عمامہ باندھے ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے: "دخل مكة وعليه عمامة سوداء بغير احرام"

(نسائی، كتاب اللباس، لبس العمائم السود؛ مسلم، كتاب الحج، باب جواز دخول مكة بغير احرام؛ ترمذی مذکورہ بالا، ابوداؤد، كتاب اللباس، باب فی العمائم؛ ابن ماجہ، كتاب اقامة الصلوٰة، باب فی الخطبة يوم الجمعة وغیرہ؛ امام نسائی کی روایت میں اسی کو "عمامہ حرقانیہ" کہا گیا ہے کہ وہ سیاہی کی بنا پر جلا ہوا معلوم ہوتا تھا: كتاب الزينة، لبس العمائم الحرقانية، شرح سيوطی)

غزوۂ خیبر: وعليه عمامة و على العمامة قلنسوة من الممطر السيجان: الساج: الطليسان الاسود۔

عمامہ قطری

رسولِ اکرم ﷺ کے دوسرے عمائم میں ایک قطری عمامہ باندھنے کا ذکر حضرت انس بن مالکؓ نے کیا ہے کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا تو ہاتھ عمامہ کے نیچے ڈال کر سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا اور عمامہ نہیں اتارا: "رأیت رسول الله ﷺ یتوضا وعلیه عمامة قطریة، فادخل یده من تحت العمامة فمسح مقدم راسه ولم ینفض العمامة"

(ابوداؤد، ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب المسح علی العمامة، وضو کرنے کے حوالے سے متعدد روایات میں عمامہ نبوی کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے جو غزوۂ تبوک کے زمانے کی ہے؛ موطا/تنویر الحوالک، ۱/۵۶ میں حدیث ہے کہ حضرت زبیرؓ اپنا عمامہ اتار کر وضو کا مسح کرتے تھے: نیز اس معنی کی احادیث مسلم: ۸۱-۸۳ (کتاب الوضوء)

عمامۂ خز: کا ذکر روایتِ حضرت سعد میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک شخص کو اپنا سیاہ خز کا عمامہ پہنا دیا تھا: "رایت رجلا ببخاریٰ علی بغلة بیضاء علیه عمامة خز سوداء، فقال: کسانیها رسول الله ﷺ"۔ (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الخز)

- رسولِ اکرم ﷺ نے غزوہ دومۃ الجندل پر روانہ کرنے سے قبل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کے سر پر اپنے ہاتھ سے اپنا عمامۂ مبارک باندھا تھا: "عممنی رسول الله ﷺ فسدلها بین یدیّ وعن خلفی". (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی العمائم)

عمائم صحابہ

اگرچہ عمومی روایات و احادیث سے تمام صحابۂ کرام کے عمامہ باندھنے کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے تاہم بعض انفرادی واقعات بھی مزید اثبات کے لئے نقل کئے جاتے ہیں: (عام عصائب کے حوالے: حدیث ابوداؤد: ۱۴۶ وغیرہ میں ہیں)

- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کے عمامہ باندھنے کے شرف خاص کا ذکر ابھی اوپر آچکا۔ (نیز حدیث ابوداؤد: ۴۰۷۸)

- حضرت عبداللہ بن عتیکؓ جب ابورافع یہودی کو قتل کر کے اس کے قلعہ سے باہر نکلے تو

اپنی پنڈلی توڑ بیٹھے اور پھر اسے اپنے عمامہ سے باندھ لیا: "فعصبتها بعمامة ثم انطلقت"

(بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع)

- حضرت وحشیؓ سے حضرت حمزہؓ کی شہادت کا واقعہ سننے کے لئے حضرت عبید اللہ بن عدی بن الخیار گئے تو حضرت وحشی اس دن اس طرح اپنا عمامہ باندھے تھے کہ صرف ان کی آنکھیں دِکھ رہی تھیں: "... معتجر بعمامته ما یری وحشی الا عینیه..."

(بخاری، مذکورہ بالا، باب قتل حمزۃ)

- دوسرے صحابہ کرام کے عماموں کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے اپنا عمامہ ایک اعرابی کو صرف اس بنا پر عطا کر دیا تھا کہ وہ ان کے والد حضرت عمر بن خطابؓ کے دوست تھے۔ (مسلم، کتاب البر والصلة...، باب فضل صلة اصدقاء الاب والام)

- حضرت عمار بن یاسر مذحجیؓ بھی سیاہ عمامہ باندھتے تھے اور خطبۂ جمعہ دیتے وقت ضرور باندھتے تھے۔ (بلاذری، ۱/۱۶۴)

- حضرت خالد بن ولید مخزومیؓ نے موئے مبارک حجۃ الوداع میں جمع کر کے اپنی ٹوپی (قلنسوۃ) کے اگلے حصہ میں رکھے تھے۔ (واقدی، ۱۱۰۸)

- حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان، زبیر، علی، طلحہ وغیرہ کے عمائم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ (ابن سعد، ۳/۱۳۱ تراجم صحابہ، ۳۰ و مابعد)

ٹوپی / برانس۔ قلنسوۃ

عربی میں ٹوپی یا لباسِ سر کے لئے مختلف نام ملتے ہیں: ان میں قلنسوہ / قلانس عام لفظ ہے جو ہر ٹوپی پر صحیح اترتا ہے۔ دوسری ٹوپیوں کے لئے ان کی ساخت کے اعتبار سے نام رکھے جاتے تھے جیسے برنس / برانس۔ وہ عرب میں پہنی جانے والی لمبی ٹوپی ہوتی تھی، صاحب مصباح اللغات نے اس کے علاوہ دوسرے معنی یہ بھی بتائے ہیں: "وہ لباس جس کا کچھ حصہ ٹوپی کی جگہ کام دے"۔ قلنسوہ کے معنی صرف ٹوپی کے دیئے ہیں جس کی مشہور جمع قلانس ہے اور بعض دوسری جمع بھی ہیں۔ محدثین کرام نے دونوں پر ابواب باندھے ہیں اور ان کے استعمال کا ذکر کیا

ہے۔ بالعموم برنس/ برانس کا ذکر احرام باندھنے کے سلسلے میں آتا ہے کہ ان کو نہ پہنا جائے کیونکہ اس سے سر ڈھک جاتا ہے جو بحالت احرام ممنوع ہے۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب البرانس، حدیث:۵۸۰۳ وغیرہ؛ کتاب الحج میں بھی یہی حدیث ہے)

نبوی ٹوپی/قلنسوۃ

رسولِ اکرم ﷺ کے ٹوپی/قلنسوہ باندھنے/ اوڑھنے کا ذکر ملتا ہے جیسے ترمذی، کتاب / ابواب السیر، باب فی فضل الشهداء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے اور روایاتِ سیرت میں اس کے کئی حوالے ملتے ہیں۔ البتہ برنس اوڑھنے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

- رسولِ اکرم ﷺ کی ایک قلنسوۃ اسماط (اونی کپڑے کی) تھی (السمط: اونی کپڑا):

"كانت لرسول الله ﷺ قلنسوة اسماط يعني جلوط، وكانت فيه ثقبة" (بلاذری، ۱/ ۵۰۷)۔ غزوہ خیبر میں عمامہ کے ساتھ قلنسوۃ بھی تھی جو سیاہ طلیسان کی تھی (بلاذری، ۱/ ۵۰۸)۔ غالباً وہ ایسی ٹوپی تھی جس کا کچھ حصہ پیشانی پر رہتا تھا اور جس میں چھوٹے سوراخ تھے جبکہ طیلسان بالعموم ریشمی کپڑا ہوتا ہے۔

صحابہ کرام کی ٹوپیوں کے سلسلے میں دونوں کا استعمال ملتا ہے۔ بخاری کے مذکورہ باب البرانس کے ترجمۃ الباب میں ہی یہ مذکور ہے کہ حضرت انسؓ کے سر پر خز کی پیلی برنس دیکھی گئی:

"رأيت على انس برنسا اصفر من خز" (فتح الباری، ۱۰/ ۳۳۵)

- حضرت خالد بن ولید مخزومیؓ نے حجۃ الوداع میں تراشیدہ موئے مبارک نبوی اپنی ٹوپی کے اگلے حصہ/مقدم میں رکھ لئے تھے۔ (واقدی، ۱۱۰۸)

- حضرت وابصہؓ کی ایک ٹوپی اور برنس دونوں کا ذکر ابوداؤد کی روایت میں ملتا ہے:

"فاذا عليه قلنسوة لا طئة ذات اذنين وبرنس خز اغبر"

(کتاب الصلوٰۃ، باب الرجل يعتمد فی الصلاة على العصا: یعنی ان کی ٹوپی دو کانوں والی لمبی تھی اور ریشمی برنس خاکستری تھی)

- حضرت شریکؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی تو اپنی ٹوپی اپنے سامنے رکھ لی: "رأيت شريكا

صلی بنا فی جنازة العصر فوضع قلنسوته بین یدیه یعنی فی فریضة حضرت" (ابوداؤد، مذکورہ بالا، باب الخط اذا لم یجد عصا) یعنی وہ اتنی لمبی تھی کہ سترہ کا کام دے سکتی تھی کہ سترہ اس وقت دستیاب نہ تھا۔

- حضرت جندب بن عبداللہ بجلیؓ کی پیلی لمبی ٹوپی (برنس اصفر) کا ذکر بعد کے زمانے کے حوالے سے ملتا ہے۔ (مسلم، حدیث: ۱۶۰ (۹۷)

اسی طرح بعض دوسرے حوالے ان دونوں قسم کی ٹوپیوں کے ملتے ہیں۔

خواتین کے مخصوص ملبوسات

صنفی لحاظ سے مرد وعورت میں جو فرقِ فطری پایا جاتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان کے ملبوسات بھی ان کی طرح خاص ہوں۔ اسلام نے بطور دینِ فطرت اس کی بہت رعائت کی ہے اور تہذیب وتمدنِ عرب وغیرہ نے بھی اس فطری تقاضے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ بلاشبہ بعض ملبوسات مشترک بھی ہوسکتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر مشترکہ لباس کی حیثیت سے اوپر کیا جاچکا ہے۔ ان کے مخصوص ملبوسات کا ذکر اس فصلِ خاص میں کرنا مناسب سمجھا گیا۔ اس لباسِ خاص کے لئے کچھ پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں جس طرح مردانہ ملبوسات کے لئے ہیں اور بعض خاص رعائتیں دی گئی ہیں جو مردوں کو حاصل نہ تھیں۔ یہ زیب وزینت اور آرائش کے نسائی حقوق کا معاملہ ہے۔

دِرع

خواتین کی ایک خاص قمیص ہوتی تھی جسے درع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مصباح اللغات میں ہے: ''عورت کی قمیص یا وہ قمیص جس کو وہ گھر میں پہنتی ہے۔ اور درع اس چھوٹے سے کپڑے کو بھی کہتے ہیں جس کو چھوٹی لڑکی گھر میں پہنتی ہے، اس کی جمع ادراع ہے''۔ قدیم ترین زمانہ عرب میں بھی وہ پہنی جاتی تھی۔ حدیثِ بخاری: ۳۳۶۴ وغیرہ کے مطابق حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے پانی کی تلاش میں جب صفا ومردہ کے درمیان چکر پہ چکر لگائے تھے تو اپنی قمیص کا کونہ

اوپر اٹھالیا تھا: "... رفعت طرف درعھا ..." تو وہ یہی چھوٹی نسائی قمیص تھی۔

- عرب جاہلی میں ایک جاہلانہ روایت یہ تھی کہ آفاقی عربوں کو طواف کعبہ کے وقت حمس (قریش/ ساکنان حرم) کے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ اور اگر وہ اپنے کپڑوں میں طواف کرنے پر اصرار کرتے تو ان کو بعد طواف اس طرح تج دیا جاتا تھا کہ کبھی کوئی ان کو کسی طرح استعمال نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ "الثیاب اللقی" (افتادہ ملبوسات) کہلاتے تھے۔ یہ صرف مردوں کے بارے میں تھا۔

عورتیں البتہ اپنے تمام دوسرے کپڑے اتار دیتی تھیں صرف ایک لمبی قمیص، جو چوغہ نما ہوتی تھی، پہنے رہتی تھیں اور اس میں طواف کرتی تھیں۔ اسی کا نام درع تھا: "واما النساء فتضع احداھن ثیابھا کلھا الا درعا مفرجا علیھا ثم تطوف بہ ..." (ابن ہشام، ۱/۲۰۲)

- حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ نے یہ جاننے کے لئے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس سچ مچ کوئی فرشتہ آتا ہے یا کوئی شیطان مردود، آپ ﷺ کو اپنی گود میں بٹھا کر اپنی لمبی اور ڈھیلی ڈھالی قمیص (درع) میں ہی داخل کر لیا تھا اور حضرت جبریل علیہ السلام روپوش ہو گئے تو فرشتہ کی تصدیق ہو گئی۔ (ابن ہشام، ۱/۲۳۹)

نطاق

لغوی معنی کمر بند یا پٹی یا پٹکے کے آتے ہیں۔ اس کے خاص معنی یہ ہیں: "کپڑے کا ایک ٹکڑا جس کو عورتیں کمر پر باندھتی ہیں اور جس کا بالائی حصہ نچلے حصہ پر اور نچلا حصہ زمین تک لٹکتا رہتا ہے" (مصباح اللغات: جمع اس کی "نُطُق" ہے)۔ روایات حدیث و سیرت میں سب سے مشہور نطاق حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کا تھا جو انھوں نے سفرِ ہجرت کے زاد راہ کے تھیلے کو باندھنے کے لئے اپنے نطاق/ پٹی/ کمر بند یا پٹکے کو دو حصوں میں پھاڑ ڈالا تھا اور ایک حصہ سے تھیلا باندھ دیا تھا اور دوسرے سے اپنی کمر باندھ لی تھی اور اسی بنا پر رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو ذات النطاقین (دو کمر بند/ پٹکے والی خاتون) کا خطاب نبوی عطا کیا تھا (بخاری، باب ھجرۃ النبی ﷺ و اصحابہ الی المدنیۃ)۔ حیرت ہے کہ نطاق کا ذکر دوسری خواتین کے حوالے سے نہیں مل سکا۔

خمار

خواتین کے سر کی اوڑھنی کو خمار کہتے ہیں جس کی جمع خُمُر آتی ہے۔ وہ مختلف کپڑوں کی بنائی جاتی تھی۔ خواتین اس سے اپنے سروں کو ڈھانک کر اس کے کناروں سے شانوں اور سینے کی بھی ستر پوشی کرتی تھیں۔ قرآن مجید کی سورہ نور کی آیتِ کریمہ: ۳۱ میں آیا ہے: "ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن" "اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر"۔ یہ حکم اسلامی جدید قانون نہیں تھا بلکہ دین حنیفی کے قانون مستورات کی تصدیق میں تھا اور عرب شرفاء کی تمام عورتیں اپنی اوڑھنیاں سینوں اور گریبانوں پر ڈال کر نکلا کرتی تھیں یا عام حالات میں گھروں میں بھی ڈالے رہتی تھیں جیسا کہ حضرت خدیجہؓ کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ سورہ نہیں اتری تھی۔

- حضرت خدیجہؓ کے خمار (اوڑھنی، دوپٹے) کا ذکر اولین وحیِ قرآنی کے ضمن میں ملتا ہے۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ سچ مچ فرشتہ ہی رسولِ اکرم ﷺ کو دکھائی دیتا ہے اور وہی وحی لاتا ہے انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو اپنی گود میں بٹھا کر اوپر سے اپنا دوپٹہ ڈال لیا تھا اور سرِ مبارک اپنی قمیص (درع) کے اندر کر لیا تھا۔ زوجین کی خلوت دیکھ کر حضرت جبریل علیہ السلام روپوش ہو گئے اور تصدیق ہو گئی کہ فرشتہ ہی ہے۔ (ابن ہشام، ۱/۲۳۹)

- کسی قدیم عورت کے بارے میں مشہور واقعہ وحدیث ہے کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو کنوئیں سے پانی پلانے کے لئے اپنے دوپٹے (خمارھا) کو پھاڑ یا بٹ کر رسی بنائی تھی اور اپنے موزے میں اسے باندھ کر پانی کھینچا اور کتے کو پلایا تھا۔ اس رحم لی پر اس کی مغفرت ہو گئی تھی۔

(بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب الخ؛ وغیرہ دوسرے ابواب؛ فتح الباری، متعلقہ بحث؛ ترمذی، باب الصلاۃ علی الخمرۃ؛ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ علی الخمرۃ؛ ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب الحائض الخ)

خمارِ عائشہؓ کا ذکر متعدد احادیث وروایات میں ملتا ہے:

- ایک انتہائی دلچسپ، جان فزا اور روح پرور واقعہ یہ ہے کہ حضرت صفیہ ام المومنینؓ کو

احساس ہوا کہ رسولِ اکرم ﷺ ان سے کسی بات پر کبیدہ خاطر ہیں۔ انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آ کر ماجرا بیان کیا اور پیش کش کی کہ اگر وہ رسولِ اکرم ﷺ کی ان سے خفگی دور کر دیں گی تو وہ ایک دن کی باری انھیں دے دیں گی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کی پیش کش و التجا دونوں قبول کر لیں۔ انھوں نے اپنا ایک دوپٹہ لیا، اس کو زعفران سے رنگا اور اس پر پانی چھڑکا تاکہ اس کی خوشبو اڑے۔ پھر رسولِ اکرم ﷺ کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! مجھ سے دور رہو! آج تمہاری باری نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ساری بات بتائی اور آپ ﷺ خوش ہو گئے۔ "...فاخذت خمارا لها مصبوغا بزعفران، فرشته بالماء ليفوح ريحه..."

(ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب المرأة تهب يومها لصاحبها؛ یہ دوپٹہ/ اوڑھنی زعفران سے رنگی ہوئی تھی اور اس پر پانی کے چھینٹے دینے سے خوشبو اٹھتی تھی۔ یہ رنگریزی کی بحث میں مفصل آتی ہے)

- حضرت ام حمید بن عبداللہؓ نے حضرت عائشہؓ کے دو حبشانی دوپٹوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے:

"رأيت على عائشة خمارين حبشانيا وغرابيا اسود" (بلاذری، ۱/۴۱۴)

- حضرت عائشہؓ تدفینِ حضرت عمرؓ کے وقت اپنا دوپٹہ اوڑھے ہوئی تھیں: "مازلت اضع خماری وانفضل ثيابی..." (ابن سعد، ۳/۳۶۴)

- حضرت رفاعہ کی مطلقہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن زبیر کی زوجہ حضرت تمیمہ بنت وهب قرظی خدمت نبوی میں شکایتِ شوہر لے کر حاضر ہوئیں تو ایک سبز رنگ کی اوڑھنی پہنے/ اوڑھے ہوئے تھیں جس سے ان کی جلد بھی سبز ہو رہی تھی اور بقول حضرت عائشہ اتنی سبز گوں کوئی اور نہ دیکھی کہ ان کے شوہر کی مار سے ان کی جلد سبز ہو رہی تھی۔ نہیں معلوم کہ ان کی جلد زیادہ سبز تھی یا ان کا ہرا دوپٹہ زیادہ سبز تھا۔ "...وعليها خمار اخضر..."

(بخاری، کتاب اللباس، باب الثیاب الخضر؛ حدیث: ۵۸۲۵؛ فتح الباری، ۹/۵۷۵؛ ۱۰/۳۴۷-۳۴۸)

مرط (اونی/ ریشمی چادرِ نسائی)

مِرط کی جمع مروط ہے۔ وہ بھی خواتین کا ایک مخصوص لباس ہے۔ وہ ریشم (خز)، اون (صوف) یا اور کسی چیز کا لباس ہے۔ صاحب مصباح اللغات نے لکھا ہے کہ "المرط: ہر بے سلا

ہوا کپڑا، اون یا ریشم کی چادر'' جس کی جمع ''مروط'' آتی ہے۔ اور حضرت نضر بن شمیل کے مطابق وہ عورتوں کا خاص لباس ہے''... کساء من خز او صوف او غیرہ، وعن النضر بن شمیل ما یقتضی انہ خاص بلبس النساء'' (فتح الباری، ۱/ ۶۲۵)۔ احادیث سے بھی اس خیالِ خاص کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ ابھی تک کوئی ایسی مثال نہیں مل سکی جس میں مرط/مروط کو مردوں کے لئے استعمال کرنا بتایا گیا ہو۔ مروط سے متعلق تمام احادیث میں عورتوں کا لباس، چادر وغیرہ معلوم ہوتی ہے۔ صرف ایک استثناء ملا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ ایک صبح باہر تشریف لے گئے تو جسم اطہر پر سیاہ بالوں والی ایک چادر (مرط) تھی: ''وعلیہ مرط مرحل من شعر اسود''

(مسلم، کتاب اللباس، باب التواضع فی اللباس؛ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الصوف والشعر، ترمذی، ابواب الاستیذان و الآداب، باب فی الثوب الاسود وغیرہ۔ یہ ممکن ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے کسی خاتونِ خانہ/ زوجہ محترمہ کا لباس/ چادر کو لے لیا ہو۔ موطا کی حدیث کی تشریح میں اسے ازار کا لباس کہا گیا ہے: ''... کان یؤتزر بھا'' (سیوطی، تنویر الحوالک، ۱/ ۲۰-۲۲)

- حضرت عائشہ حائضہ ہوتیں اور اپنی چادر اوڑھے ہوتیں اور وہ نمازِ شب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے مس ہو رہی ہوتی تھی: ''کان النبی ﷺ یصلی باللیل و انا الی جنبہ، و انا حائض، وعلی مرطٌ، وعلیہ بعضہ الی جنبہ''

(مسلم/ بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الاعتراض بین یدی المصلی؛ ابوداؤد، ابن ماجہ، وغیرہ کی احادیث یکساں)

- حضرت میمونہؓ کی بھی ایسی ایک ''مرط'' کا ذکر ابن ماجہ نے کیا ہے: باب فی الصلاۃ فی ثوب الحائض۔

- اس کا ایک عام اور مشہور استعمال نمازِ فجر میں خواتین کی حاضری سے متعلق ملتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ مومنات بھی شریک فجر ہوتی تھیں۔ اور وہ اپنی چادروں (مروطھن) میں لپٹی ہوتی تھیں اور جب اپنے گھروں کو لوٹتیں تو پہچانی نہ جاتیں: ''..لقد کان رسول اللہ ﷺ یصلی الفجر، فیشھد معہ نساء من المومنات متلفعات فی مروطھن، ثم یرجعن الیٰ بیوتھن مایعرفھن احد''

(بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فی کم تصلی المرأۃ فی الثیاب؛ حدیث: ۳۷۲؛ فتح الباری، ۱/ ۶۲۴-۶۲۵؛ اطراف: ۵۷۸، ۸۶۷، ۸۷۲؛ موطا، کتاب الصلوٰۃ، ...... ؛ تنویر الحوالک، ۱/ ۲۰-۲۲)

- ایک دوسرا عمومی ذکرِ "مروط" شانِ نزول بیان کرتا ہے۔ سورۂ نور کی آیت کریمہ-۳۱: "ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن" (اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر) نازل ہوئی تو اولین مہاجرات طاہرات نے اپنی چادریں پھاڑیں اور ان کے دوپٹے بنا لئے: "... لما انزل الله : ولیضربن بخمرهن علیٰ جیوبهن، شققن مروطهن فاختمرن به"۔ دوسری روایت میں مروط کی جگہ ازر جمع ازار ہے۔ (بخاری، کتاب التفسیر، سورة النور)

- واقعۂ افک میں حضرت ام مسطح کا پاؤں ان کی چادر (مرط) میں پھنسا تھا اور انھوں نے اپنے فرزند حضرت مسطح کو برا بھلا کہا تھا کیونکہ وہ افک میں ملوث ہو گئے تھے: "فعثرت ام مسطح فی مرطها، فقالت تعس مسطح" (بخاری، باب غزوہ بدر کا بلا عنوان، نیز حدیثِ افک)

- احادیث میں ایک اور عمومی ذکرِ مرط/ مروط کا توقیتی تعلق خلافت فاروقی سے ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے مدینہ منورہ کی خواتین کو مروط (چادریں) تقسیم کیں اور ایک عمدہ چادر (مرط جید) بچ گئی۔ لوگوں نے خلیفہ وقت سے اس کو اپنی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم بنت علیؓ کو دینے کی سفارش کی۔ مگر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ حضرت ام سلیطؓ اس کی زیادہ حق دار ہیں کیونکہ وہ نہ صرف اول اول بیعت کرنے والی خواتین میں سے تھیں بلکہ غزوۂ احد میں ہم مجاہدین کو اپنے مشکیزے سے پانی پلا رہی تھیں، میں اسے نہیں بھول سکتا: "ان عمر بن الخطابؓ قسم مروطا بین نساء من نساء اهل المدینة، فبقی منها مِرط جید..."

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة احد؛ باب ذکر ام سلیط؛ فتح الباری، ۷/ ۴۵۸ وما بعد؛ نیز رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین-غزوۂ احد میں ذکر حضرت ام سلیطؓ)

جلباب (چادر)

صاحب مصباح اللغات نے اس کے دو معانی بتائے ہیں: چادر یا قمیص اور اس کی جمع "جلابیب" لکھی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی جمع ہی صرف ایک آیتِ کریمہ- احزاب :۵۹- میں استعمال کی گئی ہے: "یٰایها النبی قل لازواجک وبنٰتک ونساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن ..." (اے نبی! کہہ دے، اپنی عورتوں کو، اور اپنی بیٹیوں کو، اور مسلمانوں

کی عورتوں کو نیچی لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی اپنی چادریں...)۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمہ "چادر ہای خودرا" کا اردو ترجمہ دیا ہے اور اردو مفسرین ومترجمین اس کا ترجمہ چادروں ہی دیتے ہیں، قمیص کوئی ترجمہ نہیں کرتا۔

احادیثِ نبوی سے بھی جلباب/ جلابیب چادر/ چادروں کے معنی میں ہی مستعمل معلوم ہوتی ہے جیسے کہ حدیثِ بخاری: ۳۲۴ میں حضرت حفصہؓ کی حدیث میں ہے کہ عیدین میں خواتین عیدگاہ جاتی تھیں۔ ایک خاتون نے رسولِ اکرم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ اگر کسی کے پاس چادر نہ ہو تو وہ نہ جائے؟ فرمایا کہ اس کی سہیلی اسے اپنی چادر اوڑھا/ پہنا لے: "...اعلی احدانا باس اذ لم یکن لها جلبابٌ ان لا تخرج؟ قال: لتلبسها صاحبتها من جلبابها..." (فتح الباری، ۱/ ۵۲۸-۵۲۹)۔ حافظِ موصوف نے جلباب کی تعریف وتشریح چادر ہی سے کی ہے: "قیل: هو المقنعة او الخمار او أعرض عنه، وقيل: الثوب الواسع يكون دون الرداء"۔ ان کے علاوہ دوسرے اقوال قیل میں ازار، ملحفہ، ملاءۃ اور قمیص کے معانی بھی دیئے گئے ہیں۔

(نیز مسلم، کتاب صلاة العیدین، باب اباحة خروج النساء، ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب خروج النساء فی العید، حدیث: ۱۱۳۶؛ ترمذی، ایضاً۔ بعض روایات میں جلباب کی جگہ ثوب ہے مگر بخاریؒ نے جلباب کی تصریح کی ہے)

- اسی طرح بعض دوسری احادیث میں ملتا ہے کہ حجاب کے احکام اترنے کے بعد خواتینِ عصر نے اپنے ازار وغیرہ پھاڑ پھاڑ کر ان کے جلباب/ چادریں بنالی تھیں۔

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کی جلباب کا ذکر واقعہ افک کے بیان میں ملتا ہے کہ جب وہ اپنے گمشدہ ہار کی تلاش سے فارغ ہو کر منزلِ قافلہ پر آئیں تو کاروان جا چکا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ میں اپنی جگہ پر اپنی چادر میں لپٹ کر وہیں لیٹ گئی: "فتلففت بجلبابی ثم اضطجعت فی مكانی". (ابن ہشام، ۳/ ۳۴۲)

- حضرت تمیمہ بنت وہب قرظی، زوجہ رفاعہ قرظی/ عبدالرحمٰن بن زبیرؓ خدمت گرامی میں ایک مسئلہ کے سلسلے میں آئیں تو جلباب اوڑھے تھیں اور اس کی ایک نازک سی مثال دی تھی:

"...أخذت هدبة من جلبابها".

(بخاری، کتاب اللباس، باب الازار المهدب، مسلم، ترمذی، کتاب النکاح، باب لا تحل المطلقة وغیرہ؛ فتح الباری، ۹/۵۷۵)

- حضرت ام طلحۃ الطالحاتؓ کی بیٹیوں کے حوالے سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک اہم حدیث ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جلباب کا اوڑھنا بچی کے لئے کس عمر میں ضروری ہوجاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ حضرت صفیہؓ یعنی طلحہ الطالحات کی ماں کی مہمان ہوئیں اور ان کی بیٹیوں کو دیکھا تو رسولِ اکرم ﷺ کی ایک حدیث بیان کی۔ رسولِ اکرم ﷺ میرے حجرے میں تشریف لائے تو اس وقت وہاں ایک بچی تھی۔ آپ ﷺ نے میری ایک ازار (حقوة) لی اور مجھے دے کر فرمایا کہ اس کو دو حصوں میں پھاڑو اور ایک حصہ اس بچی کو دے دو اور دوسرا نصف حضرت ام سلمہؓ کے پاس جو نوجوان بچی ہے اس کو دے دو، میرا خیال ہے کہ دونوں عمرِ حیض کو پہونچ گئی ہیں "...أن عائشه نزلت على صفية ام طلحة الطالحات، فرأت بنات لها، فقالت: ان رسول الله ﷺ دخل، وفي حجرتي جارية، فالقى لي حقوة وقال: شقيه بشقتين فاعطي هذه نصفا والفتلة التي عندام سلمة نصفا، قال: لا اراها الا قد حاضت... الخ".

(ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب المرأة تصلي بغير خمار، حدیث:۶۴۲؛ مصباح اللغات: "ازار یا ازار باندھنے کی جگہ")

- ازواجِ مطہرات اور دوسری خواتینِ عصر کے جلباب (چادروں) کا ایک عام دستورِ خواتین کی حیثیت سے ملتا ہے جس میں ان کے استعمال کا طریقہ و وقت بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم ازواج رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بحالتِ احرام موجود تھیں، اور جب قافلے ہمارے پاس سے گذرتے تو ہم میں سے ہر ایک اپنی چادر/ اوڑھنی کو اپنے سر سے اپنے چہرے پر لٹکا لیتی تھی اور جب وہ گذر جاتے تو ہم چہرہ کھول لیتے تھے: "... كانت الركبان يمرون بنا، ونحن مع رسول الله ﷺ محرمات، فاذا حاذوا بنا سدلت احدانا جلبابها من رأسها على وجهها، فاذا جاوزونا كشفناه."

(ابوداؤد، کتاب المناسک، باب في المحرمة تغطي وجهها؛ حدیث:۱۸۳۳)

ملبوسات کے ہدایا

کھانوں اور مشروبوں کی طرح ملبوسات کے ہدایا بھی دینے اور لینے کا عہدِ نبوی میں ایک عام رواج تھا۔ وہ سماجی رویۂ محبت اور تمدنی روشِ ارتباط کی عکاسی کرتا تھا، اور عرب جاہلی سے چلا آ رہا تھا، جس نے دین/ملتِ براہیمی سے سبق لیا تھا۔ ملبوسات کے ہدایا عام ہونے کے علاوہ دیرپا بھی تھے۔ کھانے اور مشروبات تو دو چار روز کے ہوتے تھے، ملبوسات تا عمر چلتے تھے اور بسا اوقات نسل در نسل منتقل بھی ہوتے تھے۔ اکابرِ عہد کے ملبوسات اور مقدس ہستیوں کے لباسوں سے ایک تقدس کا ہالہ بھی وابستہ ہوتا تھا لہٰذا ان کو برکات سمجھ کر محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اور یہ برکات بیش تر مادی اشیاء کے تحفظ اور منتقلی کے رویوں کو جنم دیتی تھیں۔

(مفصل بحث کے لیے مقالاتِ خاکسار: ''جسمانی آثار متبرکہ سے تبرک صحابہ''، ''متروکہ آثار نبوی سے عقیدت و تبرک صحابہ''، وغیرہ)

ہدایائے لباس دوسرے ہدایا کی طرح دوطرفہ عمل اور تعامل پر مبنی تھے: ہدایا پیش کرنے والوں کو قبول کرنے والے بہتر و برتر ہدایا پیش کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اور ہر شخص اپنی بساط اقتصاد اور خاکۂ محبت کے مطابق ہدایا پیش کرتا تھا۔ وہ معمولی سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی ہوتے تھے۔ ان کی قیمت اور مالی قدر بہرحال ایک اہم وجہِ اعتبار تھی تاہم خلوص و محبت اصل شے تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے اچھے رسوم و رواج کی طرح ہدایا کے لین دین کو بھی جاری رکھا۔ اور نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کو محبت کے اضافہ اور تعلق کے استحکام کی علامت قرار دے کر سماجی روش و رواج کو ایک مضبوط پشتہ فراہم کر دیا کہ وہ ایک اہم ترین سنت ہے۔

(بخاری، کتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، حدیث: ۲۵۶۶:... لاتحقرن جارة لجارتها ولو فرسن شاة''؛ طرف: ۶۰۱۷؛ نیز دیگر احادیث کتاب؛ فتح الباری، ۵/۲۴۳-۳۰۴: ابواب بخاری بڑے معنی خیز ہیں جیسے باب القليل من الهبة، باب من استوهب من اصحابه شيئا؛ باب قبول الهدية، باب مالا

بر د من الهدية، باب المكافاة في الهبة، باب بمن يبدأ بالهدية، وغیرہ متعدد دیگر)

ملبوسات کے ہدایا کے باب میں رسولِ اکرم ﷺ نے تمام دوسرے میادینِ حیات کی طرح دینی رنگ بھی پیدا فرمایا۔ اسلامی معاشرت میں وہ صرف ایک سماجی رواج نہیں رہ گیا جو کبھی کبھی ہدایا دینے یا لینے والوں کے لیے ایک بوجھ بن جاتا ہے اور پھر اس کے سبب گریز، اجتناب اور سماجی قطعِ تعلق کا سبب بن جاتا ہے، بلکہ وہ دین وشریعت کا حکم بن گیا۔ ہدایا کے احکام وآداب مقرر ہوئے اور اسے دینی وتشریعی مضبوطی ملی جس نے ہدایا کے رواج کو ایک وجہِ محبت اور اظہارِ تعلق بنادیا۔ نبوی سنتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ مسلم، غیر مسلم، اپنوں بیگانوں، چھوٹوں، بڑوں کو اپنے ہدایا سے نوازتے تھے اور ان کے ہدایائے لباس قبول بھی فرماتے تھے۔

(بخاری/ فتح الباری مذکورہ بالا؛ بالخصوص باب قبول الهدية من المشركين، باب الهدية للمشركين، ۵/۲۸۲-۲۸۸ ومابعد)

نبوی ہدایائے لباس

ملبوسات کے ہدایائے نبوی میں بھی دو طرح کی سنتیں ملتی ہیں: ایک آپ ﷺ سبقت فرما کر دوسروں کو ہدایا عطا کرتے تھے، دوسرے جو ملبوسات کے ہدایا پیشِ خدمت کرتا اسے بھی جواب میں ہدایا سے نوازتے تھے۔ اس بابِ خاص میں یہ مستقل طریقہ تھا کہ پیش کردہ ہدیہ سے زیادہ قیمتی ہدیہ عطا فرماتے تھے۔ غالباً اس کی حکمت ومصلحت یہ تھی کہ امام المرسلین ﷺ کو صرف لینے والا نہ سمجھا جائے۔ پھر آپ ﷺ کی غیرت بھی تھی جو سب سے زیادہ بلند تھی اور تیسرے اس حکم کی تعمیلِ خود بھی تھی کہ بلند تر ہاتھ نچلے ہاتھ سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے: "اليد العليا خير من اليد السفلى"۔ ان ہدایائے نبوی میں افراد کے علاوہ بعض طبقات جیسے وفودِ عرب کے لیے بھی ہدایا شامل ہیں۔

(بخاری مذکورہ بالا کی حدیث: ۲۵۸۵: "كان رسول الله ﷺ يقبل الهدية ويثيب عليها" موخر الذکر کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا بدل عطا فرماتے تھے بلکہ پیش کردہ ہدیہ سے زیادہ قیمتی اور بہتر ہدیہ پیش فرماتے تھے: فتح الباری، ۵/۲۵۹ ومابعد)

افراد کے لئے ہدایائے نبوی

- حضرت عمر بن خطابؓ کو ایک ریشمی حلہ (حلة سیراء حریرا) عطا فرمایا۔ ان کو تعجب ہوا کہ ریشمی ملبوسات کو تو آپ ﷺ نے مردوں کے لیے مکروہ قرار دیا ہے لہٰذا وہ حلہ سمیت حاضر خدمت ہوئے اور وجہِ خلجان عرض کی۔ فرمانِ نبوی ہوا کہ وہ حلہ تمہیں اس لیے دیا گیا ہے کہ تم اسے بیچ دو یا کسی کو پہنا دو۔ ایک روایت کے مطابق وہ حلۂ ریشمی حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو ہدیہ میں مکہ مکرمہ بھیج دیا اور ایک دوسری روایت کے مطابق اسے خاصی قیمت پر بیچ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو واقعاتِ ہدیہ تھے۔

(بخاری، حدیث: ۵۸۴۱؛ فتح الباری، ۱۰/۳۶۵، ۳۶۸-۳۶۹: امام مالک کی روایت میں مشرک بھائی کو ہدیہ کرنے کا ذکر ہے: "فکساها عمر اخا له بمكة مشركا"، نسائی کے مطابق وہ ان کے ماں جائے تھے: "اخا له من امه"۔ بہر حال پہلے بھائی کا نام حضرت عثمان بن حکیم سلمیؓ بتایا گیا ہے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور دوسری روایت کی بھی توجیہ کی گئی ہے۔ نسائی اور مسلم کی ایک روایت کے مطابق اسے حضرت عمرؓ نے بیچ دیا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی عجیب وغریب توجیہ کی ہے جو قابلِ قبول نہیں۔ دوسرا واقعہ مان لینے سے یہ اشکال نہیں پیدا ہوتا۔ نیز کتاب الھبة مذکورہ بالا کے ابواب)

- حضرت علی بن ابی طالبؓ کو بھی اسی طرح ایک سیراء کا حلہ عطا فرمایا جسے صحابیِ جلیل نے خود زیبِ تن فرما لیا۔ نگاہِ نبوی میں غضبنا کی کا رنگ نظر آیا تو بلا کچھ کہے سنے اس کو پھاڑ کر اپنی خواتین میں تقسیم کر دیا۔ سمجھ گئے کہ ریشمی کپڑا خواتین میں تقسیم کے لیے تھا۔

(بخاری، حدیث: ۵۸۴۰؛ فتح الباری، ۱۰/۳۶۵ و مابعد: دوسری روایت میں ہے کہ اس کو "فواطم" فاطمہ نامی خواتینِ اہل بیت کے درمیان تقسیم کر دیا کیونکہ نسائی کی روایت کے مطابق ہدایتِ نبوی یہی تھی لہٰذا اسے حضرت فاطمہ بنت رسولِ اکرم ﷺ اور اپنی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشمؓ وغیرہ کو دے دیا۔ تیسری فاطمہ بقول ابو منصور ازہری حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمیؓ کی دختر تھیں۔ ایک اور دلچسپ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اس کے چار دوپٹے (خمار) بنائے۔ تین تو مذکورہ بالا فواطم کو دیے اور چوتھا بقول قاضی عیاض حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمیؓ کی زوجہ حضرت فاطمہ بنت الولید بن عتبہؓ کو ہدیہ کیا جو عبشمی تھیں اور مشہور کافر سردار عتبہ بن ربیعہ کی پوتی تھیں)

- حضرت اسامہ بن زید کلبیؓ کو بھی اسی طرح حضرات عمر و علیؓ کی مانند رسولِ اکرم ﷺ نے ایک ریشمی حلہ ہدیہ کیا تھا۔ دراصل یہ ریشمی حلے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس کہیں سے آئے تھے

جیسا کہ حضرت جریر بن حازمؒ کی روایت میں ہے اور ان میں سے تین ان تین بزرگوں کو عطا کیے گئے تھے اور بقیہ دوسروں کو دیے گئے تھے: "فلما کان بعد ذلک أتی رسول اللہ ﷺ بحلل سیراء فبعث الیٰ عمر بحلة وبعث الی اسامة بن زید بحلة و اعطی علی بن ابی طالب حلة..." ۔ حافظ ابن حجرؒ نے دوسرے حلوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض دوسرے صحابہ کرام کو جو ریشمی ملبوسات عطا فرمائے تھے وہ اسی ذخیرۂ نبوی سے رہے ہوں۔

(فتح الباری، ۱۰/۳۶۹؛ نیز مندرجہ ذیل احادیث)

- حضرت مخرمہ بن نوفلؓ کو بھی رسولِ اکرم ﷺ نے ایک ریشمی قبا عطا فرمائی تھی۔ اس کا بھی سماجی اور دینی پس منظر اہم ہے۔ روایت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے بہت سے قبائیں تقسیم فرمائیں مگر حضرت مَخرمہ کو کچھ نہ دیا۔ حضرت مخرمہ کو خبر ہوئی تو فرزندِ گرامی قدر حضرت مسور بن مخرمہؓ کے ساتھ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ رسولِ اکرم ﷺ ان کی درخواست پر باہر تشریف لائے تو انھیں قباؤں میں سے ایک زیبِ تن فرمائے ہوئے تھے۔ آتے ہی فرمایا: یہ میں نے تمہارے لئے بچا رکھا تھا اور پھر وہ قبا انھیں کو عطا فرمادی۔ اس ہدیۂ خاص میں محبتِ نبوی کے علاوہ خاص تعلقِ خاطر بھی تھا اور اس کے مساوی یہ نعمت بھی کہ اس قبائے خاص کو اپنے جسمِ اطہر سے مس کر کے عطا کیا تھا جب کہ دوسرے بلامسِ نبوی گئے تھے۔

(بخاری، حدیث: ۵۸۰۰؛ فتح الباری، ۱۰/۳۲۱-۳۲۳: حافظِ موصوف نے بعض فقہی مباحث بھی بیان کئے ہیں اور تشریحِ حدیث بھی کی ہے)

- حضرت ام خالد بنت خالد بن سعید بن العاص امویؓ کو رسولِ اکرم ﷺ نے ایک چھوٹی سیاہ چادر منقش (خمیصة سوداء صغیرة) عطا فرمائی تھی۔ وہ ان کپڑوں میں سے تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے آئے تھے اور آپ ﷺ نے بطور خاص حضرت ام خالد کو اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی اور دعا فرمائی تھی کہ اسے خوب پہنو اور پرانا کرو (أبلی و أخلقی)۔ اس چادر میں سبز یا پیلے نقش ونگار بنے تھے (وکان فیھا عَلَمٌ اخضر او اصفر)۔ اس واقعہ کی کئی روایات سیرت بھی ہیں اور مختلف احادیث نبوی بھی۔

(بخاری، حدیث: ۵۸۲۳؛ فتح الباری، ۱۰/۳۴۴-۳۴۶: روایات سے دو واقعات معلوم ہوتے ہیں: ایک وہ جب

آئیں تو اپنی پیلی قمیص پہنے ہوئے آئی تھیں اور رسولِ اکرم ﷺ نے بعد میں ان کو سیاہ منقش چادر عطا فرمائی تھی۔ یہ دو واقعات الگ الگ ہیں جن کو خلط ملط کر دیا گیا ہے)

- حضرت کعب بن زہیر مزنیؓ اپنے عہد کے ایک عظیم ترین شاعر تھے۔ ان کا قصیدۂ بردہ نعتِ نبوی کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔ اس قصیدہ کا تاریخی پس منظر بہت طویل ہے۔ منظر نامہ یہ ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں حاضرِ خدمت ہوئے اس وقت آپ ﷺ صحابہ کرام کی مجلس میں تشریف فرما گفتگو فرما رہے تھے۔ حضرت کعبؓ نے اسلام قبول کیا اور آپ ﷺ کی اجازت سے اپنا مدحیہ قصیدہ سنایا۔ یہ واقعہ غزوۂ طائف ۸ھ/ ۶۳۰ء کے بعد کا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اس قصیدہ کو سن کر خوش ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کو بطور انعام اپنی چادرِ مبارک (بُردہ) عطا فرمائی جس سے ان کا قصیدہ ہی قصیدۂ بردہ بن گیا اور وہ عربی ادب میں سعادت آگیں شہرت پا گیا۔ بعد میں وہ بردۂ نبوی حضرت کعبؓ سے خلفاءِ اسلام کے پاس منتقل ہوا۔ یہ خلفاءِ کرام کی ایک متواتر سنت معلوم ہوتی ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے تاریخی اسلامی آثار و تبرکات حاصل کر کے ان کو اسلامی ریاست کی وراثت اور امتِ مرحومہ کی سعادت بنا دیتے تھے۔ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے زیرِ استعمال چیزوں، لباسوں اور دوسرے تبرکات کو حاصل کر لیتے تھے اور ان کو خاص مواقع پر استعمال کرتے تھے۔ بردۂ نبوی خلفاءِ کرام کی مسند نشینی کے وقت ان کے سرکاری شاہانہ لباس کے اوپر اپنی برکات سے ان کے جسم و جاں کو معطر کرتا تھا۔ اس کے پیچھے یہ جذبۂ اسلامی بھی کارفرما تھا کہ وہ اپنی خلافت کو نبوتِ محمدی کا تسلسل قرار دیتے تھے اور اسے آثارِ متبرکہ سے اسلامیت کی سند دیتے تھے۔

(اسد الغابہ، ۴/ ۲۴۰-۲۴۱؛ نبوتِ محمدی کے خلافت راشدہ میں تسلسل کے لئے شاہ ولی اللہ دہلوی کے ازالۃ الخفاء کے علاوہ مقالاتِ خاکسار ملاحظہ ہوں)

- حضرت عباس بن مرداس سلمیؓ بھی ایک بڑے شاعر تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو ایک حلہ عطا فرمایا تھا۔ (ابن سعد، ۴/ ۲۷۳)

- حضرت صفوان بن امیہؓ کو فتحِ مکہ کے بعد اپنی چادرِ مبارک عطا فرما دی۔ وہ مولفۃ القلوب میں تھے اور مالِ تالیف کے علاوہ یہ ہدیہ خاص تھا۔

-حضرت مسعود بن ہنیدہ اسلمیؓ اور ان کے مولیٰ کو بھی حلہ عطا فرمایا تھا: حلة الظعينة۔

(ابن سعد، ۴/ ۳۱۱)

-حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ کو مصری باریک ریشمی کپڑے (قباطی) میں سے ایک قبطیہ عطا فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ اس کے دو حصے کر لینا - ایک کی قمیص بنوالینا اور دوسرا حصہ اپنی بیوی کو دے دینا کہ وہ اپنا لباس سلوالیں۔ مزید ہدایت فرمائی کہ اپنی بیوی کو یہ ہدایت بھی کر دینا کہ اس باریک کپڑے کے نیچے دوسرا کوئی کپڑا ضرور پہنیں تا کہ ان کا بدن نہ جھلکے۔ یہ بہت اہم روایتِ ابوداؤد ہے۔ "أتى رسول الله ﷺ بقباطي، فاعطاني منه قبطية، فقال: اصدعها صدعين، فاقطع احدهما قميصاً، واعط الآخر امراتک تختمر به، فلما ادبر قال: و أمر امراتک ان تجعل تحته ثوبا لا يصفها.." (كتاب اللباس، باب في لبس القباطي)۔ اس ہدیہ و ہدایت نبوی میں دو تین معاشرتی اور تمدنی احکام بھی ملتے ہیں: ۱-عورت اور مرد ایک قسم کے کپڑے کی قمیص سلوا سکتے ہیں۔ ۲- مرد باریک کپڑا تنہا استعمال کر سکتا ہے۔ ۳-عورت کے لئے ضروری ہے کہ اگر قمیص یا زیر جامہ باریک کپڑے کا ہو تو اس کے نیچے ایک موٹا استر/ کپڑا لگائے اور پہنے تا کہ بدن نہ جھلکے۔

جماعت کے لئے ہدایائے نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کی ایک سنتِ متواترہ مستقلہ یہ بھی تھی کہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے والے وفودِ عرب اور دوسرے وفودِ فرمانروایان کو بھی ہدایا سے نوازتے تھے۔ ان میں بھی مسلم و غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ تھا: دونوں کو ہدایا عطا فرماتے تھے۔ ان کو ہدایا دیتے وقت ان کے مقام و مرتبے کا لحاظ فرماتے تھے۔ اور اگر وہ خود ہدایا لاتے تھے، جو بالعموم روایاتِ وقت کے مطابق لاتے تھے، تو ان سے زیادہ قیمتی ہدایا ان کو دیتے تھے۔ حدیث بخاری: ۲۵۸۵ کے علاوہ متعدد دوسری احادیث میں اور کئی روایاتِ سیرت میں اس اسوۂ نبوی کا بہت وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

- بنو تمیم کے وفد نے ۹ھ/ ۶۳۱ء میں خدمتِ نبوی میں حاضری دی تو ان کے ارکان کو

بہترین ہدایا عطا فرمائے: "فاحسن جوائزهم" (اسد الغابہ،۲/۱۹۴)۔ غالباً ان "انعامات و جوائز" میں ملبوسات شامل تھے جیسا کہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے: "فاعطاهم النبی ﷺ و کساهم" (اسد الغابہ،۴/۸۸)

-وفدِ عبدالقیس کے ارکان میں شامل حضرت عمرو بن البداح القیسیؓ کو چادروں کا ہدیہ عطا فرمایا: "فکساه النبی ﷺ بُردا ..." (ایضا،۴/۸۹) اور ظاہر ہے کہ دوسرے ارکانِ وفد کو بھی ملبوسات وغیرہ سے ضرور نوازا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی سنت کے مطابق تھا۔ آپ ﷺ وفد کے چھوٹے سے چھوٹے رکن حتی کہ بچے تک کو ہدیہ میں نظر انداز نہیں فرماتے تھے کہ مبادا اس کی دل شکنی ہو۔

-حضرت ضرار بن قعقاعؓ حضرت عوف بن قعقاعؓ کے بھائی تھے۔ ان کے فرزند حضرت بسطام بن ضرارؓ کا بیان ہے کہ میں اپنے والدِ ماجد کے ساتھ اپنے قومی وفد میں شامل تھا اور اس میں بہت سے لوگ تھے (رجال کثیر)۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ہم میں سے ہر ایک شخص کو دو دو چادریں عطا فرمائیں: "...ومعنا رجال کثیر فامر رسول الله ﷺ لکل رجل منا ببردین" (اسد الغابہ،۳/۴۰-۴۱)

-- اجتماعی ہدایا کی یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ وفودِ عرب کے بیان میں مزید مثالیں اور واقعات تلاش کئے جاسکتے تھے مگر اختصار کی خاطر ان کو نظر انداز کیا گیا۔ جب یہ طے شدہ سنت ہے کہ تمام ارکانِ وفود کو آپ ﷺ ہدایا سے نوازتے تھے تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کوئی وفد اور اس کے ارکان نبوی سعادتوں سے محروم نہیں رہے تھے۔

خدمتِ نبوی میں ہدایائے مسلم

محبت و عقیدت میں مسلمان اپنے رسولِ معظم ﷺ کی خدمت میں دوسری چیزوں کے علاوہ ملبوسات بھی ہدیہ کرتے تھے۔ ان ہدایا میں معمولی چیزیں بھی شامل تھیں اور عمدہ سے عمدہ ملبوسات بھی تھے۔ سب سے دل چسپ اور عقیدت و محبت آگیں وہ ہدایا تھے جو بعض خواتین نے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ان میں بھی سب سے قیمتی وہ لباس تھے جو انھوں نے

بطورِ خاص آپ ﷺ کے لئے بُنے تھے۔ صحابۂ کرام کے ہدایا میں بیشتر کا تعلق دور دراز کے صحابہ کرام اور مسلمانوں سے زیادہ ملتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قریب ترین صحابہ اس خدمت میں کسی سے پیچھے تھے۔ ان ہدایائے محبت کی مثالوں سے اس سماجی رواج اور دینی قدر کی اہمیت و وسعت کا اندازہ ہو سکے گا۔

- حضرات زبیر بن عوام اسدی اور طلحہ بن عبیداللہ تیمیؓ کے کپڑے۔ شامی کپڑے۔ کے ہدایا کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ ہجرتِ مدینہ کے لئے دارِ ہجرت کی طرف رواں دواں تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بطور ثانی اثنین تھے، راستے میں کسی مقام پر حضرت زبیرؓ شامی سفرِ تجارت سے واپس ہوتے ہوئے رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملے اور دونوں بزرگوں کی خدمت میں سفید شامی ملبوسات ہدیہ کئے۔ اسی دورانِ سفر میں حضرت طلحہؓ نے بھی اپنی شامی سفر سے واپسی پر ملاقات کی سعادت حاصل کی اور انھوں نے بھی خدمتِ نبوی میں شامی ملبوسات کا ہدیہ پیش کیا۔ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں لیکن ہیں ایک ہی زمانے کے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے شریکِ تجارت بھی تھے لہٰذا ان کو ہدیہ کے علاوہ ان کا مالِ تجارت بھی ملا تھا جو اتفاق سے شامی کپڑوں پر ہی مشتمل تھا کیونکہ شام سے برآمد کئے جانے والے سامانِ تجارت میں ان کی تجارتی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔

(ابن سعد، ۳/ ۲۱۵ وغیرہ؛ موخر الذکر واقعہ کی وضاحت و تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عہد نبوی کی تجارت/ عہد نبوی کی شامی تجارت)

- حضرت عطارد بن حاجب تمیمیؓ کے بڑے گہرے تعلقات قدیم زمانے میں ایران کے شہنشاہ (کسریٰ) سے رہے تھے۔ وہ تجارت وغیرہ کے سلسلے میں دربارِ کسریٰ جاتے رہتے تھے۔ ایسے ہی کسی موقعہ پر کسرائے ایران نے ان کو ایک حلۂ دیباج بطور ہدیہ دیا تھا۔ وہ حلۂ ریشمی صحابی موصوف نے قبولِ اسلام کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کر دیا اور اسے آپ ﷺ نے قبول فرما لیا۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۶۸، بحوالہ طبرانی: "ان عطارد بن حاجب جاء بثوب من دیباج کساہ ایاہ کسریٰ ..." / انہ أھدی الی النبی ﷺ ثوب دیباج کساہ ایاہ کسریٰ..." ۔ دو مختلف روایات ہیں جن میں حافظ موصوف نے خوب تطبیق دی ہے)

- حدیثِ بخاری: ۵۸۰۱ میں بصیغہ مجہول یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ میں ایک ریشمی قبا کا ہدیہ پیش کیا گیا جس کو آپ ﷺ نے زیبِ تن فرمایا اور اس میں نماز بھی پڑھی اور پھر اسے ناپسندیدگی سے سختی و تیزی سے اتار ڈالا اور فرمایا کہ یہ متقیوں کے لئے مناسب نہیں ہے: "أهدى رسول الله ﷺ فَرُّوج حريرٍ، فلبسه، ثم صلّى فيه، ثم انصرف فنزعه نزعا شديداً - كالكاره له - ثم قال: لا ينبغي هذا للمتقين."

(بخاری، فتح الباری، ۱۰/ ۳۳۱-۳۳۴: امام احمد اور امام ابن اسحاق کے مطابق وہ نمازِ مغرب تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے دوسری توجیہات بھی کی ہیں)

- حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو ایک جبہ اور خفین ہدیہ کئے تھے جن کو آپ ﷺ نے اتنا استعمال فرمایا کہ وہ خوب پرانے ہو گئے تھے۔

(ترمذی، كتاب اللباس، باب في لبس الجبة)

- حضرت نجاشیؓ شاہِ حبشہ کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے اور ان کے اسلام لانے یا مسلم ہونے کی تصدیق حدیث نبوی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کے ہدیہ کا ذکر اسی خاص فصل مسلم میں کیا جانا مناسب ہے۔ انھوں نے بھی دوسرے ہدایا کے علاوہ عمدہ سیاہ موزوں کا ہدیہ بھیجا تھا۔

(ترمذی، ابواب الاستيذان والآداب، باب في الخف الاسود: "...أن النجاشي اهدى النبي ﷺ خفين اسودين ساذجين فلبسهما..."؛ ان کے اسلام پر ملاحظہ ہو: مکی اسوہ نبوی...دوسرا باب برحبشہ)

- ایک خاتونِ عہدؓ ایک چادر (بردة) لے کر حاضر ہوئیں جس کو شملہ کہا جاتا تھا اور جس کے کناروں پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے یہ چادر آپ ﷺ کے لئے اپنے ہاتھ سے بنی ہے تا کہ آپ ﷺ کو پہناؤں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی اور قبول فرمالی۔ رسولِ اکرم ﷺ اپنے گھر سے باہر تشریف لائے تو وہ آپ ﷺ کا ازار تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے رسولِ اکرم ﷺ کو روک کر اس چادر/ ازارِ نبوی کا سوال کر دیا۔ آپ ﷺ نے ہاں فرمایا اور مجلس میں کچھ دیر جلوس فرمانے کے بعد گھر واپس گئے اور اس کو تہہ کر کے سوال کرنے والے صحابی کو عطا فرما دیا۔ دوسرے صحابہ نے سائل کو سخت سرزنش کی کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم جانتے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ کبھی کسی سائل کو مسترد نہیں فرماتے۔ سائل صحابی نے کیا خوب توجیہ کی: واللہ! میں نے اس چادرِ مبارک کو اس

لئے مانگا ہے کہ وہ میری موت کے بعد میرا کفن بنے اور ایسا ہی ہوا، وہ ان کا کفن ہی بنی۔

(بخاری حدیث: ۵۸۱۰؛ فتح الباری، ۳۳۹/۱۰-۳۴۱؛ مزید بحث کے لئے حدیث: ۱۲۷۷؛ فتح الباری، ۱۸۳/۳-۱۸۵: اطراف حدیث: ۲۰۹۳؛ ۶۰۳۶؛ حافظ ابن حجرؒ ہدیہ کرنے والی خاتون کے نام نامی سے واقف نہیں ہو سکے۔ سوال کرنے والے صحابی کے بارے میں بھی ابہام ہے۔ ایک خیال ہے کہ وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ تھے اور دوسرا یہ کہ وہ حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ تھے۔ اور تیسرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک اعرابی صحابی تھے۔ حافظِ موصوف نے یہاں تعددِ قصص کی بات مانی ہے۔ حالانکہ یہ قصہ صرف ایک خاتون کے ہدیہ کا ہے اور وہ صرف ایک تھیں۔ اس کو طلب کرنے والوں کے مختلف اسماء اسے متعدد قصے/ واقعات نہیں بنا سکتے۔ وہ محب طبریؒ اور قتیبہؒ کے قیاسات محض ہیں)

- حضرت ابوجہم حذیفہ بن غانم عدوی قریشی ایک مکی صحابی تھے۔ انھوں نے خدمت نبوی میں ایک منقش چادر ہدیہ کی جس میں عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسے قبول فرمالیا اور اسی میں نماز ادا کی۔ دورانِ نماز آپ ﷺ کی نظر اس کے نقش و نگار پر پڑی کہ پڑی رہ گئی۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے اسے اتار کر حضرت ابوجہم کے پاس واپس بھجوادیا کہ وہ عبادت میں خلل انداز ہونے والی شے تھی۔ ہدیہ کرنے والے صحابی کی دل شکنی نہ ہو اس لئے آپ ﷺ نے ان سے ایک دوسرے لباس کی فرمائش کردی جسے حدیث میں ''انجانیہ'' کہا گیا ہے: ''صلی رسول الله ﷺ فی خمیصة له لها اعلام، فنظر الی اعلامها نظرة، فلما سلم قال: اذهبوا بخمیصتی هذه الی أبی جهم، فانها آلهتنی عن صلاتی وائتونی بانبجانیة ابی جهم حذیفة بن غانم...''

(بخاری، حدیث: ۵۸۱۷؛ فتح الباری، ۳۴۱/۱۰-۳۴۲ نیز بخاری، حدیث: ۳۷۳؛ فتح الباری ۶۲۵/۱-۶۲۶؛ نیز طرف دیگر: ۷۵۲؛ خمیصہ نقش و نگار والی چادر تھی اور انجانیہ بلانقش و نگار موٹا کپڑا تھا جس کی نسبت انجان نامی مقام کی طرف تھی۔ دوسری تمام نسبتوں پر کلام کیا گیا ہے۔ امام مالک و امام ابوداؤد نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور دونوں میں کافی فرق ہے۔ اس میں دینی جہت یہ ہے کہ نماز میں صاف سادہ کپڑے ہوں تا کہ نظر ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی نظر کے نقش و نگار میں پھنس جانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ حضور میں فرق آ گیا تھا۔ نیز موطا، کتاب الصلوٰۃ، النظر فی الصلاۃ الخ)

غیر مسلم ہدایا

عرب جاہلی میں بھی اکابر و شیوخِ قوم کو ہدایا بالخصوص ملبوسات کے ہدایا پیش کرنے کا

خاصا مستحکم رواج تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں کچھ غیر مسلم ایک عظیم و کبیر ترین شخص کی حیثیت سے ہدایا پیش کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ ان کو قبول فرماتے تھے۔ سربراہوں اور شہزادوں اور فرمانرواؤں کے ہدایا رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ گرامی میں بطور سربراہِ اسلامی ریاست آتے تھے۔ اور اسی حیثیت سے رسولِ اکرم ﷺ ان کو بھی ہدایا بھیجتے تھے کہ وہ بین الاقوامی سیاسی روابط کا ایک رابطۂ محبت بھی تھا۔ غیر مسلم ہدایائے ملبوسات وغیرہ کی بہرحال ایک اپنی اہمیت خاص ہے جو سیاسی، سماجی اور تہذیبی ہونے کے علاوہ دینی وتشریعی بھی ہے۔

(بخاری/ فتح الباری کے مذکورہ ابواب قبول ہدایائے مشرکین ونبوی ہدایا برائے مشرکین میں ان کی حکمتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے)

- جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرقی علاقے میں واقع ایک چھوٹی کندی سلطنت کے حکمراں اکیدر بن عبدالملک نے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک قیمتی ریشمی جبہ بھیجا تھا۔ احادیث میں اس کو "جبة سندس"/ جبة دیباج، ریشم کے دھاگوں سے کڑھا ہوا حلہ (حلة منکفوفة بحریر) اورفرّوج حریر وغیرہ کہا گیا ہے۔ وہ ایک ہی لباس کے مختلف نام ہیں۔ روایات کے مطابق آپ ﷺ نے اس کو تھوڑی دیر پہنا پھر کراہت سے اتار ڈالا کہ وہ متقی لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یہ وہی لباس ہے جس کا ذکر روایت بخاری-۵۸۰۱ میں بصیغہ مجہول کیا گیا ہے۔

(بخاری، کتاب الھبة، باب قبول الھدیة من المشرکین؛ فتح الباری، ۵/۲۸۳ مابعد؛ حدیث: ۲۶۱۶؛ رسولِ اکرم ﷺ نے بھی اسے مناسب ہدایا سے نوازا جن میں ملبوسات بھی تھے؛ واقدی، ۱۰۳۰: "واھدی لہ ھدیة فیھا کسوة")

-شاہِ ایلہ نے رسولِ اکرم ﷺ کے لئے ایک عمدہ ریشمی چادر بھیجی تھی۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے ہدایا تھے (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب من کرھہ الخ)۔ رسولِ اکرم ﷺ نے یحنہ بن روبہ ملکِ ایلہ کو یمنی چادریں ہدیہ کیں۔ (واقدی، ۱۰۳۲)

- رومی شہنشاہ کے مختلف ہدایا میں ایک قیمتی ریشمی لباس تھا جس کو روایت میں "القسی" کہا گیا ہے۔ (بخاری، کتاب اللباس، باب لبس القسی؛ فتح الباری، ۱۰/۳۶۰ ومابعد)

مقوقس، والی مصر، نے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ گرامی میں دوسرے قیمتی ونایاب ہدایا

کے علاوہ ملبوسات پر مشتمل ہدایا بھی بھیجے تھے۔ ان کو روایات میں دھاری دار (ثیاب مضلعة) کہا گیا ہے اور وہ بھی ریشمی ملبوسات تھے۔

(فتح الباری، ۱۰/۳۶۲: تشریحِ ثیاب مضلعة میں القسی کو اسی کا مترادف بتایا ہے۔ بہر حال وہ کافی قیمتی ریشمی کپڑے تھے)

- جنوبی عرب کے ایک عرب حکمراں ذویزن نے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک انتہائی قیمتی حلہ پیش کیا تھا۔ اس کی قیمت تینتیس اونٹوں/اونٹنیوں کی قیمت کے برابر آنکی گئی تھی۔ (حدیث ابوداؤد: ۴۰۳۴)

- عبدالعزیز بن سیف ذی یزن نے بھی خدمتِ اقدس میں متعدد حلے بطور ہدیے پیش کئے۔ ان کی قیمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان میں سے ایک حلہ حضرت عمرؓ کو ہدیہ فرمایا تھا اور اس کی قیمت بیس اونٹ کی قیمت کے برابر آنکی گئی تھی۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئے۔ ان کا اصل نام عزیز تھا، رسولِ اکرم ﷺ نے اسے بدل کر عبدالعزیز رکھا کہ غلط نام آپ ﷺ کو پسند نہ تھے۔"... فدفع اليه حللا ودفع النبي ﷺ منها حلة الى عمر بن الخطاب فقومت عشرين بعيرا" (اسد الغابہ، ۳/۳۳۹)

- وفودِ عرب بلا امتیازِ مذہب و علاقہ جب بھی حاضرِ خدمت ہوتے تھے تو رسولِ اکرم ﷺ کے لئے ہدیے لاتے تھے اور وہ بیشتر ملبوساتِ ریشم پر مبنی ہوتے تھے کیونکہ وہی قیمتی سمجھے جاتے تھے، جیسے بنو ثقیف کا وفد آیا تو وہ ہدیہ بھی لایا تھا۔ (اسد الغابہ، ۳/۳۱۱-۳۳۲)

غیر مسلموں کو ہدایائے نبوی

بخاری کی کتاب الهبة کے باب الهدية للمشركين کا ذکر اوپر آ چکا ہے مگر اس کے تحت جو دو احادیث نقل کی گئی ہیں وہ صحابہ کرام کے ہدایائے ملبوسات ہیں جو انھوں نے اپنے مشرک و کافر عزیزوں کو حسب ارشاد نبوی دیئے تھے یا باہر بھیجے تھے۔ حدیث: ۲۶۱۹ میں رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو جو ریشمی حلہ ہدیہ کیا تھا وہ ان سے ان کے مشرک بھائی کے لئے مکہ مکرمہ بھجوا دیا تھا اور حدیث: ۲۶۲۰ کے مطابق حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کی والدہ ماجدہ عہدِ نبوی میں مشرکہ تھیں، حضرت اسماء کے استفسار پر رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو کافرہ

ماں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۲۸۶-۲۸۸)

لیکن یہ دونوں واقعات ہی مشرکوں کے لئے ہدایائے مسلم دینے کے نہیں ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ان کے ہدایائے ملبوسات وغیرہ کے جواب یا مکافات میں ان کو بہتر اور زیادہ قیمتی ہدایا دیتے تھے یا ان کے علاقوں میں انھیں بھیجتے تھے۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے یحنہ بن روبہ ملک ایلہ کو یمنی چادروں کے بیش قیمت ہدایا ارسال فرمائے تھے۔ (واقدی، ۱۰۳۲)

- اسی طرح آپ ﷺ نے کندی سلطنت عرب - دومۃ الجندل - کے فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کو کافی ہدایا بھیجے اور ان میں ملبوسات بھی تھے: "وأهدیٰ له هدية فيها كسوة"

(واقدی، ۱۰۳۲)

- شاہ ذویزن کے قیمتی حلہ/ لباس کے جواب میں رسولِ اکرم ﷺ نے قیمتی حلہ خرید کر بھیجا جو پچیس قلوص (اونٹنیوں) کی قیمت کا تھا۔ (حدیث ابوداؤد: ۴۰۳۵)

لباس مستعار لینے کی سماجی روایت

ایک انتہائی دلچسپ، تعاون پر مبنی اور امداد باہمی کا عکاس سماجی اور تمدنی رویہ مستعار لینے کا نظر آتا ہے۔ وہ غالباً ایک آفاقی رویہ وطریقہ ہے اور تمام انسانی معاشروں اور تمدنوں میں جاری ساری رہا ہے اور آج بھی کافی رائج ہے۔ قدیم تہذیبوں اور جاہلی تمدن میں بھی تلاش وتحقیق سے اس سماجی وتمدنی طریقے کی مثالیں مل جائیں گی اور تسلسل کو ثابت کریں گی۔ چھوٹی موٹی چیزوں کے مستعار لینے کا ذکر کلام الٰہی میں ہے اور سورۂ ماعون کی آخری آیتِ کریمہ: "ويمنعون الماعون" (اور مانگے نہ دیں برتنے کی چیز) میں قریشی ظالموں کے اس تنگ دلانہ رویہ پر نقد ہے کہ وہ چھوٹی موٹی روزمرہ کی چیزیں مستعار دینے سے بھی کتراتے ہیں۔

عہد نبوی میں وہ کافی قریشی تنگ دلوں اور ظالموں کا رویہ تھا، اس کے برخلاف وسیع ظرف والوں کا دوسرا طریقہ تھا۔ وہ نہ صرف چھوٹی موٹی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں مستعار دیتے تھے بلکہ بالکل بخش دیتے تھے اور بڑی بڑی چیزیں عطا کر دیتے تھے۔ دوسری چیزوں سے

قطع نظر ملبوسات کے ضمن میں اس سماجی تعاون اور تمدنی معاونت کا ذکر بعض روایات کے حوالے سے کرنا ہے۔ اس بابِ خاص میں مَردوں میں کپڑے مستعار لینے اور پھر واپس کر دینے کا بھی رویہ تھا مگر شاید وہ ذرا محدود اور کم تھا۔ خواتین میں کپڑے اور زیورات وغیرہ مستعار لینے کا زیادہ ولولہ پایا جاتا ہے کہ زیب و زینت کا فطری ملکہ ان کے اندر زیادہ ہے۔

مردوں کے ملبوسات مستعار لینے کے واقعات میں سب سے مشہور و معروف وہ واقعہ ہے، جب حضرت کعب بن مالک خزرجیؓ کی توبہ غزوۂ تبوک میں محض تساہلی میں شرکت نہ کرنے کے جرم میں قبول ہوئی تو انھوں نے اپنے جسم کے دونوں کپڑے مبشر کو مارے خوشی کے دے دیئے اور یہ اس مبارک زمانے کا ایک اور سماجی اور تمدنی طریقے اور مسرت آمیز رویے کا نمونہ ہے اور پھر اپنے ایک عزیز سے کپڑے مستعار لئے اور رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں شکرانہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔

خواتین کے ملبوسات وغیرہ کے مستعار لینے کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ان میں اعلیٰ خواتین کے ساتھ عام خواتین بھی مبتلا نظر آتی ہیں، ان کے چند واقعات اور روایات کو ذیل میں ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے اور نتائج بعد میں اخذ کئے جائیں گے:

- امہات المومنین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنی بڑی بہن حضرت اسماءؓ سے کپڑے اور زیور مستعار لیا کرتی تھیں۔ زیور کا واقعہ اگلی بحث میں آتا ہے کہ وہ اسی سے متعلق ایک رویہ ہے۔

- خود عائشہ صدیقہؓ بھی دوسری خواتین کو اپنی چیزیں بالخصوص قمیص مستعار دیا کرتی تھیں۔ ان کے ملبوسات بالخصوص درع/ دروع کے بارے میں جو روایات اور واقعات ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مستعار لینے کا سماجی رویہ مستقل تھا اور صرف ایک دو واقعات تک محدود نہ تھا۔ بالعموم بچیاں اور عورتیں تقریبات پر کپڑے مستعار لیتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس مقصد - امداد باہمی - کے لئے اپنی خاص قمیصیں صرف مستعار دینے کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔

حدیثِ بخاری: ۲۶۲۸ میں ہے کہ حضرت ایمن بن ام ایمن/ عبیدؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس گئے تو ان کے جسم پاک پر ایک موٹے کپڑے کی سوتی قمیص - درع قِطر - تھی جس کی قیمت کل

پانچ درہم تھی۔ انھوں نے حضرت ایمن سے کہا کہ میری اس جاریہ (باندی) کو دیکھو کہ وہ گھر میں بھی زیب و زینت کرنا چاہتی ہے۔ عہد رسول اکرم ﷺ میں میرے پاس عمدہ قمیصیں تھیں اور مدینہ میں کوئی ایسی عورت نہ تھی جو تجمل اور زیب و زینت کرنا چاہتی تھی (شادی بیاہ میں جانے کے لئے) تو مجھ سے وہ ان کو مستعار مانگ کر نہ لے جاتی ہو۔ "...دخلت علی عائشةؓ وعليها درع قطر ثمن خمسة دراهم. فقالت: ارفع بصرک الی جاریتی أنظر إليها فانها تزهى ان تلبسه في البيت. وقد كان لي منهن درع على عهد رسول الله ﷺ، فما كانت امراة تقيّن بالمدينة الا ارسلت اليّ تستعيره"

(بخاری، کتاب الھبة، باب الاستعارة للعروس عند البناء؛ فتح الباری، ۵/ ۲۹۷ و مابعد)۔

قطری کپڑوں کے بارے میں مختلف تشریحات ہیں جیسے موٹے کپڑے کی سوتی قمیص، عمدہ سوتی قمیص، یمن کے قطری علاقے کے سرخی مائل کپڑے یا بحرین کے قریہ قطر نامی کے بنے ہوئے کپڑے وغیرہ۔ بہرحال اس سے زیادہ اہم تشریح حافظ یہ ہے کہ دلہن کے لئے کپڑوں کا مستعار لینا ایک معمول کا کام تھا اور محبوب بھی اور اس میں ذرا بھی قباحت نہ تھی: "... ان عارية الثياب للعروس امر معمول به مرغب اليه وانه لا يعد من الشنع."

موزے (خفین)

موزے (خفین) اگرچہ لباس کا ایک ناگزیر و لازمی حصہ نہیں ہوتے تاہم وہ اپنے استعمال کی بنا پر بن گئے تھے۔ موسم کی شدت بالخصوص گرمی کی حدت کے سبب وہ بڑی حد تک جوتوں کا کام دیتے تھے اور شدید سردی میں پاؤں کی خاصی حفاظت کرتے تھے۔ ان کی ساخت اور اس سے زیادہ ان کے خام مواد کی بنا پر ان کی افادیت، ضرورت اور لباس سے وابستگی اور بڑھ گئی تھی۔ بالعموم وہ چمڑے کے بنائے جاتے تھے اور پورے پیر کو ٹخنوں سمیت ڈھک لیتے تھے اور بعض اوقات تو وہ آدھی پنڈلی تک پہنچتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ عام موزے نہیں تھے بلکہ ان کا عربی نام خف/خفین زیادہ مناسب بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اور وہ مختلف قسم کے ہوتے تھے۔

(مصباح اللغات: چرمی موزہ کے علاوہ اونٹ اور شترمرغ کی ٹاپ کے معنی بھی دیئے گئے ہیں جو ان کے چرمی موزہ ہونے کی وجہ بتاتا ہے)

حدیث وسیرت کی روایات میں خفین کا ذکر زیادہ تر دینی مسئلہ کی حیثیت سے آتا ہے اور اس کے فقہی احکام ہیں۔ وہ یہ کہ وضو میں پیروں کو دھونے کی بجائے ان پر چڑھے ہوئے موزوں (خفین) پر مسح کرنا کافی ہے۔ پھر مقیم ومسافر کے لئے مسحِ خفین کے مختلف مسائل واحکام اور مسح کی کیفیت ومقام سے متعلق مباحث ملتے ہیں۔ اسی ضمن میں رسول اکرم ﷺ کے خفین پر مسح کرنے کی روایات آتی ہیں اور صحابہ کرام اور سلفِ صالحین کے تعامل کی بھی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ سماجی لحاظ سے بھی بعض تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ خفین کے بعض تمدنی زاویے بھی ہیں اور سب سے اہم بات کہ محدثین کرام نے ان کو لباس کا جزو بنایا ہے۔

(بخاری، کتاب الوضوء، باب المسح علی الخفین؛ فتح الباری، ۱/۳۹۹ مابعد)

سماجی مسائل میں بالعموم خفین کی ساخت، لمبائی چوڑائی، خام مواد کے علاوہ ان کے استعمال اور ہدایا کا ذکر زیادہ آتا ہے۔ سب سے زیادہ رسولِ اکرم ﷺ کے خفین کا ذکر ملتا ہے۔ دوسرے اکابر اور شخصیات کے موزوں کا بہت کم، لیکن جو بھی ذکراذکار ملتا ہے وہ خاصا دلچسپ ہے اور وہ موزوں کے لباس کے ایک تکمیلی جزو کی حیثیت سے اہم ہے۔ غالباً اسی لحاظ سے محدثین کرام نے موزوں (خفین) کا ذکر اپنی کتاب اللباس میں نہیں کیا ہے۔ وہ صرف کتاب الطهارة اور کتاب الوضو جیسے ابواب میں ہی ملتا ہے لیکن کتاب اللباس میں اس کے ذکر سے ان کی لباس سے وابستگی اجاگر ہوجاتی ہے اس لئے ہم نے اس کو اس مقام پر بیان کیا ہے۔

خفینِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے خفین کا ذکر بیشتر آپ ﷺ کے وضو میں مسح کرنے کے حوالے سے آتا ہے یا ہدایا کے حوالے سے۔ متعدد احادیث میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے موزوں (خفین) پر مسح فرمایا اور مختلف اوقات ومقامات پر فرمایا۔

(بخاری، کتاب الوضوء، باب الرجل یوضی صاحبه، باب المسح علی الخفین وغیرہ؛ فتح الباری، ۱/۳۹۹-۴۰۵؛ نیز مابعد؛ مسلم، کتاب الطهارة، باب المسح علی الخفین؛ ترمذی، باب فی المسح علی الخفین وغیرہ؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب المسح علی الخفین)

ان تمام احادیث میں غزوۂ تبوک کے دوران، فتحِ مکہ کے زمانے میں اور مدینۂ منورہ کے عہد میں خفین پر مسح کرنے کا خاص ذکر ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کے حوالے سے یہ ذکر آتا ہے کہ شاہِ حبشہ نجاشیؒ نے خدمتِ گرامی میں سیاہ سادہ موزے (خفین اسودین ساذجین) ہدیہ کئے تھے جن پر آپ ﷺ مسح فرماتے تھے۔ ان کو اتنا استعمال فرمایا تھا کہ وہ کافی پرانے ہو گئے تھے اور بعض دوسرے ہدایا کا بھی ذکر ملتا ہے۔

(حدیث مسلم: ۷۳، ۷۵، ۷۶-۷۷، ۸۶، ۲۷۳، ۲۷۷، نیز مابعد کی سات احادیث؛ ابوداؤد حدیث: ۱۴۹-۱۵۴ وغیرہ، نیز باب ہدایائے لباس)

خفینِ صحابہ و اکابر

دوسرے اکابر بالخصوص صحابہ کرامؓ کے خفین کا ذکر بھی مسح کرنے کے ضمن میں ہی زیادہ تر آتا ہے۔ ان اکابر میں حضرات عمر و علی، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کے موزوں پر مسح کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (کتاب الوضوء، باب المسح علی الخفین)

- ایک دلچسپ ذکر اس جنتی خاتون کے موزوں کا آتا ہے جس نے ایک پیاسے کتے کو کنوئیں سے اپنے موزے میں پانی کھینچ کر پلایا تھا اور اس کارِ خیر کے عوض وہ مغفرت کی مستحق ٹھہری تھی۔ (بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبھائم)

رومال (مندیل)

نفاست پسندی میں متعدد لوگ بالخصوص بڑے اشخاص رومال (مندیل) بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اس سے ہاتھ منہ پونچھا کرتے تھے بالخصوص وضو کرنے کے بعد یا کھانے پینے کے بعد۔ احادیث میں مندیل کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن ان کے استعمال کا سماجی ذکر نہیں ملتا بلکہ دینی حوالہ آتا ہے۔ بیشتر روایات حضرت سعد بن معاذؓ کے جنتی رومال کی ملتی ہیں۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ دومۃ الجندل کے شاہ و فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کندی کے ہاں سے ایک قیمتی نرم اور عمدہ ریشمی جبہ آیا تو اس کو چھو چھو کر صحابہ کرام میں سے بعض حضرات نے تحسین کی اور اس کی

نرمی اور عمدگی پر حیرت کا اظہار کیا تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں حضرت سعد کے رومال اس لباس سے زیادہ حسین و بہتر ہیں۔

(لمناديل سعد فى الجنة احسن مما ترون / لمناديل سعد بن معاذ خير منها او الين وغیرہ؛ نیز دیگر احادیث نبوی؛ بخاری، فضائل اصحاب النبى ﷺ، باب مناقب سعد بن معاذ، كتاب اللباس، باب مس الحرير من غير لبس، كتاب الايمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبى ﷺ؛ مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل سعد بن معاذ؛ نسائی، كتاب الزينة، باب لبس الديباج الخ)

مندیلِ نبوی

رسول اکرم ﷺ کے زیر استعمال مندیل کا بھی ذکر آتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور ایک رومال پیش کیا گیا مگر آپ ﷺ نے اس سے نہیں پونچھا:

"...ثم أتى بمنديل فلم ينفض بها"

(بخاری، كتاب الغسل، باب المضمضة الخ وغیرہ؛ ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب الغسل من الجنابة؛ مسلم، كتاب الحيض، باب صفة غسل الجنابة وغیرہ)

۔بعض روایات میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک کپڑے کا ٹکڑا (خرقہ) رہتا تھا جس سے وضو کے بعد پونچھا کرتے تھے "كان لرسول الله ﷺ خرقة ينشف بها بعد الوضوء"۔ اور آپ ﷺ کے اصحاب علم نے وضوء کے بعد رومال استعمال کرنے کی اجازت دی ہے: "وقد رخص قوم من اهل العلم من اصحاب النبى ﷺ ومن بعدهم فى التمندل بعد الوضوء"، (ترمذی، باب ماجاء فى التمندل بعد الوضوء)

- ایک روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کھانا تناول فرمانے کے کپڑے سے ہاتھ پونچھا: "ثم مسح يده بمسح كان تحته ..."

(ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب فى ترك الوضوء مما مست النار: مسح: هو كساء معروف)

بہرحال ان روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رومال (مندیل) کا تصور اور استعمال دونوں عہدِ نبوی میں موجود تھے اور لوگوں کے پاس منادیل رہتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا چلن کم تھا یا رسول اکرم ﷺ نے تواضع و سادگی کے سبب ان کو کم استعمال کیا۔

کفن۔لباسِ میت

لباس کا سب سے اندوہناک، المناک اور عبرت ناک استعمال لباسِ میت میں ملتا ہے جسے بالعموم کفن کہا جاتا ہے۔ اس انسانی ضرورت کا یہ پہلو بھی عجیب وغریب ہے کہ انتہائی ضروری چیزیں۔غذا اور پانی۔مرنے کے بعد بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ جسم و بدن کے روح کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کے لئے ناگزیر تھیں، لیکن جب جسم و بدن ہی نہ رہے تو ان کی بھی ضرورت وافادیت کیا رہی۔ لیکن لباس مرنے کے بعد بھی جسم سے لپٹا رہتا ہے اور انسان کی آخری منزل۔قبر۔تک ساتھ جاتا ہے اور وہاں بھی ساتھ رہتا ہے۔ لباسِ میت ایک سماجی، دینی، تہذیبی علامتِ خیر ہے۔ مردہ بدن کو بھی ستر پوشی کی حاجت ہوتی ہے اور اسے تہذیب کا عمل سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دین حنیفی سے جاہلی عربوں میں کفن اور اس سے متعلق متعدد چیزوں کی منتقلی کا ذکر اپنی مذکورہ بالا فصل میں کیا ہے۔

کفن کی ایک قدیم سماجی اور تہذیبی اور دینی روایت متواترہ رہی ہے۔ اسلام کے روزِ اول سے مُردوں (میت) کو کفن پہنانے کی ریت نبھائی جاتی رہی اور تمام دوسری تہذیبوں اور سماجوں میں بھی مُردوں کو کفن دینے کا رواج ہمیشہ رہا ہے۔ عربوں میں دینِ حنیفی سے کفن کی تہذیبی اور دینی اور سماجی ریت آئی تھی اور وہ اپنے مردوں کو ہمیشہ کفن دے کر دفناتے تھے۔ بلکہ ان کے اکابر اور عظیم شخصیات کی کفن سازی میں غلو اور مبالغہ کا عنصر بھی ملتا ہے کہ وہ شاندار، قیمتی ریشمی کپڑوں کا کفن دیتے تھے۔ متعدد عرب جاہلی اکابر کے کفن کا ذکر روایاتِ سیرت وسوانح میں ملتا ہے جو اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے:

۔رسول اکرم ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب ہاشمی کو دو یمنی حلوں کا کفن دیا گیا تھا جن کی قیمت ایک ہزار مثقال سونا تھا: "... ولف فی حلتین من حلل الیمن قیمتهما الف مثقال ذهب ..." (یعقوبی، تاریخ، ۲/۱۳ او مابعد: "عبدالمطلب ہاشمی...") ایسے متعدد اکابر جاہلی کے کفن کے کپڑوں کا ذکر مختلف روایات میں ملتا ہے کہ بقول حضرت شاہؒ وہ ان کی سنت مؤکدہ تھی جس کا ترک قابل ملامت تھا۔

رسولِ اکرم ﷺ اور اسلامی آخری دین و شریعت نے ہر مسئلہ و معاملہ حیات کی طرح لباسِ میت میں بھی توازن و اعتدال کے ساتھ ساتھ ستر پوشی اور حسن و جمال دونوں کا خاص خیال رکھا۔ مَردوں کے لئے بالعموم تین کپڑوں کا اور عورتوں کے لئے پانچ کپڑوں کا کفن اسی حسن و جمال کے پہلو کے لئے ہے ورنہ جسمِ مردہ کے لئے تو صرف ایک ہی چادر کافی تھی، زیادہ کی کیا ضرورت تھی؟ مگر اسلام نے زندہ جسم کی طرح مردہ بدن کی تحسین و تجمیل کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ اسی کے ساتھ ترفہ، اسراف، بیجا صرفہ اور بیہودہ دکھاوے کی ممانعت کی اور سادہ کفن کو مسلم میت کے لئے تجویز کیا۔ رسولِ اکرم ﷺ کا اسوۂ مبارک بعدِ وفات بھی جاری رہا۔

کفنِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے کفنِ مبارک کی بہت سی روایات کتبِ حدیث و سیرت میں بیان کی گئی ہیں، کیونکہ حیاتِ نبوی ﷺ کی مانند مماتِ نبوی ﷺ کو بھی رہتی دنیا کے لئے اسوۂ خیر بننا تھا اور دنیا کو راہِ اعتدال و حسن دکھانا اور سمجھانا تھا۔ حدیثِ نبوی کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کا کفن سفید کپڑوں پر مشتمل تھا جن کو بالعموم یمنی/سحولی سوتی کپڑے بتایا گیا ہے اور جن میں نہ قمیص تھی اور نہ عمامہ: "**ان رسول اللہ ﷺ کُفِنَ فی ثلاثة اثواب یمانیة بیض سحولیة من کرسف، لیس فیهن قمیص ولا عمامة**"۔

(بخاری، کتاب الجنائز، باب الثیاب البیض للکفن؛ باب الکفن بغیر قمیص ... ولا عمامة، فتح الباری، ۳/۱۷۳-۱۷۹؛ مسلم، کتاب الجنائز، باب فی کفن المیت؛ بعض روایات میں ہے کہ تکفین کے لئے رسولِ اکرم ﷺ نے ایک حلہ بھی خریدا تھا لیکن بعد وفات مسئلہ پر ابہام کے سبب اس کا کفن نہیں دیا گیا۔ اگلی روایات میں "بردِ حبرہ" وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے، ان میں حلہ اور قمیصِ نبوی کے بھی کفن بنانے کا ذکر ہے۔ ترمذی، ابواب الجنائز، باب فی کم کفن النبی ﷺ: "فی ثوبین وبردة حبرة، وقد اُوتی بالبرد ولکنهم ردّوه ولم یکفنوه فیه"؛ ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب المیت یسجّی: سُجّی ﷺ فی ثوب حبرة"؛ (باب فی الکفن) "... کُفّن فی ثلاثة اثواب نجرانیة: الحلة وثوبان، وقمیصه الذی مات فیه")

احادیثِ کفنِ نبوی کی طرح روایاتِ سیر و تاریخ میں بھی اسی طرح رنگارنگی ملتی ہے۔ ان

میں کفن کے کپڑوں کے مختلف اسماء واقسام کا ذکر آتا ہے: جیسے تین سحولی کپڑے (ثلاثة اثواب سحولية)، رباط يمانية، ليس فيها قميص ولا عمامة، فی ثوب حبرة، فی حلة حبرة وقميص، فی ثلاثة اثواب: ثوبين صحاريين وثوب حبرة (دوصحار کے بنے ہوئے کپڑے اور ایک حبرہ کا)، ثوبين ابيضين و ثوب حبرة، اور ایک روایت میں تو سات کپڑوں: سبعة اثواب کا بھی ذکر ہے۔ ایسے اختلافات بہت ہیں۔ (بلاذری، ۱/۵۷۲)

کفنِ صحابہ کرام

عہدِ نبوی میں متعدد صحابہ کرام کی وفات یا شہادت کے واقعات پیش آئے اور ان کو بعد وفات کفن دیئے گئے۔ ان میں سے متعدد صحابہ کرام کو رسول اکرم ﷺ نے بنفس نفیس اپنے ہاتھ سے کفن دیا یا اپنی نگرانی اور ہدایت میں کفن دلوایا۔ بہت سے شہیدوں اور میتوں کو ان کے گھر والوں نے کفن پہنایا اور بہت سے شہداء کے لئے اجتماعی طور سے کفن کا بندوبست کیا گیا۔ ان میں عام سادہ اسلامی کفن کے کپڑے تھے جن کو معیاری اسلامی کفن کہا جاسکتا ہے اور وہ ایامِ سہولت کے کفن بھی تھے۔ بعض شہدائے کرام کو غیر معمولی حالات میں کفن دیا گیا اسے کفنِ عسرت کہا جاسکتا ہے کہ عام اسلامی کفن دستیاب نہ تھا۔ امام بخاریؒ نے اسی ناگزیر تکفین کے واقعہ کے سبب ایک اسلامی حکم نکالا ہے کہ ہر حال میں تکفین ضروری ہے خواہ سارا مال کیوں نہ لگ جائے۔ ان کفنِ عسرت کی مثالوں کا تعلق شہداءِ احد سے ہے لہٰذا اس کا ذکر انھیں کے ذکرِ خیر سے عبرت و برکت کے لئے شروع کیا جاتا ہے۔

کفنِ عسرت

-حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ عظیم ترین شہیدِ احد تھے۔ ان کو صرف ایک چادر کا کفن نصیب ہوسکا "... وقتل حمزة ... فلم يوجد له ما يكفن فيه الا بردة ..."

(بخاری، فی مرط فی ثوب واحد؛ ترمذی، ابواب الجنائز، باب ماجاء کم کفن النبی ﷺ)

-حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ بھی عظیم ترین شہیدِ احد تھے۔ ان کا کفن اتنا چھوٹا تھا کہ

سر ڈھکتے تو پیر کھل جاتے اور پیر ڈھکے جاتے تو سرِ مبارک بے ستر ہو جاتا۔ آنسوؤں کے درمیان رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: سر کو چادر سے ڈھانک دو اور شہید کے پیروں کو اذخر نامی گھاس سے چھپا دو۔ یہ اس شہیدِ اسلام کا کفنِ عسرت تھا جو مکی زندگی میں اسلام سے قبل بہترین لباس پہنتا تھا: "قتل مصعب بن عمير ... فلم يوجد له ما يكفن فيه الا بردة، حديث : ۱۲۷۴ وغيره ؛ ... كُفِن في بردة، ان غطي رأسه بدت رجلاهُ، وان غطّي رجلاه، بدا راسه ...؛ حديث: ۱۲۷۵ ؛ ... فأمرنا النبي ﷺ ان نغطي راسه، وان نجعل على رجليه من الإذخر": حدیث: ۱۲۷۶۔

(متعدد اطراف؛ فتح الباری، ۳/۱۸۰-۱۸۲؛ كتاب الجنائز، باب الكفن من جميع المال، باب اذا لم يوجد الا ثوب واحد، وغیرہ۔ دوسرے ابواب/ باب غزوۃ احد میں بردہ کی جگہ نمرہ (دھاری دار چادر) ہے۔ نیز مسلم، كتاب الجنائز، باب في كفن الميت؛ ابوداؤد، كتاب الوصايا، باب الدليل ان الكفن من جميع المال؛ كتاب الجنائز، باب كراهية المغالاة في الكفن وغیرہ؛ ترمذی، ابواب الجنائز، باب ماجاء كم كفن الخ؛ باب في قتلى احد وغیرہ؛ ابوداؤد، كتاب الجنائز، باب الشهيد الخ وغیرہ)

کفنِ صدیقی

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کی وصیت کے سبب ان کے پرانے کپڑوں میں ہی ان کو دھونے کے بعد کفن دیا گیا کہ ان کے بقول نئے کپڑے زندہ لوگوں کے لئے زیادہ موزوں و مناسب تھے، مُردوں کے لئے ان کے پرانے کپڑوں کا کفن ہی مناسب و موزوں تھا۔ ان کی قمیص (ثوب) کو دھویا گیا اور مزید دو کپڑے میں کفن دیا گیا تا کہ سنت کا تقاضا پورا ہو سکے: ... به رَدْعٌ من زعفران فقال اغسلوا ثوبي هذا، وزيدوا عليه ثوبين، فكفنوني فيهما. قلت: ان هذا خَلَق؛ قال: ان الحي احق بالجديد من الميت، انما هو من المهلة ..."

(بخاری كتاب الجنائز، باب موت يوم الاثنين، حدیث: ۱۳۸۷؛ فتح الباری، ۳/۳۲۰-۳۲۲)

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیثِ بخاری کی شرح میں اسلامی کفن کی تمام جزئیات سمیٹ لی ہیں۔ وہ نظری بھی ہیں اور عملی بھی:

۱- سفید کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے۔ ۲- کفن کے تین کپڑوں کا بھی استحباب ہے۔

۳- اور اکابر کے کفن اور عمل سے موافقت باعثِ برکت ہے۔ ۴- دھلے ہوئے کپڑوں میں کفن دینا جائز ہے۔ ۵- کیونکہ جدید اور نئے کپڑوں کا زندوں کے لئے ہونے میں ایثار و ترجیح پائی جاتی ہے وغیرہ۔ ان نظری اور فکری باتوں کے علاوہ یہ واضح ہے کہ تمام صحابہ کرام کو عہدِ نبوی میں عام حالات میں اسی طرح تین کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا۔ اس سنتِ نبوی نے ایک معیارِ اعتدال قائم کیا تھا جس میں نہ کنجوسی تھی، نہ تحقیرِ میت اور نہ ہی اسراف و تبذیر اور ریا کاری۔

اسی اسلامی معیاری کفن کی تصدیق ایک اور واقعہ سے ہوتی ہے۔ عہدِ نبوی میں ایک صحابی کی وفات ہوگئی تو ان کو معمولی اور چھوٹا کفن دے کر رات ہی میں دفن کر دیا گیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زحمت دہی سے بچانے کے لئے خبر نہ کی گئی۔ صبح کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے ان کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی اور خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ جب اپنے بھائی کو کوئی کفن دے تو اس کو اچھا کفن دے: "اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ" (مسلم، کتاب الجنائز، باب فی تحسین کفن المیت؛ ابو داؤد، کتاب الجنائز، باب فی الکفن) اور تحسینِ کفن یہی ہے کہ اسے تین نئے سفید کپڑوں میں کفن دیا جائے کہ سنتِ نبوی میں ضرورت کے ساتھ ساتھ حسن و جمال بھی ہے۔

کفنِ صحابیات

صحابیاتِ طاہرات کے کفن کے اسلامی معیارِ عدل کا ذکر رسول اکرم ﷺ کی بناتِ طاہرات کے کفن میں ملتا ہے۔ تین تین دخترانِ نبوی رضی اللہ عنہن حیاتِ نبوی ﷺ ہی میں وفات پا گئی تھیں، صرف حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کے بعد رحمتِ حق سے پیوست ہوئیں۔ مرحومہ دختروں کے کفن و تکفین اور تجہیز و تدفین کے سارے انتظامات رسولِ اکرم ﷺ کی براہ راست نگرانی اور ہدایت میں کئے گئے تھے لہٰذا وہ خواتینِ عہدِ نبوی کے ملبوساتِ میت کے لئے معیار بن گئے اور تمام عورتوں کو اس زمانے میں اور اس کے بعد بھی وہی کفن دیئے گئے۔ محدثین کرام نے غالبًا اسی وجہ سے بناتِ طاہرات کے کفن و تکفین کی احادیث بڑے اہتمام اور تمام جزئیات کے ساتھ بیان کی ہیں۔

دوسری تفصیلاتِ میت و تجہیز کے علاوہ کفن کے کپڑوں کا ذکر ان روایات میں بہت واضح نہیں لیکن اس کمی کی تلافی شارحین نے پوری کردی ہے۔ ان کے بیانات بالخصوص حافظ ابن حجرؒ کے بحث کے نکات بابت کفنِ خواتین حسب ذیل ہیں:

- حضرت حسن بصریؒ کے ترجمۃ الباب میں قول کے مطابق عورت کے کفن میں پانچ کپڑے ہوں گے۔ تین مردانہ کفن کی طرح چوتھی اوڑھنی اور پانچویں سے قمیص کے نیچے رانوں وغیرہ کو باندھا جائے گا: ''الخرقة الخامسة يُشَدّ بها الفخذين والوركين تحت الدرع''

- بقولِ حافظ ابن حجرؒ حضرت ام عطیہ انصاریؓ نے دخترِ رسول ﷺ کو پانچ کپڑوں کا کفن دیا تھا اور ان کو اسی طرح اوڑھنی پہنائی تھی جیسے زندہ خاتون پہنتی ہیں: ''...فكفناها في خمسة اثواب وخمّرناها كما يخمّر الحي''۔

- عورت کے کفن میں قمیص کا ہونا مکروہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بعد کے فقہاء کا مسلک ہے۔ اصل یہ ہے کہ بلا سلے کپڑے ہونے چاہئیں۔

- یہ حضرت ام کلثومؓ کے کفن کا ذکرِ خیر ہے اور وہی اصل نسوانی کفن بن گیا۔

(بخاری، كتاب الجنائز، باب كيف الإشعار للميت ؛ ترجمة الباب ؛ حدیث:۱۲۶۱؛ فتح الباری، ۳/۱۷۰-۱۷۱ وغیرہ؛ مسلم، كتاب الجنائز مختلف ابواب؛ ابن ماجہ، كتاب الجنائز، باب في غسل الميت؛ وغیرہ؛ ترمذی، ابوداؤد وغیرہ کے ابوابِ غسلِ میت)

✪✪✪

جوتے (نعلین)

جوتوں کا لباس سے گہرا تعلق ہے، اگر چہ وہ اس کا حصہ نہیں ہیں۔ اسی بنا پر محدثین کرام نے جوتوں کا ذکر اپنی اپنی کتاب اللباس میں کیا ہے اور دینی وتشریعی اعتبار سے کیا ہے۔ جس طرح انھوں نے موزوں (خفین) کا ذکر کتاب الطہارہ میں کیا ہے۔ فقہی نقطۂ نظر یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے نعلینِ شریفین کے ساتھ نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعد میں اس پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا لہٰذا رسول اکرم ﷺ اور بعض اکابرِ صحابہ کرامؓ کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جوتوں کے ساتھ نماز پڑھی گئی اور ان کے ساتھ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان میں نجاست نہ لگی ہو۔ اسی ضمن میں بعض سماجی اور تہذیبی اقدارِ نعلین کا سراغ بھی مل جاتا ہے۔

(مالک، موطا، کتاب الحج، العمل فی الاهلال، العمل فی الهدی الخ، وغیرہ ابواب بالخصوص؛ کتاب الجامع، ماجاء فی الانتعال، کتاب الوضوء، غسل الرجلین فی النعلین؛ بخاری، باب النعال السبتیة وغیرها، حدیث: ۵۸۵۰ وغیرہ؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۷۹-۳۸۵)

اسی کے ساتھ بعض دوسرے احکام بھی ملتے ہیں کہ جوتے ضرور پہننے چاہئے (حدیث: ۵۸۵۲-۵۸۵۳)، جوتے پہننے میں آغاز دائیں طرف سے کرنا چاہئے (حدیث: ۵۸۵۴)، ایک جوتے میں نہ چلنا پھرنا چاہئے (حدیث: ۵۸۵۵)، اتارنے میں آغاز بائیں جانب سے کرنا چاہئے (حدیث: ۵۸۵۶) رسولِ اکرم ﷺ کے نعلینِ شریفین کی ہیئت وشکل وغیرہ کیا ہوتی تھی (حدیث: ۵۸۵۷-۵۸۵۸ وغیرہ)؛ دوسری احادیثِ بخاری ومسلم؛ نیز موطا، کتاب الجامع، باب ماجاء فی الانتعال؛ نیز بخاری ومسلم، کتاب الصلوٰة، باب الصلاة فی النعال، وغیرہ)

نعلینِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے نعلینِ شریفین کی ساخت، بناوٹ، خام شے اور استعمال وغیرہ کا ذکر

روایات میں بہت آتا ہے۔ بعض سیرت نگاروں نے صرف نعلینِ شریفین کے ذکرِ خیر کے لئے بعض رسائل لکھے ہیں۔ صلاح الدین المنجد نے چھ رسائل کا ذکر کیا ہے جن میں دو مطبوعہ ہیں: معجم ما ألف عن رسول الله ﷺ، بحث بر "نعالِ الرسول ﷺ": احمد بن محمد مقری (م ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء) کی کتاب "فتح المتعال فی وصف النعال" مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۳۴ھ اور یوسف بن اسماعیل النبہانی (م ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء) کی کتاب "مثال نعل النبی ﷺ"، مطبوعہ مصر، سرکیس ۱۸۴۱)۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تشریح میں لکھا ہے کہ بقول امام ابن العربی جوتے انبیاءِ کرام کے لباس میں شامل تھے: "النعل لباس الانبیاء"۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے ملتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتوں کا حوالہ دیتی ہے اور مقدس مقامات پر ان کو اتار کر حاضری کا حکم بیان کرتی ہے۔ ﴿... فاخلع نعليك انك بالواد المقدس طوىٰ﴾۔ طٰہٰ: ۱۲: سو اتار اپنی پاپوشیں، تو ہے پاک میدانِ طویٰ میں: عبدالقادر دہلویؒ۔ حضرت کعب الاحبارؒ کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مردہ گدھے کی کھال کے تھے: "كانتا من جلد حمار ميت" (موطا، کتاب الجامع، مذکورہ بالا) یہ خیال محض قیاس ہے۔

بہر حال سنت نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ مقاماتِ مقدسہ پر آپ ﷺ بھی اپنے نعلینِ شریفین اتار دیتے تھے جیسا کہ روایات میں مذکور ہے کہ فتحِ مکہ اور حجۃ الوداع کے مواقع پر خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے وقت آپ ﷺ نے نعلین اتار دیئے تھے: "دخل ... الكعبة ... وخلع نعليه ..." (واقدی، ۱۱۰۰)

حدیثِ بخاری-۵۸۵۱ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نعالِ سبتیہ پہنا کرتے تھے، اس میں بال نہیں ہوتے تھے اور ان میں وضو فرماتے تھے: "وأما النعال السبتية، فانى رأيت رسول الله ﷺ يلبس النعال التى ليس فيها شعر ويتوضأ فيها ..."۔ بعض شارحین نے سبت کی طرف نسبت ہونے سے ان کو سبتیہ کہا ہے مگر امام ابوعبید کا قول ہے کہ وہ کمائے ہوئے چمڑے کے ہوتے تھے: "هى المدبوغة"۔ تمام تشریحات سے واضح یہ ہوتا ہے کہ چمڑا جب پکالیا جاتا تھا تو اس پر موجود بال اتر جاتے تھے اور وہ نرم ہو جاتے تھے اور اس چمڑے کے جوتے بنائے جاتے تھے جو پیروں کو آرام دیتے تھے۔ سیوطی نے قاضی عیاض کے حوالے سے لکھا ہے

کہ عرب عادتاً بالوں والے جوتے پہنا کرتے تھے جو بغیر دباغت کے ہوتے تھے:"وكان من عادة العرب لبس النعال بشعرها غير مدبوغة"۔نعالِ سبتیہ کے بارے میں یہی تشریحات تنویر الحوالک نے ابوعمرو شیبانی وغیرہ سے نقل کی ہیں البتہ ان میں بعض نئی معلومات ہیں مثلاً ابوزید کے بقول سبت گائے کی دباغت والی کھال کو کہتے ہیں:"السبت جلود البقر مدبوغة"۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ دباغت کی وہ ایسی قسم ہے جو بالوں کو اکھاڑ دیتی ہے۔ابن وہب کے مطابق وہ سیاہ جوتے ہوتے تھے جن پر بال نہیں ہوتے تھے:"النعال السبتية كانت سوداء لاشعر فيها" (۱/۳۰۸)

-ایک قدیم مکی بزرگ حضرت عطاء بن عبید اللہ اللیثیؒ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "مقام" میں سبتی جوتے پہنے ہوئے دیکھا:"رأيت رسول الله ﷺ في المقام وعليه "نعلان سبتيان" (اسد الغابہ، ۳/۴۱۰۔بعض ناقدین نے ان کی صحابیت پر شبہ کیا ہے)

- رسولِ اکرم ﷺ کے نعلینِ مبارک کا ایک حوالہ ایک اور حدیث میں آتا ہے جو وحیِ حدیث کے واقعہ ہونے کے علاوہ بہت اہم ہے۔اس میں صحابہ کرام کے جوتوں کا بھی حوالہ آتا ہے اور وہ نماز جوتے پہن کر پڑھنے کے مسئلہ سے ہی متعلق ہے۔حضرت ابوسعید خدریؓ کے بیان کردہ عینی شہادت پر مبنی واقعہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک آپ نے اپنے دونوں جوتے اتارے اور ان کو اپنے بائیں رکھ لیا۔قوم نے جب یہ دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے جوتے اتار ڈالے۔نماز کے بعد رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم نے کیوں اتار ڈالے۔انھوں نے سنتِ نبوی کی بات کہی تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اس لئے اپنے جوتے اتار ڈالے کہ حضرت جبریلؑ نے مجھے آکر بتایا کہ ان میں گندگی لگی ہے لہٰذا تم جب مسجد آیا کرو تو اپنے جوتوں کو دیکھ لیا کرو۔اگر گندگی لگی ہو تو اسے صاف کر دو اور ان میں نماز پڑھا کرو۔

(ابوداؤد، كتاب الصلاة، باب الصلاة في النعال: "... بينما رسول الله ﷺ يصلي باصحابه اذ خلع نعليه فوضعهما عن يساره، فلما رأى ذلك القوم القوا نعالهم ... الخ"۔بہر حال اس حدیث سے یہ سماجی روایت ثابت ہوتی ہے کہ بالعموم تمام صحابہ کرام اور دوسرے لوگ جوتے پہنا کرتے تھے، ننگے پاؤں رہنے پر وہی لوگ مجبور تھے جو نادار تھے یا جبلی طور سے جوتے ان کو کاٹتے تھے)

- امام ابوداؤد ہی نے روایات نقل کی ہیں جن میں رسولِ اکرم ﷺ کے نعلینِ شریفین کا ذکر ملتا ہے: حضرت اوس بن اوس ثقفیؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے نعلین اور قدمین پر مسح کیا: "ومسح علی نعلیه وقدمیه"۔ حضرت عبادؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو ایک قوم کے وضو خانے میں آتے دیکھا اور آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور نعلین و قدمین پر مسح کیا۔(ابو داؤد، کتاب الطهارة، باب بعد باب المسح علی الجوربین)

- حضرت عبداللہ بن ابی حبیبہؓ ایک بدری صحابی کے فرزند اور قباء کے باشندے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہماری مسجد قباء میں تشریف لائے تو مجلسِ صحابہ میں تشریف فرمائے ہوئے اور پھر آپ ﷺ نے نعلین شریفین میں نماز ادا فرمائی: "فرأيته يصلي في نعليه"

(ابن اثیر، اسد الغابہ، ۳/۱۱۵، ۱۴۱)

- حضرت عبداللہ بن سائبؓ فرماتے ہیں کہ فتحِ مکہ کے دن میں نے رسول اکرم ﷺ کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ نے اپنے جوتے اپنے بائیں طرف رکھ چھوڑے تھے: "رأبت النبی ﷺ یصلی یوم الفتح ووضع نعلیه عن یساره" یعنی نماز میں نہیں پہنے تھے۔

(ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب الصلاة فی النعل؛ نیز نسائی، کتاب الافتتاح، قراءة بعض السورة)

- ایک صحابی جلیل کی شہادت ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو ننگے پاؤں اور جوتے پہنے دونوں طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

(ابوداؤد، مذکورہ بالا، حدیث: ۶۵۳: "رأیت رسول الله ﷺ یصلی حافیا ومنتعلا". عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده)

- حضرت عبداللہ بن الشخیرؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو دیکھا کہ آپ ﷺ نے تھوکا اور اسے اپنے جوتے سے رگڑ دیا: "صلیت مع رسول الله ﷺ فرأیته تنخع فدلکها بنعله"۔ دوسری روایت میں ہے کہ بائیں جوتے سے دبا دیا۔

(مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب النهی عن البصاق فی المسجد)

جوتے کے دوسرے دینی سماجی استعمالات بھی تھے۔ ان میں قربانی کے جانوروں (ہدی) کو قلادہ پہنانے کا قدیم رواج تھا۔

-رسولِ اکرم ﷺ کا ایک عمل وسنت یہ بھی تھی کہ آپ قربانی کے جانور مکہ مکرمہ بھیجتے یا ساتھ لے جاتے تو ان کو جوتوں کا قلادہ پہناتے تھے: "... وقلدها نعلين"۔ اس کا متعدد احادیث میں ذکر آیا ہے (مسلم، كتاب الحج، باب تقليد الهدى و اشعاره عند الاحرام؛ موطا، كتاب الحج، العمل فى الهدى حين يساق؛ العمل فى النحر)۔ اس عمل کی وجہ یہ تھی کہ قربانی/ ہدی کے جانور عام جانوروں سے ممتاز ہوجائیں اور لوگ سمجھ لیں کہ وہ ہدی کے جانور ہیں۔ عرب قبائل ان کا احترام بھی کرتے تھے اور تحفظ بھی کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بعض افراد وطبقات مکہ مکرمہ نے مسلمانوں کو ان ہی قلادہ بردار ہدی کے سبب عمرہ کرنے والا تسلیم کیا تھا اور اکابر قریش کو مجبور کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے دیں۔

دو تسمے والے جوتے

جوتوں کی ایک قسم دو تسموں والے جوتوں کی شکل میں نظر آتی ہے جن کو "قبالان فى نعل" کے باب کے تحت بعض محدثینِ کرام نے بیان کیا ہے۔ اس کی شکل مروجہ چپلوں کی طرح ہوتی ہے جس میں ایک گھنڈی پیر کی دو انگلیوں کے درمیان پھنسالی جاتی ہے اور اس کے اوپر دو تسمے ہوتے ہیں جو پیر کے اوپری حصہ میں ایک سے دوسری جانب جاتے ہیں اور قدم اٹھانے میں جوتا چپکا رہتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تعریف میں لکھا ہے: "... هو الزمام، وهو السير الذى يعقد فيه الشسع الذى يكون بين اصبعى الرجل"

(فتح الباری، ۱۰/۳۸۴-۳۸۵؛ مصباح اللغات: القبال: تسمہ؛ نیز دوسری تشریحات محدثین وامامان لغت؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ۱/۴۳، ۳/۴۱۰ وغیرہ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے جوتوں میں دو تسمے لگانے کا حکمِ عام بھی وقتاً فوقتاً عطا فرمایا: "... قابلوا النعال، اجعلوا للنعل قبالين")

امام بخاریؒ نے اسی باب میں حضرت انس بن مالکؓ کی ایک حدیث بیان کی ہے۔ بعد کے راوی عیسیٰ بن طہمانؒ کے مطابق حضرت انس بن مالکؓ نے نعلین نکالے جن میں دو تسمے تھے اور ثابت بنانیؒ نے فرمایا کہ یہ نبی اکرم ﷺ کا جوتا ہے: "اخرج الينا انس بن مالك نعلين لهما قبالان. فقال ثابت البنانى: هذه نعل النبى ﷺ" حدیث: ۵۸۵۸، مگر اس سے قبل

کی حدیث ۵۸۵۷ میں حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نعلینِ شریفین میں دو تسمے ہوتے تھے: "ان نعلی النبی ﷺ کان لهما قبالان"۔ ان دونوں احادیث کے مجموعہ کے بعد مرسل اور مرفوع کی بحث علمی رہ جاتی ہے۔ حدیث انسؓ بہرحال مرفوع ہے۔

بعض دوسری روایات میں ان نعلینِ شریفین کے لئے ایک اور لفظ "جـرداوتین" بھی استعمال کیا گیا ہے کہ حضرت انسؓ نے دو جرداوتین نعلین دکھائے جن کے دو تسمے تھے۔ یہ روایت امام ابن حجرؒ نے اسی باب میں امام احمدؒ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الجهاد کے باب ماذکر من درع النبی ﷺ کی ایک حدیث میں "نعلین جَرْداوین" ہے یعنی آخری لفظ مذکر ہے۔ بہرحال دو تسموں والے نعلینِ شریفین کا ذکر تقریباً تمام کتبِ حدیث میں ہے اگرچہ ان میں جرداوین/ جرداوتین کا لفظ نہیں ملتا ہے:

(ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی الانتعال: نعل النبی ﷺ کان لها قبالان ترمذی، ابواب اللباس، باب فی نعل النبی ﷺ: کان نعلاه لهما قبالان، ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب صفة النعال: کان لنعل النبی ﷺ قبالان، مثنی شراکهما؛ ترمذی، الشمائل میں بھی یہی عبارت ہے؛ فتح الباری، ۱۰/۳۸۵ ومابعد)

دو تسمے والے جوتوں کے باب میں امام بخاریؒ نے عنوان میں یہ اہم اضافہ بھی کیا ہے: "ومن رای قبالا واحدا واسعا"۔ حافظ ابن حجرؒ کی تشریح کے مطابق دو جوتوں میں سے ہر ایک میں ایک لمبا تسمہ ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے دونوں جوتوں میں دو تسمے تھے لیکن امام بخاریؒ کے پورے باب کے عنوان سے دو قسم کے جوتے معلوم ہوتے ہیں: ایک وہ جوتے جن میں سے ہر ایک میں دو تسمے ہوتے تھے (باب فی قبالان فی نعل) اور دوسرے وہ جن میں سے ایک ہی میں صرف ایک تسمہ ہوتا تھا (ومن رأی قبالا واحدا واسعا)۔ یہی احادیثِ ترمذی وابن ماجہ سے بھی واضح ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بزار، طبرانی، نسائی وغیرہ سے بھی اس حدیث کی شہادت فراہم کی ہے۔ بہرحال ایسے جوتوں- چپلوں- وغیرہ کے ذکر سے خلجان پیدا ہوتا ہے کہ وہ جوتے نہیں تھے۔ اس کا شافی جواب حافظ ابن حجرؒ نے یہ دیا ہے کہ لفظ جوتا (نعل) ہر اس چیز پر صادق آتا ہے جو پیروں میں بغرض حفاظت پہنی جائے: "ان النعل صادقة علی مجموع ما یلبس فی الرجلین" (فتح الباری، ۱۰/۳۸۵)

۔ رسول اکرم ﷺ کے نعلینِ شریفین کا ایک بہت اہم ذکر امام مسلم کی روایتِ حضرت ابو ہریرہ دوسیؓ میں ملتا ہے۔ ''رسولِ اکرم ﷺ اپنے اصحابِ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے جن میں حضرات ابو بکر و عمرؓ وغیرہ بھی شامل تھے۔ اچانک آپ ﷺ اٹھ کر تشریف لے گئے۔ جب دیر تک واپس نہیں آئے تو میں گھبرا کر تلاش میں نکلا اور رسولِ اکرم ﷺ کو بنو النجار کے باغ میں پایا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مجھے اپنے نعلین شریفین دیئے اور فرمایا کہ ان نعلین کے ساتھ جاؤ اور اس احاطۂ باغ کے پیچھے جس کسی شخص کو پاؤ جو صدق دل سے ایمان والا ہو تو اس کو جنت کی بشارت دے دو۔ اتفاق سے میری سب سے پہلے ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی اور انھوں نے ماجرا پوچھا تو میں نے بتایا کہ دونوں رسولِ اکرم ﷺ کے نعلین شریفین ہیں اور ان کے ساتھ مجھے آپ ﷺ نے یہ بشارت دینے کے لئے بھیجا ہے۔ بہر حال حضرت عمرؓ کے مشورے پر حضرت ابو ہریرہؓ خدمتِ نبوی میں واپس پہونچے اور رسولِ اکرم ﷺ ان کے خیال سے کہ لوگ تکیہ کر لیں گے اور عمل سے گریز کریں گے اعلانِ بشارت کو روک دیا۔ اس حدیثِ مبارک میں رسولِ اکرم ﷺ کے نعلین شریفین کے ذکر کے علاوہ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ انھیں بطور ثبوتِ بشارت و فرمان نبوی استعمال کیا گیا تھا۔

(مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنة: ''...اعطانی نعليه، قال: اذهب بنعلي هاتين ... فقال [عمر]: ما هاتان النعلان يا ابا هريرة؟ فقلت: هاتان نعلا رسول الله ﷺ، بعثني بهما''...)

آدابِ مجلس کے اعتبار سے رسولِ اکرم ﷺ کے جوتوں کا ایک اور عمدہ عمل بلکہ مستقل سنت کا ذکرِ خیر ملتا ہے۔ حضرت ابو الدرداءؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے ارد گرد پرے جماتے اور آپ ﷺ کا مجلس سے کسی کام سے جا کر واپس آنے کا ارادہ ہوتا تو اپنے جوتے اتار دیتے یا اپنی کسی چیز کو اتار کر رکھ دیتے، صحابہ کرام سمجھ جاتے کہ آپ ﷺ ابھی واپس تشریف لائیں گے تو وہ اپنی جگہوں پر بیٹھے/ جمے رہتے اور مجلس سے منتشر نہ ہوتے ''كان رسول الله ﷺ اذا جلس جلسنا حوله، فقام فاراد الرجوع نزع نعليه او بعض ما يكون عليه، فيعرف ذلك اصحابه فيثبتون''

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب اذا قام من مجلس ثم رجع، حدیث: ۴۸۵۴)

۔صحابہ کرام میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ ان خوش نصیبوں میں شامل تھے جن کو نعلین شریفین کی مرمت اور سینے بنانے کا شرف حاصل تھا اور اسی بنا پر رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو "خاصف النعل" کا لقب دیا تھا اور تاویلِ قرآن کرنے والے بد باطن گروہ کی گردنیں اڑا دینے والا قرار دیا تھا: "وکان علیٌ یخصف نعل رسول اللہ ﷺ"۔ حدیث کے مطابق شیخین کے سوال کے انکار کے بعد آنحضرت ﷺ نے خاصف النعل کہا تھا۔

(اسد الغابہ، ۳/۲۸۲، ۴/۲۶ نیز ترمذی، ابواب المناقب، مناقب علی وغیرہ کے مطابق یہ صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے)

بالوں والے جوتے (نعال الشعر)

جوتوں کی تیسری قسم بالوں والے جوتے تھے۔ ان کا ذکر بعض شارحینِ کرام کی تشریحات کے علاوہ احادیث میں بھی ملتا ہے۔ ان کی سماجی قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ اہلِ شرک و کفر کے پہناوے سمجھے جاتے تھے اور شارحین میں حافظ ابن حجرؒ نے پوری وضاحت سے کہا ہے کہ ایسے جوتے صرف جاہلی عرب اور ان کے مشرکین ہی پہنا کرتے تھے۔ وہ بلا دباغت والے چمڑے کے ہوتے تھے۔ اسلامی شریعت و دین میں مردہ چمڑا اور اس کا استعمال ناجائز ہے۔ دباغت کے بعد ہی وہ جائز و قابلِ استعمال بنتا ہے۔ اسی بنا پر رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے کسی کے بھی جوتوں کے بارے میں کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے کہ وہ بالوں والے تھے۔

اس کے برعکس بعض احادیث میں ایسے جوتے دشمنانِ اسلام اور مخالفینِ دین کے ایک نشان قرار دیئے گئے ہیں۔ امام بخاریؒ وغیرہ محدثینِ کرام نے بعض خاص ابواب باندھے ہیں کہ بالوں والے جوتے پہننے والے اسلام کے خلاف جنگ کریں گے اور مسلمان ان سے قتال کریں گے۔ ان کو ترکوں اور رومیوں وغیرہ سے شناخت کیا گیا ہے اور بعض دوسرے طبقات سے بھی۔ ایسی اقوام اور ان کی علامات نعل کو قیامت کی نشانیاں بھی قرار دیا گیا ہے اور بالوں والے جوتے ان کی ایک اہم نشانی ہیں۔

(بخاری، کتاب الجهاد، باب قتال الترک؛ باب قتال الذین ینتعلون الشعر؛ فتح الباری، ۶/۱۲۷-۱۲۸ و ما بعد؛ مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتی الخ)

نعلینِ صحابہ و اکابر

سنتِ انبیاء اور سنتِ محمدی ہونے کے سبب صحابہ کرام جوتے استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک سماجی رواج بھی تھا۔ چنانچہ تمام شرفاء اور شہری بالعموم جوتے پہنتے تھے اور وہ ان کے ملبوسات کے خاص حصے تھے۔ ممکن ہے کہ بعض بدوی جوتے نہ پہنتے ہوں۔ لیکن اہلِ وسعت وصاحبانِ مال اور مہذب افراد میں جوتے پہننے کا عام رواج تھا۔ جوتوں کی بھی ملبوسات کی طرح مختلف اقسام تھیں۔ ان میں سبتی جوتوں اور پکے کمائے ہوئے چمڑے کے نعلین کو صرف متمول اور صاحبانِ استطاعت ہی استعمال کرتے تھے جیسا کہ امام ابوعبید نے اپنی تشریح میں لکھا ہے: ''كانوا في الجاهلية لايلبس النعال المدبوغة الا اهل السعة...'' اور اس کا ایک شعر سے استشہاد کیا ہے

(فتح الباری، ۱۰/۳۸۰؛ سیوطی، تنویر الحوالک، ۱/۳۰۸: کمائے ہوئے چمڑے کے جوتے طائف وغیرہ میں بنائے جاتے تھے اور ان کا استعمال مال دار کرتے تھے: ''... وكانت المدبوغة تعمل بالطائف وغيرها، وانما يلبسها اهل الرفاهية...'')

-رسولِ اکرم ﷺ کے نعلینِ شریفین پہننے کی جو عینی شہادت اوپر گذری ہے وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ہے اور اسی بنا پر وہ ہمیشہ نعالِ سبتیہ ہی پہنا کرتے تھے: ''... فانا احب أن ألبسها ...'' (نیز موطا، کتاب الحج، باب العمل فی الاهلال)

-حضرت بلال حبشیؓ کے جوتے استعمال کرنے کی ایک انتہائی اہم، معنی خیز اور قابلِ تقلید مثال ایک رویائے نبوی علیہ السلام میں ملتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے ایک خاص عملِ خیر - ہر وضو و طہارت کے بعد نماز پڑھنے - کے ضمن میں فرمایا تھا کہ بلال میں نے تمہارے جوتوں کی چاپ جنت میں اپنے آگے سنی ہے: ''... فاني سمعت دف نعليك بين يدي في الجنة ...''۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ وہ اپنی زندگی مستعار میں بھی پہنتے تھے۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل الطهور الخ؛ فضائل اصحاب النبی ﷺ، مناقب بلال بن رباحؓ؛ فتح الباری، ۷/۱۲۵ و مابعد)

-حضرات خلفائے ثلاثہ - ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم - کے جوتے بھی دباغت والے

چمڑے کے ہوتے تھے (نعال مبيتة) اور وہ تینوں اکابر دو تسموں والے جوتے بھی پہنا کرتے تھے، جیسا کہ حافظ بزار اور حافظ طبرانی نے حضرت انسؓ کی حدیث کی مانند حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث بیان کی ہے اور جس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اسی طرح حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے جوتے ہوتے تھے (و كذا لابی بكر و عمر)۔ حضرت عثمانؓ کے بارے میں البتہ یہ فرق ملتا ہے کہ وہ اولین شخص تھے جنھوں نے صرف ایک گھنڈی والا جوتا پہنا تھا: "و اول من عقد عقدة واحدة عثمان بن عفان"۔ شیخین کے جوتوں کے بارے میں نسائی میں ایک شاہد بھی ہے اور اس میں ذکر عثمانؓ نہیں ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/۳۸۵)۔ ابن ہشام نے بھی ایک صحابی کے دو تسمے والے جوتوں کا حوالہ دیا ہے۔: "...اصبت شراكين لنعلين لی..." ۲/۳۳۹)

-حضرت ابو ہریرہ دوسیؓ کے جوتوں کا حوالہ ایک حدیثِ نبوی کے حوالے اور اس پر عملِ صحابیؓ سے ملتا ہے۔ فرمان نبوی ہے کہ نماز کے وقت کوئی شخص جوتے اتارے تو کسی کو اذیت نہ دے: یا تو پیروں میں انھیں پہنے رہے یا اتار کر پیروں کے درمیان رکھ لے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اپنے جوتے نماز کے وقت اتار کر دائیں بائیں نہ رکھتے تھے بلکہ فرمانِ نبوی کے مطابق اپنے دونوں پیروں کے نیچے رکھ لیتے تھے۔

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب المصلی اذا خلع نعلیه این یضعهما ؟ احادیث: ۶۵۴-۶۵۵)

-حضرت ابن عباسؓ کا عمل اس سے مختلف تھا۔ وہ نماز کے وقت جوتے اتارتے تو کسی ایک طرف رکھ لیتے تھے۔

(ابوداؤد، مذکورہ بالا، حدیث: ۴۱۳۸؛ نیز ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ الخ، باب التیمن فی الوضوء)

رسولِ اکرم ﷺ کا یہ فرمان کہ جوتوں میں نماز پڑھا کرو ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے جس کو امام ابوداؤد نے ایک حدیث کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے کہ یہود اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھا کرتے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے ان کی مخالفت کا حکم دیا "خالفوا اليهود فانهم لا يصلون فی نعالهم و لا خفافهم" (ابوداؤد، باب الصلاۃ فی النعل: حدیث ۶۵۲)

-رسولِ اکرم ﷺ کے ایک گمنام صحابیؓ کے دباغت شدہ جوتوں کا ذکر رسولِ اکرم ﷺ کے ایک مولیٰ حضرت بشیر نے کیا ہے۔ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی معیت میں ایک قبرستانِ مسلم

سے گذر رہے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جوتوں سمیت قبروں کے درمیان چل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو چمڑے کے جوتے والے کہہ کر اپنے دونوں دباغت شدہ جوتے اتارنے کا حکم دیا اور انھوں نے انھیں اتار کر پھینک دیا: "... فاذا رجل یمشی فی القبور علیه نعلان. فقال: یا صاحب السبتیتین، ویحک ألقِ سبتیتیک، فلماعرف رسول الله ﷺ خلَعهما فرمی بهما"

(ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب المشی فی النعل بین القبور، حدیث:۳۲۳۰)

- اسی ضمن میں ایک دینی نقطۂ نظر بلکہ مابعد الطبیعاتی جہت بیان کرنے والی حدیث میں دلچسپ ذکر آیا ہے۔ وہ یہ کہ جب میت کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے دفن کرنے والے دوست واپس ہوتے ہیں تو وہ شخصِ مقبور ان کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے: "... انه یسمع قرع نعالهم" (حدیث ابوداؤد:۳۲۳۱)

صحابہ کرام کے جوتوں کے عمومی استعمالات کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور بعض کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔ ان تمام روایات و احادیث میں جوتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ ان کے پس منظر اور سماجی تناظر کا ذکر زیادہ اہم ہے۔

- حضرت ابوامامہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ایک سخت گرمی والے دن بقیع الغرقد تشریف لے گئے۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے پیچھے چل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے جوتوں کی چاپ سنی تو آپ ﷺ کے دل میں ایک خیال آیا اور آپ ﷺ بیٹھ گئے اور لوگوں کو اپنے آگے کر دیا تاکہ نفسِ مبارک میں کبر و نخوت کا شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اس روایت کے ضعیف راویوں کی وجہ سے کلام کیا گیا ہے۔

(ابن ماجہ، المقدمة، باب من کره ان یوطا عقباه، حدیث:۲۴۵: "... فلما سمع صوت النعال وقر ذلک فی نفسه ...")

- حضرت ابوالملیح کا بیان ہے کہ صلحِ حدیبیہ کے دن بارش ہوئی۔ وہ اتنی کم ہوئی تھی کہ پانی ہمارے جوتوں کے تلوں کو بھی نہیں بھگو سکا تھا مگر رسولِ اکرم ﷺ کے منادی نے اعلان کیا کہ نماز اپنے اپنے پڑاؤ میں پڑھو: "... واصابتنا السماء، لم تبل اسافل نعالنا ..."

(ابن ماجہ، کتاب اقامة الصلوٰة الخ، باب الجماعة فی اللیلة المطیرة، حدیث:۹۳۶)

- حضرت ثعلبہ بن سعیدؓ کے جوتوں کی چاپ کے حوالے سے ایک اہم ذکر ایک روایت سیرت میں ملتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مجلس میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ نے اپنے پیچھے کسی کے جوتوں کی چاپ سنی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو ثعلبہ بن سعید کے جوتوں کی چاپ ہے اور وہ مجھے حضرت ریحانہ بنت عمرو قرظیؓ کے اسلام لانے کی خوشخبری دینے آرہے ہیں: "...سمع وقع نعلین خلفه فقال: "ان هذا لثعلبة بن سعید یبشرنی باسلام ریحانة ..." (ابن ہشام، ۲/۲۴۵)

- حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ کے عظیم فرزند حضرت عبداللہؓ کو حضرت مقسم مولیٰ عبداللہ بن حارث بن نوفلؓ نے بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے جوتے اپنے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تھے: "وهو یطوف بالبیت معلقا نعله بیده" (ابن ہشام، ۲/۴۹۶)

- دلچسپ ترین روایت یہ ہے کہ بنو فزارہ کی ایک خاتون نے صرف جوتوں کی ایک جوڑی کے مہر پر نکاح کر لیا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ نے اس کو صحیح و جائز قرار دیا تھا: "... ان امراة من بنی فزارة تزوّجت علی نعلین، فقال رسول الله ﷺ: أرضیت من نفسک و مالک بنعلین؟ قالت: نعم. قال: فاجازه ..." (ترمذی، ابواب النکاح، باب فی مهور النساء)

جوتے بطور آلات ضرب

جوتوں کا ایک دلچسپ سماجی استعمال بطور آلاتِ ضرب نظر آتا ہے۔ یہ کوئی آج کا سماجی رویہ نہیں ہے کہ مار پیٹ کے لئے جوتے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے گھونسے مکے اور اعضاء و جوارح انسانی کے علاوہ دوسرے وسائل جیسے ڈنڈے وغیرہ۔ عہد نبوی میں ان کی کم از کم دو دلچسپ مثالیں ملتی ہیں: ایک باہمی نزاع میں جوتوں کا استعمال اور دوسرے سزائے مجرم میں بطور آلہ ضرب۔

- ابتدائی مدنی عہد کا واقعہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنے بعض صحابہ کرام کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی سواری کی وجہ سے گرد و غبار اٹھا تو راستہ میں بیٹھے ہوئے منافقین کے شیخ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا کہ آپ ﷺ کے گدھے کی بو نے اسے پریشان کر دیا ہے اور دوسری بدتمیزی کی۔ ایک انصاری

صحابی کو غصہ آ گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ رسولِ اکرم ﷺ کا گدھا ہے اور اس کی بو تیری خوشبو سے زیادہ اچھی ہے۔ عبداللہ بن ابی کا ایک ساتھی غصہ ہو گیا اور اس نے گالی گلوج کی اور دونوں طرف سے اس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر ایک دوسرے کی مار پیٹ ہونے لگی۔ اس مار پیٹ کے لئے چھڑیوں اور ہاتھوں کے علاوہ جوتوں کا بھی خوب استعمال ہوا: "... فکان بینهما ضرب بالجرید والایدی والنعال / فکان بینهم ضرب بالجرید وبالایدی وبالنعال"

(بخاری، کتاب الصلح، باب ما جاء فی الاصلاح بین الناس ؛ حدیث: ۲۶۹۱؛ فتح الباری، بحث متعلقہ ۵/ ۳۶۵ و مابعد؛ مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فی دعاء النبی ﷺ وصبره علی اذی المنافقین: حدیث ۱۱۷ (۱۷۹۹))

- شرابی کی سزا رسولِ اکرم ﷺ نے چھڑیوں اور جوتوں سے مار کی صورت میں دی: "ان النبی ﷺ ضرب فی الخمر بالجرید والنعال"۔ ایک صحابی حضرت نعیمان یا ابن النعیمانؓ کو شراب نوشی میں ماخوذ لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس وقت گھر میں موجود تمام لوگوں کو انھیں مارنے کا حکم دیا اور لوگوں نے ان کو جوتوں سے مارا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کے مطابق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی کی سزا میں چالیس جوتے لگوائے: "ضرب الحد بنعلین اربعین"۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ شرابی کو کسی نے ہاتھ سے، کسی نے جوتے سے اور کسی نے اپنے کپڑے سے مارا"... الضارب بیده، الضارب بنعله والضارب بثوبه ..." بخاری؛ حضرت سائب بن یزیدؓ کے مطابق ہاتھوں، جوتوں اور چادروں سے مارنے کا سلسلہ عہد نبوی سے آغاز خلافتِ فاروقی تک جاری رہا: "فنقوم الیه بایدینا ونعالنا واردیتنا ..." موطا

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، کتاب الحدود، باب ما جاء فی ضرب شارب الخمر، باب حد الخمر، فی حد السکران وغیرہ)

✪✪✪

ملبوسات سے متعلق اصولی مباحث

عہدِ نبوی کے ملبوسات کے بارے میں کچھ اصولی مباحث اور تہذیبی اقدار کے علاوہ بعض دینی احکام واوامر بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا حوالہ گذشتہ بحثوں میں آتا تو رہا ہے مگر وہ اتنا واضح نہیں رہا۔ پھر کئی مباحث ومبادی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں آیا۔ ان کی صحیح تفہیم کے بغیر بہت سی احادیث وروایات کی صحیح تفہیم ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت سی بظاہر متضاد و متصادم روایات واحادیث کی صحیح تعبیر نہیں پیش کی گئی۔ اس کی بنا پر امتِ مسلمہ میں کئی خلجان پیدا ہوگئے۔ لہٰذا اس بحث میں بعض اصول وقواعد اور ان سے متعلق احادیث وروایات اور ان کی تعبیراتِ علماء وتشریحاتِ شارحین پیش کی جارہی ہیں۔

پہلے چند اصول اور قواعد اور تہذیبی اقدار کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کی تشریح وتعبیر، تحلیل و تجزیہ اور بحث ومباحثہ بعد میں ہوگا۔ ان میں سب سے اہم دینی احکام واوامر ہیں۔ محدثینِ کرام نے تمام ملبوسات کے بارے میں روایات واحادیث دینی اور تشریعی نقطۂ نظر سے ہی پیش کی ہیں۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ کس کپڑے کا استعمال جائز ہے اور کس کا ناجائز؟ جائز ملبوسات کی لمبائی چوڑائی وغیرہ کتنی ہونی چاہئے؟ نماز کی صحت وادا کے لئے کم سے کم کپڑا کتنا ہونا چاہئے؟ مرد وعورت کا ستر کیا ہے اور اس کے لئے کون سا لباس کافی ہے؟ مردوں اور عورتوں کے الگ الگ لباس کیوں ہوں اور ان کے لئے کیا آداب واحکام مقرر ہیں؟ وغیرہ۔

معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے ملبوسات کی دوسری قدریں ہوتی ہیں جو لازمی طور سے دینی اقدار کے مخالف نہیں ہوتیں۔ البتہ بعض دینی انحرافات اور ذہنی نارسائیوں کے سبب دین و اخلاق کے منافی بھی بن جاتی ہیں اور اس طرح معاشرے کی صحت کے لئے خاصی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ بہت سی سماجی اور تہذیبی اقدار حسنِ معاشرت اور جمالِ حیات کے لئے

ہوتی ہیں اور ان کی رعایت دین وشریعت بھی کرتے ہیں۔ ان میں افراد وطبقات کے ملبوسات، سماجی واقتصادی اور دینی مقام ومرتبہ کے لحاظ سے لباسوں اور موقعہ محل کے تقاضوں کے اعتبار سے کپڑوں کا استعمال شامل ہے اور صرف تہذیب وتمدن کے تقاضوں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

دینی اصولِ لباس

دین وشریعت کے لحاظ سے انسان کی ستر پوشی بنیادی اصول ہے۔ عام اور رواں دواں زندگی میں بھی اور دینی فرائض کی بجا آوری میں بھی لباس کا ساتر ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ مرد اور عورت کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے ان کا ستر بھی جدا جدا ہے۔ مردوں کے لئے ناف سے گھٹنوں کے نیچے تک کا حصۂ بدن ستر میں داخل ہے اور عورت کا سارا بدن ستر ہے، صرف ہتھیلیوں اور پیروں اور چہرے کا حصہ ستر میں داخل نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے لئے ایسے لباس کی قید لگائی گئی جس سے ان کے ستر چھپ جائیں۔ مگر یہ صرف کم از کم حدِ لباس ہے۔ اس بنا پر احادیث اور تشریحات میں وضاحت آتی ہے کہ خواہ کپڑا یا لباس ایک ہی ہو ستر کا پوشیدہ ہونا ضروری ہے۔ محدثین وفقہاء کے ابواب میں اسی بنا پر کم از کم لباس میں نماز کی ادائیگی کے ابواب شامل ہوتے ہیں۔ مردوں کے باب میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کا طرزِ عمل کہ سارے کپڑے قصداً اتار کر رکھ دیئے اور صرف ازار میں نماز پڑھا دی، یہ بتاتا ہے کہ صحتِ نماز کے لئے اتنا سترِ مرد کا ملبس ہونا کافی ہے، ورنہ ان کا عمل آرائشِ لباس اور زینت کے اختیار کے خلاف نہیں ہے اور نہ وہ سنتِ نبوی بتاتا ہے۔ عورتوں کے ستر کے سلسلے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ اگر وہ صرف ایک چادر یا لمبے کپڑے سے اپنے سارے بدن اور تمام ستر کی پردہ پوشی کر لے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ یہ بھی صرف کمترین حدِ لباس کی علامت ہے، یہ نہ سنت ہے، نہ تقویٰ کے مطابق اور نہ دینی تقاضے کے موافق۔ البتہ ستر میں یہ بھی شامل ہے کہ کپڑا ایسا باریک نہ ہو کہ بدن جھلکے، عورت کے لئے تو حرام ہے، مرد کے لئے بھی ناپسندیدہ ہے اور ستر پوشی میں اس کے لئے بھی حرام ہے۔

فرائض بالخصوص نماز کے وقت بھی پورے لباس کو استعمال کرنا ہی سنت ہے اور اسی کا حکم

قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیتِ کریمہ-۳۱ کا اولین حصہ: ﴿یبنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد﴾ (اولاد آدم کی- لے لو اپنی رونق ہر نماز کے وقت) صاف حقیقت بتاتا ہے کہ ہر نماز کے وقت کامل لباس کا استعمال پسندیدہ اور مطابقِ تقویٰ ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے لباس کی جگہ زینت کا لفظ استعمال کیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بھی کبھی کامل لباس کے بغیر نماز ادا کی، نہ سماجی زندگی میں معاشرت کی، حتی کہ ننگے سر بھی کبھی نماز عام حالات میں نہیں پڑھی، بعض روایات میں ننگے سر نماز ادا کرنے کی بات ملتی ہے مگر وہ غیر معمولی حالات کا ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کامل لباس نماز نہیں ادا فرمائی بلکہ ٹوپی کے ساتھ عمامہ کو بھی استعمال فرمایا۔ دو کپڑوں اور ایک لباس سر میں ہی نماز ادا کی اور زندگی بھی بسر کی۔ خاص مواقع نمازِ جمعہ اور عیدین کے لئے اور دوسرے اوقات میں عمدہ کپڑے پہننے کی تاکید فرمائی۔ امام بخاریؒ وغیرہ محدثینِ کرام وفقہاء عظام نے اس کو تجمل (جمال پسندی) قرار دے کر اسی کو سنت بتایا۔ مالی آسودہ حالی میں عمدہ لباس پہننے اور پہنانے کی ہدایت فرمائی۔ نان نفقہ میں اہل وعیال کو اپنی حیثیت کے مطابق کپڑے پہنانے کی وصیت بھی کی اور خود بھی اس پر عمل کر کے صحیح اسلامی اسوہ قائم فرمایا۔ صحابہ کرام کا طرزِ عمل بھی اسی کے عین مطابق تھا۔ وہ خود بھی عمدہ کپڑے پہنتے تھے اور اپنی حیثیت وبساط کے مطابق پہنتے تھے اور اپنی بیویوں، دوسرے اہل وعیال کو بھی ایسے ہی عمدہ کپڑے پہناتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی اور تمول کی مخالفت کرنے والے صحابی خود بھی عمدہ حلہ پہنتے تھے اور اسلامی مساوات وحسنِ معاشرت کی خاطر اپنے غلام کو بھی اسی طرح کا عمدہ حلہ پہناتے تھے۔ مختلف ملبوسات کے مفصل بیان میں اسوۂ نبوی اور عملِ صحابہ دونوں کی صدہا مثالیں گذر چکی ہیں۔

معمولی اور سادہ لباس، پیوند لگے ازار اور پرانے دھرانے جبوں اور پھٹے پرانے کپڑوں کا استعمال بھی ملتا ہے اور خوب ملتا ہے۔ وہ دراصل سادہ معاشرت اور سادہ زندگی کو اجاگر کرتا ہے جس کے رسولِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ خوگر رہے تھے۔ ان کے استعمال اور ان کے استعمال پر زور دینے کا مقصود صرف یہ تھا کہ انسان تبختر، ریاکاری، دکھاوے، عُجب وغرور اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل سے بچے۔ جب بھی کسی معاشرہ کا ایک اونچا طبقہ عمدہ طرزِ زندگی اختیار

کرتا ہے تو اس میں دو خرابیاں بیک وقت پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وہ خود تکبر وریا کاری اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، دوسرے وہ اپنے سے نیچے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے اور یہ دوسرا رویہ پہلے کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ عرب جاہلی کے بلند طبقات اور ان کے اکابر فخر وغرور ہی سے اپنے ازار یا زیریں جامے کو خوب نیچا لٹکاتے تھے حتی کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلتا، اسی فخر وغرور کو ختم کرنے کے لئے رسولِ اکرم ﷺ نے ازار کی لمبائی ٹخنے تک متعین فرمادی اور اس سے نیچے لٹکنے والے حصہ کو جہنمی قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عذر سے یا بے خیالی میں ازار اپنی حد پار کر لے تو وہ شخص غرور وتکبر کا علم بردار ہے اور نہ اس کا زائد لٹکتا ہوا حصہ جہنمی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حدیث اور ان کے باب میں رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان اسی اصول کو واضح کرتا ہے۔ نصف ساق کو اسی لئے استحباب کی حد قرار دیا گیا۔ لیکن بقول امام غزالیؒ اب نصفِ ساق تک رہ جانے والا لباس ہی غرور وتکبر کا باعث بن گیا ہے لہٰذا وہ اسی عقوبت کا مستحق ہے جس کا مسبلِ ازار کیونکہ اصل وجہِ کراہت تکبر وغرور ہے، نہ کہ لباس کی لمبائی اور چھوٹائی۔ ریشم کی حرمت کی بھی یہی وجہ ہے۔

مَردوں کے لئے کامل لباس دو حصوں پر مشتمل ہونا بتایا گیا ہے: ایک کمر سے نیچے ٹخنوں تک کا لباس اور دوسرا بالائی بدن کو چھپانے والا۔ عہدِ نبوی میں ان دونوں کے لئے بالخصوص بالائی بدن کے لئے مختلف ملبوسات ہوتے تھے جب کہ زیریں لباس میں صرف ازار اور سروال ملتے ہیں۔ ان سب کے جواز کا ذکر ایک حدیثِ شریف میں ملتا ہے بلکہ اسے دینی اور تہذیبی دونوں اعتبار سے ایک مستند وکامل اور معیاری قرار دیا جاسکتا ہے۔ امام بخاری کی حدیث: ۳۶۵ میں دو حصے ہیں: اولین فرمانِ نبوی جو ایک کپڑے میں نماز کی صحت یا ہو جانے کو بتاتا ہے۔ دوسرا بیانِ حضرتِ عمرؓ جو معیاری لباس- معیاری دینی لباس- کی نوعیت وحد مقرر کرتا ہے بالخصوص اس کا اولین جملہ کہ جب اللہ تعالیٰ وسعت دے تو تم بھی توسع اختیار کرو۔ پھر دونوں لباس کے مختلف جوڑوں کا ذکر کیا ہے: ۱- ازار ورداء، ۲- ازار وقمیص، ۳- ازار وقباء، ۴- سراویل ورداء، ۵- سراویل وقمیص، ۶- سراویل وقباء، ۷- تُبان وقباء، ۸- تبان قمیص اور ۹- تبان ورداء۔

"...عن ابی ھریرۃ قال: قام رجل الی النبی ﷺ فسالہ عن الصلاۃ فی الثوب الواحد، فقال: أو کلکم یجد ثوبین ؟ ثم سال رجلٌ عمر فقال: اذا وسّع اللہ

فأوسعوا: جمع رجل علیه ثیابه، صلّٰی رجل فی ازار ورداء، فی ازار و قمیص، فی ازار و قباء، فی سراویل ورداء، فی سراویل و قمیص، فی سراویل و قباء، فی تبّان و قباء، فی تبان وقمیص، قال واحسبه قال فی تبان ورداء.

(بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی القمیص والسراویل والتبان والقبا؛ فتح الباری، ۱/۶۱۶-۶۱۷)

ان میں سے صرف تین زیریں جامے ہیں: ۱-ازار، ۲-سراویل اور ۳-تبان جو سراویل کی شکل کا ہوتا ہے لیکن اس کے دو پائینچے نہیں ہوتے تھے اور وہ کھال کا بنایا جاتا ہے: "والتبان، ... وھو علیٰ ھیئة السراویل الا انه لیس له رجلان، وقد یتخذ من جلد"۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تین ضرب تین کی یہ نو صورتیں حصر یا حدِ آخر کو نہیں بتاتیں بلکہ وہ صرف چند صورتیں بتاتی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ دو کپڑوں کا استعمال نماز میں بھی افضل ہے بہ نسبت ایک کپڑے کے: "ان الصلاۃ فی الثوبین افضل من الثوب الواحد"۔ بعض علماء کے نزدیک دو کپڑوں میں نماز مستحب ہے۔ بالائی بدن کا کھلا رکھنا مکروہ ہے خواہ نماز میں ہو یا نماز کے باہر اور وہ خلاف تہذیب تو ہے ہی۔ یہاں فقہی اقوال اور مسلکی آراء سے بحث نہیں ہے، خالص سنت و دین یہ بتاتے ہیں کہ کامل لباس کا استعمال ضروری ہے خواہ وہ دو پر مشتمل ہو یا تین پر۔ اسی مقام پر دین و تمدن دونوں کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور تمدن کا قاعدہ دین و شرع کا قاعدہ بن جاتا ہے۔

دین و تمدن کی آمیزش

خالص تمدنی لحاظ سے ملبوساتِ نبوی کا مطالعہ کیا جائے یا ملبوساتِ صحابہ کرام اور عہدِ نبوی کا، یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنتِ نبوی اور تعاملِ صحابہ اور بعد میں عملِ علماء وسلف دین و تمدن کی آمیزش یعنی زینتِ لباس پر مبنی تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے قول و فعل سے اور صحابہ کرام نے اپنے تعامل سے ثابت کر دیا کہ ملبوسات میں اسلامی معیار کیا ہے اور کیسا ہے؟ اور وہ توازن و اعتدال پر مبنی ہے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کے صحیح استعمال پر استوار ہے، وہ افراط و تفریط سے قطعی پاک

ہے۔ لہٰذا لباسِ تقویٰ وہی ہے جو رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے خود پہنا اور اپنے اہل و عیال اور ماتحتوں کو پہنایا۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱- لباس کا ساتر ہونا ضروری ہے، جسم اور خطوطِ بدن کا مستور ہونا بھی لازم ہے۔

۲- سادہ اور عمدہ لباس کا استعمال پسندیدہ ہی نہیں مستحب ہے نماز ہو یا غیر نماز، ہر صورت میں۔

۳- عام زندگی میں لباس کا انسان کی اقتصادی، سماجی اور مالی حالت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

۴- موقعہ محل کی رعائت سے لباس ضروری ہے۔ جمعہ و عیدین اور خوشی کے مواقع پر تجمل و زینت بھی مستحب و سنت ہے۔

۵- مواقعِ غم پر سادہ اور اچھا لباس مناسب ہے۔ حضرت عمرؓ نے ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کی تدفین کے وقت کچھ نوجوانوں کو سرزنش کی تھی جو شوخ لباس پہن کر آئے تھے۔

۵- کامل لباس ضروری اور پسندیدہ ہے خواہ دو کپڑوں پر مشتمل ہو یا تین ملبوسات پر۔

۶- اون (صوف) اور گاڑھے کا استعمال علامتِ تقویٰ نہیں ہے اور نہ پسندیدہ۔ سادگی پسند کے لئے البتہ پسندیدہ ہے۔

۷- رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے عمدہ سے عمدہ لباس استعمال فرمائے۔ اس لئے ان کا استعمال بھی پسندیدہ ہے۔

۸- ہر قسم کے کپڑے کا استعمال اور اس سے ملبوسات بنانا جائز و پسندیدہ ہے بشرطیکہ وہ پاک و طاہر ہوں۔

۹- مردوں اور عورتوں کے ملبوسات میں امتیاز و فرق فطری بھی ہے، اسلامی بھی اور تہذیبی بھی، لہٰذا طبقہ کے لباس کی رعائت ضروری ہے۔

۱۰- عورتوں کے لئے زیب و زینت ایک حق ہے، مردوں کے لئے بے جا زیبائش ناپسندیدہ ہے، البتہ اچھا لباس زینت میں آتا ہے۔

ریشمی ملبوسات

بالعموم لباس دو طرح کے کپڑوں کے ہوتے تھے: سوتی اور ریشمی۔ چمڑے وغیرہ کی بھی

بعض چیزیں بنتی تھیں لیکن وہ لباس کا معروف مواد نہیں تھیں۔ سوتی ملبوسات ہوں یا اونی ملبوسات، ان کے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے استعمال میں کوئی فرق نہیں روا رکھا گیا۔ دونوں کو دونوں کے لئے جائز وروا لباس قرار دیا گیا۔ البتہ ریشم اور ریشمی کپڑوں کے استعمال میں جنس کا فرق ہے۔ اس باب میں عورتوں کو مَردوں پر فضیلت حاصل ہے۔ عورتوں کے لئے ملبوساتِ ریشم بلاکراہت جائز ہیں اور مَردوں کے لئے ایک حد کے بعد ناجائز۔ سُنن وآثارِ نبوی سے ان ریشمی ملبوسات کے بارے میں کچھ اصول وقواعد ملتے ہیں اور کچھ حدود وقدغنیں نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے یہ بحث کرنی ہے کہ ریشمی ملبوسات کی اقسام کتنی تھیں کیونکہ ابھی تک یہ بحث اسی خاص فصل کے لئے اُٹھا رکھی گئی تھی۔ ریشم اور ریشمی لباس کے لئے عام عربی لفظ ''حریر'' ہے اور اس کی مختلف اقسام کے نام الگ الگ ان کی خصوصیات پر رکھے گئے ہیں۔ ''دیباج'' دوسرا لفظ ہے جو ریشمی لباس کے لئے استعمال ہوتا ہے اور احادیث وروایات میں حریر کے بعد سب سے کثرت سے آتا ہے۔

(احادیث بخاری: ۵۸۲۸، ۵۸۲۹، ۵۸۳۰، ۵۸۳۱، ۵۸۳۲، ۵۸۳۳، ۵۸۳۴، ۵۸۳۵ وغیرہ نیز مباحث شارحین کرام؛ فتح الباری، ۱۰/۳۶۱)

خز: معمولی ریشم: ''من الخز وھو ردی الحریر''

دیباج: ریشمی کپڑا

استبرق: موٹا/گاڑھا ریشم

القسی / القسیة: مصر کے ایک گاؤں قس نامی کی طرف منسوب ہے جہاں یہ خاص ریشمی کپڑا بُنا جاتا تھا۔ وہ شام سے بھی آتا تھا:

''ثیاب أتتنا من الشام — او من مصر — مضلعة فیھا حریر، وفیھا امثال الاترنج.

المیاثر / المیثرة: بچھونا: ''ھو الفراش الوطی'' (فتح الباری، ۱۰/۳۶۱) لیکن حدیث بخاری کی شرح میں دوسرے معانی بھی ہیں:

''المیثرة، کانت النساء تصنعه لبعولتھن مثل القطائف یصفونھا: قال جریر ...: القسیة ثیاب مضلعة یجاء بھا من مصر فیھا الحریر، والمیثرة جلود السباع،

کانت النساء تصنعه لازواجهن من الارجوان الاحمر و من الدیباج" اور دوسری تعبیرات۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۳۶۱)

السیراء (دھاری دار چادریں یا ایسی چادریں جن میں ریشم ملا ہوا ہو)

طیلسان/ طیالسة (سبز رنگ کی چادریں/لباسِ عجم/لباسِ مشائخ وعلماء)

سندس (باریک ریشم۔وہ جنتی لوگوں کا لباس بھی استبرق کے ساتھ آیات کریمہ میں بتایا گیا ہے جو اسے عمدہ ترین ریشم بتاتا ہے جیسا کہ اوپر بحث میں گذر چکا ہے)

تقریبات کے خاص ملبوسات

اس خاص تمدنی موضوع پر زیادہ بحث کرنی مقصود نہیں ہے کہ مختلف ملبوسات کے ذکر میں ان کا حوالہ آتا رہا ہے اور ابھی ملبوسات سے متعلق اصولی مباحث میں بھی ذکر آچکا ہے جیسے جمعہ اور عیدین وغیرہ پر بہتر اور نئے کپڑوں کا حکم نبوی اور عمل صحابہ تھا۔ اس کی چند احادیث وسنن سے پہلے محدثین کرام کے چند ابوابِ جمعہ وعیدین میں تجمل، نظافت، زیب وزینت اور عمدہ وبہتر ملبوساتؔ کے احکام ہیں۔ بخاری میں ہیں: جمعہ کے ابواب تجمل ولباس زینت: الطیب للجمعة (جمعہ کے دن خوشبو)، الدهن للجمعة (جمعہ کے لئے تیل لگانا)، یلبس احد ما یجد (جو اچھا لباس پائے وہ پہنے) وغیرہ۔ عیدین کے باب میں اولین باب تجمل سے متعلق ہے: "فی العیدین والتجمل فیه"۔ ان کے علاوہ بھی بعض اور ہیں۔ ان دونوں دینی تقریبات۔ ہفتہ واری اور سالانہ۔ کے لئے خوشبو، تیل پھلیل لگانے اور عمدہ کپڑے پہننے کی واضح احادیث نبوی موجود ہیں جیسے احادیث بخاری: ۸۸۰، ۸۸۳، ۸۸۵، ۹۱۰ وغیرہ۔ سب سے اہم ملبوسات کے لحاظ سے باب ہے: "باب یلبس احسن ما یجد" (سب سے عمدہ دستیاب کپڑا پہننا) اور اس کے تحت حضرت عمرؓ کا حلہ سیراء جمعہ کے لئے خریدنے اور استعمال کرنے کا مشورہ ہے جو بہت معنی خیز ہے اور اس میں حلۂ حضرت عطاردؓ کا استعمال اور اس کا دینی وتشریعی حکم بھی بتایا گیا ہے: حدیث: ۸۸۶ اور اس کے متعدد اطراف۔ یہی حدیث حضرت عمرؓ (اپنے طرف: ۹۴۸ وغیرہ) کے ساتھ عیدین کے تجمل اور زیب وزینت کے لئے امام بخاریؒ نے بیان کی ہے۔ یہ صرف چند

احادیث وسنن ہیں۔ باقی مفصل بحث لباسِ زینت اور آرائش اور عید کی تقریبات اور خوشی منانے پر اگلی بحث میں آرہی ہیں۔

احادیث وروایات سیرت سے بہرحال یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ تقریبات کا لباس خاص، عمدہ اور نیا ہوتا تھا، خواہ وہ دینی تقریبات ہوں یا تہذیبی وتمدنی مواقع ہوں جیسے شادی بیاہ وغیرہ۔ بعض تمدنی تقریبات اکابر مکہ اور ساکنان مدینہ سے بھی عہدِ نبوی کے زمانے میں اسلامی تمدن کے دھارے میں جڑ گئی تھیں جیسے عاشوراء کی تقریبِ مسرت تھی جس دن یہود اور مسلمان دونوں اپنے اہل وعیال کے لئے عمدہ کپڑے سلواتے تھے، بیویوں کو زیورات لے کر دیتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے۔ اس کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ یہاں صرف ملبوسات کی ایک دو مثالیں دی جاتی ہیں:

ریشمی کپڑوں کی ممانعت

بخاری، مسلم اور دیگر کتبِ حدیث اور کتبِ سیرت وسوانح وغیرہ سے ریشمی کپڑوں کی ممانعت کا عام ذکر ملتا ہے۔ اس ممانعت میں دو طرح کے احکام ہیں: رسولِ اکرم ﷺ نے ریشم سے منع فرمایا: "ان رسول اللہ ﷺ نهى عن الحرير..."۔ ۵۸۲۸۔ دوسرے جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اسے پہننے سے محروم رہے گا: "من لبس الحرير في الدنيا لن يلبسه في الآخرة - ۵۸۳۳"۔ تمام کتبِ صحاح میں یہی احکامِ ممانعت ملتے ہیں: شیخینؒ نے بالخصوص اور دوسرے بعض محدثین نے بالعموم ریشم کے پہننے کے ابواب باندھے ہیں جیسے "باب لبس الحرير، باب لبس القسي، باب الميثرة الحمراء، باب المزور بالذهب، لبس الحرير للرجال وقدر ما يجوز منه، افتراش الحرير وغیرہ" لیکن بعض متقدمین اور متاخرین نے ریشم پہننے کی حرمت وتحریم کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے ابواب باندھے ہیں: باب تحريم استعمال الحرير وغیرہ، لبس الحرير للرجال، وقدر ما يجوز منه، مسّ الحرير من غير لبس، ما يرخص للرجال من الحرير للحكة وغیرہ امام بخاری نے عناوین باندھے ہیں۔ متقدمین اور دوسرے محققین نے تحریمِ ریشم کے ابواب باندھنے سے گریز

کیا ہے۔ ان میں تحریم کا ذکر نہیں ملتا ہے، صرف اس کے استعمال کے بارے میں آراء واقوال اور احادیث ملتی ہیں۔ تحریم کا عنوان و مضمون بعد کے بزرگوں نے ایجاد کیا ہے۔ اگلی بحث اس کی وضاحت کردے گی۔

اس کا ایک بنیادی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ محدثینِ کرام کے علم میں یہ بات تھی کہ ریشم کے استعمال کی حرمت نہیں ہے اور اس پر بحث اگلی فصل میں آتی ہے۔ بہر حال ان میں ممانعت کی احادیث وروایات میں ریشم کی ایک خاص مقدار، خواہ وہ تھوڑی ہی ہو، ممانعت سے مستثنیٰ بھی کی گئی ہے۔ مثلاً اولین حدیث بخاری: ۵۸۲۸ کا پورا متن یہ ہے: ".. ان رسول الله ﷺ نهى عن الحرير الا هكذا، واشار باصبعيه اللتين تليان الابهام. قال. فيما علمنا انه يعني الاعلام"۔ امام بخاریؒ نے اسی بنا پر بڑے حکیمانہ انداز سے باب کا عنوان باندھا ہے: "باب لبس الحرير للرجال، وقدر ما يجوز منه"۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ ممانعت مردوں کے لئے ہے اور عورتوں کے لئے نہیں ہے۔ دوسرے ابن حجرؒ کے بقول ایک بڑے طبقۂ علماء نے اس کو کراہت پر محمول کیا ہے: "حمل بعضهم النهي العامَ في ذلك على الكراهة لا على التحريم"۔ قاضی عیاضؒ کے اس موقف پر ابن دقیق العیدؒ وغیرہ نے تعقب بھی کیا ہے۔ بہر حال بعد کے فقہی اقوال و آراء سے بحث نہیں ہے۔ ہمارے زیرِ بحث عہدِ نبوی میں ریشم کا عمومی استعمال عام مسلمانوں اور مَردوں کے لئے مکروہ و ممنوع تھا، عورتوں کے لئے بالکل ممنوع نہ تھا اور مردوں کے لئے زیب و زینت اور گل بوٹے وغیرہ اور گریبان و آستین وغیرہ مزین کرنے کی اجازت بھی تھی۔

ریشم کی قدرِ جائز

مَردوں کے لئے کراہیت کے باوجود ریشم کی ایک قدر جائز تھی۔ یہ بہت اہم اور دلچسپ چیز ہے۔ احادیث اور تشریحات سے واضح ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں مرد مسلمانوں کے لئے ریشم کے اَعلام بنانے یا دو چار انگل برابر ریشمی کپڑا لگانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کا ذکر ضروری ہے۔ جن احادیث میں ریشم پہننے کی ممانعت کی گئی ہے ان میں یہ "قدرِ جائز" بہت واضح طور سے

مذکور ہے جیسے امام بخاریؒ کی حدیث: ۵۸۲۸ وغیرہ میں ہے: "سمعت ابا عثمان النهدی قال : اتانا کتاب عمر، ونحن مع عتبة بن فرقد باذربیجان، ان رسول اللہ ﷺ نهی عن الحریر الا ھکذا، اشار باصبعیه اللتین تلیان الابهام، قال فیما علمنا انه یعنی الاعلام" (باب لبس الحریر للرجال، وقدر مایجوز منه؛ فتح الباری، ۱۰/۳۵۰-۳۵۳)

حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے شارحینِ کرام نے متعدد کتبِ حدیث سے اس "قدرِ جائز" کی احادیث نقل کی ہیں اور اس کی تعیین کی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پورا لباسِ ریشم تو جائز نہیں ہے مردوں کے لئے مگر ان کے ملبوسات میں جو نقش ونگار اور پٹیاں وغیرہ لگادی جاتی ہیں ان کی اجازت ہے جیسے گریبان اور آستینوں پر بطور جمال وزیبائی کچھ ٹکڑے اور پٹیاں وغیرہ لگادی جاتی ہے، اسی کو ابن حجرؒ نے یوں کہا ہے: "ان المراد المستثنیٰ الاعلام وھو ما یکون فی الثیاب من تطریف وتطریز ونحوھما"۔

حدیثِ بخاریؒ کا ایک توقیتی اور تاریخی منظر نامہ بھی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے جس "قدرِ جائز" کو مَردوں کے لئے ریشمی ملبوسات میں متعین فرمایا تھا اس کی تشہیر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کی اور اپنے امیرِ اذربیجان/ ایران کو وہ حکم نبوی مع قدرِ جائز لکھ بھیجا۔ اس کے کئی اہم پہلو ہیں: اول یہ کہ خلافتِ فاروقی تک یہ ریشمی قدرِ جائز مَردوں کے لئے روا رکھی گئی اور غالباً اس کے بعد کے ادوارِ خلافتِ اسلامی میں بھی وہ رائج وروا رہی۔ لہٰذا یہ قدرِ جائز ایک مستقل اسلامی رعائت معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ حکم امیرِ ایران اور اکابرِ صحابہ در ایران کے پاس بھیجا گیا تھا کیونکہ ایرانی ملبوساتِ اکابر بالعموم ریشمی ہوتے تھے لہٰذا اسلامی فتحِ ایران کے ساتھ ان کے عوام وخواص کو بھی نبوی حکمِ ریشم سے واقف وآگاہ کیا گیا۔ یہ تہذیبی وتمدنی قدرِ ملبوسات بھی ثابت ہوتی ہے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ قدرِ جائز اور ممانعتِ حریر دونوں کی اشاعت ایران میں کی گئی تھی تاکہ ان کو اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں اطرافِ حکم کا علم ہوجائے۔

قدرِ جائز کی سنت وتعیین

اقوالِ نبوی ﷺ کا ایک عملی پہلو ہمیشہ عمل واسوۂ نبوی ﷺ میں ملتا ہے اور تعاملِ صحابہ

اس کی ہمیشہ تصدیق کرتا ہے۔ قولی احادیث اور سنت و عملی احادیث کے درمیان معنی و حکم کے اس ارتباط پر نظر ذرا کم گئی ہے جس کی وجہ سے قولی احادیث کو ترجیح دینے کا نظریہ پیدا ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام و ہدایات اپنی زبانِ مبارک سے دیں ان پر اپنے عمل سے اثبات کر کے اسوہ قائم فرمایا۔ شاید ہی کوئی ایسا فرمانِ نبوی ہو جس پر رسولِ اکرم ﷺ نے عمل نہ فرمایا ہو اور جس پر صحابہ کرام کا تعامل نہ ملتا ہو۔ قول و فعل کے توافق و تعامل سے ہی تو سنت کا آغاز و ارتقاء اور اثبات ہوا اور وہی اسلامی احکام و اوامر کی بنیادی کسوٹی بنا۔ بخاری کی مذکورہ بالا روایت میں صرف دو تین انگلی کے بقدر یہ قدرِ جائز ملتی ہے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں وہ تین یا چار انگلی (الاموضع اصبعین او ثلاث او اربع) تک ملتی ہے۔ اصل مسئلہ انگلی دو انگلی یا قدرِ متعین کا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مردوں کو تھوڑے ریشم کے استعمال کی اجازت برائے آرائشِ لباس دی گئی ہے، جو آرائش کی حد میں رہے، لباس کا جزو نہ بننے پائے۔

ریشمی ملبوسات کی کراہت و ممانعت صرف مردوں کے لئے کی گئی اور اس میں بھی ایک قدرِ جائز کو مستثنٰی کر دیا گیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس حکم و استثناء دونوں پر بنفسِ نفیس عمل کر کے دکھایا۔ چنانچہ متعدد روایات میں آپ کے ملبوسات کے دیباج و حریر سے آراستہ و پیراستہ ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کی وہ حدیث غالباً سب سے بڑی شہادت ہے جس کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کا ایک حلہ/ جبہ دیباج سے آراستہ تھا: "کان یلبس النبی ﷺ هذه [جبة مزورة بالدیباج] ..." یہ جبۂ نبوی ﷺ اسلامی پہلی صدی کے خاتمہ کے قریب تک محفوظ تھا۔ ابوداؤد کی روایت میں اس قدرِ جائز کی اور وسعت نظر آتی ہے: "مکفوفة الجیب والکمین والفرجین بالدیباج" (باب الرخصة فی العلم وخیط الحریر) یعنی گریبان، دونوں آستینوں اور دونوں کشادگیوں کو ریشم سے آراستہ کیا جا سکتا ہے (صاحب مصباح اللغات نے فرجین کا ترجمہ کپڑے کی پھٹن دیا ہے۔ اس سے مراد دامن کے دونوں کناروں کی پھٹن یا گریبان مراد ہے)

اسی طرح صحابہ کرام کے ملبوسات میں بھی یہ قدرِ جائز نظر آتی ہے۔ صحیحین کی روایات میں اس کا واضح ذکر ملتا ہے اور اس سے زیادہ ان کے ابواب میں ہے [مسلم، باب اباحة لبس

الحریر للرجل] کی دو احادیث میں سفر اور تکلیف (وجع) کا حوالہ ہے۔ یہ تو پورے لباس کا معاملہ ہے۔ کسی سبب سے جس میں ریشم کے لباس سے راحت ملتی ہو مَردوں کے لئے پہننے کی اجازت ہے۔ دو چار انگلی ریشم کی آرائش لباس تو اس سے کمتر ہے۔

ریشمی لباس کے سلسلے میں دو اور استثناء ملتے ہیں: ایک حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ اور زبیر بن عوام اسدیؓ کو خارش (حکۃ) کے سبب پورے ریشمی لباس پہننے کی اجازت مل گئی تھی:

"رخّص النبی ﷺ للزبیر و عبدالرحمن فی لبس الحریر لحکۃ بھما"

(بخاری، حدیث: ۵۸۳۹؛ فتح الباری، ۳۶۴/۱۰؛ طبری نے اسی بنا پر ہر شخصِ معذور کے لئے اس کے استعمال کی اجازت دی)

- دوسرے جنگی ملبوسات کے ریشمی ہونے کی رخصت بھی ملتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ بھی اور صحابہ کرام بھی دورانِ جنگ ریشمی ملبوسات استعمال کرتے تھے جیسا کہ نبوی حلہ سیراء کے باب میں حدیث حضرت اسماءؓ سے ثبوت ملتا ہے۔ دوسرے شواہد بھی ہیں۔

- عام/معمولی ریشم (خز) کے ملبوسات صحابہ کا ذکر ان کے تراجم وغیرہ میں خوب ملتا ہے جیسے حضرت انس لباس و عمامہ خز پہنتے تھے (اسد الغابہ، ۱۲۸/۱)، حضرت افطس کا لباس بھی ثوب خز پر مبنی تھا (۱۰۶/۱)۔

القسی

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب اللباس میں ایک باب کا عنوان باندھا ہے: "باب فی لبس القسی" جس کا ترجمۃ الباب بہت اہم ہے اور وہ اپنے زمانے/عہدِ نبوی کے بعض قیمتی کپڑوں کی بناوٹ اور درآمد کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے تحت صرف ایک حدیث ہے: ۵۸۳۸، جس میں حضرت براء بن عازبؓ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے سرخ کھالوں پر مبنی ملبوسات اور قسی کے استعمال سے منع فرمایا ہے: "نھانا النبی ﷺ عن المیاثر الحُمر وعن القسی"۔ انھوں نے قسی نامی کپڑے کا ذکر نہیں کیا تاہم ترجمۃ الباب میں اس کے معانی اور المیثرۃ / المیاثر الحمر دونوں کے معانی ہیں۔ البتہ "الوثر" کے معنی مصباح اللغات میں ہیں: "ایک قسم کا

کپڑا جو سارے کپڑوں سے اوپر رہتا ہے، نرم، -المیثرة: زین پر رکھنے کا گدیلا، ج: مواثر و میاثر "۔ اس کے برخلاف ترجمۃ الباب میں ان کو جلود السباع (درندوں کی کھالیں) قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کا زیادہ ذکر ساخت وصنعت کے باب میں آتا ہے۔ وہ بہر حال منقش یا تصویر ملبوس ہوتا تھا جو مصر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۳۶۰-۳۶۴: مفصل بحث ہے)

عورتوں کے لئے ریشمی اجازت

ریشم اور ریشمی ملبوسات کے سلسلے میں آخری اصولی بحث یہ ہے کہ ان کا استعمال عورتوں کے لئے جائز وروا ہے۔ دین وشریعت نے اس کی وجہ بھی بتائی ہے کہ اسلامی احکام واوامر کے پیچھے کوئی نہ کوئی علت، حکمت اور مصلحت ضرور ہوتی ہے اور وہ حکمت ومصلحت زیب وزینت اور آرائش وزیبائش کا فطری حقِ نسوانی ہے۔ عورتوں کا یہ فطری حق ہے کہ وہ آرائش کریں اور اسلام نے ان کے اس فطری حق کو تسلیم کرلیا ہے لہٰذا ان کو دوسری زیبائشوں اور آرائشوں کی مانند ریشمی ملبوسات بھی پہننے کی اجازت دی۔ اس کے برخلاف مَردوں کے لئے زیب وزینت کو ناپسندیدہ چیز ٹھہرایا کہ وہ مردانگی کے خلاف ہے اس لئے اس پر شرعی قدغن بھی عائد ہوتی ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۶۵: "... ان تخصیص النهی للرجال لحکمة . فالذی یظهر انه سبحانه وتعالی علم قلة صبرهن عن التزین فلطف به فی اباحته، ولان تزیینهن غالباً انما هو للازواج، وقد ورد ان "حسن التبعل من الایمان" ... ویستنبط من هذا ان الفحل لایصلح له ان یبالغ فی استعمال الملذوذات لکون ذلک من صفات الاناث."

رسولِ اکرم ﷺ نے عورتوں کے لئے ریشمی ملبوسات کی اجازت اپنے اقوال وارشادات واحادیث میں بھی دی ہے اور اپنے اعمال وسنن کے ذریعہ اس پر عمل بھی کیا اور صحابہ کرامؓ سے عمل کروایا تاکہ قولِ نبی ﷺ کی عملی تائید وتصدیق ہوجائے۔ امام بخاریؒ اور دیگر محدثینِ کرام نے اسی بنا پر اپنی اپنی کتاب اللباس میں عورتوں کے لئے ریشم کی اجازت کے خاص ابواب باندھے ہیں۔ امام ابوداؤد اور امام ترمذی وغیرہؒ نے واضح ارشادِ نبوی نقل کیا ہے کہ ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مَردوں پر حرام کیا گیا اور ان کی عورتوں کے لئے حلال کیا گیا: "... حُرِّم لباس

الحرير والذهب على ذكور امتي واحل لاناثهم".

(باب في الحرير للنساء، باب في الحرير وغيره؛ نیز فتح الباری، ۱۰/ ۳۶۵ و مابعد، نے دوسرے امامانِ حدیث میں نسائی، حاکم اور طحاوی کی احادیث اجازت اور ان کی تصحیح کا ذکر کیا ہے)

اس کا عملی پہلو یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا عطا کردہ ریشمی حلہ (حلہ سیراء) حضرت علیؓ نے اپنی خواتین کو پہنا دیا تھا۔ حضرت ام کلثوم بنت رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک پر ریشمی چادر اور حلہ بہار دکھاتا تھا۔ حکم نبوی سے مَردوں نے ریشمی حلے اور کپڑے عورتوں کو پہنائے۔ حضرت جابرؓ کے بقول ہم لڑکوں کے جسم سے ریشمی کپڑے اتار لیتے تھے اور بچیوں کے جسموں پر رہنے دیتے تھے۔ صحابہ کرام بالعموم عمدہ ریشمی کپڑے ان کو پہناتے تھے۔ فطرت کی رعائت، تمدن سے وابستگی اور دینی و تشریعی حکمت کی ایسی نادر آمیزش کا حکم و عمل صرف اسلامی تمدن میں ملتا ہے۔

(بخاری، حدیث: ۵۸۴۰؛ ۵۸۴۲؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۶۵-۳۷۲؛ ابوداؤد و ترمذی مذکورہ بالا؛ مسلم، باب في لبس الحرير، بلاشبہ بعض احادیث میں عورتوں کو بھی ریشم نہ پہنانے کا حکم ملتا ہے مگر وہ صحابہ کرام میں سے بعض کے قیاس پر مبنی ہے اور بطور تقویٰ و احتیاط ہے۔ اس میں یہ پہلو بھی مضمر و مستور ہے کہ اس اجازتِ تجمل سے تزئین و آرائش میں مبالغہ کا رویہ نہ پیدا ہو جائے جو سماجی، معاشی اور تمدنی لحاظ سے بھی مضر ہے)

بیرونی لباس

عربِ جاہلی اور عہدِ نبوی دونوں میں مَردوں اور عورتوں دونوں کے بیرونی لباسوں کا ذکر بہت روایات میں ملتا ہے۔ دونوں کے صنفی امتیازات کی بنا پر دین و شریعت نے اور تمدن و سماج نے بھی ان کے الگ الگ بیرونی لباس متعین کئے تھے۔ ان دونوں کا ذکر الگ الگ کیا جاتا ہے اور معمول کے مطابق لباس نبوی سے اس کا ذکر شروع کیا جاتا ہے کہ ادب یہی ہے۔ لیکن ایک اصولی بات یا سماجی و تمدنی ضابطہ اسی جگہ بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مردوں کے لئے بھی لازم تھا کہ وہ تجمل کے ساتھ باہر نکلا کریں۔ رسولِ اکرم ﷺ کی سنت متواترہ تھی کہ جب کبھی اپنے اصحاب کرام کے پاس تشریف لاتے اور ظاہر ہے کہ گھر سے باہر ہی لاتے تھے تو خاصے اہتمام زیب و تجمل کے بعد تشریف لاتے تھے۔ بالوں میں تیل لگاتے، داڑھی اور بالوں میں کنگھا کرتے، خوشبو لگاتے اور اپنے بیرونی لباس میں باہر تشریف لاتے تھے۔ محدثینِ کرام اور

سیرت نگاروں حتی کہ مختصرات نگاروں نے اس سنت کا ذکر اہتمام سے کیا ہے۔ احادیث میں التزام کے ساتھ یہ ذکر آتا ہے کہ گھر سے نکلنے سے قبل اپنے کپڑے پہنے پھر نکلے: "... فلبس ثيابه ثم خرج" (موطا/تنویر، ۱/۲۴۰ وغیرہ)

مردوں کے بیرونی ملبوسات: میں عام دو کپڑوں۔ازار و قمیص۔یعنی زیریں اور بالائی جاموں کے علاوہ اوپر کی چادرِ زینت کا استعمال ایک مستقل تمدنی اور سماجی رویے و روش کو بیان کرتا ہے۔ باہر جاتے وقت مرد حضرات اپنی بالائی چادر ضرور جسم پر ڈال لیتے تھے اور کبھی جلدی میں نکلتے تو اسے گھسیٹتے ہوئے یا جسم پر ڈالتے ہوئے باہر آتے تھے اور جلدی میں ہوتے اور بلا چادر نکلنے پر مجبور ہوتے تو گھر سے پھر بالائی چادر منگوا کر جسم یا لباس معمولی ڈال لیتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں:

- رداء کے باب میں گذر چکا ہے کہ جلدی میں گھر سے نکلنے کی فراق میں حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام لانے کے وقت، ان کے اسلام کی خبر ملأ قریش میں جلد از جلد پہنچانے کے لئے خبر رسانِ قریش جمیل بن معمر جمحی نے اور خود حضرت عمرؓ نے اذانِ بلال سننے کے بعد خدمت نبوی میں تیزی سے حاضر ہونے کے لئے اپنی چادریں پوری طرح نہیں اوڑھی تھیں اور ان کو گھسیٹتے ہوئے نکلے تھے (یجر رداءه)۔ ایسے بعض دوسرے واقعات اور بھی ہیں جن کا ذکر رداء کے باب میں آ چکا ہے۔

- بلا چادر گھر سے نکل آنے اور پھر گھر سے چادر منگوا کر زیب تن کرنے کا مشہور واقعہ حضرت علی مرتضیٰؓ کا ہے۔ انھوں نے جب سنا کہ مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت عام ہو رہی ہے تو بلا چادر گھر سے مسجد میں تشریف لائے اور بیعت کی اور پھر گھر سے چادر منگوا کر اوڑھی اور فرمایا کہ چادر لینے کی فکر اس لئے نہ کی تھی کہ مبادا بیعت میں تاخیر ہو جائے۔

بیرونی لباسِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ باہر تشریف لاتے تو کامل لباس میں ہوتے تھے۔ ازار و قمیص یا کسی دوسرے بالائی لباس جیسے جبہ / حلہ / خمیصة وغیرہ کے علاوہ جسم اطہر پر چادر (رداء) ضرور

ہوتی تھی۔ بسا اوقات خمیصہ جیسی چادروں پر مشتمل ملبوسات زیب تن فرماتے تو رداء یا چادر کی ضرورت نہ ہوتی کہ وہ خود بالائی لباس کے ساتھ ساتھ چادرِ زینت کا کام کرتا تھا۔ عام یا معمول کے دو کپڑوں- ازار و قمیص- زیب تن فرمانے کی صورت میں آپ ﷺ بھی چادر (رداء) کا اہتمام فرماتے تھے، وہ محض تمدن عرب یا سماجی و تمدنی ریت کی پیروی میں نہیں تھا بلکہ وہ تجمل نبوی کی سنت متواترہ کا ایک ضروری مظہر تھا۔

-سفرِ ہجرت کے ذرا پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پر تشریف لے گئے تو جسم اطہر پر چادر مبارک (رداء) موجود تھی۔

-عید کے دن گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کا کھیل دکھایا تو چادر مبارک سے اپنی حرم محترم کا پردہ/ ستر فرمالیا تھا۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے:
"رأیت النبی ﷺ یسترنی بردائه" (بخاری، کتاب النکاح، باب نظر المرأة الی الحبش الخ)

-رات میں بقیع الغرقد کے آسودگانِ خاک کے لئے دعا کرنے تشریف لے گئے تو اپنی رداء مبارک تمام ملبوسات کے اوپر ڈال لی اور اس سے قبل باہر سے تشریف لائے تھے تو رداء مباک ملبوسات کے اوپر شانوں کی زینت تھی۔

(حدیث مسلم: ۱۰۳، کتاب الجنائز؛ نسائی، کتاب عشرة النساء، باب الغیرة)

-حدیث مسلم: ۱۴ (۹۰۶) کے مطابق ایک دلچسپ واقعۂ تعجیل نبوی کا ملتا ہے۔ سورج گرہن کے وقت آپ ﷺ جلدی میں گھر سے مسجد کے لئے نکلے تو غلطی سے کسی زوجہ محترمہ کی قمیص (درع) اپنی چادر (رداء) کی جگہ لے گئے۔ اہل بیت کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ کی چادر مبارک بھجوادی اور اپنی درع منگوالی: "فاخذ درعا حتی ادرک بردائه"۔

-حلہ/ جبہ اور قباء و عباء کے بارے میں جو احادیث و واقعات ان کے ابواب میں آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بیرونی ملبوسات تھے، گھروں میں ان کو پہن کر کوئی نہیں بیٹھا رہتا تھا۔ بہر حال ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیرونی لباس نبوی گھریلو لباس سے نہ صرف مختلف ہوتا تھا بلکہ اس میں خاصا اہتمام کیا جاتا تھا اور وہ بالعموم تین کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا -ازار، قمیص، چادر- عمامہ اور قلنسوہ کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ عام روزمرہ کے

ملبوسات میں شامل نہ تھے بالخصوص عمامہ کہ روزانہ باندھنے کا ذکر نہیں ملتا۔

بیرونی لباس صحابہ کرام

رداء (چادر) کے عام سماجی اور تمدنی استعمال اور مستقل طریقہ لباسِ خارجی کے ضمن میں صحابہ کرام کی چادروں کا ذکر کافی آ چکا ہے اور ان کے معمول کے بیرونی لباسوں کا بھی۔ ان کے علاوہ مختلف ملبوسات میں بھی بیرونی لباس کا حوالہ آتا ہی رہا ہے۔ اس خاص فصل میں یہ مزید واضح کرنا مقصود ہے کہ تمام اکابر عرب جاہلی دور سے اور صحابہ کرام عہد نبوی میں لباس بیرونی کا اہتمام کرتے ہوئے معمول کے دو ملبوسات - ازار و قمیص/ حلہ و جبہ - وغیرہ کے اوپر چادر یا اور کوئی خاص لباس زینت ضرور پہنتے تھے گویا کہ ان کے جسموں پر تین لباس ہوتے تھے اور بالعموم وہ معمولی ملبوسات سے بہتر اور قیمتی اور خوبصورت ملبوسات ہوتے تھے۔ معمول کے ملبوسات بہر حال دو ہوتے تھے اور ان کے اس قدر حوالے آتے ہیں کہ اسی کو متواتر سنت لباس کہا جا سکتا ہے جیسے حدیث ابوداؤد: ۵۲۲۵ "فلبس ثوبيه" ؛ حدیث ابوداؤد: ۳۰۷۷: حضرت کعبؓ کے دو کپڑے وغیرہ۔

- اکابر عرب میں عاص بن وائل سہمی کا ذکر اسلام حضرت عمرؓ کے ضمن میں آتا ہے کہ وہ جب خانہ فاروقی میں آئے تو ازار و قمیص کے اوپر ایک قیمتی حلہ بھی پہن رکھا تھا۔

- راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کے وقت اپنے لباس معمول پر چادر اوڑھ رکھی تھی اور راستے کی گرد سے بچنے کے لئے اسے ناک پر رکھ لیا تھا۔ (بخاری، كتاب الطب، باب عيادة المريض وغیرہ)

- حضرت عمر فاروقؓ کی اہلیہ محترمہ نے اپنے نامدار شوہر کو جواب دیا تو ان کو غصہ آیا۔ بیوی نے اپنے دفاع میں کہا کہ ازواج مطہرات تو رسولِ اکرم ﷺ کو پلٹ کر خوب جواب دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کو قلق ہوا کہ حضرت حفصہؓ نے بھی یہی روش اختیار کر رکھی ہے تو اپنی چادر لی اور حضرت حفصہ کے پاس سخت سست کہنے کے لئے تشریف لے گئے: "فقام عمر فأخذ رداءه مكانه حتى دخل على حفصة" (بخاری، كتاب التفسير، سورة مريم وغیرہ)

-حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رداء کا مدینہ آمد پر رسولِ اکرم ﷺ کے سرِ عزیز پر سایہ کرنے کے واقعہ میں ذکر آچکا ہے۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة)

-حضرت علیؓ کی چادر مبارک کا ذکر ابوتراب کے حسین وجمیل واقعہ وخطاب نبوی کے ضمن میں آتا ہے۔

رداء کے علاوہ دوسرے ملبوسات زینت جیسے حلہ، قباء، عباء، خمیصہ وغیرہ بھی بیرونی لباس ہی تھے۔ ان کے پہننے کا ذکر ان کے تمام متعلقہ ابواب وفصول میں کیا گیا ہے اوران سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیرونی ملبوسات ہی تھے۔

عمامہ بھی بیرونی ملبوسات میں شمار ہوتا تھا کیونکہ اکابر عرب اور صحابہ کرام جب باہر نکلتے تھے تو ہی عمامے پہنتے تھے مگر وہ عام بیرونی لباس نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ معمول کے بیرونی معاملات وزیارات میں اس کا استعمال نظر نہیں آتا۔ بالعموم وہ خاص مواقع اور خاص تقریبات ہی پر پہنا جاتا تھا۔ وہ ٹوپی/قلنسوہ کی مانند معمول کے لباس کا حصہ نہیں تھا۔ اکابر عرب میں ابواحیحہ سعید بن العاص کے عمامۂ خاص کا ذکر آتا ہے تو روایت میں یہ وضاحت بھی آتی ہے کہ وہ جب عمامہ پہنتے تھے تو دوسرے اکابر قریشِ مکہ نہیں پہنتے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ عمامہ خاص خاص مواقع پر پہنا جاتا تھا۔ صحابہ کرام کے بارے میں بھی روایات یہی واضح کرتی ہیں کہ عمائم روزانہ بیرونی زیارتوں یا آمد کے وقت نہیں پہنے جاتے تھے۔

کام کے کپڑے

اسی طرح کام کرنے کے خاص کپڑے ہوتے تھے یا عام کپڑوں میں کام کیا جاتا تھا جو بالعموم دو ہوتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسی بنا پر جمعہ کے لئے دو الگ کپڑے بنانے کا حکم دیا تھا۔ (موطا/تنویر/۱/۱۳۳)

ملبوسات سفری

لباس کا ایک سماجی اور تمدنی پہلو یہ بھی ہے کہ لوگ جب سفر پر جاتے ہیں تو خاص قسم کے

کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ ایک طرح کے بیرونی لباس کا ایک خاص انداز تھا۔ اس میں بالعموم ایسے کپڑے پہنے جاتے تھے جو جلد گندے نہ ہوں، موسم کی سختی اور شدت سے جسم کی حفاظت کر سکیں، سواری پر بیٹھنے اور دورانِ منازل قیام کے زمانے میں آرام دہ ہوں۔ عہدِ نبوی سے قبل اور اس کے دوران اور بعد میں بھی سفری ملبوسات کا ذکر ملتا ہے۔ وہ عام ملبوساتِ سفر کے حوالے سے بھی ملتا ہے اور بعض خاص ملبوسات کے حوالے سے بھی مثلاً غزوات میں ملبوساتِ نبوی کا ذکر روایات میں خاص طور سے کیا جاتا ہے۔ ان کا ذکر حلہ وغیرہ کے حوالے سے ایک خاص فصل میں اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام اور دوسرے اکابر عرب کے حوالے سے ان ملبوساتِ سفر کا عام و خاص حوالہ آتا ہے۔ ان سے متعلق چند روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

- شعبان ۶ھ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو دومۃ الجندل کے سریہ کا امیر بنایا گیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور اس کا طریقہ بھی بتایا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اپنے سر پر عمامہ صرف لپیٹ لیا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو سیاہ عمامہ پہنایا اور اس کا شملہ ان کے کاندھوں کے درمیان لٹکا کر فرمایا کہ اس طرح عمامہ باندھتے ہیں۔ حضرت صحابیؓ کا بیان ہے کہ میں نے اس سفر کے لئے اپنے خاص سفری کپڑے (ثیاب سفری) پہنے تھے۔ (واقدی، ۵۶۰-۵۶۱)

- حضرت انس بن مالکؓ کا قاعدہ بھی یہی تھا کہ جب وہ سفر پر جاتے تو اپنے سفری لباس پہنتے تھے: "ولبس ثیاب السفر" (ترمذی، حدیث: ۳۶۳)

- ذکر آ چکا ہے کہ غزوۃ السلاسل میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک فدکی عباء پہنے ہوئے تھے۔ (واقدی، ۲، ۷۷۲)

- اکابر عرب میں شیبہ بن ربیعہ کے بارے میں آتا ہے کہ دوران حج قیامِ مزدلفہ کے وقت دو سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

خواتین کا بیرونی لباس

احادیث و روایات واضح کرتی ہیں کہ خواتین بھی مردوں کی مانند بلکہ ان سے زیادہ

اہتمام کر کے باہر نکلتی تھی۔ اس کی ایک فطری اور دینی وجہ بھی تھی اور تمدنی اور سماجی ریت بھی تھی۔ ان کا سارا جسم ستر پوشی کا تقاضا کرتا تھا اور ان کی حیاو شرم بھی اسی کی متقاضی تھی۔ سماجی اور تمدنی رویہ بھی یہ نظر آتا ہے کہ شریف خواتین (حرائر) ستر کا زیادہ خیال کرتی تھیں اور ان کے برخلاف باندیاں، کنیزیں اور دوسری عام عورتیں زیادہ فکر نہیں کرتی تھیں یا ان کے لئے ایسی سماجی قید و بند نہ تھی۔ بالعموم خواتین کا بیرونی لباس تین کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا: ازار/ زیریں جامہ، قمیص/ بالائی بدن کا جامہ اور سر کی اوڑھنی، چنانچہ خواتین بالعموم خمار/ دوپٹے کے بغیر باہر نہیں نکلتی تھیں یا اپنے اور دوسرے مردوں کے سامنے نہیں آتی تھیں جیسا کہ ان کے گھریلو لباس کے بیان میں حضرت ام سلیمؓ اور والدۂ حضرت ابوہریرہ دوسیؓ کے گھریلو لباس میں خمار کا ذکر آ چکا ہے۔ جلباب کی شرطِ ستر مزید عائد ہوئی تو خواتین عصر نے اپنے پورے جسم کو لمبی چادروں سے باہر نکلتے وقت چھپانا شروع کر دیا جیسا کہ نماز فجر کے وقت عورتوں کے اپنی اپنی چادروں (مروطهن) میں لپٹے ہونے کا ذکر روایات واحادیث میں بکثرت آتا ہے۔ یا جلباب کے خاص بیان میں ازواج مطہرات کے اپنے چہروں کو آڑ میں کر لینے کا ذکر ملتا ہے کہ اجنبی لوگ ان کو نہ دیکھ سکیں۔ اس صورت میں خمار یا اوڑھنی کی ضرورت نہ رہ جاتی تھی کہ جلباب/ مروط یا دوسری لمبی چوڑی چادریں دونوں کا کام کرتی تھیں۔ بہرحال خواتین باہر نکلتے وقت سر کو بھی ڈھانکتی تھیں اور خمار کو بطور خاص سر پر اوڑھ کر نکلا کرتی تھیں۔ اس کے بعض واقعات:

- حدیث نبوی: ۳۷۷ کے مطابق ایک خاتون نے ننگے سر پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مان لی۔ وہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی بہن تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے بھائی کو ہدایت کی کہ وہ نذر توڑ دیں، کفارۂ صوم ادا کریں اور سواری پر بیٹھیں اور دوپٹہ اوڑھیں۔

(حدیث ابوداود: ۳۲۹۳: احادیث ترمذی مذکورہ بالا اور ابوداود: ۶۴۱ کے مطابق عورت کو نماز میں بھی اوڑھنی (خمار) ضروری ہے ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی کہ اس کا سر اور اس کے بال بھی ستر میں شامل ہیں)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خمار/ دوپٹہ کا ذکر جنت البقیع جانے کے واقعہ میں آ چکا ہے کہ وہ شب میں بھی رسولِ اکرم ﷺ کے تعاقب میں گئیں تو اپنی اوڑھنی سر پر اوڑھنا نہیں بھولیں۔

(حدیث مسلم ونسائی - نبوی بیرونی لباس میں)

-حضرت رفاعہ کی مطلقہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن زبیر قرظیؓ کی اہلیہ اپنے شوہر سے طلاق لینے کی غرض سے حاضر خدمت ہوئیں تو ان کے سر پر سبز دوپٹہ تھا: "وعليها خمار اخضر"

(مسلم، كتاب اللباس، باب ثياب الخضر)

باریک لباس کی ممانعت

خواتین کے لئے باریک لباس جس سے بدن کے خطوط جھلکیں ممنوع تھا اور باہر نکلنا تو قطعی حرام تھا۔

-حدیث ۴۱۰۴ کے مطابق حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آئیں تو ان کے جسم پر باریک کپڑے (ثیاب رقاق) تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے اعراض فرمایا اور ہدایت کی کہ جب عورت بلوغ کو پہونچ جائے تو اس کے لئے مناسب نہیں کہ اس کا جسم جھلکے سوائے اس کے اور اس کے: آپ ﷺ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

-حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں تو باریک اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو پھاڑ ڈالا اور اس کی جگہ موٹا دوپٹہ اوڑھا دیا: "... وعلى حفصة خمار رقيق، فشقته عائشة وكستها خمارا كثيفا".

(موطا، كتاب الجامع، باب مايكره للنساء لبسه من الثياب)

-قباطی باریک ریشمی کپڑا ہوتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ کو ایک قبطیہ دے کر فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر لو: ایک کی تم اپنی قمیص بنا لینا اور دوسرا اپنی زوجہ کو دے دینا کہ اپنی اوڑھنی بنالیں مگر ان کو ہدایت کر دینا کہ اس کے نیچے ایک کپڑا لگالیں تا کہ بدن نہ جھلکے... (حدیث ابوداؤد: ۴۱۱۶)

گھریلو لباس

ہر سماج و معاشرے اور تمدن میں گھریلو لباس بیرونی لباس سے کسی قدر مختلف و سادہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گھر میں انسان، خواہ مرد ہو یا عورت، کسی نہ کسی کام میں

مصروف و مشغول ہوتا ہے یا وہ آرام و آسائش کی حالت میں لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ اس تن آسانی کے لئے وہ اپنے گھریلو لباس میں رہتا ہے۔ جو نہ صرف سادہ اور معمولی ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات صرف دو جامے - زیریں اور بالائی - ہی اس کے بدن پر رہ جاتے ہیں۔ سخت گرمی یا کسی اور غیر معمولی صورت میں وہ صرف زیریں جامے ازار، پاجامہ، تہمد، شلوار وغیرہ پر قناعت کرتا ہے اور بالائی بدن کا لباس بھی اتار ڈالتا ہے۔ مگر یہ صرف مردوں کا طریقہ، رویہ اور گھریلو لباس کا تمدن ہوتا ہے۔ خواتین اور عورتیں ہر حال میں اپنے بالائی بدن کو ہر مہذب معاشرہ میں ڈھانکے رہتی ہیں خواہ وہ صرف ایک لمبی قمیص ہی کیوں نہ ہو۔ یہ صرف غیر متمدن و غیر مہذب سماجوں کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس کی عورتیں بالائی بدن کو بھی کپڑوں کی قید سے آزاد کر دیتی ہیں۔ مہذب سماج میں اور روایتی معاشروں میں مردوں کا ننگے بدن گھر میں رہنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ وہ شرافت کے خلاف ہے حتیٰ کہ ستر کا کوئی حصہ کھلا رکھنا جو شرعی طور سے ضروری نہیں ہوتا وہ بھی برا سمجھا جاتا ہے کہ معیارِ تہذیب اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلامی اصول و اقدار معاشرت میں اس سماجی رواج اور تمدنی رویے کی بھرپور تائید ملتی ہے۔ سورۂ نور - ۵۸: میں تین اوقاتِ ''عورت'' کا ذکر ہے: نماز فجر سے قبل اور دوپہر میں جب تم اپنے کپڑے اتار کر رکھتے ہو اور نماز عشاء کے بعد۔ اگرچہ ان تین اوقات میں زیارت و طواف کے لئے اجازت خاص لینے کا حکم ہے تاہم دوسرے وقتِ ''عورت'' میں کپڑے اتارنے کا واقعہ بھی مذکور ہے: ''وحین تضعون ثیابکم من الظهیرة'' اور اس میں گھریلو لباس کا واضح ذکر ہے اور دوسرے دو اوقات میں وہ مضمر و مستور ہے کہ انسان ان تین خاص اوقاتِ تنہائی میں آرام و سکون کی خاطر کم لباسی کو پسند کرتا ہے۔ وہ عربوں کا دستور بھی تھا اور اسلامی نبوی عہد کا معاشرتی و تمدنی رویہ بھی تھا۔

نبوی گھریلو لباس: کا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس حدیث میں ملتا ہے جس میں رسولِ اکرم ﷺ کے رات میں گھر تشریف لانے، اپنے بستر پر بیٹھ کر تمام غیر ضروری یا بیرونی ملبوسات کے اتارنے اور صرف لباسِ ستر میں رہ جانے کا ذکر ہے اور پھر جنت البقیع تشریف لے جانے کے لئے دوبارہ تمام لباسِ زینت کو زیب تن فرمانے کا بیان ہے۔ اس میں لباس نبوی سے

زیادہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھریلو لباس اور باہر جانے کے لباس کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ اس کا مختصر مختصر ترجمہ و بیان یہ ہے:

-رسولِ اکرم ﷺ میری باری پر گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک اتاری اور جوتے اتار کر اپنے قدم شریف کے پاس رکھ لئے اور اپنی ازار کا ایک حصہ اپنے بستر پر پھیلا کر دراز ہو گئے۔ جب مجھے سوتا ہوا سمجھا تو پھر آپ ﷺ نے اپنی چادر زیب تن فرمائی اور جوتے پہنے اور دونوں کام بہت آہستہ سے انجام دیئے۔

-حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ ﷺ کے جانے کے بعد آپ کے پیچھے جانے کے لئے اپنی چھوٹی گھریلو قمیص پہنی (درعی فی راسی) اور دوپٹہ اوڑھا اور اپنا ازار لپیٹا اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر ہولیں ... اس پورے بیان میں گھریلو لباس کا واضح ذکر ہے بالخصوص درع اس چھوٹی سی قمیص کو کہتے ہی ہیں جو عورت گھر میں پہنتی ہے (مصباح اللغات) اور باہر جانے والی قمیص بہت لمبی اور شاندار بھی ہوتی ہے جیسا کہ قمیص کی فصل میں ذکر آچکا ہے۔

-بردہ/ بردا اور رداء وغیرہ جیسی چادریں دراصل لباسِ زینت تھیں جو گھر سے باہر جانے کے لئے معمول کے لباس کے اوپر ڈالی جاتی تھیں، جیسا کہ نبوی رداء کے اس واقعہ میں بھی ہے اور دوسرے واقعاتِ رداء میں ملتا ہے۔ اسی طرح حلہ/ جبہ/ عباء/ قباء وغیرہ بھی بیرون کے ملبوسات زینت تھے اور گھر آتے ہی ان کو اتار کر رکھ دیا جاتا تھا اور صرف ازار و قمیص یا دو گھریلو کپڑوں میں رہا جاتا تھا۔

-مشہور واقعہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے جسم اطہر پر دو موٹے قطری کپڑے تھے: "ثوبین قطریین غلیظین"۔ جب پسینہ آتا تو وہ بھاری ہو جاتے۔ ایک یہودی کے پاس شام سے بز نامی کپڑا آیا تو آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے مشورے پر ادھار خریدنا چاہا مگر ظالم نے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنے مال کھا جانے کا الزام بھی دھرا۔

(ترمذی، کتاب البیوع، فی الرخصۃ فی الشراء الی اجل)

-مشہور واقعہ ہے کہ حضرت کعب بن مالکؓ غزوۂ تبوک میں استطاعت کے باوجود حصہ نہ لینے کی پاداش میں قیدِ عزلت (خود ساختہ) کاٹ رہے تھے اور ساری دنیا سے کٹ کر صرف اپنے

گھر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ چالیس دن کے بعد جب ان کی توبہ قبول ہوئی اور ان کے دوست نے ان کو بشارت بہ آواز بلند دی تو انھوں نے اپنے دونوں کپڑے (ثوبی) بشارت دینے والے کو بطور انعام دے دیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے صرف گھریلو لباس کے دونوں حصے تھے۔

(ابن ہشام، ۲/ ۵۳۶)

-ایک دلچسپ روایت ایک غیر مسلم حارث بن سوید کے بارے میں ہے کہ غزوۂ احد میں وہ مدینہ کے کسی احاطہ/ باغ سے باہر آیا تو اس کے جسم پر دو مستعمل پرانے کپڑے تھے اور حکم نبوی سے حضرت عثمانؓ نے اس کو قتل کر دیا: "و علیه ثوبان مضرّجان" (ابن ہشام، ۲/ ۸۹)

-گھریلو لباس میں بسا اوقات صرف ایک چادر یا لمبا لباس رہ جاتا تھا جس سے پورا بدن ڈھانپ لیا جاتا تھا اور بچے تو صرف اسی میں رہتے تھے۔ کبھی وہ ازار ہوتا جو ان کی گردنوں میں باندھ دیا جاتا اور اس سے سارا ستر محفوظ رہتا تھا اور کبھی چادر سے سارا بدن ڈھک لیا جاتا تھا مثلاً:

-حضرت سلمہ بن سلامہؓ بعثت کے وقت بہت چھوٹے تھے اور جب ایک یہودی نے بعثت نبوی کی پیش گوئی بہ آواز بلند ان کے قبیلہ/ خاندان بنو عبدالاشہل میں کی تو وہ اپنے گھر والوں کے صحن میں ایک چادر میں ملبوس لیٹے ہوئے تھے: "علیّ بردة لی، مضطجع فیها بفناء اهلی..." (ابن ہشام، ۱/ ۲۱۲)

-حضرت خدیجہؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ اپنی گھریلو قمیص میں تھیں (درعها) جب انھوں نے حضرت جبریلؑ کے فرشتہ ہونے کا پتہ لگایا تھا۔

-اسی طرح قرآن کی اولین تنزیل کے واقعہ کے بعد وہ رسولِ اکرم ﷺ سے سارا ماجرا سن کر حضرت ورقہ بن نوفلؓ کے پاس جانے کے لئے اٹھی تھیں تو اپنے سارے کپڑے پہن لئے تھے: "... قامت فجمعت علیها ثیابها" (ابن ہشام، ۱/ ۲۳۸ و مابعد)

عہد نبوی کی معاشرت و ثقافت میں بھی اس گھریلو لباس کے اختیار و استعمال کے متعدد واقعات ملتے ہیں اور مختلف ملبوسات کے بیان کے ضمن میں ان کا ذکرِ خیر آ چکا ہے مگر ان کے گھریلو لباس ہونے کے زاویہ کو بوجوہ ابھارا نہیں جا سکا۔ اس خاص فصل میں ان کا ذکر روایات و واقعات

کے حوالے سے کیا جاتا ہے تاکہ یہ معاشرتی رویہ اور لباس کا یہ خاص استعمال اور مخصوص قسم بھی مستند و مدلل ہو جائے۔

-مکی اور مدنی دونوں ادوار حیات و تاریخ میں گھریلو لباس پہننے کا ذکر مختلف طریقوں سے اور کبھی واضح اور کبھی مضمر طریقے سے ملتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں موسم کی سختی اور گرمی کی شدت کی بنا پر اور ان ہی اسباب سے دوسرے گرم علاقوں میں دوپہر میں بالخصوص اور آرام و سکون اور کام و کاج کے اوقات میں بالعموم گھریلو لباس پہنے رہنے کا ذکر آتا ہے۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا جاتا مگر بیرونی یا معمول کے ملبوسات کو گھر میں داخل ہونے کے بعد اتار کر رکھ دینے اور صرف ضروری لباسِ ستر زیب تن رکھنے کا ذکر بہرحال آتا ہے اور اسی طرح وہ مدینہ منورہ جیسے دوسرے نسبتاً معتدل علاقوں کے بارے میں بھی آتا ہے۔ اس کی صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

-سورۂ نور- ۵۸ کے آخری حصہ میں نکاح کی عمر پار کر جانے والی خواتین کے کپڑے اتارنے کا ذکر ہے: ﴿أن يضعن ثيابهن غير متبرجٰت بزينة ...﴾ حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسی عمر رسیدہ بالعموم اپنے تمام اوپری کپڑے اتار دیتی تھیں اور صرف لباس ستر میں رہ جاتی تھیں۔ دوسرا اہم واقعۂ معاشرت یہ بیان کیا ہے کہ ان اوقات بالخصوص دوپہر میں میاں بیوی صرف ایک کپڑے (ثوب واحد) میں رہ جاتے تھے اور ان کو اس لباسِ مباشرت میں دیکھنا ممنوع تھا لہٰذا پیشگی اجازت داخلہ کی شرط لگائی گئی۔ بعض اوقات غربت و ناداری نے بھی مرد تو مرد عورت کو صرف ایک چادر میں اپنا بدن چھپانے پر مجبور کر دیا تھا جیسا کہ ایک مشہور صحابی کا واقعہ ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے واقعات مجالست کا ذکر کیا گیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، ۳/۲۹۲ و مابعد)

خواتین کا گھریلو لباس

عہدِ نبوی کی صنف نازک کا گھریلو لباس بھی بالعموم دو لباسوں/کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ قمیص و ازار ہوتے تھے یا قمیص (درع) لمبی ہوتی تو ازار نہیں ہوتا تھا اور اوپر کے جسم یعنی سر پر دوپٹہ یا اوڑھنی ضرور ہوتی تھی۔ اس طرح ان کے گھریلو لباسوں میں دو یا تین لباسوں کا ذکر ملتا

ہے۔ معمول غالباً تین کا تھا یعنی ازار، درع اور خمار (اوڑھنی) کا۔ ان دونوں کا ذکر بعض روایات کے حوالے سے کیا جارہا ہے جو اس خیال و نتیجہ کو مستند بنادے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ گھروں پر تنہائی میں خواتین خانہ صرف زیریں جامے اور بالائی لباس میں رہتی تھیں اور اوڑھنی کا استعمال مردوں کے آنے پر کرتی تھیں یا باہر نکلنے پر۔

دو کپڑوں کا ذکر

-حضرت ابوہریرہ دوسیؓ کی والدہ ماجدہ نے اسلام قبول کیا تو غسل فرما کر اپنی قمیص اور اوڑھنی اوڑھ لی اور پھر حضرت ابوہریرہؓ کے لئے دروازہ کھولا تھا: "فاغتسلت ولبست درعها وعجلت من خمارها ..." (حدیث مسلم: ۱۵۸ (۲۴۹۱)

-حضرت ام سلیمؓ کی ایک یتیم و پروردہ بچی سے رسول اکرم ﷺ نے مذاق میں فرمادیا کہ تیری عمر/سن زیادہ نہ ہوگا۔ وہ خدمتِ نبوی سے روتی ہوئی حضرت ام سلیمؓ کے پاس گئی اور شکوہ کیا کہ اب تو میرا سن ہرگز ہرگز زیادہ نہ ہوگا۔ حضرت ام سلیمؓ نے اپنی اوڑھنی جلدی سے سر پر رکھی اور خدمت نبوی میں وضاحت کے لئے پہونچ گئیں: "فخرجت ام سليم مستعجلة تلوث خمارها" (حدیث مسلم: ۹۵ (۲۶۰۳): حضرت ام سلیم کو رسول اکرم ﷺ نے بتایا کہ بددعا بھی دعائے نبوی بن جاتی ہے کہ یہی شرط رب سے ٹھہری ہے)

-حدیث مسلم: ۱۱۹ (۱۹۴۲) کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس فہریؓ کو ان کے شوہر سے طلاق کے بعد حضرت ابن ام مکتوم نابینا صحابیؓ کے گھر میں رکھا تھا کہ ان کی اوڑھنی گر جائے یا کپڑا اٹھ جائے تو ستر کی خلاف ورزی نہ ہو۔

بیک وقت دو ملبوسات کا استعمال

عام طور سے عرب جاہلی اور تمدن اسلامی دونوں میں دو ملبوسات بدن کا رواج تھا: ایک جامۂ زیریں ازار وغیرہ اور دوسرا بالائی بدن کا ایک -صرف ایک- لباس جیسے قمیص، حلہ، جبہ، خمیصہ، بردہ، رداء وغیرہ۔ لیکن متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت بالائی بدن پر دو دو

لباس ہوتے تھے۔ ان کی بھی دو قسمیں ملتی ہیں: ایک یکساں قسم کے دو لباس بدن پر پہن لئے جیسے دو قمیصیں یا دو حلے یا دو چادریں وغیرہ بیک وقت تہہ بہ تہہ پہن لیں، دوسرے ایک معمول کے لباس کے اوپر دوسرا لباس فاخر بطور زینت وافتخار چڑھالیا جیسے قمیص کے اوپر حلہ، جبہ، قبا، عباء وغیرہ بطور اضافی ملبوس پہن لیا۔ ان دونوں کے متعدد واقعات ملتے ہیں اور ان کا ذکر اوپر کئی جگہ آچکا ہے۔ اس سماجی رجحان اور تمدنی رواج کی مزید وضاحت کے لئے ان کے بعض واقعات کو مختصراً یہاں دہرایا جارہا ہے:

قمیص

عام اور شاید معمول کی سب سے زیادہ پسندیدہ، محبوب ومروج بالائی ستر پوشی کا لباس تھا۔ حدیث بخاری: ۱۳۵۰ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے بیک وقت دو دو قمیصیں پہن رکھی تھیں جن میں سے ایک منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کے کفن کے لئے اتار کردے دی تھی: "وکان علی رسول اللہ ﷺ قمیصان"۔

حلہ

حضرت حمزہ بن ثعلبہ بہزیؓ جب خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو دو یمنی حلے پہنے تھے۔ (اسد الغابہ، ۲/۴۴)

شملہ

- حضرت سلمان فارسیؓ اپنے قبول اسلام کے لئے حاضر خدمت ہوئے تو دو دو چادریں (شملتان) پہنے ہوئے تھے۔ (ابن ہشام، ۱/۲۲۰)
- حضرت عمرؓ کے عمامہ فاروقی میں دو دو سیاہ چادریں ہوتی تھیں: "بردتان سوداوتان". (اسد الغابہ، ۴/۷۲)

قمیص پر حلہ

- مشہور عرب مکی سہمی شیخ عاص بن وائل نے حضرت عمرؓ کو ان کے قبول اسلام کے وقت پناہ

دی تھی تو اس کے جسم کا بالائی لباس قمیص پر مشتمل تھا اور اس کے اوپر ریشمی حلہ تھا: علیه حلة حبرة وقميص مكفوف بحرير - بخاری

قمیص پر رداء/ چادر

اشراف عرب اور اکابر قوم کا ایک سماجی اور تمدنی رواج ورویہ یہ تھا کہ وہ قمیص پر ایک چادر ضرور ڈالتے تھے۔ بسا اوقات کسی شریف قبیلہ یا عظیم قوم کے جسم پر تنہا قمیص دیکھی جاتی تو اس کا بطور خاص ذکر کیا جاتا کہ اس پر چادر نہ تھی۔ یہ تواضع وانکسار، فروتنی کے لئے بھی کیا جاتا تھا اور عاجزی والتماس کے لئے بھی۔ بعض اوقات غمی کے معاملات بھی چادر اتار دیتے تھے۔ یہ جاہلی روایات تھیں جن کو اسلام میں بہر حال ممنوع قرار دیا گیا۔

- حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے ایک عظیم قریش کی سفارش کی تو ان کی قمیص پر چادر نہ تھی۔

- بعض صحابہ کرام نے ایک جنازے کی مشایعت میں اپنی چادریں اپنی قمیصوں پر سے اتار دی تھیں اور صرف قمیصوں میں چل رہے تھے۔

قیدیوں کے کپڑے

اسلامی نبوی تمدن میں قیدیوں کے لئے جس طرح کھانے پینے کا انتظام کیا گیا تھا اسی طرح ان کے لئے ضرورت کے وقت کپڑے بھی فراہم کئے جاتے تھے۔ یہ دراصل ان صالح روایات کی اسلامی توسیع تھی جو دین حنیفی یا دوسرے مہذب معاشروں سے چلی آ رہی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے قیدیوں کے لئے اچھے اور معقول کپڑے بھی فراہم کئے تھے۔ کپڑوں/ ملبوسات کی بعض اقسام کے حوالے سے ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے ان کا مختصر ترین حوالہ اور بعض دوسرے واقعات کا تاریخی تناظر میں ذکر مختصر ہی کیا جا رہا ہے:

- غزوۂ بدر میں رسولِ اکرم ﷺ کی ہدایت وفرمائش پر صحابہ کرام نے اسیران بدر کو اپنے کپڑے دیئے تھے۔

-حتی کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کو اپنی قمیص دے دی تھی کہ ان کے طویل وتوانا جسم پر کسی اور کی قمیص چست نہیں ہو رہی تھی اور سردارِ نفاق کی قمیص نے ان کا تن ڈھانک دیا تھا۔

- غزوۂ حنین کے قیدیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ ان کے لئے کپڑے کم پڑ گئے تو رسولِ اکرم ﷺ نے خاص طور سے مکہ مکرمہ سے ان کے لئے کپڑے خرید کر منگوائے تھے۔ روایات میں ان کو ثیاب المعقد کہا گیا ہے جو علاقہ ہجر کی چادریں تھیں۔

(واقدی، ۹۴۳؛ النہایہ، ۳/۱۱۳: ثیاب المعقد کی شرح کے لئے: "ضربٌ من برود هجر")

ملبوسات کی ساخت/صنعت

اگر چہ اس باب کا اور باب رنگریزی کا راست علاقہ صنعت وحرفت کے موضوع ومبحث سے زیادہ ہے تاہم ملبوسات کی بحث میں صنعت پارچہ بافی کا مختصر ذکر وتجزیہ پیش کیا جانا بھی ضروری ہے تا کہ اس بحث کی تکمیل ہو سکے اور بعض دوسرے اہم تمدنی اور سماجی مظاہر کو سامنے لایا جا سکے۔ اسی سے یہ معلوم ہوگا کہ عہد نبوی کا تمدن محض قبائلی یا معمولی نہیں تھا یا وہ تمدن کے اعلیٰ اسباب وعناصر سے محروم نہ تھا۔ اگر وہ بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ نہ تھا تو اوسط درجہ کا ضرور ہی رہا تھا۔ صنعت پارچہ بافی کے بھی مختلف مظاہر ہی سے اس کا مزید اثبات ہوگا۔ عربی میں کپڑا بننے کے لئے لفظ "نسج" اور اس کے مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور امام بخاری کے ایک باب صلوٰۃ کے ترجمۃ الباب میں جبہ شامیہ کے حوالے سے مجوسی کے بُنے کپڑوں کے بارے میں خیال حضرت حسن بصری ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے یہودی، نصرانی اور دوسرے غیر مسلموں کے بنے ہوئے کپڑوں کے استعمال کے جواز سے بحث کی ہے۔ (فتح الباری، ۱/۶۱۳-۶۱۴ وغیرہ)

عہد مبارک میں صنعت پارچہ بافی یا کپڑوں کی ساخت کے دو بنیادی پہلو یا سطحیں تھیں: ایک گھریلو اور دوسری پیشہ ورانہ۔ ان دونوں میں مہارت اور فنی گہرائی کے علاوہ دوسرے امتیازات واختلافات بھی تھے اور دلچسپ زاویے بھی تھے۔

گھریلو صنعت میں یہ ذکر بہت واضح آتا ہے کہ خواتین اپنے شوہروں کے لئے، اور

دوسرے عزیزوں کے لئے بھی، کپڑے بنا کرتی تھیں جیسے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے ہاتھ سے رسولِ اکرم ﷺ کے لئے ایک لباس بُنا تھا۔

ایک دوسری گمنام صحابیہ کا ذکر ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے لئے ایک شملہ یا بردہ (چادر) بن کر لائی تھیں۔ اس کو خمیصہ وغیرہ بھی کہا گیا ہے اور اس کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ اس کے حاشیے میں یا کنارے گل بوٹے بنائے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تانے بانے کے اختلاف واختلاط کی بنا پر کپڑے بناتے وقت ہی بناوٹ آئی تھی اور اس میں رنگ سازی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ دو قسم کے رنگوں والی چادریں جیسے نمرہ وغیرہ جو سفید وسیاہ دھاریوں پر مشتمل ہوتی تھیں اسی گھریلو صنعت پارچہ بافی کا حصہ ونتیجہ تھیں۔

پیشہ ورانہ صنعت پارچہ بافی کا ذکر اگرچہ بیشتر طور سے ترقی یافتہ ممالک جیسے مصر، شام و عراق وغیرہ کے حوالے سے آتا ہے تاہم وہ جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی علاقوں میں کلیتًا مفقود نہیں تھا۔ وہاں بھی پیشہ ور ماہر صناع ہوتے تھے جیسے ایک خاص قسم کا کپڑا حریثیہ ایک عرب صناع کے نام کی طرف منسوب ہونے کے سبب اپنا نام پاسکا تھا۔ وہ حریث نامی شخص تھے۔

غیر ملکی۔ شامی یا مصری۔ کپڑوں کے بارے میں قسیة / القسی کے بیان وباب میں ان کی صنعت کا بھی حوالہ ہے جس کا ذکر ریشمی یا ممنوع ملبوسات میں کیا جاچکا ہے۔ وہ ریشم سے بنائے ہوئے کپڑے ہوتے تھے جس میں الاترنج اور المیثرة کی شکلیں بنی ہوتی تھیں اور عورتیں ان کو اپنے شوہروں کے لئے قطائف کی طرح بچھا کر یا پھیلا کر بنایا کرتی تھیں۔

(فتح الباری، ۱۰/۳۶۰)

کپڑوں کو رنگنے کی صنعت

سادہ، سفید یا بلا رنگ کپڑوں کی اپنی قدر و قیمت تھی اور آج بھی ہے کہ وہ تمدن کی سادگی بتاتے ہیں۔ لیکن انسانی مزاج گونا گونی کا فطری طور سے خوگر ہے، وہ رنگوں کو بھی پسند کرتا ہے اور رنگین چیزوں اور لباسوں کو بھی۔ یہ دراصل فطری/ قدرتی کاریگری کی تخلیقی جبلت کا اظہار بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیقات میں سپاٹ چیزیں بھی بنائی ہیں اور نوع بہ نوع رنگوں کی بھی اور

غالباً موخر الذکر کا پلہ بھاری ہے۔ لہٰذا پارچہ بافی کی صنعت میں رنگریزی اور رنگریزوں کو ہمیشہ دخل رہا ہے۔ وہ مختلف کپڑوں کو اور دوسری چیزوں کو رنگتے آئے تھے حتیٰ کہ مرد وانسان نے اپنے اعضاء وجوارح بھی رنگنے پسند کئے ہیں (عربی میں بالعموم کپڑوں کو رنگنے کے لئے لفظ "صبغ" یا اس کے مشتقات آتے ہیں؛ (مصباح اللغات: صبغ ... صَبغاً و صِبغاً)۔ حدیث ابوداؤد: ۱۷۹۷ میں حضرت فاطمہؓ کے کپڑوں کو "ثیابا صبیغا" کہا گیا ہے؛ مصبوغ تو عام طور سے استعمال ہوتا ہے۔ (حدیث ابوداؤد: ۴۰۶۴)

عرب جاہلی اور عہد نبوی دونوں میں کپڑوں کو رنگنے کی صنعت و کاریگری موجود تھی اور رنگین کپڑے پسند کئے جاتے تھے۔ اس زمانۂ فطرت میں رنگ۔ مختلف رنگ۔ قدرتی چیزوں جیسے گھاس، نباتات، پھولوں، پتیوں، جڑوں وغیرہ سے حاصل کئے جاتے تھے۔ ان کا بنانا اور ان سے رنگنا آسان کام تھا کہ ان کے اپنے ذاتی اور قدرتی رنگ سیال کی شکل میں نکلی چیزوں کو رنگین بنا دیتے تھے لیکن فنی رنگریزی ماہرانہ استعمال اور صناعانہ مہارت چاہتی تھی۔ اس کے دو طبقات تھے جن کا ذکر اس فصل کے آخر میں آتا ہے۔ رنگ حاصل کرنے کے طریقوں پر بحث و معلومات ذرا کم ملتی ہیں لیکن مختلف نباتاتِ قدرت سے رنگنے کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ یہ اشیاء تھیں:

- زعفران: جو اردو میں زعفران ہی کہلاتی ہے اور ہندی میں کیسر۔ اس کی باقاعدہ کاشت کی جاتی تھی اور درآمد بھی۔
- ورس: جو خاص قسم کی تل کی مانند گھاس ہوتی تھی اور اس کو رنگنے کے لئے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔
- صفرة: پیلے رنگ کی نباتات ہوتی تھی یا جو کپڑے کو پیلا کر دیتی تھی۔ ویسے اس کے لغوی معنی زردی اور سیاہی دونوں ہیں۔
- مدر: مٹیالا رنگ پیدا کرنے والا مادہ: حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمیؓ کا کپڑا اسی میں رنگا ہوا تھا: انما ہو مدر۔ موطا، ۱/۳۰۴۔
- مشق: گیرو جو لال رنگ سے مختلف ہوتا ہے، اس سے بھی کپڑے رنگے جاتے تھے۔

موطا، ۳/۱۰۲ (کتاب الحج، لبس الثیاب المصبغة)

-خلوق: ''ایک خاص قسم کی خوشبو جس کا جزو اعظم زعفران ہے''۔ مصباح اللغات کی اس تعریف سے اس کے مخلوط رنگ ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ مگر احادیثِ احرام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رنگ بھی ہوتا تھا جیسے حدیث ابوداؤد: ۱۸۱۹ میں ہے: علیه اثر خلوق أو صفرة۔

حافظ ابن حجرؒ کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ رنگنے کے دو طریقے تھے: ۱- کپڑا بننے سے پہلے تانے بانے کسی رنگ میں رنگ لئے جاتے تھے، جیسے یمنی چادروں (برود الیمن) وغیرہ کے بارے میں طریقہ تھا: ''وبرود الیمن یصبغ غزلها ثم ینسج''۔ دوسرے کپڑے بھی اسی طرح پہلے رنگ لئے جاتے تھے۔ ۲- کپڑا بننے (نسج) کے بعد کسی رنگ میں اس کو رنگا جاتا تھا۔ اصلاً یہ دونوں طریقے بالترتیب جزوی اور کلی رنگنے کے لئے اختیار کئے جاتے تھے۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۳۷۷)

ان قدرتی اور نباتاتی رنگوں کی ایک خاصیت یہ ہوتی تھی کہ ان کا رنگ تازہ یا کچا ہوتا تھا تاہم چھوٹتا نہیں تھا۔ دوسری خاصیت یہ تھی کہ ان سے رنگے ہوئے کپڑوں پر اگر پانی کے چھینٹے مار لئے جاتے تو ان کی بھینی سی خوشبو اٹھنے لگتی تھی جو لباس پہننے والے کے مشام جاں کو تو معطر کرتی ہی تھی، خواتین خانہ اور ازواج بیت کو بھی خوب لبھاتی تھی۔ شوہر اور بیوی دونوں اس کا استعمال کرتے تھے جیسے رسولِ اکرم ﷺ اپنی ملحفہ (چادر) پر پانی چھڑک کر ازواج کے گھروں کے چکر لگاتے تھے یا جیسے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت صفیہؓ کی سفارش کرنے اور مزاجِ نبوی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنی رنگین اوڑھنی پر چھینٹے مار کر خوشبو کے جھونکے اٹھا دیئے تھے۔

رنگین کپڑوں کی ممانعت

حج وعمرہ کے احرام کے ابواب میں ان رنگین لباسوں کا ذکر ان کے رنگوں اور رنگنے کی صناعت کے ساتھ آتا ہے جن کو بحالتِ احرام ممنوع قرار دیا گیا ہے اور عام حالات میں ان کے استعمال کی اجازت ہے۔ اس کی بہت سی روایات واحادیث ہیں۔

(موطا، کتاب الحج، باب ما ینهی عن لبس الثیاب فی الاحرام نیز دیگر کتب حدیث جیسے بخاری، کتاب العمرة، باب ما ینهی الخ، کتاب اللباس، باب التزعفر للرجال؛ الثوب المزعفر وغیرہ)

-متعدد روایات واحادیث میں زرد رنگ میں رنگے کپڑوں (المزعفر / المعصفر) کو

پہننے کی ممانعت کی گئی ہے جیسے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے دونوں زرد رنگ کپڑوں (ثوبین معصفرین) کو دیکھ کر آپ ﷺ نے ان کی ممانعت کی تھی۔ اسی طرح سرخ رنگ کے کپڑوں کی ممانعت کی بھی احادیث ملتی ہیں۔ بقول حافظ ابن حجرؒ ان روایات میں خاصا معنوی اختلاف پایا جاتا ہے (فتح الباری، ۱۰/۳۷۵ و مابعد)۔ حافظ موصوف نے باب الثوب الاحمر کے آخر میں اپنی تشریح میں علماء سلف و خلف کے سات اقوال دیئے ہیں: ۱- مطلق جواز کا فتویٰ حضرات علی و طلحہ و عبداللہ بن جعفر اور براء وغیرہ متعدد صحابہ کرام، ۲- مطلق ممانعت، ۳- بیحد بھڑکیلا سرخ مکروہ اور معمولی سرخ جائز، ۴- مطلق مکروہ، ۵- تانے بانے سرخ ہوں تو جائز اور بننے کے بعد سرخ رنگا جائے تو ممنوع، ۶- صرف معصفر کی ممانعت حدیث کے سبب، باقی رنگوں کی نہیں، ۷- پورا کپڑا رنگا ہو تو ممنوع، ان تمام اقوال کے ذکر کے بعد امام طبری کا خیال نقل کیا ہے کہ بہر حال تمام رنگوں میں رنگا ہوا کپڑا جائز ہے لیکن بھڑکیلے سرخ وغیرہ پسندیدہ نہیں ہیں۔ (فتح الباری، ۱۰/۳۷۷-۳۷۸)

بیوہ کے لئے رنگین کپڑوں کی ممانعت

رسولِ اکرم ﷺ نے بیوہ عورتوں کو دورانِ عدت رنگین کپڑوں کے پہننے کی ممانعت کی جو زعفران یا ورس سے رنگے ہوئے ہوں، صرف ثوب/ ثیابِ عصب (سوتی) پہننے کی اجازت دی:

"...ولا تلبس ثوبا مصبوغا الا ثوب عصب..."

(بخاری، کتاب الطلاق، باب تلبس الحادة ثياب العصب؛ حدیث مسلم: ۴۸ (۲۰۸۷)

رنگوں کی اقسام

عہدِ نبوی کے ملبوسات کے متعدد رنگوں کا ذکر بہت وضاحت اور بڑی دلنشینی اور وجاہت کے ساتھ آتا ہے۔ قسما قسم کے ملبوسات کے ذکر میں ان کے رنگوں کا بیان آچکا ہے۔ صرف رنگوں کا فرق و امتیاز بیان کرنے کی خاطر ان کا ایک مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔:

سرخ رنگ

رسولِ اکرم ﷺ کے حلۂ حمراء کے علاوہ متعدد دوسرے ملبوسات کا ذکر ملتا ہے جیسے منیٰ میں

جسم اطہر پر ایک لال چادر تھی "برد احمر" - حدیث ابوداوٴد: ۴۰۲۳؛ چاندنی رات میں حضرت جابر بن سمرہؓ نے آپ ﷺ کو حلہ حمراء میں ملبوس دیکھا۔ ترمذی، "لبس الحمرۃ للرجال"۔

-سوق ذوالمجاز میں رسولِ اکرم ﷺ کا حلہ حمراء تھا اور دوسرے بازار میں دشمن چچا ابولہب کا حلہ حمراء تھا۔

- صفت/ شمائل نبوی میں حدیث حضرت براء بن عازبؓ: نبوی حلۂ حمراء جس میں آپ ﷺ حسین ترین لگ رہے تھے: مسلم: ۲۵۹

-حلۂ حمراء میں رسولِ اکرم ﷺ نے دورانِ حج نماز پڑھائی۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، الصلاۃ فی الثوب الاحمر)

سبز رنگ

رسولِ اکرم ﷺ کی بعض چادریں اور کپڑے سبز بھی تھے۔ حدیث ابوداوٴد: ۴۰۶۵ کے مطابق حضرت ابورمثہؓ نے جسم اطہر پر دو سبز چادریں دیکھی تھیں: "بردین اخضرین"۔

-حضرت طلحہ کے جسم پر سبز رنگ کے کپڑے تھے: حدیث ترمذی، تفسیر القرآن، سورۃ الاحزاب۔

-حضرت عبدالرحمٰن بن زبیر قرظیؓ کی اہلیہ کا دوپٹہ سبز تھا: "وعلیھا خمار اخضر" (مسلم، کتاب اللباس، ثیاب الخضر)۔

زرد رنگ

-حضرت جندب بن عبداللہ بجلیؓ کی لمبی ٹوپی (برنس) زرد تھی: "اصفر" حدیث مسلم: ۱۶۰ (۹۷)

-حضرت ام خالد بنت خالد امویؓ مجلس نبوی میں آئیں تو پیلے رنگ کی قمیص پہنے تھیں۔

-حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ بحالت احرام پیلے رنگ کے کپڑے پہنتی تھیں جن میں زعفران نہیں ہوتی تھی: "انھا کانت تلبس الثیاب المعصفرات المشبعات وھی محرمۃ لیس فیھا زعفران" موطا/ تنویر، ۱/ ۳۰۴

-حضرت ابن عمرؓ زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے اور گیرو (مشق) سے رنگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ موطا، ۳/ ۱۰۲

- حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے مہمان کو اپنی پیلی چادر اوڑھنے کے لئے دی۔
حدیث ترمذی: ۱۱٦۔

- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے دونوں کپڑوں کو زرد رنگ میں رنگا ہوا پایا تو منع فرمایا۔ حدیث مسلم: ۲۷-۲۸ (۲۰۷۷)

سیاہ رنگ: کے عمائم بالخصوص عمائم نبوی کا کثرت سے ذکر آتا ہے:

- رسولِ اکرم ﷺ نے نماز استسقا پڑھی تو جسم اطہر پر ایک خمیصہ سوداء تھی جس کی تحویل مشکل ہوگئی تھی۔ ابوداؤد: ۱۱٦۴

- رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ام خالد بنت خالد امویؓ کو ایک منقش کالی چادر (خمیصة سوداء صغيرة) عطا کی تھی۔

- ہدایا میں رسولِ اکرم ﷺ کو بھی بسا اوقات سیاہ چادریں اور دوسرے سیاہ ملبوسات پیش کئے گئے تھے۔

گیرو رنگ

حضرت ابن عمرؓ کے کپڑے گیرو رنگ سے رنگے ہوتے تھے اور بعد میں حضرت ابو ہریرہؓ کے جسم پر کتان کے دو کپڑے گیرو سے رنگے ہوئے دیکھے گئے: "وعليه ثوبان مُمشقان من كتان" (بخاری، کتاب الاعتصام، باب ماذكر النبي ﷺ ... حض على انفاق اهل العلم)

سفید رنگ

اور تمام رنگوں میں سب سے اچھا، شاندار اور عظیم وجمیل رنگ سفید ہے جسے رنگوں کا سلطان وامام بھی کہا جا سکتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کو وہ سب سے زیادہ پسند تھا اور اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہننے کا اور اسی کا کفن بنانے کا حکم بھی دیا تھا کہ زندگی و موت دونوں میں اسی کا ساتھ رہے۔ امامانِ حدیث نے اسی عظمت وجلالت کی وجہ سے اس کے خاص ابواب قائم کئے ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنے "بـاب الثيـاب البيـض" میں پہلی حدیث: ۵۸۲٦ میں

اسے جبریل و میکائیل جیسے فرشتوں کا لباس کہا ہے اور دوسری حدیث: ۵۸۲۷ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید کپڑے/لباس کا ذکر کیا ہے کہ وہ جسم اطہر پر بہار دکھا رہا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام احمد اور اصحاب سنن کی تخریج اور امام حاکم کی تصحیح سے سفید لباس کے بارے میں حدیث نبوی نقل کی ہے: "علیکم بالثیاب البیض فالبسوھا فانھا أطیب و أطھر، و کفنوا فیھا موتاکم"۔ بعض روایات میں اسے بہترین لباس کہا گیا ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۴۸-۳۴۹؛ مسلم، کتاب الایمان، باب من مات لایشرک باللہ الخ)

سفید رنگ کی پوشاکوں کا بہت ذکر ملتا ہے جن میں سے متعدد کا مختلف حوالوں سے اوپر ذکر آچکا ہے اور سفید قمیص فاروقی کا دھونے کے حوالہ آگے آتا ہے۔

بعض اور سفید ملبوسات عہد کا ذکر بطور مثال مزید کیا جاتا ہے:

- سفر ہجرت کے دوران حضرت زبیرؓ نے رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو سفید شامی کپڑے ہی پہنائے تھے: "ثیاب بیض" (بخاری، کتاب المناقب، باب ھجرۃ النبی ﷺ الخ)

مطلقہ کے لئے سفید کپڑے

رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت امیمہ بنت شراحیل سے شادی کی مگر ان کو شب زفاف میں کچھ کراہت محسوس ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت ابواسیدؓ کو حکم دیا کہ ان کو دو سفید کتان کے کپڑے دے کر رخصت کردیں: "و یکسوھا ثوبین رازقیین"

(بخاری، کتاب الطلاق، باب من طلق الخ؛ الرازقیۃ: کتان کے سفید کپڑے؛ مصباح اللغات: الرازقی: لمبا سفید انگور)

رنگِ پیشاب

کپڑوں کو رنگنے کی صنعت اور رنگوں کی قسم میں سب سے زیادہ عجیب و غریب رنگ رنگِ پیشاب نظر آتا ہے۔ بظاہر وہ نفرت انگیز بھی معلوم ہوتا ہے اور ناجائز بھی مگر وہ ان دونوں اقسام کراہت سے پرے پسندیدہ رنگ سمجھا جاتا تھا اور عہد نبوی میں اس میں ذرا کراہت نہیں

سمجھی جاتی تھی۔ البتہ بعد کے ادوار میں بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں خود خلیفہ دوم نے اس کو ناپسندیدہ قرار دے کر ممنوع کرنا چاہا مگر ایک دوسرے صحابی مکرم کے مشورے سے ایسا نہیں کیا۔ موخر الذکر کی دلیل تھی کہ رسول اکرم ﷺ نے ایسے رنگین کپڑے بنفس نفیس پہنے اور دوسروں کو پہنائے اور اپنی احادیث میں ان کی اجازت دی۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب البرود والحبرة والشملة: "...ای الثیاب کان احب الی النبی ﷺ، قال: الحبرة؛ نیز مسلم، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ؛ نیز احادیث بخاری: ۵۸۱۲، ۵۸۱۳؛ فتح الباری، ۱۰/۳۳۹-۳۴۱، رنگ خاص کے لئے بالخصوص ۳۴۱ ملاحظہ ہو)

یمن میں ان کپڑوں کی صنعت بھی تھی اور ان کی رنگریزی بھی اور وہ روایات میں ثیاب الیمن کہے جاتے ہیں اور ان کی ایک خاص قسم حبرہ تو بہت مقبول و پسندیدہ تھی۔ وہ لغوی و حدیثی اعتبار سے ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس کی جمع "حبرات و حبر" ہیں۔

- حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بخاری کے مذکورہ بالا باب کی احادیث حبرہ کی تشریح کے اواخر میں لکھا ہے کہ امام احمد نے حضرت حسن بصریؒ کے طریق سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حبرہ کے حلوں کو منع کرنے کے ارادہ کیا کیونکہ وہ پیشاب سے رنگے جاتے تھے، تو حضرت ابی بن کعبؓ نے ان سے کہا کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے، ان کو نبی ﷺ نے پہنا ہے اور عہد نبوی میں ہم نے بھی پہنا ہے: "...أن عمر بن الخطاب أراد ان ینھی عن حلل الحبرة لانھا تصبغ بالبول، فقال لہ ابی: لیس ذلک لک، فقد لبسھن النبی ﷺ ولبسناھن فی عھدہ" ۔ امام ابن حجرؒ نے بہر حال یہ نقد کیا ہے کہ حضرت حسن نے حضرت عمرؓ سے سماعت نہیں کی۔ یہ نقد صحیح ہے اور حبرہ کے پیشاب رنگ میں رنگے جانے کی بات بھی صحیح ہے کہ امام بخاری کے مندرجہ ذیل ترجمۃ الباب میں وہ موجود ہے۔

- بخاری کے ترجمۃ الباب میں ہے کہ حضرت معمرؒ نے فرمایا کہ میں نے امام زہری کو یمن کے وہ کپڑے پہنے ہوئے دیکھا جو پیشاب سے رنگے جاتے تھے اور حضرت علیؓ نے بلا دھلے کپڑوں میں نماز پڑھی: "رایت الزھری یلبس من ثیاب الیمن ما صُبغ بالبول وصلّی علیؓ فی ثوب غیر مقصور"

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ فی الجبۃ الشامیۃ؛ فتح الباری، ۱/۶۱۳ وما بعد)

حضرت حافظ ابن حجرؒ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ ایسے کپڑوں کو استعمال سے قبل دھولیا جاتا تھا اگر وہ جنس پر محمول ہو اور اگر عہد پر محمول ہو تو اس سے مراد اس جانور کا پیشاب ہے جس کا گوشت کھایا جاتا ہے کہ وہ (امام) اس کی طہارت کے قائل تھے: "... (بالبول) ان کان للجنس فمحمول علی انه کان یغسله قبل لبسه، وان کان للعهد فالمراد بول ما یؤکل لحمه لانه کان یقول بطهارته" (فتح الباری، ۱/۶۱۴ نیز ماقبل)

رنگریزی/رنگ سازی

عام طور سے عورتیں خود اپنے کپڑے من چاہے رنگ میں رنگ لیتی تھیں مگر سب مرد و عورت یہ کام نہیں کر سکتے تھے خاص طور سے مرد حضرات لہٰذا وہ کسی رنگریز یا رنگ ساز سے اپنے کپڑے رنگواتے تھے۔ یہ پیشہ ور طبقۂ ماہرین ہوتا تھا۔ ان میں مرد و عورت دونوں شامل ہوتے تھے اور بالعموم عورتیں عورتوں کے کپڑے رنگتی تھیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکابر کے گھروں بالخصوص ازواج مطہرات کے گھروں میں جا کر کپڑے رنگتی تھیں۔ بہرحال یہ سماجی قدر و رواج بھی رہا تھا کہ رنگریز اپنا کام اپنے گھروں یا کام کی جگہوں پر کرتے تھے۔ ان کے واقعات و روایات ذرا کم دستیاب ہیں لیکن بہرحال ہیں۔

رنگ ساز عورتیں

- بنو اسد کی ایک عورت کا بیان ہے کہ میں ایک دن حضرت زینب زوجۂ نبوی ﷺ کے پاس تھی اور ہم ان کے کپڑوں کو نرم سرخ رنگ رہے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ وارد ہوئے لیکن جب آپ ﷺ نے معزہ (غیر خالص سرخ) دیکھا تو پلٹ گئے۔ حضرت زینبؓ سمجھ گئیں کہ آپ ﷺ کو رنگ پسند نہیں آیا لہٰذا انھوں نے اپنے تمام کپڑے دھو ڈالے اور تمام سرخی مٹا دی: "... ونحن نصبغ ثیابا لها بمعزة فبینا نحن کذلک ... فاخذت فغسلت ثیابها و وارت کل حمرة ..." حدیث ابوداؤد: ۴۰۷۱۔ حدیث کا دروبست بتاتا ہے کہ اس رنگریزی کے کام میں ام المومنین بھی شریک تھیں۔ "معزة" کا معنی گیرو اور غیر خالص سرخی کا رنگ بتایا گیا ہے، شارح ابوداؤد نے اسے "ملین احمر" کہا ہے۔ (مصباح اللغات؛ ومتن ابوداؤد)

خیاط اور خیاطت

ملبوسات کے سلنے سلانے کا ذکر ملے یا نہ ملے یہ واضح حقیقت ہے کہ عہد نبوی میں بھی کپڑے سلے ہی جاتے تھے اور ان کے سلنے والے، والیاں بھی تھیں۔ روایات و احادیث میں بہر حال خیاط اور خیاطی دونوں کا ذکر ملتا ہے اور ان کے طبقات کا بھی۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام کپڑوں کو سلنے والوں/ والیوں کا ایک گھریلو طبقہ تھا جو زیادہ تر خواتین خانہ پر مشتمل ہوتا تھا اور بعض پیشہ ور اور ماہر خیاط بھی تھے جیسے رسولِ اکرم ﷺ کے ایک پڑوسی خیاط تھے اور انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کی تھی اور اس میں لوکی/ گوشت/ شوربے پر مشتمل ثرید/ کھانا کھلایا تھا۔ ان کا ذکر اسی دعوت کے حوالے سے ملتا ہے۔ ان کے پیشے یا کام کی مہارت وغیرہ کے حوالے سے نہیں ملتا۔ شارحین حدیث ان کے نام تک کا پتہ نہیں چلا سکے تو اور کیا تفصیل کرتے۔

- حضرت عمار بن یاسرؓ کے بارے میں ایک روایت بتاتی ہے کہ وہ لحاف ثعالب سے ایک کپڑا سلی رہے تھے: "...یقطع علی لحاف ثعالب ثوبا"۔

- خلافت فاروقی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک خیاط یا تو سمور کا قطیفہ سلتا تھا یا ثعالب کا: "خیاط یخیط اما قطیفة سمور او ثعالب"

(ابن سعد، ۳/۲۵۵-۲۵۶؛ ثعالب لومڑی کی کھالوں کو کہتے ہیں اور سمور نیولے کی مانند ایک جانور ہوتا ہے)

گھریلو کپڑا سلنے والیوں میں رسولِ اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات بھی شمار کی جا سکتی ہیں اور دوسرے افراد و طبقات کی خواتین بھی کہ وہ جس طرح کپڑا بننے کی صنعت و حرفت جانتی تھیں اسی طرح ان کا سلنا بھی جانتی تھیں۔ بنفس نفیس رسولِ اکرم ﷺ اپنے کپڑوں میں پیوند لگا لیتے تھے جیسا کہ احادیث میں آپ ﷺ کے گھریلو کاموں کے سلسلہ میں ذکر آتا ہے اور آپ ﷺ کے پاس ایک تلے دانی سفر و حضر دونوں میں رہتی تھی جس میں سوئی اور دھاگا ہمیشہ رہتا تھا جیسا کہ ذکر آ چکا۔ جرانہ وغیرہ کے قیام و سفر کے حوالے سے آپ ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام کے سوئی دھاگے کا ذکر ملتا ہے اور دوسرے واقعات کے حوالے سے بھی۔

(واقدی، ۹۴۳: الخیاط و المخیط؛ الخیط و الابرہ: یعنی دھاگا اور سوئی)

کپڑے سینے کی چیزیں

روایات سیرت اور احادیث دونوں میں کپڑے کو لباس میں ڈھالنے کے ضمن میں چند ضروری چیزوں کا ذکر ملتا ہے اور اگر نہ بھی ملے تو بھی ان کی موجودگی لازمی ہی تھی کیونکہ ان کے بغیر کپڑے کو لباس کے لئے نہ کاٹا جاسکتا ہے اور نہ سلا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بنیادی چیزیں تھیں: قینچی (مقراض)، سوئی (ابرۃ)، دھاگا (خیط)

-مقراض: قینچی کا ذکر بالعموم بال کاٹنے اور وہ بھی رسولِ اکرم ﷺ کے موئے مبارک تراشنے کے ضمن میں آتا ہے۔

-سوئی اور دھاگہ کا ذکر رسولِ اکرم ﷺ کے سفر کے لازمی تھیلے کے اسباب سے متعلق روایات میں کیا جاتا ہے اور بعض دوسری روایات میں بھی، اگرچہ وہ ضمناً آتا ہے اور لباس کی قطع و برید یا کپڑے سینے کے حوالے سے ذرا کم آتا ہے۔ مثلاً غزوۂ حنین کے اموالِ غنیمت میں حضرت عقیل بن ابی طالبؓ کو ایک سوئی ملی تھی جو انھوں نے اپنی زوجہ محترمہ کو لا کر دیتے وقت کہا تھا کہ یہ ایک سوئی ہے جس سے تم اپنے کپڑے سینا: ...ابرۃ تخطین بھا ثیابک..." پھر کچھ دیر میں منادی نبوی کی نداء پر اس معمولی سوئی کو بھی بیوی سے لے کر اموال غنیمت کے ذخیرۂ ریاست میں ڈال آئے تھے۔ (واقدی، ۹۱۸)

کپڑے دھونے کے واقعات

کپڑے استعمال کرنے سے گندے ہوجاتے ہیں اور ان کے دھونے، صاف کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح وہ بسا اوقات نجاست حکمی کے سبب ناپاک ہوجاتے ہیں اور تب ان کو پاک و طاہر کرنے کی حاجت ہوجاتی ہے۔ ان دونوں سماجی و تمدنی اور دینی و تشریعی صورتِ غسل کے لئے سورۂ مدثر: ۴ میں حکم الٰہی ہے: ﴿وثیابک فطھر﴾ (اور اپنے کپڑے پاک رکھ)۔ رسولِ اکرم ﷺ کے خطابِ خاص کے ساتھ یہ عام حکم الٰہی ہے اور سب انسانوں کے لئے ہے۔ صرف نمازیوں، مسلمانوں اور اس دور کے مخاطبین کے لئے نہیں ہے۔ خطاب

کے اسلوبِ قرآنی کے اسی طرح تہہ در تہہ معانی ہوتے ہیں۔

اس حکمِ تطہیر میں صرف ناپاکی یا جنابت کی گندگی سے پاک رکھنے کا حکم بھی نہیں ہے بلکہ عام طہارت کا ہے۔ کیونکہ دینِ حنیفی اور شریعت ابراہیمی - اسماعیلی میں یہ حکمِ طہارت۔ غسل جنابت اور اس کے آلودہ کپڑوں کو پاک کرنے کا حکم - موجود تھا۔ حضرت شاہؒ نے اپنی خاص فصل اصلاح احوالِ اہلِ جاہلیت میں اس پر مدلل بحث کی ہے اور خاکسار نے اسلامی احکام کے ارتقاء میں۔ عرب جاہلی میں یہ حکم وعملِ طہارت اسی دینِ حنیفی سے آیا تھا اور اس پر ان کا ہمیشہ سے عمل تھا۔ اس کو سنت مؤکدہ سمجھتے تھے۔ گندے، میل خوردہ، گرد آلود کپڑوں کو دھونے دھلانے کا عام طریقہ ورواج تھا اور اس کی متعدد شہادتیں ملتی ہیں۔

(حدیث ابوداؤد: ۴۰۶۲: گندے کپڑے والے شخص کو کپڑے دھونے کی ہدایت نبوی؛ کتاب اللباس، باب فی غسل الثوب وفی الخلقان؛ عربی میں "قصر" کے معنی ہیں: دھونا اور پٹک کر دھونا اور قصار کے معنی ہیں: دھوبی۔ مصباح اللغات؛ بخاری/ فتح الباری، ۱۰/ ۶۱۳-۶۱۴)

ناپاک یا گندے کپڑے دھونے کے سلسلہ میں بعض دلچسپ اور اہم سماجی رجحانات و میلانات ملتے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ عام اور معمول کا طریقہ یہ تھا کہ کپڑے گندے ہو جاتے تو ان کو دھولیا جاتا تھا یا دھلوالیا جاتا تھا۔

- حدیث ابن ماجہ: ۳۵۵۸ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کی سفید قمیص دیکھی تو دریافت فرمایا: تمہارا یہ کپڑا دھلا ہوا ہے یا نیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یہ دھلا ہوا ہے۔ فرمایا اور دعا دی کہ نئے پہنو، خوب جیؤ اور شہید مرو: "...رای علی عمر قمیصا ابیض فقال: ثوبک ھذا غسیل ام جدید؟ قال: لا، بل غسیل..."

- ترجمۃ الباب اور تشریح حافظ ابن حجرؒ میں مذکور ہے کہ حضرت علیؓ کو قمیصِ کرابیس (کھردرے کپڑے کی قمیص) میں جو دھلی ہوئی نہیں تھی "غیر مقصور" میں نماز پڑھتے دیکھا گیا۔ اس میں بالواسطہ طور سے کپڑے دھونے کا ذکر ہے۔ (فتح الباری، ۱/ ۶۱۳-۶۱۴)

- بعض دوسرے صحابہ کرام اور صحابیات طاہرات بالخصوص ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے کپڑے دھونے کا ذکر ملتا ہے۔ حدیث ترمذی: ۱۱۷ کے مطابق حضرت عائشہؓ رسولِ اکرم ﷺ

کے کپڑے دھوتی تھیں اور منی آلود کپڑے بھی دھوتی تھیں: کنت اغسل الجنابة من ثوب النبی ﷺ (بخاری، کتاب الوضوء، باب غسل المنی؛ احادیث ابوداؤد: ۳۵۷-۳۶۵ وغیرہ)۔

- حدیث ترمذی: ۱۱۵- حضرت عائشہؓ نے اپنے ایک مہمان کو اپنی پیلی چادر اوڑھنے کو دے دی - موصوف کو احتلام ہو گیا تو انھوں نے پوری چادر دھو ڈالی۔ حضرت عائشہؓ نے شکوہ کیا کہ ہمارا کپڑا خراب کر دیا، صرف منی آلود حصے کو رگڑ دینا کافی تھا۔

- حدیث ابوداؤد: ۴۰۷۱ میں حضرت زینبؓ کے اپنے تمام لال کپڑے دھونے کا ذکر موجود ہے۔

اسلام لانے پر کپڑے دھونے کا تشریعی اور دینی حکم بالعموم نہیں سمجھا جاتا تاہم بعض اسلام قبول کرنے والوں کو رسولِ اکرم ﷺ نے بنفس نفیس کپڑے دھونے کا حکم دیا تھا۔ بعض کو ان کے مسلمان کرنے والوں نے اور بعض نے بذات خود اسے اسلام قبول کرنے اور دین فطرت میں داخل ہونے کی ایک عام سنت سمجھ کر اپنے کپڑے دھوئے تھے اور غسل بھی کیا تھا۔

- حضرت ابوہریرہ دوسیؓ کی والدہ ماجدہ کے گھریلو لباس کے ضمن میں ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے غسل بھی کیا تھا اور کپڑے بھی دھوئے تھے۔

- حضرت عمرو بن طفیل دوسیؓ نے اپنے والدین ماجدین کو اسلام قبول کرنے سے قبل ان کے کپڑے دھلوائے تھے۔

- مدینہ منورہ کے متعدد اکابر جیسے حضرت سعد بن معاذ اوسی، حضرت سعد بن عبادہ خزرجی اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہم نے اسلام لانے کے وقت غسل کر کے اپنے کپڑے دھوئے تھے۔

کپڑوں کے انتخاب میں ذوق سلیم

ذوق سلیم یوں تو ہر چیز کے اختیار کرنے میں کارفرمائی کرتا ہے مگر ملبوسات کے بارے میں وہ کچھ زیادہ ہی کرتا ہے۔ کپڑے کی قسم/قسموں کا معاملہ ہو یا ان کے رنگوں کا، وہ سراسر پہننے والے کے مذاق لطیف پر منحصر ہوتا ہے۔ یہی ذوق و مذاق اسے مختلف اوقات اور حالات کے لحاظ سے کپڑوں کے انتخاب کا سلیقہ عطا کرتا ہے اور ان کے رنگوں کا بھی۔ موقع و محل کی رعائت اسی

مذاق سلیم سے کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے اور عہد نبوی میں بھی کی جاتی تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ ایک وقت میں ایک کپڑا پسندیدہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسرے وقت میں وہی کپڑا ناپسندیدہ بن جاتا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کا معاملہ دوسرے انسانوں سے قطعی مختلف وممتاز تھا۔ رسول آخر الزماں ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو دینی وتشریعی رعائتوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا تھا اور تمدنی اور سماجی احوال کا بھی اور اسی کے ساتھ فطری ذوق کے تقاضوں کا بھی۔ رنگین کپڑوں کی بحث میں حافظ ابن حجرؒ سے بالخصوص اور دوسری احادیث وروایات وواقعات سے بالعموم ان کا پتہ چلتا ہے۔ آپ ﷺ نے متعدد مواقع پر سرخ حلوں کا استعمال فرما کر ان کا جواز بلا کراہت ثابت فرمایا اور دوسروں کو بعض مواقع پر رنگین کپڑوں بالخصوص زرد اور سرخ رنگوں کی شوخی کو ناپسند کر کے کپڑوں کو اتروا دیا۔ یہ دراصل مواقع کے لحاظ سے تعلیم وہدایت تھی اور اس میں ذوق سلیم کی تربیت اور مذاق سلیم کی رعائت دونوں موجود تھیں۔ اگر ان تمام عناصر وعوامل اور چیزوں کا لحاظ سمجھ میں آ جائے تو روایات واحادیث کا ظاہری تناقض دور ہو سکتا ہے اور صحیح مسئلہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔

صحابہ کرام اور صحابیاتِ طاہرات نے ان تمام روایات واحادیث اور مختلف سننِ نبوی کی حقیقت سمجھ لی تھی لہٰذا ان کے فکر وعمل میں کسی قسم کا تضاد وتصادم اور اختلاف وتنافر نہیں پایا جاتا۔ وہ تمام ملبوسات کی اقدار واصول سے بھی واقف تھے اور ان کے استعمال وعدم استعمال اور استحباب وکراہت سے بھی۔ فقہاء محدثین نے بھی سنن واحادیث کی کنہ اسی طرح پالی تھی۔ بعد کے لوگوں میں البتہ ان روایات واحادیث کے ظواہر کے اختلاف نے عدم تفقہ پیدا کیا اور وہ تضاد وتصادمِ احادیث کی بات کرنے لگے۔ مجموعی تناظر میں ان تمام سنتوں اور احکام اور اعمال کا مطالعہ کیا جائے تو صحیح طریق لباس واضح ہو جائے گا اور اس پر عمل کرنا بھی آسان ہوگا۔

آرائشِ بدن

دینِ فطرت ہونے کی بنا پر اسلام نے روح و باطن کے تزکیہ و آراستگی کے ساتھ ساتھ جسم و بدن کی آرائش بھی بتائی ہے۔ اسلامی فلسفۂ حیات میں انسان جسم و روح دونوں سے مل کر بنا ہے اور دونوں کی اپنی اپنی جگہ ایسی اہمیت ہے کہ دوسرے کی اہمیت اس پر منحصر ہے۔ وہ روحانی ترقی یا خالص روحانیت کی راہ میں جسم کو سدراہ نہیں سمجھتا بلکہ اس کے بالمقابل جسمانی نظافت و آرائش کو اس کا معاون بتاتا ہے۔ قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ اور رسولِ اکرم ﷺ کی احادیث مقدسہ دونوں میں جسم کو سنوارنے سجانے اور جمال آگیں بنانے کی ہدایات ملتی ہیں۔ ان ہدایات ربانی پر رسولِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام نے پورا پورا اسلامی عمل کیا تھا۔ وہ دراصل جمال الٰہی سے انسانی جمال کی ہم آہنگی کا معاملہ ہے ورنہ ارشادِ گرامی نہ ہوتا کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے: ''ان اللہ جمیل یحب الجمال'' ۔ اسی لیے اسے زیب و زینت، تجمل و تزئین، آرائش و زیبائش، حسن و جمال اور نظافت و طہارت وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آرائشِ بدن میں دو طرح کی چیزیں ملتی ہیں یا اس کی دو نوعیتیں ہیں: ایک بدن کے مختلف اعضاء و جوارح بالخصوص ظاہری اور کھلے رہنے والے حصے آرائش کی چیزیں ہیں، ان سے باطنِ جسم کی نظافت وغیرہ خارج نہیں۔ اس کو جسمانی آرائش کہا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم زیبائش وہ ہے جو انسانی جسم و بدن پر خارجی چیزوں کو سجانے و سنوارنے اور آراستہ کرنے کی خاطر کی جاتی ہے۔ جسمانی اعضاء و جوارح اور سارے قالب کی آرائش میں گیسو، چہرے، اور اس کی چیزوں، دست و بازو اور پیر و قدم کی آرائش آتی ہے۔ یہ اندرونِ بدن کی نظافت و تزئین بھی ہے۔ کیونکہ ظاہری اعضاء و جوارح کی طہارت و زیبائش سے جو ادراک جمال پیدا ہوتا ہے وہ اندرون کو بھی سنوارتا ہے جس طرح اندرونی تزکیہ اور طہارت اپنے خارجی مظاہر کو انسانی جسم و بدن

پر بطور نظارۂ جمال دیکھنا چاہتی ہے۔ خارجی اشیائے زیبائش میں بہت سی چیزیں آتی ہیں جو اعضاء کی آرائش میں بھی شریک و سہیم ہیں لیکن ان میں خاص اشیاء وہ ہیں جو جزوِ بدن نہیں بنتیں تاہم وہ اعضاء و جوارح اور انسانی بدن کو سجا اور سنوار دیتی ہیں جیسے زیورات، خوشبو، عطریات وغیرہ۔ اگلے مباحث ان ہی دونوں اقسام آرائش کا مطالعہ عہد نبوی کے حوالے سے روایاتِ سیرت واحادیث نبوی کے تناظر میں کرتے ہیں۔

گیسوئے تابدار

اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم اور خاص کر اس کے سر پر بال اگائے ہیں اور یہ نعمت مرد و عورت دونوں کو حاصل ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے آرائشِ گیسو کے بارے میں متعدد احکام و ہدایات دی ہیں جو مرد وزن کے لئے یکساں بھی ہیں اور مختلف بھی۔ آپ ﷺ نے بنفس نفیس سرِ اقدس پر تاجِ گیسوئے تابدار سجایا ہے اور دوسرے صحابہ کرام اور اکابرِ عرب کے بھی گیسوؤں کا ایک انداز تھا۔ خواتین وصحابیات کے گیسوؤں کا دوسرا تابدار اور تابناک تر انداز تھا۔ اور بچوں/ لڑکوں اور بچیوں/لڑکیوں کے گیسو طرازی کے طریقے دوسرے تھے۔ بالوں کی مختلف قسموں، آرائشوں اور تزئین کے لحاظ سے ان کے مختلف اسماء وتعریفات ہوتی تھیں جو عربی زبان کی وسعت، فصاحت و بلاغت اور جزئیات نگاری کی شہادتیں فراہم کرتی ہیں۔ یہ محض لغوی آرائشیں نہیں ہیں بلکہ تمدنِ عرب اور تہذیب اسلامی کی عطایا ہیں جو صدیوں، قرنوں میں ارتقاء پذیر ہوئی تھیں اور جن کی ارتقائی آبیاری میں دین فطرت اور دین حنیفی نے بھی پورا پورا حصہ لیا تھا۔

-مرد وزن کی جسمانی ساخت اور اندرونی فطرت کے مطابق ان کے چہروں میں بالوں کے لحاظ سے فرقِ بین کیا گیا ہے۔ مردوں کے داڑھی مونچھیں لگائی گئی ہیں اور فطرت کی یہ حنا بندی اور تراش وخراش انسانی جسم کی طرح ازلی اور ابدی بھی ہے۔ ازلی وابدی اس معنی میں کہ جب سے مردوں کا ظہور ہوا انھیں یہ فطری نعمت عطا کی گئی اور جب تک ان کی صنف باقی ہے وہ بھی لگی رہے گی۔ شریعت نے ان کے لیے خاص احکام اور آداب وحدود مقرر کیے۔ وہ خصالِ فطرت اور سنتِ انبیاء قرار دے کر مسلسل عمل بنائے گئے۔ اس کے برعکس عورتوں اور خواتین کے

چہروں کو داڑھی مونچھوں کے بالوں سے محفوظ رکھا گیا کہ ان کے حسنِ چہرہ اور جمالِ طلعت کا یہی تقاضا ہے جس طرح مردوں کے جمال وجلال کا اور وقار وحسن کا تقاضا ہے کہ ان کے چہروں پر سنتِ نبوی کا نور اور جمالِ فطرت کا ظہور ہو۔ دونوں اصناف کے ان جمالی پہلوؤں کو تمام ادیان اور تمدنوں نے تسلیم کیا ہے لہٰذا مردوں کا نسوانی چہرہ بنانا فطرت کے بھی خلاف ہے۔

-بعض مقامات کے بالوں کی پیداوار مختلف حکمتوں کے تحت فطری رہی تھی لہٰذا ان کی پیدائش ہوتی رہتی ہے لیکن ان کو ناپسندیدہ پیداوار قرار دے کر ان کی صفائی کے احکام وآداب مقرر کیے گئے جو مَرد و زن دونوں پر بلا کسی امتیاز کے صادق ہوتے ہیں۔ یہ حکم وارشاد بھی فطری خصال اور سنتِ انبیاء قرار دیا گیا اور اس کو ایک مسلسل سنت اور مستقل فطری عمل بتایا گیا۔ بالوں کا تعلق جسمِ انسانی سے لباس کی طرح سے جڑا ہوا ہے اس لیے محدثینِ کرام نے ان کے احکام وآداب کو اپنی اپنی کتاب اللباس ہی کے مختلف ابواب کے تحت بیان کیا ہے۔ ہم بھی اسی طرح اسی ترتیب سے اس بحث ومعاملہ کو تمدنی لحاظ سے پیش کرتے ہیں۔

گیسوئے نبوی

جاہلی عربوں میں بالوں کے مختلف انداز اور آرائشِ گیسو کے متنوع طریقے رائج تھے۔ وہی اسلامی زمانے میں بھی آئے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسلامی دین وشریعت کی ظاہری اور اندرونی حکمتوں کے پیشِ نظر ان میں سے بعض کو قائم واستوار اور جاری رکھا کہ ان میں ظاہری حسن وجمال بھی تھا اور اس ظاہری تزئین وآرائش سے اندرون کی بھی تزئین وآرائش اور تحسین ہوتی تھی۔ ان میں سے بعض ایسے انداز وطرق تھے جو ظاہری حسنِ اسلامی کو خراب کرتے اور اندرون میں بھی فتنہ وفساد پیدا کرتے تھے ان کو منع فرما دیا۔ اپنے عملِ صافی، سنتِ متواترہ ظاہرہ اور اسوۂ حسنہ سے رسولِ اکرم ﷺ نے فطری گیسوؤں کی آرائش کا انداز سکھایا۔

-فطری طور سے رسولِ اکرم ﷺ کو ہر شے- ظاہری مادی اور باطنی روحانی - اعتدال وتوازن کے ساتھ عطا کی گئی تھی۔ فطرتِ شخصی کے ساتھ وہ فطرتِ اسلامی کی بھی شہادت ودلیل تھی کہ اس عظیم ترین شخصیت اور اس کے پیغام ودین میں کسی قسم کا تنافر وتناقض نہیں۔ شخصی حسن وجمال

ایسا متوازن اور معتدل تھا کہ پہلی نظر میں آنکھوں میں کھبتا اور دھیرے دھیرے اثر کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اور کوئی حسین ترین شخص نہیں ٹھہرتا۔ وہ حسنِ یوسفؑ نہیں تھا کہ اول وہلہ ہی میں ہوش و خرد کی دھجیاں بکھیر کر حیران و ششدر کر دے۔ حسنِ یوسفؑ کی اس دہشتناکی اور ہوش و خرد شکار کرنے کی صفت ان کی عصمت کی حفاظت کی سبیل تھی اور حسنِ نبوی کی معتدل و ٹھنڈی روشنی حسن و جمال پیغمبر اسلام کی کارگزاری، عصمت مآبی اور آفاقیت کی دلیل تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معتدل و متوازن گیسو عطا فرمائے تھے۔ جس طرح دوسرے اعضاء و جوارح میں توازن و اعتدال پیدا کیا گیا تھا۔

شمائلِ نبوی کی روایات و احادیث میں رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوؤں کے بارے میں اسی اعتدال و توازن کا ذکر ملتا ہے۔ آپ ﷺ کے گیسوئے مبارک نہ تو بالکل گھنگھریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے اور بلا پیچ، بلکہ وہ دونوں کے درمیان تھے اور دونوں کی خصوصیات کے حامل:

"...ولیس بالجعد القطط ولا بالسبط" (نہ بے انتہا گھنگھریالے اور نہ بالکل سیدھے: حدیث: ۵۹۰۵۔ "وکان شعر النبی ﷺ رجلاً، لا جعدا ولا سبطاً"۔ حدیث: ۱۹۰۶ (نبی ﷺ کے بال تھوڑے گھنگھریالے تھے، وہ انتہائی گھنگھریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے)

(بخاری، کتاب اللباس، باب الجعد؛ فتح الباری، ۱۰/ ۴۳۷-۴۴۲؛ نیز دیگر کتبِ حدیث کے ابوابِ شمائل نبوی)

حافظ ابن حجرؒ نے ان احادیث کی تشریح میں دو قسم کے بالوں کے لیے دو قوموں کی دلچسپ مثال دی ہے۔ گھنگھریالے بال جو انتہائی پیچ و خم والے ہوتے ہیں جیسے سوڈانیوں کے ہوتے ہیں اور سیدھے بال جو پھیلتے ہیں تو ان میں ذرا بھی پیچ و خم نہیں ہوتا جیسے ہندوؤں/ ہندوستانیوں کے بال ہوتے ہیں: "وان الشعر الجعد ھو الذی یتجعد کشعور السودان، وان البسط ھو الذی یسترسل فلا یتکسر منہ شی کشعور الھنود"۔ حدیث: ۵۹۰۵ میں وارد لفظ "قطط" کی تعریف میں لکھا ہے: "البالغ فی الجعودۃ بحیث یتفلفل" (گھنگھریالے پن میں انتہائی حد کو پہنچ جائیں)۔ حافظ موصوف نے غالباً ہندوستانی گھنگھریالے بال نہ دیکھے تھے۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۴۳۸)

- گیسوئے دراز اور ان کی درازی کی حد کے لحاظ سے بالوں کی مختلف اقسام تھیں۔

رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوئے مبارک کے بارے میں ان میں سے کئی کا ذکرِ خیر خوب خوب آتا ہے اور محدثینِ کرام اور ان کے شارحینِ عظام نے ان کی تعبیر وتشریح میں خوب خوب تحقیقات کی ہیں۔ ان کے مختلف اسماء کے حوالے سے گیسوئے نبوی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لِمّۃ (زلف جو کانوں کی لَو سے متجاوز ہو)

امام بخاریؒ نے حدیث: ۵۹۰۲ اور اس سے قبل حدیث: ۳۴۴۰ وغیرہ میں بیان کیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے شب اسراء ومعراج میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے دیدار میں ان کے گیسوئے دراز دیکھے جو "لمّة" تھے اور اتنے خوبصورت گیسوئے دراز کسی کے نہیں دیکھے۔ ان کی آرائش حضرت مسیحؑ نے فرما رکھی تھی اور ان سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ دو شخصوں کے کاندھوں پر تکیہ کئے ہوئے بیت اللہ کا طواف فرما رہے تھے: "... له لمة كاحسن ما أنت راء من اللمم قد رجّلها، فهي تقطر ماء، متكأ على رجلين ... يطوف بالبيت ..." حدیث: ۳۴۴۰ میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ ان کے گیسوئے مبارک ان کے دونوں شانوں کو چھو رہے تھے: "تضرب لمته بين منكبيه"۔ حافظ ابن حجرؒ کے مطابق جب سر کے بال کانوں کی لووں سے متجاوز ہو کر شانوں کو چھونے لگیں تو وہ "لمة" کہلاتے ہیں: "... اذا جاوز شحمة الاذنين والم بالمنكبين لمة"۔ حضرت امامؒ نے اس حدیث کو نبوی گیسو کے ساتھ اس لیے وابستہ کیا کہ وہ بھی اسی صفت کے حامل تھے۔

(فتح الباری، ۶/ ۵۸۲-۵۹۳ بالخصوص آخری؛ ۱۰/ ۴۳۷-۴۴۳؛ ۱۰/ ۴۳۹ بحوالہ جوہری، نیز موطا، کتاب الجامع، باب ماجاء فی صفة عيسىٰ بن مريم عليه السلام: مصباح اللغات: اللمة: بالوں کی زلف جو کانوں کی لو سے متجاوز ہو)

جُمّۃ (شانوں کے نیچے لٹکنے والے گیسو)

دوسری قسم یہ ہے کہ سر کے گیسو اتنے دراز ہوں کہ کندھوں سے نیچے لٹکنے لگیں: "واذا جاوزت المنكبين فهي جمّة" (فتح الباری، ۶/ ۵۹۳؛ مصباح اللغات: الجمة: لو سے نیچے تک کے بال)

حدیث: ۵۹۰۱ میں حضرت البراء بن عازبؓ کی حدیث میں امام مالک کی روایت نقل کی

ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے جمۃ آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے قریب پہونچتے تھے: "إن جمته لتضرب قريبا من منكبيه" ۔ یہ روایت کئی بار بلکہ بار بار نقل کی گئی ہے۔ حضرت انسؓ کی کئی روایات میں اسی کا ذکرِ خیر ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوئے مبارک آپ کے مبارک شانوں تک پہنچتے تھے: حدیث:۵۹۰۳: "... كان يضرب شعره منكبيه"، حدیث:۵۹۰۴: "كان يضرب شعر راس النبى ﷺ منكبيه"۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان تینوں اقسامِ گیسو کی تعریف جوہری کی تحقیق کے حوالے سے بیان کی ہے جو حرف واو میں "الوفرة" کے حوالے سے آئی ہے اور کلامِ جوہری اہل لغت کے کلام کے مطابق ہے۔

وَفرۃ (شانوں سے اوپر رہ جانے والے گیسو)

جمہ سے چھوٹے اور لمہ سے بڑے بالوں کو جو کاندھوں تک نہ پہونچیں مگر کانوں کی لوؤں سے آگے ہوں ان کو وفرہ کہتے ہیں: "... واذا قصرت عنها فهى وفرة"

(فتح الباری، ۶/۵۹۳؛ مصباح اللغات: الوفرہ: کانوں سے لٹکے ہوئے بال؛ فتح الباری، ۱۰/۴۳۹ بحوالہ جوہری)

- مسجد نبوی کی تعمیر میں اینٹیں وغیرہ اٹھانے کے سبب رسولِ اکرم ﷺ کے پٹے (وفرہ) میں مٹی بھر گئی تھی جسے آپ ﷺ اپنے دست مبارک سے جھاڑتے رہے تھے کیونکہ آپ ﷺ گھنگھریالے بالوں شخص تھے، یہ حضرت ام سلمہ کا بیان ہے: "فرايت رسول الله ﷺ ينفض وفرته بيده وكان رجلا جعداً ..." (ابن ہشام، ۲/۱۱۴)

- حضرت ام ہانیؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ فتحِ مکہ میں تشریف لائے تو آپ ﷺ کے سرِ مبارک سے چار پٹیاں/ چوٹیاں لٹک رہی تھیں: "قدم النبى ﷺ الى مكة، وله اربع غدائر تعنى عقائص" (ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فى الرجل يعقص شعره)

رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوئے مبارک۔ کے لیے یہ تینوں تعبیریں آتی ہیں اور مختلف احادیث سے ان تینوں قسم کے رکھے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسری روایات وتعبیرات ملتی ہیں:

- مسلم اور ابوداؤد کی روایاتِ حضرت انس ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے بال آپ ﷺ

کے دونوں کانوں کے نصف نصف حصے تک تھے: "کان شعر النبی ﷺ الیٰ انصاف اذنیہ"
(فتح الباری، ۱۰/۴۴۰)

-حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی حدیث ابوداؤد و ابن ماجہ میں ہے جس کو امام ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق گیسوئے مبارک وفرہ سے بڑے اور جمہ سے چھوٹے تھے:
"کان شعر النبی ﷺ فوق الوفرة و دون الجمة"

-حیرت ناک بات یہ ہے کہ امام ترمذی کی روایت میں اس کے برعکس معاملہ ہے کہ وہ جمہ سے بڑے اور وفرہ سے چھوٹے تھے "فوق الجمة و دون الوفرة"۔ امام ابن حجرؒ نے اپنے شیخ کی شرح ترمذی سے اس کی تشریح و تعبیر کی ہے کہ ایسی تعبیرات کبھی محل کے اعتبار سے ہوتی ہیں اور کبھی کثرت و قلت کے اعتبار سے۔ اسی کو انھوں نے بہترین اور عمدہ جمع قرار دیا ہے کیونکہ وہ ان کے شیخ تھے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ ایک مخرج/سرچشمہ سے آئی ہیں اور ان کا مخرجِ حدیث متحد ہے۔ لہٰذا یہ عمدہ جمع کی مثال نہیں ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/۴۳۹؛ ابوداؤد، کتاب الترجل، باب ماجاء فی الشعر؛ ترمذی، ابواب اللباس، باب فی الجمة و اتخاذ الشعر؛ مسلم، کتاب الفضائل حدیث: ۹۱-۹۲ (۲۳۳۷)؛ نسائی، کتاب الزینة، الذوابة)

بہرحال ان تمام احادیث و روایات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گیسوئے مبارک مختلف اوقات میں مختلف لمبائی رکھتے تھے اور یہ احادیث مختلف احوال کو بیان کرتی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ کا یہ خیال اور ابن بطالؒ پر یہ نقد ہے کہ وہ ایک یا یکساں راویوں سے مروی ہیں لہٰذا وہ اختلافِ احوال کو نہیں بتاتیں لہٰذا ان کے درمیان تطبیق دینے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ امام ابن بطال کا تجزیہ اور تشریح بالکل صحیح ہے۔ ایک ہی راوی دو یا زیادہ باتیں مختلف اوقات کی نقل کرسکتا ہے اور نقل کرتا ہے۔ حضرت انس یا حضرت عائشہؓ کی روایات میں اختلاف اسی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوئے مبارک مختلف درازی رکھتے تھے۔ آرائشِ گیسو فرماتے، یا عمرہ کرتے اور آخری حج فرمایا تو گیسوؤں کی درازی کم ہوگئی اور تابداری بڑھ گئی۔ اس کمی بیشی میں بالعموم آرائش اور قطع و برید میں بالِ مبارک کبھی کانوں کی لوؤں تک رہ جاتے اور کبھی ان سے نیچے آجاتے اور بہت بڑھتے تو شانۂ مبارک

کو چھونے اور بوسہ دینے لگتے تھے۔ یہ بہر حال مختلف احوال کے واقعات کی رودادیں اور روایتیں ہیں۔ دوسرے محدثین وشارحینِ کرام نے موسمی اثرات کا لحاظ نہیں فرمایا۔ انسان طبعی طور سے گرمی میں بال چھوٹے کروالیتا ہے اور سردی میں بڑھالیتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوئے مبارک کی خوب درازی اور کم درازی کی ایک وجہ یہی موسمی اثر انگیزی بھی ہوسکتی ہے۔ اور پھر آرائشِ جمال میں تو ایسا ہونا فطری ہے۔ بہرحال لمبے بال رکھنا اور دراز گیسو ہونا ہی سنتِ نبوی ہے خواہ اسے سنتِ عادی کہا جائے۔ مختصر بالوں اور سر منڈانے کی روایات کہاں سے آئیں اور ان کی تقدیسِ صلحاء کیونکر ہوئی تحقیق طلب بات ہے۔ (فتح الباری، ۱۰/۴۳۹ ومابعد)

صحابہ کرام کے گیسو

عصری سماجی روایت اور پیارے رسول ﷺ کی سنت کی پیروی میں صحابہ کرام بھی بڑے بڑے اور دراز بال رکھتے تھے۔ چھوٹے بالوں یا سر گھٹانے کا طریقہ معروف وپسندیدہ نہ تھا۔ وہ صرف عمرہ وحج کے مناسک ادا کرنے کے دوران اختیار کیا جاتا تھا۔ متعدد صحابہ کرام اور دوسرے اکابرِ عرب کے گیسوئے دراز کی روایات ملتی ہیں۔ ان کو صرف ایک پیراگراف میں سمیٹا جاسکتا ہے مگر اس سے سماجی ریت ورواج کا اندازہ نہیں ہوسکتا لہٰذا مختلف شخصیاتِ عصر کے گیسوؤں کا ذکر ان کے تاریخی تناظر اور سماجی پس منظر میں اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے:

- بلا تکلف یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ تمام اکابرِ صحابہ اور دوسری شخصیات واکابر ان تین قسموں - وفرہ، لمہ، جمہ - میں سے کوئی نہ کوئی اندازِ آرائشِ گیسو اختیار کرتے تھے: اس کی متعدد روایات ہیں، وہ عصری سماجی روایات کے مطابق تھا اور وہ سنتِ نبوی تھا۔ شیخین - ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما - کے علاوہ حضرات عثمان وعلی رضی اللہ عنہما اور کئی اکابر صحابہ کے بارے میں انھیں میں سے کسی نہ کسی انداز کا ذکر ملتا ہے:

- حضرت ابوبکر صدیقؓ صرف وہ واحد صحابی تھے جن کے بال کھچڑی تھے جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے تھے: "... قدم النبی ﷺ ولیس فی اصحابه اشمط غیر ابی بکر، فغلفها بالحناء والکتم"۔ لہٰذا انھوں نے مہندی اور وسمہ کا

خضاب لگا کر ان کو چھپایا'' (بخاری، باب ھجرۃ النبی ﷺ الخ)

-خادمِ نبوی حضرت انس بن مالکؓ اگرچہ بہت کم عمر تھے تاہم ان کے بال لمبے تھے اور ان کی چوٹی گوندھی جاتی تھی۔ ان کی والدہ ماجدہ نے اس کو کاٹنے سے صرف اس بنا پر انکار کردیا تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ اسے اپنے دستِ شفقت سے نوازتے تھے: ''... کانت لی ذؤابة فقالت لی امی: لاأجزھا، کان رسول اللہ ﷺ یمدھا ویاخذبھا''

(ابوداود، باب فی الذولبۃ، حدیث: ۴۱۹۶۔ دیگر احادیث: ۴۱۹۳-۴۱۹۵ کے مطابق بچوں کے ذوابہ ہوتی تھیں۔ ان کے بالوں کی آرائش اور کاٹنے وغیرہ کی ممانعت کا ذکر بھی ہے مگر وہ بعد میں آتا ہے)

-حضرت حجاج بن حسانؓ کے بھی دو لمبے لمبے قرنان/قصتان (پٹے یا چوٹیاں) تھیں۔

(حدیث ابوداود: ۴۱۹۷)

-حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بھی بالوں کے پٹے تھے جن کو پکڑ کر رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو نمازِ شب میں بائیں سے دائیں کھڑا کرلیا تھا۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب الذوائب؛ حدیث: ۵۰۱۹؛ فتح الباری، ۱۰/ ۴۴۵-۴۴۶: ''فاخذ بذؤابتی فجعلنی عن یمینه'')

حضرت وائل بن حجر کندیؓ حضرموت کے اقیال (حکمرانوں) میں سے ایک تھے۔ وہ آخری عہدِ نبوی میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ ان کے بہت طویل بال تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذباب، ذباب (بڑے بڑے)۔ فرماتے ہیں کہ میں واپس گیا اور ان کو چھوٹا کردیا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی تحسین فرمائی: ''... ولی شعر طویل، فلما رآنی رسول اللہ ﷺ قال: ذباب، ذباب؛ قال فرجعت فجزرته ثم اتیته من الغد فقال: انی لم اغنک، وھذا احسن''

(ابوداوٗد، کتاب الترجل، باب فی تطویل الجمة؛ نسائی، مندرجہ ذیل؛ فتح الباری، ۱۰/ ۴۴۱-۴۴۲: ابن ماجہ نے اسے بیان کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے)

-اسی معنی و مفہوم کی ایک حدیث حضرت حصینؓ سے مروی ہے اور انھیں کے لمبے بالوں کے بارے میں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ ہجرت کے بعد جب مدینہ تشریف لائے تو میں حاضر ہوا۔ مجھ سے فرمایا کہ قریب آؤ۔ جب میں قریب گیا تو آپ ﷺ نے ان کے گیسوئے دراز پر ہاتھ

پھیرا اور دعا فرمائی: "... فوضع یدہ علی ذؤابته ثم اجری یدہ وصمت علیه و دعا له".
(نسائی، کتاب الزینة، الذؤابة: الذؤابة تطویل الجمة ۔امام نسائی نے ان دونوں روایات کو طویل جمہ کے باب میں نقل کیا ہے اور ان کے معنی بھی متعین کیے ہیں)

۔حضرت حسن بن علیؓ کے بال اتنے لمبے تھے کہ ان کی چوٹی سی باندھ کر گدی پر لٹکا لیتے تھے۔ان کو "ضفرہ" کہا گیا ہے۔اس طرح وہ اپنی چوٹی یا بالوں کی پٹی کو گدی پر باندھے نماز ادا فرمارہے تھے کہ حضرت ابورافع مولائے نبوی ﷺ کا گذر ہوا تو انھوں نے بالوں کی پٹی کھول دی اور اس پر جب حضرت حسنؓ نے غصہ کا اظہار کیا تو حضرت ابورافعؓ نے فرمایا کہ نماز پڑھتے رہو، غصہ نہ کرو، رسول اکرم ﷺ نے اسے شیطان کا حصہ قرار دیا ہے: "... انه مرّ بالحسن بن علی وھو یصلی، وقد عقص ضفرته فی قفاہ، فحلھا..."
(ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی کراھیة کف الشعر فی الصلاۃ؛ ابن ماجہ، کتاب اقامة الصلوٰۃ الخ، باب کف الشعر الخ)

۔حضرت کعب بن عجرہؓ کا بیان ہے کہ صلح حدیبیہ میں ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ احرام باندھے موجود تھے اور مشرکین نے ہمارا محاصرہ کر رکھا تھا۔میرے بال لمبے اور شانوں تک پہونچنے والے (وفرہ) تھے اور ان سے جوئیں میرے چہرے پر گرتی تھیں۔رسول اکرم ﷺ نے ان کو حلق کرانے کا حکم دیا اور وہ آیت کریمہ: "فمن کان منکم مریضا او به اذی من راسه. الخ" کے نزول کا باعث بن گئی۔"...وکانت لی وفرۃ فجعلت الھوام تساقط علیٰ وجھی. "
(ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورۃ البقرہ؛ ابوداؤد، کتاب المناسک، باب فی الفدیة)

۔حضرت ابوقتادہؓ کے گیسو دراز بھی تھے اور کافی گھنے بھی۔رسول اکرم ﷺ نے ان کو آرائش گیسو کی تاکید کی: "کانت له جمة ضخمة فسأل النبیّ ﷺ فامرہ ان یحسن الیھا..."
(نسائی، کتاب الزینة، تسکین الشعر؛ موطا، کتاب الجامع، اصلاح الشعر: "ان لی جمة")

۔حضرت ضمام بن ثعلبہؓ جب اپنی قوم سعد بن بکر کے نمائندے کی حیثیت سے حاضر ہوئے تو بہت بالوں والے تھے اور ان کی دو چوٹیاں لٹکا رکھی تھیں: "وکان ضمام رجلا جلدا اشعر ذا غدیرتین..." (ابن ہشام، ۲/۵۷۳)۔رسول اکرم ﷺ سے فرائض کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ زیادہ کروں گا نہ کم۔اور ان کے جانے کے بعد

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: دو چوٹیوں والے نے اگر سچ کہا تو جنت میں گیا۔

(ایضا،۲/۵۷۴:الغدیرۃ: الذؤابۃ من الشعر؛ فقال ﷺ: ان صدق ذو العقیقتین دخل الجنۃ: الضفیرتان من الشعر)

-کندہ کے وفد میں اسی سوار حاضرِ خدمت ہوئے وہ سب صاحبانِ جمۃ تھے : "وقد رجلوا جممھم ..."

(ابن ہشام،۲/۵۸۵:الجمم: جمع جمۃ، وھی مجتمع شعر الناصیۃ الذی یصل الی المنکبین ۔پیشانی/ اگلے حصۂ سر کے بالوں کا گچھا جو شانوں تک پہونچے)

اکابرِ عرب کے گیسو

متعدد عرب اکابر اور یہودی شخصیات کے بھی لمبے بالوں کا ذکر ملتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ وہی زمانے کی ریت تھی:

-مشہور یہودی شاعر اور دشمنِ اسلام کعب بن اشرف کے لمبے لمبے گیسو تھے، اور انھیں کو پکڑ کر اس کا کام تمام کیا گیا تھا۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف؛ فتح الباری،۷/۴۲۰-۴۲۵)

-منافقین میں سے ایک شخص حارث بن عمرو بھی تھا۔ مسجدِ نبوی سے اس کے اخراج کے حکم نبوی کے بعد حضرت عبداللہ بن حارثؓ نے اس کے لمبے بالوں کو پکڑ کر ہی اسے دھکا دیا تھا:"... و کان ذا جمۃ فاخذنا بجمتہ نسحبہ بھا..."

(ابن کثیر، البدایہ والنہایہ،۲/۳۵۰؛ نیز ابن ہشام،۱/۵۲۹)

صحابیات وخواتین کے گیسو

لمبے بال اور دراز گیسو خواتین کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے اور اسلامی معاشرت میں بھی وہ ان کا حقِ خاص تھا۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ عہدِ نبوی کی خواتین اور صحابیاتِ طاہرات دراز گیسو رکھتی تھیں اور ان کی آرائش کرتی تھیں۔ ان میں ازواج مطہرات کے گیسوؤں کا ذکر بہت خاص ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی ازواج کا عمل تھا اور اسے سنتِ نبوی کی تائید

حاصل تھی۔ اس سنتِ خیر کا حوالہ آرائش گیسو کے ضمن میں آتا ہے لہٰذا ان دونوں ابواب کا ذکر ایک ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ تکرار سے بچا جا سکے:

-حضرت ابو سلمہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اپنے سر کے بالوں کو کاٹ کر کانوں کی لوؤں تک کر لیتی تھیں: "وکان ازواج النبی ﷺ یاخذن من رؤوسهن حتی تکون کالوفرة"

(مسلم، کتاب الحیض، باب القدر المستحب من الماء الخ: ای یاخذن من شعر رؤوسهن، ویخففن من شعورهن حتی تکون کالوفرة، وهی من الشعر ماکان الی الأذنین ولا یجاوزهما)

-حضرت ام سلمہؓ غسلِ جنابت کے وقت اپنے بالوں کو باندھ کر جوڑا بنا لیتی تھیں: "انی امرأة اشد ضفر راسی"

(مسلم، باب حکم ضفائر المغتسلة؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب فی المرأة هل تنقض الخ؛ ترمذی، هل تنقض المرأة الخ۔ حضرت عائشہؓ کے بارے میں بھی یہی آتا ہے: ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب فی غسل النساء الخ وغیرہ)

-ان ہی ام المومنین کا واقعہ ان ہی کا بیان کردہ ہے کہ باندی ان کے بال سنوارتی تھی جب انھوں نے حوض کا ذکر نبوی سنا تھا: "...والجارية تمشطنی..." (حدیث مسلم: ۲۹ (۲۲۹۵)۔ یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ خواتین اپنی باندیوں/بچیوں سے بال سنورواتی تھیں۔

-حضرت عائشہ صدیقہؓ ہجرت کے معاً مدینہ میں بخار میں مبتلا ہو گئی تھیں تو ان کے سر کے بال جھڑ گئے تھے اور بقول ان کے چھوٹے سے جمہ (جُمیمه) رہ گئے تھے: "فتمرق شعری فوفیٰ جُمیمة..."

(بخاری، باب تزویج النبی ﷺ عائشه الخ؛ فتح الباری، ۷/ ۲۷۸-۲۸۰ و مابعد: بعد میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جمۃ بھی رکھے تھے اور مسلم کی حدیثِ عام کے مطابق وفرہ بھی رکھتی تھیں۔ یعنی ان کے بال/گیسو کبھی کانوں کی لوؤں تک ہوتے تھے (وفرہ) اور کبھی شانوں سے نیچے تک (جمہ) اور کبھی ان کے درمیان میں)

آرائشِ گیسو کے احکام

سر کے بالوں کے سنوارنے، سجانے، کنگھی تیل کرنے، گوندھنے اور پٹے یا چوٹیاں بنانے

کو اسلامی دین و شریعت نے بھی پسند کیا ہے کہ وہ آرائشِ جمال ہے جسے اللہ تعالیٰ بھی اس لیے پسند فرماتا ہے کہ وہ خود بھی جمیل ہے۔ ایک صحابیٔ جلیل کے سوال پر رسولِ اکرم ﷺ نے اس آرائش کا حکم دیا تھا اور ایک بدوی پراگندہ بال والے بزرگ کو بھی آرائشِ گیسو کی ہدایت دی تھی۔ بعض دوسرے صحابہ کرام و صحابیات کے حوالے سے بھی آرائشِ گیسو کا حکمِ نبوی ملتا ہے۔ اور ان سے زیادہ بنفسِ نفیس رسولِ اکرم ﷺ کا اپنے حکم پر خود عمل ہے جو سنت متواترہ بن جاتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنے گیسوؤں کی تیل سے آرائش کرتے تھے، ان میں کنگھی کرتے تھے اور ان کی تراش خراش اور دوسری جمالیاتی کاوشیں فرماتے تھے۔ پراگندہ بالوں کو شیطانی صورت بنانے کے مرادف قرار دیا گیا ہے: "الیس ھذا خیرا من أن یاتی احدکم ثائر الراس کانه شیطان" (موطا، کتاب الجامع، اصلاح الشعر)

احادیث و روایات اور ارشادات کے اس باب میں دو طبقے ملتے ہیں: ایک ناغہ کر کے تیل لگانے اور کنگھی کرنے کا حکم، دوسرے روزانہ تیل پھلیل لگانے اور سجانے سنوارنے کا حکم۔ بعض علماء و شارحین نے ان میں سے ایک حکم کو لے کر تفریط کا موقف اختیار کیا ہے جو صحیح نہیں۔ اصل حکم آرائش ہے اور اس کا دوسرا نہی کا پہلو یہ ہے کہ بلاوجہ محض آرائشِ جمال میں ہی نہ لگا رہے جسے ترفہ، تکبر اور ضیاعِ وقت کہا گیا ہے۔ یہ دونوں احکام اختلافِ احوال و حالات اور شخصی معاملات کے لیے ہیں۔ گھنے بالوں والے حضرات و خواتین کو بھی حضرت ابوقتادہ انصاریؓ کی مانند روز تیل لگانے اور کنگھی کرنے کا حکم ہے اور جن کے بالوں کا معاملہ مختصر ہو ان کو ناغہ سے لگانے کی ہدایت ہے۔ یہ دراصل شخصی مزاج پر بھی منحصر ہے۔ اسی کے ساتھ بعض احوال و حالات پر بھی ان احکام کا انحصار ہے۔ روزانہ نہانے والے کے لیے روزانہ تیل لگانا اور آرائش کرنا ضروری ہے اور حکم یہی ہے کہ انسان اپنی صحیح، جائز اور ضروری حاجت کے مطابق آرائشِ گیسو کرے۔ ان دونوں احکام و ہدایات کو ذیل میں صرف واضح کرنے کے لیے الگ الگ نقل کیا جاتا ہے:

ایک دن کے ناغہ سے تیل اور کنگھی کرنا

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی حدیث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے صرف ناغہ کر کے کنگھی

کرنے کی اجازت دی: "نهیٰ رسول الله ﷺ عن الترجل الا غبا"

(ترمذی، ابواب اللباس، باب النهي عن الترجل الا غبا؛ ابوداؤد، مذکورہ بالا، حدیث: ۴۱۵۹، دوسری احادیث ممانعت کے لئے ملاحظہ ہو: فتح الباری، ۱۰/۴۵۰: "نهانا رسول الله ﷺ ان يمشط احد منا كل يوم"۔ اس کے خلاف بحثِ ابن حجرؒ)

روزانہ آرائشِ گیسو کا حکم

۱۔ حضرت ابوقتادہؓ روزانہ کنگھی کرتے اور بسا اوقات دن میں دوبار تیل لگاتے اور کنگھی کرتے تھے (موطا، کتاب الجامع، اصلاح الشعر)۔ صحابی جلیل کا یہ طرز عمل ان کی عدم پیروی سنت پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ اول تو وہ مزاج نبوی سے اور حکم نبوی کے منشا سے واقف تھے۔ دوسرے ان کو رسولِ اکرم ﷺ سے صریح ہدایت/ اجازت بھی ملی تھی کہ وہ روزانہ آرائش گیسو کریں۔

پراگندہ/ پریشاں بال رہنے کا خیال

حضرت فضالہ بن عبیدؓ امیر/ والی مصر تھے (خلافت کے زمانے میں) اور ان کے بال پریشان تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ وجہ بتائی کہ رسولِ اکرم ﷺ بہت آرائش سے منع فرماتے تھے اور کبھی کبھی ننگے پاؤں چلنے پھرنے کا حکم دیتے تھے۔ اسی بنا پر وہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلتے تھے: ... اراک شعثا ...؟ قال: ان رسول الله ﷺ كان ينهانا عن كثير من الارفاه ... كان يامرنا ان نحتفي احيانا : ابوداؤد: ۴۱۶۰۔

آرائشِ گیسوئے نبوی

تمام دوسرے معاشرتی اور دینی معاملات کی طرح رسولِ اکرم ﷺ ان تمام چیزوں میں، جن میں واضح حکمِ الٰہی نہیں ملتا تھا، اہلِ کتاب کی موافقت فرماتے تھے اور جاہلی عربوں کے رواج سے گریز کرتے تھے۔ بالوں کے سنوارنے کے سلسلے میں ہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس سنتِ نبوی کا ذکر کیا ہے کہ اہلِ کتاب اپنے بالوں کو لٹکاتے تھے اور اہلِ شرک اپنے سروں کے

بالوں کو باندھ لیا کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے شروع میں اہلِ کتاب کی طرح اپنے بالوں کو سیدھا چھوڑ دیا اور دوسروں کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ یہ آغازِ رسالت کا معاملہ ہے۔ بعد میں غالباً مدینہ منورہ کے قیام کے آغاز ہی میں آپ ﷺ نے خود بھی اپنے بالوں کو باندھا اور دوسروں کو بھی باندھنے کا حکم دیا تاکہ اہلِ کتاب کی اب مخالفت ہو جو ضروری ہو گئی تھی۔ محدثین وشارحین نے اس نکتہ کی طرف توجہ ذرا کم دی ہے کہ یہ دونوں احکام وحیِ حدیث پر مبنی تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے جب اپنی صوابدید سے ''سدل'' (بال لٹکانے) کا حکم دیا تو اس کی خاموش تائید وحی سے ہو گئی اور جب اسے بدل کر ''فرق'' (مانگ نکالنے) کا حکم دیا تو وہ بھی وحیِ الٰہی پر مبنی تھا کیونکہ امام بخاریؒ کے ایک ترجمۃ الباب کے مطابق آپ ﷺ اپنی رائے سے کچھ کام نہ کرتے تھے۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب الفرق: حدیث: ۵۹۱۷: ''كان النبی ﷺ يحب موافقة اهل الكتاب فيما لم يؤمر فيه، وكان اهل الكتاب يسدلون اشعارهم، وكان المشركون يفرقون رؤوسهم، فسدل النبی ﷺ ناصيته، ثم فرق بعد؛ نیز حدیث ۵۹۱۸؛ فتح الباری، ۱۰/۴۴۳-۴۴۵: ای فرق شعر الراس، وهو قسمته فی المفرق وهو وسط الراس ... الخ) موطا، كتاب الجامع، السنة فی الشعر؛ ابوداؤد، كتاب الترجل، باب ماجاء فی الفرق: ۴۱۸۲-۴۱۸۸؛ اوپر بالوں کی اقسام میں آپ ﷺ کی چوٹیوں ضفائر وغیرہ کا ذکر آچکا ہے کہ بال گوندھے جاتے تو ان کے پٹے کئی حصوں میں تقسیم کر کے گوندھ دیے جاتے تھے)

اس سنتِ نبوی اور اس کے دو ادوار یا طرق کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ شروع میں مانگ نہیں نکالتے تھے اور بعد میں باقاعدہ مانگ نکالنے لگے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے مانگ نکالنے کی متعدد روایات آتی ہیں۔ حدیث ابوداؤد: ۴۱۸۹ میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں جب رسولِ اکرم ﷺ کی مانگ نکالتی تو آپ ﷺ کے ٹیپو سے بال دو حصوں میں کردیتی اور پیشانی کے بال دونوں آنکھوں کے درمیان کردیتی تھی: ''كنت اذا اردت ان افرق راس رسول الله ﷺ صدعت الفرق من يافوخه وارسل ناصيته بين عينيه.'' (مصباح اللغات: یافوخ: ''نومولود بچہ کے سر کا وہ حصہ جو حرکت کرتا رہتا ہے'')۔ آرائشِ گیسو، کنگھی کرنے کی روایات بھی آتی ہیں۔ کنگھی کرنے کے سلسلے میں ازواجِ مطہرات کی خدمات بہت اہم سماجی رویہ بتاتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ یا بعض اور ازواجِ مطہرات ماہانہ اذیت سے گذر

رہی ہوتی تھیں تب بھی وہ رسولِ اکرم ﷺ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ جب مسجد میں اعتکاف فرماتے تو اپنا سر مبارک گھر کے دروازے میں رکھتے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرہ اپنے ہاتھ سے بال سنوارتیں۔

(عائشة: "... كنت ارجل راس رسول الله ﷺ وانا حائض"؛ "كان رسول الله ﷺ اذا اعتكف يدني الىّ راسه فارجله..." موطا، جامع الحيضة، كتاب الاعتكاف، ذكر الاعتكاف؛ مسلم، بخاری، كتاب المحيض، باب غسل الحائض راس زوجها، باب ترجيل الحائض زوجها؛ ابوداؤد، كتاب الترجل، باب ماجاء في الفرق، حدیث: ۴۱۸۹ کے مطابق حضرت عائشہ آپ ﷺ کی مانگ نکالتی تھیں: كنت افرق راس رسول الله ﷺ ...")

رسولِ اکرم ﷺ بعض اوقات بنفسِ نفیس اپنے دستِ مبارک سے اپنے گیسوئے مبارک کی آرائش فرماتے تھے۔ ان کو مختلف قسم کی چیزوں سے دھوتے تھے اور ان کی آرائش وسجاوٹ کا اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت سہل بن سعد کی روایت ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ رسولِ اکرم ﷺ سینگوں والی/ سینگ کی کنگھی سے اپنے گیسوئے مبارک جھاڑ رہے تھے: "والنبی ﷺ يحك راسها بالمدرىٰ..."

(بخاری، باب الامتشاط؛ مسلم، كتاب اللباس، باب تحريم النظر في بيت غيره وغيره؛ فتح الباری، ۱۰/۴۵۰-۴۵۱: کنگھی کی تفصیل وتصویر دونوں پر مفصل بحث کی ہے)

۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب غسلِ جنابت فرماتے تو سرِ مبارک کو خطمی سے دھوتے تھے اور اسی پر کفایت/ اکتفا فرماتے اور اس پر پانی نہیں بہاتے تھے:

"انه كان يغسل رأسه بالخطمي، يجتزى بذلك، ولا يصب عليه الماء"

(ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب في الجنب يغسل راسه بخطمي الخ؛ مصباح اللغات: "الخِطمِي: "ایک قسم کی نباتات جو دواؤں میں کام آتی ہے"۔ اس کا واحد "خطمية" ہے۔ لغوی معنی سے زیادہ وہ صاف کرنے والی چیز تھی جس سے سر دھویا جاتا تھا جیسے ریٹھے یا شکاکائی سے دھویا جاتا ہے)

۔ حضرت ام المومنینؓ کا ایک اور بیان ہے کہ ہم غسل کرتے تھے اور ہمارے سروں پر "ضماد" ہوتا تھا اور ہم رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بہ حالتِ احرام وحلال ہوتے تھے: "كنا نغتسل وعلينا الضماد و نحن مع رسول الله ﷺ محلات ومحرمات"۔

(ابوداؤد، مذکورہ بالا، باب في المرأة هل تنفض شعره عند الغسل۔ ضماد سے ایک مراد یہ ہے کہ ایک کپڑ۔

سے سر باندھ لیا جاتا تھا: ''الضماد خرقة يشد بها العضو المعروف'' ؛ مگر امام منذری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ضماد ہے جو بالوں میں مَل کر ان کو سر پر جما دیتا ہے اور اس کو دوسری خوشبو وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے: ''المراد هنا ما يلطخ به الشعر مما يلبّده ويسكنه من طيب غيره'' ؛ مصباح اللغات میں ضماد اور ضمادة کو محض زخم پر باندھنے والی پٹی کے معنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کو اصطلاحاً تلبید کہتے ہیں جیسا کہ ذکر آتا ہے)

۔رسولِ اکرم ﷺ دورانِ عمرہ و حج بحالت احرام اسی طرح ''تسلبید'' فرماتے تھے کہ اپنے گیسوؤں کو کسی شے سے ملا کر باندھ لیتے تھے اور ان کو سر پر جمع کر لیتے تھے اور پھر ان کو احرام کھولنے کے وقت ہی کھولتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ کے مطابق آپ ﷺ نے ایک بار اپنے سرِ مبارک کی تلبید شہد سے فرمائی تھی: ''ان النبی ﷺ لبّد راسه بالعسل''۔

(ابوداؤد، حدیث: ۱۷۴۸؛ بخاری، کتاب اللباس، باب التلبید: حدیث: ۵۹۱۴-۵۹۱۶؛ فتح الباری، ۱۰/۴۴۲-۴۴۳؛ ابوداؤد، کتاب المناسک، باب التلبید، حدیث: ۱۷۴۸: التلبید: هو جمع الشعر في الراس بما يلزق بعضه ببعض كالخِطمي والصمغ لئلا يتعشث و يقمل في الاحرام'' ...صمغ بمعنی گوند، خطمی ایک نباتات کی قسم جو ادویہ میں کام آتی ہے (مصباح اللغات)۔ یعنی ان جیسی اشیاء کو سر کے بالوں میں لگا کر چپکا لیا جاتا تھا تا کہ وہ پراگندگی سے بچیں اور ان کے بالوں میں جوئیں بھی نہ پڑیں)

۔حضرت عائشہ صدیقہؓ رسولِ اکرم ﷺ کے بالوں اور داڑھی میں بھی اتنی خوشبو لگا دیتی تھیں کہ اس کے نشانات نظر آتے تھے: ''كنت اطيب النبي ﷺ باطيب مايجد، حتى اجد وبيص الطيب في راسه ولحيته''

(بخاری، باب الطيب في الراس واللحية، حدیث: ۵۹۲۳، فتح الباری، ۱۰/۴۴۹، مفصل بحث خوشبو کے بیان میں آتی ہے؛ یہاں ریش مبارک اور گیسوؤں میں جس خوشبو کے لگانے کا ذکر ہے وہ خالص سیال نہیں ہوتی تھی)

خواتین کی آرائشِ گیسو

خواتین اپنے بالوں کی آرائش کرتی تھیں، یہ ایک عام قاعدہ اور ایک عام ریت ہے جس کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ لیکن تاریخی واقعات میں روایات و احادیث سے ان کی حیثیت پکی ہو جاتی ہے اور شخصیات کے حوالے سے ان کی قدر و قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے خواتین ایک دوسرے کے بال سنوارتی تھیں۔ بالخصوص بڑی بوڑھیاں اپنے بچوں بچیوں کی مانگ پٹی اور چوٹی کرتی تھیں جیسا کہ عام دستور ہے۔ عہدِ نبوی میں چونکہ غلام و باندی

کا قدیم رواج چلا آ رہا تھا اس لیے بعض واقعات کے مطابق ان سے بھی یہ خدمت اکثر و بیشتر لی جاتی تھی۔ عورتوں کو بالوں کے مختلف انداز سے سنوارنے سجانے کا بھی ہمیشہ شوق رہتا ہے اور اس فطری حق کا وہ اس عہدِ خیر و برکت میں بھی استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ کھلے بال بلا باندھے رکھنے کا رواج بھی تھا، چوٹیاں بنانے کا بھی، سر پر بالوں کا جوڑا اور اس کے طرح طرح انداز کا بھی خوب چلن تھا۔ ان سب انداز کے لیے عربی زبان ولغت کے علاوہ احادیث وروایات میں متعدد الفاظ واصطلاحات ملتی ہیں جن میں سے بعض کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور بعض کا ذیل میں آ رہا ہے۔ ان میں سے بعض ہیں: ذؤابة / ذواب، ذباب، قرون، ضفر / ضفائر، غديرة / غدائر، عقائص وغیرہ۔

-حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی کے دن ان کی والدۂ ماجدہ حضرت ام رومانؓ نے ان کے بال سنوارے تھے: (بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب تزويج النبی ﷺ عائشة الخ)

-حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے ایک عمر دراز خاتون (ثیب) سے شادی کی تھی کہ وہ ان کی نو بہنوں کی دیکھ بھال کر سکیں اور ان کے بال سنوار سکیں اور ان کی کنگھی چوٹی کر سکیں۔
(بخاری، كتاب المغازی، باب اذهمت طائفتان الخ؛ مسلم، كتاب الرضاع، باب استحباب نكاح البكر؛ كتاب الامارة، باب كراهة الطروق الخ وغیرہ، احادیث: ۵۵-۵۶ نیز ۵۷ اور مابعد کی بعض دوسری احادیث مسلم)

-حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمیؓ نے جس مُزنی عورت کے ذریعہ قریشی سرداروں کو خط بھیجا تھا وہ اس نے اپنے بالوں کے پیچ در پیچ جوڑے میں چھپا لیا تھا۔
(بخاری، كتاب المغازی، باب فضل من شهد بدرا وغیرہ؛ كتاب الجهاد، باب الجاسوس؛ مختلف ابواب وکتب؛ فتح الباری، ۷/ ۳۸۰-۳۸۲ وغیرہ: فلما رأت الجدّ اهوت الىٰ حجزتها ... فاخرجته۔ حدیث: ۳۹۸۳)۔

بعض شارحین نے اس سے نیفہ مراد لیا ہے۔ بعض کے ہاں دوسری روایت کے مطابق اس جاسوسہ نے اسے اپنے جوڑے میں چھپا رکھا تھا۔ ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ اس نے اپنے راس (سر) میں رکھ کر اس پر بالوں کی لٹیں پھیلا لی تھیں۔ حضرات زبیر و علیؓ کی سختی وطلبی پر اس نے اپنے سر کی لٹوں میں سے اسے نکالا تھا: "... فجعلته في رأسها، ثم فتلت عليه

قرونها.. فحلت قرون رأسها فاستخرجت الكتاب منها ..." ۲/ ۳۹۸-۳۹۹۔یہ روایاتِ حدیث وسیرت کا اختلاف بھی ہے۔

-حضرت ام سلمہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی باندی ان کے بال سنوارتی تھی:

"والجارية تمشطني..." (مسلم، كتاب الفضائل، فضائل ام سلمة)

-خواتین اپنے بالوں کے گچھے (قرون) بنالیتی تھیں اوران کو سروں پر ہی جمالیتی تھیں جیسا کہ مزنی جاسوسہ کے بارے میں آتا ہے۔

ممنوعہ آرائشیں: مردوں کی

بالوں کی تراش خراش اور خاتون کی بالوں میں چوٹی کے بارے میں بعض احکام ممانعت کے ملتے ہیں۔ان کا مختصر ذکر بھی ضروری ہے:

-"قزع" بالوں کی تراش خراش سے متعلق ایک صورت ہے جس سے رسولِ اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے:"ينهىٰ عن القزع"۔قزع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بچے کے سر کو مونڈا جائے اور یہاں وہاں کچھ بال چھوڑ دیے جائیں۔ یہ بالوں کی جگہیں حضرت عبیداللہ بن حفصؒ کے مطابق پیشانی اور سر کے دونوں جانبوں کی ہیں۔ گدی پر بالوں کی چوٹی اور بال چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں۔قزع میں صرف پیشانی پر بال چھوڑے جاتے ہیں اوران کے علاوہ سر میں کہیں بال نہیں ہوتے:"ولكن القزع ان يُترك بناصيته شعر وليس في راسه غيره، وكذلك شق راسه هذا وهذا"

(بخاری، كتاب اللباس، باب القزع ؛حدیث:۵۹۲۰، ۵۹۲۱؛فتح الباری،۱۰/ ۴۴۶-۴۴۸... جمع قزعة وهي القطعة من السحاب، وسُمِّي شعر الراس اذا حلق بعضه وترك بعضه قزعاً تشبيها بالسجاب المتفرق")

مصنوعی آرائشیں: عورتوں کی

خواتین اپنے بالوں میں دوسروں کے بالوں کی چوٹی/ چوٹیاں یا لٹیں باندھ لیتی ہیں تاکہ

ان کو لمبائی میں زیادہ دکھا سکیں کیونکہ لمبے بال حسنِ زن کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ بعض دوسری چیزیں کرتی ہیں جیسے دانتوں کو مختلف چیزوں سے باندھنا یا چہرے کو سوئی وغیرہ سے گوندنا وغیرہ۔ ان سب کو رسولِ اکرم ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور ایسی خواتین مجرمات کو لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ بخاری کی حدیث: ۵۹۳۱ ہے: "لعن الله الواشمات والمستوشمات والمتنصمات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله تعالىٰ ... الخ" (اللہ تعالیٰ نے گودنے والیوں اور گدوانے والیوں اور بالوں میں دوسرے کے بالوں کو ملانے والیوں اور حسن افروزی کے لیے غلط طریقے اختیار کرکے اللہ کی پیدا کردہ صورت کو بدلنے والیوں پر لعنت کی)

(فتح الباری، ۱۰/ ۴۵۶-۴۵۸: نے ان تمام پر مفصل بحث کی ہے۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے لیکن یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ مصنوعی آرائش کے یہ طریقے عہدِ نبوی کے جاہلی سماج اور غیر اسلامی معاشرے کے ساتھ اسلامی معاشرت میں بھی تھے اور ان کی اصلاح کی گئی)

حافظ ابن حجرؒ نے حسن افزائش کے مصنوعی طریقوں کی تشریح میں کافی مفصل کلام کیا ہے۔ "وشم" میں مختلف شارحین کی مختلف تعبیرات ملتی ہیں۔ اہلِ لغت کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ عضو میں سوئی جیسی کوئی چیز چبھوئی جائے تا آنکہ خون بہ نکلے پھر اس میں پوڈر وغیرہ ملا کر اسے سبز گوں بنایا جائے۔ امام ابوداؤد کی سنن میں تشریح ہے: "الواشمة التي تجعل الخيلان في وجهها بكحل او مداد" (جو عورت اپنے چہرے میں سرمہ اور روشنائی سے خیلان (مچھلی نما جل پری) جیسی صورتیں بنائے)۔ ان سب میں صورت بدل جاتی ہے اس لیے اسے ممنوع قرار دیا گیا۔

دوسرے کے بالوں سے اپنے بالوں کو ملا کر انھیں بڑا اور لمبا بنانا بھی ایک جاہلی رواج تھا۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتینِ بنی اسرائیل کا بھی یہی فن تھا جس کے سبب ان کی ہلاکت ہوئی۔ اس لیے ایسی عورتوں پر لعنت کی گئی ہے۔ اس ممانعت کا پس منظر یہ ہے کہ بعض انصاری خواتین کے بال جھڑ گئے اور اس میں دوسرے بالوں کی ملاوٹ کرنے کا ارادہ ہوا تو رسولِ اکرم ﷺ نے منع فرمایا۔ ان خواتین کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کا نکاح ہو گیا تھا مگر وہ بیمار ہو گئیں

اور ان کے سر کے بال جھڑ گئے اور ان کے شوہروں یا گھر والوں نے بالوں کے وصال پر اصرار کیا۔ مسئلہ خدمتِ نبوی میں پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے بال ملانے والی اور ملوانے والی (مشاطہ) دونوں پر لعنت بھیجی۔ ایسے کئی واقعات کتبِ حدیث میں مذکورہ ہیں۔

(بخاری، باب وصل الشعر: احادیث: ۵۹۳۲-۵۹۳۸ وغیرہ؛ نیز مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ دیگر کتبِ حدیث کی اسی معنی کی احادیث۔ اول الذکر حدیث بخاریؒ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت کے باوجود کم از کم بالوں میں ملانے کا رواجِ ناقص حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت تک جاری رہا تھا جس پر انھوں نے علماءِ مدینہ کی سرزنش کی تھی۔ مزید بحث فتح الباری، ۱۰/۴۶۰ وغیرہ)

ریشِ مبارک اور مونچھیں

محدثین کرام نے اسی کتاب اللباس میں گیسوؤں کے سنوارنے کے ابواب سے پہلے یا بعد مردانہ حسن و جمال سے بھی بحث کی ہے۔ مردوں کی داڑھی اور مونچھوں کے دو ابواب میں ان کے احکام و مسائل اور واقعات سے متعلق متعدد روایات و احادیث نقل کی ہیں۔ یہ خالص مردانہ حسن و جمال کا معاملہ ہے۔ عورتوں کو اس سے فطری طور سے الگ رکھا گیا کہ ان کے چہرے کا حسن بالوں کا کبھی مرہونِ منت نہ ہوا۔ داڑھی اور مونچھوں کی سماجی اور تہذیبی اقدار کے علاوہ دینی روایات و احکام بھی تھے اور وہ تمام مذاہب و ادیان اور تہذیبوں میں رہے ہیں اور ان میں سماجی اور تہذیبی اثرات کی کارفرمائی کے سبب اختلافِ قطع و برید بھی رہا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب اور اس کے قرب و جوار کے معاشروں میں دو طرح کے رواج و رسوم ملتے ہیں: ایک مونچھیں بڑی بڑی رکھی جائیں اور ان کے مقابلے میں داڑھی نسبتاً چھوٹی رکھی جائے۔ دوسرا یہ کہ داڑھی خوب لمبی ہو اور مونچھیں اس کے مقابلے میں چھوٹی ہوں اور ان کو کتروایا جائے۔ جاہلی عربوں اور یہود و نصاریٰ دونوں میں یہ دونوں سماجی رویے ملتے تھے۔ ان کے دیندار اور شریف افراد و طبقات لمبی داڑھی اور چھوٹی مونچھیں رکھتے تھے اور متمول و مغرور طبقات و افراد چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں رکھا کرتے تھے اور یہ علامتِ غرور، مایۂ افتخار اور طبقاتی نشان بن گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسلام ایسی مغرورانہ روش پسند نہیں فرماتا۔

لہٰذا رسولِ اکرم ﷺ کی قولی احادیث اور زبانی ارشادات وارد ہوئے کہ لمبی داڑھی اور

چھوٹی کتروا ں مونچھیں رکھی جائیں۔ ان کے لیے دو تعبیرات بطور خاص احادیث میں آئیں: "واعفوا اللحیٰ وقصوا الشوارب"۔ بعض دوسری تعبیرات بھی آئی ہیں جیسے: "انھکوا الشوارب واعفوا اللحی": بخاری - حدیث: ۵۸۹۳۔ متعدد روایات میں قص الشارب کو خصالِ فطرت میں سے ایک قرار دیا گیا ہے، نسائی کی ایک روایت میں "حلق" کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن جمہور کی روایات میں "قص" کا لفظ ہی ملتا ہے اور بعض دوسرے الفاظ بھی ہیں۔ امام ابن حجرؒ کے بقول ان سب کا مطلب ازالہ وقطع وبرید میں مبالغہ ہے: "ھذہ الالفاظ تدل ان المطلوب المبالغة فی الازالة"۔ بہر حال تمام آراء وافکار ونظریات کا حاصل یہ ہے کہ مونچھیں خوب کتروائی جائیں اور ان کو جڑ سے صاف نہ کیا جائے اور داڑھی خوب لمبی کی جائے اور ان دونوں کی اصلاح اور تراش خراش بھی ہوتی رہے۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۴۲۶-۴۳۱: نیز داڑھی کے مسئلہ پر متعدد علماء کی کتب وتحقیقات)

ریشِ نبوی

ریشِ نبوی خوب بھرواں تھی اور رسولِ اکرم ﷺ اس کی اصلاح اور تراش خراش بھی فرماتے تھے اور اس میں خوشبو اور تیل وغیرہ بھی لگاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسولِ اکرم ﷺ کی تمام سنتوں کے انتہائی پابند تھے خواہ تعبدی ہوں یا عادی۔ امام مالک نے ان کا عمل لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جب بھی عمرہ یا حج میں سر منڈواتے تھے تو اپنی داڑھی اور مونچھوں کی بھی اصلاح کرواتے تھے: "کان ابن عمر اذا حلق راسه فی حج او عمرة اخذ من لحیته وشاربه"۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ ہم خوب لمبی داڑھی رکھتے تھے اور صرف حج یا عمرہ میں ان کی اصلاح کرتے تھے: "کنا نعفی السبال الا فی حج او عمرة"۔ ترمذی کی ایک روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنی ریشِ مبارک کے طول وعرض کی اصلاح فرماتے تھے: "کان یاخذ من لحیته من عرضھا وطولھا" اگرچہ اس پر کلامِ بخاریؒ خاصا سخت ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے دوسرے علماء ومحدثین کے نظریات وافکار سے بحث کی ہے جس سے سردست ہمیں بحث نہیں۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ریشِ مبارک بھرواں، لمبی اور

طویل تھی اور اس کی آرائش کی جاتی تھی کہ بالا آرائش وتزئین وہ پراگندہ بالی کی حدود میں داخل ہوجاتی جو حدیث وسنت کے خلاف اور مزاجِ نبوی کے منافی تھی۔ اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے موچھیں بالکل صاف نہیں کرائیں یعنی ان کو کبھی منڈوایا نہیں ورنہ پھر مونچھ مونچھ نہ رہ جاتی۔ یہ عجیب وغریب بات ہے کہ تمام مباحث کے باوجود رسولِ اکرم ﷺ کی ریشِ مبارک اور مونچھوں کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں البتہ قصِ شارب کا ذکر ملتا ہے: "کان النبی ﷺ یقصّ شاربہ"۔ ترمذی (فتح الباری، ۱۰/ ۴۲۷)

صحابہ کرام کی داڑھی مونچھ

سنتِ نبوی کے عین مطابق صحابہ کرام کی داڑھی موچھیں تھیں۔ داڑھیاں بھرواں، بھرپور اور خوب لمبی مگر اصلاح شدہ، اور موچھیں کتری ہوئی اور چھوٹی۔ حضرت عمرؓ کی مونچھوں کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ وہ خاصی بڑی موچھیں رکھتے تھے مگر ان کی اصلاح کرتے تھے اور ان کے بالوں کو لب کے نیچے نہیں لٹکنے دیتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے رسولِ اکرم ﷺ کے اصحاب کرام۔ ابوامامہ باہلی، مقدام بن معدی کرب کندی، عتبہ بن عوف سلمی، حجاج بن عامر ثمالی اور عبداللہ بن بُسر کے موچھیں کترنے کا ذکر کیا ہے (فتح الباری ۱۰/ ۴۲۷)۔ اسی مقام پر بعض دوسرے صحابہ کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ اتنی موچھیں کاٹتے تھے جیسے منڈوادیا ہو اور بعض حلق بھی کرتے تھے لیکن یہ حلق کرنے والے تمام کے تمام تابعی تھے۔ صحابہ کرام میں حضرت ابن عمرؓ کے موچھیں خوب کاٹنے کا ذکر بخاریؒ میں بھی ہے کہ لب کی جلد کی سفیدی جھلکنے لگتی تھی۔ لیکن وہ حلق نہیں تھا۔ اور موچھیں منڈوانے کے خلاف بھی بعض روایات ملتی ہیں۔ وجہ اعتدال وتوازن یہی ہے کہ موچھیں کتری جائیں مگر منڈوائی نہ جائیں۔

خضاب نبوی

عرب معاشرت میں بالوں کو مختلف قسم کی چیزوں۔ خضابوں۔ سے رنگنے اور سفیدی چھپانے کا رواج بھی تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے اور صحابہ کرام سیاہ، مہندی

اور متعدد دوسرے رنگوں سے اپنی داڑھی، مونچھیں اور سر کے بال رنگتے تھے اور صحابیات بھی اپنے سر کے بالوں کی تزئین خضاب سے کرتی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کا اپنا عمل خالص فطرت پر قناعت کا تھا۔ سرِ عزیز اور داڑھی مونچھوں کے بال کالے اور سیاہ ہی رہے۔ صرف چند بال سفید ہوگئے تھے اور صحابہ کرام نے ان سفید بالوں کی تعداد سترہ اور بیس تک محدود کی ہے۔ لہٰذا رسولِ اکرم ﷺ نے خود کبھی خضاب استعمال نہیں فرمایا کہ سفیدی اتنی کم تھی کہ اس کو چھپانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ حضرت جابر بن سمرہؓ کے بیان کے مطابق آپ ﷺ بالوں میں تیل لگا لیتے تھے تو سفیدی نظر ہی نہ آتی تھی، نہ لگاتے تو معلوم ہونے لگتی تھی۔

(مسلم: ۲۳۴۴؛ بخاری، حدیث: ۵۸۹۴-۵۸۹۸: فتح الباری، ۱۰/۴۳۲-۴۳۵)۔

ان میں سے بعض احادیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ ریشِ مبارک اور سرِ اقدس کے بعض بال جو حضرت ام سلمہؓ نے دکھائے وہ سرخ تھے: "شعر النبی احمر، شعرات حمراً" لیکن یہ خضاب آلود تھے یا نہیں۔ حدیث: ۵۸۹۷ ان کو خضاب آلود (مخضوبا) بتاتی ہے۔ ممکن ہے کہ راوی کو سرخ رنگت سے خضاب آلود معلوم ہوئے ہوں کیونکہ کالے بال جب سفیدی مائل ہوتے ہیں تو پہلے سرخ ہو جاتے ہیں پھر سفید ہوتے ہیں۔

(احادیث مسلم: ۲۳۴۱-۲۳۴۴ میں گیسوئے نبوی اور موئے مبارک کے بارے میں تفصیل ہے)

خضابِ صحابہ کرام

البتہ صحابہ کرام کو بالوں - سفید بالوں - کو خضاب لگانے کا حکم دیا (حدیث بخاری: ۵۸۹۹ وغیرہ فتح الباری، ۱۰/۴۳۵) اور متعدد صحابہ کرام نے سیاہ خضاب (وسمہ) اور مہندی (الکتم والحناء) دونوں سے اپنی ریش اور سر کے بالوں کی سفیدی کو بدلا ہے۔ ان خضابوں میں شامل ہیں: الکتم (وسمہ)، الحناء (مہندی)، الصفر (پیلا خضاب/......)، حمرۃ (سرخ/سرخی) اور سواد (سیاہ خضاب)۔

- حضرات شیخین نے حنا اور وسمہ کا خضاب لگایا: خضبا بالحناء والکتم۔ والدِ حضرت ابی بکر حضرت ابوقحافہؓ نے مہندی کا خضاب لگایا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن اسود بن یغوثؒ کو

حضرت عائشہؓ نے اپنی خادمہ نُخیلہ کے ذریعہ اطلاع دی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خضاب لگاتے تھے اور اسی بنا پر ان کو بھی خضاب لگانے کا حکم دیا تھا اور انھوں نے ان کو سرخ کرلیا تھا"... أرسلت الیّ البارحة جاریتها نخیلة فاقسمت علیّ لاصبغن واخبرتنی ان ابابکر کان یصبغ" (موطا، کتاب الجامع فی صبغ الشعر)۔ دوسرے اکابرِ عرب میں جناب عبدالمطلب ہاشمی بھی خضاب - سیاہ خضاب - لگاتے تھے بلکہ ان کو مکہ میں خضاب متعارف کرانے والا کہا جاتا ہے۔ سیاہ خضاب دراصل ان کی عادت عرب میں شامل تھا۔

(مصباح اللغات: الکتم و الکتمان: وسمہ جس سے خضاب بناتے ہیں اور اس کی جڑ کو جوش دے کر روشنائی تیار کرتے ہیں۔"الوسم: ایک درخت ہے جس کے پتوں کو بطور خضاب استعمال کرتے ہیں..."" الوسمة..."نیل کے پتے یا ایک قسم کی نباتات جس کے پتوں سے خضاب تیار کرتے ہیں")

سیاہ خضاب کی تحریم یا کراہت کی بھی بعض احادیث آتی ہیں۔ علماء نے مردوں کے لیے مکروہ اور عورتوں کے لیے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ شدت پسندی ہے۔ صحابہ کرام کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ سیاہ خضاب بھی استعمال کرتے تھے لہٰذا بعد کے نظریات وافکار شخصی خیالات ہیں۔ بعض روایات میں خضاب لگانے کے حکم کا محرک یہود کی مخالفت بتایا گیا ہے کہ وہ خضاب نہیں لگاتے تھے مگر یہ محرک وسبب اصل وجہ حکم نہیں ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۴۳۵-۴۳۶؛ ابن سعد نے طبقات میں صحابہ کرام کے سوانحی تراجم میں سیاہ/ سرخ وغیرہ خضاب لگانے کا ذکر کیا ہے؛-اقسام خضاب کے لیے ملاحظہ ہو: مسلم، باب استحباب الشیب لصفرة او حمرة و تحریمه بالسواد؛ ابوداؤد: باب فی خضاب الصفرة / خضاب السواد وغیرہ؛ حضرت عائشہؓ خضاب الحناء استعمال نہیں کرتی تھیں کہ آپ ﷺ کو اس کی بو ناگوار تھی مگر دوسروں کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھیں: ابوداؤد: ۴۱۶۴ وغیرہ)

غیر ضروری بالوں کی صفائی

سنتِ انبیاء کرام اور خصالِ فطرت میں سے بالوں کے تعلق سے آخری چیز یہ ہے کہ جسم کے بعض حصوں کے بالوں کی صفائی کی جائے۔ ان میں موئے زیرِ ناف اور بغلوں کے بال شامل ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان بالوں کو بالکل صاف کردیا

کریں۔ متعدد احادیث میں ان کا حکم وارد ہوا ہے اور ان پر رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کا عمل بھی متواتر و مسلسل رہا ہے۔ اگرچہ بعض عام احادیث سے اس فطری صفائی کی مدت کا علم نہیں ہوتا لیکن مسلم کی ایک حدیث ثابت کرتی ہے کہ چالیس دنوں سے زیادہ ان کی صفائی سے اجتناب نہ کیا جائے۔ یہ حدِ آخری ہے۔ ان کی صفائی جلد از جلد کی جائے تو اور بھی محمود ہے کیونکہ وہ جسم کے ان حصوں کی نظافت وطہارت کی کافی ضمانت بن جاتی ہے۔ چالیس دن کے بعد ان غیر ضروری بالوں سے چھٹکارا نہ پانا مکروہ اور باعثِ گناہ ہے۔ ان تمام احادیث وروایات کا ذکر بالعموم خصالِ فطرت سے متعلق احادیث میں آتا ہے جن کی تعداد پانچ دس نہیں ہے جیسا کہ بخاری و مسلم کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے بلکہ وہ بیسیوں تک متجاوز ہے۔ بہرحال غیر ضروری بال کے تعلق سے یہ بحث حدیث بخاری: ۵۸۸۹ اور اس کی شرح ابن حجرؒ میں آئی ہے۔

(۱۰/۴۱۲-۴۳۱، بالخصوص: ۴۲۲-۴۲۳: "الاستحداد، ونتف الابط"؛ نیز ملاحظہ ہو: خاکسار کا مضمون: خصالِ فطرت پر اور "مکی عہدِ نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء" میں اس کی متعلقہ بحث)

خواتین کے لیے ایک عام اور مستقل حکم اس ضمن میں یہ ملتا ہے کہ اپنے شوہروں کی غیر حاضری کے بعد ان کی آمد پر ان غیر ضروری بالوں کی صفائی ضرور کریں اور سر کے بالوں کو سنوار لیا کریں۔ اور مردوں کو حکم تھا کہ اچانک گھروں میں نہ وارد ہوا کریں بلکہ خبر کر کے جائیں تاکہ خواتین زیب وآرائش کا موقعہ پاسکیں: ...فقالَ: امهلوا حتى ندخل ليلا (اى عشاء ا) كى تمتشط الشعثة و تستحدّ المغيبة"

(احادیث مسلم: ۱۸۱(۷۱۵) ۱۸۲(...)؛ کتاب الامارة، باب كراهة الطروق... الخ)

✪✪✪

خوشبو وعطریات

جسمانی نظافت ہو یا لباس کی طہارت، دونوں کو خوشبو کی ضرورت ہوتی ہے۔ غسل اور دھونے کا عمل اولین مرحلۂ طہارت ونظافت ہے اور اس کے بعد کا دوسرا مرحلۂ نظافت جسم اور کپڑوں کو خوشبو۔عطر، تیل پھلیل وغیرہ۔ سے آراستہ کرنا ہوتا ہے۔ جسمانی نظافت میں بھی خوشبو کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے اشنان، سدر (بیری) وغیرہ کی پتیوں سے اس کا اہتمام مزید کیا جاتا ہے۔ وہ ایک فطری رویہ اور قدرتی خواہش ہے اس لیے وہ اسلامی دین وشریعت کا ایک عمدہ اصولِ نظافت وطہارت اور عملِ پاکیزگی ہے۔ متعدد احادیث وآثار بتاتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو بہت پسند تھی اور بدبو سخت تکدر وخلجان اور تردد کا باعث بنتی تھی۔ اسی بنا پر خوشبو لگانے کے احکام وارد ہوئے اور بدبو سے بچنے کی ہدایات دی گئیں۔ ان میں سے کچھ کا ذکر لباس وملبوس کے حوالے سے آچکا ہے۔ ایک دلچسپ روایت یہ بھی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے گھروں کے احاطوں/ دور میں مساجد بنانے، ان کو صاف ستھرا رکھنے اور خوشبو سے ان کو بسانے کا بھی حکم دیا ہے: **أمر رسول اللہ ﷺ ببناء المسجد فی الدور، وان تنظف وتطیب** - ترمذی، حدیث: ۵۹۴، **باب فی تطییب المساجد)**

خوشبو صرف نظافت کی چیز نہیں تھی بلکہ وہ سنگھار کی بھی ایک شے تھی، بالخصوص عورتوں کے لیے۔ مردوں کے لیے بھی وہ پسندیدہ تھی۔ خوشبوئے مرد وزن میں ایک فرق بھی احادیث میں آتا ہے: مردوں کے لیے وہ خوشبو پسندیدہ اور روا ہے جو بُو رکھتی ہو مگر رنگ سے عاری ہو، عورتوں کے لیے رنگین خوشبو پسندیدہ تھی اور بُو والی ناپسندیدہ یا ہلکی، بھینی خوشبو والی شے؛ اس کا ذکر حدیث نبوی میں یوں آتا ہے: "**طیب الرجال ماظهر ریحه وخفی لونه، وطیب النساء ماظهر لونه وخفی ریحه**" (ترمذی، **ابواب الاستیذان والآداب، باب فی طیب الرجال**

والنساء) یعنی مردوں کی خوشبو وہ ہے جس کی بو غالب وظاہر ہو اور جس کا رنگ ہلکا یا مخفی ہو اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ چوکھا اور جس کی بو ہلکی ہو"۔ حدیث شریف سے بھی بو/خوشبو کی نفی نہیں ملتی بلکہ تیز خوشبو عورتوں کے لیے ناپسندیدہ ہے۔

عرب ہو یا دوسرے ممالک، خوشبو مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ عہد نبوی میں خوشبوئیں مختلف نباتات سے بنائی جاتی تھیں لہٰذا ان میں رنگ بھی ہوتا تھا اور بُو بھی۔ احادیث وروایات میں ان کے بہت سے اسماء اور اقسام وانواع کا ذکر ملتا ہے، جن پر بحث آتی رہے گی۔ پھر ان خوشبوؤں کا محلِ استعمال بھی مختلف تھا: کچھ کا استعمال بالوں- سر اور داڑھی- وغیرہ کے لیے ہوتا تھا، کچھ کا جسم کے حصوں کے لیے، کچھ سے ہاتھ پیر اور چہرے کی تزئین کی جاتی تھی اور کچھ سے لباس کو خوشبو دار بنایا جاتا تھا۔ ان تمام خوشبوؤں کا ذکر الگ الگ عناوین کے تحت کیا جاتا ہے۔ حسب معمول نبوی خوشبو وعطریات سے آغاز کیا جاتا ہے۔

نبوی خوشبو وعطریات

رسولِ اکرم ﷺ کے سرِ اقدس اور لحیۂ مبارک کی آرائش میں یہ بات گذر چکی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ان دونوں میں خوشبو- بہترین خوشبو- لگاتی تھیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کے احرام باندھنے سے پہلے یا اس وقت آپ ﷺ کے لباس میں بھی بہترین خوشبو لگاتی تھیں: "کنت اطیب النبی ﷺ عند احرامه باطیب ما اجد" (بخاری، حدیث: ۵۹۲۸؛ فتح الباری، ۱۰/۴۵۳-۴۵۴ وما بعد)۔ اسی ضمن میں حدیث: ۵۹۳۰ کے مطابق یہ ذکر ملتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو حجۃ الوداع کے زمانے میں احرام وحل دونوں زمانے میں خوشبو لگائی تھی اور اس بار خوشبو کا نام "ذریرہ" بتایا ہے جو حافظ ابن حجرؒ کے مطابق اہلِ حجاز کی مخصوص خوشبو کا نام تھا اور امام نوویؒ جیسے بعض علماء وشارحین نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ ایک خوشبودار پودے سے بنی ہوتی تھی اور ہندوستان سے منگوائی جاتی تھی اور بہت پسند کی جاتی تھی: "...وجزم غیر واحد منهم النووی بانه فتات قصب طیب یجاء به من الهند"

(فتح الباری، ۱۰/۴۵۵: باب الذریرۃ- بخاری...... مصباح اللغات: الذریرۃ: ایک قسم کی خوشبو؛ نیز بخاریؒ، کتاب

اللباس، باب تطیب المرأۃ الخ، باب الطیب فی الراس واللحیۃ؛ باب ما یستحب من الطیب، باب ما یذکر من المسک وغیرہ؛ منیٰ میں بھی خوشبو لگانے کا ذکر آیا ہے۔ نیز مسلم، کتاب الحج، باب الطیب للمحرم الخ وغیرہ۔ رسولِ اکرم ﷺ کو خوشبو پسند تھی لہٰذا اس کا ہدیہ کبھی مسترد نہیں فرماتے تھے: ''...انہ کان لا یرد الطیب...بخاری: ۵۹۲۹؛ ترمذی، باب فی کراھیۃ رد الطیب)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ رسولِ اکرم ﷺ کو خوشبو سے آراستہ کرتیں پھر آپ ﷺ ازواجِ مطہرات کے پاس جاتے اور صبح کو محرم ہوتے تو خوشبو کا برادہ جھاڑ دیتے تھے: ''کنت اطیب رسول اللہ ﷺ فیطوف علی نسائہ ثم یصبح محرما ینضح طیبا...''

(بخاری، کتاب الغسل، باب اذا جامع الخ؛ کتاب الحج، باب الطیب عند الاحرام، وغیرہ؛ فتح الباری، ۱/ ۴۸۸-۴۹۰ میں حافظ موصوف کی تشریح کی ہے کہ وہ خشک ہو جانے کے بعد باقی رہ جاتی تھی یا ''عین الطیب'' باقی رہ جاتا تھا جسے آپ ﷺ جھاڑ دیتے تھے)

- اسی طرح غسلِ جنابت کرتے تو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بقول خوشبو دار نباتات (حِلاب) یا خوشبو (طیب) وغیرہ طلب فرماتے اور اسے پہلے سر کے دائیں پہلو پر پھر بائیں پہلو پر اور بعد میں پورے سر پر اپنے دستِ مبارک سے مل لیتے: ''کان النبی ﷺ اذا اغتسل من الجنابۃ دعا بشیٔ نحو الحلاب فاخذ بکفہ فبدأ بشق راسہ الایمن ثم الایسر فقال بھما علیٰ راسہ''.

(بخاری، مذکورہ بالا، باب من بدأ بالحلاب او الطیب الخ؛ فتح الباری، ۱/ ۴۷۹-۴۸۲: حافظ موصوف نے اس لفظ ''حلاب'' پر محدثین کے اختلاف شدید کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے لیکن وہ اس کا عقدہ نہیں کھول سکے کیونکہ حلاب برتن کے معنی میں آتا ہے۔ تمام تاویلات میں سے وہی تاویل سب سے صحیح لگتی ہے جو حلاب کو خطمی وغیرہ خوشبو جیسی بتاتی ہے)

اس حدیث کی تشریح میں تمام شارحین اس پھیر میں پڑ گئے ہیں کہ خوشبو نہانے کے بعد لگائی جاتی ہے اور پہلے لگانے سے وہ پانی سے بہہ جائے گی لہٰذا طرح طرح کی تاویلات کی ہیں جو متن حدیث سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہیں۔ دوسرے امام بخاریؒ نے غلطی کی ہو یا نہ کی ہو ان کا ترجمۃ الباب واضح کرتا ہے کہ وہ اسے غسل کے وقت خوشبو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، استعمال کرنے کا واقعہ بتاتا ہے اور سنت ثابت کرتا ہے کہ آپ ﷺ غسل کے وقت خوشبو استعمال کرتے تھے۔

جمعہ کی خوشبو

عام خوشبو کے استعمال میں جمعہ کے دن غسل کرنے اور کپڑوں میں خوشبو لگانے کی احادیث و روایات شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ صحابہ کرام کو جب حکم عطا فرمارہے تھے تو بنفس نفیس اس پر عمل فرماتے تھے۔ یہی سنتِ نبوی ہے۔

(بخاری، کتاب الجمعة، باب الطیب للجمعة، باب الدهن للجمعة وغیرہ؛ فتح الباری، ۲/ ۴۶۸-۴۷۰ اور ۴۷۶-۴۸۰۔ حافظ موصوف نے ساری بحث اس امر پر کی ہے کہ غسلِ جمعہ واجب ہے یا نہیں اور غسل جمعہ واجب ہے تو خوشبو/ تیل لگانا بھی واجب ہے یا نہیں یا پھر روایتی اختلافات سے سروکار رکھا ہے۔ بہر حال ان دونوں ابواب کی احادیث بخاری: ۸۸۰-۸۸۵ کی تشریح میں ہدایات واحکام تو بیان کیے ہیں مگر خوشبو یا تیل لگانے کا کوئی واقعہ سنتِ نبوی یا تعاملِ صحابہ سے نہیں بیان کیا ہے۔ ویسے دونوں کے باب میں وہ امر واقعہ ہے)

بخور سے خوشبو بسانا

بخوردان سے خوشبو کو کپڑوں میں بسانے کا عربوں میں قدیم زمانے سے رواج تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ بھی اس طرح بخور سے اور کافور وغیرہ سے اپنے کپڑوں کو خوشبودار بناتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کا طریقہ اور اپنا اور نبوی عمل بیان کیا ہے: "کان ابن عمر اذا استجمر استجمر بالالوة مطراة بکافور یطرحه مع الالوة ثم قال: هکذا کان یستجمر رسول الله ﷺ"

- اس کے علاوہ رسولِ اکرم ﷺ کی ایک مقیش چادر کے زعفران سے رنگین کرنے کا ذکر ملتا ہے جس کو اوڑھ کر آپ ﷺ ازواج مطہرات کے گھروں میں جایا کرتے تھے اور جانے سے قبل اس پر پانی چھڑک لیتے تھے تاکہ اس کی عطر بیز خوشبو سے سب محظوظ ہوں۔ اس کا حوالہ کتاب/ باب ملبوسات میں پہلے تفصیل سے آچکا ہے۔ یہاں خوشبو کا عام و خاص استعمال دکھانے کے دوبارہ کیا گیا ہے۔

(مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرها، حدیث: ۲۲۵۴؛ مصباح اللغات: اجتمر و استجمر: دھونی دینا "؛ اس کا طریقہ بہت معروف ہے: ایک چھوٹی سی سوراخ دار ہانڈی میں انگاروں پر لوبان وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔ اس کے خوشبودار دھوئیں سے مکان و مقام کو بھی دھونی دیتے ہیں اور اسے لوگ اپنے کپڑوں بالعموم بالائی قمیص کے اندر کرکے خوشبو سے کپڑے بساتے ہیں)

قربانی کے دن کی خوشبو

-حضرت عائشہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو قربانی کے دن اور احرام سے قبل مشک کی خوشبو میں بھی بسایا تھا: "طیبت رسول اللہ ﷺ قبل ان یحرم ویوم النحر قبل ان یطوف بالبیت بطیب فیه مسک".

(ترمذی، ابواب الحج، باب الطیب عند الاحلال الخ؛ فتح الباری، ۲/ ۴۶۸ ومابعد کی بحث میں اس حدیث کا بھی ذکر ہے اور دوسری احادیث کا بھی ہے)

بہترین خوشبو

-ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہی سوال پوچھا گیا: کیا رسولِ اکرم ﷺ خوشبو لگاتے تھے؟ فرمایا: ہاں، آپ ﷺ بہترین خوشبو مشک اور عنبر استعمال فرماتے تھے: "...قالت: نعم، بذکارۃ الطیب: المسک والعنبر"

(نسائی، کتاب الزینة، العنبر؛ ترمذی، ابواب الجنائز، باب فی المسک للمیت کی حدیثِ حضرت ابوسعید خدریؓ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں مشک کو بہترین خوشبو بتایا تھا: "قالَ: ھو اطیب طیبکم" (۱/ ۳۶۷)

عطر دانِ نبوی

-ایک اور سوال کے جواب میں حضرت انس بن مالکؓ نے بتایا تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس عطر دان تھا جس سے آپ ﷺ خوشبو لگایا کرتے تھے: "... کانت للنبی ﷺ سکة یتطیب بھا" (ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی استحباب الطیب)

-دورانِ سفر بھی نبوی عطر دان اور قارورۂ تیل رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہمیشہ رہتا تھا:

"ولا یفارقه قلرورۃ الدھن فی سفرہ".

(شاہ ولی اللہ کا رسالۂ سیرت، ۸۷، ۱۱۸، ۱۶۲ وغیرہ؛ مختصرات سیرت ابن سید الناس، طبری، شاہ ولی اللہ وغیرہ میں اس کا ذکر ملتا ہے)

صحابہ کرام کی خوشبو

نبوی خوشبویات وعطریات ایک طرح سے مردانہ خوشبوؤں اور عطروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ صحابہ کرام بھی اکثر و بیشتر ان خوشبوؤں اور عطروں اور تیل پھلیل کا استعمال کرتے تھے۔ غسل کے پانی میں بھی اشنان، بیری وغیرہ ملانے کا رواج عام تھا۔ ان عمومی خوشبوؤں میں مشک (مسک)، ذریرہ، حلاب وغیرہ کے علاوہ بعض اور خوشبوؤں کا ذکر ملتا ہے جو صحابہ کرام میں سے بعض کے استعمال میں تھیں البتہ وہ رسولِ اکرم ﷺ استعمال نہیں فرماتے تھے۔ غالباً ان میں رنگ کا عنصر زیادہ ہوتا تھا جو کپڑوں یا جسمانی اعضاء و جوارح کو رنگین بنا دیتا تھا جیسے زعفران وغیرہ۔ ان خوشبوؤں کا ذکر بالعموم احرام باندھنے کے حوالے سے آتا ہے تاہم یہ بھی ذکر واضح طور سے ملتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایسی خوشبوئیں استعمال کی تھیں جن کا واضح اثر جسم مبارک پر رہ جاتا تھا یا سر اقدس میں اس کی چمک کہکشاں بن کر جگمگ کرتی تھی۔ زعفران کا استعمال ملبوسات نبوی میں ملتا ہے البتہ احکام حج وعمرہ الگ تھے۔

- حنین میں ایک اعرابی صحابی حاضر خدمت ہوئے اور احکامِ عمرہ پوچھے۔ ان کی قمیص پر زردی کا اثر تھا: "وبہ اثر صفرۃ"۔ رسولِ اکرم ﷺ نے قمیص اتارنے اور زردی دھونے کا حکم دیا۔ (موطا، کتاب الحج، ماجاء فی الطیب فی الحج)

- امام مالکؒ نے اسی کتاب و باب میں دو اور واقعات لکھے ہیں: حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے جسم اور کپڑوں میں ان کی بہن ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے خوشبو لگا دی لیکن خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ نے اسے دھلوا دینے کا حکم دیا۔ اسی طرح حضرت کثیر بن الصلتؒ نے اپنے سر کی تلبید کر لی تھی اور ان کا ارادہ حلق نہ کرانے کا تھا اور اس سے بھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں بھی دھونے کا حکم دیا۔ یہ دونوں واقعات اگرچہ بعد کے ہیں تاہم ان میں صحابہ کرام اور ان سے زیادہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کا عمل بھی موجود ہے جو بہت اہم ہے (موطا مذکورہ بالا) حضرت عمرؓ کا طریقہ احتیاط پر مبنی تھا اور صحابہ کے مقتدا ہونے کے خیال عوام پر بھی کہ وہ ان کے طرز عمل کو اپنا لیں گے۔ ورنہ احرام سے پہلے کپڑوں میں خوشبو لگانے کا عمل صحابہ میں بھی ملتا ہے

اور سنت نبوی میں بھی۔ بعد کے فقہی افکار و روایتی تاویلات سے اس وقت بحث نہیں ہے۔

- حضرت جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ پہلی نماز پڑھی پھر آپ ﷺ اپنے اہل کی طرف چلے اور میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ گیا تو بچوں نے آپ ﷺ کا استقبال کیا اور آپ ﷺ ان کے دونوں گالوں کو فرداً فرداً چھونے لگے مگر میرے صرف ایک رخسار کو چھوا۔ میں نے آپ کے دستِ مبارک میں اتنی خوشبو پائی گویا کہ وہ عطار کی صندوقچی سے نکالا گیا ہو: "...فوجدت لیده برداً وریحاً کان اخرجها من خزنة عطار"۔ اسی طرح حضرت انسؓ خادم نبوی کا بیان آپ ﷺ کے دست مبارک کی نرمی، خوبصورتی اور خوشبوداری کے بارے میں ملتا ہے اور اس میں بھی خوشبوؤں کے نام ہیں جن سے وہ واقف تھے: میں نے رسولِ اکرم ﷺ کی خوشبوئے بدن سے زیادہ بہتر کسی عنبر یا مسک کی خوشبو نہیں پائی: "ماشممت عنبرا قط ولا مسکا ولا شیئا اطیب من ریح رسول الله ﷺ ... الخ"۔

(مسلم، کتاب الفضائل :احادیث:۸۰(۲۳۲۹)-۸۱(۲۳۳۰؛ نیز دیگر کتب حدیث)۔ ان دونوں روایات سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں: ایک عطار کا عہد نبوی میں وجود اور اس کے ذخیرہ/صندوقچہ عطاری کا۔ دوسرے عنبر اور مشک کی دو خوشبوؤں کے معروف اور مستعمل ہونے کا۔ دونوں عہد نبوی میں استعمال ہوتی تھیں۔ اور عطاروں/عطر فروخت کرنے والوں پر بحث بعد میں آتی ہے)

خلوق

- بچوں کو بالعموم عہدِ نبوی میں خلوق نامی خوشبو لگائی جاتی تھی جس کا جزوِ اعظم زعفران ہوتی تھی اور اسی میں زرد رنگ ہوتا تھا۔ متعدد روایات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد حضرات بھی اسے لگاتے تھے البتہ رسولِ اکرم ﷺ کو رنگ کی وجہ سے وہ ناپسند تھی۔

(مصباح اللغات: خلوق ایک قسم کی خوشبو، اس کی مزید وضاحت نہیں کی کہ وہ کیسی خوشبو تھی۔ بہرحال وہ مرکب خوشبو معلوم ہوتی ہے کہ زعفران کے علاوہ بعض اور چیزوں سے مل کر بنتی تھی کیونکہ زعفران کو اس کا جزو اعظم بتایا گیا ہے)

- حضرت عمار بن یاسرؓ کا بیان ہے کہ میں رات میں اپنے اہل و عیال کے پاس گیا اور میرے دونوں ہاتھ پھٹ گئے تھے تو انھوں نے زعفران کا خلوق لگا دیا۔ یہ غالباً لیپ کی شکل میں ہوتا تھا۔ صبح کو اسی حال میں حاضرِ خدمت ہو کر سلام عرض کیا تو روئے انور پر تکدر تھا۔ آپ ﷺ

نے زردی دور کرنے اور دھونے کا حکم دیا۔ تھوڑا سا نشان دھونے کے بعد بھی رہ گیا تھا تو اسے بھی آپ ﷺ نے دھلوا دیا۔

- فتحِ مکہ میں حضرت ولید بن عقبہ امویؓ بڑے/ بالغ شخص تھے۔ ان کا بیان ہے کہ لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو لے کر حاضرِ خدمت ہوتے تو آپ ﷺ ان کے سروں پر دست شفقت پھیرتے۔ میرے سر پر ہاتھ اس لیے نہیں پھیرا کہ میں خلوق لگائے ہوئے تھا۔

- اسی طرح ایک اور شخص کے ہاتھ پر زردی کا اثر تھا، آپ ﷺ کو ناگواری ہوئی اور آپ ﷺ نے اسے دھونے کا حکم دیا۔

- اسی بنا پر رسولِ اکرم ﷺ نے خلوق کو، زعفران کو اور دوسری رنگدار خوشبوؤں کو مردوں کے لگانے کے لیے منع فرمایا۔ عورتوں کو اجازت دی ہے۔ ممانعت کی کئی قسمیں ملتی ہیں: صاف حکم ہے کہ مرد زعفران نہ لگائیں، دوسرے نماز ایسے شخص کو قبول نہیں ہوتی، تیسرے فرشتے اس سے گریز کرتے ہیں۔ ان تمام احادیث اور سنن سے بہر حال رنگین کر دینے والی خوشبو کو مردوں کے لیے ناپسندیدہ قرار دیا جانا معلوم ہوتا ہے۔

(ابوداؤد، کتاب الترجل، باب الخلوق للرجال؛ ترمذی، ابواب الاستیذان والآداب، باب فی کراهیة التزعفر والخلوق للرجال: نهیٌ عن التزعفر للرجال)

- شادی بیاہ میں بھی زعفران وغیرہ کی خوشبو لگائی جاتی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ نے آغاز مدنی عہد میں اپنی اولین مدنی شادی کی تو دوسری صبح جب وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو ان کے جسم ولباس پر زردی کے اثرات تھے یعنی زعفران کے.......... "... ان رسول الله ﷺ رأی عبدالرحمن بن عوف وعليه ردع زعفران، فقال النبی ﷺ: مهيم؟ فقال: يا رسول الله! تزوجت امرأة... الخ"

(ابوداؤد، باب النکاح، باب قلة المهر، حدیث: ۲۱۰۹)

خواتین کی خوشبو

عہدِ نبوی میں ازواجِ مطہرات، صحابیات اور دوسری خواتینِ عصر طرح طرح کی خوشبوئیں

اور عطریات استعمال کرتی تھیں۔ اور ان کے عام استعمالات کے علاوہ بعض خاص احوال و مقامات بھی تھے۔ ان میں کپڑوں اور ملبوسات کو عطر سے بسانے کے علاوہ ہاتھوں، چہروں اور جسم کے دوسرے اعضاء و جوارح کی آرائش و تزئین بھی شامل تھی۔ اسے موجودہ اصطلاح میں آرائشِ طلعت کہا جاتا ہے۔ آرائشِ جمال کا فطری طور سے مرد و زن دونوں کو شوق ہوتا ہے اور اسلام اور اس کی تہذیبی شریعت نے اس کا فطری پاس و لحاظ کیا ہے اور ان کی حدود مقرر کی ہیں۔ عصری روایاتِ تزئین و آرائش میں سے تمام صالح چیزوں کو برقرار رکھا ہے اور غیر ضروری یا مضر چیزوں کی ممانعت کر دی ہے۔

عام خوشبو

ملبوسات اور جسم کے بعض اعضاء و جوارح کو خوشبو سے بسانا یا ان پر عطر وغیرہ لگانا خواتین میں بھی رائج تھا۔ وہ سنتِ نبوی کے مطابق اپنے جسم اور ملبوس دونوں کو اس سے آراستہ کرتی تھیں۔ اس کی متعدد روایات ملتی ہیں:

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ ہم رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ مکہ جاتے تو اپنی پیشانیوں پر احرام کے وقت خوشبو دار مشک کا ضماد/ لیپ لگا لیتے تھے اور پسینہ نکلتے وقت وہ ہمارے چہروں پر بہہ نکلتا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ اسے ملاحظہ فرماتے تھے مگر منع نہ کرتے تھے:

"کنا نخرج مع النبی ﷺ الیٰ مکة فنضمد جباهنا بالمسک المطیب عند الاحرام، فاذا عرقت احدانا فسال علی وجهها فیراه النبی ﷺ فلا ینهاها"

(ابوداؤد، کتاب المناسک، باب مایلبس المحرم: حدیث: ۱۸۳۰)

- خواتینِ عہد بالخصوص بعض ازواج مطہرات اپنے کپڑوں، لباسوں اور چادروں کو زعفران سے رنگ لیا کرتی تھیں۔ بعض دوسری رنگدار خوشبوؤں سے بھی ان کے رنگنے کا ذکر ملتا ہے۔ سوگ یا احرام میں ان کے استعمال سے ان کو روکا گیا ہے:

- اس باب میں رسولِ اکرم ﷺ کا ایک حکم فطرتِ انسانی اور جبلتِ نسوانی کے ساتھ ساتھ تعلقاتِ زن و شو کی بہتری کو خوب واضح کرتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا حکم عام تھا کہ مرد

بالخصوص شوہر جب کبھی باہر کے طویل یا مختصر سفر سے واپس آئیں تو خواتین کو اطلاع کرایا کریں یا تھوڑی مہلت دے کر گھروں میں داخل ہوا کریں تا کہ ان کی بیویاں اور خواتین گندگی دور کر کے آرائش وزیبائش کرلیں اور ان کو شکستہ حال دیکھ کر شوہروں پر برا اثر نہ پڑے: "لکی تمتشط الشعثة وتستحد المغيبة"

(بخاری، کتاب النکاح، باب الثیبات؛ ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی الطروق: حدیث: ۲۷۷۸۔ خواتین بالعموم اس دوران زیب وزینت کرلیا کرتی تھیں)

- دوسری خواتین کی خوشبو کا ذکر ملبوسات میں بھی آچکا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی احادیث سے ان کا عام استعمال معلوم ہوتا ہے۔

آرائشِ چہرہ ونگاہ

سرمہ

چہرے بالخصوص آنکھوں کی آرائش وحفاظت کے لیے مرد وزن دونوں عہدِ نبوی میں سرمہ کا استعمال کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی کئی احادیث نقل کی جاتی ہیں جن کا مدعا یہ ہے کہ انسان کو سرمہ لگانا چاہیے بالخصوص پتھر (اثمد) کا جو نگاہ تیز کرتا اور بال اگاتا ہے اور راوی کا خیال ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے آپ ﷺ ہر رات تین تین سلائیاں دونوں آنکھوں میں لگاتے تھے: "عن ابن عباس: ان النبی ﷺ قال: اکتحلوا بالاثمد فانه یجلو البصر وینبت الشعر؛ وزعم ان النبی ﷺ کانت له مکحلة یکتحل بها کل لیلة ثلاثة فی هذه وثلاثة فی هذه"

(ترمذی، ابواب اللباس، باب فی الاکتحال؛ مصباح اللغات: اثمد: ایک قسم کا پتھر جس سے سرمہ تیار کیا جاتا ہے اور جس کو علمائے کیمیا "انتیموان" کہتے ہیں؛ مختصرات سیرت کے حوالے سے گذر چکا کہ سرمہ دانی ان سات اشیاء میں سے ایک تھی جو دوران سفر بھی ساتھ رہتی تھیں)

- دوسرے سرمہ کا نام الصبر (ایلوا) ملتا ہے اور حضرت ام سلمہؓ کے استعمال کے حوالے سے موطا میں آتا ہے اور ہم نے اس کا ذکر خاص احوال کے تحت کی آرائش وخوشبو میں کیا ہے حالانکہ وہ ایک عام سرمہ تھا اور اس سے آنکھوں کی آرائش بھی ہوتی تھی۔

ہاتھوں اور ناخنوں کی آرائش

مردوں اور عورتوں کے ہاتھوں کی بناوٹ میں اگرچہ خاصا فطری فرق ہوتا ہے تاہم بعض خواتین کی انگلیاں، ہتھیلیاں اور کلائیاں وغیرہ خاصی مردانہ ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ خالص نسوانی ہاتھوں کے لیے بھی حکم وہدایت ہے کہ ان کی آرائش وزیبائش کی جائے اور ان کو مردانہ بنا کر نہ رکھا جائے۔

- حضرت ہند بنت عتبہؓ فتحِ مکہ کے بعد جب بیعتِ نبوی کے لیے تشریف لائیں تو رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے ننگے بچے ہاتھ اور کلائیاں دیکھ کر ان کو زیب وزینت سے آراستہ کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ درندوں جیسی لگ رہی تھیں: "... تغیری کفیک کانها کفا سبع"

(حدیث ابوداود: ۴۱۶۵)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایات میں دوسرا واقعہ یہ ملتا ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے اپنا ہاتھ نکالا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں کتاب پیش کرے۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک روک کر فرمایا: میں نہیں جانتا کہ یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا۔ اس نے کہا کہ عورت کا ہاتھ ہے، تو ارشاد فرمایا: اگر تم عورت ہو تو تم کو اپنے ناخنوں کو مہندی وغیرہ سے رنگ لینا چاہیے: "... لو کنت امراة لغیرت اظفارک یعنی بالحناء"

(ابوداود- ۴۱۶۶: کتاب الترجل، باب فی الخضاب للنساء)

- خود ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں ایک روایت آتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے ہاتھوں وغیرہ کو بلا زیب وزینت ملاحظہ فرمایا تو ان کو آرائش کا حکم دیا اور انھوں نے ایک خاص قسم کی خوشبو سے اپنے دست وبازو کو سجایا سنوارا۔

مخصوص احوال تزئین

عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے ماہانہ اذیت (حیض) اور ولادت کی نجاست (نفاس) میں خاص مقاصد ومصالح سے مبتلا کیا ہے۔ ان اذیتوں اور نجاستوں سے پاکی کا اہم ترین حصہ غسل ہے۔

پانی میں بعض خوشبودار پودوں اور گھاس جیسے بیری اور زعفران ومشک وغیرہ کے علاوہ نمک جیسی چیزوں کا استعمال بھی نبوی تعلیمات میں بتایا گیا ہے کہ وہ طہارت لانے اور نجاست دور کرنے میں کافی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ماہانہ اذیت کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے متعدد خواتین کو خوشبو استعمال کرنے کا حکم دیا اور خواتینِ عصر نے ان پر پابندی سے پوری زندگی عمل کیا۔ اسی طرح نفاس کے بعد بھی خواتین باقاعدہ خوشبوؤں سے اپنے جسم وجان کو آراستہ کرتی تھیں۔

(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الاغتسال من الحیض؛ نیز دیگر کتب حدیث کے ابواب حیض ونفاس)

- حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ عہدِ نبوی میں نفاس والی خواتین چالیس دنوں تک گوشۂ تنہائی اختیار کرتی تھیں پھر وہ تل کی مانند گھاس (الورس) وغیرہ سے اپنے چہروں کو سجاتی تھیں: "کانت النفساء تجلس علیٰ عهد رسول الله ﷺ اربعین یوما، فكنا نطلی وجوهنا بالورس من الكلف"

(ترمذی، ابواب اللباس، باب ماجاء فی کم تمکث النفساء ؟؛ ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، مذکورہ بالائے ترمذی؛ ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب النفساء الخ ؛ امام ابوداؤد نے الورس کو ایک پیلی نباتات (گھاس) بتایا ہے جس سے چہرے کا میک اپ تیار کیا جاتا تھا اور کلف سیاہی زردی مائل (السمسم) جیسی چیز تھی جو بطور غازہ استعمال ہوتی تھی: الورس نبت اصفر یصبغ به ویتخذ منه صباغ الوجه، والكلف شئ یعلو الوجه کالسمسم"۔ (مصباح اللغات میں کلف کے معنی دیے ہیں: "سیاہی زردی مائل، جھائیں" اور سمسم کے معنی چیونٹی اور سرخ چیونٹی وغیرہ اور ان دونوں سے اس گھاس یا نباتات یا خوشبو کا پتہ نہیں چلتا)

- حضرت ام عطیہؓ کی مشہور روایت ہے کہ ہماری عورتوں میں سے جب کوئی حیض سے پاک ہونے کے لیے غسل کرتی تو تھوڑی سی خوشبو ضرور استعمال کرتی تھی جو عودِ ہندی ظفاری تھی:

"...اذا اغتسلت احدانا من محیضها فی نبذة من کست اظفار..."

(بخاری، کتاب الصلوٰة، باب اتباع النساء الجنائز؛ کتاب الحیض، باب الطیب للمرأة الخ؛ فتح الباری، ۱/۵۳۶-۵۳۷: عود ہندی یمن کے علاقہ ظفار سے لے جائی جاتی تھی۔ مسلم وغیرہ کی روایت میں لفظ قسط ہی ہے۔ وہ بدبو دور کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی؛ مصباح اللغات میں قسط کے معنی عود ہندی دیے ہیں مگر بخاری لفظ "کست" نہیں شامل کیا ہے۔ وہ پھر عود اظفار/یمنی ہی کہلانا چاہیے؛ بعض روایات میں مشک کی ایک ڈلی یا ٹکیہ "قرصة من مسك" استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے؛ حدیث بخاری: ۳۱۴)

سوگ کے خاتمہ پر بھی خواتین عصر کسی قدر غازہ، خوشبو وغیرہ کا استعمال کرتی تھیں تا کہ اس کا اعلان عام ہو جائے:

- دو امہات المومنین حضرت زینب بنت جحش اسدی خزیمی اور حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان امویؓ نے بالترتیب اپنے بھائی اور والد کی وفات پر سوگ کی سہ روزہ مدت ختم ہونے پر ہاتھوں، بازوؤں وغیرہ پر غازہ ملا تھا اور خوشبو لگائی تھی تا کہ سب کو معلوم ہو جائے اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہ تھی لیکن صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہم سوگ نہیں منا رہے ہیں یہ خوشبو استعمال کی ہے، جب کہ بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن کی سوگ کی مدت مقرر تھی اور وہ اس کے خاتمے پر اسی طرح خوشبو، آرائش وغیرہ کر کے اظہار کرتی تھی۔ حضرت ام حبیبہؓ نے اپنی باندی سے خلوق وغیرہ کی زردی یا خوشبو استعمال کروائی تھی جس نے ان کے مشام جاں کو معطر کیا تھا اور خود انھوں نے اپنے دونوں رخساروں پر لگایا تھا۔

(بخاری، کتاب الطلاق، باب تحد المتوفی عنها زوجها؛ ابوداؤد، باب احداد المتوفی عنها زوجها: حدیث: ۲۲۹۹؛ موطا، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الاحداد: حضرت ام حبیبہؓ کی خوشبو کے بارے میں صراحت ہے: "بطیب فیه صفـــــرة خلوق او غیره فدهنت به جاریة ثم مسحت بعارضیها" ترمذی، ابواب الطلاق، باب ماجاء فی عدة المتوفی عنها زوجها میں موطا کے الفاظ حرف بہ حرف ہیں؛ مسلم، کتاب الطلاق، باب انقضاء عدة الخ)

- حضرت ام سلمہؓ اپنے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کی وفات پر سوگ میں تھیں مگر انھوں نے اپنی دونوں آنکھوں میں سرمہ (صَبِر) لگالیا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو اسے دیکھ کر ہدایت کی کہ رات میں تو لگالیا کریں مگر دن میں اسے صاف کر دیا کریں: "... وهی حاد علی ابی سلمة، وقد جعلت علی عینها صبراً. فقال: ما هذا یا ام سلمه؟ فقالت: انما هو صبر:... الخ" انھیں کی ایک اور روایت ہے کہ سوگ کرنے والی خاتون اپنے سر کو بیری اور تیل سے استوار کر سکتی ہے: "تجمع الحاد راسها بالسدر و الزیت"۔ سیوطی نے امام ابوداؤد کے حوالے سے یہ اضافہ کیا ہے کہ خوشبو اور حنا سے اس کی آرائش کرنا ممنوع ہے کہ وہ خضاب ہے لیکن بیری سے سر دھونے کی اجازت ہے مگر اسے ڈھانکے رکھنے کی بھی ہدایت ہے۔

(موطا، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الاحداد؛ تنویر، ۲/۱۱۲؛ مسلم، مذکورہ بالا؛ ابوداؤد، کتاب الطلاق،

باب فیما تجتنب المعتدۃ فی عدتھا؛ حدیث:۲۳۰۵)

-حضرت سُبیعہ بنت حارثؓ کے شوہر حضرت سعد بن خولہؓ کا حجۃ الوداع کے موقع
انتقال ہو گیا۔اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ان کی وفات کے کچھ دنوں بعد بچے کی ولادت ہو گئی
جب نفاس سے فراغت ہو گئی تو انھوں نے پیغام دینے والوں کے لیے آرائش اور زیب وزین
کی: "فلما تعلت من نفاسھا تجمّلت للخطّاب"۔ وہ دراصل نکاحِ ثانی کی امیدوار تھیں
ان کے عمل کی تائید رسولِ اکرم ﷺ نے فرمادی کہ ایسی بیوہ کی مدت سوگ وعدت چار ماہ د
دن نہیں بلکہ وضعِ حمل ہے۔دوسرا خیال بعض صحابہ کرام کا تھا جو صحیح نہ تھا۔
(بخاری، کتاب الطلاق، باب بلا عنوان ؛ترمذی،ابواب الطلاق، باب فی الحامل المتوفی ع
زوجھا تصنع)

خوشبو کے نقطہ نظر سے اس حدیث میں یہ زاویہ بہت اہم ہے کہ خواتین پیغام دینے والو
کی خاطر یا پیغام کے وقت خوشبو اور غازے کا استعمال کرتی تھیں۔اس حدیث میں صرف خو
لگانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ تجمّل اور تزئین وآرائش کرنے کا ذکر ہے۔

خوشبو لگا کر نکلنے کی ممانعت

خواتین کو خوشبو لگا کر بالخصوص جس کی تیز بو ہو اور پھیلتی ہو گھروں سے باہر نکلنے حتی کہ مس
میں نماز کے لیے جانے کی بھی ممانعت کردی گئی تھی۔اس معنی ومفہوم کی متعدد احادیث کتبِ حدی
میں موجود ہیں:

– زینب الثقفیۃ: ..اذا شھدت احداکن العشاء فلا تطیب تلک اللیلۃ.

– امرأۃ عبداللہ : ...اذا شھدت احداکن المسجد فلا تمسّ طیبا.

– عن ابی ھریرۃ: ایما امرۃ اصابت بخورا فلا تشھد معنا العشاء الآخرۃ.

مسلم کی یہ چند احادیث ہیں۔ان کے علاوہ اس معنی کی متعدد دوسری احادیث ملتی ہیں
ان سب کا مقصود یہ ہے کہ عورتیں تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلا کریں کیونکہ اس کی مہک سے لوگوں
نگاہیں بلاوجہ اٹھیں گی اور وہ عفتِ نگاہ کے بھی خلاف ہیں اور عفتِ خواتین کے بھی منافی ہیں۔
(مسلم،کتاب الصلاۃ؛ باب خروج النساء الی المساجد؛ابن ماجہ،کتاب الفتن، باب فتنۃ النسا

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے مُزینہ کی ایک خاتون کو ہار سنگھار اور آرائش کر کے مسجد میں آنے سے روکا تھا۔ اور بعض روایات کے مطابق بنو اسرائیل کی عورتوں پر سخت سنگھار اور مسجدوں میں تبختر و فخر و ناز سے آنے کے سبب عذاب بھی آیا تھا۔

-جن احادیث و روایات میں عورتوں کی خوشبو کے لیے بلا بو اور بارنگ ہونے کا ذکر ہے اور مردوں کے لیے اس کے برعکس، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ خواتین ایسی خوشبوئیں استعمال کریں تو باہر نہ نکلیں۔ اور مردوں کے لیے رنگ زیب بے جا کی بنا پر ممنوع ہے۔

-ان تمام احادیث و روایات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں تو وہ جو خوشبو چاہیں استعمال کریں۔ مسلم کی احادیث سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ خوشبو منع نہیں ہے بلکہ تیز خوشبو کے سبب لوگوں کے لیے باہر نکل کر فتنہ پیدا کرنا ممنوع ہے۔

مکانات و مساجد کی خوشبو

عام مساکن یا خاص عبادت الٰہی کے خانہ ہائے گراں مایہ، مساجد ہوں یا دوسرے معابد، ان کو خوشبو سے بسانے کا طریقہ ہمیشہ اور ہر تمدن میں رہا ہے۔ خانہ کعبہ کی تطہیر کے حکم الٰہی میں اس کو خوشبوؤں میں بسانے کا حکم مضمر ہے اور مساجد کو خوشبو سے بسانے اور معطر کرنے کا حکم تو احادیث میں موجود ہے اور اس پر عمل صحابہ کرام بھی ہے اور سنت نبوی بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عبادت گاہوں کو خوشبو سے بسانے کا آغاز ایک برآمدی یا تمدنی لین دین کے طریقہ سے ہوا۔ ان دونوں کا مختصر ترین ذکر درج ذیل ہے:

-حضرت تمیم داریؓ نے شامی معبدوں سے یہ طریقہ اخذ کیا اور پہلی بار مسجد نبوی کو خوشبو/بخور سے معطر کیا اور رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو دعا دی۔

-حدیث ابن ماجہ: ۲۵۸-۲۵۹ میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے گھروں میں مساجد بنانے اور پاک وصاف رکھنے اور خوشبو سے معطر کرنے کا حکم دیا تھا: "...وان تطهر وتطيب" (باب تطهير المساجد وتطييبها)

-حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے قبلۂ مسجد میں تھوک دیکھا تو غصہ

سے سرخ ہو گئے۔ایک انصاری عورت نے اسے صاف کر کے اس کی جگہ خلوق کی خوشبو لگا دی: "...وجعلت مکانه خلوقا..." آپ ﷺ نے ان کی تعریف فرمائی۔(حدیث ابن ماجہ:۲۶۲۷)

عَطار/عطارہ

عطر فروش کو عطار کہا جاتا ہے اور اس کے پیشۂ عطر فروشی کو "العطارۃ" کہا جاتا ہے (مصباح اللغات)۔لغوی معنی کی تصدیق گذشتہ حدیثِ مسلم:۸۰(۲۲۲۹)وغیرہ سے بھی ہوتی ہے جس میں عطار کی صندوقچی:"خزنة عطار" کا حوالہ موجود ہے۔ان دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں عطر فروش طبقہ کا وجود تھا اور عطر سازی کی صنعت و حرفت بھی تھی۔ان دونوں کا تعلق اگرچہ تجارت و صنعت کے باب سے زیادہ ہے تاہم خوشبوؤں اور عطریات کے حوالے سے اس کا مختصر ذکر اس فصل کے آخر میں کیا جاتا ہے۔اس میں بھی بعض دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں جو عہد نبوی کی سماجی زندگی اور تمدنی کارگذاری کو چار چاند لگاتے ہیں۔

عطریات اور خوشبوؤں کی دو قسمیں ملتی ہیں: ایک وہ عمدہ عطر اور خوشبو ہوتے تھے جو یمن سے بالخصوص اور دوسرے دیار و امصار سے درآمد کیے جاتے تھے، اور دوسری قسم ان مقامی خوشبوؤں -خلوق وغیرہ- کی تھی جو خواتین عصر یا عطارانِ قوم خود بنا لیتے تھے، یہ مقامی صنعتیں تھیں۔ان کے ضمن میں ایک دوسری اہم حقیقت یہ ملتی ہے کہ غیر ملکوں یا دور دراز کے علاقوں سے خوشبوؤں کی برآمدی تجارت اور غالباً دوسری مقامی تجارت بھی مرد تاجروں کے ہاتھ میں تھی اور وہ خاصی مقبول اور مفید تجارت تھی کہ سب سے زیادہ منافع لانے والی اقسام میں شمار ہوتی تھی مگر مقامی عطر فروشی کا کام یا کاروبار بیشتر خواتین کرتی تھیں اور مدینہ منورہ کی بعض "عطارہ" بہت مشہور تھیں۔

-مدینہ منور کی ایک انصاری خاتون حضرت حولاء تھیں۔وہ ایسی عطر فروش خاتونِ شہر تھیں کہ "العطارہ" کے لقب سے ہی مشہور ہو گئی تھیں۔وہ دوسرے گھروں کے علاوہ خانہ نبوی میں بھی آتی تھیں اور ازواج مطہرات کے ہاتھ عطر فروخت کرتی تھیں۔رسولِ اکرم ﷺ ان کو دروازے پر قدم رکھتے ہی پہچان لیتے تھے۔

(اسد الغابہ،۵/۴۳۲-۴۳۳؛ نیز رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین-ایک سماجی مطالعہ)

- حضرت مُلیکہ، والدۂ حضرت سائب بن اقرع ثقفیؓ بھی عطر فروشی کرتی تھیں اور ان کے فرزند یمن سے ان کے لیے عطر بھیجا کرتے تھے۔ وہ ازواج مطہرات اور دوسری خواتین کے گھروں میں جاتی تھیں اور عطر/ خوشبو بیچتی تھیں۔ (اسد الغابہ، ۵/ ۵۴۹)

- سب سے اہم عطر فروش حضرت اسماء بنت مخربہ ثقفیؓ تھیں کہ وہ مشہور سردار ابو جہل مخزومی کی ماں تھیں۔ ان کے دوسرے فرزند بھی ان کے لیے یمن سے عطریات بھیجا کرتے تھے جن کو وہ گھر گھر جا کر بیچا کرتی تھیں۔ (اسد الغابہ، ۵/ ۴۵۲؛ بلاذری، ۱/ ۲۹۸-۲۹۹ وغیرہ)

- ان کے علاوہ بھی دوسری عطارائیں تھیں اور عطار بھی تھے جن کا ذکر عہد نبوی کی تجارت میں ملے گا۔ بہرحال ان سے عطریات فروش کے نسوانی طبقہ کی کارگذاری کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح مشاطہ کا ایک خاص طبقۂ نسواں تھا جو خواتین بالخصوص دلہنوں کی زیب و آرائش کا کام خاص احوال شادی بیاہ کے علاوہ عام دنوں میں بھی کرتا تھا۔ احادیث و روایات میں ماشطہ/ مشاطہ کا ذکر ملتا ہے جیسے حضرت عائشہ کی شادی کے واقعہ میں آتا ہے، ان سے قبل اولین ام المومنین حضرت خدیجہ کی بھی ایک ماشطہ تھیں۔ (رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین-۵۴ وغیرہ)

✪✪✪

زیورات

آرائش وزیبائش کا ایک طریقہ زیورات سے جسم و بدن اور اس کے اعضاء و جوارح کو آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔ زیورات سے دھیان بالعموم عورتوں کی طرف جاتا ہے کہ زیور انھیں کا سنگھار سمجھا جاتا ہے اور مردوں کے لیے اب وہ بالعموم عار مانا جاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی تمام تہذیبوں اور ان کے معاشروں میں زیورات مرد و زن اور بچوں بچیوں سب کے لیے ایک ضروری سنگھار سمجھے جاتے تھے۔ عرب جاہلی کے مختلف ادوار میں اور اسلامی محمدی تہذیب سے قبل دوسری اسلامی تہذیبوں میں بھی مرد و عورت دونوں زیورات استعمال کرتے تھے۔ شریعت محمدی نے دوسرے سماجی میدانوں اور تہذیبی و تمدنی علاقوں کی طرح زیورات کے باب میں بھی تکمیلی احکام و حدود مقرر فرمائے۔ قرآن مجید کی مختلف آیات کریمہ میں زیورات کا ذکر بطور انعام الٰہی ملتا ہے اور گذشتہ قوموں کے حوالے سے بھی: نحل-۱۴ اور فاطر-۱۲ میں سمندر و دریا سے حلیہ (زیور) نکالنے اور ان کے پہننے کا ذکر ہے: "وتستخرجوا منه حلية تلبسونها"؛ رعد-۱۷ میں زیور کی تلاش میں آگ جلانے یعنی زیور گڑھنے کا حوالہ ہے؛ اعراف-۱۴۸ میں قومِ موسیٰ کے زیورات سے بچھڑا بنا لینے کا واقعہ درج ہے۔ یہ تمام آیات کریمہ ان زیورات کے آفاقی استعمال کو بتاتی ہیں اور احادیث میں ان کے حوالوں کا ذکر آگے آتا ہے۔

زیورات کو محدثین کرام میں سے متعدد محققین و اکابر نے کتاب اللباس ہی کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ گویا وہ ملبوسات ہی کی ایک قسم ہیں۔ عام طور سے سونے اور چاندی کے زیورات استعمال ہوتے تھے اور وہی اصلی زیور سمجھے جاتے تھے کہ سونا چاندی ہی بنیادی "ثمن" ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ان کی ایک اقتصادی نوعیت و اہمیت بھی تھی کہ جب چاہا یا ضرورت ہوئی ان کو فروخت کر کے دوسری ضرورتیں پوری کی جاسکتی تھیں۔ وہ ایک طریقہ سے سکے بھی تھے بلکہ

سکۂ رائج الوقت۔ مختلف قیمتی پتھروں اور مونگوں وغیرہ کے زیورات بھی بنائے جاتے تھے اور استعمال کیے جاتے تھے۔ اسی طرح اعضا و جوارح میں سے مختلف کے لیے الگ الگ زیورات ہوتے تھے۔ ان میں مردوں کے بعض اعضاء کے زیورات ہوتے تھے۔ ان کا استعمال عام بھی تھا اور خاص بھی: یعنی روز مرّہ کے زیورات ہوتے تھے جو مرد و زن روزانہ بلکہ ہمہ وقت پہنتے اور استعمال کیا کرتے تھے۔ خاص استعمال یہ تھا کہ شادی بیاہ، سفر و سیاحت اور دوسری تقریبات پر عام معمولات کے برخلاف زیادہ اہتمام ان کے پہننے میں کیا جاتا تھا۔

(بخاری، کتاب اللباس، میں ابواب الحلی کی جگہ مختلف زیورات کے ابواب ہیں جیسے المزور بالذهب، خواتیم الذهب (متعدد ابواب خاتم)، القلائد، القرط وغیرہ؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۸۷-۴۰۸؛ ان کے علاوہ دوسری کتب کے ابواب میں بھی ان کا متفرق ذکر ملتا ہے؛ صحیح مسلم میں کتاب اللباس والزينة ہے اور نسائی میں خاص کتاب الزينة)

ان تمام جزئیاتِ مبحث کو مختلف طریقوں سے زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے۔ مکی عہد میں جاہلی عہد سے اسلامی دور تک اور پھر مدنی حیاتِ طیبہ کے زمانے تک ان کا تاریخی مطالعہ کیا جا سکتا ہے مگر اس میں تکرار و اطناب کا شدید خطرہ ہے۔ لہٰذا بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے زیورات کو دو الگ خانوں میں مطالعہ کیا جائے اور ان میں بھی زیور بہ زیور یعنی مختلف زیورات کے حوالے سے بحث ہو۔ ان میں ایک موضوعی ترتیب و تنظیم یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ مختلف اعضاء و جوارح جیسے انگلیوں، دست و بازو، پیروں اور پنڈلیوں اور کانوں، سر اور گردن کے زیورات کو ایک ترتیب سے زیرِ بحث لایا جائے۔ اور حسبِ معمول نبوی زیور سے بحث کا آغاز کیا جائے۔

بابِ خاتم

رسولِ اکرم ﷺ کی خاتم مبارک کا ذکر اور اس کے متعلق روایات اور واقعات بہت معروف و مشہور ہیں۔ محدثین کرام نے اسی بنا پر خاتم (انگوٹھی) سے متعلق متعدد ابواب قائم کیے ہیں۔ ان میں مختلف طبقاتِ مرد و زن کے زیورات بالخصوص خاتم/خواتیم کا بہت مفصل بیان ملتا ہے۔ بخاری میں زیورات کا وسیع تر باب اسی سے شروع ہوتا ہے اور دوسری کتبِ حدیث میں بھی اسی کو نقطۂ آغاز بنایا گیا ہے لہٰذا ہم بھی اسی سے آغاز کرتے ہیں۔

خاتمِ نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں یہ خیال کہ زیور کا استعمال فرماتے تھے خاصا خام ہی نہیں، بلکہ سوئے ظن بھی معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ رسولِ اکرم ﷺ کو اپنے مردانہ حسن و جمال اورنبوی جلال و جبروت کے لیے زیور جیسی ادنیٰ چیزوں سے آراستگی کی حاجت نہ تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک کی ایک انگلی میں انگوٹھی ضرور ہی پہنی، خواہ اس کا مقصد زیب وزینت کی بجائے نبوی فریضہ کی ادائیگی ہو۔ صحابہ کرام اوران کے بعد دوسرے مردوں کے لیے اسی خاتمِ نبوی سے انگوٹھیاں پہننے کا جواز عطا ہوا اوران کا استعمال عام بھی ہوا تھا۔ محدثینِ کرام نے خاص اس سنتِ نبوی اور عملِ محمدی کے لیے اپنی اپنی کتبِ حدیث میں خاص ابواب باندھے ہیں اوران میں احادیث نقل کی ہیں۔

امام بخاریؒ نے خاتمِ نبوی سے متعلق متعدد ابواب باندھے ہیں: ایک طلائی انگوٹھی (خواتیم الذهب) پر ہے، دوسرا نقرئی انگوٹھی (خاتم الفضة) پر، اسی کا ایک ضمیمہ باب بلاعنوان ہے اورایک باب انگوٹھی کے نگینہ (فص الخاتم) پر ہے۔ موخرالذکر کے سوا سب میں تین چار مسائل وامور سے بحث کی ہے، ان کے علاوہ بھی متعدد ابواب ہیں جن کا ذکر مسائل کے ساتھ آتا ہے۔

۱- رسولِ اکرم ﷺ سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے: ''كان رسول الله ﷺ يلبس خاتما من ذهب'' ۔حدیث: ۵۸۶۷، یا رسولِ اکرم ﷺ نے طلائی انگشتری پہنی یا بنوائی: ''اتخذ خاتما من ذهب وجعل فصه مما يلي كفه...'' حدیث: ۵۸۶۵ واطراف۔

۲- صحابہ کرام نے سنتِ نبوی سمجھ کر سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں: ''فاتخذه الناس...'' حدیث: ۵۸۶۵ وغیرہ۔

۳- رسولِ اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کے عمل کو دیکھ کر سونے کی انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور چاندی کی بنوالی اورصحابہ کرام نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں بنوالیں اورسونے کی پھینک دیں: ''...فلما راهم قد اتخذوا رمىٰ به ... ثم اتخذ خاتما من فضة فاتخذ

الناس خواتیم الفضۃ ...'' حدیث: ۵۸۶۶۔

۴- رسولِ اکرم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت بھی فرمادی اور بنفس نفیس پھر تازندگی نہیں پہنی: ''نھی عن خاتم الذھب - او قال - حلقۃ الذھب / نھی عن خاتم الذھب''- حدیث: ۵۸۶۳-۵۸۶۴۔

محدثین وشارحین کرام نے آخری حدیث سے سونے کی انگوٹھی کے پہننے کی حرمت ثابت کی ہے اور عام ہدایتِ نبوی سے بھی کہ سونا مردوں کے لیے ممنوع وحرام ہے۔ دوسرے محدثینِ کرام کے ہاں بھی نبوی انگشتری کے باب میں کم وبیش اسی قسم کی احادیث وروایات پائی جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں مزید معلومات حدیثِ بخاری: ۵۸۶۶ کے علاوہ دوسری احادیث میں بھی ہیں جو یہ ہیں:

- نگینۂ خاتم پر محمد رسول اللہ لکھا گیا تھا / نقش تھا۔ اور الفاظ بالترتیب اوپر اٹھتے گئے تھے: ''محمد رسول اللہ'' - حدیث: ۵۸۶۶ وغیرہ، حدیث: ۵۸۷۸: ''و کان نقش الخاتم ثلاثۃ اسطر: محمد سطر، ورسول سطر، واللہ سطر''؛ فتح الباری، ۱۰/ ۴۰۴۔

- نگینہ چاندی کا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ اپنی ہتھیلی کی جانب رکھا کرتے تھے: ''کان خاتمہ من فضۃ و کان فصہ منہ'' حدیث: ۵۸۷۰، وجعل فصہ ممایلی کفہ''۔ حدیث: ۵۸۶۵ وغیرہ؛ ''باب من جعل فص الخاتم فی بطن کفہ''؛ فتح الباری، ۱۰/ ۴۰۰-۴۰۱۔

- انگوٹھی بنیادی طور سے نبوی خاتم اور سرکاری مہر تھی جس سے خطوط وفرامین پر مہر لگائی جاتی تھی: ''باب اتخاذ الخاتم لیختم بہ الشیٔ، او لیکتب بہ الی اھل الکتاب وغیرھم''؛ فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۹-۴۰۰۔

- اس کے بنانے کا پس منظر یہ تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے جب سلاطینِ عالم کو فرامین بھیجنے کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام میں سے کسی صاحب بصیرت نے مشورہ دیا کہ سلاطین وفرمانروا بلا مہر خطوط قبول نہیں کرتے لہٰذا آپ ﷺ نے خاتمِ نبوی بنوائی: ''ان النبی ﷺ اراد ان یکتب الی رھط - او اناس - من الاعاجم فقیل لہ: انھم لا یقبلون کتابا الا علیہ خاتم، فاتخذ النبی ﷺ من فضۃ الخ'' حدیث: ۵۸۷۲-۵۸۷۵ وغیرہ۔

-بعض روایاتِ حدیث وسیرت سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ہمہ وقت اسے پہنے نہیں رہتے تھے۔ اور جب پہنتے تھے تو چھوٹی انگلی میں پہنتے تھے: "باب الخاتم فی الخنصر"۔ حدیث: ۵۸۷۴ اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے: "فی یدہ الیمنی": حدیث: ۵۸۷۶۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے متعدد علماء وشارحین کے افکار ونظریات بیان کر کے دونوں میں تطبیق بھی دی ہے۔ ۱۰/ ۴۰۱-۴۰۳: اسی طرح متعدد صحابہ کے بارے میں بحث ہے کہ بعض دائیں ہاتھ کی چھنگلی میں پہنتے تھے اور بعض بائیں ہاتھ کی۔

-صحابہ کرام میں حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسیؓ افسرِ خاتم تھے کہ سرکاری انگوٹھی ان کی تحویل میں رہا کرتی تھی: "... وکان معیقیب علی خاتم النبی ﷺ یعنی کان امینا علیہ فیحمل علی التعدد..." فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۶: بحوالہ ابوداؤد ونسائی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں انھیں کے ہاتھ سے وہ کنوئیں میں گری تھی: "وھو الذی سقط من معیقیب فی بئر اریس"۔ فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۳ بحوالہ نسائی ومسلم۔

-حضرت بلال بن رباحؓ بھی اسے اپنے پاس رکھا کرتے تھے کہ وہ موذنِ نبوی سے زیادہ امین وخازن نبوی بھی تھے لیکن غالباً حضرت بلالؓ کی تحویل میں وہ کبھی کبھی رہتی تھی کہ اصل افسر حضرت معیقیبؓ تھے۔

- رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد وہ خاتم نبوی حضرات خلفائے ثلاثہ - ابوبکر وعمر وعثمانؓ - نے یکے بعد دیگرے استعمال فرمائی اور بطور سرکاری مہر استعمال کی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری برس وہ ان کی انگلی سے پھسل کر بئر اریس میں گر گئی اور پھر کبھی نہ ملی: "فلبس الخاتم بعد النبی ﷺ ابوبکر، ثم عمر، ثم عثمان، حتی وقع من عثمان فی بئر اریس"۔ حدیث: ۵۸۶۶، فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۳ میں بعض روایات حدیث - نسائی وغیرہ - کے مطابق وہ خلافتِ عثمانی کے چھٹے سال کنوئیں میں جا گری تھی۔ یہ توقیت صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے اس کے گرنے کا واقعہ احادیث مسلم ونسائی اور بحث حافظ ابن حجر عسقلانیؒ سے مسترد ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ مزید تحقیق طلب مسئلہ ہے کہ خاتم نبوی کس کے ہاتھ سے اریس کے کنوئیں میں جا گری تھی اور اس کا ضیاع خلافت راشدہ کے زوال کا نشان بن گیا۔

بمتعدد مورخین اور محدثین کے علاوہ علماء کرام نے اس علامتِ خلافتِ نبوت پر بحث کی ہے جن میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ اہم ترین ہیں۔

صحابہ کرام کی انگوٹھیاں

خاتم نبوی سے متعلق متعدد ابوابِ بخاری اور ان کی متعدد روایات و احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام بھی انگوٹھی پہنتے تھے۔ پہلے انھوں نے طلائی خاتمِ نبوی دیکھ کر طلائی انگشتریاں بنوائیں، رسولِ اکرم ﷺ کے طلائی خاتم پھینک دینے کے بعد انھوں نے بھی ان کو تج دیا اور پھر خاتمِ نبوی کی مانند نقرئی انگشتریاں بنوائیں اور اپنی اپنی انگلیوں میں پہنیں۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام نے سرکاری مقصد سے نہیں بنوائی تھیں۔ حضرات خلفائے ثلاثہ نے ہی اس مقصد سے اسے پہنا تھا اور وہ بھی خاتمِ نبوی ہی کو پہنا تھا جو ان کو بطور خلیفہ وراثتِ نبوی میں ملی تھی۔ بقیہ صحابہ کرامؓ نے صرف اس لیے انگوٹھیاں بنوالی تھیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی انگوٹھی بنوائی اور پہنی تھی۔ وہ سب کی سب چاندی کی تھیں۔

ان روایات و احادیث سے یہ التباس ہوتا ہے کہ خاتمِ نبوی بنوانے اور استعمال کرنے سے قبل مَردوں کے انگوٹھی پہننے کا رواج نہ تھا۔ یہ التباس یا یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔ متعدد روایاتِ سیرت وسوانح اور احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام پہلے سے طلائی یا نقرئی انگوٹھیاں پہنتے چلے آرہے تھے بلکہ بعض حضرات تو لوہے وغیرہ دوسری دھاتوں کی انگوٹھیاں پہنتے تھے جن کی ممانعت کی گئی۔ سونے کی انگوٹھی کے پھینک دینے اور اس کے استعمال کی ممانعت کی روایات سے ایک دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صحابہ کرام بالخصوص اور دوسرے اکابر اسلام اور اشخاصِ عرب سونے کی انگوٹھی بالکل استعمال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی ممانعت بطور حرمت آگئی تھی۔ یہ بھی محلِ نظر ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۳-۳۹۵ میں اس مسئلہ پر مفصل بحث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے کیوں طلائی انگوٹھی پھینکی اور کیوں نقرئی انگوٹھی پہنی۔ دوسرے مسئلہ پر فتح الباری ہی کے حوالے سے مفصل بحث آرہی ہے)

احادیث و روایات اور محدثین و شارحین کی تصریحات سے دوسری صورتِ حال نظر آتی۔

ہے۔ مختلف اکابرِ عرب کے علاوہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں صحیح روایات اور معتبر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بعد کی زندگی میں بھی سونے کی انگوٹھیاں پہنی تھیں اور بعض اکابرِ صحابہ کے اعتراض ونقد کے باوجود پہنی تھیں۔ مسئلہ ان کی حرمت کا ہے یا کراہت کا، اور کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں خاصی مفصل بحث کی ہے اور دوسرے بزرگوں نے بھی۔ ان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بحث بڑی حکیمانہ ہے۔ ان تمام مباحث سے قبل بعض روایات واحادیث صحابہ کرام کی سونے کی انگوٹھیوں کی:

- حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے بارے میں روایات آتی ہیں کہ وہ طلائی انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ ان میں حضرات سعد بن ابی وقاص زہری، طلحہ بن عبیداللہ تیمی اور صہیب بن سنان رومیؓ کے اسماءِ گرامی کے علاوہ چھ یا سات کا ذکر ہے: "وقد جاء عن جماعة من الصحابة لبس خاتم الذهب ... انه رای علیٰ سعد بن ابی وقاص وطلحة بن عبید الله و صهیب و ذکر ستة او سبعة..." ۔حضرت ابواسیدؓ کے ہاتھ سے ایک طلائی انگوٹھی اتارنے یا چھیننے کا ذکر ملتا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ جناب ابوالسفر نے کہا کہ میں نے حضرت البراء بن عازبؓ کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ شعبہ نے بھی ابواسحاق سے یہی روایت کی ہے۔ ان کے علاوہ امام بغوی نے "الجعدیات" میں اور امام احمد نے محمد بن مالک کی سند سے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت البراء کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی: "رایت علی البراء خاتما من ذهب"۔ حضرت براءؓ اس لیے اسے پہنتے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو پہنائی تھی۔ جب لوگ حضرت براء سے یہ کہتے کہ آپ سونے کی انگوٹھی کیوں پہنتے ہیں جب کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس کی ممانعت کی ہے تو وہ فرماتے تھے: تم لوگ مجھے اس چیز کو اتارنے کا حکم کیونکر دیتے ہو جب کہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے پہنایا ہے: "کان الناس یقولون للبراء: لم تتختم بالذهب وقد نهیٰ عنه رسول الله ﷺ؟ فیذکر لهم هذا الحدیث ثم یقول: کیف تامروننی ان أضع ماقال رسول الله ﷺ: البس ماکساک الله ورسوله"۔ اسی طرح حضرت خباب بن ارت تمیمیؓ کے بارے میں ایک حدیث آتی ہے کہ وہ سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ عہدِ نبوی کے بعد کسی وقت حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ نے ان سے فرمایا: کیا اس انگوٹھی کے اتارنے اور پھینکنے کا وقت نہیں آیا تو انھوں نے فرمایا کہ آج کے بعد آپ اسے نہیں دیکھیں گے:"وکذا ماروی فیه عن خباب وقد قال له ابن مسعود: اَمَا آن لهٰذا الخاتم ان یُلقیٰ ؟ فقال: انک لن تراه علیّ بعد الیوم".

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۰-۳۹۱)

حافظ ابن حجرؒ نے ان تمام مثالوں کے بارے میں دو طرح کی تاویلات کی ہیں: اول یہ کہ ان صحابہ کرام کو رسولِ اکرم ﷺ کی سونے کی انگشتری پہننے کی ممانعت کی خبر نہیں پہونچی تھی اور جب ان کو رسولِ اکرم ﷺ کی نہی پہونچی تو انھوں نے انگشتریاں اتار دیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے عجیب وغریب بات یہ ہے کہ حضرت البراء بن عازبؓ نے خود ممانعت کی روایات بیان کی ہیں مگر وہ خود بعض صحیح روایات کے مطابق سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ حافظ موصوف نے امام حازمی کے اس خیال پر کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو خصوصیت سے جو طلائی انگشتری پہنائی تھی اس کا حکم ممانعت کی احادیث کے بعد منسوخ ہوگیا پر سخت نقد کیا ہے۔ اگر حضرت براء بن عازبؓ کے نزدیک نسخ ثابت ہوتا تو وہ رسولِ اکرم ﷺ کے بعد اسے ہرگز نہ پہنتے جب کہ ان سے ممانعت کی مروی حدیث متفق علیہ ہے۔ لہٰذا ان کی روایت اور ان کے فعل کے درمیان جمع وتطبیق کی صورت یہ ہے کہ یا تو حضرت موصوف نے اس ممانعت کے حکم کو تنزیہی کراہت پر محمول کیا یا رسولِ اکرم ﷺ کے ارشادِ مبارک کو اپنے لیے ایک خصوصی حکم وارشاد سمجھا: اور امام حازمی پر نقد کرکے پھر ان صحابی موصوف کی توجیہ اور لوگوں کے اعتراض کے جواب میں ان کا موقف نقل کیا ہے جس کا ذکر اوپر آیا:"..قلت: لو ثبت النسخ عندالبراء مالبسه بعد النبی ﷺ، وقد روی حدیث النهی المتفق علیٰ صحته عنه. فالجمع بین روایته وفعله إما ان یکون حمله علی التنزیه او فهم الخصوصیة له من قوله: "البس ما کساک الله ورسوله"، وهذا اولیٰ من قول الحازمی: لعل البراء لم یبلغه النهی، ویؤید الاحتمال الثانی انه وقع فی روایة احمد..."

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۰-۳۹۱؛ صحابہ کرام کے بارے میں ایسی مشہور احادیث نہ پہونچنے کا نظریۂ شارحین بہت عجیب وغریب ہے۔ یہ تسلیم کہ تمام احادیث وروایات سب کو نہیں پہونچی تھیں اور بعض اکابر کو کسی خاص مسئلہ پر

حدیث نہیں ملی تھی مگر ایسے مشہور واقعات و مسائل کے بارے میں یہ نظریہ نا قابلِ تسلیم ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے البتہ ایک نکتہ یہاں یہ بیان کیا جا سکتا کہ احادیث نہ پہونچنے کا نظریہ خالص قیاسی ہے)

متعدد روایاتِ سیرت و سوانح میں بھی بعض صحابہ کرام اور تابعین وغیرہ کے سونے کی انگوٹھیوں کے پہننے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے اس فعل پر اکابر صحابہ یا خلفائے وقت یا بعض دوسرے لوگوں نے اعتراض کیا تھا یا انھیں اتارنے کا حکم دیا تھا۔

- حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے تو سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: کیا تم سونا پہنتے ہو؟ انھوں نے اس کو اتار کر پھینک دیا۔ دوسرے دن صحابی موصوف لوہے کی انگوٹھی پہن کر وارد ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو جہنمی لوگوں کا زیور بتایا۔ اس کے بعد وہ صحابی جلیل چاندی کی انگوٹھی پہن کر آئے اور خلیفہ گرامی خاموش رہے: ”جاء عوف بن مالک الاشجعی الیٰ عمر بن الخطاب، وعلیه خاتم من ذهب، فضرب عمر یده وقال: أتلبس الذهب؟ فرمیٰ به ... فجاء من الغدو علیه خاتم من حدید فقال: حلیة اهل النار، فجاء من الغدو علیه خاتم من ورق فسکت عنه“

(ابن سعد، ۴/ ۲۸۱۔ نیز فتح الباری، ۱۰/ ۳۹۷ و مابعد جس میں آہنی انگشتریوں کے متعدد اصحاب کے پہننے کا ذکر ہے اور ان میں سے بعض کے لیے یہی فقرہ ”حلیة اهل النار“ بھی ہے۔ نیز حدیث بخاری: ۵۸۷۱؛ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک انگوٹھی لوہے کی تھی: ”کان خاتمه من حدید“ - ابن سعد، ۳/ ۱۵۸)

- خلافتِ فاروقیؓ کے زمانے میں دو عمال فاروقی حضرات ابو موسیٰ اشعریؓ اور جناب زیاد بن ابی سفیان امویؓ حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خلیفہ گرامی نے جناب زیاد کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھ کر فرمایا: تم لوگوں نے سونے کے حلقے بنوا لیے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا کہ میری انگوٹھی تو لوہے کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: وہ تو اور گندگی یا خبیث ہے پھر فرمایا: جس کو انگوٹھی بنوانی ہی ہو تو وہ چاندی کی انگوٹھی بنوایا کرے: ”قدم ابو موسیٰ وزیاد علی عمر بن الخطاب، فرای فی ید زیاد خاتما من ذهب، فقال: اتخذتم حلق الذهب، فقال ابو موسیٰ: اما انا فخاتمی حدیدٌ، فقال عمر: ذلک انتن او أخبث... من کان منکم متختما فلیتختم بخاتم من فضة“ (ابن سعد، ۴/ ۱۱۴)

-حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ سونے کی انگوٹھی پہنا کرتے تھے: "انہ کان یلبس خاتما من ذھب"۔ (ابن سعد، ۳/۱۴۳)

-حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمیؓ زندگی بھر سونے کی انگوٹھی پہنتے رہے اور واقعۂ جمل میں جس دن شہادت پائی اس دن بھی ان کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی: "...قتل یوم الجمل وعلیہ خاتم من ذھب" (ابن سعد، ۳/۲۲۰)

-حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نجران (یمن) سے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس آیا تو سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا اور ارشاد کیا کہ تم میرے پاس اس حال میں آئے ہو کہ تمہارے ہاتھ میں آگ کی ایک چنگاری ہے: "...ان رجلا قدم من نجران الی رسول اللہ ﷺ وعلیہ خاتم من ذھب، فاعرض عنہ رسول اللہ ﷺ وقال: انک جئتنی وفی یدک جمرۃ من نار". (نسائی، کتاب الزینۃ، باب خاتم الذھب)

-مختلف روایات میں لوہے (حدید)، پیتل (صفر)، سونے (ذھب) اور چاندی (ورق / فضہ) کی مردانہ انگشتری کا ذکر آتا ہے اور ان میں سے سب کی ناپسندیدگی کا بھی برابر حوالہ آتا ہے۔ صرف چاندی کی انگوٹھی کو مردوں کے لیے مناسب گردانا گیا ہے (اسد الغابہ، ۱/۱۷۶؛ نیز مذکورہ بالا مآخذ کی روایات)۔ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو لوہے کی انگوٹھی پہنے تھا۔ آپ ﷺ نے اسے جہنمی زیور قرار دیا۔ دوسرے دن موصوف نے پیتل (صفر) کی انگوٹھی پہنی تو اسے بت پرستوں کا زیور بتایا، تیسرے دن سونے کی پہنی تو اسے بھی اہل جنت کا زیور نہیں سمجھا۔ آخر کار صحابی نے پوچھا کس چیز کی بنواؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چاندی کی اور اسے ایک مثقال سے زیادہ نہ بنوانا: "ولا تتمہ مثقالاً"

(حدیث ابوداؤد: ۴۲۲۳؛ ترمذی، باب فی خاتم الحدید وغیرہ - ایک مثقال سے کم حد چاندی کی مقرر فرمادی)

مذکورہ بالا احادیثِ بخاری وغیرہ میں مردوں کے لیے طلائی زیور یا انگشتری پہننے کی قطعی ممانعت ملتی ہے۔ لیکن بعض دوسری احادیث میں ایسی اجازت وایسا استثنا بھی بیان کیا گیا ہے جو تھوڑے سونے کی مردوں کے لیے رخصت بتاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "باب النھی عن خاتم الذھب للرجال" کے بابِ موطا کی شرح میں حضرت معاویہؓ کی ایک حدیث

نقل کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے تھوڑی مقدار میں سونا پہننے کی اجازت یا رخصت دی ہے۔ امام خطابیؒ نے حدیثِ معاویہ میں وارد لفظ/فقرہ: "الا مقطعا" کی تفسیر میں تھوڑی چیز جیسے انگوٹھی وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ اور اس کی مقدارِ کثیر کو مکروہ جانا ہے جو اہلِ اسراف کی عادت اور متکبرین اور ریا کاروں کی زینت میں شامل ہوتی ہے۔ "شیئ یسیر" یا تھوڑی چیز سے مراد وہ مقدار ہے جس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لہٰذا فقیر کے نزدیک "مقطع" ہر ایسی چیز سے عبارت ہے جیسے انگوٹھی اور دھاگے میں پروئی ہوئی چیز، مگر طلائی زنجیر اور طوق، پازیب اور کنگن اور بالی وغیرہ جیسی چیزیں جائز نہیں ہیں۔ حضرت شاہؒ کی فارسی عبارتِ مصفّٰی یہ ہے: "مترجم گوید: زیورِ طلا حرام است مطلقا بر مردمان، ورخصت دادہ شد زنان را در زیورِ زر۔ واز معاویہ مروی ست "ان رسول الله ﷺ نهىٰ عن لبس الذهب الا مقطعا"۔ خطابی تفسیر کردہ است مقطع را بچیزے اندک مانند خاتم۔ ومکروہ داشتہ است از آنچہ عادتِ اہل اسراف است وزینتِ اہل خیلاء وتکبر است، وتعبیر کردہ است چیزے اندک را بآنچہ واجب نمیشود در آن زکوٰۃ۔ ونزدِ فقیر ظاہر آنست کہ مقطع عبارت از چیزیست مانند خاتم یا چیز یکہ در ریسمان کشیدہ شود۔ واما آنچہ مثل زنجیر طلاء وطوق و خلخال وسوار وقرط باشد پس آں جائز نیست..." (مصفّٰی، ۲/۲۰۱)

حضرت شاہؒ کی عربی عبارتِ مسوّیٰ (۲/۲۰۰) بھی اس موقع پر نقل کرنی ضروری ہے تاکہ بعد میں بحث میں سہولت رہے: "قلت: وعلىٰ هذا اهل العلم ان التحلي بالذهب حرام على الرجال، واما النساء فقد رخّص لهن في حلي الذهب. وروى عن معاوية أن رسول الله ﷺ نهى عن لبس الذهب الا مقطعا". قال الخطابي: يريد بالمقطع الشيئ اليسير نحو الشنف والخاتم، وكره من ذلك الكثير الذى هو عادة اهل السرف وزينة الخيلاء والكبر. واليسير ما لا تجب فيه الزكاة. اقول: والظاهر عندى ان المقطع ما يكون كالخاتم او ينظم بالخيط. واما ما كان كالسلسلة والطوق والخلخال والسوار والقرط فلا يجوز"

(بحث کے لیے خاکسار کی کتاب "شاہ ولی اللہؒ کی خدمات حدیث)

احادیثِ استثناء و رخصت

اصلاً یہ حدیثِ رخصت ابوداؤد کی ہے جس کا متن یہ ہے: ۴۲۳۴:"حدثنا حمید بن مسعدۃ حدثنا اسماعیل اخبرنا خالد عن میمون عن ابی قلابۃ عن معاویۃ بن ابی سفیان: أن رسول اللہ ﷺ نھیٰ عن رکوب النمار وعن لُبس الذھب الا مقطعا"۔ امام ابوداؤد نے اس حدیث کو خواتین کے لیے سونے کے استعمال کے باب میں سب کے آخر میں بیان کیا ہے اور تبصرہ بھی کیا ہے کہ ابوقلابہ کی حضرت معاویہ سے ملاقات نہ تھی:"قال ابوداؤد: ابوقلابہ لم یلق معاویۃ"۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے کہ صحابی کے بعد کا راوی نہیں ہے۔ دوسرے اس باب میں تمام مذکورہ احادیث: ۴۲۳۰-۴۲۳۳ میں مطلب و مفہوم یہ ہے کہ سونا ان خواتین کے لیے بھی پسندیدہ نہیں ہے بلکہ ان کو اس کے استعمال یا طلائی زیورات کے استعمال پر عذابِ جہنم کا سامنا کرنا ہوگا اور اسی زیور کے برابر آگ کا عذاب ہوگا۔ اس باب اور اس کی احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آخر الذکر حدیث میں تھوڑی مقدار میں سونے کے استعمال کو عورتوں کے لیے بیان کیا گیا ہے نہ کہ مردوں کے لیے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان سے قبل حافظ ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ نے مردوں کے لیے اس کی اجازت کیسے حاصل کی؟

حافظ بیہقی نے السنن الکبریٰ میں دو ابواب قائم کیے ہیں: سونے کے زیورات کی حرمت: باب سیاق اخبار تدل علیٰ تحریم التحلی بالذھب؛ اور عورتوں کے لیے طلائی زیورات کی اجازت: باب سیاق اخبار تدل علیٰ اباحتہ للنساء۔ موخر الذکر میں مشہور حدیث ہے: "الحریر والذھب حرام علیٰ ذکور امتی، حل لاناثھم" (ریشم اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہیں) اور اپنے اسی خیال و فکر کے مطابق انھوں نے مردوں کے لیے سونا اور سونے کے زیورات کے قطعی حرام ہونے کا باب قائم کیا ہے: "باب تحریم تحلی الرجال بالذھب"۔

خواتین کی طلائی انگشتریاں

خواتین کے لیے اجازت و رخصت کے علاوہ انگشتریوں کے باب میں خاص اجازت و

رخصت دی گئی ہے، اور اسی بنا پر حضرات محدثین میں سے امام بخاریؒ وغیرہ نے خاص ابوابِ رخصت باندھے ہیں۔ حضرت امام بخاریؒ کے باب کا عنوان ہی معنی خیز ہے: "باب الخاتم للنساء، وكان على عائشة خواتيم الذهب" (عورتوں کے لیے انگوٹھی کا باب اور حضرت عائشہؓ کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھیاں ہوتی تھیں)۔ حافظ ابن حجرؒ نے ترجمۃ الباب کی غیر موصول روایت کو ابن سعد کے ذریعہ موصول بنایا ہے۔ اس کے مطابق حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ فرماتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ زعفران سے رنگے کپڑے اور طلائی انگوٹھیاں پہنتی تھیں: "...لقد رأيت، والله، عائشة تلبس المعصفر وتلبس خواتيم الذهب"، بحوالہ ابن سعد از طریقِ عمرو

(بخاری، کتاب اللباس، ۵۶ باب الج؛ فتح الباری، ۱۰/۴۰۶؛ واقدی، ۶۷۳ نے یہود خیبر کے حوالے سے طلائی انگوٹھیوں (خواتم ذہب) کا ذکر کیا ہے جو عام استعمالِ طلاء کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور تمدنی لحاظ سے اس کی بہت اہمیت ہو جاتی ہے)

اس حدیث اور ترجمۃ الباب سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں جن کو نکات کی شکل میں درج ذیل کیا جاتا ہے:

۱- حضرت عائشہ صدیقہؓ سونے کی ایک انگوٹھی ہی نہیں کئی انگوٹھیاں اپنے ہاتھوں میں پہنا کرتی تھیں کیونکہ دونوں جگہ جمع کا صیغہ "خواتيم الذهب" آیا ہے جو عربی قاعدے کے اعتبار سے کم از کم تین عدد کا تو متقاضی ہی ہے۔

۲- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دستِ مبارک (اور ممکن ہے کہ دونوں ہاتھوں) کی انگلیوں میں یہ طلائی انگشتریاں عہدِ نبوی کے کافی بعد دیکھی گئیں۔ ان کے بھتیجے حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ اولین اموی عہد کے شخص اور عالم وفقیہ تھے اور خود حضرت عائشہؓ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے اواخر میں ۵۸/ ۶۷۷ میں جوارِ رحمت سے پیوست ہوئیں۔

۳- لہٰذا وہ عہدِ نبوی سے خلافتِ اموی کے زمانے میں اپنی وفات تک سونے کی انگشتریاں پہنتی رہیں۔

۴- اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوسری خواتینِ عصر اور ازواجِ مطہرات بھی طلائی

انگشتریاں استعمال کرتی تھیں۔

۵- اسی قیاس کی تائید روایاتِ سیرت و سوانح سے بھی ہوتی ہے۔

فتخ / بڑی انگوٹھی

انگوٹھی کی عام قسم خاتم کہلاتی تھی جس کی جمع خواتیم آتی ہے اور جس کا ذکر مرد و خواتین دونوں کے زیور کی حیثیت سے آ چکا ہے۔ اس کی خاصی بڑی اور بھاری بھر کم قسمیں "فتخ" کہلاتی تھی جیسا کہ روایات میں آتا ہے اور لغت کے علماء بھی ایسا کہتے ہیں۔ یہ بھاری بھر کم انگوٹھیاں بالعموم خواتین ہی پہنتی تھیں۔

-حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے تو میرے ہاتھ میں چاندی کی موٹی انگشتریاں دیکھیں: "عن عائشة : دخل علیّ رسول الله ﷺ فرای فی یدی فتخات من ورق ... فقلت : صنعتهن، اتزین لک یا رسول الله ! ..."

(ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب الکنز الخ؛ حدیث:۱۵۶۵)

-رسولِ اکرم ﷺ کے مولیٰ حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ دخترِ ہبیرہ مخزومیؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں تو ان کے ہاتھ میں "فتخ" تھیں۔ حضرت ابیؓ کی کتاب میں یہی ہے اور ان سے مراد موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے ہاتھ پر ضربِ ناپسندیدگی لگائی: "...جاءت بنت هبیرة الی رسول الله ﷺ، وفی یدها فتخ، فقال کذا فی کتاب أبی: ای خواتیم ضخم، فجعل رسول الله ﷺ یضرب یدها..."

(نسائی، کتاب الزینة، باب الکراهیة للنساء فی اظهار الحلی والذهب؛ اسد الغابہ،۵/۵۶۳ میں ان کا نام ہند بنت ہبیرہؓ ہے: فتخ کو "خواتیم ضخام" بتایا گیا ہے)

-عام مسلم خواتین بھی بڑی بڑی انگوٹھیاں پہننے کی عادی تھیں اگر چہ وہ امام عبدالرزاق کے بقول جاہلی دور کی بڑی انگوٹھیاں تھیں۔ ان کا ذکر احادیثِ بخاری و مسلم میں آتا ہے جن کے مطابق خواتینِ اسلام نے رسولِ اکرم ﷺ کے وعظ پر بطور صدقہ حضرت بلال کے پھیلے ہوئے

دامن میں ڈالا تھا: "... فيلقين الفتخ والخواتيم فی ثوب بلال. قال عبدالرزاق: الفتخ: الخواتيم العظام كانت فی الجاهلية..." (بخاری، کتاب العيدين، باب موعظة الامام النساء يوم العيد؛ مزید بحث وحوالے کے لیے اگلی بحث زیورات میں عمومی حوالے کے تحت)۔ الفتخ کو دور جاہلیت کی موٹی اور ضخیم انگوٹھیاں قرار دینا اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ وہ اس زمانے سے استعمال میں چلی آرہی تھیں مگر حدیث مذکورہ بالا میں تو ان کو صحابیاتِ طاہرات نے پہنا تھا اور پھر ان کو صدقہ میں دیا تھا۔ اس لیے وہ دور جاہلی کی نشانیاں نہیں رہ گئی تھیں۔ ان کا استعمال بعد میں بھی جاری رہا۔

حافظ ابن حجرؒ نے امام عبدالرزاق کے تبصرہ وحاشیہ پر بحث میں یہ وضاحت کی ہے کہ امام موصوف نے یہ نہیں لکھا کہ وہ کس چیز میں پہنا جاتا تھا/ پہنی جاتی تھیں۔ امام ثعلب کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ پیروں کی انگلیوں میں پہنی جاتی تھیں: "انهن كن يلبسنها فی اصابع الارجل" اس لحاظ سے وہ اردو میں بچھوے/ بچھوا کا مرادف زیور تھا جسے عورتیں آج بھی پیروں کی انگلیوں میں پہنتی ہیں مگر امام اصمعی کے مطابق وہ ایسی انگوٹھیاں تھیں جن میں نگینے نہیں ہوتے تھے: "ان الفتخ الخواتيم التی لا فصوص لها" (فتح الباری، ۲/۶۰۳)۔ حافظ ابن حجرؒ نے محاکمہ نہیں کیا ہے۔ حدیث ابوداؤد: ۱۵۶۵ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فتخ کو ہاتھ میں پہننے کا زیور بتاتی ہے جن کو انھوں نے خود سے بنا کر رسولِ اکرم ﷺ کے لیے پہنا تھا۔ دوسری روایات اور احادیث میں بھی یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ ہاتھوں (الايدی - يد) میں پہنی جاتی تھیں لہٰذا ان کا انگوٹھیاں ہونا ہی صحیح ہے۔ واقدی نے خزانہ آلِ ابی الحقیق کے حوالے سے یہودِ خیبر کی بڑی انگوٹھیوں (فتخ) کا ذکر کیا ہے جس کی تشریح مرتب کتاب/ راویٔ روایت نے بڑی انگوٹھیوں سے کی ہے جو ہاتھوں اور پیروں دونوں میں پہنی جاتی تھیں: "... فتخ (خواتيم كبيرة تلبس فی الايدی والارجل"؛ واقدی، ۶۷۳)

انگوٹھی داہنے یا بائیں ہاتھ میں

متعدد روایات واحادیث سے واضح ہوتا ہے کہ انگوٹھیوں کو پہننے کا رواج تھا اور وہ لوگوں کے مذاق پر زیادہ تر منحصر تھا۔ اسی طرح ذوق اور پسند ان کو دائیں یا بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں

سے مختلف میں پہننے پر آمادہ کرتے تھے: کچھ صحابہ کرام دائیں ہاتھ کی انگلی/ انگلیوں میں پہنتے تھے اور کچھ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں۔ انگلی کا فرق بھی نظر آتا ہے: کچھ سب سے چھوٹی انگلی (خنصر) میں پہنتے تھے اور کچھ اس کے پاس والی انگلی (بنصر) میں۔ بسا اوقات یہ بھی نظر آتا ہے کہ انگوٹھی کبھی دائیں ہاتھ میں پہنی گئی اور پھر بائیں ہاتھ میں منتقل کر دی گئی یا اس کے برعکس ہوا۔ خواتینِ عصر کے بارے میں یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ وہ ایک ہاتھ کی کئی انگلیوں میں کئی انگوٹھیاں پہنتی تھیں البتہ مسلم کے باب سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی انگلی یا اس کے برابر والی انگلی میں انگوٹھی پہننے کی ممانعت کی گئی ہے: "باب النهي عن التختم في الوسطىٰ والتي تليها"۔ اس کا بھی امکان ہے کہ دونوں ہاتھوں کی ایک ایک یا ایک سے زیادہ انگلیوں میں انگوٹھیاں سجاتی ہوں جیسا کہ آج کل بھی رواج ہے۔ یہ دراصل ایک تہذیبی اور تمدنی ریت و رواج کا معاملہ ہے اور اس کا تعلق دین و شریعت کے فقہی اور قانونی پہلو سے نہیں ہے۔ غالباً اسی لیے محدثین میں سے اکثر نے دائیں یا بائیں ہاتھ میں انگوٹھیاں پہننے کے ابواب قائم کیے ہیں۔

(ابوداؤد: باب التختم في اليمين او اليسار، نیز ترمذی وغیرہ کے ابواب)

خاتم نبوی: کے پہنے جانے کے بارے میں کئی احوال کی احادیث ملتی ہیں:

۱- اکثر پہنے رہتے تھے اور کبھی کبھی نہیں بھی پہنتے تھے۔ جب نہیں پہنتے تھے تو ایک صحابی افسر کی تحویل میں رہتی تھی۔

۲- بالعموم داہنے ہاتھ کی چھنگلیا (خنصر) میں پہنتے تھے۔ متعدد احادیث بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد۔

۳- کبھی کبھی بائیں ہاتھ کی چھنگلیا (خنصر) میں پہنتے تھے۔ (حدیث مسلم: ۶۲ (۲۰۹۴)

۴- بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو انگوٹھی اتار دیتے تھے، غالباً نقشِ خاتم کے سبب۔ ترمذی، نسائی۔

خلفاء کرام: میں سے اولین خلفائے ثلاثہ کے انگوٹھی پہننے کا ذکر آتا ہے مگر دائیں بائیں کی زیادہ تصریح نہیں ملتی۔ زیادہ قیاس یہی ہے کہ وہ بالعموم دائیں ہاتھ کی چھنگلیا ہی میں پہنا کرتے تھے۔ اور حضرت عثمانؓ کے طریقے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آن نہیں پہنے رہتے تھے بلکہ

اسے افسرِ تحویل کے پاس بھی رکھ دیتے تھے۔ غالباً یہ سرکاری نبوی خاتم کا معاملہ ہے۔ ان کی ذاتی انگوٹھیوں کا ذکر نہیں مل سکا۔ البتہ حضرت علیؓ کی انگوٹھی کا ذکر ملتا ہے کہ وہ دائیں میں پہنتے تھے، اسی طرح دوسرے صحابہ/ خلفاء کا ذکر ملتا ہے۔

صحابہ کرام: کے انگوٹھیاں پہننے کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن یہ صراحت کہ وہ بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے یا دائیں میں بہت کم ملتی ہے۔ غالباً بیشتر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی (خنصر) میں ہی پہنتے تھے جیسے حضرات صلت بن عبداللہ بن نوفل مطلبی، ابن عباس وغیرہ۔

- بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے والوں میں حضرات ابن عمر کے علاوہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا ذکر ملتا ہے: "کان الحسن والحسین یتختمان فی یسارھما" (ترمذی/ ابوداؤد)

ازواج وصحابیات: کی انگوٹھیوں خاص کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی انگوٹھیوں کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ وہ کئی انگوٹھیاں ایک ہاتھ میں پہنتی تھیں۔ غالباً وہ دائیں ہاتھ میں پہننے کے رواج کے مطابق پہنتی تھیں لیکن امکان بہرحال ہے کہ دونوں ہاتھوں کی ایک ایک یا دو انگلیوں میں وہ رہی ہوں۔

زیوراتِ خواتین

خواتین فطری طور سے زیب و زینت کی شوقین ہوتی ہیں اور ان کے اس فطری حق کو اسلامی شریعت نے تسلیم کیا ہے۔ لباس و غازہ اور خوشبویات کے علاوہ ان کے سولہ سنگھار میں زیورات بھی شامل ہیں جن کو عربی میں الحلی (واحد حلیة) کہتے ہیں۔ ان میں مختلف اعضاء و جوارح کے لیے الگ الگ زیور ہوتے ہیں جن کے مختلف نام ہوتے ہیں۔ انگلیوں میں انگشتریوں (خواتیم) کے علاوہ بازو بند (دمالج) اور کنگن (اسورۃ) ہاتھوں میں بازوؤں اور کلائیوں میں بالترتیب پہنے جاتے ہیں۔ بعض دوسرے زیور بھی ہوتے ہیں۔ کانوں میں بالیاں (قرط) پہنی جاتی ہیں اور بسا اوقات ناک میں بھی کیل نما یا نتھنی جیسی چیزیں بھی آویزاں کی جاتی ہیں، ان کے کئی نام ملتے ہیں۔ گلے میں ہار (عقد - عقود) آویزاں کر کے اس کا حسن بڑھایا جاتا ہے اور بعض اوقات سروں کے اوپر اور پیشانی کے ٹیکے ہوتے ہیں۔ پیروں میں پازیبیں (خلاخل،

اوضاح) جیسی چیزیں ضرور ڈالی جاتی تھیں تا کہ ان کا حسن و جمال سولہ سنگھار میں مزید چار چاند لگائے۔ احادیث میں بکثرت اور روایاتِ سیرت میں بھی کافی حوالے خواتین کے زیورات کے مختلف واقعات واحوال اور اوقات کے لحاظ سے ملتے ہیں۔

ان کی سماجی اہمیت بھی ہے اور تہذیبی جہت بھی۔ تمام معاشروں نے خواتین اور عورتوں، بچیوں کے لیے زیورات کا استعمال استوار کیا ہے اور اسے بطور نسوانی حق کے تسلیم کیا ہے۔ شاید ہی کوئی انسانی معاشرہ ملے جو عورتوں کے سجنے سنورنے کے خلاف رہا ہو۔ پھر ہر دوسرے میدانِ حیات اور عملِ انسانی کی طرح زیورات کی ایک دینی جہت بھی رہی ہے بالخصوص اسلامی تشریعی تہذیبوں میں۔ شریعتِ محمدی میں فکری لحاظ سے عورتوں کو زیب و زینت کا حق دیا گیا اور مردوں سے چھین لیا گیا کہ ان کی مردانگی اور شجاعت کے منافی ہے۔ زیورات کی ایک دینی جہت یہ بھی ہے کہ بالعموم ان میں سونا چاندی استعمال ہوتا ہے۔ جس کی مالی قدر و قیمت بھی ہے لہٰذا ایک خاص مقدار کے زیورات زکوٰۃ کی زد میں آ جاتے ہیں۔ تقویٰ وطہارت اور سادگی وخواجگی کے لحاظ سے ان کی زیادتی ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات مصلحتِ دینی قلیل مقدار کو بھی باعثِ ملامت بنا دیتی ہے۔ قیمتی پتھروں اور سینگوں وغیرہ کے زیورات بھی بنائے اور استعمال کیے جاتے تھے۔ اور ان کی بھی سماجی، تہذیبی اور دینی جہات تھیں۔ انھیں کے پس منظر میں عہدِ نبوی کے دونوں ادوارِ مکی و مدنی میں خواتین کے زیورات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

زیورات کے عمومی حوالے

احادیث وروایات میں زیور بہ زیور بھی ذکر ملتا ہے جو خاص ہے اور ان کے عمومی حوالے بھی ملتے ہیں جن میں متعدد شامل ہوتے ہیں یا ان کے مجموعی نام الحلی (زیورات) کا ذکر ملتا ہے۔ سماجی طور سے ان کے نسوانی استعمال کا ذکر تو آتا ہی ہے کہ وہ خاصا فطری ہے مگر احادیث میں بالخصوص ان کا ذکر صدقہ وزکوٰۃ ادا کرنے کی دینی جہت سے آتا ہے۔ اس کی مذہبی حیثیت، خواتین کے جوش وجذبے اور عصری تقاضوں کی رعایت کے علاوہ خواتین کی قربانی، خلوص اور کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی روایات بہت اہم حوالے ہیں۔ تقاضے وطلب پر صدقہ وخیرات

کرنے کے جذبۂ صادق سے بڑھ کر وہ اندرونی داعیہ قابلِ افتخار تھا جو خواتین کو از خود کارِ خیر پر ابھارتا تھا۔ یہ اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ بالعموم عورت کا مزاج وخمیر زیور سے ایسا وابستہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں جدا کرنا پسند نہیں کرتی اور جب وہ مانگنے سے اپنے زیورات دے دے یا از خود زیورات نچھاور کرنے لگے تو وہ خیر القرون کے خیرِ کل کی کارگذاری کا طرۂ امتیاز بن جاتا ہے۔

-مشہور حدیث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک عید الفطر کے دن نماز اور خطبہ کے بعد خاص طور سے عورتوں سے خطاب فرمایا اور ان کو صدقہ وخیرات کرنے کی ایسی پرزور اور پُر تاثیر نصیحت فرمائی کہ خواتین نے حضرت بلالؓ کے پھیلے ہوئے دامن میں اپنے زیورات، جن میں بڑی اور چھوٹی انگوٹھیاں اور دوسری چیزیں شامل تھیں، ڈالنی شروع کیں۔ یہ صدقہ وخیرات زکوٰۃ الفطر / صدقۂ فطر کے علاوہ تھی۔ امام بخاریؒ نے اس موضوع کی ایک ہی روایت کی مختلف جزئیات الگ الگ احادیث میں بیان کی ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ عورتیں اپنے اپنے کنگن (القلب) اور حلقے (الخرص) ڈالنے لگیں۔ مسلم کی روایت میں بڑی انگوٹھیوں (فتخھا) اور طلائی / نقرئی حلقوں (خرصہا) کے علاوہ ان کے زیورات عام کا حوالہ بھی ہے اور ان میں خاص طور سے ان کی بالیوں (اقرطھن) اور انگوٹھیوں (خواتیمھن) کے علاوہ لونگ کے ہار (سخابھا) کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض زیورات کا ذکر مل سکتا ہے دوسری کتبِ حدیث میں: "...وامرهن بالصدقة فجعلت المرأة تلقي القرط والخاتم ... / .... تلقي فتخها ... فيلقين الفتخ والخواتيم / تلقي خرصها وسخابها / اقرطهن وخواتيمهن"

(بخاری، کتاب العیدین، باب موعظة الامام النساء يوم العيد؛ حدیث: ۹۷۸-۹۷۹؛ فتح الباری، ۲/ ۶۰۱-۶۰۴۔ کتاب الزکاۃ، باب التحريض على الصدقة الخ، حدیث: ۱۴۳۱ وغیرہ؛ فتح الباری، ۳/ ۲۷۸ ومابعد؛ کتاب العلم، باب عظة الامام النساء الخ؛ مسلم، کتاب صلاة العيدين، احادیث: ۱- (۸۸۴) تا ۱۳ (۸۸۴)

امامِ سیرت ابن ہشامؒ نے عورتوں کے عام زیورات میں بھی خاص زیورات کا حوالہ دیا ہے جو بہت اہم سماجی واقعہ ہے۔ طائف کے قلعہ کے محاصرہ کے دوران ۸/ ۶۳۰ میں ایک

مشہور صحابیہ حضرت خویلہ بنت حکیم بن امیہ بن حارثہ بن الاوقص سلمی نے، جو بعد میں حضرت عثمانؓ کی زوجہ مکرمہ بنیں، رسولِ اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ اگر قلعہ فتح ہو جائے تو مجھے بادیہ بنت غیلان بن مظعون بن سلمہ یا فارعہ بنت عقیل کے زیورات عطا فرمائیں۔ یہ دونوں خواتین وہ تھیں جو بنو ثقیف میں سب سے زیادہ اور بہترین زیورات پہننے کے لیے مشہور تھیں: "...

اعطنی ان فتح اللہ علیک الطائف حلی بادیة بنت غیلان بن مظعون بن سلمه، اوحلی الفارعة بنت عقیل، و کانتا من احلیٰ نساء ثقیف" (ابن ہشام، ۲/۴۸۴)

-حضرت ابوامامہؓ نے اپنی تین بیٹیوں - ام زینب حبیبہ اوران کی بہنوں فارعہ اور کبشہ - کا وصی رسولِ اکرم ﷺ کو مقرر کیا۔ ان کی وفات کے بعد تینوں صاحبزادیاں کفالت نبوی میں آئیں تو ان کے والد مرحوم کے عطا کردہ زیورات بھی آپ ﷺ کی تحویل میں آئے۔ وہ سونے اور موتی پر مشتمل تھے اور ایسے زیورات کا خاص نام "الرعاث" تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو اوران کی دوسری بہنوں کو بھی ان زیورات سے آراستہ کیا: "...**فاتاہ حلی من ذھب ولؤلو، یقال له الرعاث، قالت: فحلّاھن من الرعاث**".

(اسد الغابہ، ۵/ ۵۸۵ نیز ذکر/ ترجمہ حبیبہ وغیرہ؛ بحث کے لیے: رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین - ایک سماجی مطالعہ، ۱۳۱-۱۳۲)

زیورات کے کئی عمومی حوالے صدقہ وزکوٰۃِ زیورات نکالنے یا نہ نکالنے کے ضمن میں متعدد واقعات سے ملتے ہیں:

-حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی دختروں اور بچیوں/ باندیوں کو طلائی زیورات پہناتے تھے مگر ان کی زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے: "**ان عبداللہ بن عمر کان یحلّی بناته و جواریه بالذھب، ثم لا یخرج من حلیھن الزکاة**"

(موطا، کتاب النکاح، ماجاء فی الصداق الخ؛ سیوطی، تنویر الحوالک، ۲/۶۳)

-حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے مرحوم بھائی کی یتیم بچیوں کی کفالت کرتیں اوران کو زیورات پہناتی تھیں مگر ان کی زکوٰۃ نہیں دیتی تھیں: "**ان عائشة زوج النبی ﷺ کانت تحلی بنات اخیھا یتامیٰ فی حجرھا لھن الحلی، فلا تخرج من حلیھن الزکاة**"

(موطا، کتاب الزکاة، مالا زکوٰة فیه من التبرو الحلی و العنبر؛ سیوطی، تنویر الحوالک، ۱/۲۴۵)

زکوٰۃ نہ نکالنے کا ذکر صرف اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ متعدد صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین استعمالی زیورات پر زکوٰۃ فرض نہیں مانتے تھے جب کہ متعدد دوسرے صحابہ کرام اور علماء اجتہاد ان پر بھی زکوٰۃ کی فرضیت کے قائل ہیں۔ سردست ہمیں زیورات سے بحث ہے ان کی زکوٰۃ سے نہیں۔

(البیہقی، احمد بن الحسین، السنن الکبریٰ، باب من قال زکاۃ الحلی عاریتہ، باب من قال: زکاۃ الحلی انما وجبت، بیروت ۱۹۹۹ء، ۴/۲۳۶-۲۳۷ ومابعد)

متعدد صحابیات اور خواتینِ اسلام نے از خود بلا کسی خارجی تحریک کے اپنے زیورات کا صدقہ راہِ الٰہی میں کیا۔ ایسی متعدد احادیث و روایات ہیں جن میں ان کے زیورات کے عمومی حوالے آتے ہیں:

- حضرت کعب بن مالک انصاریؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت خیرہؓ خدمت نبوی میں اپنے زیور لے کر حاضر ہوئیں کہ وہ راہِ الٰہی میں صدقہ ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے شوہر کی اجازت کے بغیر عورتوں کے زیورات کا صدقہ لینے سے انکار فرمادیا اور حضرت کعبؓ کو بلا کر ان کی اجازت کی تصدیق فرمالی تب ان کے زیورات قبول کیے: "... ان جدتہ خیرۃ، امراۃ کعب بن مالک، اتت رسول اللہ ﷺ بحلی لھا فقالت: انی تصدقت بھذا... فبعث رسول اللہ ﷺ الیٰ کعب بن مالک زوجھا فقال: ھل اذنت لخیرۃ أن تتصدق بحلیھا..."

(ابن ماجہ، کتاب الھبات، باب عطیۃ المرأۃ بغیر اذن زوجھا...)

- بعض صحابیاتِ طاہرات نے عید الفطر کے موقعہ پر صدقہ وخیرات کی نصیحتِ نبوی کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنے صدقاتِ زیور وغیرہ پیش کیے۔ ان میں صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت زینب بنت معاویہ ثقفیؓ شامل تھیں جنھوں نے عرض کیا تھا کہ میرے پاس کچھ زیور ہیں جن کو میں صدقہ کرنا چاہتی ہوں: "وکان عندی حلی لی فاردت ان أتصدق بہ"۔ ان کے شوہر گرامی کا خیال تھا کہ اس صدقہ کے زیادہ مستحق ان کے شوہرِ (نادار) اور ان کے بچے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ کے خیال کی تصدیق فرمائی۔

(بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الزکاۃ علی الاقارب وغیرہ؛ مسلم، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین؛ فتح الباری، ۳/۴۰۹-۴۱۱: نیز دیگر ابواب بخاری؛ اسد الغابہ، ۵/۴۷۰-۴۷۱ و اصابہ ترجمۃ زینب)

بخاری و مسلم کی دوسری حدیث میں حضرت ابن مسعودؓ کی اہلیہ گرامی کے علاوہ ایک انصاری خاتون بھی اسی طرح اپنے زیورات کا صدقہ لے کر دربارِ نبوت میں پہونچی تھیں۔

(بخاری، باب الزکاۃ علی الزوج والایتام فی الحجر ؛ مسلم مذکورہ بالا؛ نیز ملاحظہ ہو: رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین - ایک سماجی مطالعہ، ۱۴۴)۔

یہ دونوں خواتین گرامی دستکار تھیں اور اپنی دستکاری سے مال کماتی تھیں کہ ان دونوں کے شوہرانِ نامدار نادار صحابہ کرام میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو اپنے شوہر اور اولاد پر خرچ کرنے کا حکم دیا تھا کہ وہ بہترین صدقہ ہے اور اس میں دہرا اجر ہے: ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔ حدیث حضرت ام سلمہؓ میں بھی یہی حکم ہے۔

مسرت وانبساط اور خوشی کے مواقع پر خواتین کے زیورات کے عمومی حوالے ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق خوشخبری پر خوشخبری لانے والے/ والی قاصد کو زیورات میں سے نوازنے کا ہے۔ یہ ایک اور سماجی رویے اور تہذیبی قدر کی عکاسی کرتا ہے۔ اتفاق سے دو واقعات کا کم از کم ذکر ملتا ہے اور ان دونوں کا تعلق دو امہات المومنین کی نوازشِ قاصد سے ہی ہے۔

- حضرت زینب بنت جحش اسدی خزیمیؓ کی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کرنے کی آیاتِ الٰہی اتریں تو وہ ان کے سببِ نکاحِ نبوی میں خود بخود آ گئیں۔ ان آیات کے نزول اور ان کے نتیجہ میں رسولِ اکرم ﷺ سے ان کے بیوی بننے کی خوشخبری ان کو ایک خاتون نے جا کر دی۔ حضرت زینبؓ نے فرطِ مسرت سے خوشخبری لانے والی کو اپنے تمام زیور جو پہنے ہوئے تھیں اتار کر بخش دیے: "... اعطت من بشرھا حلیاً کان علیھا" (بلاذری، ۱/۴۳۶)

- حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان امویؓ کا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔ وہ حبشہ میں حضرت نجاشیؓ کے سایۂ پناہ میں مقیم تھیں جب قاصدِ نبوی حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ نے ان سے شادی کا پیغامِ نبوی حضرت نجاشیؓ کو پہونچایا۔ ابرہہ نامی ایک حبشی باندی نے یہ خوشخبری جا کر حضرت ام حبیبہؓ کو سنائی تو وہ مسرت سے جھوم اٹھیں اور اپنے تمام زیورِ بدن اس کو عطا کر دیے:

"... فوھبت لھا ام حبیبۃ حلیا کان علیھا و کستھا ..."

(بلاذری، ۱/۴۳۹؛ لباس عطا کرنے کا تہذیبی رویہ ملبوسات کے باب میں آ چکا ہے)

غمناک اور قتل کے واقعات بھی بعض اوقات انھیں زیورات کی خاطر پیش آئے۔ وہ انسانی لالچ کی کہانی سناتے ہیں۔ امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہ نے ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ ایک انصاری بچی کو اس کے زیورات کے لیے قتل کر کے کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا:

"قتل جارية من الانصار على حلّى لها، ثم ألقاها فى القليب"

(كتاب القسامة، باب ثبوت القصاص الخ، باب القود الخ، ابوداؤد، كتاب الديات، باب يقاد من القاتل، حدیث: ۴۵۲۷، ۴۵۳۵ وغیرہ؛ نسائی، تحريم الدم، باب تاويل الخ؛ ترمذی، ابواب الديات، باب ماجاء فى من رضخ راسه بصخرة"۔ بعد میں قاتل پکڑا گیا تھا اور اسے سزا ملی تھی لیکن یہ کہانی آج بھی دہرائی جاتی ہے)

یہودی زیورات

مدینہ منورہ کے متعدد یہودی قبائل اور خیبر کی یہودی عورتوں کے زیورات کے حوالے بھی کثرت سے روایات میں ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی مسلم معاشرے کے ساتھ رہتے بستے تھے اور ان کی اپنی سماجی اور تہذیبی روایات بھی تھیں۔ عرب جاہلی کی روایات سے ان کی سماجی روایات کچھ کم قدیم نہ تھیں۔ لہٰذا ان کے ہاں زیورات کے استعمال کا تہذیبی اور سماجی منظر نامہ زیادہ تھا۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں: اول تو وہ بھی انسانی معاشرہ ہونے کے سبب زیب وزینت کے فطری طور سے شائق تھے۔ دوسرے ان کی مالداری، تمول اور اظہارِ فخر ومباہات بھی ان میں زیادہ تھا جو ان کو اظہار زیب وزینت پر اکساتا تھا۔ تیسرے ان کے سنار غالباً سب سے عمدہ کاریگر تھے جیسا کہ بنوقینقاع کا پورا قبیلہ ہی زرگری کرتا تھا۔ ایک ایسے ہی یہودی زرگر کی دکان میں ایک مسلم خاتون اپنے زیور بنوانے گئی تھی جہاں اس کی ایک یہودی نوجوان نے بے عزتی کی اور وہ واقعہ غزوہ بنی قینقاع کا سبب بن گیا تھا۔

(واقدی، ۱۷۶: "امرأة مسلمة لحلى لها فى سوق بنى قينقاع ..."؛ ابن ہشام ۲/ ۴۲۷: "... وجلست الىٰ صائغ بها (لسوق بنى قينقاع) ... فعمد الصائغ الى طرف ثوبها فعقده الى ظهرها.. فوثب رجل من المسلمين على الصائغ فقتله وكان يهوديا..." بیہودہ حرکت کرنے والا یہودی زرگر ہی تھا بروایت ابن ہشام)

غزواتِ بنوقینقاع اور بنوالنضیر کے حوالے سے ان کی خواتین کے زیورات کا ذکر آتا ہے اور دوسرے دینی حوالوں سے بھی:

-غزوۂ بنی النضیر کے بعد جب یہودی قبیلہ کو جلا وطن کیا گیا تو ان کی خواتین اپنے تمام زیورات- طلائی کنگن اور موتی کے ہار وغیرہ- پہنے ہوئے ان کا اظہار کرتی ہوئی شادیانے بجاتے ہوئے شہر سے گئی تھیں:"... وعلی النساء المعصفرات وحلی الذهب، فی ایدیهن اسورة الذهب والدر فی رقابهن..." (واقدی، ۳۷۵-۳۷۶)

-غزوۂ خیبر ۷/ ۶۲۹ء میں آل ابی الحقیق کے خزانے میں طلائی کنگن، طلائی بازو بند/ پہونچی، طلائی پازیبیں، طلائی بالیاں، جوہر وزمرد کے ہار اور سونے کی انگوٹھیاں اور طلائی بڑی انگوٹھیاں اور بچھوے اور ظفار کے پتھروں کے سونے سے آراستہ ہار شامل تھے۔

(واقدی، ۶۷۳:"...فاذا جُلّه اسورة الذهب، ودمالج الذهب وخلاخل الذهب، وقرطة الذهب، ونظم من جوهر وزمرد، وخواتم ذهب، وفتخ بجزع ظفار، مجزع بالذهب)

یہودی دینی حوالہ یہ ہے کہ عاشوراء کو یہودِ مدینہ اور باشندگانِ خیبر روزہ رکھتے تھے اور اس دن کو عید کی طرح مناتے تھے اور اپنی عورتوں کو عمدہ زیورات وملبوسات سے سجاتے تھے:"... **کان اهل خیبر یصومون یوم عاشوراء، یتخذونه عیدا، و یلبسون نساء هم فیه حلیهم و شارتهم...**" (مسلم، کتاب الصیام، باب صوم عاشوراء، حدیث: ۱۳۰(...) "شارتهم" سے مراد عمدہ اور حسین وجمیل ملبوسات ہیں جو یہودی مرد اپنی عورتوں کو اس روزِ فتح وجشن پہناتے تھے: مزید بحث ملبوسات/ تقریبات میں)۔ ظاہر ہے کہ یہ خاص زیورات تھے جو نئے پہنائے جاتے تھے۔ ورنہ ان کے ہاں عام معمول کے زیورات پہننے کا بھی باقاعدہ رواج تھا۔

ہاتھوں کے زیوراتِ خواتین

چھوٹی انگشتریوں (خواتیم) اور بڑی اور بھاری بھرکم انگوٹھیوں (فتخ) کے علاوہ خواتین اپنے ہاتھوں میں بعض دوسرے زیورات بھی پہنتی تھیں۔ ان میں سے ایک کنگن تھے جو کلائیوں میں پہنے جاتے تھے۔ ان کے مختلف نام اور قسمیں ملتی ہیں۔ عرب جاہلی اور غیر اسلامی معاشروں

میں مرد بھی کنگن اور وہ بھی سونے کے پہنتے تھے، بالخصوص شاہانِ عجم، کسریٰ و قیصر وغیرہ۔ حضرت سُراقہ بن جعشمؓ کے تعاقب کے واقعہ میں کسریٰ کے کنگن کا ذکر آتا ہے جو بعد میں ان کو وعدۂ نبوی کے تحت فتحِ ایران کے بعد سچ مچ پہنائے گئے تھے۔ بہر حال خواتین کے ہاتھوں کے زیورات میں کنگنوں اور ان جیسے زیوروں کے پہننے کا ذکر کئی احادیث میں آتا ہے۔

کنگن (سوارین)

- دو عورتیں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو ان دونوں کے ہاتھوں میں سونے کے دو دو کنگن تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی زکوٰۃ ادا کرنے کے بارے میں دریافت فرمایا اور ان کے جوابِ نفی پر آتشی کنگنوں کی وعید سنائی اور ان دونوں نے زکوٰۃ ادا کی۔ یہ ضعیف حدیث ہے: "ان امراتین اتتا رسول اللہ ﷺ وفی ایدیھما سواران من ذھب ..."

(ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ الحلی، ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الکنز ما ھو وزکوٰۃ الحلی؛ نیز بیہقی، مذکورہ بالا باب تحریم)

- حضرت خُلیدہ بنت قعنب ضبیؓ ان خواتین میں شامل تھی جو رسولِ اکرم ﷺ کے پاس بیعت کرنے کے لیے آئی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک عورت آئی تو اس کے ہاتھ میں سونے کا کنگن تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بھیڑ میں سے نکلیں اور کنگن پھینک دیا۔ پھر حاضر خدمت ہوئیں تو رسولِ اکرم ﷺ نے بیعت فرمالی۔ وہ خاتون بعد میں اپنا کنگن تلاش کرنے گئیں تو وہ جا چکا تھا: "... فاتتہ امراۃ فی یدھا سوار من ذھب، فابیٰ ان یبایعھا، فخرجت من الزحام فرمت بالسوار، ثم جاء ت الی النبی ﷺ فبایعھا قالت: فخرجت فطلبت السوار فاذا ھو قد ذھب" (اسد الغابہ، ۵/۴۴۰ بحوالہ ابن مندہ وابونعیم)

مردوں کے کنگنوں (سوارین) کا ذکر رویائے صادقہ کے حوالے سے آتا ہے، وہ بھی بہت اہم ہے اور معنی خیز بھی۔ ان کا ذکر بھی بہر حال ایک ناپسندیدہ شے کی حیثیت ہی سے آتا ہے:

- رسولِ اکرم ﷺ نے خوابِ صادق میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے دونوں ہاتھوں میں دو طلائی کنگن ہیں: "رایت فی یدی سوارین من ذھب"۔ خواب میں ہی آپ ﷺ نے وحیِ الٰہی

کے ارشاد پر ان میں پھونک ماری تو وہ اڑ گئے۔ صبح کو آپ ﷺ نے اس خواب کی تعبیر بتائی کہ دو جھوٹے نبی اٹھیں گے جو مارے جائیں گے۔ ان دونوں سے اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب مراد تھے جیسا کہ روایت میں آتا ہے۔

(بخاری، کتاب بدء الخلق، باب علامات النبوۃ؛ فتح الباری، ٦/٧٦٦ ومابعد: "... بینما انا نائم رأیت فی یدیّ سوارین من ذھب..." اطراف حدیث: ٣٦٢١=٤٣٧٤-٤٣٧٥، ٤٣٧٩، ٧٠٣٤، ٧٠٣٧)

- بنوالنضیر کی عورتوں کے طلائی کنگنوں (فی ایدیھن اسورۃ الذھب) اور آل ابی الحقیق کے خزانے کے حوالے سے "اسورۃ الذھب" کا ذکر روایاتِ سیرت میں آتا ہے۔

(واقدی، ٣٧٠، ٦٧٣)

- ان سے زیادہ اہم ان کا بازبندوں کا ذکر ہے جو سونے کے تھے: "دمالج الذھب"۔ یہ حوالہ بہت نادر و نایاب ہے مگر یہ حقیقتِ مسلمہ ہے کہ عرب خواتین بھی بازوبند اور پہونچی پہنتی تھیں جو سونے اور چاندی کی ہوتی تھیں۔ (واقدی، مذکورہ بالا)

مسکتان

کنگن نما زیورِ دست کا ایک نام "مسکۃ" (تثنیہ مسکتان) ملتا ہے اور وہ بھی دو دو پہنے جاتے تھے: یعنی دونوں ہاتھوں میں ایک ایک۔ یہ بھی بالعموم عورتوں اور بچیوں کا ہی زیور تھا۔ عربی میں مذکر لفظ "مسکین" بھی آتا ہے اور مؤنث لفظ "مسکتین" بھی ملتا ہے۔ حضرت ہند بنت عتبہؓ کے ذریعہ حضرت حمزہؓ کے قتل کے واقعہ کے دوران ان کے دو "مسکین" کا ذکر ملتا ہے۔

(بلاذری، ١/٣٢٢؛ ابن ہشام، ٣/٤١ میں حضرت ہند کے دوسرے زیوروں کا ذکر ہے جو انھوں نے حضرت حمزہؓ کے قتل کے لیے "حضرت وحشیؓ کو دیے تھے: واعطت [ھندَ] خدمھا وقلائدھا وقرطتھا وحشیا غلام جبیر بن مطعم...")

- ایک عورت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی تو اس کے ساتھ اس کی ایک بچی بھی تھی، اور اس کی بیٹی کے ہاتھ میں دو موٹے موٹے سونے کے کنگن تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی نصیحت پر عورت نے ان کو اتروا دیا اور راہِ الٰہی میں صدقہ کر دیا: "ان امرأۃ اتت ... ومعھا

ابنة لها، وفی ید ابنتها مسکتان غلیظتان من ذهب...“

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الکنز ماهو وزکوٰۃ الحلی، حدیث:۱۵۶۳)

-حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں ایک روایت بہر حال یہ ملتی ہے کہ ان کے ہاتھوں میں بھی ایسے ہی دو موٹے طلائی کنگن تھے جن کو رسولِ اکرم ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: کیا تمہیں ان سے بہتر زیور کی خبر نہ دوں۔ اگر تم ان دونوں کو اتار ڈالو اور ان کی جگہ چاندی کے کنگن بنوالو اور ان کو زعفران سے رنگ لو تو وہ زیادہ خوبصورت لگیں گے۔ اس روایت کو بعض ناقدینِ حدیث جیسے امام ابوعبدالرحمٰن ہی نے غیر محفوظ کہا ہے:”عن عائشة ان رسول الله ﷺ رأى عليها مسكتی ذهب فقال رسول الله ﷺ : ألا اخبرک بما هو احسن من هذا؟ لو نزعتِ هذا و جعلت ... كيتين من ورق ثم ضفرتهما بزعفران كانتا حسنتين...“

(نسائی، کتاب الزینة، باب الکراهیة للنساء فی اظهار الحلی والذهب)

-خواتینِ اسلام نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جو صدقاتِ زیور دیے تھے ان میں ”مَسَکٌ“ بھی شامل تھے اور صحاحِ جوہری کے مطابق وہ ہاتھی دانت یا کچھوے کی پیٹھ کی ہڈی سے بنتے تھے: مسک (اسورة من ذبل او عاج - الصحاح،۱۶۰۸-واقدی)

معاضد/ دمالج: نامی زیورات بازوبند/ پہونچی تھے۔ ان کا ذکر حضرت ہند بنت عتبہ کے زیورات اور مسلم خواتین کے صدقات تبوک میں ملتا ہے۔ دونوں کو مترادف بتایا گیا ہے صحاح کے حوالے سے۔

(صحاح،۵۰۶ بحوالہ واقدی، خزانہ آل ابی الحقیق میں بھی طلائی بازوبندوں کا ذکر ہے:”دمالج الذهب“۔ واقدی،۶۸۶)

گلے کے زیورات

ہار (عقد)

گلے کے ہار کے لیے عام عربی لفظ ”عِقد“ ہے۔ جس کی جمع عقود آتی ہے۔ عہدِ نبوی کی خواتین کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ وہ اسے معمولاً پہنتی تھیں، وہ سونے کا بھی ہوتا تھا اور

چاندی کا بھی اور ان کے علاوہ لونگ، مونگے، موتی وغیرہ بعض خوبصورت اور قیمتی پتھروں کا بھی ہوتا تھا۔ اور یہ پتھر اپنے اپنے منبع و مرکز کی طرف نسبت کر کے معروف و مشہور ہوتے تھے جیسے جزع یا عقدِ ظفار جو یمن کے علاقہ ظفار کا ہار تھا۔ احادیث و روایات میں بسا اوقات اس کے لیے دوسرا لفظ ''قـلادة'' بھی ملتا ہے جس کی جمع قلائد و قلاد بھی آتی ہے۔ وہ مالا بھی کہا جاتا ہے۔ بعض روایات میں ''سـلسلة الذهب'' (سونے کا ہار) بھی آیا ہے۔ اس سے بھی مراد ہار، مالا اور گلے میں پہننے کا زیور ہی ہے۔ وہ موتی، جواہرات اور ہیروں کے ہار بھی ہوتے تھے جیسا کہ یہودی عورتوں۔ بنو النضیر وخیبر۔ کے حوالے سے آتا ہے: ''والـدر فی رقـابهـن / نظم من جوهر و زمرد'' (واقدی، ۶۷۳،۳۷۶ وغیرہ)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہار

غالباً سب سے زیادہ مشہور و معروف ہونے کے علاوہ سعادت و خیر و برکت آگیں ہار تھا کہ اس کے سبب تیمم کی سہولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارزانی ہوئی۔ وہ غزوۂ مریسیع / بنو مصطلق کا واقعہ اور حادثۂ افک کا جزئیہ ہے۔ حضرات محدثین نے بالعموم اور امام بخاریؒ نے بالخصوص اس واقعہ کو اور اس میں ہارِ عائشہ صدیقہؓ کے کردار کو متعدد کتب و ابواب میں بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک مقام و مرحلے پر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں۔ واپس آئیں تو گردن میں ہار نہ تھا۔ اس کی تلاش میں کسی قدر دور نکل گئیں۔ قافلۂ نبوی کو صحرائی علاقے میں پانی کی قلت کا سامنا ہوا تو تیمم کی آیاتِ کریمہ کا نزول ہوا۔

(بخاری، کتاب التیمم، ۱-باب بلاعنوان، حدیث:۳۳۴:''... انـقطع عقد لی .. فاصبنا العقد تحته''، اطراف حدیث: متعدد؛ فتح الباری، ۱/۵۵۹ وغیرہ، بخاری، کـتـاب التیـمم، باب اذا لم یجد ماء ولا ترابا، حدیث:۳۳۶:''...قـلادة فهلکت''؛ فتح الباری، ۱/۵۷۰-۵۷۱۔ عقد: کـل مـا یعقد ویعلق فی الـعنق ویسمی قلادة'')۔ فتح الباری، ۱/۵۶۱؛ بلاذری، ۱/۳۴۲ میں اس ہار کی مزید تعریف ملتی ہے: وہ لمبا ہار تھا جو سینہ پر لہراتا تھا اس لیے اسے مرسلہ بھی کہا جاتا تھا اور وہ ظفار کے قیمتی خوبصورت پتھروں کا بنا ہوا تھا: ''فـوجـدهـا قـد انقطعت مرسلتها [الـمـرسـلة ای الـقلادة الطویلة تقع علی

الصدر] وكانت من جزع ظفار، فتشاغلت بلقط خرزها"۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق کا ہار

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا وہ گمشدہ و بازیاب ہار دراصل حضرت اسماءؓ کا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سفر پر جانے سے قبل اسے اپنی بڑی بہن سے مستعار لائی تھیں: "... انها استعارت من اسماء قلادة فهلكت ... الخ"۔ مذکورہ بالا کتب وابواب بخاری کے علاوہ اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع بحث کتاب اللباس کے کئی ابواب میں کی ہے جن میں باب استعارة القلائد خاص ہے: حدیث: ۵۸۸۲۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی خاص تشریح کتاب الطہارۃ کے باب میں وارد احادیث کے ضمن میں کی ہے۔ حدیثِ اِفک میں ابن اسحاق وابن ہشام نے اس کو یمن کے علاقہ ظفار کے مونگوں یا پتھروں (جزع ظفار) کا ہار بتایا ہے۔

(۲/ ۲۹۸؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، حدیث: ۳۱۷: قلادة ہے اور حدیث: ۳۲۰ میں "عقد من جزع ظفار" ہے؛ ابن ہشام، ۳/ ۳۴۲: "... وفي عنقي عقدٌ لي فيه جزع ظفار ...")

- حضرت ہند بنت عتبہ عبشمیؓ نے اپنے زمانۂ کفر میں حضرت حمزہؓ کے قاتل حضرت وحشیؓ کو جو زیورات بطور انعام دیے تھے ان میں ہار بھی تھا جو چاندی کا تھا اور اس میں ظفار کے خاص پتھر / نگینے جڑے تھے: "... كان عليها من ورق و جزع ظفار – و ظفار جبل اليمن يؤتى منه بهذه الحجارة ... " بلاذری، ۱/ ۳۲۲

- عقدِ حضرت اسماء بنت عمیسؓ کا واقعہ ایک بڑے عبرت خیز حادثے سے جڑا ہوا ہے، اگرچہ کچھ بعد کا ہے۔ خلافتِ صدیق میں ایک یمنی شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مہمان ہوا جس کا داہنا ہاتھ اور داہنا پیر کٹا ہوا تھا۔ اسی رات حضرت اسماء بنت عمیسؓ زوجۂ حضرت صدیق اکبرؓ کا ہار گم ہو گیا۔ وہ لولا لنگڑا شخص لوگوں کے ساتھ تلاشِ ہار میں گھومتا پھرتا تھا اور چور کو برا بھلا کہتا جاتا تھا کہ ایسے صالح بزرگ کے گھر اس نے چوری کی۔ بہرحال وہ ہار ایک سنار کے پاس ملا جس نے یہ بتایا کہ لولا لنگڑا ہی وہ ہار اس کے پاس لایا تھا اور اس ظالم نے اس کا اعتراف کر لیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا

کہ اس کمبخت کی اپنی جان کے خلاف بددعا اس کی چوری سے زیادہ میرے نزدیک حیرت ناک اور تکلیف دہ تھی۔

(موطا، کتاب الحدود، باب جامع القطع؛ تنویر الحوالک، ۳/۵۰: "... ثم انهم فقدوا عقد الاسماء بنت عميس...")

قلادہ (ہار/ مالا)

قلادہ (ہار) کی سب سے قدیم مثال حضرت زینب بنت رسولِ اکرم ﷺ کی ملتی ہے، اگرچہ اس کا ذکر بعد کے واقعہ میں آتا ہے اور یہ واقعہ اپنی محبت وعقیدت کی یادگار بھی ہے۔ حضرت زینبؓ کے کافر شوہر ابوالعاص بن ربیع عبشمی کے فدیہ میں غزوۂ بدر کے موقعہ پر آیا تھا۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابوالعاصؓ بھی اسیرانِ بدر میں تھے اور جب دوسرے اسیرانِ جنگ کے فدیہ پر چھڑانے کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے اپنی گردن کا ہار (قلادہ) بطورِ فدیہ خدمتِ نبوی میں بھیجا۔ رسولِ اکرم ﷺ اسے دیکھ کر رو پڑے کہ وہ ان کی چہیتی مرحومہ بیوی حضرت خدیجہؓ کا ہار تھا جو انھوں نے حضرت زینب کی رخصتی کے موقعہ پر ان کو پہنایا تھا: "...وبعثت فيه بقلادة لها كانت خديجة ادخلتها بها على ابى العاص حين بُنى عليها..." ابن ہشام، ۱/۶۵۳؛ بلاذری، ۱/۳۹۷)

اس واقعہ میں ایک خاص موقعہ پر ہار/ قلادہ کے دیے جانے کا ذکر ہے اور وہ ہے بیٹی کی/ دولہن کی رخصتی کے وقت ماں کا تحفہ۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ ہار حضرت خدیجہؓ کا تھا اور تیسرا یہ کہ وہ مکہ مکرمہ میں حضرت زینب کی شادی/ رخصتی کے وقت دیا گیا تھا۔

- ایسی ہی بیکراں محبت اور اتھاہ عقیدت کا ہالہ اس ہار کے گرد قائم ہوا جو رسولِ اکرم ﷺ نے ایک نوجوان غفاری لڑکی کو اپنے دستِ مبارک سے پہنایا تھا۔ حضرت امیہ بنت قیس غفاریؓ کا اپنا بیان ہے کہ غزوۂ خیبر ۷/ ۶۲۹ کے بعد جب مسلم خواتین کو اموالِ غنیمت سے ان کے عطایائے نبوی ملے تو ان کو بھی ایک ہار (قلادہ) ملا۔ رسولِ اکرم ﷺ ان کو اپنے ساتھ اپنی سواری پر بٹھا کر لائے تھے اور تقسیمِ عطایا کے وقت آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے وہ ہار

ان کے گلے میں پہنایا اور آویزاں کیا تھا۔ صحابیہ موصوفہ اسے کبھی اپنی گردن سے جدا نہ کرتی تھیں اور وفات کے وقت بھی وہ ان کے گلے میں تھا اور وصیت کے مطابق وہ انھیں کے ساتھ دفن کیا گیا تھا: "...واخذ هذه القلادة ترين في عنقي فاعطانيها، وعلقها بيده في عنقي، فوالله لا تفارقني ابدا. فكانت في عنقها حتى ماتت ثم اوصت ان تدفن معها.

(ابن ہشام، ۲/۳۴۲-۳۴۳؛ رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین، ۱۰۷-۱۰۸ بحوالہ ابن سعد، ۸/۲۹۳)

-مگر اپنی حد سے زیادہ چہیتی دختر حضرت فاطمہؓ کے لیے رسولِ اکرم ﷺ نے ہڈی کا ہار (قلادة من عصب) حضرت ثوبانؓ کے ذریعہ ایک مدنی تاجر ہاتھی دانت سے خریدوایا تھا اور نواسوں کو بھی ہاتھی دانت کے کنگن پہنوائے تھے، ان کے چاندی کے کنگن اتروا دیے تھے۔

(ابوداؤد، كتاب الترجل، باب في الانتفاع بالعاج، حدیث: ۴۲۱۳)

-قلادہ (ہار) کی سب سے آخری مثال وہ ہے جو حضرت معاویہ بن ابی سفیان امویؓ نے اپنے عہد خلافت میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ہدیہ کیا تھا اور جس کی قیمت ایک لاکھ درہم آنکی گئی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے اسے قبول کیا اور اس کی رقم باقی امہات المومنین کے درمیان تقسیم کر دی کیونکہ وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخی اور غنی تھیں اور اپنی ذات مبارک میں مستغنی تھیں: "ان معاوية بعث الىٰ عائشة قلادة قوّمت مائة الف، فقبلتها وقسمتها بين امهات المومنين و كانت من اسنى الناس" (بلاذری، ۱/۴۱۸-۴۱۹)

- یہودی عورتوں بالخصوص آل ابی الحقیق کے خزانے میں ہیرے اور زمرد کے ہاروں کا ذکر ملتا ہے؛ ان کے لیے دوسرا لفظ "نظم" استعمال کیا گیا ہے: "نظم من جوهر و زمرد..." (واقدی، ۳/۶۷۳)

نُظم اصل میں نظام کی جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں: "موتیوں کی لڑی کا دھاگا"، مراد ہار ہی ہوتا ہے۔ (مصباح اللغات)

طوقِ زریں

گلے کا ایک زیور طوق کہلاتا ہے۔ جس کی جمع اطواق آتی ہے۔ اس کی بناوٹ ہار سے

مختلف ہوتی ہے۔ ہار بالعموم ہلکا پھلکا ہوتا ہے اور کافی نیچے لٹکتا ہے، اس کی شکل زنجیر کی سی ہوتی ہے جب کہ طوق بھاری بھرکم اور گلے اور گردن سے چپک جانے والا زیور ہوتا ہے اور گردن کے سامنے کے حصہ سے دوطرف گدی پر چھا جاتا ہے اور اس کا اگلا حصہ کافی نمایاں ہوتا ہے۔ لغوی طور سے اس میں احاطہ کرنے کا معنی پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ہر احاطہ کرنے والی چیز کو بھی طوق کہتے ہیں، وہ گلا بھی ہوتا ہے (مصباح اللغات)۔ مختلف احادیث میں بہر حال ''طوق'' کا بطور زیور ذکر آیا ہے اور حرام زیوروں/طوقوں کے آتشِ جہنم میں عذاب کا طوق بننے کا بھی۔

عہد نبوی کی خواتین میں طوق پہننے کا بھی رواج تھا اور اس کی کئی مثالیں احادیث و روایات میں ملتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی عمدہ مثال حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ایک بہن کے حوالے سے ملتی ہے۔ وہ تاریخ و سیرت میں ایک گمنام شخصیت کی مالک ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بوڑھے والد ماجد حضرت ابوقحافہؓ کی دیکھ بھال کے لیے اپنی سب سے چھوٹی بہن حضرت قریبہؓ کو مکہ ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ حضرت ابوقحافہؓ نابینا بھی ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے دن انھوں نے بچی سے کہا کہ وہ انھیں جبلِ ابوقبیس پر لے جائیں اور وہاں سے ان کو اسلامی لشکر کے داخلہ کا حال سناتی رہیں۔ بہر حال وہ واپسی پر گھر پہونچنے سے پہلے ہی کسی شخص کے ہاتھ لگ گئیں اور اس نے ان کی گردن سے چاندی کا طوق اتار لیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تمام کوششوں کے باوجود اس طوق کا پتہ نہ چل سکا: ''...**وفی عنق الجارية طوق من ورق، فتلقاها رجل فيقتطعه من عنقها**...''

(ابن ہشام، ۲/۴۰۵-۴۰۶، واقدی نے ان کا نام حضرت قریبہؓ بنت ابی قحافہ بتایا ہے اور ان کے زیور کو ''طوق من فضة'' کہا ہے۔ واقدی ۸۲۴؛ اسد الغابہ، ۵/حرف القاف میں ان کا اندراج نہیں ہے)

طلائی زنجیر (سلسلۃ الذہب)

اگر چہ اس کو روایات و احادیث میں طلائی زنجیر: ''سلسلة الذهب'' کہا گیا ہے ورنہ وہ بھی ایک قسم کا ہار (عقد) ہی ہے۔ بعض دوسری روایات میں اسے عقد/ قلادہ (ہار) ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس طلائی ہار کا ذکر زیورات کی مذمت کے حوالے سے آیا ہے:

۔حضرت فاطمہ بنت رسولِ اکرم ﷺ کو ان کے شوہر نامدار حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ نے ایک طلائی زنجیر ہدیہ کی تھی۔ حضرت ہند بنت ہبیرہؓ جب حضرت فاطمہؓ کے گھر آئیں اور یہ واقعہ بیان کیا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے ہاتھوں میں موٹی موٹی انگوٹھیوں کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ضربیں لگائیں تو صاحبزادی گرامی نے وہ زنجیرِ طلائی اپنی گردن سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی اثناء میں رسولِ اکرم ﷺ گھر میں تشریف لائے اور زنجیر ہاتھ میں دیکھ کر فرمایا: "فاطمہ! کیا تمہیں غیرت نہیں آئے گی جب لوگ کہیں گے کہ رسول اللہ ﷺ کی دختر کے ہاتھوں میں آتشی/جہنمی زنجیر ہے؟ یہ ارشاد فرما کر آپ ﷺ تشریف لے گئے اور معمول کے مطابق ان کے پاس نہیں بیٹھے۔ حضرت فاطمہؓ نے اسی وقت وہ طلائی زنجیر بازار بھیج کر بکوادی اور اس کی قیمت سے ایک غلام خریدا اور اسے آزاد کر دیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے شکرِ الٰہی ادا کیا کہ اس نے حضرت فاطمہ کو آگ سے بچالیا: "...فانتزعت فاطمة سلسلة في عنقها من ذهب، وقالت: هذه اهداها الیّ ابوحسن، فدخل رسول الله ﷺ والسلسلة في يدها فقال: يا فاطمة! ايغرك ان يقول الناس: "ابنة رسول الله وفي يدها سلسلة من نار". ثم خرج فلم يقعد . فارسلت فاطمة بالسلسلة الى السوق فباعتها واشترت بثمنها غلاما، وقال مرة: عبدا، ... فاعتقته..."

(نسائی، كتاب الزينة، باب كراهية للنساء في اظهار الحلي والذهب؛ مع طرف دیگر؛ اسد الغابہ، ۵/۵۶۳)

ہار (سخاب)

ہار اور مالا کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جس میں موتی اور جواہر وغیرہ نہ ہوں اور وہ لونگ وغیرہ کا بنا ہو (مصباح اللغات)۔ حافظ ابن حجرؒ نے کئی شارحین کے حوالے سے اس کی تشریح وتعریف کی ہے۔ امام خطابی کے مطابق وہ ایسا ہار ہوتا ہے جو "طیب" سے بنایا جاتا ہے اور اس میں سونا یا چاندی نہیں ہوتی: "هي قلادة من طيب ليس فيها ذهب ولا فضة"۔ امام داؤدی کے مطابق وہ لونگ (قرنفل) کا ہوتا ہے جب کہ امام ہروی کا خیال ہے کہ شیشہ کے چھدے ہوئے دانے یا

پتھر کے نگ پر مشتمل ہوتا ہے جس کو دھاگے میں پرولیا جاتا ہے اور جس کو بچے اور کمسن بچیاں پہنتی ہیں: "هو خيط من خرز يلبسه الصبيان والجواری" ۔ اس حدیث کے راوی نے تو اس کو بالکل الگ چیز بتایا ہے۔

(فتح الباری، ۴/۲۳۲: کتاب البیوع، باب ماذکر فی الاسواق، حدیث: ۲۱۲۲ طرف: ۵۸۸۴)

حدیثِ بخاری: ۲۱۲۲ کے مطابق حضرت ابو ہریرہ دوسیؓ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بنو قینقاع کے بازار چند دیگر اصحاب کی معیت میں گئے اور واپسی پر حضرت فاطمہؓ کے گھر صحن/ احاطہ میں تشریف فرما ہوئے اور حضرت حسنؓ کو بلایا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے جب ان کو پیار سے پکارا مگر ان کے آنے میں دیر ہوئی۔ مجھے خیال ہوا کہ حضرت فاطمہؓ شاید ان کو نہلا رہی ہیں یا سنوار رہی ہیں یا ان کو ہار (سخاب) پہنا رہی ہیں... الخ: "... فظننت انها تلبسه سخابا او تغسله... الخ"

حدیث: ۵۸۸۱ میں سخاب کو عورتوں کے ہاروں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے عید کے دن جو پند و موعظت کی اس کی بنا پر عورتوں نے اپنے ہاروں کا نذرانہ بھی پیش کیا تھا۔ اسی بنا پر امام بخاریؒ نے اس کو "باب القلائد والسخاب للنساء" کے تحت بیان کیا ہے اور ترجمۃ الباب میں ان کو: قلادة من طيب ومسك (خوشبودار لکڑی یا دانوں کا ہار) کہا ہے۔ اہلِ لغت ان دونوں کے معنی خوشبو بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ خوشبو کے ہار نہیں ہو سکتے، خوشبو دار شے کے ہار ہوتے تھے۔ اس کی نوعیت کا پتہ لگانا مشکل ہے تاہم تحقیق سے پتہ چل سکتا ہے۔

(نیز مسلم، کتاب صلاۃ العیدین؛ حدیث: ۱ (۸۸۴) - ۴ (۸۸۵) اور ۱۳ (۸۸۴) میں القلب، الخرص، فتخ، القرط، خواتیم، سخاب جیسے کئی زیورات کا ذکر ملتا ہے)

کانوں کے زیورات

کانوں کی بالی (قرط)

کانوں میں پہنے جانے والا ایک زیور بالی (قرط) کہلاتا ہے اور بالعموم خواتینِ عہد اسے اپنے کانوں میں آویزاں کرتی تھیں۔ وہ سونے یا چاندی کا چھوٹا سا حلقہ ہوتا تھا جیسا کہ ابن حجرؒ

نے کہا ہے:"ھی الحلقة الصغیرة من ذھب او فضة" (فتح الباری،۱۰/ ۴۰۷)۔اس کو "خِرص / خُرص" بھی کہا گیا ہے۔دونوں کی بناوٹ میں فرق ہونے کے سبب ان کے دونام رکھے گئے۔

(مصباح اللغات:الخِرص و الخُرص جمع خِرصان و خُرصان:"سونے چاندی وغیرہ کا حلقہ")

-عید کے موقعہ پر رسولِ اکرم ﷺ کے وعظ کے بعد خواتینِ اسلام نے جن زیورات کا صدقہ کیا تھا ان میں ان کی بالیاں (خرص) بھی شامل تھیں:"... فجعلت المرأة تصدق بخرصها وسخابها. (حدیث:۵۸۸۱/ و ما بعد اطراف؛فتح الباری،۱۰/۴۰۶ وغیرہ)

-قرط (بالی) کا ایک ذکر مکی دور سے متعلق ہے اور بہت اہم ہے،تاریخی لحاظ سے بھی اور سیرت و دین کے لحاظ سے بھی۔رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہجرت کے سفر پر روانگی کے کچھ دیر بعد متعدد اکابرِ قریش،جن میں ابوجہل مخزومی بھی شامل تھا،تفتیش کی خاطر خانۂ صدیقی میں گئے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں انھوں نے پوچھ تاچھ کی تو حضرت اسماءؓ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔اس پر ابوجہل مخزومی کو سخت غصہ آیا اور اس نے ان کے رخسار پر اتنی زور کا طمانچہ مارا کہ ان کی کانوں کی بالی (قرط) نکل کر دور جا پڑی۔

(ابن ہشام،۱/ ۴۸۷؛۲/۱۰۰:حضرت اسماءؓ کا بیان ہے:...فلطم خدی لطمة فطرح منها قُرطی...")

-حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کو قتل کرنے کی خوشی میں قاتل کو ہند بنت عتبہ نے اپنی بالیوں کا انعام دیا تھا اور دوسرے زیوروں میں ان کی پازیبیں بھی شامل تھیں:"واعطت خدمها وقرطها وحشیا" (ابن ہشام،۲/۹۱)

-خزانۂ آلِ ابی الحقیق-خیبر میں طلائی بالیاں (قرطة الذھب) بھی ملی تھیں جو یہودی عورتیں پہنتی تھیں اور عرب خواتین بھی۔(واقدی،۶۷۳)

"رعاث" نامی زیورات کی ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ کانوں کے زیورات (القرطة وھی من حلی الاذن) تھے (واقدی،۶۸۶)۔اس میں یہ بھی وضاحت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زیورات حضرت اسعد بن زرارہؓ کی دختروں کو عطا فرمائے تھے جن کا حوالہ اسد الغابہ میں دوسرا ہے۔

پیروں کے زیورات

خواتین ہر زمانے میں اپنے پیروں میں مختلف قسم کے زیور پہنتی رہی ہیں اور عہدِ نبوی میں بھی وہ انھیں پہنتی تھیں۔ ان کو "پازیب" اردو میں بہت صحیح، برجستہ اور معنی خیز بلکہ حسن افروز نام دیا گیا۔ وہ اپنی وسیع جہات کے لیے بھی خاصا اہم ہے کہ اس کا اطلاق ہر قسم کے زیورِ پا پر ہوسکتا ہے۔ ان میں "اوضاح" (پازیبیں) بھی شامل ہیں اور ان کی دوسری اقسام بھی جیسے گھنگھروں والی پازیبیں (اجراس)، گھنگھرو (جلاجل - واحد جلجل)، بجنے والی پازیب (خلخال - جمع خلاخل) وغیرہ۔

(مصباح اللغات: جرس / اجراس: گھنٹہ/گھڑیال: بجنے کے معنی میں ہے؛ جلجل / جلاجل: گھنگھرو، خلخال/خلاخل: پازیب)

خلخال

- غزوۂ احد ۳/ ۶۲۵ میں خواتین کی پائلوں کا عمومی ذکر ملتا ہے۔ جب مقابلہ ہوا تو دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور عورتیں پہاڑ میں سمٹ کر آ گئیں۔ انھوں نے پنڈلیوں سے کپڑے اوپر چڑھا لیے تھے اور ان کی پائلیں دِکھنے لگی تھیں: "فلما لقینا هربوا، حتی رأیت النساء یشتددن فی الجبل، رفعن عن سوقهن قد بدت خلاخلهن... الخ" حدیث: ۴۰۴۳، بخاری (کتاب المغازی، باب غزوة احد؛ فتح الباری، ۷/ ۴۳۷)۔ یہ قریشی خواتین کا ذکر ہے۔ قریشِ مکہ غزوۂ احد میں اپنی خواتین کے ساتھ آئے تھے تاکہ ان کے سبب وہ میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہ سکیں۔ ابن اسحاق نے ان خواتین قریش کے نام گنائے ہیں اور وہ سب کی سب اکابرِ قریش کی بیویاں اور ممتاز شخصیات تھیں۔ دوسرے مورخین کے مطابق مشرک خواتین کی تعداد اس غزوہ میں پندرہ تھی۔ بہرحال اس حدیث میں اور بعض دوسری احادیث میں انھیں کی پائلوں کا ذکر ہے۔

(بخاری، کتاب الجهاد، باب مایکره من التنازع: حدیث-۳۰۳۹: میں ہے: "...فانا والله رأیت النساء یشتددن، قد بدت خلاخلهن واسوقهن..." یہ حضرت براء بن عازبؓ کا مشاہدہ اور روایت ہے؛ رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین میں ان سب کے اسماء مذکور ہیں، ۱۰۰-۱۰۱ بحوالہ واقدی، ۲۰۲-۲۰۳ ومابعد؛ فتح الباری، ۷/ ۴۵۸-۴۶۴)

ان تمام روایات سے واضح ہوتا ہے کہ قریشی خواتین کا اعلیٰ طبقہ بالعموم پازیبیں پہنتا تھا اور ان میں سے کم از کم پندرہ خواتینِ قریش غزوۂ احد کے نازک موقعہ پر بھی ان کو پہنے ہوئے تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے عمومی استعمالِ خلاخل کا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور وہ غلط نہیں ہوگا۔ دوسرے رواۃِ حدیث نے ایک ہی واقعہ کے بیان میں "خلاخل اور خدم" دونوں الفاظ ایک ہی زیور کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح یہودی خواتین بھی طلائی پازیبیں (خلاخل الذہب) پہنتی تھیں جس کا ذکر خزانۂ آلِ ابی الحقیق۔ خیبر میں ملتا ہے۔(واقدی،۶۷۳)

زیورات بالخصوص پازیبیں حسن افزا اور حسن افروز تو ہوتی ہی ہیں بعض اوقات ایسی فتنہ انگیزی کرتی ہیں کہ انسان بے بس ہو کر حدودِ شرافت پار کر جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک دلچسپ، رومان آگیں اور فطرت نما اور عشقِ مردانہ کا واقعہ عہدِ نبوی میں رونما ہوا اور صرف پائلوں کے سبب رونما ہوا۔ ایک روایت میں خلخال کی بجائے دوسرا لفظ حَجل آیا ہے اور وہ بھی پازیب کا معنی رکھتا ہے۔

(مصباح اللغات: الحَجل و الحِجل و الحِجِل: پازیب، بیڑی اور گھوڑے کی ٹانگ کی سفیدی، جمع احجال و حجول آتی ہے)

۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک شخصِ جوان نے اپنی بیوی سے ظِہار کیا۔ یعنی اسے اپنی محرمات میں سے کسی سے مشابہ قرار دیا اور ابھی اس نے کفارہ ادا نہیں کیا تھا کہ بیوی سے صحبت کر لی۔ ندامت نے اسے خدمتِ نبوی میں پہونچایا اور اس نے رسولِ اکرم ﷺ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تم پر رحم کرے، تم کو کس چیز نے ایسا کرنے پر اکسایا؟ صحابی موصوف نے عرض کیا کہ چاندنی میں اس کی پازیبیں دیکھ لی تھیں اور بس قابو نہ رہا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے انھیں انتظارِ امرِ الٰہی کا حکم دیا۔ بہر حال ان کو کفارہ ادا کرنے کا حکم بھی دیا: "ان رجلا جاء الی النبی ﷺ، قد ظاهر من امرته، فوقع عليها، فقال: يا رسول الله! انی ظاهرت من امراتی فوقعت عليها قبل ان اكفر. فقالَ: ما حملک علی ذلک، يرحمک الله؟ قال: رأيت خلخالها فی ضوء القمر..."

(ترمذی، ابواب الطلاق، باب ماجاء فی المظاهر يواقع قبل ان يكفر؛ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب المظاهر يجامع الخ)۔

ابن ماجہ میں لفظ "خلخالھا" کی جگہ "حجلیھا" (اس کی پازیبیں) ہے۔ بہرحال ان دونوں الفاظ کے مترادف ہونے کے باوجود یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دو قسم کی پازیبیں تھیں اور اس کے تمام زیورات بلکہ دوسری اشیاء میں بھی یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ مترادفات میں معنی/ معانی کا بہرحال فرق ہوتا ہے۔ زیورات میں ان کی ایک قسم ہونے کے باوجود بناوٹ وغیرہ کے لحاظ سے فرق آ جاتا ہے اور اس بنا پر ان کے نام بدل جاتے ہیں۔

پائل/ پائلیں (خَدَم)

"خلخال جمع خلاخل" کا دوسرا مترادف لفظ "خَدَم" (واحد خدمة) استعمال ہوا ہے اور انھیں مشرک خواتین میں سے بعض کی پائلوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ دوسری احادیث میں "خَدم" کا لفظ ازواجِ مطہرات اور صحابیات میں سے بعض کے پیروں کے زیورات کے لیے بھی آیا ہے۔ اہلِ لغات میں صاحب مصباح اللغات نے "الخَدَمَة" کے معنی پازیب وغیرہ بتایا ہے اور وہ پنڈلی کا حلقہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور "الخلخال" کے معنی بھی پازیب لکھے ہیں۔ ان کی بناوٹ کے سبب ان میں یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور فرق رہا ہوگا ورنہ ایک زیور کے لیے دو لفظ نہیں ہو سکتے، ہوتے ہیں تو معنی و مفہوم کا کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ مسلم خواتین نے غزوۂ تبوک کے موقع پر جو زیورات عطیہ کیے تھے ان میں خدمات بھی شامل تھے۔ (واقدی، مذکورہ بالا)

-حضرت زبیر بن عوامؓ ایک مجاہدِ غزوۂ احد تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے ہند بنت عتبہ اور ان کی سہیلیوں کے پیروں کی پائلیں دیکھیں کیونکہ وہ اپنے پائنچے چڑھائے بھاگ رہی تھیں:

"واللہ لقد رایتنی الی خَدَمِ ہند بنت عتبة وصواحباتھا مشمرات ھوارب... الخ" (فتح الباری، ۷/ ۴۳۸)۔ حافظ موصوف نے یہ روایت ابن اسحاق کی کتابِ سیرت سے نقل کی ہے۔

ہند بنت عتبہ ان خواتین قریش میں شامل تھیں جو مکی لشکر کے ساتھ میدانِ احد میں آئی تھیں۔

(ابن ہشام، ۲/ ۷۷؛ ابن اسحاق کا مزید بیان ہے کہ ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہؓ کے قاتل حضرت وحشی کو اپنی پازیبیں (خدمھا) بطور انعام دے دی تھیں؛ ۲/ ۹۱: "أعطت خدمھا وقرطھا وحشیا"؛ یہ دوسرے عینی شاہد کا بیان ہے۔ اس سے قبل حضرت براء بن عازبؓ کے مشاہدہ کا ذکر آ چکا ہے جس میں ان کے لیے لفظ "خلخال" آیا ہے)۔

- ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور صحابیات میں حضرت ام سلیم بنت ملحان انصاری والدۂ حضرت انس بن مالکؓ کے بارے میں حدیثِ بخاری-۲۸۸۰ ہے کہ وہ مسلم زخمی مجاہدوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ اس وقت انھوں نے اپنے پائنچے اوپر چڑھا لیے تھے اور ان کی پازیبیں دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ روایت حضرت انس بن مالکؓ کے عینی مشاہدے پر مبنی ہے جو کئی ابوابِ بخاری میں آئی ہے: "ولقد رأيت عائشة بنت ابی بکر و ام سليم و انها لمشمرتان، اریٰ خَدَمَ سوقهن، تنفز ان القرب... الخ"

(بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب غزو النساء وقتالهن مع الرجال؛ فتح الباری، ۶/ ۹۶؛ اطراف حدیث: ۲۹۰۲، ۳۸۱۱، ۴۰۶۴۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح میں خدم سے مراد خلاخیل ہی کو لیا ہے: "خدَم سوقهما"... وهی الخلاخيل"۔ اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پازیب کی بجائے پیروں کے کڑے تھے جو پازیب سے اوپر پنڈلیوں پر پہنے یا چڑھائے جاتے ہیں۔ "سوق" کا لفظ یہی بتاتا ہے)۔

گھنگھرو (اجراس/ جلاجل)

پیروں میں گھنگھرو بھی باندھے جاتے تھے جو بجتے تھے۔ وہ پازیبوں اور پائلوں میں بھی لگے ہوتے تھے جس کے سبب ان کو بھی گھنگھرو کہا جاتا تھا۔ ان کی دوسری قسم بھی تھی جس کو روایات میں جلاجل کہا گیا ہے۔ ان دونوں زیوروں کا ذکر بعض احادیث میں آتا ہے۔ ان کی ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ کسی مضبوط دھاگے میں بہت سے گھنگھرو خاص کر چھوٹے چھوٹے پرو لیے جاتے تھے اور ان کو پائلوں کی طرح پہنا جاتا تھا۔ ان کے بجنے کی وجہ سے بالعموم اشراف کی خواتین ان سے پرہیز کرتی تھیں اور ان ہی کی ممانعت بعض احادیث میں ملتی ہے۔ البتہ چھوٹی بچیاں اور باندیاں ان کو پہنتی تھیں جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے:

- حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایت ہے کہ ان کی ایک باندی یا آزاد کردہ کنیز حضرت زبیر بن عوامؓ کی ایک بیٹی/ بچی کے ساتھ حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس گئی اور اس کے پیروں میں گھنگھرو بندھے تھے تو حضرت عمرؓ نے اس کو کاٹ کر پھینک دیا کہ وہ جرسِ شیطانی تھا: "عن ابن الزبير ان مولاة لهم ذهبت بابنة الزبير الیٰ عمر بن الخطاب، وفی رجلها

أجراس، فقطعها عمر، ثم قال: سمعت رسول الله ﷺ "

(ابوداؤد، حدیث: ۴۲۳۰ مندرجہ ذیل - اس روایت میں زیور کے لیے لفظ "اجراس" استعمال ہوا ہے اور ذیل کی حدیث میں جلاجل آیا ہے)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ ان کے پاس ایک بچی آئی اور اس نے بھی گھنگھرو (جلاجل) باندھ رکھے تھے جو آواز کر رہے تھے۔ انھوں نے ہدایت فرمائی کہ جب تک ان کے گھنگھروؤں کو کاٹ کر نکالا نہ جائے اس وقت تک ان کو میرے پاس نہ آنے دیا کرو کیونکہ بقول نبوی ﷺ ایسے جرس والے گھروں میں ملائکہ نہیں آتے۔ یہ دونوں واقعات غالباً بعد کے زمانے کے ہیں لیکن ان دونوں میں گھنگھروؤں کا ذکر ہے: "عن عائشة قالت: بينما هي عندها اذ دخل عليها بجارية، وعليها جلاجل يصوّتن، فقالت: لا تدخلنها عليّ الا ان تقطعوا جلاجلها..." (ابوداؤد، كتاب الخاتم، باب ماجاء في الجلاجل، حدیث: ۴۲۳۱)۔

امام موصوف نے دو مختلف الفاظِ مترادفہ "اجراس" اور "جلاجل" دونوں کو ایک ہی بابِ جلاجل میں بیان کیا ہے اور ان دونوں سے ایک ہی زیور مراد لیا ہے۔ گھنگھرو جو چلتے وقت بجتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی پازیبیں یا پائلیں تھیں جن میں گھنگھرو لگے تھے اس لیے آخری حدیث میں لفظ "جلاجلها" اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بچھوے

- "فتـــخ" کی ایک تعبیر اوپر گذر چکی کہ ان سے مراد پیر کی انگلیوں کے بچھوے تھے۔ بلاذری وغیرہ نے حضرت ہند بنت عتبہ عبشمیؓ کے پیروں کے بچھوے کا ذکر حضرت حمزہؓ کے قتل کے ضمن میں کیا ہے کہ دوسرے زیورات کے ساتھ وہ بھی حضرت وحشی کو دے دیے تھے: "واعطته خواتيم ورق كانت في اصابع رجلها"

(بلاذری، ۱/۳۲۲: حضرت ہندؓ نے حضرت وحشی کو چاندی کی وہ انگوٹھیاں بھی دیں جو ان کے پیروں کی انگلیوں میں تھیں۔ اردو میں ان کے لیے بچھوا/بچھوے استعمال ہوتا ہے، نہیں معلوم اس کی عربی کیا ہے۔ اس روایت میں ان کو پیروں کی انگوٹھی بنا دیا ہے)۔

پازیبیں (اوضاح)

پازیبوں کے بارے میں بالعموم یہ بیان ملتا ہے کہ وہ چاندی کی ہوتی تھیں اس بنا پر ان کی سفیدی کے سبب ان کو "اوضاح" بھی کہا جاتا تھا۔ بعض روایات میں ان کو سونے کے زیورات اور طلائی پازیبیں بھی کہا گیا ہے۔ اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کا ایک حوالہ ایک ام المومنین کے زیورات کے ضمن میں آتا ہے۔ لغوی اعتبار سے زیور کے ضمن میں اس کے دو معانی ملتے ہیں:

"چاندی کا زیور، پازیب" ان کے علاوہ اس کے متعدد معانی ہیں۔ (مصباح اللغات)

۔حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں طلائی پازیبیں/ زیورات پہنتی تھی۔ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا ان کا شمار کَنْزٌ (خزانے) میں ہوتا ہے؟ فرمایا: اگر وہ نصاب کو پہونچ جائے جس پر تم زکوٰۃ دیتی ہو تو کنز ہے اور زکوٰۃ ادا کر دیا وہ نصاب کو نہ پہونچے تو کنز نہیں ہے۔ "عن ام سلمة قالت: كنت البس اوضاحا من ذهب. فقلت : يا رسول الله! أكنزٌ هو؟ فقال: مابلغ ان تؤدى زكاته فزكى فليس بكنز [حاشیہ/شرح میں ہے: جمع وضح: وهو نوع من الحلى، وقيل: الخلخال؛ اس طرح وہ طلائی پازیب ہوئی۔

(ابوداؤد، كتاب الزكاة، باب الكنز ما هو وزكاة الحلى؛ حدیث:۱۵۶۴)

۔انہیں "اوضاح" کے سبب ایک قتل کا واقعہ بھی رونما ہوا تھا جو یہودی حرص وطمع کا ایک نمائندہ نشان ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ ایک یہودی نے ایک باندی/ بچی کو اس کے اوضاح (پازیبوں) کے لیے پتھر سے قتل کر دیا۔ ابھی اس میں رمق باقی تھی کہ وہ خدمتِ نبوی میں لائی گئی اور اس نے اشارہ سے خاصی تفتیش کے بعد اپنے قاتل کی شناخت کر لی اور وہ بھی اسی طرح پتھروں سے قتل کیا گیا: "ان يهوديا قتل جارية على اوضاح فقتلها بحجر..."۔ شرح مسلم میں اس کی وضاحت یہ آئی ہے کہ وہ چاندی کا بنا ہوا زیور ہوتا ہے اور اہلِ لغت کا بیان ہے کہ چاندی کو اس کی سفیدی کے سبب "وضح" کہا جاتا ہے اور اس کی جمع اوضاح ہے: "اى لاجل حلى لها من قطع فضة. ذكر اهل اللغة ان الفضة تسمى وضحا لبياضها، ويجمع علىٰ اوضاح"

(مسلم، كتاب القسامة، باب ثبوت القصاص الخ؛ ابوداؤد، كتاب القسامة، باب القود بغير حديد)

بچوں کے زیورات

عرب جاہلی اور عہدِ نبوی دونوں میں کمسن بچوں اور لڑکوں کو بھی بعض زیور پہنائے جاتے تھے، اگرچہ بعض روایات ان کو ناپسندیدہ عمل قرار دیتی ہیں۔ ان میں قُلبَیْن (کنگن) شامل ہیں۔ اس کا واحد قُلب ہے لیکن دونوں ہاتھوں میں پہنانے کے سبب ان کا تثنیہ (دو) کا صیغہ آتا ہے۔ اس کے لیے دوسرا لفظ سوار/سوارین بھی ہے۔ ان دونوں کو مترادف قرار دے کر دونوں کے معانی کنگن بتائے جاتے ہیں (مصباح اللغات) لیکن بہرحال ان دونوں میں فرق ضرور تھا۔ وہ ایک ہی قسم کے دو زیور تھے جو ہاتھوں کی کلائیوں میں پہنے جاتے تھے۔

- حضرت فاطمہؓ نے حضرات حسنینؓ کو چاندی کے دو کنگن پہنا دیے تھے اور دروازے پر ایک پردہ ڈال لیا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ ایک غزوہ سے واپس آئے تو یہ دیکھ کر گھر میں تشریف نہیں لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ نے پردہ پھاڑ ڈالا اور دونوں بچوں کے کنگن اتار لیے۔ وہ دونوں رسولِ اکرم ﷺ کے پاس روتے ہوئے گئے تو آپ ﷺ پر بہت اثر ہوا اور آپ ﷺ نے اپنے مولیٰ حضرت ثوبانؓ سے فرمایا کہ ان کے ساتھ مدینہ کے فلاں گھر جاؤ۔ مجھے ناپسند ہے کہ میرے اہل بیت اپنی تمام طیب چیزیں اپنی دنیاوی زندگی میں ہی کھالیں۔ اے ثوبان! فاطمہ کے لیے ایک خوشبودار لکڑی یا ہڈی کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ: "...**وفلّت الحسن والحسين قُلْبين من فضة، فقدم فلم يدخلْ... وفككت القلبين عن الصبيين وقطعته بينهما، فانطلقا الىٰ رسولِ الله ﷺ وهما يبكيان، فأخذه منهما. وقال: يا ثوبان. اذهب بهذا الىٰ آل فلان: اهل البيت بالمدينة ... يا ثوبان ! اشتر لفاطمة قلادة من عصب، وسوارين من عاج...**"

(ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی الانتفاع بالعاج، حدیث:۴۲۱۳)

- رسولِ اکرم ﷺ نے اسی طرح اپنی چہیتی نواسی حضرت امامہ بنت ابی العاص عبشمیؓ کو وہ سونے کی انگوٹھی عطا کی تھی جو آپ ﷺ کے پاس حضرت نجاشیؓ کی طرف سے ہدیہ میں آئی تھی اور جس کا نگینہ حبشی تھا اور ان کو بلا کر عطا فرمایا تھا کہ بیٹی اس کو پہن لو: "...**تحلّي بهذا يا**

بنیة"۔ حدیث ابوداؤد: ۴۲۳۵ (ابوداؤد، باب فی الذهب للنساء، حدیث: ۴۲۳۵)

-حضرت حسن بن علیؓ کے بارے میں ایک حدیث بخاری ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ سوق بنی قینقاع سے واپسی پر حضرت فاطمہؓ کے گھر ٹھہرے اور حضرت حسن کو پکارا۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے تو ان کے گلے میں ہار (سخاب) تھا: "وفی عنقه السخاب"

(بخاری، باب السخاب للصبیان، حدیث: ۵۸۸۴؛ خواتین کے زیورات کے باب میں بھی یہ حدیث آئی ہے اور اس کے معنی قلادہ یعنی ہار کے ہی بیان کیے گئے ہیں؛ فتح الباری، ۱۰/ ۴۰۸ نیز کتاب البیوع وغیرہ کا باب مذکورہ بالا)

ان دونوں روایات و احادیث سے بہر حال یہ واضح ہوتا ہے کہ لڑکوں / بچوں کو دو قسم کے زیورات پہنانے کا رواج تھا: ایک دونوں ہاتھوں میں کنگنوں کا خواہ وہ چاندی کے ہوں یا ہاتھی دانت اور ہڈی کے اور دوسرے گلے میں ہار جیسی چیز پہنانے کا جس کے مختلف نام تھے جیسے سخاب وغیرہ۔ ذیل کی حدیث سے بھی بچوں کو زیورات پہنانے کا رواج معلوم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ کانوں کی بالیوں / حلقوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ بعد میں ان کو بچوں / لڑکوں کے لیے مناسب نہیں سمجھا گیا اور ان میں سے بھی چاندی یا سونے کے زیورات کو، ہاتھی دانت وغیرہ کے زیورات کا سلسلہ تب بھی چلتا رہا۔

بچوں کے زیورات کے سلسلہ میں رسولِ اکرم ﷺ کی ایک محبت آگیں تمنا کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

-رسولِ اکرم ﷺ کو حضرت اسامہ بن زید کلبیؓ سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کے بچپن میں ان کو آپ ﷺ کھلاتے تھے، لاڈ کرتے تھے تو فرماتے کہ اگر اسامہ لڑکی ہوتا تو میں اسے خوب اچھے اچھے کپڑے پہناتا اور اسے زیوروں سے آراستہ کرتا: "...وقال: لو كان اسامة جارية لکسوته و حلیته..." (اسد الغابہ، ۱/ ۶۵)

-واقدی کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت اسامہؓ کے فرزند کے لیے بھی یہی تمنا کی تھی اور ان کے لیے چاندی کے دو کنگنوں اور دو بالیوں کے بنوانے کا ذکر فرمایا تھا: "ان شاء الله يجعل لها مسكان من ورق، وقرطان" (واقدی، ۱۱۲۵ نیز حاشیہ مرتب)

سنار اور سناری

زیورات گڑھنے اور بنانے والے خاص لوگوں کے طبقات تھے جن کو سنار (صائغ جمع صاغة وغیرہ) کہا جاتا ہے۔ سونے چاندی اور دوسری دھاتوں کے علاوہ مختلف دوسری چیزوں کے زیور بنانے والے بھی تھے۔ اور ان سے کوئی شہر خالی نہ تھا۔ ان کے علاوہ زیورات کی فراہمی تجارت کے ذریعہ بھی ہوتی تھی اور وہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں یمن، ظفار وغیرہ کے علاوہ قریبی ممالک جیسے شام و عراق اور حبشہ و ایران وغیرہ سے بھی لائے جاتے تھے اور ان کے ذریعہ دوسرے بڑے اور مشہور مراکز زرگری سے بھی۔ فی الحال تجارتی سرگرمی سے بحث نہیں البتہ سناری اور زرگری کے ایک مختصر جائزے سے ضرور سروکار ہے۔

- مکہ مکرمہ کے طبقہ یا افرادِ زرگری کا ذکر ذرا کم ملتا ہے مگر زیورات کے استعمال سے ان کے وجود اور کارگذاری کا یقین ہوتا ہے۔

- مدینہ منورہ کے بارے میں سب سے مشہور زرگروں کا ذکر خوب ملتا ہے اور وہ بنو قینقاع کے یہودی زرگروں اور سناروں کا قبیلہ تھا۔ روایاتِ سیرت میں بہت صراحت سے اور احادیث میں کافی وضاحت سے ان کے ماہر صناع اور فن کار زرگر اور سنار ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اوپر ایک مسلم عورت کی بے عزتی اور غزوۂ بنی قینقاع کے محرک کے سلسلہ میں ان کے ایک زرگر (صائغ) کا حوالہ بھی گذر چکا ہے۔ دوسری روایات سیرت میں ان کے ماہر سنار اور عظیم زرگر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

- ہاتھی دانت اور دوسری اشیاء کے زیوَرات بنانے والوں یا فروخت کرنے والوں کا ذکر اوپر حضرت فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحبزادگان گرامی قدر۔ حضرات حسن و حسینؓ۔ کے حوالے سے احادیث میں آیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے مولیٰ حضرت ثوبانؓ کے ذریعہ اہل بیت کے لیے عاج (ہاتھی دانت) اور عصب (خوشبودار لکڑی / ہڈی) کے زیورات میں کنگن اور ہار منگوائے تھے۔ حدیث ابوداؤد: ۴۲۱۳ میں "آل فلان" کہہ کر ان کی شناخت واضح نہیں کی لیکن یہ صراحت ضرور موجود ہے کہ وہ مدینہ کا ایک خاندان تھا: "اهل البيت بالمدينة"

- یہ یقینی ہے کہ مکہ مکرمہ بالخصوص مدینہ منورہ میں مسلم زرگر بھی تھے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ قینقاعی زرگروں کی طرح ماہر فن نہ ہوں لیکن وہ کام چلاؤ یا اوسط درجہ کے سنار و زرگر ضرور تھے۔ مدینہ منورہ آج بھی فن زرگری میں معروف ہے۔

- اسلامی ریاست و معاشرے کے دوسرے علاقوں میں بھی بہر حال سنار و زرگر ضرورت تھے کیونکہ بقول شخصے جہاں خواتین اور عورتیں ہوں گی وہاں زیورات بھی ہوں گے اور زیورات ہوں گے تو ان کے بنانے والے بھی ہوں گے۔

- بعض خواتین خانہ بھی چاندی اور سونے کے تاروں اور پتروں سے اپنے ہلکے پھلکے زیورات خود بھی بنا لیتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے اپنے ایک زیور -فتخ- موٹی انگشتریوں- کے بارے میں عرض کیا تھا کہ میں نے ان کو آپ ﷺ کے لئے سجنے کی خاطر خود بنایا ہے: "صنعتهن، اتزين لک يا رسول الله!" - حدیث ابوداؤد: ۱۵۶۵۔ اس سے یہ قیاس صحیح کیا جا سکتا ہے کہ خواتین خانہ اور صحابیات ہار، بالی، جھمکے اور دھاگوں میں پروئے جانے والے گھنگھرو وغیرہ اور بعض دوسرے ہلکے پھلکے زیور خود بنا لیا کرتی تھیں۔

✪✪✪

مبحثِ سوم

تعمیرات

عہدِ نبوی کی تعمیراتِ خانہ کعبہ

انسانی معاشروں میں دوقسم کی تعمیرات کا سراغ قدیم زمانے سے ملتا ہے: ایک عبادت الٰہی کے لیے تعمیراور دوسری اپنی ذاتی رہائش کے لیے تعمیرِ مکان۔ خانۂ خدااور بیت/ بیوت اللہ کی تعمیر کی تاریخ سے سردست اس وقت بحث نہیں ہے کہ وہ موضوع کا نکتہ نہیں تاہم بیت اللہ کی تعمیر کا ذکراوراس کی مختصر تاریخ کا حوالہ ضروری ہے کہ وہ عرب تمدن کا بھی اسی طرح ایک عظیم ترین اظہار رہا ہے جس طرح دین اسلام کا۔قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ میں اسے عربوں کی سماجی، اقتصادی اورتمدنی زندگی کا محوراوران کی جان مال کا محافظ کہا گیا ہےاوراس کی یہ دونوں خصوصیات اس کی تعمیر کے روزاولیں سے اس میں موجود ہیں اور تعمیرِابراہیمی-اسماعیلی سے تو ان کا تسلسل ملتا ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر وتزئین ہو یا اس کے اردگرد کی مسجد حرام کی تعمیر وتزئین، اس کا سلسلہ آج تک جاری ہےاور قیامت تک جاری رہے گا۔لیکن اس بحث میں صرف عہدِ نبوی کی تعمیر وتزئین سے ہمیں سروکار ہے۔

اولین قریشی تعمیرِ کعبہ

سیرتِ نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ سیلاب کے پانی اور دوسری جغرافیائی بلیات کے سبب رسولِ اکرم ﷺ کے لڑکپن میں، جب آپ ﷺ کی عمر شریف دس بارہ سال کی تھی، یعنی ۵۸۱ء یا اس کے کچھ بعد، قریش کے اکابر نے خستہ ونزار عمارتِ کعبہ کو از سرِنو تعمیر کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اسے اپنے پاک مال سے اصل بنیادوں پر پھر سے استوار کردیا۔ اس کی تعمیر کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں تاہم اس میں رسولِ اکرم ﷺ اور عم مکرم حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کے حصہ

لینے کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ آپ ﷺ اپنے چچا کے ساتھ تعمیر کے لیے قریب کے پہاڑ سے پتھر ڈھوڈھو کر لا رہے تھے۔ پتھر بڑے بڑے تھے اور عمریں کچی پکی۔ لہٰذا چچا نے مشورہ دیا کہ ان پتھروں سے شانوں سے رگڑ کھانے اور زخمی ہونے سے بچانے کے لئے اپنی ازار مبارک اتار کر شانہ اقدس پر رکھ لیں۔ مشورہ پر عمل کیا ہی تھا کہ عریانی کی دہشت سے بیہوشی طاری ہوگئی اور اسی عالمِ بیخودی میں ہدایتِ ربانی بذریعہ فرشتہ آئی کہ آئندہ کبھی جامہ عریانی نہ پہنیں۔

حدیث بخاری:۳۶۴:...ان رسول الله ﷺ كان ينقل معهم الحجارة للكعبة وعليه ازاره، فقال له العباس عمه : يا ابن اخي! لو حللت ازارک فجعلته على منكبيک دون الحجارة . قال : فحلّه فجعله علىٰ منكبيه، فسقط مغشيا عليه، فمارئي بعد ذلک عريانا .(اطراف حدیث:۱۵۸۲، ۳۸۲۹؛ فتح الباری، ۱/۶۱۵ بحوالہ طبرانی جس میں عریاں چلنے کی ممانعت کا ذکر ہے:"نهيت ان امشي عريانا" نیز مفصل بحث کے لیے: وحیِ حدیث، ۱۹-۲۰)

-خانہ کعبہ کی چھت پاٹی گئی تو حطیم کی جانب ایک پرنالہ رکھا گیا تا کہ بارش کا پانی چھت سے نیچے گر جائے۔ اس کو میزابِ رحمت کہا جاتا ہے اور اس کی ایک دینی، سماجی اور تمدنی حیثیت بھی ملتی ہے۔ وہ یہ کہ اس میزاب کے نیچے کھڑے ہو کر جو بارش کے پانی سے نہالے اس کو رحمتِ الٰہی گھیر لیتی ہے اور اس کو سعادتِ دارین ملتی ہے۔ عہد جاہلی اور عہد اسلامی نبوی دونوں میں اس کے نیچے نہانے کی روایت ہی نہ تھی بلکہ اس کے لیے مسابقت بھی ہوتی تھی۔ یہ دینِ ابراہیمی اور اسلام کے درمیان تاریخی اور تشریعی تسلسل کے ساتھ سماجی و تمدنی ارتباط کے تسلسل کی ریت ہے۔

-عہدِ نبوی میں کعبہ کی عمارت اٹھارہ ہاتھ کی تھی:"كانت الكعبة علىٰ رسول الله ﷺ ثماني عشرة ذراعاً۔ (ابن ہشام، ۱/۲۱۵ و مابعد)

-حطیم کا حصہ نیم دائرہ کی شکل میں ہے جب کہ خانہ کعبہ کی مسقف عمارت چوکور (مربع) ہے۔ اس کا ایک تعمیراتی زاویہ یہ ہے کہ حطیم کا حصہ جب تعمیر ابراہیمی-اسماعیلی میں شامل تھا تو وہ اسی طرح نیم مدور تھا۔ قریشی تعمیرِ دوم میں اس کو اصل ابراہیمی بنیادوں پر نہ صرف چھوڑا گیا بلکہ حطیم کی حدود کی باقاعدہ تعیین کر دی گئی تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ کعبہ کا ہی حصہ ہے۔

-اس کی دینی اور تشریعی اہمیت یہ ہے کہ طواف میں حطیم کے حدود کے باہر ہی سے چکر لگانا ضروری ہے۔ اگر کوئی حطیم کے اندر سے طواف میں گذر جائے تو اس کا طواف نہ ہوگا۔ یہ

عہدِ جاہلی کی بھی شریعت ہے اور دور نبوی کی بھی ہے۔

-اس کا ایک اور دینی پہلو یہ بھی ہے کہ جو کوئی حطیم کے اندر نماز پڑھے یا عبادت کرے تو گویا اس نے خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھی اور عبادت کی۔

-ایک تمدنی پہلو یہ ہے کہ حجۃ الوداع / فتح مکہ میں رسولِ اکرم ﷺ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور وہاں نماز پڑھی اور باہر آ کر حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حسرت کا اظہار فرمایا کہ خانہ کعبہ کے اندرون میں امت کے ہر کس و ناکس کا داخلہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مرضی اکابر اور منشائے کلید بردار پر منحصر ہے۔ حطیم کے خانہ کعبہ کی عمارت کے باہر رہ جانے میں حکمتِ الٰہی یہی معلوم ہوتی ہے کہ بیکسان و بیچارگانِ امت بھی خانہ کعبہ یا بیت اللہ کے اندرون میں داخل ہو کر وہی سعادت اصلی حاصل کرسکیں۔

-حطیم کو خانہ کعبہ کی عمارت میں شامل کرنے کے ارادۂ نبوی اور اس کی تکمیل نہ کرسکنے کی ایک بلکہ اصلی وجہ یہی حکمت الٰہی ہے۔

(بخاری، کتاب التفسیر، وقالوا اتخذ اللہ الخ؛ مسلم، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ وبنائھا، حدیث: ۳۹۸ (۱۳۲۳ و مابعد)

مولانا شبلیؒ اور بعض دوسرے مورخین اور سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ اس اولین تعمیر قریش میں حسب سابق کعبہ مشرفہ کی صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں اور وہ بھی صرف قد آدم اونچی۔ ان پر چھت نہ تھی، وہ موجودہ دور کی عیدگاہوں کی مانند تعمیر تھی۔

کعبہ کی دوسری تعمیرِ قریش

روایاتِ سیرت و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ مشرفہ کی دوسری تعمیر قریش نے اس کے بعد بڑے پیمانے پر کی۔ اختلاف روایات کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کی عمر شریف پچیس یا پینتیس سال تھی۔ بہرحال اس وقت تک آپ ﷺ محترم شخصیت بن چکے تھے، اس دوسری تعمیر کعبہ کی تفصیلات کافی ہیں۔ مولانا شبلیؒ اور بعض دوسرے اکابر کے بیانات کو قدیم روایات سے مدلل کر کے بشکل نکات ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

۱- مضبوط تعمیر کے لیے یہ طے کیا گیا کہ موجودہ عمارت کو گرا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم عمارت بنائی جائے۔

۲- قریش کے تمام خاندانوں/ بطون کو عمارت کے مختلف حصے تفویض کر دیے گئے کہ وہ اپنے اپنے حصہ کی تعمیر کریں۔

۳- سب کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ اپنے صرف پاک مال، سود سے مبرا مال سے سامانِ تعمیر خرید کریں اور اس میں لگائیں۔

۴- اسی زمانے میں جدہ کی بندرگاہ میں ایک رومی جہاز ٹوٹ گیا۔ ایک مخزومی سردار ولید بن مغیرہ نے اس کے تختے خریدے۔

۵- جہاز کے رومی معمار باقوم کو بھی ساتھ لائے اور اس نے تعمیر کعبہ میں مدد دی۔

۶- دیواریں پتھروں کی اور چھت لکڑی وغیرہ کی بنائی گئی اور اس کی روک کے لیے متعدد چوبی ستون لگائے گئے یہ تعمیر مسقف تھی، بروایت بخاری: ۵۰۵؛ فتح مکہ کے دن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اندر داخل ہوئے تو بیت اللہ کے چھ ستون تھے: کان البیت یومئذ علیٰ ستة اعمدة۔

۷- پھر ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کعبہ نہیں کی جا سکی کہ ان قریشی اکابر کا پاک مال ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا شمالی جانب ایک حصہ چھوڑ دیا گیا کہ آئندہ اسے شامل کر لیں گے اور وہ نہ ہو سکا۔ البتہ مقام ابراہیم کی جانب بیت اللہ میں ایک کافی اونچا دروازہ رکھا گیا جو اس سے قبل نہ تھا یا تھا تو بہت نیچا تھا۔

۸- صفا کی جانب بیت اللہ کے دروازے کے پاس حجر اسود رسولِ اکرم ﷺ نے تمام اکابر قریش کی تحکیم کے بعد اس کے مقام پر نصب فرمایا۔

مسجد حرام

خانہ کعبہ کے اردگرد کی عبادت گاہ مسجد حرام کے قرآنی نام سے مشہور و موسوم ہے:
سورۂ اسراء کی اولین آیت کریمہ میں اسی مسجدِ حرام سے رسولِ اکرم ﷺ کو اسراء و معراج کے

دوگانہ سفر پر لے جانے کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی مسجدِ حرام میں امن وسلامتی کے ساتھ حلق یا قصر کر کے داخل ہونے اور عمرہ وحج کرنے کا ذکر سورۂ فتح: ۲۷ میں ہے۔ جب کہ اسی سورہ کریمہ کی آیت ماقبل: ۲۵ میں کفار مکہ کے مسلمانوں کو حج وعمرہ سے روکنے اور ہدی کو نہ پہونچنے دینے کا بیان ہے۔ قبلہ اور تحویل قبلہ کے ضمن میں اس مسجد حرام کا ذکر متعدد آیات میں آیا ہے: بقرہ: ۱۴۴، ۱۴۹-۱۵۰ وغیرہ۔ اور اس کے قریب جنگ وجدال سے ممانعت اور دوسری ہدایات ربانی کا ذکر بھی بہت سی آیات کریمہ میں ہے جیسے: سورۂ بقرہ: ۱۹۱، ۱۹۶، ۲۱۷؛ سورۂ مائدہ-۲؛ سورۂ انفال: ۳۴؛ سورۂ توبہ: ۷، ۱۹، ۲۸؛ سورۂ حج: ۲۵۔

بایں ہمہ اس مسجد حرام کی تعمیر وعمارت سازی کے بارے میں معلومات ذرا کم ملتی ہیں اور عہدِ نبوی کی تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار اے، جے وینسنک (A.J.Wensink) اور ادارہ نے بہت ناقص معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ بعد کی تفصیلات تو ہیں مگر عہد نبوی کی بالکل نہیں۔ اور بعض معلومات تو خالص گمراہ کن ہیں جیسے اس کی مشمولہ عمارتیں۔ بہر حال روایاتِ سیرت وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد جاہلی اور عہد نبوی میں ایک کھلا صحن تھا جو کعبہ مشرفہ کے چاروں اطراف کو محیط تھا اور کعبہ مشرفہ سے متصل چاروں طرف کے علاقے کو ہموار کر کے کسی قدر پکا کر لیا گیا تھا جہاں نمازیں پڑھی جاتی تھیں اور اسی کے پاس کے علاقے میں طواف کیا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ کھلا صحن مسجد حرام بھی تھا اور مطاف کعبہ مکرمہ بھی تھا۔ حدیث بخاری: ۳۸۳۰ میں واضح بیان ہے کہ بیت اللہ کے گرد کوئی احاطہ نہیں تھا اور لوگ بیت اللہ کے قریب/ چاروں طرف نماز پڑھتے تھے تا آنکہ خلافت فاروقی میں اس کے گرد احاطہ بنایا گیا: "لم یکن علی عہد النبی ﷺ حول البیت حائط ... حتی کان عمر فبنی حولہ حائطاً ... باب بنیان الکعبة"۔

-اسی مطاف کے قرب وجوار میں اکابرِ قریش کی مندیں صبح وشام جمائی جاتی تھیں۔ ان کی سماجی، تہذیبی، دینی اور تمدنی جہات تھیں۔ ہر شیخ/ رئیس بطن وخاندان کی الگ مجلس (نادی) ہوتی تھی جہاں وہ اپنے اکابرِ خاندان اور حامیوں کے ساتھ پرے جماتا تھا۔ قرآن مجید، احادیث نبوی اور روایات سیرت میں ان قریشی اندیہ کی تفصیلات ملتی ہیں، ان قریشی مجالس و "اندیہ"

کی بڑی سماجی اور تمدنی اہمیت تھی۔ وہ تمام قبائلی معاملاتِ روزمرہ اور سماجی امور پر وہیں بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب بن ہاشم کی النادی یا مجلس کا ذکر روایات میں خاصی تفصیل کے ساتھ آتا ہے۔ ''عبدالمطلب ہاشمی کے لیے دوسرے اکابر قریش کی مانند سایۂ کعبہ کے نیچے فرش لگایا جاتا۔ وہ مسند عبدالمطلبی تھی، اس پر ان کے سوا اور کوئی بیٹھ نہ سکتا تھا حتیٰ کہ ان کے فرزند گرامی قدر بھی اس پر پیر نہ دھرتے اور صرف حاشیہ ہی پر بیٹھتے۔ صرف رسولِ اکرم ﷺ کو اس مسند عالی شان پر بیٹھنے کی اجازت تھی کہ وہ عظیم دادا کے عظیم ترین پوتے اور دلارے تھے''۔

(ابن ہشام، ۱/ ۱۸۰؛ سہیلی ۲/ ۱۸۱-۱۸۲ و مابعد؛ بلاذری، ۱/ ۸۱؛ ابن سعد، ۱/ ۱۱۷-۱۱۹؛ حلبی، ۱/ ۱۰۸-۱۰۹؛ یعقوبی، ۲/ ۱۲؛ عبدالمطلب ہاشمی، ۲۶، ۷؛ نیز مکی اسوۂ نبوی...'' کی فصل: دفاعی اقدام کا حق بالخصوص ۱۷۶-۱۷۹ و مابعد)

- مسجدِ حرام کے چوطرفہ مدور گھیرے کو مختلف مقامات کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کے مختلف ارکان یا ان کے حصوں اور اہم ترین چیزوں سے موسوم تھے یا خاص عطایائے الٰہی سے نسبت رکھتے تھے اور ان سے موسوم تھے مثلاً مقامِ حجر مقدس ترین پتھر- حجر اسود- سے موسوم تھا۔ اسی طرح دوسرے مقامات تھے اور ان کا ذکر طواف کے اشواط کے ضمن میں ملتا ہے یا رسولِ اکرم ﷺ کو قریشی اکابر کے ایذا دینے کے واقعات کے ضمن میں۔ ان مقامات کی بڑی سماجی، دینی تمدنی اہمیت تھی۔ اسی مذکورہ بالا مقامِ حجر میں عقبہ بن ابی معیط اموی، ابوجہل مخزومی اور امیہ بن خلف جمحی وغیرہ نے ہر شوطِ طواف میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بدتہذیبی کی تھی۔

(فتح الباری، ۷/ ۲۱۲-۲۱۳؛ مکی اسوۂ نبوی، ۱۷۶)

مساجدِ اسلامی

بالعموم مساجدِ اسلامی میں مدینہ منورہ کی مسجد نبوی سب سے زیادہ مشہور ہے اور اس کے بعد مسجد قباء کی شہرت ہے۔ لیکن یہ دونوں اور بہت سی دوسری مساجدِ نبوی مدنی دور کی ہیں۔ ان سے بہت پہلے مکی دور میں بہت سی مساجد اسلامی تعمیر کی گئی تھیں۔ ''مکی اسوۂ نبوی'' میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، یہاں اسی کا ایک خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱- مکہ کے بالائی حصہ میں مسجد نبوی جہاں آپ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کی امامت میں نماز پڑھی تھی۔

۲- گھریلو مسجد نبوی جس میں آپ ﷺ روزانہ شب کو بالخصوص نمازیں ادا فرماتے تھے۔

۳- صحابہ کرام میں حضرات ابوبکر صدیق، عمار بن یاسر اور بعض دوسرے مسلمانوں کی مسجدوں کا ذکر ملتا ہے۔

۴- اسلام قبول کرنے والے قبائل جیسے اسلم وغفار، مزینہ، عبدالقیس وغیرہ کی مساجد کی تعمیر کا خاص بیان آتا ہے بالخصوص موخر الذکر کی مسجد جواثی کا۔ اسی طرح ہجرت نبوی سے قبل مدینہ منورہ میں بعض مساجد کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔

- ان تمام مساجد کی تعمیراتی نوعیت دو طرح کی تھی: اول گھریلو مسجدیں تھیں جو احاطہ، صحن بیرونی کے ایک حصہ کو خاص کرنے کا مقام تھا۔ اس کی کسی چیز سے حد بندی کر لی جاتی تھی اور اس کا قبلہ بھی متعین کر کے اس کی علامت مقرر کر لی جاتی تھی جیسا کہ مسجد نبوی میں ذکر آتا ہے۔ دوسری باقاعدہ مسجدیں تھیں جو بالعموم کسی باڑے کو صاف کر کے اس پر چھپر وغیرہ ڈال کر کے ان کو مسجدوں کی شکل دے دی جاتی تھی۔ ان مساجد خاص میں بھی قبلہ کی تعیین کا نمایاں اظہار کیا جاتا تھا۔

مسجد قباء: خاندان بنونجار کی ایک زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں اور کچھ کھجور کے درخت تھے۔ وہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ آپ ﷺ نے اس کی قیمت ادا کر کے زمین مسجد کے لیے خریدی۔ تعمیر میں صحابہ کرام کے ساتھ آپ ﷺ حسب معمول پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے۔ دیواریں پتھروں کی تھیں یا پکی اینٹوں کی، برگ خرما کا چھپر، کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ بیت المقدس کی طرف یعنی جانب شمال رکھا گیا، دروازہ جنوبی سمت میں تھا۔ بعد میں شمالی جانب ایک دروازے کا انتظام تحویل قبلہ کے بعد کیا گیا۔ فرش بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی تو صحابہ کرام نے اپنے اپنے حصہ میں کنکریاں بچھا لیں۔ آنحضرت ﷺ نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔ چھت بھی کھجور کی شاخوں اور پتیوں کی تھی، اس پر مٹی کا لیپ کر کے مضبوط کیا گیا، چھت کی ''پختگی'' سے کسی قدر راحت ملی۔ قبلہ نما کے پاس ہی محراب نبوی تھی اور اسی سے متصل

منبرِ نبوی جو پہلے کھجور کا ایک ٹوٹا تنہ تھا بعد میں اس کی جگہ خاص لکڑی کا تین زینوں والا منبر بنوایا گیا۔ احادیث میں ان دونوں کے بارے میں کافی تفصیل اور معجز واقعات کا ذکر ملتا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کے حجرات۔ مکانات ازواج مطہرات۔ اور منبر نبوی کے درمیان کا علاقہ جنت کی کیاری "روضة من روضات الجنة" کہلاتا ہے۔ اس میں نماز و عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور شفاعت نبوی کا اس پر وعدہ ہے لہذا وہاں ہر دور میں شدید اژدحام ہوتا ہے۔ اسی طرح مسجد نبوی کے مختلف ستونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ دینی سے زیادہ سماجی اور تمدنی ہے۔

- ان ستونوں کے پاس صحابہ کرام نماز نفل بالخصوص مغرب کے فرض سے قبل دو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔

- ایک خاص اسطوانہ/ستون مصحف کے پاس تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ اکثر و بیشتر وہاں نماز پڑھتے تھے اور صحابہ نے بھی آپ کی اتباع کی۔

- ایک اسطوانہ اس لیے مشہور ہوا کہ مشہور صحابی حضرت ابولبابہؓ نے افشائے راز کے جرم میں توبہ کی خاطر اس سے اپنے آپ کو بندھوالیا تھا۔

- دوسرا اسطوانہ ایک شدت پسند صحابیہ حضرت زینبؓ کے اپنے بالوں کے باندھنے کے سببِ مشہور ہوگیا تھا کہ نیند آتی تو وہ اپنے بال اس سے بندھوالیتی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی شدت پسندی کو منع فرمادیا۔

- ایک اور اسطوانہ/ستون سے ثمامہ بن اثال حنفیؓ کو اسلام سے قبل گرفتار کرکے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ قیدی کی سزا تھی۔

- مشہور ترین اسطوانہ حنانہ ہے یعنی وہ ستون یا کھجور کا تنہ جو منبر بننے کے بعد آپ ﷺ کے فراق میں رو دیا تھا اور آپ ﷺ نے اس کو تسلی دی تھی۔

(بخاری، کتاب الصلوٰة، باب هل تنبش قبور الخ، باب بنیان المسجد؛ متعدد دیگر ابواب؛ فتح الباری، ۱/ ۶۸۷-۷۰۰ ومابعد؛ مسلم، کتاب المساجد؛ موطا، کتاب الاعتکاف، ماجاء فی لیلة القدر؛ ابوداؤد، کتاب الصلوٰة، بناء المسجد وغیرہ احادیث: ۴۵۱-۴۶۱ ومابعد)

مسجد نبوی کی توسیع: کا سلسلہ بہت لمبا ہے اور اب تک جاری ہے۔ اس کی چند اولین

توسیعات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے جو بخاری کی حدیث: ۴۴۶ پر زیادہ مبنی ہے (فتح الباری، ۱/۶۹۹ وما بعد) کے مآخذ اور مآخذ تاریخ مدینہ بھی اس کی اساس ہیں۔

عہدِ نبوی کی توسیع: غزوۂ خیبر کے بعد اس کی اولین توسیع کی گئی۔ مسجد تنگ ہونے لگی تو حضرت عثمان بن عفان اموی ؓ نے جنوبی جانب ایک وسیع قطعہ آراضی خرید کر اس میں ملادیا اور اس کے نتیجے میں محراب تو دو تین صف آگے چلی گئی اور منبر بھی اسی کے قریب پہونچایا گیا۔ وہ جنت کی کیاری کے آگے کا حصہ ہے۔ پہلے مسجد نبوی کا احاطہ/محیط سوگز + سوگز تھا۔ بعض کم لمبائی چوڑائی کی بھی روایات ملتی ہیں اور اس توسیع کے بعد ہو گیا تھا: سوگز سے زیادہ طول وعرض بقول مولانا کاندھلوی لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع تھی:

عہد صدیقی میں نبوی دور کے ستون اور چھت خراب ہو گئے تو اسی طرح کھجور کے ستونوں اور پتیوں سے اس کی تعمیر کی گئی۔

عہد فاروقی میں اسی طرح ان کے ستون اور چھت میں تبدیلی کی گئی اور کچی اینٹوں کا استعمال کیا گیا۔

عہد عثمانی میں البتہ کافی توسیع اور تعمیراتی تزئین کی گئی۔ دیواروں اور ستونوں کو منقش پتھروں سے بنایا اور چھت کو شیشم کی لکڑی (ساج) سے تعمیر کیا گیا۔

(احادیث بخاری، مسلم و ابوداؤد بالخصوص موخر الذکر: ۴۵۱-۴۵۸ وغیرہ؛ نیز بخاری، موطا وغیرہ کے مذکورہ بالا ابوابِ کتاب الصلوٰۃ؛ حدیث بخاری: ۴۴۶)

- حدیث و روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد نبوی کے کئی دروازے تھے، کم از کم دو ضرور تھے جن میں سے ایک مردوں کے لیے تھا اور دوسرا خواتین کے لیے، مولانا ادریس کاندھلوی نے تین دروازوں کا ذکر کیا ہے: موجودہ قبلہ کی دیوار میں، دوسرا مغربی دیوار میں جو باب الرحمۃ کہلاتا ہے اور تیسرا دروازہ جو باب جبرئیل کے نام سے مشہور ہے اور جس سے آپ ﷺ آتے جاتے تھے۔ (۱/۴۲۷-۴۲۸)

- ان میں سے ایک دروازہ رسولِ اکرم ﷺ نے خواتین کے لیے مخصوص کیا تھا۔ حضرت عمرؓ باب النساء سے مردوں کو داخل ہونے سے روکتے تھے اور حضرت ابن عمرؓ حکم نبوی کے مطابق

زندگی بھر اس دروازۂ خواتین سے داخل نہیں ہوئے: "عن ابن عمر. قال : قال النبی ﷺ: لو ترکنا ھذا الباب للنساء ... الخ"

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال، حدیث: ۴۶۲-۴۶۴)

- مسجد کی دیوار قبلہ اور دوسرے مقامات پر تھوک وغیرہ کو رسول اکرم ﷺ نے مٹایا اور اس کی جگہ خوشبو- زعفران، خلوق کے عبیر وغیرہ- کو لگایا: (ابوداؤد، احادیث: ۴۷۹، ۴۸۵ وغیرہ) بعض خواتین نے بھی نظافت وطہارت مسجد کا کام کیا جس کا ذکر خوشبو وعطریات کے باب میں گذر چکا۔

- احادیث کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے گھروں میں مسجدیں بنانے اور ان کو صاف ستھرا رکھنے اور خوشبودار بنانے کا حکم دیا: "عن عائشة: امر رسول الله ﷺ ببناء المساجد فی الدور و ان تنظف وتطیب". (ابوداؤد، باب اتخاذ المساجد فی الدور، حدیث: ۴۵۵)

- تمام غزوات کے دوران بالخصوص فتوحات کے بعد مساجد نبوی بنائی گئیں جہاں جہاں آپ ﷺ نے نمازیں پڑھی تھیں۔ جیسے محاصرۂ طائف کے دوران، مسجد طائف اسلام ثقیف کے بعد، تبوک اور مدینہ کے درمیان سترہ مساجد نبوی کا ذکر ابن ہشام نے کیا ہے۔

(ابن ہشام ۲/۴۸۲-۴۸۳، ۵۳۰-۵۳۱ نیز بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد التی علی طرق المدینة والمواضع التی صلی فیھا النبی ﷺ؛ مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، مختلف ابواب)

ابن ہشام کی فہرست مساجد جو مدینہ اور تبوک کے درمیان تھیں یہ ہے:

۱- مسجد تبوک، ۲- مسجد ثنیہ مدران، ۳- مسجد ذات الزرّاب، ۴- مسجد اخضر، ۵- مسجد ذات الخطمی، ۶- مسجد آلاء، ۷- مسجد طرف التبراء/ ذنب کواکب، ۸- مسجد الشق، ۹- مسجد ذی الجیفة، ۱۰- مسجد صدر حوضی، ۱۱- مسجد الحجر، ۱۲- مسجد الصعید، ۱۳- مسجد الوادی/ وادی القریٰ، ۱۴- مسجد الرقعة- شقة بنی عذرہ، ۱۵- مسجد المروۃ، ۱۶- مسجد الفیفاء، ۱۷- مسجد ذی خشب۔

امام بخاریؒ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع راستوں پر ان مساجد نبوی کا ذکر کیا ہے جہاں آپ ﷺ نے نمازیں پڑھی تھیں (فتح الباری ۱/۷۳۳-۷۳۸، احادیث ۴۸۳-۴۹۲)

حافظ ابن حجر نے ان مساجد مدینہ کی فہرست عمر بن شبہ کی اخبار المدینہ کے حوالے سے دی ہے جن کا ذکر بخاری نے شرط پوری نہ ہونے کی بنا پر نہیں کیا۔ ۱- مسجد قباء، ۲- مسجد الفضیخ،

۳-مسجد بنی قریظہ، ۴-مشربہ ام ابراہیم / مسجد شمالی بنی قریظہ، ۵-مسجد بنی ظفر / مسجد البغلۃ، ۶-مسجد بنی معاویہ جو مسجد الاجابہ کے نام سے معروف ہے، ۷-مسجد الفتح، سلع نامی پہاڑ کے قریب، ۸-مسجد القبلتین / بنی سلمہ، اوران کے علاوہ متعدد مساجد جو امتداد زمانہ سے ختم ہو گئیں۔

صفہ

مسجدِ نبوی کی تعمیر کے ساتھ ہی صفہ کی تعمیر کا ذکر آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مسجد کے شمالی جانب میں ایک صفہ بھی بنوایا تھا: لغوی لحاظ سے صفہ کے معانی خاصے دلچسپ ہیں اور ان کو مصباح اللغات کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے:

-''الصفة: ہتھیلی پر رکھے ہوئے دانے؛ صفة السرج والرحل: زین یا کجاوے کی گدی۔

-صفة المسجد: مسجد کا سایہ دار چبوترہ؛ الصفة: گرمی کے لیے مکان جس کی چھت گھاس پھوس سے پٹی ہو۔

-صفة الدھر: زمانے کی ایک مدت۔ اس کی تین جمع دی ہیں: ''صُفَف، صفّات، وصِفاف''

اس لحاظ سے صفہ میں معنوی طور سے حاشیہ، طرف کا ایک مفہوم پوشیدہ ہے جو اس کے تمام اطلاقات میں موجود ہے۔ بہر حال عام طور سے صفہ کو مسجد نبوی کا ایک چبوترہ ہی بتایا گیا ہے۔ مولانا شبلیؒ نے اس کی ایک اور تعریف کی ہے:

تعمیری لحاظ سے وہ ایک چوکور چبوترہ تھا جو بے گھر و بار اصحاب کی سکونت کے لیے بنایا گیا تھا۔ بقول مولانا شبلیؒ ''صفہ سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبوی کے ایک کنارہ پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا...'' آگے چل کر اصحاف صفہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ''...رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے شبلیؒ کے یکساں عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ''. قبلۂ اول کی طرف دیوار اور اس کے متصل جو جگہ تھی وہ ان فقراء و غرباء کے ٹھہرنے کے لیے بدستور چھوڑ دی گئی کہ جن کے لیے کوئی ٹھکانہ اور گھر بار نہ تھا۔ یہ جگہ صفہ کے نام سے مشہور تھی۔ صفہ اصل میں سائبان اور سایہ دار جگہ کو کہتے ہیں...'' اگلا سارا بیان اصحاب صفہ کے متعلق ہے۔ (سیرۃ النبی، ۱/۲۹۲ ومابعد؛ سیرۃ المصطفیٰ، ۱/۴۶۳ ومابعد)

جنازہ گاہ

عام اسلامی ادارہ بھی ہے اور سماجی و تمدنی ضابطہ بھی کہ میت کا جنازہ اس کے گھر کے قریب کسی جگہ بالخصوص قریب ترین مسجد کے پاس رکھا جاتا ہے اور اس کی نماز جنازہ وہاں پڑھا دی جاتی ہے۔ اس میں سہولت بھی ہے۔ عہدِ نبوی میں بھی یہی صورت حال دونوں ادوار میں نظر آتی ہے خاص طور سے مکی دور میں اور اولین زمانہ مدینہ منورہ میں رسولِ اکرم ﷺ کو میت کا جنازہ تیار ہونے پر اور کچھ مدت بعد کسی شخص کے مرنے کے فوراً بعد اطلاع دے دی جاتی تھی۔ اور آپ ﷺ وہاں تشریف لے جاتے اور نماز جنازہ پڑھ دیا کرتے تھے۔ مکی دور میں تو خیر نماز جنازہ مشروع ہی نہیں تھی، مدنی دور میں نماز جنازہ کی مشروعیت کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اس پر کافی لکھا ہے۔

(سیرۃ المصطفیٰ، ۱/۴۳۳-۴۳۴ بحوالہ طبقات ابن سعد و بخاری و فتح الباری؛ مسجد میں نماز جنازہ پر فقہی بحث مختصر بھی ہے)

اس میں ایک تمدنی اور سماجی ارتقاء یہ پیدا ہوا کہ بسا اوقات رسولِ اکرم ﷺ کو خبر دینے میں تردد بھی ہوتا اور آپ ﷺ کی تکلیف و زحمت کے پیش نظر تامل بھی اور اس کی وجہ سے تدفین میں خاصی تاخیر ہو جاتی تھی۔ لہٰذا صحابہ کرام نے یہ فیصلہ کیا کہ جنازہ آپ ﷺ کے گھر کے قریب لے آتے اور آپ ﷺ وہاں نماز جنازہ پڑھا دیتے، اس خاص جگہ پر نماز جنازہ پڑھانے کے سبب اس کا نام ''موضع الجنائز'' پڑ گیا اور وہ خاص مقام جنازہ بن بھی گیا تھا۔ حدیث بخاری: ۱۳۲۹ میں بالخصوص اور اس کی بعض اطراف میں ''مسجد کے قریب موضع الجنائز'' کا واضح ذکر آتا ہے۔ اطراف ہیں: ۳۶۳۵، ۴۵۵۶، ۶۸۱۹، ۷۳۳۲، ۷۵۴۳؛ فتح الباری، ۳/۲۵۴-۲۵۵ وغیرہ۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے مختلف اکابر کے حوالے سے اس موضع الجنائز/ جنازہ گاہ کا ذکر و شرح فتح الباری میں کیا ہے۔ امام ابن بطالؒ کے مطابق مسجد نبوی کے مشرقی جانب مسجد سے متصل جنازہ گاہ تھی: ''أن مصلى الجنائز بالمدينة كان لاصقا بمسجد النبى ﷺ من ناحية جهة المشرق''۔ بعض احادیث جیسے حدیث ابن عمرؓ مذکورہ بالا سے بھی یہی استدلال کیا

ہے کہ مسجد کے قریب خاص نماز جنازہ گاہ تھی "... انه کان بجنب مکان معد للصلاة علیها ..."

(فتح الباری، ۲۵۴/۳: اگلی ساری بحثِ حافظ شافعی نقطۂ نظر کے اثبات میں ہے کہ مسجد کے اندر نمازِ جنازہ جائز ہے)

مکاناتِ نبوی وصحابہ کرام

مکی اور مدنی مکاناتِ اکابر کا ذکر متعدد روایاتِ سیرت واحادیث نبوی میں ملتا ہے اور ان میں فنی تفصیلات بھی جا بجا آتی ہیں محض مکانات کا ذکر زیادہ معنی خیز نہیں ہے اگر چہ وہ بھی تمدنِ عہد کا غماز ہے لیکن ان سے زیادہ ان کے تعمیری پہلوؤں کا ذکر زیادہ اہم ہے اور فنی جہات کے ذکر میں ان کے عمومی بیانات بھی آتے جائیں گے۔ یہ تمدنی اور سماجی حقیقت بھی اجاگر ہوتی جائے گی کہ دوسرے انسانی معاشروں کی مانند عرب جاہلی اور عہدِ نبوی میں مکانات تین قسم کے تھے: ایک مال داروں/اعلیٰ طبقات کے مکانات، دوسرے اوسط طبقات کے مساکن اور تیسرے عام اور غرباء کے جھونپڑے۔ ان میں تمدنی اسباب سے زیادہ اقتصادی اور معاشی وجوہ وعوامل کی کارفرمائی تھی۔

مکی مکاناتِ نبوی کا ذکر کچھ تو جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور کچھ ان کی شادی خانہ آبادی اور ولادتِ نبوی وغیرہ کے حوالے سے آتا ہے۔ اسی طرح صحابہ وصحابیات کے قبولِ اسلام کے ضمن میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے یا ہجرتِ مدینہ میں متروکہ آراضی ومکانات کے حوالے سے آتا ہے۔ ان تمام تفصیلات سے چند اہم تعمیری تفصیلات یا فنی جہات ملتی ہیں:

۱- اول رہائشی کمروں کی تعمیرات اصل مکان کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے مختلف کمرے ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کا خاص کمرہ یا غرفہ وحجرہ ہوتا تھا اور ان کے ساتھ نابالغ بچی بچے تو رہتے تھے مگر بڑے بچوں اور بچیوں کے لیے الگ کمرے ہوتے تھے، دوسرے افرادِ خاندان کی رہائش بھی الگ الگ ہوتی تھی۔ خواہ ان کی معمولی کوٹھریاں یا کولکیاں ہی ہوتی ہوں۔ وہ بہر حال ساتھ نہیں رہتے تھے۔

۲- رہائشی کمروں یا اصل مکان (بیت) کے آگے ایک احاطہ ہوتا تھا جو "دار یا فناء" وغیرہ

کہلاتا تھا۔ یہ غیر مسقف اور بلا تعمیر کھلا ہوا حصہ ہوتا تھا۔ اس احاطہ کے متصل ہی سڑک یا آنے جانے کا راستہ ہوتا تھا۔ اسی کو بیرونی حصہٗ مکان بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی سب سے مشہور مثال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان میں نظر آتی ہے جب حضرت موصوف نے اپنے فناءِ دار/صحن بیرونی میں ایک گھریلو مسجد تعمیر کر لی تھی اور وہاں نماز شب وغیرہ ادا فرماتے اور تلاوتِ کلام الٰہی کرتے تو اسے سننے کے لیے کافروں کے بچے اور خواتین جمع ہو جاتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے مکان کے بارے میں اسی طرح کے فناء دار کا ذکر ملتا ہے اور اس کی مسجد کا بھی۔ دوسرے مکی مکانات میں بھی فناء/ دار کا ذکر ملتا ہے۔

مدنی مکاناتِ نبوی میں بھی فنی اور تعمیراتی جہات کا زیادہ ذکر اور زیادہ تفصیل ملتی ہے جو نسبتاً ہی کہلائی جا سکتی ہے۔ ازواجِ مطہرات کے مکانات دو سے بڑھ کر دس گیارہ تک پہنچ گئے تھے اور وہ ایک ہی قطار میں ملے ہوئے کمرے ہی تھے۔ بقول شبلیؒ وہ دس دس ہاتھ لمبے چوڑے کمرے تھے اور ان کا ایک دروازہ صحنِ مسجد میں کھلتا تھا اور دوسرا باہری راستہ کی طرف۔ اسی سمتِ بیرونی میں چھوٹا سا مختصر صحن یا احاطہ ہوتا تھا جدھر سے رسولِ اکرم ﷺ ازواج مطہرات کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔ غالباً اسی سمت میں صحابہ کرام نے آپ ﷺ کو نماز تراویح پڑھتے دیکھ کر خود بھی شروع کر دی تھی کہ حجرہ کی دیوار چھوٹی تھی (بخاری، مواقیت الصلوٰۃ / حائط) اور حضرات صحابہ اور دوسرے لوگ خدمتِ نبوی میں حاضری دیتے تھے۔ یہ مشرقی سمت تھی جدھر جنت البقیع واقع ہے۔ البتہ مسجد کی سمت میں ان مکاناتِ نبوی بالخصوص حجرۂ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ان کے والد مکرم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام کے گھروں کے دروازے یا کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ ان کو حدیث نبوی میں ''خوخۃ'' کہا گیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کی تشریح کے مطابق وہ چھوٹا سا ایک پٹ کا دروازہ ہوتا تھا اور بسا اوقات دروازہ بلا پٹ کا محض دیوار میں ایک کشادہ/ تنگ در ہوتا تھا۔ (بخاری، حدیث: ۴۶۷ وغیرہ؛ فتح الباری، ۱/۲۲۷ ومابعد)

نبوی مکانات یا ازواج مطہرات کی رہائش گاہوں کا تعمیری انداز یہ تھا کہ وہ مربع کمرے تھے جو لمبائی میں دس ہاتھ تھے اور چوڑائی میں بھی دس ہاتھ (۱۰×۱۰) گویا وہ پندرہ بیس فٹ کے مربع کمرے تھے۔ ان کی دیواریں کچی اینٹوں/ گارے یا پتھروں کی تھیں اور چھتوں کو بھی پتھروں سے

پاٹا گیا تھا۔ غالباً لکڑی کے شہتیروں پر پتھروں کے چوڑے تختے رکھ کر ان کو کسی چیز یا مصالحہ سے جوڑ دیا گیا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک غرفہ۔ غرفۂ حضرت حفصہؓ۔ کی چھت پر رسولِ اکرم ﷺ نے پیشاب کرنے کے لیے دو اینٹیں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہ سب یک منزلہ کمرے تھے اور ان کی اونچائی کافی تھی۔ لیکن ایک۔ کم از کم ایک۔ کمرے یا غرفۂ نبوی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ چھت کے اوپر ایک بالا خانہ/مشربہ بھی تھا جہاں رسولِ اکرم ﷺ نے ایلاء کے زمانے میں قیام فرمایا تھا اور اس میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک سریر نبوی سما سکے اور دوسرے زائرین کے لیے بیٹھنے کی جگہ باقی بچ رہے۔ اوپر چھت سے پانی کی نکاسی کے لیے ایک پرنالہ ضرور ہوتا تھا۔ مشربہ/علیہ کے اندر کا درجہ کھجور کے ستونوں (جذوع) سے بنایا گیا تھا۔ واقعہ ایلاء میں اس کے اسباب جیسے چٹائی (حصیر) وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب المظالم، باب الغرفة و العلية المشرفة ؛ ترمذی، ابواب الصوم، باب ان الشهر يكون تسعا و عشرين ؛ ان میں علیہ اور مشربہ دو نام بالائی غرفہ کے لیے آتے ہیں نیز ابوداؤد حدیث: ۵۲۳۸: علیہ کا دروازہ مقفل رہتا تھا جسے کنجی سے کھولا جاتا تھا: "الى عليه فاخذ المفتاح من حجزته ففتح ..." ؛ موطا، كتاب الاقضية، باب ما جاء في المؤنث الخ ؛ بخاری، كتاب الصلوٰة، باب في الصلاة في السطوح: "في مشربة له درجتها من جذوع")۔

اندرونی ساخت کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیرون سے بیت نبوی میں داخلے کے دروازے پر پردے پڑے رہتے تھے تاکہ پردہ داری ہو سکے اور یہ پردے اس الگنی یا کولکی کے اوپر ہوتے تھے جو داخلے کے دروازے کے قریب ہوتی تھی اور جہاں گھریلو سامان رکھا جاتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے کمرے/حجرے میں ایسی کولکی (سهوة) کا ذکر ملتا ہے جس میں سامانِ زیست رکھا جاتا تھا۔

- حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکی گھر کے بارے میں ایک اسی قسم کی اور دلچسپ تعمیراتی چیز ملی ہے، وہ روشندان ہے جو عربی میں "كوة" کہلاتا ہے (مصباح اللغات)۔ اس کا کام تو روشنی پہونچانا اور ہوا سے بہرہ مند کرنا ہے مگر حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کے مطابق وہ صدیقی تجوری تھی جس میں حضرت صدیق اپنا مال رکھا کرتے تھے۔ ہجرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد ان کے والد ماجد حضرت ابوقحافہؓ کو احساس ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے ساتھ اپنا سارا مال لے گئے مگر

حضرت اسماءؓ نے بوڑھے نابینا دادا کی تسکینِ خاطر کے لیے اس ''کوۃ'' میں پتھر رکھ کر ان پر کپڑا ڈال دیا تھا اور دادا کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ خاصا مال چھوڑ گئے ہیں: "...فوضعتها في كوة في البيت كان ابي يضع ماله فيها" (ابن ہشام، ۲/۱۰۲ دار الفکر طباعت)

مکاناتِ نبوی کی ساخت اور لمبائی چوڑائی کے بارے میں متعدد جدید سیرت نگاروں نے تفصیلات بہم پہونچائی ہیں۔ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ''... یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے۔ ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے۔ جو حجرے اینٹوں کے تھے، ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے۔ ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے اور حضرت عائشہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ مقابل جانب تھیں۔ یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپ ﷺ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواج مطہرات گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ ﷺ کے بال دھو دیتی تھیں۔ یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا...''

(شبلی، ۱/۲۸۱-۲۸۲؛ کاندھلوی، ۱/۴۳۰ کا بیان خاصا مختصر ہے کہ وہ نبوی گھر ''زہد و قناعت کی تصویر اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ تھے'')

دریچہ/ کلام

دریچہ/ روشندان: مکانات کی باہری دیواروں میں بالعموم روشندان ہوتے تھے جن سے روشنی اور ہوا آتی تھی۔ ان کے علاوہ دو مکانات بالخصوص پڑوسیوں کے مکانوں سے ملنے والی دیواروں میں ایک خاص روشندان یا دریچہ بھی ہوتا تھا۔ اس کے واسطے سے بالعموم پڑوسنیں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتی تھیں اور حال احوال پوچھ لیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہؓ بنت رسولِ اکرم ﷺ کے مکانوں کے اندرونی دیواروں میں بھی اسی قسم کے دریچے تھے جن سے ان دونوں خواتینِ اسلام کی بات چیت ہوتی تھی۔ غالباً یہ حضرت فاطمہؓ کی شادی سے پہلے کا مکان تھا۔ کیونکہ بعد کی روایات بتاتی ہیں کہ ان بتول خاندان کا گھر

یت نبوی سے ذرا فاصلے پر بازارِ مدینہ کے قریب واقع تھا۔ اس مکانی یا تعمیراتی تمدن کا خاص ہاتی پہلو یہ ہے کہ کبھی کبھی پڑوسنوں میں باہمی بات چیت میں تلخی پیدا ہوجاتی تھی اور پھر نہ ف گفتگو اور کلامِ مدارات کا دروازہ بند ہوجاتا تھا بلکہ دریچہ/ دریچہ ہائے گفتگو کا بھی ''سد باب'' کردیا جاتا تھا۔ حضرت صدیقہؓ سے حضرت فاطمہؓ کی بشری تقاضوں سے کچھ کہا سنی ہوئی تو رسولِ اکرم ﷺ نے اس دریچہ کلام کو بند کروادیا۔ سد باب کی تحریک حضرت فاطمہؓ کی درخواست پر ہوئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسے حضرت بتولؓ کی شادی کے بعد کا گھر بتایا ہے۔

(سیرت عائشہ، ۶۹ بحوالہ ابن ماجہ، باب الولیمہ وغیرہ؛ حدیث ابن ماجہ: ۱۹۱۱ میں حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب کا ذکر ہے مگر دریچہ کا نہیں)۔

سقیفہ

لغوی اعتبار سے سقیفہ کے متعدد معانی ہیں جن میں سے اولین ہے: ''چھت پاٹنے کا پتھر یا تختہ''، اس کی جمع سقائف آتی ہے۔

(مصباح اللغات؛ بخاری، کتاب المظالم، باب ماجاء فی السقائف؛ فتح الباری، ۵/۱۳۵ و مابعد؛ لسان العرب، سقف / السقیفۃ: الصفۃ: صرف سقیفہ بنی ساعدہ کا ذکر کیا ہے)

سیرت نبوی میں سب سے زیادہ مشہور و معروف سقیفہ بنی ساعدہ ہے۔ بنو ساعدہ خزرج کے قبیلہ کا ایک عظیم ترین بطن تھا اور حضرت سعد بن عبادہ انصاریؓ اور متعدد دوسرے اکابر اس کے شیوخ تھے۔ وفات نبوی کے بعد حضرت سعد بن عبادہ انصاریؓ اور ان کے قبیلہ وبطن کے کچھ لوگوں نے اسی سقیفہ میں اسلامی خلافت کے قیام پر بحث شروع کی تھی اور جو بالآخر دوسرے اکابر بالخصوص مہاجرین کے شیوخ - ابوبکرؓ و عمرؓ و ابوعبیدہؓ - کے شامل بحث ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اولین اسلامی خلیفہ مقرر کرنے کے واقعہ پر ختم ہوئی تھی۔

(ابن ہشام، ۴/۳۳۵-۳۴۰ و مابعد؛ سیرۃ المصطفیٰ، ۳/۱۸۳ و مابعد میں دو مقامات پر بحث طویل ہے نیز دیگر کتب بالخصوص بخاری / فتح الباری مذکورہ بالا؛ حدیث: ۲۴۶۲: مع اطراف ۳۴۴۵، ۳۹۲۸، ۴۰۲۱، ۶۸۲۹، ۶۸۳۰، ۷۳۲۳)

بالعموم اسی سقیفہ بنی ساعدہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس میں بھی صرف خلافت کے قیام سے زیادہ سقیفہ کے سماجی اور تمدنی ادارہ سے تعرض نہیں کیا جاتا اور اگر کیا بھی جاتا ہے تو صرف اسی کے حوالے سے اور ضمناً۔ دراصل ''سقیفہ'' چوپال تھی اور وہ مدینہ منورہ کے تمام اہم خاندانوں اور ان کے بطون کی متعدد چوپالوں پر مشتمل ادارہ تھا۔ ہر ایک قبیلہ/ خاندان یا بطن کی سقیفہ ہوتی تھی اور وہ اس کی طرف نسبت کر کے اسی کی تشخیص و تعیین کرتی تھی۔ وہ ایک سایہ دار یا سائبان نما چبوترہ ہی ہوتا تھا یا ایک چھپر والا مکان جو کھلے دروازوں والا ہوتا تھا اور جہاں دن یا رات میں فرصت کے اوقات میں اس کے اکابر و افراد جمع ہو کر روز مرہ کے مسائل و امور پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ان کا ایک تفریحی ادارہ بھی تھا کہ خوش گوئی، تفریح اور شعر و شاعری سے گونجا کرتا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی چوپالوں سے اس کی خاصی مشابہت تھی اور وہ قریشی مجالس (اندیہ) کی مدنی صورت تھی۔ مکہ مکرمہ کے دارالندوہ سے وہ قطعی مختلف تھی کیونکہ دارالندوہ میں اکابر قریش جمع ہو کر قومی امور پر فیصلے کرتے تھے اور ان مجالس ندوہ کا انعقاد وقتی ضرورت کے تحت ہوتا تھا۔ وہ روز مرہ کے معاملات و مسائل سے متعلق نہ تھا۔ جب کہ سقیفہ/ چوپال روز مرہ کے معاملات و امور اور سماجی، تفریحی اور تمدنی چیزوں کے لیے خاص تھی اور وہاں اکابر کے ساتھ عام ارکان و افراد بھی شریک ہوتے تھے اور بحث و مباحثہ کے علاوہ تفریح اور حظ نفس کا اہتمام کرتے تھے۔

(فتح الباری، ۱۳۶/۵: جمع سقيفة وهي المكان المظل كالساباط او الحانوت بجانب الدار'')

روایاتِ سیرت اور احادیث وغیرہ سے دوسرے مدنی/ انصاری خاندانوں کے سقیفوں کا بھی پتہ چلتا ہے مگر ان سے زیادہ ان سقیفوں کی سماجی اور تمدنی اہمیت تھی۔ مثلاً اسی سقیفہ بنی ساعدہ کا ایک عمدہ تہذیبی پہلو یہ ملتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ بنو ساعدہ کے ایک قلعہ (اجم) کے اندر تشریف لے گئے کہ وہاں آپ ﷺ نے ایک عرب عورت کو حضرت ابو اسید ساعدیؓ کے ذریعہ بلوا بھیجا تھا کہ آپ ﷺ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ آپ ﷺ کو پہچان نہ سکی تو آپ ﷺ وہاں سے واپس ہوئے اور سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے اصحاب کے ساتھ وہاں حضرت سہل بن سعد ساعدی انصاریؓ سے فرمائش کر کے ایک پیالہ سے مشروب نوش فرمایا اور دوسروں کو بھی اس سے شاد کام فرمایا۔ یہ سقیفہ بنی ساعدہ کی حیات نبوی میں تمدنی

حیثیت کی صرف ایک جھلک ہے۔

(حدیث بخاری: ۵۶۳۷- بخاری نے سقیفہ میں رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے جلوس فرمانے کا ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے اس تمدنی اور معاشرتی روایت پر بحث کی ہے)

پرنالہ/ میزاب

چھت سے پانی کی نکاسی کے لیے کسی سمت میں ایک پرنالہ/ میزاب ضرور لگایا جاتا تھا۔ وہ لکڑی کا یا لوہے کا ہوتا تھا۔ ایک امکان یہ ہے کہ وہ پکی ہوئی مٹی کا بھی ہوتا ہو کیونکہ عہدِ نبوی میں کمہاری کا فن موجود تھا اور پکے برتنوں کا ذکر بھی ملتا ہے، اسی طرح پکی اینٹوں کا بھی۔ اسی طرح بڑی لمبی چھت کے ایک سے زیادہ دو تین پرنالے ہو سکتے تھے اور غالباً ہوتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ پانی کی نکاسی اور پرنالے کی طرف اس کے بہاؤ کے لیے چھت ڈھلواں بنائی جاتی تھی۔ روایات میں پرنالہ کا ذکر بہت خاص انداز میں ملتا ہے اور اس میں تاریخی تناظر بھی ہے اور تمدنی پہلو بھی۔

- میزابِ رحمت: خانہ کعبہ کی چھت میں شمالی جانب یعنی حطیم کی طرف ایک پرنالہ لگایا گیا تھا جسے بالعموم روایات واحادیث میں میزاب رحمت کہا جاتا ہے اور اس کی دینی اور تشریعی حیثیت کی طرف خانہ کعبہ کے ضمن میں ذکر آچکا ہے۔

- **میزابِ ضرار:** اس کے مقابل مسجد ضرار کا میزاب/ پرنالہ تھا۔ اس مسجد کو منافقین نے سازش کرنے کا مرکز کے بطور بنایا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کو منہدم کر دینے کا حکم دیا تو دو خاص منافقین اس مسجد ضرار کے میزاب/ پرنالے کی مرمت کر رہے تھے: "... وهما يصلحان ميزابا قد فرغامنه ..." (واقدی، ۱۰۴۸)

- **میزابِ اختلاف:** دو صحابہ کے درمیان ان کے گھروں کے پرنالے کی سمت پر اختلاب ہو گیا تھا۔ اس کا ذکر بعض روایات میں آتا ہے۔

مکانات کی سہ گانہ تقسیم

اکثر و بیشتر مکانات یک منزلہ ہوتے تھے اور وہ سادہ ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتے تھے

جن کا ایک احاطہ ہوتا تھا۔ مکانات نبوی کے حوالے سے ان کا ذکر آ چکا۔ اور وہ یقیناً سب سے سادہ اور معمولی مکانات تھے اور تمام تعمیراتی تزئین سے عاری۔ تاہم ان میں سے بعض کے بالائی کمروں، غرفوں اور حصوں کا ذکر ملتا ہے جن کو آرام وسکون یا تخلیہ کے زمانے میں استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ واقعۂ ایلاء کے زمانے میں رسولِ اکرم ﷺ نے وہاں ایک ماہ ازواج مطہرات اور صحابہ کرام سے دور تخلیہ میں بسر فرمایا تھا۔ بہر حال وہ عام اور یک منزلہ مکانات تھے۔

دومنزلہ مکانات

مدینہ منورہ میں بعض مال دار صحابہ کرام اور اعلیٰ طبقات کے مکانات نسبتاً شاندار اور پختہ اور دومنزلہ بھی ہوتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے میزبان مدنی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان خاصا وسیع، کئی کمروں پر مشتمل اور دومنزلہ تھا۔ مولانا شبلیؒ اور دیگر سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ''حضرت ابوایوبؓ کا مکان دومنزلہ تھا، انھوں نے بالائی منزل پیش کی لیکن آپ ﷺ نے زائرین کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا... ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہو۔ گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا۔ حضرت ابوایوب نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔'' مولانا ادریس کاندھلوی اور تمام دوسرے روایتی سیرت نگاروں نے اکلوتے لحاف کا ذکر کیا ہے۔

(شبلی بحوالہ اصابہ وزرقانی، ابویوسف، حاکم اور وفاء الوفاء ۱/ ۲۷۹: ''گھر میں صرف ایک لحاف تھا'' کا بیان مفروضہ عسرت پر مبنی ہے؛ ادریس کاندھلوی، ۱/ ۴۱۰: حضرت ابوایوب انصاری کے مکان کی تعمیر تبع شاہِ یمن کا واقعہ افسانوی انداز میں بیان کیا ہے)

- حضرت ابوسریحہ حذیفہ بن اسیدؓ کی روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ایک غرفہ میں تشریف فرما تھے اور ہم آپ ﷺ کے نیچے تھے کہ آپ تشریف لائے اور ہمارے بحث ومباحثہ کا موضوع معلوم کیا، ہم نے بتایا کہ ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے: ''... كان النبي ﷺ في غرفة، ونحن اسفل منه، فاطلع الينا. وفي غرفة ونحن تحتها نتحدث، فاشرف الينا ...''

(مسلم، كتاب الفتن، باب في الآيات التي تكون قبل الساعة، حدیث: ۴۰-۴۱ باب مذکورہ)

متعدد مکانات

بالعموم ایک شخص کے پاس ایک ہی مکان ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض وسیع و عریض ہوتے تھے اور بعض چھوٹے اور مختصر۔ لیکن بعض متمول افراد کے پاس متعدد مکانات ہوتے تھے۔ ان مکانات کا ذکر مکی دور میں ذرا کم ملتا ہے، مدنی دور میں زیادہ ملتا ہے۔

مدنی دور کے متعدد مکانات کے ایک مالک حضرت حارثہ بن نعمان انصاریؓ تھے۔ انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کے علاوہ رسولِ اکرم ﷺ کی دختروں کے لیے بھی اپنے مکانات ہدیہ کیے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کے لیے حضرت حارثہ کے مکان پیش کرنے کا واقعہ بہت دلچسپ اور محبت و عقیدت آگیں ہے اور اس کا ذکر ان کے سوانح میں ملتا ہے۔ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ''حضرت حارثہ بن نعمان انصاریؓ کے متعدد مکانات تھے جن میں سے وہ کئی آنحضرت ﷺ کو نذر کر چکے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے، حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضورؐ میں اور میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کا ہے۔ خدا کی قسم! میرا جو مکان آپ ﷺ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض انھوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا اور حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں۔

(سیرۃ النبی، ۱/ ۳۶۷ بلا حوالہ؛ ادریس کاندھلوی، ۱/ ۴۳۰: ''مسجد کے متصل حارثہ بن نعمان انصاریؓ کے مکانات تھے جب آپ کو ضرورت ہوتی تو حضرت حارثہ آپ کو نذر کر دیتے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے تمام مکانات آپ کی نذر کر دیے...'' مولانا موصوف کا بیان مبالغہ آمیز بھی ہے اور شبلی کا چربہ بھی)

رسولِ اکرم ﷺ کے بعض پڑوسی انصار کرام اکابرِ اوس خزرج تھے: ''حضرات سعد بن عبادہ خزرجی، سعد بن معاذ اوسی، عمارہ بن حزم اور حضرت ابوایوبؓ رئیس اور دولت مند تھے''۔ ان کے مکانات دومنزلہ بھی تھے اور بعض دیگر مکانات کے بھی وہ مالک تھے۔ دوسرے بڑے صحابہ کرام میں حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ کے دولت مند ہونے کے علاوہ ان کے مکانات اور جائدادوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حضرت کعب بن مالکؓ بھی متعدد مکانات کے مالک تھے جن کا ذکر

ان سے متعلق واقعات میں ملتا ہے خاص کر ان کی توبہ کے باب میں۔

(واقدی، ۱۰۵۳: اسی میں ان کے چچازاد بھائی حضرت ابوقتادہ کے مکانات اور حوائط کا ذکر بھی ہے: واقدی، ۱۰۵۱-۱۰۵۵؛ "...صلیت الصبح علیٰ ظهر بيت من بيوتنا..." قبول توبہ کی صبح وہ پہاڑ سلع پر ایک خیمہ میں مقیم تھے جو اس گھر کی چھت پر لگا ہوا تھا)

مکانات کے مختلف حصے

تعمیراتی لحاظ سے مکانات خاص کر بڑے مکانات کے کئی حصے ہوتے تھے۔ صرف ایک کمرے پر مشتمل مکانات کے اندر جو روشندان، کولکی، دریچہ وغیرہ ہوا پانی اور روشنی کے علاوہ سامان رکھنے کے حصے ہوتے تھے ان کے علاوہ بھی بعض حصوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر روایات کے حوالے سے کیا جاتا ہے:

- **مُخدع / کوٹھری:** لغوی معنی یہ ہیں: کوٹھری جو بڑے کمرے کے اندر ہو، اس کی جمع مخادع ہے (مصباح اللغات)۔ سیرت ابن ہشام کے محشی محمد محی الدین عبدالحمید نے اسے گھر کے اندرون میں ایک گھر بتایا ہے: "البیت یکون فی جوف البیت"۔ اس طرح وہ مکان کے اندرون کی کوٹھری بن جاتی ہے، نہ کہ کمرے کے اندر کی۔ بہر حال وہ ایک چھوٹی کوٹھری کے معنی میں آتی ہے۔ حضرت عمرؓ جب اپنے بہن اور بہنوئی کے قبول اسلام کے بارے میں سن کر ان کے گھر اچانک وارد ہوئے تھے تو ان دونوں کے معلم قرآن حضرت خباب بن ارت تمیمیؓ کو اسی اندرونی کوٹھری کے اندر چھپا دیا گیا تھا: "...تغيب خباب بن الارت فی مخدع لهم او فی بعض البيت ..." (ابن ہشام، ۱/۳۶۶)

- **سہوہ / کانس، مہتابی طاقچہ، روشندان وغیرہ** (مصباح اللغات): کا ذکر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پردوں کے دروازے پر لگانے کے ضمن میں آتا ہے جو بہت اہم ہے۔

طویل ترین مکان

حدیث ابوداؤد: ۵۱۹ کے مطابق بنوالنجار کی ایک خاتون مکرم کا بیان ہے کہ مسجد نبوی کے

اردگرد میرا گھر سب سے طویل تھا لہذا رمضان میں حضرت بلالؓ سحر کے وقت آتے اور گھر کے اوپر بیٹھتے اور فجر صادق کے طلوع کا انتظار کرتے تو اذان دیتے۔ امام موصوف نے اس باب کا عنوان خوب باندھا ہے: منارہ کے اوپر سے اذان کا باب: "باب الاذان فوق المنارة"

(بخاری: احادیث: ۶۱۷ اور ۶۲۰ وغیرہ میں ہے کہ حضرت بلال رات میں اذانِ سحری دیتے تھے اور حضرت ابن ام مکتوم اذانِ فجر دیتے تھے؛ فتح الباری، ۲/ ۱۳۱-۱۳۶ و مابعد)

مکان پر قبۂ بلند

حدیث ابوداؤد: ۵۲۳۷ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ ایک بار مدینہ میں ایک جگہ سے گذرے تو ایک بلند قبہ (قبة مشرفة) دیکھا تو اس کے بارے میں دریافت فرمایا- صحابہ کرام نے عرض کیا کہ فلاں انصاری کا ہے۔ آپ ﷺ خاموش رہے لیکن دل میں بات رہ گئی، جب اس کے مالک حاضر خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے اعراض فرمایا اور بار بار یہ واقعہ پیش آیا۔ انصاری صحابی سمجھ گئے کہ ناراض ہیں اور لوگوں سے سبب معلوم کیا اور واپس جا کر قبہ کو گرا کر زمین کے برابر ہی کر دیا۔ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی البناء)

وسیع و عریض مکان

بنو قریظہ کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو قید رکھنے کے ضمن میں ایک انصاری خاتون بنت الحارث کے مکان کا ذکر روایاتِ حدیث و سیرت میں آتا ہے۔ قیدیوں کی تعداد مختلف بتائی گئی ہے: چار سو مقاتلین تھے، چھ سو قیدی تھے، آٹھ سو سے نو سو تک ان کی تعداد تھی۔ بہر حال ان کی تعداد کچھ بھی رہی ہو لیکن کئی سو پر مشتمل تھی اور انصاری خاتون کا مکان اتنا وسیع و عریض تھا کہ اس میں یہ تعداد سما گئی تھی۔ ابن حجرؒ کے مطابق دو گھروں میں قیدی رکھے گئے تھے۔

(ابن ہشام، ۳/ ۲۶۱ و مابعد؛ فتح الباری، ۷/ ۵۱۷ و مابعد)

متعدد صحابہ کرام کے مکانات خاصے بڑے اور کشادہ ہوتے تھے اور وہ ان میں کافی بڑی تعداد میں مہمانوں کی رکھ سکتے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا مکان، جو بقیع کے پاس تھا اور اس کا

پورا احاطہ (دار) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بطور اقطاع دیا تھا، ایسا ہی وسیع و عریض تھا کہ ۹ھ/۶۳۱ء میں جب ان کا قومی وفد بنو ثقیف آیا تو حضرت موصوف نے ان کو پہلے اپنے ہی گھر میں اتارا اور اسی دار المغیرہ میں رسولِ اکرم ﷺ ان مہمانانِ ریاست کی ضیافت کے لیے کھانا وغیرہ بھیجتے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ ان ارکان وفد کے لیے مسجد میں کھجور کے تین خیمے لگوائے گئے تھے۔

(واقدی، ۹۶۵؛ یہ دونوں روایات صحیح ہیں کہ پہلے خیموں میں ان کا انتظام کیا گیا پھر حضرت مغیرہؓ ان کو اپنے گھر میں لے گئے تھے)

تعمیر و مرمتِ مکانات

عہدِ نبوی میں مکانات کی خستہ حالی اور خرابی کے بعد ان کی مرمت و اصلاح اور دوبارہ تعمیرِ نو دونوں کا ذکر ملتا ہے، کعبہ مشرفہ کی دو مرتبہ تعمیر قریشی کے علاوہ مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع اور عہد صدیقی وغیرہ میں مرمت کا واقعہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ان مساجد یا مکانات/ بیوت الٰہی کے علاوہ عام مکانات کی مرمت و اصلاح کا ذکر بھی روایات میں آتا ہے اور اس کے سلسلہ میں بعض سماجی رویوں اور تمدنی زاویوں کے علاوہ خالص دینی رجحانات کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان میں سے چند واقعات کا ذکر ذیل میں روایات و احادیث کے حوالے سے کیا جاتا ہے:

- ابن اثیرؒ نے رسولِ اکرم ﷺ کے اپنے مکان کی مرمت کرنے کا واقعہ بعض عینی شاہدوں کے بیان پر پیش کیا ہے۔ (اسد الغابہ، ۱/ ۳۶۸)

- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سہمیؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ہمارے پاس سے گذرے تو ہم اپنے جھونپڑے کی مرمت کر رہے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ وہ خراب ہو گیا لہٰذا ہم اس کی مرمت کر رہے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں معاملہ کو اس سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ امام ترمذی نے یہ حدیث ابواب الزہد کے باب فی قصر الامل میں نقل کی ہے: "...ونحن نعالج خصاً له ... قد وهي فنحن نصلحه ..."۔ "خُص" بانس یا لکڑی کے جھونپڑے کو کہتے ہیں (مصباح اللغات)۔ حدیث ابوداؤد: ۵۲۳۵ میں

یہ اضافہ ہے کہ حضرت ابن عمرو اپنی ماں کے ساتھ دیوار/ حائط کو مٹی سے لیپ رہے تھے اور دوسری حدیث: ۵۲۳۶ میں ترمذی کی حدیث جیسا بیان ہے۔ یہ دونوں دو واقعات معلوم ہوتے ہیں اور حائط کی لیپ پوت کا واقعہ دلچسپ ہے: "وانا اطین حائطاً لی انا وامی"، کتاب الادب، باب فی البناء کا عنوان بھی معنی خیز ہے۔

(نیز ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب البناء والخراب: حدیث: ۴۱۶۰)

بیٹھک کی تعمیر

حضرات ابوذر غفاری اور ابوہریرہ دوسیؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لاتے تو اپنے اصحاب کے درمیان رونق افروز ہوتے۔ کوئی اجنبی آ جاتا تو آپ ﷺ کو پہچان نہ پایا تا آنکہ وہ دریافت کرتا۔ ہم نے رسولِ اکرم ﷺ سے درخواست کی اور اجازت مانگی کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مقامِ مجلس بنا دیں تاکہ غریبان وطن بھی پہچان لیا کریں۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی تو ہم نے آپ ﷺ کے لیے ایک مٹی کا چبوترہ (دکان) بنا دی۔ اس پر آپ ﷺ تشریف فرما ہوتے اور ہم آپ ﷺ پہلو میں بیٹھا کرتے تھے: "... فبنينا له دكانا من طين، فجلس عليه ..."

(حدیث ابوداؤد: ۴۶۹۸؛ نسائی، کتاب الایمان وشرائعه، صفة الایمان والاسلام؛ دکان بقول صاحب مصباح اللغات کلمہ فارسیہ ہے اور دکان و چبوترہ دونوں کے معانی دیتا ہے)

قلعے۔ اطم/حصن

مصباح اللغات میں "اطم" کے معنی قلعہ اور اس کی جمع "آطام" دی ہے۔ سیرت ابن ہشام کے محشی محمد محی الدین عبدالحمید اور متعدد دوسرے حاشیہ نگاروں اور شارحوں نے اس کا معنی قلعہ دیا ہے: "الاطم: الحصن" (۱/۱۷۱)۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بخاری کی کتاب الفتن کی حدیث: ۷۰۶۰ میں اس کو قلعہ (حصن) کے مترادف ہی بتایا ہے اگرچہ اس کی تشریح و بیان میں آخرالحج میں اپنے گذشتہ مبحث کا حوالہ بھی دیا ہے (فتح الباری، ۱۳/۱۵-۱۷ و مابعد) اطم اور حصن

کے دو الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف قسم کی بڑی تعمیرات تھیں: اطم کو بالعموم گڑھی بتایا جاتا ہے اور حصن کو قلعہ۔ موخر الذکر کافی بڑا ہوتا تھا۔

یہودی آطام

مدینہ منورہ کے یہودیوں کے آطام/قلعوں یا گڑھیوں کا ذکر مکی عہد کے واقعات سے ہی ملنے لگتا ہے اور بعد میں ان کے بہت حوالے آتے ہیں:

- سب سے پہلا حوالہ رسولِ اکرم ﷺ کی ولادت کے ضمن میں ملتا ہے جب ایک یہودی نے اپنے قلعہ/اطم پر چڑھ کر ستارہ دیکھا تھا اور چیخ کر بولا تھا کہ آج رات ستارۂ احمدی طلوع ہو گیا۔ ابن ہشام کی یہ روایت حضرت حسان بن ثابتؓ کی سند سے ہے "... اذ سمعت یهودیا یصرخ بأعلیٰ صوته علیٰ اطمه بیثرب ..." (ابن ہشام، ۱/۱۷۱-۱۷۲)

- اسی طرح ایک یہودی کے اپنے اطم/قلعہ پر چڑھ کر رسولِ اکرم ﷺ کے قافلۂ ہجرت کی خبر مدینہ والوں کو دینے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ انصارِ مدینہ انتظار کرتے کرتے گھروں کو پلٹ گئے تھے جب اس نے ان کو خبر دی تھی۔

(ابن ہشام، ۲/۱۰۹؛ اطم کا اس میں واضح ذکر نہیں ہے لیکن دوسری روایات میں ہے)

- **قلعۂ کعب بن اشرف:** یہودِ مدینہ کے اکابر میں کعب بن اشرف کا مقام اس بنا پر خاص تھا کہ مدنی مسلموں کے علاوہ ان کے خاندانوں سے بڑے تعلقات تھے۔ وہ بھی ایک قلعہ (حصن) کا مالک تھا۔ اس کے قتل کے سلسلے میں اس کے قلعہ کا ذکر ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف؛ فتح الباری، ۷/۴۲۰-۴۲۵: "...فدعاهم الی الحصن")

یہودی آطام کا زیادہ ذکر غزواتِ نبوی کے ضمن میں ملتا ہے۔ ان میں مدینہ منورہ کے تین سب سے بڑے اور معاہدہ شکن یہودی قبیلوں میں بنو قینقاع، بنو النضیر اور بنو قریظہ شامل تھے۔ بعض دوسرے بھی آطام یہود تھے۔ ان کے علاوہ خیبر اور اس کی نواحی بستیوں کے آطام کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن ان کے لیے حصون کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

آطام بنوقینقاع: بنوقینقاع کے بازارِ زرگری میں ایک زرگر یہودی کے ہاتھوں ایک مسلم عورت کی بے عزتی کے بعد ظالم زرگر کا قتل ایک مسلم کے ہاتھوں ہوا اور اس غیرت مند مسلم کو دوسرے یہودیوں نے مل کر قتل کردیا اور اس کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کے سمجھانے اور صلح و صفائی کی کوششیں کرنے کے باوجود انھوں نے معاہدہ توڑ کر اعلان جنگ کردیا اور اپنے آطام میں محصور ہوکر بیٹھ گئے۔ اسلامی فوج کے پندرہ دنوں کے محاصرہ کے بعد وہ اپنے آطام (گڑھیوں) سے نیچے اترے۔ بعض روایات سیرت میں ان کے آطام کے لیے بھی حصون کا لفظ آیا ہے۔ (ابن ہشام، ۲/ ......؛ ابن سید الناس، ۱/ ۳۸۶: "وتحصنوا فی حصنهم"؛ فتح الباری، ۷/ ۴۱۱ و مابعد)

آطام بنوالنضیر: بنوالنضیر نے بھی بنوقینقاع کی مانند معاہدہ شکنی کے بعد اپنے آپ کو قلعوں میں محصور کرلیا تھا۔ ابن اسحاق نے ان کے لیے لفظ حصون کا استعمال کیا ہے اور اسی کا فعل بھی: "فتحصنوا منه فی الحصون"۔ بعض دوسری روایات سے بھی آطام کی جگہ حصون کا ہی ذکر آیا ہے جیسے ہجرت کے بعد قریش کے اکابر نے یہودِ مدینہ کو جو خط لکھا تھا اس میں ان کو "اهل الحلقة والحصون" کہا تھا (حلقہ کے معنی اسلحہ اور ساز و سامان حرب کے آتے ہیں؛ ابن ہشام، ۳/ ۱۹۲ و مابعد؛ ابن سید الناس، ۲/ ۲۳-۲۶؛ فتح الباری، ۷/ ۴۱۱ و مابعد)

آطام بنوقریظہ: تیسرے یہودی مدنی قبیلہ کے لیے ابن اسحاق وغیرہ نے لفظ حصون ہی استعمال کیا ہے۔ بعض روایات میں البتہ ان کے لیے آطام کا لفظ بھی آتا ہے مثلاً غزوۂ بنی قریظہ کے بارے میں قرآن مجید نے لفظ الصیاصی (صیاصیهم) استعمال کیا ہے۔ اس کی تفسیر ابن اسحاق نے حصون و آطام سے کی ہے: "الحصون والآطام التی کانوا فیها" (ابن ہشام، ۳/ ۲۵۲-۲۵۵ و مابعد؛ فتح الباری، ۷/ ۵۱۵ و مابعد؛ ابن سید الناس ۲/ ۵۰ و مابعد؛ الصیاصی کی تفسیر کے لیے ابن ہشام، ۳/ ۲۶۹)

خیبر وغیرہ کے یہودی قلعے

غزوۂ خیبر کے ضمن میں خیبر کے یہودی قلعوں کا ذکر بڑی تفصیلات کے ساتھ روایاتِ سیرت و حدیث میں ملتا ہے۔ عام مورخین ان کے چھ یا سات قلعوں کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اصلاً

وہ چھ یا سات گروپ تھے جن میں سے ہر ایک میں کئی کئی قلعے تھے، یہ چھ مجموعے تھے: ۱- ناعم، ۲- النطاۃ، ۳- الشق، ۴- الکتیبہ، ۵- الوطیح اور ۶- سلالم۔ بعض قلعوں کا نام ان کے مجموعہ/گروپ کے حوالے سے ملتا ہے جیسے قلعۂ مرحب ناعم کے گروپ میں تھا، قلعہ الصعب بن معاذ اور قلعہ الزہر کے دو نام النطاۃ کے قلعوں کے بطور ملتے ہیں۔ الشق مجموعہ میں تین قلعوں کا ذکر ملتا ہے: قلعہ النزار قلعۂ ابی اور قلعہ سمران، جب کہ مشہور قلعہ قموص الکتیبہ گروپ میں تھا۔ الوطیح اور سلالم کے صرف نام ملتے ہیں، ان کے انفرادی قلعوں کا ذکر ذرا کم ملتا ہے۔ مورخ یعقوبی نے چھ قلعوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کا نام مختلف ہے۔ بہرحال یہ بڑا شہر اور قلعوں کا گڑھ تھا جس میں بیس ہزار جنگجو اور ان کے اہل وعیال رہتے تھے اور ان کے اموال بھی تھے۔

(واقدی، ۶۴۲-۶۴۸ ومابعد؛ ابن سعد، ۲/۱۰۶؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۳/۳۸۱ وغیرہ؛ یعقوبی، ۲/۵۶ نیز دوسرے مآخذ؛ مفصل بحث کے لیے: غزوات نبوی کے اقتصادی پہلو، لاہور ۲۰۰۷ء، ۱۸۴-۱۸۵ ومابعد)

قلعہ دومۃ الجندل

شمال میں شامی سرحد کے قریب کندی بادشاہت تھی جس کے قلعہ کا ذکر روایات میں وضاحت سے آتا ہے خاص کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کے سریہ ۶/۶۲۷ اور حضرت خالد بن ولید مخزومی کے سریہ دومہ ۹/۶۳۱ کے ضمن میں۔ موخر الذکر نے اس کے شاہ اکیدر بن عبدالملک کو قلعہ کے باہر شکار کرتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔

(غزوات نبوی کے اقتصادی پہلو، ۹۹-۱۰۰؛ حواشی ابن ہشام؛ ۴/۱۸۱، واقدی، ۱۰۲۷ ومابعد؛ ابن سعد، ۲/ ۱۹۸ وغیرہ)

ان کے علاوہ بھی بعض غیر مسلم یہودی اور عیسائی قلعے، قلعچے اور گڑھیاں تھیں جو پوری پوری آبادی رکھتی تھیں۔

آطام وحصونِ مسلم

۱- قلعۂ حضرت حسان بن ثابتؓ- فارع

مدینہ منورہ کے متعدد اکابر کے مکانات صرف وسیع وعریض ہی نہیں تھے بلکہ ان میں سے

بعض قلعے تھے۔ ان کا ذکر ذرا کم ملتا ہے لیکن بہر حال ملتا ہے۔ ان میں سے ایک قلعہ/ حصن مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابتؓ کا تھا۔ وہ خزرج کے نہ صرف قومی شاعر تھے بلکہ ان کے مالدار ترین اکابر اور معمر ترین شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے قلعہ کا ذکر غزوۂ خندق کے حوالے سے بعض روایات میں آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حفاظت کی خاطر تمام مسلم عورتوں اور بچوں کو ان کے قلعہ فارع نامی میں پہونچا دیا تھا اور ان میں رسولِ اکرم ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بھی تھیں۔ احادیثِ مسلم کے مطابق صحابہ کرامؓ کے بچے جو حضرت حسان بن ثابتؓ کے قلعہ میں محفوظ تھے ان میں عبداللہ بن زبیر اور عمر بن ابی سلمہؓ بھی تھے۔ اس قلعۂ مسلم کا ذکر بہر حال ان ہی کی ذات گرامی کی شجاعت کے ضمن میں آتا ہے۔ انھوں نے ایک یہودی کو اس قلعۂ مسلم کی جاسوسی کرتے دیکھا تو حضرت حسانؓ سے کہا کہ وہ اس کو مارلیں۔ حضرت حسانؓ خاصے بوڑھے شخص بھی تھے اور قتال و جہاد والے بھی نہ تھے۔ انھوں نے معذرت کی تو حضرت صفیہؓ نے خود ہی قلعہ سے اتر کر اس کا کام تمام کیا: "... كانت صفية بنت عبدالمطلب فی فارع حصن حسان بن ثابت ... فمرّبنا رجل من يهود، فجعل يطيف بالحصن ... فقلت: يا حسان ! ان هذا اليهودی كما تری يطيف بالحصن، وانی والله ما آمنة أن يدل على عورتنا من ورائنا من يهود ... ثم نزلت من الحصن اليه، فضربته بالعمود حتى قتلته ... الخ

(ابن ہشام، ۳/۲۴۶ ومابعد ؛ شبلی، ۱/ ۴۲۸-۴۲۹ بحوالہ زرقانی، طبرانی و بزار و ابویعلیٰ، وابن ہشام؛ مولانا موصوف نے لکھا ہے کہ "مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا، یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہونچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا"۔ مولانا مرحوم کا بیان جزوی طور پر صحیح ہے جیسا اگلے قلعۂ مسلم کے ذکر سے واضح ہوگا۔ کیونکہ تمام مسلم مستورات ایک قلعہ میں نہ تھیں: مسلم، کتاب الفضائل، فضائل الزبیر بن العوام؛ صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین ۱،/۳۸۱)

۲-قلعہ (حصنِ) بنی حارثہ

دوسرا قلعہ انصار کے قبیلہ اوس کے ایک بطن یا خاندان بنو حارثہ کا تھا، جو روایت کے مطابق مدینہ منورہ کے مستحکم ترین قلعوں میں سے ایک تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ

حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ کی والدۂ ماجدہ کے ساتھ اسی قلعہ میں غزوۂ خندق کے دوران مقیم تھیں۔ اور اسی قلعہ سے حضرت ام المومنینؓ نے حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ کو گذرتے دیکھا تو ان کی زرہ بہت چھوٹی پائی اور حفاظت کی غرض سے ناقص سمجھا۔ ان کی ماں کو مشورہ دیا کہ وہ کاش بڑی اور مضبوط زرہ پہنے ہوتے! بعد میں اسی ناقص زرہ کی وجہ سے حضرت موصوف کو کاری زخم لگا۔ "... أن عائشة ام المومنين كانت في حصن بني حارثة يوم الخندق و كان من احصن حصون المدينة... الخ"

(ابن سید الناس، ۲/۴۲ بروایت ابن اسحاق؛ شبلی، ۱/۴۲۲: "حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزیں تھیں حضرت سعد بن معاذؓ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں...")

تلاش و تحقیق سے بعض دوسرے حصونِ مسلم (مسلم قلعوں) کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہرحال مدینہ منورہ کے ان دو مسلم قلعوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اوس و خزرج کے بعض اکابر کے بھی قلعے تھے اور ان کے بعض بطون اور خاندانوں کے بھی قلعے یعنی آطام و حصون تھے۔ اور یہ بات منطقی بھی لگتی ہے کہ بعثت یا ہجرت نبوی سے قبل اوس و خزرج دونوں جنگیں لڑتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ ان باہمی جنگوں میں وہ بطور حلیف کسی نہ کسی یہودی قبیلہ کو شریک کر لیتے تھے اور ان قتال و جنگ کی کارروائیوں کے زمانے میں اور دوسرے پرامن زمانے میں بھی ان کو محفوظ و مستحکم قلعوں کی ضرورت پڑتی تھی جہاں وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو محفوظ کر سکیں اور اسی کے ساتھ سامان رسد اور اسلحے وغیرہ بھی اکٹھا کر سکیں۔

اطم دُلیم بن حارثہ انصاری

یثرب میں حضرت سعد بن عبادہ بن ولیم بن حارثہ انصاریؓ کا تعلق بنو ساعدہ کے خاندان خزرج سے تھا تاہم روایات سے ایسا واضح ہوتا ہے کہ ان کے دادا دُلیم بن حارثہ انصاری کا ایک قلعہ/اطم بنو ساعدہ کے اطم کے علاوہ تھا۔ ان کے خاندان ذی شان کی ایک صفت جوادی یہ بیان کی گئی ہے کہ چار چار نسلوں میں ان کے جوادون/مطعمون پائے جاتے تھے۔ حضرت سعدؓ بذات خود اور ان کے والد اور دادا اور نیچے کی پیڑھی میں حضرت سعد کے فرزند حضرت قیس خزرجی

مثالی سخی اور مطعم ومنعم تھے۔ ان کے اطم اور قلعہ/گڑھی کا ذکر ان کی صفت سخاوت کے ضمن میں ہی ملتا ہے۔ ابن اثیر وابن حجر عسقلانی وغیرہ کے تذکرہ وترجمہ میں یہ بیان آتا ہے کہ ان کا ایک اطم تھا جس پر سے روز پکار لگتی تھی کہ جو شخص چربی/مزیدار کھانا کھانا چاہے وہ دلیم بن حارثہ کے اطم پہنچ جائے: "...وکان لهم اطم ینادیٰ علیه کل یوم: من احب الشمم خلیات اطم دلیم بن حارثة"۔ اس کے بعد اس مثالی جفنہ طعام سعد کا ذکر ہے جس میں اہل بیت نبوی کے علاوہ اسی اہل/اصحاب صفہ کے لیے روزانہ کھانا بلکہ مائدۂ نعمت آتا تھا اور گردش کرتا تھا۔

(اسد الغابہ، ۲/۳۸۳-۲۸۴؛ اصابہ ۳۱۷۳)

اجم/آجام

اطم/آطام کی ایک اور لغوی حیثیت یا صورت اُجم/آجام کی صورت میں ملتی ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ج کو ط سے یا اس کے برعکس منقلب ومتبدل کرنے کی عرب روایات لغت کا نتیجہ و شاخسانہ ہو۔ صاحب مصباح اللغات نے بہر حال اس کے معنی قلعہ کے دیے ہیں اور اس کی جمع آجام بتائی ہے اور دوسری بحث نہیں کی ہے۔ بعض احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے اور وہ یہ بتاتا ہے کہ انصار کے بعض بطون کے بھی قلعے تھے اور ان میں کافی لوگ رہا کرتے تھے۔

اجم بنی ساعدہ

قبیلہ خزرج کے ایک عظیم ترین بطن بنو ساعدہ کا یہ قلعہ/اجم تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے ایک عرب (بدوی) عورت کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے حضرت ابو اسید ساعدیؓ کے ذریعے اس عورت کو بلوا بھیجا۔ وہ آئیں تو بنو ساعدہ کے قلعہ میں اتریں، رسولِ اکرم ﷺ ان سے ملنے کے لیے وہاں قلعہ کے اندر تشریف لے گئے تو وہ سر نیوڑھائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے کلام شروع کیا ہی تھا کہ خاتون نے دیکھے بغیر اللہ کی پناہ چاہی اور آپ ﷺ فوراً واپس ہو لیے۔ بعد میں خاتون کو تازندگی اس لغزش کی کسک رہی۔ حافظ ابن حجرؒ نے بہر حال اس قلعہ کی تعریف میں مختصر سہی کچھ تو لکھا ہے۔ اس کے مطابق وہ محل سے مشابہ عمارت تھی اور وہ

مدینہ کے قلعوں میں سے ایک تھا۔ اس کی جمع آجام ہے، اطم اور آطام کی طرح۔ امام خطابی کے بقول اطم اور اجم ایک ہی معنی کے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض تشریحات شرح حافظ میں ہیں جن سے سر دست بحث نہیں ہے۔

(حدیث بخاری: ۵۶۳۷: "... فقدمت فنزلت في اجم بني ساعدة ..." فتح الباری، ۱۰/۱۲۳: ... الاجم هو بناء يشبه القصر، وهو من حصون المدينة، والجمع آجام مثل اطم و آطام، قال الخطابي: الاطم والاجم بمعنى ...")

دروازہ (باب)

مکانات کے دروازے عہد نبوی کے تمدن میں بھی ہوتے تھے اور تعمیرات کا ایک ضروری حصہ اور فنِ تعمیر کا ایک طریقہ بھی تھا۔ تمام دوسرے معاشروں اور تمدنوں کی مانند دروازے مکانات کے اگلے حصے یا سامنے کے حصے میں رکھے جاتے تھے جن سے آمد و رفت مسلسل ہوتی تھی۔ یہ تمام مکی اور مدنی معاشروں اور ان کی تعمیرات کا ایک ایسا امر واقعہ تھا جس کو متواتر کہا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ میں مکانوں کے دروازوں کا ذکر کسی نہ کسی سماجی، تمدنی، دینی یا تشریعی حوالے سے آیا ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعۂ عصمت میں دروازے کا ذکر الٰہی اسی طرح ہے: "وراودته التي هو في بيتها عن نفسه و غلقت الابواب ..." ۲۳ (اور پھسلایا اس کو عورت نے، جس کے گھر میں تھا اپنا جی تھامنے سے اور بند کیے دروازے ...) اور آیت کریمہ۔ ۲۵: میں ہے: "واستبقا الباب ..." (اور دونوں دوڑے دروازے کو ...) "والفيا سيدها لدا الباب ..." (اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس ...)۔ یہ حوالے تو دنیاوی مکانات کے دروازوں کے بارے میں تھے۔ اور آخرت کے مکانات کے بھی دروازے ہوں گے جیسا کہ سورۂ زخرف: ۳۴: ولبيوتهم ابوابا وسررا عليها يتكئون (اور ان کے گھروں کو دروازے اور تخت جن پر لگ بیٹھیں)۔ ان کے علاوہ دوسرے حوالے دوسرے دروازوں کے بارے میں ہیں۔ ایک تشریعی حوالہ قرآن مجید میں عام مکانات کے دروازوں کے بارے میں آتا ہے لیکن اس کا ذکر احادیث اور سماجی رجحانات کے حوالے سے کیا جا رہا ہے۔

احادیث وروایات سیرت میں بھی مکانات کے عام دروازوں کا ذکر ملتا ہے اور اس میں سب سے اہم تشریعی حوالہ ہے۔ انصار مدینہ- اوس وخزرج - کا جاہلی انحراف یہ تھا کہ وہ جب حج کر کے واپس آتے تو اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے پچھواڑے سے گھستے تھے۔ اسی زمانۂ انحراف میں ایک انصاری شخص اپنے دروازے سے داخل ہوا تو اس کو عار دلائی گئی لہٰذا آیت کریمہ: ولیس البر بأن تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی، واتوا البیوت من ابوابھا. البقرہ:۱۸۹ (اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ چھت پر سے، لیکن نیکی وہی جو کوئی بچتا رہے، اور گھروں میں آؤ دروازوں سے ...)۔ یہ حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث بخاری: ۱۸۰۳ ہے اور ان کے مشاہدے اور بیان پر مبنی ہے، سردست دوسرے متعلقہ مسائل سے بحث نہیں۔

(بخاری، کتاب العمرۃ، باب قول اللہ تعالی: واتوا البیوت الخ؛ فتح الباری، ۳/۷۸۳ومابعد؛ طرف حدیث: ۴۵۱۲؛ شاہ عبدالقادر دہلوی کا "من ظھورھا" کا ترجمہ "چھت پر سے" قابل بحث ولائق نقد ہے متن کے لحاظ سے بھی اور تفسیر کے اعتبار سے بھی، اس کا صحیح ترجمہ ہے: "مکانوں کے پچھواڑے سے" جیسا کہ آگے بحث سے واضح ہوگا اور دوسرے مترجمین نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے)

حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ قریش، جو حمس ہونے کے مدعی تھے، احرام میں دروازوں سے ہی داخل ہوتے تھے، جب کہ انصار اور تمام دوسرے عرب دروازوں سے نہیں داخل ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسولِ اکرم ﷺ ایک باغ میں تھے اور آپ ﷺ دروازے سے برآمد ہوئے اور آپ ﷺ کے ایک مدنی صحابی حضرت قطبہ بن عامر انصاریؓ بھی دروازے سے ہی باہر نکلے۔ لوگوں نے رسولِ اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ قطبہ تو ایک گناہگار شخص ہیں کیونکہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ دروازے سے باہر نکلے، رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت قطبہ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ عرض کیا کہ میں نے وہی کیا جو آپ ﷺ نے کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تو احمسی ہوں۔ حضرت قطبہؓ نے عرض کیا کہ میرا دین تو وہی ہے جو آپ ﷺ کا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل کی۔ حافظ موصوف نے امامان حدیث ابن خزیمہ اور حاکم کی صحیحین سے یہ واقعہ نقل کرنے کے علاوہ اور بعض اسی قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ان اسباب نزول میں سے ایک آخری روایت و واقعہ اس بحث کے لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ وہ

سامنے اور پچھواڑے کے بارے میں بتاتا ہے۔ امامِ تفسیر حضرت مجاہدؒ کی روایت ہے کہ مشرکین میں سے جب کوئی احرام باندھ لیتا تھا تو وہ اپنے گھر کے پچھواڑے ایک دریچہ (کوۃ) بنالیتا تھا اور اس سے داخل ہوتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ ایک دن تشریف لائے تو آپ ﷺ کے ساتھ ایک مشرک بھی تھا۔ آپ ﷺ دروازے سے داخل ہونے لگے تو مشرک پچھلے دریچہ/سوراخ سے داخل ہونے کے لیے بڑھا تو آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ اس نے کہ میں احمسی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی احمسی ہوں اور تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اس پوری بحث میں تعمیرات اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے باب (دروازہ) اور کوہ (دریچہ) کا استعمال اہم ترین ہے۔

(فتح الباری، ۳/۷۸۴-۷۸۵؛ مفصل تشریعی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: اسلامی احکام کا ارتقاء، باب حج وعمرہ؛ یہاں صرف یہ ذکر کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا روایات نے اسے مدنی زمانے کا واقعہ قرار دیا ہے حالانکہ وہ مکی دور کا معاملہ ہے)

بہر حال ان روایاتِ حدیث وسیرت سے اور ان سے قبل قرآنی آیات کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ مکانات میں دروازے سے داخل ہوتے تھے۔ وہ ایک مکان میں کئی بھی ہوتے تھے جیسا کہ واقعۂ حضرت یوسف علیہ السلام میں ہے کہ خاتونِ خانہ نے دروازے بند کیے تھے اور وہ اندرونی دروازے تھے اور جب دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہونچے تو وہ بیرونی دروازہ تھا جس پر خاوند خاتون کھڑا تھا۔ یہ دروازے سامنے حصۂ مکان میں ہوتے تھے جب کہ پچھواڑے دریچے/ طاق/ روشندان (کوۃ) ہوتے تھے۔ سیرت وتاریخ اور احادیث سے بعض اور واقعات ومعلومات ابواب پیش کیے جاتے ہیں:

بابِ کعبہ: کا ذکر آچکا ہے کہ اس بیت اللہ میں صرف ایک دروازہ رکھا گیا تھا۔ وہ عام اور مسلسل آمد ورفت کا دروازہ نہ تھا، کسی خاص موقعہ پر خانہ کعبہ میں داخل ہونے اور پھر باہر نکلنے کا دروازہ تھا۔ لہٰذا وہاں صرف ایک دروازہ کافی تھا۔

ابوابِ مسجد نبوی: مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کے باب میں ذکر آچکا ہے کہ اس کی تین سمتوں میں تین دروازے تھے۔ کیونکہ اس میں آمد ورفت مسلسل ومستقل ہونے کے علاوہ چاروں اطراف سے داخلہ کی سہولت کا انتظام ضروری تھا۔ چوتھی سمت - سمتِ قبلہ - کو دروازے

سے محفوظ رکھا گیا تھا کہ آنے جانے والے نمازیوں کے سامنے سے نہ نکلیں۔

ابوابِ مکاناتِ نبوی: رسولِ اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کے مکانات کے بارے میں دو تین نکات اہم ہیں: اول ان کے دو اطراف میں دروازے تھے: ایک خارجی سمت میں جنت البقیع کی طرف جو آمد و رفت کا عام دروازہ تھا، دوسرا مسجد کی طرف کھلنے والا دروازہ تھا جس سے رسولِ اکرم ﷺ نماز وغیرہ کے اوقات میں مسجد تشریف لے جاتے تھے۔ دوم یہ کہ بعض صحابہ کرام نے، جن کے مکانات مسجد نبوی سے ملحق و متصل تھے، اپنے مکانات میں سمتِ مسجد میں دریچے/ روشندان (خوخہ) رکھ لیے تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بھی خوخہ تھا اور جو وفات نبوی کے وقت اور بعد میں بھی باقی رہا اور باقی تمام دریچے/ روشندان حکم نبوی پر بند کر دیے گئے تھے۔

اکابرِ عرب کے مکانات کے دروازے

اجماعی طعام خیر کی فصل میں اور بعض دوسرے گذشتہ ابواب میں بعض جاہلی اکابر کے مکانات کے دروازوں کا ذکر آچکا ہے۔ ان میں سے ابوجہل مخزومی کے مکان فیض و سخاوت میں دو دروازوں کا ذکر واضح ہے۔ ایک سے جو اگلے حصہ میں تھا حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہ کھانے کے لیے داخل ہوئے تھے اور پچھلے دروازے سے وہ باہر نکلے تھے۔

مسجد حرام کا باب

رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت قبل بعثت کے حوالے سے مسجد حرام کے ایک دِروازے کا ذکر آتا ہے۔ حجر اسود کی تنصیب پر جب قریشی اکابر میں اختلاف ہوا تو اس کے دور کرنے کے لیے انھوں نے تحکیم پر معاہدہ کرلیا تھا کہ جو اس مسجد کے دروازے سے اول اول داخل ہو اس کا فیصلہ قابل قبول ہوگا: یا معشر قریش ! اجعلوا بینکم فیما تختلفون فیه اول من یدخل من باب هذا المسجد یقضی بینکم فیه ففعلوا...'' اور حسن اتفاق سے رسولِ اکرم ﷺ ہی اس دروازے سے اولین داخل ہونے والے تھے۔ محشی گرامی نے اس دروازے کے بارے

میں لکھا ہے کہ وہ باب بنی شیبہ ہے جسے دوران جاہلیت باب بنی عبد شمس کہا جاتا تھا اور اب اسے باب السلام کہا جاتا ہے۔ بعض روایات میں باب الصفا کا بھی ذکر ملتا ہے جس سے داخلہ کی شرط ٹھہری تھی۔ بہر حال مسجد حرام میں داخل ہونے کے لیے متعدد دروازے تھے۔ (ابن ہشام،۱/۲۱۴)

مکی بیت نبوی کے دروازے

عہدِ مکی میں رسولِ اکرم ﷺ کے دولت خانے کے دروازوں کا ذکر مختلف حوالوں سے ملتا ہے:

- سب سے مشہور وہ حوالہ ہے جو رسولِ اکرم ﷺ کی ایذا دہی کے بارے میں آتا ہے۔ قریشی اکابر بالخصوص آپ ﷺ کے دونوں شری پڑوسی آپ ﷺ کے دروازے پر گندگی اور کوڑا کرکٹ ڈال دیا کرتے تھے اور آپ ﷺ فرماتے تھے کہ کیا یہی پڑوس ہے۔

(ابن ہشام،۲/۲۵: دروازہ کا ذکر واضح ہے: "...فیقف به علی بابه ثم یقول: یابنی عبد مناف! أیّ جوار هذا؟..."")

- ہجرت کی رات رسولِ اکرم ﷺ اپنے گھر سے دروازے پر برآمد ہوئے اور دروازے پر موجود کافر قاتلوں کا ٹولہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھ سکا۔ (ابن ہشام،۲/۹۵-۹۶)

- بخاری کی کئی احادیث میں غزوۂ موتہ کے شہداء کے ذکر کے ضمن میں دروازے کا ذکر ملتا ہے۔ حدیث:۱۲۹۹ اور اس کے دو اطراف:۱۳۰۵- اور حدیث بخاری:۴۲۶۳ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ جب حضرات جعفر بن ابی طالب ہاشمی، زید بن حارثہ کلبی اور عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت (در غزوۂ موتہ) کی خبر آئی تو رسولِ اکرم ﷺ اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کا حزن و ملال نمایاں تھا۔ میں دروازے کے کنارے سے جھانک رہی تھی جب ایک شخص نے آکر خدمت گرامی میں عرض کیا کہ حضرت جعفرؓ کی خواتین آہ و بکا کر رہی ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو اس سے منع کرنے کا حکم دیا!...: "وانا اطلع من صائر الباب- ......من شق الباب- فاتاه رجل فقال..."

(فتح الباری،۷/۶۴۱ و مابعد: صائر الباب/شق الباب کے معنی پر بحثِ حافظ)

دوسرے مکی مکانات کے دروازے

- مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کو جب اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زید اور بہن حضرت فاطمہ بنت الخطابؓ کے اسلام لانے کی خبر ملی تھی تو غصہ میں ان کے گھر پہونچے تھے اور دروازے پر ان کی چاپ سن کر ان کی بہن نے صحیفہ قرآن چھپا دیا تھا اور دروازہ پر حضرت عمرؓ نے بعض روایات کے مطابق دستک دی تھی اور پھر داخل ہوئے تھے۔ (ابن ہشام، ۱/۳۶۶)

- حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کے بارے میں آتا ہے کہ وہ دار ارقم پہونچے تو اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ موجود صحابہ کرام میں سے کسی نے دروازے کی جھریوں سے جھانک کر دیکھا تو حضرت عمرؓ کو شمشیر برہنہ کے ساتھ پایا۔ انھوں نے دروازہ نہیں کھولا اور گھبرا کر رسولِ اکرم ﷺ کو جا کر خبر دی جو دوسرے کمرے میں تھے۔ حکم نبوی پر دروازہ کھولا گیا اور بنفس نفیس رسولِ اکرم ﷺ نے دہلیز پر ان سے ملاقات کی۔ دوسری روایت قبول اسلام میں رسولِ اکرم ﷺ کے گھر میں داخل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (ابن ہشام، ۱/ ۳۶۷-۳۷۰)

- حضرت ابوبکر صدیقؓ کی گھریلو مسجد ان کے گھر کے دروازے پر محلّہ بنی جمح میں تھی:

• و کان لابی بکر مسجد عند باب داره فی بنی جمح ... (ابن ہشام، ۱/۳۹۶)

- حضرت عبداللہ بن جحش اسدیؓ اور ان کے خاندان بنی غنم بن دودان/ اسد خزیمہ نے مدینہ ہجرت کی تو اپنے سارے گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ گئے تھے اور ہوا کے زور سے وہ کھڑکھڑاتے تھے: "... تخفق ابوابها یباباً ..."

(ابن ہشام، ۲/ ۷۹؛ اسی طرح متعدد دوسرے مکانات کے دروازوں کا ذکر ملتا ہے)

- ہجرتِ مدینہ کے لیے سفر کے معاملات طے کرنے کے لیے رسولِ اکرم ﷺ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر گئے تو حضرت اسماءؓ نے دروازہ کھولا۔ اس سے قبل رسولِ اکرم ﷺ نے دروازے پر اجازت داخلہ لی تھی اور ہجرت کے دن دوپہر میں رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خانۂ صدیقی کے پچھواڑے کے دریچہ/ روشن دان سے نکل کر غار ثور کی راہ لی تھی: "فخرجا من خوخة لابی بکر فی ظهر بيته" (ابن ہشام، ۲/ ۹۸)

دروازوں کی تکنیک

دیوار میں دروازہ/ دروازے رکھنے کی تکنیک کا تعلق فنِ تعمیر سے ہے اور اس کے دو طریقے نظر آتے ہیں: ایک خالی دیواریں ہوں، احاطہ، باغ، دار وغیرہ کی اور ان کے اوپر چھت نہ ڈالی جائے تو دیوار میں ایک مناسب شگاف رکھ کر دروازہ/ دروازے لگا دیے جاتے تھے کہ ان کے اوپر کسی قسم کی تعمیر نہیں ہوتی تھی جو فنی صورت مانگے۔ دوسرے اونچی دیواروں پر چھت ڈالی جائے اور ان میں دروازے رکھے جائیں تو دروازے کے شگاف کے اوپر بھی تعمیر چلتی ہے۔ اس خالی جگہ کے اوپر دیوار چلانے کے لیے دروازے کے اوپر ایک روک تھام کرنے والی شے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کی دو صورتیں یا دو قسم کے مواد استعمال کیے جاتے تھے: ایک دروازے کے اوپر والے حصہ پر ایک موٹا لکڑی کا شہتیر رکھ دیا جاتا تھا اور اس شہتیر کے اوپر کچی اینٹوں، مٹی اور گارے یا پتھروں کی چنائی کر دی جاتی تھی۔ دوسرے لکڑی کے شہتیر کی جگہ پتھر کی مضبوط سل بھی رکھی جاتی تھی اور پتھروں کی بعض عمدہ اور مضبوط اقسام دستیاب تھیں۔

خانہ کعبہ کی دیواروں میں دروازہ یا مسجدِ نبوی کے تین چار دیواروں کے دروازوں کے علاوہ دوسری مساجد اور مکانات میں ان ہی دونوں قسم کی تکنیکوں میں سے ایک کو استعمال کیا گیا تھا۔ ان میں یا تو لکڑی کے شہتیر رکھے گئے تھے جیسا کہ خانہ کعبہ کے دوسری تعمیر قریشی کے ضمن میں رومی جہاز کے تختوں کے خریدنے اور عمارت میں استعمال کرنے کے سلسلہ میں پتہ چلتا ہے یا پتھروں کی سلوں سے کام چلایا گیا تھا۔ کھجور کے مضبوط و توانا تنوں کو بھی لکڑی کے تختوں یا شہتیروں کی جگہ استعمال کرنے کا قرینہ ملتا ہے۔

چول

دیوار کے اندر یا باہر کھولنے کے لیے دروازوں کو کسی نہ کسی چول پر قائم کیا جاتا تھا، خواہ وہ لکڑی کی ہو یا لوہے کی۔ نجاروں (بڑھیوں) اور حدادوں (لوہاروں) کے طبقات اور افراد اور ان کے کام کرنے کے حوالے مآخذ میں آتے ہیں اور وہ بلاشبہ ان دروازوں کو چول پر بٹھاتے

تھے تاکہ آسانی سے کھل اور بند ہو سکیں۔ خاص طور سے بھاری دروازوں کے لیے ان کی مضبوط و مستحکم اور آہنی چولوں کی ضرورت پڑتی تھی جیسا کہ ذکر آتا ہے۔

دہلیز

دروازے کے نیچے کی جگہ دہلیز کہلاتی ہے اور اس کے لیے بالعموم کسی چوبی یا آہنی مواد کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن قرونِ وسطٰی بالخصوص عہدِ نبوی میں دہلیز کے لیے چوبی تختے یا شہتیر نما موٹے ٹکڑے استعمال کیے جاتے تھے۔ متعدد روایات میں "اسکفة الباب" (دہلیز) کا حوالہ آتا ہے اور عرب شاعری میں بھی اس کے حوالے ملتے ہیں۔ ان میں دہلیز سے ٹھوکر کھانے اور روک لگانے کا ذکر یا حوالہ بتاتا ہے کہ دروازوں کے نیچے ایک چوبی تختہ ضرور ہوتا تھا اور وہی دہلیز تھا۔ دارارقم میں حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کے وقت ان کے دہلیز پر استقبال نبوی کا ذکر آچکا ہے۔

دروازوں کی اقسام

دو پٹ والے

عام اور معمولی دروازے ہوں یا بھاری بھر کم قیمتی اور بڑے دروازے بالعموم دو پٹوں کے ہوتے تھے۔ ان کے لیے روایات وحدیث میں ''مصراعین'' کا صیغۂ تثنیہ آتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے: دروازے کے دو پٹ۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں پٹ دو مخالف سمتوں میں دیواروں میں یا دیواری چوکھٹوں میں لگائے جاتے تھے اور جب وہ بند کیے جاتے تھے تو آپس میں اپنے کھانچوں سے مل جاتے تھے اور کھولے جاتے تھے تو دونوں اپنی اپنی سمتوں میں چلے جاتے تھے۔ خانہ کعبہ کے دونوں پٹوں یا دو پٹ والے دروازے کے لیے ''عضادتی الباب'' کی ترکیب استعمال کی گئی ہے (واقدی، ۸۳۵)۔ دو پٹ والے دروازوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں:

- خانہ کعبہ، مسجد حرام، مسجد نبوی (مدینہ منورہ) اور بعض دوسری مساجد میں دو پٹ والے دروازے تھے۔

- مکانات نبوی میں بالعموم دو پٹ والے دروازے لگائے گئے تھے اور یہ عام سادہ دروازے تھے۔

- بڑے مکانات میں نسبتاً بھاری اور قیمتی لکڑی کے دروازے لگائے جاتے تھے جیسے ساج (شیشم) اور دوسری اقسام کے دروازے۔ ان کو بڑے دروازے بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ لمبائی چوڑائی میں کافی طویل وعریض ہوتے تھے۔

- بلند، ضخیم اور مضبوط و مستحکم دروازے آطام اور قلعوں کے ہوتے تھے بالعموم ان کے بیرونی دروازے، جن سے باہر نکلا جاتا تھا، مضبوط لکڑی شیشم وغیرہ کے بنائے جاتے تھے اور ان میں لوہے کی سیخیں اور کیلیں وغیرہ بھی گاڑی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی اور بھی دوسرے مضبوطی کے اقدامات کیے جاتے تھے جیسے بڑکے وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ یہ سب دروازے دو پٹ والے ہوتے تھے۔ خیبر کے قلعہ قموص کے جس دروازے کو حضرت علی بن ابی طالبؓ نے مشہور روایت کے مطابق اکھاڑا تھا وہ اسی طرح کا مستحکم و توانا دو پٹ والا دروازہ تھا۔

- بنو نضیر کے یہودی محض مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کی خاطر اپنے مکانوں اور گڑھیوں کے دروازے اور چوکھٹیں تک اکھاڑ کر ساتھ لادلے گئے تھے:

(غزوات نبوی کے اقتصادی پہلو، ۵۸، نیز حاشیہ ۱۱۴: ۱۷۳: ان چوکھٹوں کو "نجف الباب" کہا گیا ہے)

ایک پٹ والے دروازے

عہدِ نبوی میں ایسے دروازوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو سادہ لکڑی کے ہلکے پھلکے ایک پٹ کے دروازے تھے۔ بالعموم یہ چھوٹے اور کم عرض وطول کے دروازے ہوتے تھے۔ ان کو دیواروں میں بھی لگایا جاتا تھا، کمروں میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی۔ گھروں کے اندرونی کوٹھریاں یا کولکیاں یا سامان وغیرہ رکھنے کے حصے بنے ہوتے تھے ان میں ایک پٹ کا ہی دروازہ لگایا جاتا تھا۔ روایات سیرت واحادیث دونوں میں ان "ایک پٹی" دروازوں کا ذکر ملتا ہے۔

زنجیر

ایک پٹ کے دروازے ہوں یا دو پٹ کے، ان کو بند کرنے اور بند رکھنے کے لیے ان

میں زنجیر لگائی جاتی تھی، بالعموم وہ لوہے کی ہوتی تھی، اور لکڑی کی میخ نما بھی ہوتی تھی۔ زنجیر دروازے کے دونوں طرف کے حصوں میں ہوتی تھی کہ اندر سے اور باہر سے بھی ان کو بند کر کے رکھا جا سکے۔

قفل

بعض جلیل القدر دروازوں میں قفل ڈالا جاتا تھا اور ان قفلوں کو کنجیوں سے کھولا جاتا تھا جیسے خانہ کعبہ کے دروازے میں قفل پڑتا تھا اور اس کی ایک کلید ہی نہیں ایک صاحب کلید بھی ہوتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر صاحب کلید حضرت عثمان بن طلحہ حجبی/عبدریؓ سے کلید (مفتاح البیت) منگوا کر خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا تھا۔ دلچسپ روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ماں نے کعبہ کی کنجی اپنے سروال کے نیفے میں اڑس لی تھی کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کو کنجی دینا نہیں چاہتی تھیں۔ عام دروازے کے بارے میں قفل (تالے) اور مفتاح (کنجی) کا حوالہ ذرا کم ملتا ہے یا بالکل نہیں ملتا مگر بڑے مکانوں کے دروازے مقفل کیے جاتے تھے۔ ان کے بعض حوالے ملتے ہیں۔

(واقدی، ۸۳۵: اور رسولِ اکرم ﷺ نے کلید خانہ کعبہ اپنی آستین میں دروازہ کھولنے کے بعد رکھی تھی: "جعل رسول الله ﷺ مفتاح الكعبة في كمه")

- حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک بیت المال ان کے گاؤں سُنح (س ن ح) کارخانے میں تھا اور اس کی حفاظت کے لیے کوئی مقرر نہ تھا مگر اس میں قفل ڈالا جاتا تھا: "ان ابا بكر الصديق كان له بيت مال بالسنح معروف ليس يحرسه احد ... عليه قفل"

(ابن سعد، ۳/۲۱۳: ان کا یہ بیت المال شخصی تھا اور خلافت اسلامیہ کا بیت المال نہ تھا)

✪✪✪

869

بخاری

رہائش گاہیں

مستقل اور عارضی رہائش گاہیں عرب جاہلی کی روایات میں شامل تھیں۔ بدوی عرب، جو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، صحراؤں، ریگستانوں اور دیہاتوں میں خیموں میں رہائش پذیر رہتے تھے اور وہ ان کی مستقل رہائش گاہیں بھی تھیں، اگر چہ ان کی ایک جگہ رہائش مستقل نہ تھی۔ وہ چارہ، پانی اور رغذا کی فراہمی اور دستیابی تک ایک جگہ قیام کرتے اور خیموں میں رہتے تھے اور جب دوسرے مقام پر جاتے تو ان کے خیمے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی بنا پر ان کو خانہ بدوش (کندھوں پر اپنا مکان رکھنے والے) کہا جاتا تھا اور اردو کی یہ تعبیر عربی کے اہل البادیہ سے زیادہ صحیح ہے اور زیادہ معنی آفریں بھی۔

ان کے برعکس شہری عرب یا متمدن لوگ، جو اہل الحضارۃ کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں، اپنے مکانات میں مستقل طور سے رہتے تھے۔ ان کو عربی میں بیوت/ واحد "بیت" کہتے ہیں۔ وہ باقاعدہ مستقل تعمیرات ہوتی تھیں اگر چہ ان کی تعمیر میں فنی عنصر ذرا کم ہوتا تھا۔ ان گھروں (بیوت) کا ایک خاص مزاج وانداز رہائش اور نوعیت وقسم بھی تھی جن کا ذکر الگ سے آتا ہے۔ مکہ مکرمہ اور دوسری بدوی آبادیوں میں بھی عارضی اور مستقل رہائش گاہوں کے طور پر خیموں کا استعمال ہوتا تھا۔ بدوی مزاج کے لوگ مستقل رہائش کے لیے بھی خیموں کا استعمال کرتے تھے اور ان کے مختلف نام ہوتے تھے جیسے قبہ، فسطاط، عریش اور خود خیمہ بھی۔

سفری رہائش گاہوں کے لیے بھی ان خیموں کا استعمال ہوتا تھا اور حج وعمرہ، شکار وسیاحت اور دوسرے اسفار کے زمانے میں قیام وسکونت کے لیے بدوی اور حضری، یعنی دیہاتی، خانہ بدوش اور شہری ومتمدن، سب ہی ان خیموں میں رہائش اختیار کرتے تھے۔ عرب تمدن کا یہ ایسا متواتر عمل اور پیہم ومسلسل روایت ہے کہ آج بھی ان کا استعمال ہوتا ہے اور بعض احوال میں تو وہ

ناگزیر ہوتا ہے، بالخصوص حج و عمرہ کے زمانے میں کہ زائرین کے مستقل قیام کا مسئلہ نہیں ہوتا اور عارضی سکونت کے لیے اتنی عمارتیں دستیاب نہیں ہوتیں، لہٰذا خیموں کے شہر لگائے اور بسائے جاتے ہیں اور اکا دکا خیمے اِدھر اُدھر بھی سکونت کے لیے نصب کیے جاتے ہیں۔

(مآخذ کے لیے اگلے مباحث ملاحظہ ہوں؛ نیز اہل البادیہ/ بدو اور اہل الحضارة/ متمدن لوگوں پر عرب تاریخ کے مآخذ اور کتب و مقالات)

قبہ (خیمہ)

لغوی معنی کے لحاظ سے قبہ گنبد ہے جس کی جمع قباب وقبب آتی ہے (مصباح اللغات)۔ اصطلاحی طور سے وہ خیمہ کے معنی میں آتا ہے۔ قبہ (خیمہ) عارضی اور مستقل سکونت کے مقامات و آلات ہوتے تھے: عارضی مسافروں کے لیے یا بادیہ (گاؤں، دیہات) میں دیہاتی زندگی کا لطف اٹھانے والوں کے لیے ہوتے تھے اور مستقل بدوی اعراب اور خانہ بدوش عربوں کے قبیلوں کے لیے ہوتے تھے۔ وہ بالعموم اونٹ وغیرہ مویشیوں کے کھالوں سے بنائے جاتے تھے۔ ان کی ساخت، بناوٹ اور دوسری چیزوں کے لحاظ سے ان کی مختلف قسمیں ہوتی تھیں۔ بعض بلا بال کے دباغت شدہ چمڑے کے ہوتے تھے، بعض بال والے ہوتے تھے، بعضوں کا رنگ لال ہوتا تھا اور بعضوں کا ٹیالا۔ احادیث و روایات میں "قبۃ من ادم" (چمڑے کے خیموں) کا ذکر مختلف مناسبات سے ملتا ہے۔ ان میں نبوی خیمے سرفہرست ہیں:

چمڑے کے قبے

- حدیثِ بخاری: ۵۸۵۹ کے مطابق حضرت ابو جحیفہؓ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ چمڑے کے سرخ قبہ میں تھے..."أتیت النبی ﷺ وھو فی قبة حمراء من ادم..."۔ اسی طرح حدیث بخاری: ۵۸۶۰ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے انصار کو چمڑے کے ایک خیمہ میں جمع کیا تھا: "أرسل النبی ﷺ وجمعھم فی قبة من ادم"

(کتاب اللباس، باب القبة الحمراء من ادم)

امام بخاریؒ نے ان دونوں واقعاتِ غزوہ فتح مکہ وحنین کو بیان کرنے کے لیے خاص اسی عنوان کا باب باندھا ہے۔ وہ دوسرے کتب وابواب بخاری میں بھی آیا ہے اور ان کی شرح حافظ ابن حجر میں بھی۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۸۵-۳۸۶ بحوالہ دیگر کتب حدیث؛ ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، ترمذی ایضاً، باب فی المؤذن الخ وغیرہ؛ کتاب الاستیذان، باب فی الرخصة فی لبس الحمرة الخ: "فی قبة له حمراء ...")

- عمرۂ قضا، ۷/ ۶۲۹ میں رسولِ اکرم ﷺ کے لیے چمڑے کا قبہ لگایا گیا تھا: "ضربت له قبة من ادم..." (واقدی، ۷۴۰)

- غزوۂ خیبر، ۷/ ۶۲۹ میں حضرت صفیہ سے شادی کی رات حضرت ابوایوب انصاریؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کے قبہ کی محافظت کی تھی۔

(واقدی، ۷۰۸: "وبات ابو ایوب الانصاری قریبا من قبته آخذ القائم السیف...")

- فتحِ مکہ، ۸/ ۶۳۰ کے ضمن میں رسولِ اکرم ﷺ کے قبہ کا ذکر ملتا ہے: "حتی اجتمعنا جمیعا علی باب قبة النبی ﷺ" (واقدی، ۸۱۷)۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مکہ میں کسی گھر کے اندر قیام کرنے کے بجائے حجون نامی مقام پر ایک قبہ میں ہی قیام فرمایا تھا اور آپ ﷺ کے ساتھ امہات المومنین ام سلمہ اور میمونہ تھیں: "قد ضرب لرسول الله ﷺ قبة بالحجون من ادم..." (۸۲۹)

- غزواتِ حنین، طائف اور تبوک میں بھی رسولِ اکرم ﷺ کے خیموں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں قبہ کا ہی زیادہ حوالہ آتا ہے۔

- حجۃ الوداع، ۱۰/ ۶۳۲ میں رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے لیے منیٰ، مزدلفہ اور عرفات وغیرہ پر خیمے لگائے گئے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا قبہ مرکزی مقام پر ہوتا تھا اور اس کے اردگرد ازواجِ مطہرات کے خیمے ہوتے تھے۔ بعض اوقات وہ بالوں والے بھی تھے جیسے عرفات میں تھا: "قبة من شعر بها" ... وازواجه فی قباب ... او فی قبة ... حوله" (واقدی، ۱۱۰۱)... جنت الابطح فضربت قبته ..." (واقدی، ۱۱۱۳) اور منیٰ میں حضرت ابوبکرؓ کا قبہ رسولِ اکرم ﷺ کے قبہ کے برابر لگایا گیا تھا۔ (واقدی، ۱۰۹۱)

- ۹/ ۶۳۱ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی امارت میں حج کرایا تھا تو وہ ایک "قبة شعر" میں ہی ٹھہرے تھے (واقدی، ۱۰۷۷)۔ اسی طرح صحابہ کرام کے لیے قبہ/ قبے لگائے جاتے تھے بالخصوص غزوات اور عمرہ و حج کے اسفار کے دوران۔ ان کا ذکر روایاتِ سیرت میں بھی آتا ہے۔

خیمہ: دوسرا لفظ ہے جو قبہ یا دوسرے عارضی قیام گاہوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع خِیَم وخیام وغیرہ ہے اور خیام کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے: سورہ رحمٰن-۷۲: "حور مقصورت فی الخیام" (گوریاں رکی رہتیاں خیموں میں)۔ یہ جنت کے خیموں کا ذکر ہے۔ لغوی معنی میں: ڈیرہ، ہر وہ مکان جو اینٹ پتھر مٹی وغیرہ سے نہ بنا ہو، جمع خِیَم وخیام وغیرہ ہیں۔ (مصباح اللغات)

- احادیث وروایات میں خیمہ کا سب سے مشہور ذکر اور اعلیٰ مثال وہ ہے جس کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ کی تیمارداری اور علاج ومعالجہ کے لیے مسجدِ نبوی میں ایک خاتون جراح حضرت رُفیدہؓ کے لیے لگوایا تھا۔

(حدیثِ بخاری: ۴۱۲۲ میں ہے: "... فضرب النبی ﷺ خیمة فی المسجد لیعوده من قریب ..."؛ فتح الباری، ۷/ ۵۱۴ و ماقبل و مابعد ۵۱۵ بحوالہ ابن اسحاق: "وکان رسول اللہ ﷺ جعل سعدا فی خیمة رفیدة عند مسجده ... فقال: اجعلوه فی خیمتها لاعوده من قریب ...")

- ثقیف کا وفد ۹/ ۶۳۱ میں مدینہ منورہ آیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے لیے تین خیمے کھجور کی پتیوں کے مسجد میں لگوائے تھے: "فامر النبی ﷺ بخیمات ثلاث من جرید فضربت فی المسجد" (واقدی، ۹۶۵)

فسطاط

بھی خیمہ کے معنی میں آتا ہے۔ اسے مصباح اللغات میں مصر قدیم کا عَلَم بتایا گیا ہے اور خیمہ اور اون کے خیمہ کے معانی دیے گئے ہیں۔

- حج سے متعلق بعض متاخر روایات میں قبہ کے بجائے فسطاط آتا ہے۔ جیسے حدیث بخاری

:۱۶۶۳ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حجاج بن یوسف ثقفیؒ کے خیمہ (فسطاط) پر آواز لگا کر وقتِ رحیل بتایا تھا۔ (فتح الباری، ۳/۶۴۹)

- واقعۂ تحکیم کے موقع پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے خیمہ (فسطاط) کے برابر حضرت مسروقؒ کا بھی خیمہ تھا (ابن سعد، ۴/۱۱۳)۔ بعض روایاتِ سیرت میں بھی خیمہ کے لیے فسطاط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

- حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سہمیؓ کے لیے حج کے دوران مقامِ حل میں ان کا خیمہ (فسطاط) لگایا جاتا تھا۔ (ابن سعد، ۴/ ۲۶۸)

قبہ، خیمہ اور فسطاط کو ان مذکورہ بالا روایات میں مترادف کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جہاں تک عارضی رہائش گاہ کے وسیع تر معنی و مفہوم کا تعلق ہے وہ تعبیر صحیح ہے لیکن ان تین مختلف الفاظ سے تین مختلف قسم کے خیمے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی بناوٹ، ساخت اور اس کے خام مواد وغیرہ کی بنا پر ان کے ناموں کی تقسیم ہوئی تھی۔ ان کے اس بنیادی فرق و امتیاز کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ وہ مزید تحقیق کا طالب ہے۔

عریش (جھونپڑی)

گھروں اور مستقل یا عارضی قیام گاہوں کی ایک صورت جھونپڑی (عریش) کی تھی جس کی جمع عُرُش آتی ہے۔ مصباح اللغات میں اس کے کئی معانی دیے ہیں: ''جھونپڑی، چھولداری، جانوروں کو سردی سے بچانے کا باڑہ، انگور کی ٹٹی''۔ ان سب معانی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ بالعموم چھپر اور ٹٹیوں سے بنائی جاتی تھی اور ان سے سایہ اور ٹھنڈک حاصل کرنا مقصود ہوتا تھا۔ گرمی کے زمانے میں بالخصوص اکابر صحابہ اور دوسرے صاحبانِ استطاعت اپنے احاطوں اور باغوں میں ایسی عریش بنا لیتے تھے اور ان پر پانی چھڑک کر ان کو ٹھنڈا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ کے باغاتِ نخیل وغیرہ کے مالکان کے احاطوں میں ایسی ہوادار ٹھنڈی جھونپڑیوں کا ذکر متعدد احادیث و روایاتِ سیرت میں آتا ہے۔ یہ مستقل قسم کی عریش/عرش تھیں۔ ان میں سے بعض خالص عارضی عریش ہوتی تھیں جو ایک خاص مقصد کے لیے محدود وقت پر لگائی جاتی تھیں۔

عریشِ بدر

- سب سے مشہور تو وہ جھونپڑی یا عریش تھی جو رسولِ اکرم ﷺ کے لیے غزوۂ بدر کے دوران بطور صدر مقام و مرکز بنائی گئی تھی اور جہاں آپ ﷺ نے اپنی گریہ وزاری اور دعا و انابت سے رحمتِ الٰہی اور نصرتِ ربانی کو کھینچا اور فتح کا انعام الٰہی پایا تھا: "لما نزل رسول الله ﷺ علی القلیب بنی له عریش من جرید، فقام سعد بن معاذ علی باب العریش متوشح السیف ..." (واقدی، ۵۵ وغیرہ)۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن معاذؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و آرام کی غرض سے آپؐ کے اذن سے عریش بنائی تھی (۲/۲۶۰) اور اسی عریش میں اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت کی دعا کی تھی (۲/۲۶۷) اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کو تسلی اور تشفی دی تھی۔ مگر احادیث بخاری: 2915 اور اس کے بعض اطراف میں اسے "قبۃ" کہا گیا ہے جہاں آپ ﷺ نے دعا کی تھی۔

(فتح الباری، ۶/۱۲۱ و مابعد؛ اطراف بخاری: ۳۹۵۳، ۴۸۷۵، ۴۸۷۷: حافظ موصوف نے موخر الذکر دو اطراف کے بعد ایک نکتہ کی بات یہ کہی ہے کہ یہ چاروں احادیث بخاری حضرت ابن عباسؓ کے مرسلات/ مراسیل ہیں کہ وہ خود اس واقعہ میں موجود نہ تھے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے عریش کو قبہ سے اپنی فہم کی بنا پر بدلا ہو۔ روایاتِ سیرت بہر حال مرفوع و متصل ہیں اور عینی شاہد کی روایت پر مبنی ہیں؛ نیز مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملئكة عن عمرؓ جو عینی شاہد تھے)

مستقل عریش

- حضرت عبداللہ بن خیثمہ سالمیؓ کی جھونپڑی کا ذکر غزوۂ تبوک کے حوالے سے آتا ہے جو ۹/۶۳۱ میں واقع ہوا۔ روایت ہے کہ صحابیٔ جلیل اپنی دو بیویوں کے پاس گئے تو وہ دونوں اس شدید گرمی کے دن اپنی اپنی جھونپڑیوں میں تھیں۔ ان دونوں نے اپنی دونوں جھونپڑیوں پر پانی چھڑک کر اسے ٹھنڈا بنا رکھا تھا اور شوہرِ نامدار کے لیے اس میں پانی ٹھنڈا کر رکھا تھا اور کھانا پکا رکھا تھا۔ وہ اپنے "مال" / جائداد یا آراضی پر مقیم رہے تھے ...: "...فوجدهما فی عریشین لهما، قد رشّت کل واحدة منهما عریشهما، وبرّدت له فیه ماءً، وهیأت له فیه

طعاما ...''۔ دو بیویوں کے لیے دو الگ الگ عریش/جھونپڑیاں تھیں۔ (واقدی ۹۹۸)

- حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ انصاری صحابی کے باغ میں ایک عریش تھی جہاں رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی دعوت پر قیلولہ کیا تھا اور آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی تھے: ''... فقال الرجل: یا رسول الله! عندی ماء بائت، فانطلق الی العریش ... الخ'' حدیثِ بخاری: ۵۶۱۳؛ فتح الباری، ۹۴-۹۷ ...: ''ان لنا عریشا باردا فقل فیه یا رسول الله عندنا ...''۔

پردے دروازوں کے: قرام

قدیم زمانے سے دروازوں پر پردے لٹکانے کا رواج چلا آ رہا ہے۔ اس کی ایک تمدنی جہت اور سماجی اہمیت ہمیشہ رہی ہے، عرب جاہلی میں بھی اس کا رواج ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ صاحبانِ مال و استطاعت ہی کے افراد و طبقات کا تمدنی جلوہ تھا۔ پردے لٹکانے کے دو محرکات ضرور رہے تھے: ایک تخلیہ و خلوت، حجاب اور حفاظت کا تصور و عمل تھا اور دوسرا زیب و زینت کا جذبہ تھا۔ عہدِ نبوی میں بھی اس سماجی روایت اور تمدنی قدر کے وافر ثبوت ملتے ہیں اور ان کے آدابِ و احکام بھی ملتے ہیں۔ اسلامی شریعت پردے لٹکانے کے خلاف ہرگز نہیں بلکہ اس کے حق میں سب سے آگے ہے کہ وہ غیر ضروری اختلاط اور بے پردگی سے بچاتی ہے اور نگاہ و دل کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اندرونِ خانہ جلووں کی صیانت و حفاظت کی بھی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امہات المومنین کو پردے کے پیچھے (''من وراء حجاب'' - احزاب: ۵۳) سے سوال و جواب اور اختلاط کا حکمِ ربانی دیا گیا۔

ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرہ کے دروازوں کے پردوں سے متعلق کئی احادیث بہت مشہور ہیں۔ پہلے ان کا ذکرِ خیر، پھر ان کا مختصر تجزیہ اور دوسری روایت و احادیث پر بحث مباحثہ۔ احادیث و روایات میں اس شے کے لیے مختلف الفاظ آتے ہیں جیسے ''قرام'' جس کے معنی ہیں: ''سرخ پردہ یا باریک کپڑا'' (مصباح اللغات)، دوسرا لفظ ''درنوک'' ہے جس کے معنی ہیں: غالیچہ، قالین جس کی جمع درانیک ہے (مصباح اللغات)۔ خالص پردہ (ستر) کا لفظ بھی آتا

ہے۔ نمط کا لفظ بھی آیا ہے۔

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دروازوں یا گھر کے پردوں کے بارے میں احادیث میں کافی گونا گونی اور رنگارنگی پائی جاتی ہے، امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین کرام نے متعدد اطراف حدیث کو بیان کیا ہے:

(۱) خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ایک مہتابی، طاقچہ (سھـوۃ) پر ایک سرخ پردہ یا باریک کپڑے کا پردہ ڈال دیا یا اسے ڈھک دیا۔ رسولِ اکرم ﷺ ایک سفر سے تشریف لائے تو اس کی تصویریں (تماثیل) دیکھ کر اسے پھاڑنے/ ہٹانے کا حکم دیا بلکہ خود ہی اسے ہٹا دیا۔ ہم نے اس کے ایک یا دو تکیے بنا لیے: "...قدم رسول اللہ ﷺ من سفر، وقد سترت بقرام لی علی سھوۃ لی فیھا تماثیل، فلما رآہ رسول اللہ ﷺ ھتکہ... قالت: فجعلناہ وسادۃ او وسادتین..."

(کتاب اللباس، باب ما وُطیٔ من التصاویر، حدیث: ۵۹۵۴؛ فتح الباری، ۱۰/۴۷۴-۴۷۶)

(۲) ۵۹۵۵: عن عائشۃ: "... قدم النبی ﷺ من سفر، وعلقت در نو کا فیہ تماثیل، فامرنی ان انزعہ، فنزعتہ (ایضاً)"

"سھوۃ" کے ترجمہ میں مختلف بیانات ملتے ہیں: حافظ ابن حجرؒ نے اسے گھر کے کنارے ایک چبوترہ قرار دیا ہے: "صفۃ من جانب البیت" اور دوسرے مجروح اقوال لفظ قیل (کہا گیا) سے بیان کیے ہیں: (۱) الکوۃ (روشندان)، (۲) الرف (الگنی، لکڑی وغیرہ جس کے دونوں کنارے دیوار میں لگا کر گھر کا سامان رکھ دیں (مصباح اللغات)، (۳) چار یا تین لکڑیاں جو ایک دوسرے کے اوپر مختلف سمتوں سے رکھ جاتی ہیں اور اس پر اسباب میں سے کچھ رکھا جاتا ہے، (۴) گھر کے احاطہ میں ایک چھوٹا احاطہ بنایا جائے اور پورے احاطہ پر چھت ڈال دی جائے اور جو بیچ گھر کا حصہ ہے وہ "سھوۃ" ہے اور جو اس کا اندرونی حصہ ہے وہ "مخدع" کہلاتا ہے۔ (۵) گھر کے کونے میں ایک اندرونی دریچہ: "دخلۃ فی ناحیۃ البیت"، (۶) کمرے کے اندر کی چھوٹی کوٹھری کے مانند چھوٹا گھر (۷) چھوٹا گھر جو زمین کے اندرونی حصہ کی طرف جاتا ہو اور اس کی چھت زمین سے بلند ہو جیسے چھوٹا خزانہ جس میں سامان رکھا جاتا

ہے اور اسی کو بقول حافظ امام ابوعبید نے ترجیح دی ہے اور حافظ موصوف نے اسی کو اپنے معنی کا مترادف قرار دیا ہے۔ مزید یہ کہا ہے کہ حدیثِ حضرت عائشہؓ میں ہی، جو اسی بابِ بخاری کی دوسری روایت ہے، یہ بات آئی ہے کہ حضرت صدیقہؓ نے اسے اپنے دروازے پر لٹکایا تھا اور اسی طرح مسلم کی حدیث وروایتِ حضرت زید بن خالد جہنیؓ میں ہے۔ اس سے یہ متعین ہو گیا کہ سہوہ ایک چھوٹا گھر تھا جس کے دروازے پر حضرت صدیقہؓ نے پردہ لٹکا لیا تھا۔ مصباح اللغات میں ہے: ''کانس، مہتابی، طاقچہ، روشندان، صحن کے سامنے کا پردہ، پانی کے سامنے کا خیمہ جو اعراب قائم کیا کرتے تھے...''

اس روایت/حدیث میں ''تماثیل'' کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی تصویروں کے ہیں خواہ وہ نقش ہوں، ابھرے ہوئے ہوں یا کاڑھے ہوئے ہوں یا کپڑے کی بناوٹ میں ہوں۔ غرض باتصویر شے ان سے مراد ہے۔ مسلم کی روایت میں تصاویر کا لفظ ہے۔

اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اسے بنفس نفیس ہٹا دیا اور اس کے بعد کی روایت میں ہے کہ مجھے ہٹانے کا حکم دیا اور میں نے ہٹا دیا۔

اول روایت میں ہے کہ ہم نے اس کے ایک یا دو تکیے بنا لیے۔ کتاب المظالم کی حدیث میں ہے کہ میں نے اس سے دو چھوٹے تکیے یا گدیلے (نمرقتین) بنائے جس پر آپ ﷺ تشریف رکھا کرتے تھے: ''فاتخذت منه نمرقتين فكانتا في البيت يجلس عليها''۔ مسلم میں لفظ ''مرفقتین'' ہے جس پر آپ ﷺ ٹیک لگایا کرتے تھے۔ مصباح اللغات کے مطابق ''مرفقتين'' کے معنی ہیں: تکیہ لگانے کی جگہ۔

دوسری روایت میں لفظ ''درنوک'' ہے جس کی ایک قراءت واملا ''درموک'' بھی ہے اور امام خطابی کے مطابق وہ ایک موٹا روئیں دار کپڑا ہوتا ہے۔ جب اسے بچھا لیا جاتا ہے تو وہ فرش/بساط بن جاتا ہے اور لٹکا لینے پر پردہ بن جاتا ہے: ''هو ثوب غليظ له خمل، اذا فرش فهو بساط، واذا علق فهو ستر''۔ مصباح اللغات نے اس کے دو معانی دیے ہیں: غالیچہ اور قالین جس کی جمع درانیک ہے۔

دوسری حدیث میں وارد لفظ تماثیل کی تشریح میں دیگر روایات کا سہارا لیا ہے اور مختلف

تشریحات پیش کی ہیں: مسلم کی ایک روایتِ ابی اسامہ ہے کہ اس میں پروں والے گھوڑے تھے: "فیه الخیل ذوات الاجنحة" - اس کے بعد کی پوری بحثِ حافظ ابن حجرؒ تصاویر کی حرمت اور اباحت اور ان کے سلسلے میں مسالکِ علماء وفقہاء سے متعلق ہے۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۴۷۶-۴۷۷)

بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب ان صلّی فی ثوب مصلب الخ کی حدیث: ۳۷۴ میں حضرت انسؓ کی روایت مختلف ہے۔ حضرت عائشہؓ کا ایک پردہ تھا جس سے انھوں نے اپنے گھر کے ایک حصہ کے جانب پردہ ڈالا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اپنے اس پردے کو ہٹاؤ کہ اس کی تصویریں برابر میری نماز میں سامنے لہراتی رہیں: "کان قرام لعائشة سترت به جانب بیتها، فقال النبی ﷺ: أمیطی عنا قرامک هذا فانه لا تزال تصاویره تعرض فی صلاتی" ۔طرف: ۵۹۵۹؛ فتح الباری، ۱/ ۶۲۷-۶۲۸ جس میں تصاویر کی تشریح پر کوئی بحث نہیں ہے۔

نسائی میں متعدد اطرافِ حدیث ہیں: ۲۱۲-۲۱۴: "... وقد علقت قراما فیه الخیل اولات الاجنحة" ۲- "کان لنا ستر فیه تمثال طیر مستقبل البیت اذ دخل الداخل... یا عائشة: حوّ لیه، فانی کلما دخلت فرأیته ذکرت الدنیا"، ۳- قالت: "وکان لنا قطیفة لها علم فکنا نلبسه فلم نقطعه، ۴- کان فی بیتی ثوب فیه تصاویر فجعلته الیٰ سهوة فی البیت فکان رسول الله ﷺ صلی الیه ثم قال: یا عائشة! أخریه عنّی، فنزعته و سائد، ۵- "نصبّت سترا فیه تصاویر فدخل رسول الله ﷺ فنزعه فقطعته وسادتین ... یرتفق علیهما"

(نسائی، کتاب القبلة، باب الصلاة الیٰ ثوب فیه تصاویر؛ کتاب الزینة: التصاویر)

ان تمام احادیث اور ان کے اطراف سے ایک حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ یہ مختلف اوقات کے مختلف واقعات ہیں: ایک تو پردہ تھا جو دروازے پر پڑا تھا (قرام) ۲- دوسرا غالیچہ/ قالین تھا جس کے بعد میں تکیے بنائے گئے۔ ۳- باتصویر پردہ فوراً اتار دیا گیا کہ وہ سامنے دروازے پر تھا۔ ۴- باتصویر پردہ دوسرا تھا جو کوٹھی (سہوہ) پر پڑا تھا اور نماز میں تنگ کرتا تھا۔ ۵- قطیفہ یا چادر تھی جس میں نقش تھے۔

مسلم کے مختلف کتب وابواب میں حدیثِ پردہ کے متعدد اطراف ہیں:

نمط بمعنی چادر یا ایک قسم کا اونی کپڑا جو ہودج پر ڈالا جاتا ہے (مصباح اللغات)

– عن عائشة ... رأيته خرج في غزاته فأخذت نمطا فسترته على الباب، فلما قدم فراه النمط ... قالت: فقطعنا منه وسادتين و حشوتهما ليفا، فلم يعب ذلك عليّ. حديث ...... (۲۱۰۷)۔اس نمط کو کاٹ کر دو تکیے بنا لیے جن میں کھجور کی پتیاں بھری تھیں اور ان کو ناپسند نہیں فرمایا۔

ستر (پردہ)- عن عائشة: كان لنا ستر فيه تمثال طائر و كان الداخل اذا دخل استقبله، قال لي رسول الله ﷺ: حوّلي هذا، فاني كلما دخلت فرأيته ذكرت الدنيا. و كانت لنا قطيفة كنا نقول علمها حرير، فكنا نلبسها"۔حدیث:۸۸(۲۱۰۷)

درنوک-عن عائشة: قدم رسول الله ﷺ من سفر، وقد سترت على بابي درنوكا فيه الخيل ذوات الاجنحة فأمرني فنزعته۔حدیث:۹۰(۲۱۰۷)

قرام-عن عائشة: دخل عليّ رسول الله ﷺ وانا سترة بقرام فيه صورة، فتلون وجهه ثم تناول الستر فهتكه..." حدیث:۹۱(ایضاً)

– عن عائشة: وقد سترت سهوة لي بقرام في تماثيل فلما رآه هتكه، فقطعناه فجعلنا وسادة او وسادتين ۹۲(ایضاً)

ثوب (کپڑا)-عن انس: انه كان لها ثوب فيه تصاوير، ممدودة الىٰ سهوة، فكان النبي ﷺ يصلّي اليها... فجعلته وسائد ... "۹۳(ایضاً)

نمرقة (غالیچہ)-عن عائشة: اشترت نمرقة فيها تصاوير..." حدیث:۹۵-۹۶ تا ۱۰۰(ایضاً) نیز ۱۶۶۶-۱۶۷۱

ابوداؤد، كتاب اللباس، باب في اتخاذ الستور، احادیث:۴۱۵۳:باب في الصور حضرت عائشہ کے بارے میں ہے۔ اور ۴۱۵۷ اور ۴۱۵۸ آخر کتاب اللباس میں یہ دلچسپ اضافہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو حضرت جبریل علیہ السلام نے پردوں کو کاٹ کر ان کے دو تکیے بنا لینے کی ہدایت کی تھی جس پر حضرت عائشہ نے عمل کیا۔

ان تمام روایات واحادیث کے اختلافات سے قطع نظر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے گھر کے داخلہ کے دروازے پر ایک پردہ لٹکایا تھا اور پردہ لٹکانا زیر بحث یا زیرِ نقد نہیں ہے اگرچہ مسلم کی ایک روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے تاہم پردے دروازے پر لٹکائے جاتے تھے اور ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس کی تائید دوسری احادیث سے ہوتی ہے۔ مولانا شبلیؒ نے مکانات ازواج مطہرات کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا'' (۲۸۲/۱: منازل نبوی کا حال طبقات ابن سعد جزء ۸ صفحہ ۱۱۰ اور وفاء الوفاء میں تفصیلاً ہے)۔ اگلی بحث میں مزید احادیث پردہ آتی ہیں۔

مسجد کی طرف دروازے پر پردہ

متعدد محدثینِ کرام نے حیاتِ نبوی کی آخری حدیث بیان کی ہے کہ مرض الوفاۃ کے آخری دن حضرت ابوبکر صدیقؓ مسلمانوں کو مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے اور وہ دوشنبہ کا دن تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حجرہ کا پردہ اٹھا کر مسلمانوں کو دیکھا اور پھر پردہ گرادیا: "... حتی اذا کان یوم الاثنین وهم فی صفوف الصلاة، فکشف النبی ﷺ ستر الحجرة ینظر الینا ... وارخی الستر فتوفی من یومه" ۔ حضرت انسؓ کی دوسری روایتِ باب میں لفظ ستر کی جگہ حجاب ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ پردہ/ستر یا حجاب مسجد میں کھلنے والے دروازے پر تھا۔

(بخاری، کتاب الاذان، باب اهل العلم والفضل احق بالامامة؛ باب هل یلتفت لامر الخ، احادیث: ۶۸۰، ۶۸۱، اطراف حدیث: ۷۵۴، ۱۲۰۵، ۴۴۴۸؛ فتح الباری، ۲/ ۲۱۳-۲۱۶؛ ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب الدعا فی الرکوع والسجود، حدیث: ۸۷۶؛ الستارة؛ ترمذی، ابواب صفة القیامة، وغیرہ)

روایاتِ سیرت میں کم از کم اس پردے کا ذکر لگ بھگ انھیں الفاظ وتعبیرات میں ملتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ دروازے پر پردے ڈالے جاتے تھے۔ (بلاذری، ۱/ ۵۶۱)

حضرت فاطمہ کے گھر کا پردہ

– حدیثِ بخاری: ۲۶۱۳ میں حضرت فاطمہؓ کے گھر کے دروازے پر پردہ لٹکائے جانے کا ذکر ہے۔ پردہ پر نہیں بلکہ پردہ کی تصاویر اور نقش ونگار پر اعتراض تھا اس لیے رسولِ اکرم ﷺ نے

حضرت علیؓ سے اس کا ذکر کیا اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر وہ باتصویر پردہ ایک ضرورت مند گھرانے کو ہدیہ کرنے کا حکم دیا تھا اور حضرت علیؓ نے اس پر عمل کیا تھا: "... عن ابن عمرؓ قال: اتی النبی ﷺ بیت فاطمة فلم یدخل علیها، وجاء علیّ فذکرت له ذلک، فذکره للنبی ﷺ: قال: انی رأیت علیٰ بابها سترا مؤشیا ..."

(بخاری، کتاب الهبة، باب هدیة مایکره لبسها؛ فتح الباری، ۵/۲۸۱-۲۸۲)۔

حافظ ابن حجرؒ نے "موشیا" کے معنی رنگ برنگی نقوش سے مزین بتائے ہیں: "قال ابن الجوزی: الموشی المخطط بألوان شتی"

- حدیث بخاری: ۱۹۵۷ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خرید کردہ قالین (نمرقہ) پر بیٹھنے اور آرام فرمانے سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ اس میں تصاویر تھیں۔

حضرت زید بن خالدؓ کے گھر کا پردہ

- حضرت زید بن خالدؓ کے گھر کے دروازے پر جو پردہ پڑا ہوتا تھا اس میں تصویریں ہوتی تھیں مگر وہ کپڑوں کی بنت میں ہوتی تھیں: "... فاذا نحن فی بیته بستر فیه تصاویر ... إلا رقم فی ثوب"

(بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم الخ؛ کتاب اللباس، باب من کره القعود علی الصور" حدیث: ۵۹۵۸؛ فتح الباری، ۱۰/۴۷۷-۴۷۸)

حضرت بسر بن سعید تابعی عالم تھے۔ انھوں نے صحابیِ موصوف کی بیماری میں عیادت کی تو پردوں کی تصاویر دیکھ کر اعتراض کیا۔ حضرت عبید اللہ خولانی دوسرے تابعی ساتھ تھے۔ انھوں نے ان کے اعتراض کو رفع کرتے ہوئے بتایا کہ کپڑے میں بُنے ہوئے بیل بوٹے اس سے مستثنیٰ ہیں جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے۔ سابق اعتراض محض ایک حدیث کی بنا پر تھا۔

حضرت ابن عمرؓ کے دیواری پردے

امام بخاریؒ کے ایک بابِ نکاح کے ترجمۃ الباب میں ایک عظیم و جلیل روایتِ پردہ کا ذکر

ملتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کو کھانے کی دعوت پر اپنے گھر بلایا۔ مہمان گرامی جو عظیم ترین میزبان نبوی بھی رہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے گھر پہونچے تو دیوار پر ایک پردہ دیکھا۔ حضرت ابن عمرؓ نے معذرت کی کہ وہ پردہ اس بنا پر لٹکایا ہے کہ ہم پر عورتیں غالب آ گئیں۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ مجھے اپنے بارے میں تو ان کا خدشہ وخوف تھا لیکن آپ کے بارے میں بالکل خوف نہ تھا اور اللہ کی قسم میں آپ کا کھانا نہیں کھاؤں گا اور واپس ہو گئے۔ اس عبارت/ حدیث کا اصل متن درج ذیل ہے:

"... و دعا ابن عمر ابا ایوب فرأی فی البیت ستراً علی الجدار، فقال ابن عمرؓ: غلبنا علیه النساء، فقال: من کنت اخشی علیه فلم اکن اخشی علیک، و الله لا اطعم لکم طعاما، فرجع..."

(فتح الباری، ۹/۳۰۹-۳۱۱: حافظ ابن حجرؒ نے تشریح کی ہے کہ یہ خلافتِ فاروقی کا واقعہ ہے اور اس کا ایک خاص سماجی اور تمدنی پس منظر ہے۔ امام احمد کی کتاب الورع اور مسند مسدد اور طبرانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنے والد ماجد کے عہد میں شادی کی اور والد مکرم نے لوگوں کی دعوت کی اجازت ان کو دی۔ ان میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی شامل تھے، دوسری روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کرام دعوت ولیمہ میں آتے تو اول آنے والوں کو پہلے کھلایا گیا: **"فاقبل اصحاب النبی ﷺ یدخلون الاول فالاول..."** ۔ ان میں حضرت ابوایوبؓ بھی تھے۔ بقیہ بحث فقہی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ بہر حال یہ ذرا بعد کا واقعہ ہے مگر تمدنی اور سماجی روایات میں اتنے مختصر عرصوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ایک وجہ اعتراض یہ بھی تھی کہ آپ نے اپنا گھر خانہ کعبہ سمجھ لیا ہے کہ پردوں سے ڈھکا ہے)

✪✪✪

بیت الخلاء

بعض روایاتِ سیرت وحدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں مکانات کے اندرون یا احاطہ میں بیت الخلاء نہیں تھے۔ مولانا شبلیؒ اور ان کے بعض ہمنواؤں نے اس سے عصری تمدن کے بارے میں بعض نتائج اخذ کیے ہیں جو ان روایات کے عین مطابق ہیں۔ دوسری بعض روایات سے یہ قرینہ بھی ملتا ہے کہ مکان کے اندر یا احاطہ وغیرہ کے کسی حصہ میں کسی نہ کسی قسم کا مقامِ طہارت ہوتا تھا خواہ عارضی ہو، بہر حال دو طرح کی روایات ملتی ہیں: ایک گھروں سے باہر میدان/ جنگل/ کھیت وغیرہ میں فراغت کے لیے جانے کی اور دوسری گھر کے اندر یا اس کے قرب وجوار میں بول وبراز کرنے کی۔ ذیل میں ان دونوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

رفع حاجت کے لیے باہر جانا

عام سماجی ضابطہ اور تمدنی طریقہ تھا۔ حدیث افک میں حضرت عائشہؓ کی زبان سے اس کی حکمت کا پتہ چلتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ ہم اعرابی/ بدوی قوم ہیں اور اپنے گھروں میں وہ پاخانے/ بیت الخلاء نہیں بناتے جن کو عجمی لوگ بناتے ہیں کیونکہ ان سے بچتے اور ان کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہم تو مدینہ کے میدانوں یا مکانوں کے درمیان واقع کشادہ جگہوں پر جایا کرتے ہیں اور عورتیں صرف رات میں ہر رات اپنے حوائج کے لیے نکلا کرتی ہیں: "وکان قوما عربا لا نتخذ فی بیوتنا هذه الكنف التی تتخذها الاعاجم، نعافها ونکرهها، انما کنا نذهب فی فسح المدینة، وانما کانت النساء یخرجن کل لیلة فی حوائجهن ..." ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی اسی طرح باہر جایا کرتی تھیں۔

(ابن ہشام، ۲/ ۲۹۹؛ الکنف جمع ہے الکنیف کی جس کے معنی ہیں: پائخانہ، اصلاً اس کے معنی پردہ یا پردہ کرنے والے کے ہیں۔ مصباح اللغات؛ بخاری، حدیث الافک؛ حدیث: ۴۱۴۱ میں اس پر مزید وضاحت ہے جو آگے آتی ہے؛ فتح الباری، ۷/ ۵۳۹- ومابعد: بحث حافظ موصوف)۔

حضرت سودہؓ ام المومنین اسی غرض سے ایک بار نکلی تھیں اور حضرت عمرؓ نے ان کو پہچان لینے کی بات کہی تھی جو بعد میں حجاب کا ایک قاعدہ بنا گئی کہ ضروریات/ حوائج کے لیے وہ باہر جاسکتی ہیں۔ (بخاری، کتاب الوضوء، خروج النساء الی البراز)

عورتوں کی مانند بلکہ ان سے زیادہ مردوں کا رفع حاجت کے لیے باہر جانا روایاتِ سیرت وحدیث سے ثابت ہے۔ احادیث میں رسولِ اکرم ﷺ کے بول و براز کی غرض سے باہر جانے کے واقعات بہت سے ملتے ہیں اور صحابہ کرام کے نسبتاً کم کیونکہ راویوں کی توجہ سنن نبوی کے جمع و تدوین پر زیادہ رہی تھی اور تعاملِ صحابہ پر کم رہی تھی۔ پھر بھی ان کے تعامل اور سماجی رویوں کا ذکر مل ہی جاتا ہے۔ باہر جانے کا معاملہ بھی بہت وسیع جہات رکھتا ہے۔ ان کے ذکر سے مختلف مواقع بول و براز کا پتہ چلتا ہے۔

بیت الخلاء/ خلاء کے عمومی حوالے

احادیث میں رسولِ اکرم ﷺ کے بالخصوص اور دوسرے اکابر کے بالعموم خلاء میں جانے کے متعدد عمومی حوالے ملتے ہیں۔ ان میں بھی متعدد اور مختلف قسم کی ہدایات اور سنن ملتی ہیں اور ان اسلامی تعلیمات میں سماجی اور تمدنی رویے بھی مضمر ہیں۔ مثلاً ایک عمومی حوالہ یہ آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب خلاء میں تشریف لے جاتے تو دعاء پڑھا کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو اس میں جانے سے قبل دعاء پڑھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ سب سے عام ومشہور دعائے نبوی یہ ہے: ”اللھم انی اعوذ بک من الخبث و الخبائث“

(بخاری، کتاب الوضوء، باب ما یقول عند الخلاء؛ ابوداؤد، کتاب الطھارۃ، باب ما یقول الرجل اذا دخل الخلاء؛ نیز مسلم، نسائی وغیرہ کے یکساں ابواب اور بخاری کے مکررات)

- ایک دلچسپ سماجی ضابطہ یا قدر اس ضمن میں یہ نظر آتی ہے کہ صحابہ کرام میں سے کوئی

بالعموم نوجوان اور حضرت انس بن مالکؓ خادم خاص بیت الخلاء میں پانی رکھ دیتے تھے جب رسولِ اکرم ﷺ وہاں جانے کا ارادہ فرماتے۔

- اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بیت الخلاء/خلاء سے آپ ﷺ کی واپسی پر ان میں سے کوئی آپ ﷺ کے لیے وضو کا پانی رکھ دیتا تھا اور آپ ﷺ اسے دعا دیتے تھے۔ مثلاً ایک بار حضرت ابن عباسؓ نے یہ خدمت انجام دی تو آپ ﷺ نے ان کو فقہ دین کی توفیق ارزانی کرنے کی دعا کی: "اللهم فقهه في الدين"

حضرت انس کا بیان ہے کہ جب رفع حاجت کے لیے جاتے تو میں اور ایک غلام (لڑکا) استنجاء کے لیے ایک برتن میں پانی لے جاتے۔ اس کا ایک مزید حوالہ آگے آتا ہے۔

- رسولِ اکرم ﷺ کا ایک قاعدہ یہ تھا کہ بول و براز کے لیے تشریف لے جاتے تو کافی دور نکل جاتے اور لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے تا کہ بے پردگی نہ ہو اور عام لوگوں کو پریشانی نہ ہو: كان اذا ذهب المذهب أبعد.

(ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب التخلي عند قضاء الحاجة؛ ابن ماجه، باب التباعد للبراز في الفضاء)

کھلے میدان میں بول و براز

فضا/کھلے میدان میں بول و براز فرمانے کے واقعات نبوی ملتے ہیں اور ان سے متعلق ہدایات نبوی بھی۔ میدان/فضا میں تشریف لے جاتے تو دور نکل جاتے جیسا کہ عمومی خلاء کے حوالے میں اوپر ذکر آچکا ہے۔

- حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا بیان ہے کہ ایک غزوہ (غزوۂ تبوک) کے دوران آپ ﷺ بہت دور گئے تھے۔

- بول و براز کے بارے میں ہدایات یہ ہیں: (۱) کھلے میدان میں بیٹھے تو قبلہ سمت کی طرف نہ منہ کرے نہ پیٹھ بلکہ قبلہ سمت کو اپنے دائیں بائیں ہاتھ کی جانب رکھے: "نهى ان نستقبل القبلة ببول ..." حديث ابو داؤد عن جابر .

(ابن ماجہ، كتاب الطهارة، باب النهي من استقبال القبلة بالغائط والبول)

- مردوں کو خاص حکم ہے کہ بول و براز کے وقت اور استنجا کے دوران داہنے ہاتھ سے اپنے اعضاء تناسل نہ پکڑیں۔

(بخاری،...باب لا یمس ذکرہ بیمینہ اذا بال؛ ابوداؤد...،باب کراھیة مس الذکر بالیمین فی الاستبراء وغیرہ)

- لیکن اس حکم کی منسوخی کا ذکر بھی متعدد احادیث اور سنن نبوی کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن جابرؓ کی مذکورہ بالا حدیث ابوداؤد کا اگلا حصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی وفات سے ایک سال قبل آپ ﷺ کو سمت قبلہ کی طرف منہ کر کے رفع حاجت کرتے ہوئے دیکھا: "... فرایتہ قبل أن یقبض بعام یستقبلھا"۔ بخاری اور ابوداؤد وغیرہ کی دوسری روایات واحادیث میں سمت قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے رفع حاجت کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ اسی بنا پر متعدد محدثین نے استقبال واستدبار قبلہ کے بارے میں رخصت کے ابواب قائم کیے ہیں اور شارحین نے اس کی منسوخی کی بحث کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے البتہ یہ وسطی راہ نکالی ہے کہ کھلے میدان میں تو سمت قبلہ کا استقبال واستدبار نہ کرے البتہ گھروں کے اندر بنے ہوئے پاخانوں میں اس کی احتیاط کی اتنی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اجازت ہے۔

(بخاری، کتاب الوضوء، باب التبرز فی البیوت؛ ابوداؤد/ ابن ماجہ، باب الرخصة فی ذلک؛ نیز اگلے حوالے؛ ترمذی، نسائی، مسلم وغیرہ میں بھی استقبال واستدبار کے مکروہ ہونے کے ابواب ہیں اور ان کے منسوخ ہونے کے بھی)

اوٹ میں بول و براز

- ٹیلہ یا جھاڑی

فطری حیاء وشرم اور اسلامی قاعدۂ طہارت دونوں کا تقاضا ہے کہ بول و براز میں کسی اوٹ میں چلا جائے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی ایسے مقام پر رفع حاجت کے لیے جاتے جہاں گذرگاہ ہوتو اوٹ تلاش کرتے تھے، احادیث وروایات میں یہ دو قسم کی نظر آتی ہے: جھاڑی/ جھاڑیوں کے درمیان تشریف رکھتے یا کسی اونچی جگہ کی ڈھلان پر۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کا بیان اور مشاہدہ دونوں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ رفع حاجت کے لیے جاتے تو آپ ﷺ

کی پسندیدہ جگہ "ھدف" (بلند زمین) ہوتی تھی یا کھجور کی جھاڑی: "حائش نخل"۔ حدیث مسلم: ۷۹ (۳۴۲) کی ان دونوں چیزوں کی شرح محشی گرامی نے کی ہے: "الھدف ما ارتفع من الارض وحائش النخل بستان النخل"۔ مصباح اللغات میں ہے: "ھدف: ہر ایک بلند عمارت یا ٹیلہ..."، الحائش: درخت کا گنجان حصہ"۔

- حائط/ احاطہ کے اندر

بعض صحابۂ کرام خصوصاً خدام نبوی کا بیان ہے کہ بسا اوقات رسولِ اکرم ﷺ بول و براز کے لیے کسی حائط یا باغ کے احاطہ کے اندر تشریف لے جاتے تھے۔

- حضرت انسؓ کی اس حدیث مذکورہ بالا میں جس میں یہ ذکر ہے کہ وہ اور ایک اور لڑکا وضو کے پانی کا برتن آپ ﷺ کے لیے جاتے تھے اسی میں یہ بھی ذکر ہے کہ ایک بار آپ ﷺ ایک احاطہ میں داخل ہوئے تھے: "دخل حائطا ومعه غلام معه میضاة ..."

- ڈھال کی اوٹ میں

ستر اور پردہ کرنا اصل قاعدۂ بول و براز ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اس کا بہر حال خیال فرماتے تھے۔ بسا اوقات حاجت شدید ہوتی اور کوئی قدرتی / جغرافیائی اوٹ میسر نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شے سے اوٹ کر لیتے تھے۔ ان میں شے کی قید نہیں تھی، اس کے صرف ستر کرنے یا پردہ بنانے کی صلاحیت کی رعایت ملحوظ رہتی تھی مثلاً ایک بار آپ ﷺ نے اپنی ایک چمڑے کی بنی ہوئی ڈھال، جس میں لکڑی اور پٹھا نہیں تھا، کی اوٹ میں پیشاب کیا تھا۔ اس کا ایک سماجی اور تمدنی پس منظر بھی خاصا اہم ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن حسنہؓ کا بیان ہے کہ میں اور حضرت عمرو بن العاصؓ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس (غالباً اسلام لانے سے قبل) گئے۔ آپ ﷺ اس وقت باہر تشریف لے گئے اور آپ ﷺ کے پاس ایک ڈھال تھی جس سے آپ ﷺ نے پردہ کیا اور پھر پیشاب کیا۔ ہم نے کہا کہ آپ کو ملاحظہ کرو، اس طرح پیشاب کر رہے ہیں جیسے عورت کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے ان کی بات سن کر فرمایا... اس میں بنو اسرائیل کے عذاب قبر کا

ذکر ہے کہ وہ بول میں قطروں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے:"... فخرج و معه درقة ثم استتر بها ثم بال، فقلنا: انظروا اليه يبول كما تبول المرأة ..."

(ابوداؤد،... باب الاستبراء من البول؛ حدیث:۲۲؛ ابن ماجہ،... باب التشديد في البول وغيره)

اندرون خانہ پاخانے

مذکورہ بالا احادیث وروایات میں اندرونی بیت الخلاء کے بنائے جانے کا ذکر ملتا ہے اور ان سے زیادہ اہم یہ ذکر ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے بسا اوقات اندرون بیت یا گھر کے کسی حصہ میں ہی رفع حاجت فرمائی ہے۔ ان دونوں کی روایات وواقعات کو الگ بیان کیا جاتا ہے:

گھر کے اندر بول و براز

- مشہور حدیث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا ایک چوبی پیالہ/لگن تھی جو آپ ﷺ کے تخت کے نیچے رکھی رہتی تھی اور رات میں آپ ﷺ اسی میں پیشاب کرتے تھے، یہ حضرت امیمہ بنت رقیقہؓ کا مشاہدہ بھی ہے"... قالت: كان للنبي ﷺ قدح من عيدان تحت سريره يبول فيه بالليل" (حدیث ابوداؤد:۲۴: باب في الرجل يبول بالليل في الاناء ثم يضعه عنده)

گھر کی چھت پر بول و براز

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مشاہدہ ہے کہ میں ایک بار حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر چڑھا تو دیکھا کہ رسولِ اکرم ﷺ شام کی طرف رخ کر کے قبلہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے قضائے حاجت فرما رہے تھے۔ دوسری روایت میں مزید وضاحت ہے کہ آپ ﷺ نے دو اینٹیں رکھ چھوڑی تھیں جن پر بیٹھ کر قضائے حاجت کرتے تھے:"... ارتقيت فوق ظهر بيت حفصة لبعض حاجتي فرأيت رسول الله ﷺ يقضي حاجته مستدير القبلة مستقبل الشام.

(بخاری،... باب التبرز في البيوت؛ ابوداؤد، باب الرخصة في ذلك؛ مسلم، كتاب الطهارة، باب الاستطابة نیز ابن ماجہ کے ابواب مذکورہ بالا متعلقہ)

گھروں میں یا گھروں کے قریب پختہ پاخانے

بخاری کی حدیث افک: ۴۱۴۱، جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے، اس باب میں گذشتہ سے پیوستہ کا حال بیت الخلاء بیان کرتی ہے۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ میں اس زمانے میں حضرت ام مسطحؓ کے ساتھ ایک رات قضائے حاجت کے مقامات کی طرف روانہ ہوئی جو کھلے میدان میں ہمارے پاخانے تھے اور ہم لوگ صرف رات ہی میں نکلا کرتے تھے۔ اور یہ واقعہ اس زمانے سے پہلے کا ہے جب ہم نے اپنے گھروں کے قریب پاخانے بنا لیے تھے۔ ہمارا معاملہ یہ تھا کہ اول عربوں کی طرح ہم بول و براز کے لیے میدان جایا کرتے تھے کیونکہ اپنے گھروں کے قریب پاخانے بنانے کو اذیت ناک جانتے تھے: "... فخرجت مع ام مسطح قبل المناصع – و کان متبرزنا – و کان لا نخرج الا لیلا الیٰ لیل – و ذلک قبل ان نتخذ الکنف قریبا من بیوتنا – قالت: و أمرنا امر العرب الأول فی البریة قبل الغائط، و کنا نتأذی بالکنف ان نتخذها عند بیوتنا..." ۔ اس حدیث میں آگے یہ بیان ہے کہ حضرت ام مسطحؓ اور میں جب دونوں اپنے کام سے فارغ ہوئے تو گھروں کو واپس ہوئے.... اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ خواتین بالعموم ایک دو کے ساتھ قضائے حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ بہرحال اس حدیث میں عام عرب کے گھروں کے قریب بیت الخلاء بنانے کو ناپسند کرنے کے ذکر کے علاوہ یہ واضح بیان ہے کہ ہم نے اپنے گھروں کے قریب بیت الخلاء۔ کچے یا پکے عمارتوں والے۔ بنا لیے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی ہے۔ انھوں نے صرف واقعہ افک کے مختلف پہلوؤں سے ہی سروکار رکھا ہے۔ بہرحال اس حدیث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ غزوۂ مریسیع ۵/ ۶۲۷ کے بعد کسی وقت عہدِ نبوی میں یا اس کے متصل مستقل پاخانوں کا وجود ہو گیا تھا اور وہ گھروں کے باہر ہی احاطہ میں بالعموم بنائے جاتے تھے۔

(فتح الباری، ۷/ ۵۳۸-۵۴۷؛ مسلم حدیث: ۱۲۲- (۳۷۵) کی حدیث ہشیمؒ میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب "کنیف" پاخانے کی عمارت میں داخل ہوتے تھے، وہ بھی عہدِ نبوی میں کنیف/ کنف پاخانوں کے بنائے جانے کی تائید کرتی ہے)

بول و براز کی عام ہدایات نبوی

عام قاعدہ بیٹھ کر کرنا: احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ بنفس نفیس بیٹھ کر بول و براز کرتے تھے۔ براز میں تو بیٹھنا لازمی ہے لیکن پیشاب کرتے وقت بھی اسی کو ترجیح دیتے تھے اور دوسروں کو بھی یہی ہدایت دی تھی۔ چنانچہ محدثین کرام نے اسی قاعدہ کے مطابق پیشاب کرنے کے ابواب کے عناوین مقرر کیے ہیں۔

(ابن ماجہ: باب البول قائما کی بعض احادیث میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی ممانعت کرنے کی مخالفت ہے اور اس پر حضرات صحابہ کا تعامل بھی ہے۔ ابوداؤد کی حدیث حضرت عبدالرحمٰن بن حسنہ؛ نیز دیگر کتب حدیث: ابواب البول قاعدا)

۔کبھی کھڑے کھڑے پیشاب کرنا: دوسرا قاعدہ یہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے بھی پیشاب کیا ہے۔ جیسے ایک قوم کے گھورے پر گئے تو کھڑے کھڑے پیشاب کیا۔ بعض دوسرے واقعات بھی اسی قسم و قاعدے کے ملتے ہیں۔ لیکن ان ابواب و احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت اس کی اجازت ضرور ہے مگر بیٹھنے کا قاعدہ مسنون ہے۔

(ابوداؤد، باب البول قائما: حدیث: ۲۳؛ ابن ماجہ: یکساں باب وحدیث)

پانی سے استنجا: پسندیدہ ترین ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ پانی سے استنجا فرماتے تھے۔

(بخاری،... باب الاستنجاء بالماء؛ ابوداؤد وغیرہ کے یکساں ابواب طہارت)

مٹی کے ڈھیلے سے استنجاء: بول و براز دونوں کے لیے مٹی یا پتھر وغیرہ کے ڈھیلے بھی استنجا کے لیے استعمال فرمائے۔ احادیث میں بالعموم تین ڈھیلوں کا ذکر ملتا ہے۔ بعض فقہاء نے اس کی تعداد کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ طہارت کو شرط جانا ہے۔ ڈھیلوں کے بعد پانی سے مزید طہارت حاصل کرنے کو پسندیدہ بتایا گیا ہے اور قرآنی آیت میں ایسے پاکبازوں کی تحسین آئی ہے۔

(بخاری، کتاب الوضوء، باب الاستنجاء بالحجارۃ؛ ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ کے ابواب متعلقہ)

بیٹھتے وقت کپڑے تاخیر سے اٹھانا: سنت بھی ہے اور ہدایت بھی کہ بول و براز کے لیے بیٹھنے لگے تو زمین کے قریب تر پہونچ کر ہی ستر کھولے۔ یہ حیاء و شرم کا بھی معاملہ ہے اور دوسروں

کی نظر کو روکنے کا سماجی طریقہ بھی ہے۔

(ابوداؤد، باب کیف التکشف عند الحاجۃ ،حدیث:۱۴؛"کان اذا اراد حاجۃ لایرفع ثوبہ حتی یدنو من الارض")

پیشاب کے لیے نرم زمین تلاش کرنا: رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ایک دن میں ساتھ تھا۔ آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کا ارادہ فرمایا تو ایک دیوار کی جڑ میں نرم زمین استعمال کی اور اسی کی ہدایت سب کو بعد میں کی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ پیشاب کی چھینٹیں سخت زمین سے اڑ کر کپڑوں اور جسم کو ناپاک و نجس کرسکتی ہیں بلکہ حقیقتاً کر دیتی ہیں جب کہ نرم زمین سے چھینٹیں اڑنے کا امکان کم ہوجاتا ہے۔

(ابوداؤد،...باب الرجل یتبوأ لبولہ: "... اذا اراد احدکم ان یبول فلیرتد لبولہ موضعا...")

بول و براز کے وقت سلام نہ کرے: ایسے وقت میں رسولِ اکرم ﷺ سلام کا جواب نہیں دیتے تھے اور ہدایت فرماتے تھے کہ نہ کوئی کسی پیشاب کرنے والے کو سلام کرے اور نہ پیشاب کرنے والا اسلام کا جواب دے کہ وہ وقت نجاست ہے اور نہ ہی کسی قسم کا کلام و گفتگو کرے۔

(ابوداؤد، حدیث:۱۴-باب کراھیۃ الکلام عند الحاجۃ؛ باب أیرد السلام وھو یبول...احادیث: ۱۴-۱۸)

- بول و براز کی حاجت شدید ہو تو پہلے اس کو دور کرے اور پھر نماز پڑھے۔ ایسے شخص (حاقن) کو نماز پڑھنے کی اجازت تو ہے مگر اس میں شدید کراہت ہے۔

(ابوداؤد،...باب : ایصلی الرجل وھو حاقن)

پاخانے سے نکلنے پر دعا: رسولِ اکرم ﷺ بیت الخلاء سے واپس نکلتے تو دعا پڑھتے تھے: "الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذیٰ و عافانی" یا صرف غفرانک یا اسی طرح کی اور کوئی دعا پڑھنا مسنون ہے۔ (ابن ماجہ،...باب ما یقول اذا خرج من الخلاء)

عارضی بیت الخلاء

خاص تقریبات کے موقعہ پر اور بالخصوص حج و عمرہ کے دوران بعض مقامات پر عارضی

بیت الخلاء کا رواج ہے۔ یہ کوئی نیا رواج نہیں ہے۔ عہدِ نبوی سے چلا آ رہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اس سے پہلے عہدِ جاہلی میں بھی اس کا رواج رہا ہو۔ دوسرے مقاماتِ حج کے علاوہ خاص منٰی میں اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہاں تین یا چار دنوں تک قیام رہتا ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کے لیے منٰی میں عارضی بیت الخلاء بنائے گئے تھے جو لکڑی اور ٹٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھانچے سے تھے۔ ان کے لیے اجازت نبوی مانگی تھی جو عطا کی گئی اور ان کو روایات میں کنیف ہی کہا ہے: "... عن عائشة: ... ألا نبني لك كنيفاً؟ ..." (واقدی، ۱۱۰۱)

روایات بیت الخلاء کا مختصر تجزیہ

بیت الخلاء سے متعلق جو روایات یا واقعات دستیاب ہیں ان کا تعلق مدنی دورِ نبوی سے ہے۔ شاید ہی کوئی روایت مکی دور سے متعلق ملتی ہو، مآخذ میں ان کا توڑا ہی نہیں فقدان سا نظر آتا ہے جو خاصا خلاء ہے۔ تاریخی طور سے اور سماجی اور تمدنی لحاظ سے بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ تبصرہ کہ ہم بدوی قوم گھروں کے قریب یا اندر بیت الخلاء ناپسند کرتے تھے اور قضائے حاجت کے لیے باہر جایا کرتے تھے مکی دور پر بھی صادق آتا ہے کہ بدویت وہاں بھی تھی۔ تاہم قریش مکہ اور دوسرے عرب قبائل بالخصوص تجارت پیشہ قبائل اندرون خانہ یا قریب بیت الخلاء کے وجود سے واقف تھے۔ جس طرح ایک مدنی کبیر قوم حضرت ابوایوب انصاریؓ اور ان کے مانند دوسرے اکابر شام میں اندرونی بیت الخلاء کے وجود وافادیت سے واقف تھے، قریشی اکابر کو بھی اپنے مختلف اسفار کے دوران کا خوب تجربہ ہوا تھا۔

(بخاری، کتاب الصلوۃ، باب قبلة اهل المدينة واهل الشام: استقبال واستدبار قبلہ کی حدیث میں اضافہ: "قال ابوايوب: فقدمنا الشام فوجدنا مراحيض بنيت قبل القبلة فننحرف ونستغفر الله تعالى"۔ نیز دیگر کتب حدیث وسیرت)

تمدنی ارتقاء یا سماجی لین دین کا مسئلہ یہ ہے کہ ان مکی اور عرب قبائل یا ان کے اکابر نے اس ضروری سماجی اور تمدنی تعمیر کو اپنے گھروں کے اندر یا قرب میں عجمیوں سے سیکھ کر اپنے

مکانات اور احاطوں کا حصہ بنایا تھا یا نہیں اور بنایا تھا تو کب۔ مدنی دور میں ایسا لگتا ہے کہ واقعۂ افک کے بعد گھروں کے قریب بیت الخلاء بنائے جانے لگے تھے کہ ان کی شدید حاجت تھی۔ خواتین کے لیے خاص کر کیونکہ رات سے رات تک حاجات شدیدہ کا روکنا مشکل تھا اور اس کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالی گئی تھی۔ پیشاب کرنے کی حد تک تو ثبوت ملتا ہے کہ گھر کے اندر یا قرب میں کر لیا جاتا تھا، پاخانے کا مسئلہ البتہ رہ جاتا ہے۔ بہر حال اسی تمدنی تبادلہ نے عہدِ نبوی میں اس کا مسئلہ بھی حل کیا تھا۔ رہی بدویت اور اس کے نتیجے میں میدان میں یا باہر جانے کی روایت تو وہ آج بھی اندرونی کنیف/کنف ہونے کے باوجود بعض کھلے مزاج والوں کو زیادہ عزیز ہے اور دیہاتوں یا شہروں کے جھونپڑوں والوں کی بول و براز کی جنگل جانے کی روایت آج بھی خاصی مستحکم ہے بالخصوص پسماندہ ممالک میں اور ترقی یافتہ ممالک میں وہ مخصوص کھلے مقامات پر بھی نظر آتی ہے۔

✪✪✪

عہدِ نبوی میں گھریلو اسباب

ہر نظام تمدن میں رہن سہن کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور اس کا گھریلو اسباب اور خانگی ساز و سامان ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی دقیانوسی، ابتدائی اور غیر متمدن سا ہو۔ امامِ فلسفۂ تاریخ و معاشرت ابن خلدون بالخصوص اور دوسرے ساجیات کے ماہرین نے اولین انسانی معاشرہ کے قبائلی نظامِ تمدن سے لے کر اپنے عہد کے متمدن و مہذب ترین معاشرہ کے رہن سہن سے بحث کی ہے اور ان کے اسباب و ذرائعِ معیشت کو اجاگر کیا ہے۔ اس اصولی بحث میں نظامِ تمدن کی جزئیات اور گھریلو اسباب کی گنجائش نہ تھی۔ اس میں فلسفۂ حیات اور کاروبارِ حیات سے بحث مباحثہ آتا ہے جو تاریخ و سیرت کا موضوع ہے۔

اسلامی تاریخ اور نبوی سیرت کے مآخذ و مصادر میں خانگی اسباب اور گھریلو ساز و سامان کی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں۔ وہ افراد و طبقات کے رہن سہن، معاشرتی کارگذاری، تاریخی واقعات و احوال اور فطری ارتقائے تمدن کے ضمن میں آتی چلی جاتی ہیں۔ انسان جس طرح اپنے کھانے پینے اور تن ڈھانکنے کے لیے لباس و ملبوسات کا انتظام کرتا ہے اور جس طرح وہ اپنے جسم و جان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسے سجانے سنوارنے کی چیزیں فراہم کرتا ہے، اسی طرح رہنے بسنے اور زیست کرنے کے لیے مختلف قسم کا ساز و سامان جمع کرتا ہے تا کہ اس کی گذر بسر آسان، آرام دہ اور بہتر سے بہتر ہو۔

جاہلی عرب کا انسانی معاشرہ بدوی، قبائلی بھی تھا اور شہری اور متمدن بھی۔ ان دونوں میں تمدنی ارتقاء بھی جاری تھا۔ اسلامی انقلابِ آخریں نے مدنیت اور تمدن کے ارتقا کی رفتار تیز کر دی اور عہدِ نبوی کے اواخر تک وہ خاصا متمدن بن چکا تھا۔ قبائلی نظامِ تمدن سے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ اولین انسانی قبائلی معاشرہ کی مانند شہری ضروریات اور مدنیت کے تقاضوں سے یکسر عاری تھا۔

جاہلی دور میں بھی عرب افراد و طبقات کچھ تو اپنی تہذیب کے سبب اور کچھ قرب و جوار کے متمدن ایرانیوں، عراقیوں اور شامیوں سے اختلاط کے سبب مدنیت کی شاہراہ پر تیزی سے چل پڑے تھے۔ اسلام نے سادگی کے ساتھ تمدن کی پرکاری بھی پیدا کی۔

گھریلو اسباب کی فہرست انسانی آرزوؤں کی طرح بیکراں، بے حد و حساب اور بے پناہ ہے۔ وہ جن گھروں، آشیانوں اور مسکنوں میں رہتا ہے ان کی مختلف قسمیں اور نوعتیں ہیں جن میں کچھ عارضی ہیں اور کچھ مستقل، ان گھروں اور آشیانوں میں وہ اپنے اٹھنے بیٹھنے، لیٹنے، سونے اور کام کاج کرنے کے لیے بہت سا سامان جمع کرتا ہے۔ ان میں تخت و چارپائی، چٹائی اور فرش و فروش اور کرسی وغیرہ گوناگوں چیزیں شامل ہوتی ہیں اور اکثر دیسی ہوتی ہیں۔ بستر اور فرش و فروش میں موسمی تقاضے کام کرتے ہیں اور سونے بچھانے کی چادریں گرمی کے لیے ہیں تو سردی کے لیے لحاف و توشک ہوتے ہیں۔

کھانے پکانے، پینے پلانے اور چیزیں رکھنے رکھانے کے لیے مختلف برتنوں اور ظروف کی ضرورت پڑتی ہے۔ تمام سادگی اور دقیانوسیت کے باوجود ان کا تنوع اور گوناگونی حیران کن ہے کہ اتنی اقسام کہاں سے اور کیونکر آئیں۔ ان برتنوں میں پکانے کے برتن الگ ہیں، کھانے کے الگ، کھانا رکھنے کے الگ، اسی طرح مشروبات کے لیے ظروف کی وسعت ہے۔ گھروں میں اناج وغلہ، سبزی و گوشت اور دوسری چیزوں کے رکھنے کے ماٹ الگ ہوتے تھے۔ پینے کے پانی کے برتن تو ہوتے ہی تھے، ان کے رکھنے کے لیے چوکیوں اور چوکھٹوں کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ پھر گوشت، سبزی اور دوسری چیزوں کے کاٹنے کے لیے چھریاں اور چاقو ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ متعدد دوسری چیزیں اور قسم قسم کے سامان دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہوتے تھے جن کا ایک الگ خانہ ہوتا تھا۔

آمد و رفت کے لیے اور سواری کے لیے مختلف مویشی اور جانوروں سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ ان کی خاصی اقسام تھیں۔ پھر ان سواری کے جانوروں اور دوسرے مویشیوں کے لیے رہنے کے گھر ہوتے تھے اور ان کی کھانے پینے کی ضروریات کی بہت سی چیزیں ہوتی تھیں۔ ان پر سواری کرنے کے لیے، انسان کو آرام سے بیٹھنے کے لیے متعدد چیزوں کی ضرورت پڑتی تھی اور

رفتار پر قابو کرنے کے لیے کچھ اور چیزیں تھیں۔ ایسی ہی نہ جانے اور کتنی چیزیں رہن سہن کے لیے ضروری تھیں اور ان کو عہدِ نبوی میں مہیا کیا گیا تھا۔ گھریلو اسباب میں ان کا بھی ذکر آئے گا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی عبادتِ خاص - پنجگانہ نماز - کے لیے مساجد تھیں اور ان کے ضروری ساز و سامان بھی تھے۔ فرش و فروش کے علاوہ ان کی پاکیزگی و طہارت، نظافت و صفائی اور روشنی و تزئین کی بھی کئی چیزیں تھیں جو رفتہ رفتہ عہدِ نبوی کے نظامِ تمدن میں آتی گئیں اور پورے نبوی اسلامی عرب معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتی گئیں۔ عرب جاہلی معاشرہ قبائلی نظام سے اوپر اٹھتا گیا اور اسلامی تمدن میں ڈھلتا گیا۔

مساجد اور ان کا ساز و سامان

خانہ کعبہ اور مسجدِ حرام

جاہلی دور میں مکہ مکرمہ کی مسجدِ حرام اور خانہ کعبہ کی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی، نظافت و طہارت قریشی "مـــلأ" (مجلس) کے پاس تھی۔ اس قومی امانت اور دینی اثاثے کی حفاظت و نگہداشت کے لیے خاص منصب دارانِ حجابہ (تولیت) اور متولیانِ کعبہ تھے۔ اس کی مرمت اور تعمیر کی ذمہ داری پوری قوم کی سمجھی جاتی تھی۔ عہد و حیاتِ نبوی میں قریشِ مکہ نے خانہ کعبہ کی دوبار تعمیرِ نو کی کیونکہ سیلاب کے پانی سے اس کی عمارت کو نقصان پہونچا تھا: ایک بار ۵۹۲ء کے لگ بھگ جب عمرِ شریف دس بارہ سال تھی اور دوسری بار ۶۰۵ء میں جب عمرِ مبارک کا پینتیسواں سال تھا۔ قریشی اکابر کو طہارتِ کعبہ کا اتنا خیال تھا کہ اس کی تعمیر میں صرف مالِ حق لگایا تھا اور مالِ ناجائز سے قطعی پرہیز کیا تھا۔ حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام ان کے اجداد اولین تھے اور ان کے دین نے ان کو یہ تطہیر بیت کا سبق پڑھایا تھا اور ان دونوں اکابر کو قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ وہ رکوع و سجود اور طواف و زیارت کرنے والوں کے لیے خانہ کعبہ اور اس کی ملحقہ مسجدِ حرام کو پاک و صاف رکھیں۔ (بقرہ-۱۲۵)

اگرچہ روزانہ صفائی ستھرائی کی روایات نہیں ملتیں مگر یہ واضح ہے کہ ان کی روزانہ تطہیر و نظافت کا کام کیا جاتا تھا۔ مسجدِ حرام کے اردگرد قریشی اکابر کی مجالس (نادی/اندیہ) جمائی جاتی

تھیں، ان کے حوالے سے صفائی و پاکی اور فرش وفروش کا ذکر ملتا ہے۔ بالعموم قریشی اکابر ہوں یا دوسرے زائرین، مسجدِ حرام اور خانہ کعبہ میں بحالتِ پاکی ہی جاتے تھے اور وہاں ناپاکی کی حالت میں جانا گناہ سمجھتے تھے۔ قریش اور اکابرِ مکہ کا نظریۂ حمس اسی تصورِ نظافت اور خیالِ تطہیر پر مبنی تھا اور اس میں وہ غلو کی حدیں پار کر گئے تھے کہ بیرونی زائرین کے پاک کپڑوں کو بھی ناپاک ٹھہراتے تھے اور اپنے خاص حرم کے باسیوں کے کپڑے پہننے پر اصرار کرتے تھے۔ یہ نظافت کی باغیانہ حد تھی۔

خانہ کعبہ کے فرش کو غسل دینے کی روایت زمانۂ قدیم سے قائم تھی اور دورانِ حج وہ اس کا بہت خاص اہتمام کرتے تھے۔ اس صفائی اور ستھرائی کو اکابرِ قریش ایک اہم عبادت تصور کرتے تھے اور تمام شیوخ و سادات اس میں حصہ لینا سعادت سمجھتے تھے۔ خانہ کعبہ کی دیواروں پر غلاف چڑھانے کا تصور و عمل اسی نظافت و تطہیر کعبہ کے نظریہ سے پیدا ہوا تھا۔ وہ ہر سال حج کے دوران اور کبھی کبھی دورانِ سال خانہ کعبہ کو نیا غلاف پہناتے تھے۔ وہ عمدہ کپڑوں کا بنایا جاتا تھا۔ شروع میں یمنی چادروں کا غلافِ کعبہ بنتا تھا پھر باریک اور عمدہ مصری کپڑے -قباطی- کا غلاف بنایا جانے لگا۔ عہدِ نبوی کے بعد بہترین ریشمی کپڑے -دیباج- کے غلاف چڑھائے جانے لگے۔

مساجدِ مدینہ منورہ

اشرافِ مکہ کے ساتھ رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام خانہ کعبہ اور مسجدِ حرام کے معاملات میں برابر کے شریک رہے۔ دورِ جاہلیت میں تو کسی قسم کا اختلاف ہی نہ تھا۔ اسلامی نبوی دور میں دین و شریعت کے بعض اصولی اور عملی اختلافات کے باوجود قریشِ مکہ اور دوسرے تمام عرب بھی مسلمانوں کو خانہ کعبہ اور مسجد حرام کے معاملات میں شریک رکھتے تھے کہ وہ ان کے جدامجد حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی مشترکہ میراث تھی اور اس پر تمام پیروانِ براہیمی کا برابر کا حق تھا۔ ملتِ محمدی بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ملتِ ابراہیمی کی تجدیدی شکل وصورت تھی اور دین اسلام دین ابراہیمی کی خالص صورت ہونے کا دعویدار بھی تھا۔ ایک طرح سے عرب سائیکی میں یہ چیز سرایت کر گئی تھی کہ خانہ کعبہ اور مسجدِ حرام تمام انسانوں کے لیے بالعموم اور عرب

قوم کے لیے بالخصوص ماویٰ وملجا اور مسجد ومعبد ہے اس لیے تمام سماجی، تمدنی اور بسا اوقات دینی اختلافات کے باوجود وہ سب کو نہ صرف اس کی زیارت کی اجازت دیتے تھے بلکہ اس کی خدمت کی بھی اجازت دیتے اور اس کے کاموں میں ان کو شریک کرتے تھے۔

مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ میں مساجد کی تعمیر و تطہیر کی زمامِ کار آئی۔ انصارِ مدینہ ہجرت کے پہلے سے ہی اپنی مسجدوں کی تعمیر و نگہداشت کرتے چلے آرہے تھے۔ جس طرح جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کے مسلمان اپنے اپنے علاقوں کی مساجد کی تعمیر و تطہیر کا فرض نبھاتے رہے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ آمد کے فوراً بعد مسجدِ قباء کی اس جگہ تعمیر فرمائی جہاں ساکنان علاقہ نمازیں پڑھتے رہے تھے اور خاص مسجد نبوی مدینہ منورہ میں بھی اسی مقام پر تعمیر کی گئی جہاں اس محلہ کے انصار کی سجدہ گاہ تھی۔ ان دونوں مساجد کی تعمیر و نگہداشت کے علاوہ مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کی ان کے اپنے اپنے محلوں میں مسجدیں تھیں اور ان کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔

مسجدِ نبوی کے بارے میں بالخصوص تعمیر کے ضمن میں بعض طہارت و نظافت کے کاموں کا ذکر آچکا ہے۔ ان میں ایک فرش کو پختہ کرنے کی روایت تھی جو صحابہ کرام کے اپنے اپنے مصلیٰ میں کنکریاں بچھانے کے شخصی عمل سے شروع ہوئی اور پھر پختہ فرش کی تعمیر نبوی پر تمام ہوئی۔

نظافت و طہارت کا دوسرا کام یہ تھا کہ فرش اور دیواروں کو تھوک وغیرہ سے بچانے کی ہدایات دی گئی تھیں۔ یہ زبانی تطہیر کس طرح عملی تطہیر مسجد میں تبدیل ہوئی اس کی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ کسی نے غلطی سے تھوک دیا تو اس کو دور کر کے اس کی جگہ خوشبو لگادی گئی یا اسے مٹی میں دفن کر دیا گیا کسی نے انجانے میں مسجد میں پیشاب کر دیا تو اس پر ایک بالٹی پانی بہا کر زمین کو طاہر بنالیا گیا۔ جوتوں کی گندگی سے فرش مسجد بچانے کے لیے پہلے جوتوں کو خوب زمین سے رگڑ لینے کی ہدایات جاری کی گئیں تا کہ ان کی گندگی جھڑ جائے اور بعد میں پاک مقامات کے احترام کے تقاضے کے تحت جوتوں کو مسجد میں داخل ہونے کے بعد اتار لینے کا حکم دیا گیا اور اس پر عمل کیا گیا۔

یہ مسجدیں اور دوسری مساجد عرب بالعموم کچی تعمیرات تھیں۔ ان کی دیواریں تو پتھروں یا اینٹوں (کچی اینٹوں) سے اٹھائی گئی تھیں اور چھتوں کے لیے کھجور کے تنے بطور شہتیر اور پتیاں

وغیرہ بطور سایہ استعمال کی گئی تھیں۔ چھت کی روک کے لیے تنوں کو بطور ستون استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے لیے مسجد نبوی کے اسطوانہ کا ذکر بطور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ چھت پر مٹی کا لیپ کر دیا گیا تھا۔ بارش ہوتی تو چھت ٹپکنے لگتی اور فرشِ مسجد کیچڑ بن جاتا۔ صحابہ کرام نے اس کا تدارک یوں کیا کہ فرش پر اپنی اپنی جگہ کنکریاں اور پتھروں کی چپٹیاں بچھانی شروع کر دیں اور چھت کی لپائی میں مضبوطی کا عنصر داخل کر دیا کہ پانی نیچے نہ آ سکے۔

مساجد بالخصوص مسجدِ نبوی میں جو نمازی آتے تھے ان میں سے بعض خاصے بدوی اور نظافت و طہارت سے لاپرواہ ہوتے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی سماجی تطہیر و نظافت کا کام ان کی دینی تطہیر کی مانند شروع کیا اور مسجد سے متعلق مختلف احکام نافذ کیے۔ مسجد کی دیواروں اور فرش پر تھوکا نہ جائے، ضرورت پڑے تو کپڑوں کے کنارے میں اس کو لے لیا جائے، فرش پر گرے تو مٹی کے نیچے دبا دیا جائے۔ دیواروں پر یا ستونوں پر لگ جائے تو اسے مٹا دیا جائے۔ دوسری گندگی کی چیزوں کو دور کیا جائے، تطہیرِ فضا کے لیے خوشبو کا استعمال کیا جائے، مسجد میں لوبان وغیرہ کی دھونی دی جائے۔ نمازی نہا دھو کر، صاف ستھرے کپڑے پہن کر آئیں، بدبودار چیزیں جیسے کچی لہسن وغیرہ کھا کر نہ آئیں، نمازوں سے قبل طہارتِ دین کے لیے مسواک اور داتون ضرور کریں۔ خوشبو لگا کر آئیں تاکہ سب کو راحت ہو۔ ان احکام اور ان جیسے دوسرے احکامِ نظافت پر عمل ہوا اور مسجدیں طہارت و نظافت کی آماجگاہیں اور خوشبوؤں کی پناہ گاہیں بن گئیں۔

مسجدوں میں چراغ

مساجد دن کی روشنی میں سورج کی کرنوں سے منور رہتی تھیں مگر رات کی تاریکی میں اندھیرے میں ڈوب جاتی تھیں۔ ان کی روشنی کے لیے صحابی جلیل حضرت تمیم داریؓ نے بعض روایات و احادیث کے مطابق سب سے پہلے مسجدوں میں چراغ جلانے کی سبیل کی، ان کا تعلق شامی حدود کے عرب علاقے سے تھا اور وہ بکثرت تجارت وغیرہ کے لیے شامی شہروں اور علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ وہاں انھوں نے عیسائی اور یہودی معبدوں اور عبادت گاہوں میں قندیلیں جلتے دیکھی تھیں۔ لہٰذا وہ مسجد نبوی کے لیے بھی ایک شامی قندیل لے آئے۔ مسجد نبوی روشن ہوئی

تو دوسری مساجد بھی روشنی میں نہا گئیں کہ وہ مسجد نبوی سے ہی کسبِ نور اور اکتسابِ فیض و طہارت کیا کرتی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ اور مسجدوں کو منور کرنے والوں کے حق میں دعائے خیر نے دوسروں کو بھی اپنی مسجدیں منور کرنے کی تحریک عطا کی۔ مساجد میں قنادیل جگمگانے لگیں اور رسولِ اکرم ﷺ کی خاص مسجد نبوی تو بقعۂ نور بن گئی۔ اس سے متعلق بعض روایات ذیل میں درج ہیں۔

- حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ مساجد میں سب سے پہلے چراغ جلانے والے حضرت تمیم داریؓ تھے: "اول من اسرج فی المساجد تمیم الداری" (ابن ماجہ، کتاب المساجد والجماعات، باب تطهير المساجد وتطييبها) ۔اگر چہ اس روایت کو موقوف کہا گیا ہے اور اس کی سند کے ایک راوی خالد بن ایاس کے ضعیف ہونے پر ناقدینِ حدیث کے اجماع کا بھی ذکر کیا گیا ہے مگر وہ واقعہ صحیح ہے اور دوسری روایات و احادیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس روایت کا ایک اہم درایتی اور متنی حصہ یہ ہے کہ اس میں صرف مسجد نبوی میں چراغ جلانے کی بات نہیں کہی گئی ہے بلکہ مساجد کا جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

مسجد کے لیے تیل بھیجنے کی روایت

مسجدوں کے چراغ جلانے کے لیے تیل بھیجنے کی روایتِ عام اور مسلم سماجی رویہ بھی رسولِ اکرم ﷺ کی ایک حدیث سے ابھرا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی ایک مولاۃ (رشتۂ ولاء سے وابستہ خاتون) حضرت میمونہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے بیت المقدس کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہاں جاؤ تو اس میں نماز پڑھو اور اگر نہ جا سکو کہ وہ شہرِ غیر و بلادِ جنگ ہے تو اس کی قندیلوں کو روشن کرنے کے لیے تیل بھیجا کرو: "... یارسول اللہ! افتنافی بیت المقدس. فقال: ائتوه فصلوا فيه، وكانت البلاد اذ ذاک حربا، فان لم تاتوه وتصلوا فيه فابعثوا بزيت يسرج في قناديله".

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی السرج فی المساجد، حدیث: ۴۵۷؛ ابن ماجہ، کتاب اقامة الصلاة الخ، باب فی الصلاة فی مسجد بیت المقدس)

گھروں کے چراغ

ایک آدھ روایت کی بنا پر بعض محققین تک نے فیصلہ فرما دیا کہ عہدِ نبوی میں چراغ نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کا تصور بھی نہ تھا کہ عربی زبان میں چراغ کے لیے کوئی خاص لفظ نہیں، سراج ہے بھی تو فارسی چراغ کا معرب ہے۔ لفظ مستعار ہے تو تصور وعمل ضرور مفقود تھا۔ متعدد روایاتِ سیرت وتاریخ اور احادیثِ نبوی وآثارِ صحابہ ثابت کرتے ہیں کہ عربوں میں۔ جاہلی عربوں میں۔ راتوں کو روشن کرنے کے کئی طریقے رائج تھے۔ ان میں مشعلیں بھی تھیں اور چراغ بھی تھے۔ اسلامی نبوی عہد میں ان کا استعمال حرمینِ شریفین میں تو عام رائج تھا اور دوسرے بلادِ عرب بھی اتھاہ تاریکی میں ڈوبے نہیں رہتے تھے۔ ان کے ہاں بھی راتوں کو روشن کرنے اور گھروں کو منور کرنے کے آلات وطریقے موجود تھے۔

بلا شبہ بعض احادیثِ حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرہ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اس زمانے میں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے: "... والبیوت یومئذ لیس فیها مصابیح"

(موطا، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی صلاة اللیل؛ بخاری، باب الصلوٰة علی الفراش؛ ابواب سترة المصلی، باب التطوع خلف المرأة وغیرہ دیگر ابواب وکتب؛ فتح الباری، ۱/۶۳۷ ومابعد؛ مسلم، کتاب الصلوٰة، باب الاعتراض بین یدی المصلی وغیرہ؛ نسائی، کتاب الطھارة، ترک الوضوء من مس الرجل امراته الخ وغیرہ)

مگر ایسی روایات واحادیث کی تفسیر وتوجیہ دوسری احادیث اور مسلم حقائق کی روشنی میں کرنی ضروری ہے جن میں گھر کے چراغوں کا ذکر حتمی طور سے ملتا ہے۔ حدیثِ عائشہؓ کے الفاظ خود بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں نہ تھے یعنی اولین زمانے نہ رہے ہوں گے اور اس سے زیادہ قابلِ نظر وفکر توجیہ یہ ہے کہ راتوں میں گھروں کے اندر چراغوں کو جلتا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ اس کی وجہ حفاظت وتحفظ کا تصور وعمل تھا اور دوسرے رسولِ اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس ہدایت فرمائی تھی کہ راتوں میں گھروں کے اندر چراغوں کو جلتا نہ چھوڑا کرو مبادا چوہے چوہیا اس کی بتی کھینچ لے جائیں اور پورے گھر کو آگ لگا دیں: "... واطفئوا المصباح عند الرقاد، فان الفویسقة ربما اجترت الفتیلة فاحرقت اهل البیت" بخاری، کتاب بدء الخلق، باب خمس

من الدواب فواسق؛ کتاب الاستیذان، باب لا تترک النار فی البیت عند النوم وغیرہ؛ فتح الباری، ۱/۶۰ ۷ وغیرہ؛ ترمذی، ابواب اللباس، باب ...واطفاء السراج والنار عند المنام؛ ابواب الاستیذان والآداب، باب فی تخمیر الآنیة؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی اطفاء النار باللیل، حدیث: ۵۲۴۷؛ موطا، کتاب الجامع، باب ما جاء فی الطعام والشـــراب ؛تنویر، ۳/۱۱۲۔ حافظ ابن حجرؒ نے ایک بلیغ فقرہ میں یہ بتایا ہے کہ اس جملۂ حضرت صدیقہؓ میں اشارہ ان (چراغوں) سے اشتغال نہ ہونے کی طرف ہے: "وفی قولها ... اشارة الی عدم الاشتغال بها" (۱/۶۰ ۷)

امام ابوداؤد کی روایت میں اس حکم کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک چوہیا ایک فتیلہ کھینچتی ہوئی لائی اور رسولِ اکرم ﷺ کی چٹائی پر ڈال دیا جس پر آپ ﷺ تشریف فرما تھے اور اس کی جگہ سے ایک درہم کے برابر وہ چٹائی جل گئی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے حکم دیا کہ سوتے وقت اپنے چراغوں کو بجھا دیا کرو: "... فاذا نمتم فاطفئوا سرجکم..."۔ یہ تمام احادیث و روایات وہدایات خود بھی گھروں میں چراغ روشن کرنے کی حقیقت ثابت کرتی ہیں۔

آیاتِ چراغ

صرف اثباتِ تصور وعمل کی خاطر چند قرآنی آیاتِ کریمہ کا صرف حوالہ دیا جاتا ہے جن میں سراج اور مصباح دونوں کا صریح ذکر ہے: فرقان-۶۱، نوح-۱۶ اور النباء-۱۳ میں آسمان کے ستاروں کو سراج، اور سراج وہاج قرار دیا گیا ہے مگر سورۂ احزاب ۴۶: "وداعیا الی الله باذنه وسراجا منیرا" (اللہ کی طرف اس کے حکم سے، اور چراغ چمکتا) کہہ کر رسولِ اکرم ﷺ کو روشن وروشنی پھیلانے والا چراغ بتایا گیا ہے۔ ان الفاظ وتعبیرات کا استعمال ہی بے معنی ٹھہرتا اگر مخاطبین عرب چراغ سے واقف نہ ہوتے۔ اسی طرح آسمان کے ستاروں کے لیے مصابیح (جمعِ مصباح) سورۂ فصلت-۱۲ اور سورہ الملک-۵ میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور الٰہی نور کی تمثیل کے لیے سورۂ نور کی آیت کریمہ-۳۵ میں مصباح کو دوبار استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بھی عربوں کے علم اور وجودِ چراغ کو بتاتا ہے۔ مزید بحث کے لیے ان آیات کریمہ کی تفاسیر معتبر کتب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

واقعاتِ چراغ

متعدد روایاتِ سیرت اور احادیثِ نبوت ثابت کرتی ہیں کہ گھروں میں چراغ ہوتے تھے اور ان کو بوقتِ ضرورت جلایا جاتا تھا:

- بخاری کی ایک حدیث/ترجمۃ الباب بتاتی ہے کہ کچھ خواتین رات کے وسط میں چراغ منگواتی تھیں اور اپنی طہارت کا پتہ لگاتی تھیں: "ان نساء یدعون بالمصابیح من جوف اللیل ینظرن الی الطھر..." (بخاری، کتاب الحیض، باب اقبال المحیض وادبارہ، ترجمۃ الباب؛ فتح الباری، ۱/۵۴۴)۔ حافظِ موصوف نے اس حدیث پر کافی مفصل بحث کی ہے لیکن چراغوں کے استعمال سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابیات برائے احتیاط وحزم اپنی اپنی طہارت کا پتہ چراغوں کی روشنی سے راتوں میں ہی کرلیا کرتی تھیں۔ اس میں بلاشبہ غلو اور حرج کا عنصر ہے لیکن احتیاط وحزم کا بھی عنصر ہے اور اس کی بنا پر ان صحابیات کے عمل پر نقد نہیں کیا جاسکتا (موطا، کتاب الحیض، طھر الحائض؛ سیوطی، تنویر الحوالک، ۱/۷۸)۔ بہر حال ایک خاص کام سے یا مخصوص مقصد سے چراغوں کو راتوں میں جلایا جاتا تھا خواہ وہ عارضی طور سے رہا ہو۔ ان کے اس سماجی اور دینی رویہ سے چراغوں کی شہادت تو ملتی ہی ہے۔

- مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی جلیلؓ نے اپنے ایک مہمانِ مکرم کی ضیافت کے وقت چراغ بجھا دیا تھا۔ اس کا ایک اہم اور انتہائی محبت آگیں اور ایثار انگیز واقعہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رات حضرت ابوطلحہ انصاریؓ ارشادِ نبوی پر ایک بھوکے مہمان کو گھر کھانا کھلانے لے آئے۔ اتفاق سے گھر میں صرف بچوں کے لیے کھانا بچ گیا تھا اور زیادہ نہ تھا۔ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دینے کو کہا اور پھر ان کو یہ ترکیب بتائی کہ چراغ کی لو ٹھیک کرنے کے بہانے اس کو بجھا دو اور اندھیرے میں کھانا مہمان کے سامنے رکھو اور ہم بھی ان کے ساتھ بیٹھ جائیں اور صرف ہاتھ اٹھاتے اور منہ چلاتے رہیں اور کھانا نہ کھائیں۔ مہمان اس بہانے کھانا کھالیں گے۔ یہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے اس ایثار کی بڑی قدر وتعریف کی۔ اس پورے واقعہ میں اس وقت ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ گھروں

میں چراغ ہوتے تھے تو جلائے جاتے تھے اور سوتے وقت بجھا دیے جاتے تھے۔

(بخاری، کتاب مناقب الانصار ،مناقب ابی طلحہ میں یہ حدیث نہیں ہے، البتہ دوسری جگہ ہے؛ کتاب التفسیر، سورۃ الحشر: "باب ویؤثرون علیٰ انفسھم الخ" حدیث:۴۸۸۹:"... وتعالی فاطفئ السراج ونطوی بطوتنا اللیلۃ..."؛ فتح الباری،۸/۸۰۶: چراغ پر کوئی بحث نہیں ہے؛ مسلم، کتاب الاشربۃ، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ)

- ترمذی کی ایک اور دلچسپ روایت ہے جو چراغوں کے جلانے کے علاوہ بعض سماجی رویوں کو بھی نگاہوں کے سامنے لاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت زبیر بن عوام اسدیؓ کے گھر میں چراغ جلتا دیکھا تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا: عائشہ! میرا خیال ہے کہ اسماء کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے لہٰذا اس کا نام نہ رکھنا جب تک میں نہ رکھوں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے نومولود کا نام عبداللہ رکھا اور ایک کھجور سے ان کی تحنیک کی (یعنی پہلی بار کھجور کا گودا اپنی زبانِ مبارک سے نرم کر کے ان کو چٹایا): "عن عائشۃ : ان رسول اللہ ﷺ رای فی بیت الزبیر مصباحا فقال: یا عائشۃ ! ما أُری اسماء الا قد نفست. فلا تسموہ حتی اسمیہ، فسماہ عبداللہ وحنکہ بتمرۃ" (ترمذی، ابواب المناقب، مناقب عبداللہ بن الزبیر)۔ اس حدیث کی کئی جہات ہیں: اول یہ کہ ابتدائی مدنی زمانے کی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بالکل آغاز ہی میں پیدا ہوئے تھے، دوسرے ولادت کے وقت یا اس سے قبل انتظامات کی خاطر چراغ رات میں جلایا جاتا تھا۔ ان کا گھر رسولِ اکرم ﷺ کے گھر کے قریب تھا کہ اس کی روشنی وہاں تک پہونچی، چراغ رات میں جلانے کا ایک سماجی پہلو یہ بھی تھا کہ کسی خاص حالت یا ہنگامی ضرورت کے لیے چراغ گھر کے اندر جلایا گیا ہے۔

غیر معمولی حالات میں چراغِ شب

حملہ/غزوہ کے وقت

غیر معمولی حالات میں راتوں میں چراغ، قندیل یا دیا جلانے کی روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے اور وہ عہدِ نبوی میں بھی تھی۔ ان میں سے کچھ واقعات مغازی کے حوالے سے ملتے ہیں کہ وہ بھی غیر معمولی تھے:

- ابورافع یہودی کے ملازمین اس کے ایک گمشدہ گدھے کو تلاش کرنے کے لیے نکلے تو ایک چراغ کی روشنی میں تلاش کرنے لگے پھر جب وہ تلاش کر کے واپس قلعہ میں چلے گئے تو حضرت براء بن عازبؓ اور ان کے ساتھی ابورافع کے قلعہ پر ایک سیڑھی سے چڑھ گئے۔ اس وقت گھر تاریک تھا کہ چراغ بجھا دیا گیا تھا۔ لہٰذا ظالم یہودی کو آواز دے کر بلایا اور اس کی آواز پر ہی اس کا کام تمام کیا گیا"... فخرجوا بقبس يطلبونه ... ثم صعدت الىٰ ابى رافع فى سلّم، فاذا البيت مظلم، قد طفئ سراجه ..."

(بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع ؛فتح الباری، ۷/ ۲۷۵ وما بعد بالخصوص حدیث: ۴۰۴۰ اور اس کی شرح حافظ)

- یہودی دشمن اسلام کعب بن الاشرف نے اپنے قتل کے وقت چیخ ماری تو قریب کی گڑھیوں میں آگ/ مشعل/ مشعلیں جل گئی تھیں۔

- خیبر کے یہودی سلام بن ابی الحقیق کے قتل کے بعد شور اٹھا تو مشعلیں جل گئیں اور قاتلوں کی تلاش ہونے لگی۔ عینی شاہد صحابی کا بیان ہے کہ مقتول کی بیوی کے ہاتھوں میں چراغ تھا جس کی روشنی میں وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی:"... فوجدت امراته ... وفى يدها المصباح تنظر فى وجهه ..."

(ابن ہشام، ۲/ ۲۷۵؛ نیز ملاحظہ ہو: فتح الباری، ۷/ ۲۰-۳۳۱ و دیگر کتب سیرت، ابواب قتل کعب وسلام بن ابی الحقیق وغیرہ)

تدفین کے وقت

دوسرے غیر معمولی واقعات میں راتوں کی تدفین شامل ہے۔ متعدد روایات میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے بطور خاص کسی صحابی کی تدفین کے لیے چراغ روشن کیے گئے اور آپ ﷺ نے ان کی روشنی میں مرحوم کے لیے دعا کی اور ان کا قبلہ درست کیا:

-"عن ابن عباس ان النبى ﷺ دخل قبرا ليلاً فاسرج له سراج فاخذه من قبل القبلة وقال: رحمك الله ... الخ

(ترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء فى الدفن بالليل ؛ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب الاوقات التى

لا یصلیٰ فیھا ... الخ: "واسرج فی قبرہ" یعنی مرحوم صحابی کی قبر کے اندر بھی چراغ جلایا گیا تا کہ ان کی صحیح طریقے سے تدفین کی جاسکے۔ یہ قبروں پر چراغ جلانے کا معاملہ/ بدعت نہیں ہے جو احادیث نبوی کے مطابق ناجائز اور قابل لعنت وملامت ہے جیسا کہ ذیل کی روایت میں آتا ہے)

- غالباً اسی قسم کی روایت کے سبب بعض لوگوں نے قبروں پر چراغ جلانے کی بدعت شروع کردی تھی یا جاہلی دور سے چلی آرہی تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے قبروں پر چراغ جلانے والوں کی مذمت کی اور ان پر لعنت کی: "لعن رسول الله ﷺ زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج"

(ترمذی، باب کراھیة ان یتخذ علی القبر مسجدا؛ نسائی، کتاب الجنائز، التغلیظ فی اتخاذ السرج علی القبور)

راستہ دکھانے کے لیے چراغ

اندھیری راتوں میں راستہ چلنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ لہٰذا بالعموم راتوں کو راہ چلنے والے چراغ، قندیل، مشعل وغیرہ روشن کرکے ان کی روشنی میں راستہ دیکھتے تھے اور منزل پر پہونچتے تھے۔ روایات سیرت وحدیث میں ان کی بعض مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے بعض غزوات کے ضمن میں راتوں کو آگ روشن کرنے اور مشعلیں جلانے کے واقعات کا ذکر ملتا ہے خاص طور سے فتح مکہ مکرمہ کے حوالے سے اور ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ خالص ایمان اور خالص عمل کے انعام میں نورِ الٰہی قندیلیں بن کر لوگوں کو راستہ دکھاتا تھا۔ اس کے لیے شرط یہی ہے کہ عمل صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور اخلاص کی اتنی فراوانی ہو کہ وہ عالمِ ملکوت سے نورانی قندیلوں کو نیچے اتار لائے منکرینِ معجزات اور مادہ پرستوں کے لیے ایسے واقعات کہانیاں ہیں لیکن اہلِ بصیرت ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور فیض اٹھاتے ہیں:

- امام بخاریؒ نے ایسی تین احادیث اپنی صحیح کے مختلف ابواب میں نقل کی ہیں: بظاہر وہ صرف ایک حدیث ہے جس کے اطراف دو ہیں: حدیث: ۴۶۵ اور اطرافِ حدیث: ۳۶۳۹، ۳۸۰۵ مگر اہل علم جانتے ہیں کہ وہ اپنی مختلف اسناد اور اضافہ شدہ متون کے سبب تین الگ الگ احادیث ہیں خواہ وہ ایک ہی واقعہ سے متعلق ہوں۔ بہر حال ان تینوں احادیث کے مجموعہ سے

حسبِ ذیل واقعہ ملتا ہے۔ حضرات اُسید بن حضیر اوسی اشہلی اور عباد بن بشر بن وقشؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک اندھیری رات میں کافی تاخیر سے نمازِ عشاء ادا کی اور پھر مجلسِ نبوی میں شرکتِ فیض سے اکتسابِ نور کیا۔ اب گھر کو چلے تو ان کے سامنے، آگے آگے ایک نورِ الٰہی دو روشن قندیلوں کی مانند راستہ دکھاتا رہا اور جب ان کے راستے الگ ہوئے تو وہ دو قندیلیں بھی الگ الگ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ چل پڑیں اور ان کو گھر تک پہونچا کر ہی واپس اپنے منبعِ ملکوتی کو گئیں۔ متنِ حدیث صرف اول کا درج کیا جارہا ہے کہ اسی میں مصباح کا ذکر ہے: "... عن انس ... ان رجلین من اصحاب النبی ﷺ خرجا من عند النبی ﷺ فی لیلة مظلمة، ومعهما مثل المصباحین یضیئان بین ایدیهما، فلما افترقا صار مع کل واحد منهما واحد حتی یاتی اهله"

(بخاری، کتاب الصلوٰة، باب بلا عنوان؛ فتح الباری، ۱/ ۷۲۱-۷۲۲؛ ۷/ ۱۵۸-۱۵۹۔ حافظ ابن حجرؒ کی تشریح میں یہ اضافہ ہے کہ امام احمد اور امام حاکم نے اس روایت کی شخصیات کے ساتھ موصول روایت بیان کی ہے)

- اسی طرح حضرت اُسید بن حضیرؓ کی تلاوتِ قرآن مجید کے وقت سکینہ الٰہی ایک بدلی کی شکل میں نازل ہوئی تھی جس میں چراغوں کی مانند مشعلیں روشن تھیں۔ انھوں نے جب تلاوت بند کی تو وہ قندیلوں والی بدلی اوپر اپنے مقامِ ملکوتی کو واپس چلی گئی: "... فاذا مثل الظلة فیها امثال المصابیح ..." رسولِ اکرم ﷺ نے اس کو سکینہ اور نزولِ ملائکہ سے تعبیر فرمایا تھا۔

(بخاری، فضائل القرآن، باب نزول السکینة والملئکة عند قراءة القرآن؛ حدیث: ۵۰۱۸؛ فتح الباری، ۹/ ۷۹-۸۲۔ تشریح میں دوسری تفصیلات بھی ہیں۔ اصل شے یہ ہے کہ قراءتِ قرآن مجید بذاتِ خود نور ہے اور فراوانیٔ خلوص سے وہ نور بیرون میں بھی ظاہر ہوجاتا ہے اور چراغ بن جاتا ہے)

غزوات میں چراغ و مشعل

متعدد غزوات و سرایا میں اسلامی فوج کے اور غیر اسلامی لشکروں کے چراغ اور مشعل جلانے کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے کعب بن اشرف اور سلّام بن ابی الحقیق کے قتل کے دو سرایائے صحابہ کے حوالے سے مشعلیں روشن کرنے کے علاوہ خاص چراغ جلا کر تفتیش و تلاش کرنے کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔

گھر اور اس کا سامان

زندگی گذارنے اور تنگی ترشی یا فراخی سے گذر بسر کرنے کے لیے انسان کو ہمیشہ مختلف چیزوں کی ضرورت رہی ہے۔ عہدِ نبوی کے قبائلی یا متمدن معاشرہ میں بھی ان کی حاجت قائم رہی اور وہ تمام سادگی اور تنگی کے باوجود ان کی فراہمی کی تگ و دو کرتا رہا۔ اسلام اور تعلیماتِ نبوی نے ضروری ساز و سامان کی فراہمی اور حصول و استعمال سے کبھی نہیں روکا بلکہ اس کو پسندیدہ قرار دیا۔ روک تھام صرف اسراف، بے جا اسباب، غیر ضروری ترفہ اور کبر و غرور اور ریاکاری پیدا کرنے والے اسباب کی ہی کی۔ اس کے پیچھے یہ اسلامی فکر کارفرما تھی کہ انسان اسباب دنیا میں پھنس کر اسبابِ آخرت کی فراہمی سے غافل نہ ہو جائے (سورۂ حدید-۲۰: "اعلموا انما الحیٰوة الدنیا لعب و لهو وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر في الاموال والاولاد ... وما الحیٰوة الدنيا الا متاع الغرور" جان رکھو! کہ دنیا کا یہی ہے کھیل اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں، اور بہتات ڈھونڈنی مال کی اور اولاد کی، اور دنیا کا جینا تو یہی ہے جنس دغا کی"۔ اس متاع دنیا کے بالمقابل بعد کی آیات میں متاع آخرت - مغفرت، جنت اور فضل الٰہی - اور اس کے اسباب کی تشریح کی ہے۔ یہی دونوں کا اصل مآل ہے)

رسولِ اکرم ﷺ کی دنیاوی زندگی سادہ، سادگی پسند اور فقیرانہ ہونے کے باوجود رہبانیت زدہ نہ تھی۔ نہ ہی صحابہ کرام کی معیشت اتنی سادہ اور فقیرانہ تھی کہ اس پر اسبابِ دنیا اور اسبابِ عیش ترک کر دینے کا الزام آئے۔ ان میں فقراء و مساکین بھی تھے جن کو دو وقت کی روٹی کے لالے تھے اور اسبابِ دنیا سے انھیں چند چیزوں کے سوا کچھ میسر نہ تھا۔ متوسط طبقۂ اصحاب و اکابر بھی تھا جو سادہ عیش و عشرت اور اسلامی معتدل طرزِ حیات اور اسبابِ زندگی پر عامل تھا۔ اسی کے ساتھ ان میں مالدار و متمول بلکہ انتہائی دولت مند افراد و طبقات بھی تھے جن کو ہر قسم کا اسبابِ عیش و عشرت حاصل تھا۔ تاہم ان تینوں - ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ - طبقات کا اعتماد اور بھروسہ اسباب دنیا پر نہ تھا، بلکہ وہ اسے اسباب آخرت کے حصول کا ایک ذریعہ اور زندگی گذارنے کا ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ زندگی اور اس کے مادی اسباب کو نعمت الٰہی سمجھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔

بایں ہمہ ان تمام سہ گانہ طبقاتِ امت میں معاشرتی و سماجی اونچ نیچ کے باوجود اسلام پوری طرح کارفرما تھا۔ ان کی غربت وفقیری دنیا اور اسبابِ دنیا کی طرف دوڑنے اور ان کے پیچھے بھاگنے اور آخرت کو بھلا دینے پر کسی طرح آمادہ نہ کر سکی۔ متوسطین اور مال دار ترین طبقاتِ صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ اسبابِ زندگی اور مال و دولت ان کی نظروں میں قطعی ہیچ تھے اور ذرا سے اشارہ پر بلکہ بلاتحریکِ خارجی وہ صدقات و مبرات کے اتنے خوگر ہو گئے تھے کہ فقراء و مساکین سے عبادت میں بڑھ گئے۔ فقراء اور متمول اصحاب کرام کی اس دینی مفاخرت اور اخروی مسابقت کا ذکر ایک حدیث میں خوب آتا ہے، جس میں ان مال داروں کے فضل کا ذکر نبوی ہے۔ اسبابِ دنیا اور اسبابِ عیش ان کے زندگی کے گذارنے کے وسیلے تھے، مقصد و مقصود نہ تھے، مطمحِ نظر صرف مرضی الٰہی اور اُخروی عشرت تھی۔

✪✪✪

بستر اور اس کا اسباب

چارپائی یا تخت یا زمین پر بچھانے اور اوڑھنے اور سر رکھنے کے لیے مختلف چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ان میں نیچے کا فرش یا فرش کی چادر اور بچھونا شامل ہیں اور سرہانے کے لیے تکیہ ضروری شے ہے اور عہدِ نبوی میں ان تمام چیزوں کا استعمال ملتا ہے۔لباس کے باب میں اوڑھنے کی چادروں کا ذکر آیا ہے۔ان میں ملحفہ،خمیصہ وغیرہ اوڑھنے کی چادریں تھیں اور اسی طرح بچھانے کے لیے بھی ان کا استعمال ہوتا تھا۔سردی کے دنوں میں رضائی اور لحاف اور کمبل کی ضرورت پڑتی تھی اور رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے بستروں میں ان کا بھی حوالہ ملتا ہے۔سرہانے کے لیے وسادہ کا ذکر بہت عام ہے۔ان کا ایک استعمال ٹیک لگانے کے لیے بھی نظر آتا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کے بستر میں ان تینوں چیزوں کا ذکر پایا جاتا ہے:

تکیے: وسادۃ (تکیہ)- زمانۂ ایلاء میں حضرت عمرؓ نے تکیۂ نبوی دیکھا تھا جو چمڑے کا تھا اور جس میں پتیاں بھری تھیں:"**متکنا علیٰ وسادۃ من ادم حشوھا لیف**".

(حدیث بخاری:۵۱۹۱؛ فتح الباری،۹/۳۴۶ومابعد)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پردے کو پھاڑ کر اس کے ایک یا دو تکیے بنا لیے تھے اور حدیثِ مسلم کے مطابق وہ کھجور کی پتیوں سے بھرے گئے تھے:"**فقطعنا منہ وسادتین وحشو تھما لیفا**" (مسلم،۸۳(۲۱۰۷)

- دوسرے تکیوں کا ذکر ذیل کی روایاتِ بستر کے تحت آتا ہے۔

بچھونے اور چادریں

- ازواجِ مطہرات کا بستر ان کا شخصی بھی ہوتا تھا اور ان کے شوہرِ مکرم رسولِ اکرم ﷺ کا

انجھا بھی۔ وہی تمام چیزیں اس میں بھی تھیں۔ بعض ازواج مطہرات کے حوالے سے ان کے بستروں کی کچھ تفصیلات ملتی ہیں: بچھانے کی چادر/ بچھونے کو فراش کہا جاتا ہے اور اوڑھنے کی چادروں کے مختلف نام ملتے ہیں جیسے قطیفہ، خمیصہ، خمیلہ وغیرہ۔

- حضرت ام سلمہؓ کو رسولِ اکرم ﷺ نے ان کے مہر میں ایک قطیفہ (موٹی چادر) دی تھی اور اس کے بارے میں ان سے فرمایا تھا کہ سردی میں اسے لباس بنالینا اور گرمی میں فرش کی طرح استعمال کرنا اور ایک تکیہ بھی تھا جو چمڑے کا تھا اور اس میں پتیاں بھری تھیں: "... لک عندنا قطیفة تلبسها فی الشتاء، وتفرشیها فی الصیف، ووسادة من ادم حشوها لیف ..."

(بلاذری، ۱/۴۳۱)

- حضرت فاطمہؓ کو جو سامانِ عیش ملا تھا اس میں ایک تکیہ تھا جو اذخر گھاس سے بھرا تھا: "وسادة محشوة باذخر" (بلاذری، ۱/۴۰۳) اور ایک روئیں دار چادر یا بچھونا (خمیل) بھی شامل تھا۔

اوڑھنے کی چادریں

لیٹنے اور آرام و استراحت کے وقت مختلف قسم کی چادروں کا ذکر روایات و احادیث میں آتا ہے۔ اور بسا اوقات ایک ہی قسم کی چادر کو ایک ہی روایت میں دو دو ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان میں لغوی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ اوپر بچھونے کے بیان میں حضرت ام سلمہؓ کے مہر کی چادر کا ذکر آیا ہے جو سردی میں اوڑھنے کی چادر بنتی تھی اور گرمی میں بچھونا، اس کو قطیفہ کہا گیا ہے۔ گویا اس کے تین استعمالات تھے: جسم پر چلتے پھرتے بطور چادر اوڑھنا اور بچھانا فراش کی طرح اور سوتے وقت اوپر اوڑھنا بطور چادرِ خواب۔ ان کے علاوہ بعض دوسری چادروں کا ذکر بھی ملتا ہے جو ملبوسات کے باب میں کافی تفصیل سے آچکا ہے۔

- حضرت ام سلمہؓ ہی کا بیان ہے کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک چادر (خمیصة) میں لیٹی ہوئی تھی کہ ماہواری شروع ہوگئی اور میں نے چادر سے نکل کر اپنا لباسِ ایام پہن لیا پھر رسولِ اکرم ﷺ کے بلانے پر میں دوبارہ آپ کے ساتھ اس چادر (خمیلہ) میں لیٹ گئی:

"...بینا انا مع النبی ﷺ مضطجعة فی خمیصة اذ حضت ... فدعانی فاضطجعت معه فی الخمیلة"

(بخاری، کتاب الحیض، باب من سمی النفاس حیضا، حدیث: ۲۹۸؛ فتح الباری، ۱/۵۲۲-۵۲۳:
اطراف حدیث: ۳۲۲، ۳۲۳، ۱۹۲۹)

حافظِ موصوفؒ نے خمیصہ کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ کالا کپڑا ہوتا ہے جس میں نقش ونگار بنے ہوتے ہیں اور وہ اون وغیرہ سے بنا جاتا ہے: "کساء اسود له اعلام یکون من صوف وغیره ..."۔ حافظ موصوف نے لفظ خمیصہ سے زیادہ خمیلہ کو ترجیح دی ہے جو آخرِ حدیث میں ہے اور اس کے معنی قطیفہ یا طنفسہ بتائے ہیں۔ امام خلیل کے مطابق خمیلہ روئیں دار یا جھور والا کپڑا ہوتا ہے: "الخمیلة ثوب له خمل ای هدب"۔ اس بنا پر حدیث میں وارد دونوں الفاظ خمیصہ اور خمیلہ کے درمیان شارح گرامی کوئی منافاۃ نہیں پاتے کہ وہ دونوں سیاہ چادریں تھیں جن میں جھور ہوتے تھے: "فکانها کساء اسود لها اهداب"۔ احادیث: ۳۲۲-۳۲۳ میں دونوں جگہ خمیلہ ہی ہے، یعنی صرف ایک لفظ ہے۔

- ملبوسات کے باب میں مذکورہ بالا خمیلہ/ خمیصہ کے علاوہ بعض دوسری اوڑھنے کی چادروں کا ذکر آچکا ہے جیسے حضرات زید بن حارثہ اور ان کے فرزند حضرت اسامہؓ دونوں ایک ہی چادر اوڑھے ہوئے محوِ خواب تھے۔ بعض دوسرے صحابہ کرام کی اوڑھنے کی چادروں کا ذکر بھی آچکا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کی اوڑھنے کی چادروں کا ذکر ان کے بعض واقعات اور پس منظر کے حوالے سے آیا ہے۔

ملحفہ/ لحاف

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پیلی چادر/ دلائی کی خبر بہت دلچسپ ہے۔ ان کے گھر ایک مہمان وارد ہوا تو حضرت صدیقہؓ نے ان کو اپنی ایک پیلی چادر اوڑھنے کے لیے عطا فرمادی۔ مہمان اس میں سوئے تو بدخوابی کا شکار ہو گئے۔ شرما گئے کہ اس کو ایسے ہی آثارِ احتلام کے ساتھ واپس کریں لہٰذا پوری طرح دھودھا کر واپس بھیجی۔ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو فرمایا کہ ہمارا کپڑا

کیوں خراب کیا، صرف اس کو چھڑا دینا کافی تھا... "... فامرت له بملحفة صفراء، فنام بها فاحتلم..." (ترمذی، کتاب الطهارة، باب غسل المنی من الثوب)

اس واقعہ میں جس چیز کو ملحفہ کہا گیا ہے اس کا ترجمہ بالعموم چادر کیا جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے اسے دلائی سمجھنا زیادہ موزوں ہے اور اس کے استعمال اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نقد سے بھی وہ دلائی ہی معلوم ہوتی ہے جس میں روئی وغیرہ بھری تھی کیونکہ صرف چادر کا دھونا اس کو خراب نہیں کرتا۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی آخری مجلس میں جو صحابہ کرام سے خطاب کیا تھا اس میں منبر پر تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کے شانوں پر اوڑھنے والی چادر پڑی ہوئی تھی: "... ملحفة علیٰ منکبیه..." (بخاری، کتاب الجمعة، باب من قال فی الخطبة الخ)

لحاف

روایات واحادیث میں دو الفاظ ملتے ہیں: ملحفۃ اور لحاف، اول الذکر کا ترجمہ بالعموم چادر کیا جاتا ہے اور دوسرے کا رضائی اور لحاف۔ ملحفہ اوڑھنے کی چادر اور دلائی بھی تھی جو خنک موسم میں چلتے پھرتے اور سوتے وقت اوڑھی جاتی تھی۔ لحاف یا رضائی سردی میں اوڑھنے کی چیز تھی اور اس کا ذکر کئی روایات میں آتا ہے۔ اس کا خاص تاریخی یا جغرافیائی پس منظر یہ ہے کہ لحاف مدینہ منورہ کی سردی میں استعمال ہوتے تھے اور مکہ مکرمہ کے زمانۂ حیات میں ان کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی کہ وہاں موسم سال بھر خاصا گرم رہتا ہے۔

- سب سے مشہور وہ حدیث ہے جس کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کے پاس وحی صرف حضرت عائشہؓ کے ہی لحاف میں آتی تھی۔ امہات المومنین کے ایک طبقہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں شکایت کی تھی تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: "یا ام سلمه! لا تؤذینی فی عائشه! فانه والله ما نزل علیّ الوحی، وانا فی لحاف امراة منکن غیرها" (بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب فضل عائشةؓ، حدیث: ۳۷۷۵؛ فتح الباری، ۷/۱۳۵-۱۳۸: حافظ ابن حجرؒ نے دوسری بحث زیادہ کی ہے جو حضرت خدیجہ یا حضرت عائشہؓ کی افضلیت سے متعلق ہے،

لحاف سے کم۔ بہر حال اس میں یہ واضح بیان ملتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے لحاف میں تو وحی الٰہی آتی تھی، دوسری امہات المومنین کی رضائی میں نہیں آتی تھی۔ بالواسطہ دوسری امہات المومنین کے لحافوں کا ذکر بھی اس میں آجاتا ہے)

- حضرت ابوایوب انصاریؓ کے لحاف کا ذکر رسولِ اکرم ﷺ کی سولہ ماہہ میزبانی کے دوران کے پیش آنے والے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ ایک رات پانی کا گھڑا اوپری منزل پر ٹوٹ گیا جہاں حضرت ابوایوب انصاری اور ان کی اہلیہ محترمہ کا قیام تھا۔ اس خدشہ سے کہ پانی نچلی منزل میں استراحت فرما رسولِ اکرم ﷺ کو زحمت نہ دے انھوں نے اپنے لحاف کو استعمال کر کے سارا پانی اس سے سکھا دیا تھا۔

سریر (تخت)

لیٹنے کے لیے جس شے کا استعمال کیا جاتا ہے اسے عربی میں سریر کہتے ہیں جس کی جمع اسرّۃ اور سُرُرٌ آتی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ تخت کیا جاتا ہے اور عام استعمال کے لحاظ سے اسے چارپائی یا اس جیسی اور کوئی چیز کہا جا سکتا ہے۔ عربوں میں اس کا عام استعمال تھا اور وہ بالعموم پورا کا پورا لکڑی کا بنایا جاتا تھا جیسے آج کل ہمارے ممالک میں تخت ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ تخت ہی استعمال کرتے تھے بلکہ تختِ خواب سے زیادہ انھیں اور کوئی شے محبوب نہ تھی: "كانت قريش بمكة وليس شئ احب اليها من السرير تنام عليه" (بلاذری، ۱/۵۲۵)۔ بغدادی نے بعض اکابرِ قریش کے سریر (تخت) کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اجتماعی طعام خیر کے باب میں ان میں سے ابوجہل مخزومی کے سریر کا ذکر گذر چکا۔ احادیث و روایات سیرت میں سریر (تخت) کا ذکر کافی آتا ہے اور تمام استراحت کے سریر/تخت اکابر عرب و صحابہ ہی کے تھے (قرآن مجید میں سریر کی جمع سرر ہی کا ذکر آیا ہے، واحد کا نہیں اور وہ سب جنتی تختوں کا ذکر ہے: حجر - ۴۷؛ صٰفٰت - ۴۴؛ طور - ۲۰؛ واقعہ - ۱۵؛ غاشیہ - ۱۳؛ زخرف - ۳۴)

اسی روایتِ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اگلا حصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قیام گاہ کو شرفِ اقامت بخشا تو اپنے میزبانِ عزیز

سے تخت کے بارے میں دریافت فرمایا اور ان کے جوابِ نفی کی خبر حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ کو ہوئی تو انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی استراحت کے لیے ایک تخت بھیجا جس کا ایک سرہانہ تھا اور جس کے پائے شیشم کے تھے اور وہ مونجھ کی رسی کا بنا ہوا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ اسی پر استراحت فرماتے تھے اور جب اپنے خانۂ مبارک کو منتقل ہوئے تو وہ تخت بھی آپ ﷺ کے ساتھ وہاں گیا اور اپنی وفات تک اسی پر آپ سوتے رہے۔ بعد وفات اسی پر آپ ﷺ کا جنازہ بھی رکھا گیا اور اسی پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ بعد میں لوگوں نے اسی پر اپنے جنازے لے جانے شروع کیے اور اسی پر حضرات شیخین - ابوبکر و عمرؓ - کے جنازے بھی اٹھائے گئے اور یہ صرف تختِ نبوی سے برکت حاصل کرنے کی خاطر ہوا۔

(بلاذری، ۱/۵۲۵: "...فبلغ اسعد بن زرارة ذلک، فبعث الیٰ رسول الله ﷺ بسریر له عمود، و قوائمه من ساج، مرمول بخزم یعنی المسد، فکان ینام علیه حتی تحوّل الی منزلی، کان فیه ... فی مکان ینام علیه حتی توفی..." الخ)

اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ سریر (تخت) پر سونے کے عادی تھے اور وہ ان کے لازمی اسباب میں سے ایک تھا۔ اس سے یہ بھی استنباط کیا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ کی زندگی میں بھی رسولِ اکرم ﷺ بالخصوص اور دوسرے اکابرِ قریش تخت پر ہی سویا کرتے تھے۔ اس کا اگلا جزئیہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں سریر یا تخت کا عام رواج نہ تھا کہ منزلِ حضرت ابوایوب انصاریؓ میں تو نہیں نکلا۔ مگر ایک دوسرے مدنی صحابی کے گھر میں موجود تھا۔ اور وہ عام تخت بھی نہ تھا، بلکہ خاص سریر تھا جو خاصی قیمتی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ مدنی سماجی روایات کے یہ دو متنوع پہلو نظر آتے ہیں۔ اصل تجزیہ دوسری روایاتِ سریر کے ذکر کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔

متعدد احادیث میں سریرِ نبوی کا ذکر آتا ہے خاص طور سے نماز و استراحت اور ملائکہ کے گھروں میں داخلے کے حوالے سے۔ موخر الذکر کے حوالے سے کئی روایات ملتی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فرشتے ایسے گھروں میں داخل نہیں ہوتے جہاں تصاویر ہوں یا کتے ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام وعدہ کرنے کے باوجود وقتِ مقرر پر دربارِ نبوی میں صرف اس بنا پر بعض حالات میں نہیں پہونچے کہ سریرِ نبوی کے نیچے کوئی کتے کا پلا آ کر بیٹھ گیا تھا اور اہل بیت کو

اس کی خبر نہ تھی۔ یہ واقعہ غالباً کئی بار پیش آیا اور ان میں سے بیشتر میں سریر کا حوالہ ہے:

''-... ثم التفت فاذا جرو کلب تحت سریرہ، فقال: یا عائشة متیٰ دخل هذا الکلب؟ ...''۔ حدیث عائشہ

-''...اسی قسم کی ایک روایت حضرت میمونہؓ سے ان کے گھر کے حوالے سے آئی ہے۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۴۸۱-۴۸۲؛ مزید بحث کے لیے: وحی حدیث، ۱۶۵-۱۶۶)

- رسولِ اکرم ﷺ نے واقعہ ایلاء کے دوران ایک بوریائے فقیرانہ یا چٹائی پر استراحت فرمائی تھی۔ حدیثِ بخاری: ۵۱۹۱ وغیرہ میں اسے ''رمال حصیر'' یا ''رمل حصیر'' ہی کہا گیا ہے جس سے مراد صرف بنی ہوئی چٹائی لی جاتی ہے۔ مگر حافظ ابن حجرؒ کا اصرار ہے کہ وہ سریرِ نبوی تھا اور وہ اسی طرح بنا ہوا تھا جس طرح حصیر یا چٹائی بنی جاتی ہے اور اس حدیث میں اس سے وہی مراد ہے: ''... والمراد هنا ان سریرہ کان مرمولا بما یرمل به الحصیر'' کیونکہ ایک دوسری روایت میں ''علیٰ رمالِ سریر'' کے الفاظ وضاحت موجود ہے۔ اور جسمِ اطہر پر اس کے نشانات بتانے والے فقرہ فاروقی کو بھی حافظِ موصوف نے اپنی تائید میں پیش کیا ہے کہ سریر کی بنائی پر چٹائی کا اطلاق کیا گیا ہے: ''یؤید ما قدمته انه اطلق علی نسج السریر حصیراً'' (فتح الباری، ۹/ ۳۵۷)

حصیر (چٹائی)

مختلف چیزوں کی بنی ہوئی چٹائیاں مختلف نوعیت کی ہوتی تھیں۔ وہ عرب جاہلی اور عہدِ نبوی دونوں میں زیرِ استعمال رہی تھیں۔ ان کا عام نام تو ''حصیر'' ہے جس کا ترجمہ چٹائی کے علاوہ ''بوریا'' بھی کیا جاتا ہے اور وہ بوریائے فقیر ہی ہے ورنہ وہ اپنی قسم کے اعتبار سے چٹائی ہوتی تھی جو کھجور کی پتیوں وغیرہ سے بنائی جاتی تھی۔ جوٹ کی چٹائی یا بوریے کا وجود غالباً نہیں تھا۔ اس کی جمع ''حُصُر'' اور احصرۃ آتی ہیں۔ چھوٹی چٹائی ''خمرۃ'' کہلاتی تھی۔ وہ بالعموم کھجور کی چھوٹی چٹائی ہی تھی۔ اس کی جمع ''الخمر'' آتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض نام اور اقسام ملتی ہیں جن کا ذکر روایات کے حوالے سے آئے گا۔

بوریائے نبوی

رسولِ اکرم ﷺ کے استعمال میں ان دونوں قسم کے بوریا اور چٹائیوں کا ذکر روایاتِ سیرت واحادیث میں ملتا ہے:

- واقعۂ ایلا کے ضمن میں یہ واقعہ آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ بالائی غرفہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور وہاں حضرت عمر فاروقؓ نے آپ ﷺ کو ایک چٹائی پر استراحت فرما دیکھا تھا جس کی کھردری دھاریوں نے جسمِ اطہر پر نقش ونگار بنا دیے تھے کہ اس پر دوسرا فرش نہ تھا: "فدخلت علی رسول اللہ ﷺ، فاذا ھو مضطجع علی رِمال حصیر لیس بینه و بینه فِراش، قد اثر الرمال بجنبه..."

(حدیث بخاری: ۵۱۹۱؛ فتح الباری، ۹/ ۳۴۶، ۳۵۷ وغیرہ: یعنی بنی ہوئی چٹائی: "حصیر مرمول ای منسوج ..." نیز بحث سریرِ نبوی)

- حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو ایک چٹائی پر نماز میں سجدہ کرتے دیکھا: "فرأیته یصلی علی حصیر یسجد علیه"۔ یہی مشاہدہ ایک دوسرے صحابی حضرت عمر بن ابی سلمہؓ نے بھی کیا تھا۔

(مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی ثوب واحد؛ ترمذی، باب الصلاۃ علی الحصیر؛ ابن ماجہ، ۱۰۲۸)

- حضرت انس بن مالکؓ کی دادی حضرت مُلیکہؓ کے گھر کھانے کی دعوت کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے تمام "اہل بیت" کو ایک پرانی چٹائی پر نماز پڑھائی تھی جو طویل استعمال سے کالی پڑ گئی تھی اور نماز کے لیے حضرت انسؓ نے اسے پانی سے دھو دیا تھا یا اس پر پانی چھڑک دیا تھا: "... قال انس: فقمت الیٰ حصیر لنا قد اسوّد من طول مالُبس، فنضحته بماء ..."

(بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی الحصیر، حدیث: ۳۸۰؛ فتح الباری، ۱/ ۶۳۳-۶۳۶؛ اطراف حدیث: ۷۲۷-۸۶۰، ۸۷۱، ۸۷۴، ۱۱۴۶: حافظ موصوف کے مطابق بقول ابن بطال جو چٹائی قد آدم کے برابر ہوتی ہے وہ حصیر کہلاتی ہے اور اس کو خمرہ نہیں کہا جاتا: "ان کان ما یصلی علیه کبیرا قدر طول الرجل فاکثر فانه یقال له الحصیر ولا یقال له الخمرة، وکل ذلک یصنع من سعف النخل وما اشبهه")

خمرۃ (کھجور کی چھوٹی چٹائی)

امامانِ حدیث بالخصوص امام بخاریؒ نے ''خمرہ'' کا ذکر طہارت اور نماز کے ابواب کے حوالے سے کئی مقامات پر کیا ہے۔ امام موصوف نے ایک باب کا عنوان ہی باندھا ہے: چھوٹی چٹائی پر نماز کا باب (باب الصلاۃ علی الخمرۃ) اور اس کے تحت حضرت میمونہ ام المومنینؓ کے حوالے سے ایک طرح سے معمولِ نبوی بیان کیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ چھوٹی چٹائی پر نماز پڑھا کرتے تھے: ''کان النبی ﷺ یصلّی علی الخمرۃ'' (حدیث: ۳۸۱؛ فتح الباری، ۱/ ۶۳۷)

- روایاتِ سیرت و حدیث میں ایک اور اہم دلچسپ واقعہ اس ضمن میں ملتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی مسجد سے اپنی انا حضرت ام ایمنؓ کو پکارا کہ آپ ﷺ کو چھوٹی چٹائی دے دیں۔ انھوں نے معذرت کی کہ وہ اپنی ماہانہ اذیت سے گذر رہی ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا حیض/ نجاست تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ دراصل قدیم جاہلی تصور تھا کہ حائضہ کو پورا نجس مانتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اصل اسلامی صورت بتائی۔ یہ واقعہ مکی دور کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت ام ایمنؓ مدنی دور میں کافی بوڑھی ہو چکی تھیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مضمون خاکسار: حضرت ام ایمن- رسولِ اکرم ﷺ کی انا، معارف اعظم گڑھ)

✪✪✪

اسبابِ خوردونوش

کھانے پینے سے متعلق بہت سے اور گوناگوں اسباب اور ساز و سامان ہوتا ہے جو ہر تمدن میں پایا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض تمدنوں میں ان کی کثرت ہوتی ہے اور بعض میں قلت، اور یہ قلت بھی بسا اوقات تعداد کے سبب کثرت میں بدل جاتی ہے۔ عرب جاہلی اور عہدِ نبوی میں کھانے پینے کے اسباب بہت تھے اور ان کا ذکر بہت سی چیزوں پر مشتمل ہے۔ ان میں جو چیزیں شامل تھیں ان کا ایک اندازہ بعد کے مباحث سے ہوگا۔ ان کی مختصر فہرست تیار کی جائے تو اس میں بھی کافی رنگارنگی نظر آئے گی۔ جیسے دسترخوان، تنور، چھری چاقو وغیرہ، بیٹھ کر کھانے کے لیے چٹائی، جاجم وغیرہ، آٹا پیسنے کے لیے چکی وغیرہ۔

ان اسبابِ خورد و نوش میں ظروف یا برتن کا باب بہت وسیع ہے اور یہ ظروف مختلف نوعیتوں کے تھے۔ ان کی ایک قسم پانی کے ظروف کی تھی اور اس میں بھی دو طرح/قسم کے برتن تھے: ایک پانی رکھنے کے چھوٹے بڑے اور منجھلے برتن، دوسرے پانی پینے کے ظروف۔ ان میں بھی لمبائی چوڑائی یا حجم کے لحاظ سے خاصی رنگارنگی ملتی ہے۔ بعض چھوٹے ہیں کہ صرف ایک دو کی پیاس بجھانے کے لیے کافی ہوں اور بعض اتنے بڑے کہ پوری مجلس کی سیرابی کے لیے کافی ہوں۔ ان کے اسماء ان کی انواع کی بنا پر تھے۔ ان میں خاصا تنوع بلکہ بسا اوقات ترادف پایا جاتا ہے۔ ان کے خام مواد یعنی جس کے وہ بنے ہوتے تھے وہ بھی وجہ تسمیہ بن جاتا تھا۔

ظروف کی ایک اور قسم کھانے پکانے کی تھی۔ ان میں چھوٹی سی دیگچی سے لے کر جہازی سائز کی دیگیں ملتی ہیں۔ قرآن مجید میں ان ہی کو "قدور راسیٰت" کہا گیا ہے۔ ان کی لمبائی چوڑائی اور ضخامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان میں یعنی چند دیگوں میں پورا پورا اونٹ پکا لیا جاتا تھا۔ دوسری قسم کی دیگوں، ہانڈیوں اور دیگچوں کا بھی روایات میں ذکر ملتا ہے۔ پھر

کھانے کے برتن تھے۔ ان میں پیالہ، رکابی، تھالی، لگن اور بڑی بڑی تالاب جیسی لگن تھیں جن میں ایک پورا مجمع کھانا کھالیتا تھا، پھر چھوٹے کھانے کے برتن تھے۔ ان کے خام مواد کی گونا گونی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ اناج، جنس، غلہ وغیرہ رکھنے کے ظروف تھے۔ ان سب کا ذکر ان کی اقسام واستعمال کے لحاظ سے بالترتیب کیا جاتا ہے۔

برتن/ظروف

گھروں میں مختلف چیزیں بالخصوص اناج وغلہ اور دوسرے کھانے کی اشیاء رکھنے کے لیے خاص برتنوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان کے علاوہ دوسرے ظروف مشروبات کے رکھنے اور پینے کے لیے ہوتے تھے۔ ان کے نام، قسم اور نوع سب کچھ بالکل مختلف ہوتا تھا۔ پانی لانے اور خاص کر دور دور کے کنوؤں اور چشموں سے لانے کے ظروف الگ ہوتے تھے اور ان کے ٹھنڈا کرنے کے برتن بھی الگ تھے۔ ظروف کی یہ گونا گونی ان کے استعمال کے علاوہ اشیاء ضرورت کے واسطہ سے ان کے استعمال کی بنا پر تھی۔ ان کا الگ الگ ذکر ضروری ہے۔

اناء (جمع = آنیة) برتن، ظروف کے لیے عام نام ہے اور اس میں ہر طرح کے برتنوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع الجمع ''اوان'' ہے۔ غالباً ظروف اور برتنوں کی بیکراں گونا گونی اور بہت زیادہ تنوع کے سبب جمع کی جمع بنائی گئی۔ جیسے کثرتِ اقسام سے بعض دوسرے عربی الفاظ کی جمع الجمع ملتی ہے۔ احادیث وضو وطہارت میں ''اناء'' کا ذکر بہت آتا ہے جیسے احادیث ابوداؤد: ۷۸-۷۹، ۸۱-۸۲، ۹۸-۹۹ وغیرہ نیز ابن ماجہ: ۳۵۸-۳۵۹، ۳۶۷، ۳۸۲ وغیرہ۔ پھر عام برتنوں کے خاص ظروف ہوتے ہیں اور ان کے مخصوص نام ہوتے ہیں۔ انھیں کے اعتبار سے ان کی تقسیم ہوتی ہے۔ دوسرا عام لفظ اداوۃ ہے جس کی جمع اداویٰ ہے اور وہ بھی برتن کے معنی میں آتا ہے اور بکثرت احادیث میں ملتا ہے، اگرچہ اناء کے مقابلہ میں کم ملتا ہے۔ جیسے حدیث ابوداؤد: ۸۴ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے رسولِ اکرم ﷺ نے جنات کی ملاقات کی رات دریافت فرمایا تھا: تمہارے برتن میں کیا ہے؟ عرض کیا: نبیذ، آپ ﷺ نے فرمایا: پاک کھجور اور طاہر پانی ہے: ''... ما فی اداوتک؟ قال: نبیذ...'' (مصباح اللغات: الاداوة: چمڑہ کا چھوٹا برتن)

برتن کے لیے عام لفظ "انـاء" کا استعمال دوسرے سیاق وسباق میں بھی کیا گیا ہے لیکن طہارت میں زیادہ کیا گیا ہے۔ اس کا ایک خاص دینی اور تشریعی پس منظر اور اسی کے ساتھ معاشرتی وتمدنی تناظر یہ ہے کہ مذکورہ بالا اور ان جیسی دوسری احادیث میں ایک ہی برتن سے مردوں اور عورتوں دونوں کے ساتھ ساتھ وضو کرنے کا بیان ملتا ہے: "کـان الـرجـال و الـنسـاء یتـوضـئـون فی زمان رسول اللہ ﷺ ... من الاناء الواحد جمیعاً" نیز رسولِ اکرم ﷺ اور بعض ازواج مطہرات بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ایک ساتھ ایک برتن سے وضو کرنے کا علم ہوتا ہے۔ حضرت صدیقہ فرماتی ہیں کہ ہمارے ہاتھ باری باری سے برتن کے اندر پڑتے تھے: "اختلفت یدی و ید رسول اللہ ﷺ فی الوضوء من اناء واحد"۔ حضرت ابن عمرؓ کا یہ بیان دوسرے صحابہ وصحابیات کے بارے میں ہے: "من اناء واحد ندلی فیه ایدینا..."

پانی کے ظروف

ظروفِ طہارت

احادیث میں وضو، غسل اور پینے پلانے کے ظروف کے لیے عام نام برتن/ اناء بہت کثرت سے ملتا ہے جیسے اناء الوضوء: رسولِ اکرم ﷺ نے برتن سے وضو فرمایا: موطا/تنویر: ۵۴-۵۵ یا صحابہ کرام میں سے کسی نے ایک برتن سے وضو کیا (مذکورہ بالا)

سونے چاندی کے برتنوں (آنیة الفضة و الذهب) میں کھانے پینے کی ممانعت کی بہت سی احادیث ہیں: موطا، کتاب الجامع؛ النہی عن الشرب الخ؛ تنویر، ۳/۱۱۰

ان میں سے بعض برتنوں کا نام ان کی وسعت وگنجائش کے حساب سے ہوتا تھا جیسے ایک مُد یا دو مد پانی کا برتن جو وضو وغیرہ کے حوالے سے آتا ہے۔ ایک صاع کے برتن کا ذکر بخاری و مسلم وغیرہ، کتاب الغسل/ کتاب الحیض، باب الغسل بالصاع/ باب القدر المستحب وغیرہ میں ہے۔ ازواجِ مطہرات اور رسولِ اکرم ﷺ اس قدر پانی سے غسلِ جنابت کر لیتے تھے:

- غسل ایک صاع یا پانچ مد اور وضو ایک مد سے فرماتے تھے: "کان النبی ﷺ یغتسل ... بالصاع الی خمسة امداد، ویتوضا بالمد"۔ حدیثِ بخاری: ۲۰۱؛ فتح الباری، ۱/ ۳۹۸؛

مسلم کی روایت میں لفظ مکوک/ جمع مکاکیک/ مکاکی بھی استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد بقول امام نوویؒ مد ہی ہے۔ ابن المثنیٰ نے اس کے معنی کنتور بتائے ہیں۔ دوسرا لفظ سفینہ بھی ہے جس سے آپ نے غسل فرمایا۔ (کتاب الحیض، باب القدر المستحب الخ)

الفرق بڑا برتن ہوتا تھا جس میں سولہ رطل پانی آتا تھا اور اس میں سے نہانے کے لیے پانی لینے کا ذکر ملتا ہے: رسولِ اکرم ﷺ غسلِ جنابت فرق نامی برتن سے کرتے تھے: "کان یغتسل من اناء – ھو الفرق – من الجنابة"

(موطا/تنویر، ۱/۶۶؛ بخاری، کتاب الغسل، باب غسل الرجل مع امراته؛ مسلم، مذکورہ بالا؛ ابوداؤد، کتاب الطھارۃ، باب المقدار الذی الخ وغیرہ: ستة عشر رطلا)

غسل یا وضو کے لیے مختلف مقدار میں پانی مختلف احوال و حالات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ تشریعی سہولت کا معاملہ ہے۔ برتنوں یا ظروفِ طہارت کی گونا گونی کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے لیے متعدد ظروف، جو مختلف مقداروں کے حامل ہوتے تھے، معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے مد، مدین، صاع، مکاکیک (مکوک/ مکاکی)، سفینہ کے علاوہ "الفرق" کا ان میں سے اوپر ذکر آچکا ہے۔ بعض دوسرے بھی ہیں۔

"ذنوب" ڈول کے معنی میں آتا ہے۔ بالعموم اس کے ذریعہ کنوئیں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ مختلف احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے:

- مشہور واقعہ ہے کہ ایک اعرابی نے مسجدِ نبوی میں ایک جگہ پیشاب کر دیا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس پر چیخنے سے منع فرمایا اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی بہا دینے کا حکم دیا: "...ثم امر رسول الله ﷺ بذنوب من ماء فصبّ علی ذلک المکان"

(موطا/تنویر، ۱/۸۴؛ بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول فی المسجد وغیرہ کتب؛ حدیث: ۲۲۰؛ فتح الباری، ۱/ ۴۲۱-۴۲۲؛ ترمذی، ابواب الطھارۃ، باب فی البول یصیب الارض وغیرہ: ابن حجرؒ: الدلو ملای ماء، قال ابن فارس: الدلوا لعظیمة وغیرہ)

"شراب ناب" کے لیے مختلف برتنوں اور ظروف کا ذکر ملتا ہے اور وہ مختلف چیزوں سے بنائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک شراب کی پکھال بھی ہوتی تھی جسے "راویة خمر" کہا گیا ہے۔ دراصل "راویہ" پانی کی پکھال کے لیے استعمال ہوتا ہے (مصباح اللغات)۔ شراب

بھی مشروب/ سیال ہے اس لیے اس کے لیے بھی اس لفظ کا استعمال ہوا اور شراب کے ساتھ خاص اضافت کردہ وضاحت کردی گئی۔ اسی طرح مزداۃ/مزداتین (تثنیہ) بھی بڑے مشکیزوں کے لیے آتا ہے جو پانی لانے کے لیے ہوتے ہیں اور ان میں شراب بھی لائی جاتی ہے۔ -رسولِ اکرم ﷺ کو ایک شخص نے مشکیزہ/ پکھال شراب پیش کی۔ آپ ﷺ نے اس کی اور اس کی خرید و فروخت کی حرمت بیان فرمائی تو صحابی موصوف نے دونوں مشکیزوں کے منہ کھول دیے اور ان کا سارا مال بہہ گیا: ''اهدیٰ رجل لرسول الله ﷺ راوية خمر... ففتح الرجل المزداتين حتى ذهب ما فيها'' (موطا، کتاب الاشربة، تحریم الخمر؛ تنویر، ۳/ ۵۷)

جرّۃ /جرار بھی پانی رکھنے کا گھڑا تھا جو شرابِ ناب کا بھی گھڑا بن جاتا تھا۔ اس کے متعلق ایک بہت اہم روایت ملتی ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ میں حضرات ابوعبیدہ بن جراح فہری قریشیؓ، ابوطلحہ انصاریؓ اور ابی بن کعب خزرجی انصاریؓ کو کھجور اور شیرۂ انگور (فضیخ وتمر) کی بنی ہوئی شراب پلا رہا تھا کہ اسی دوران منادیٔ نبوی نے اس کے پینے پلانے کی حرمت کے اعلان کا ڈھنڈورا پیٹا، حضرت ابوطلحہؓ نے مجھ سے کہا کہ انس اس گھڑے کو توڑ دو اور میں نے ایک نوکیلے پتھر سے اسے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا: ''... یا انس! قم الی هذه الجرار فاکسرها...'' (موطا، کتاب الاشربة، تحریم الخمر؛ تنویر، ۳/ ۵۷؛ الفضیخ کے تین معانی ملتے ہیں: ''شیرۂ انگور، کھجور کی شراب، بہت پانی ملا ہوا دودھ'' (مصباح اللغات)۔ شارحین نے اس سے بالعموم شیرۂ انگور ہی مراد لیا ہے۔ یعنی وہ کئی چیزوں کی ملی ہوئی شراب تھی۔ حدیث میں تمر کے اضافے سے بھی دوسرے معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔

الدباء والمزفت وغیرہ میں جن کی تعداد بالعموم چار ملتی ہے نبیذ بنانے سے روکا گیا کہ وہ شراب سازی کے لیے استعمال ہوتے تھے مگر بعد میں ان کو عام استعمال کرنے کی اجازت عطا فرمادی گئی۔ متعدد احادیث وروایات میں ان برتنوں کا ذکر ملتا ہے۔

(موطا، کتاب الاشربة؛ تنویر، ۳/ ۵۵-۵۶؛ الدباء لوکی یا کدو کو کھوکھلا کر کے اسے ایک خاص برتن میں ڈھال لیا جاتا ہے)

''مخضب'' نامی برتن سے رسولِ اکرم ﷺ کے وضو، غسل فرمانے کے کئی شواہد اور

احادیث وواقعات ملتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے کتاب الوضوء کے ایک باب کا عنوان متعدد برتنوں سے وضوفرمانے پر باندھا ہے، ان میں مخضب، قدح، خشب اور حجارہ کا ذکر ہے: باب الغسل والوضوء فی المخضب، والقدح والخشب والحجارة، حدیث: ۱۹۵؛ فتح الباری، ۱/۳۹۳ومابعد "عن انس، قال: حضرت الصلاة، فقام من کان قریب الدار الیٰ اھله، وبقی قوم، فاتی رسول الله ﷺ بمخضب من حجارة فیه ماء، فصغر المخضب ان یبسط فیه کفه، فتوضا القوم کلھم، قلنا: کم کنتم؟ قال: ثمانین وزیادة"۔

حافظ ابن حجرؒ نے "مخضب" کو وہ برتن قرار دیا ہے جس میں کپڑے دھوئے جاتے تھے اور کبھی اس کا اطلاق چھوٹے بڑے برتن پر بھی ہوتا تھا۔ "قدح" کا منہ تنگ ہوتا تھا اور وہ اکثر و بیش تر لکڑی کا ہوتا تھا۔ "مخضب" میں رسولِ اکرم ﷺ کی ہتھیلی نہیں پھیل سکی تھی۔ اس سے حافظ موصوف نے نتیجہ نکالا ہے کہ وہ چھوٹا یا چھوٹے منہ کا برتن ہوتا تھا۔ بہرحال اس میں یہ بھی ملاحظہ کرنے کی بات ہے کہ مخضب پتھر کا تھا۔ صاحب مصباح اللغات نے اس کے معنی بتائے ہیں: "کپڑے دھونے یا رنگنے کا برتن، لگن"۔ اس کے تنگ منہ ہونے کی بات نہیں کہی ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ اس کا منہ تنگ ہو اور برتن چھوٹا نہ ہو کیونکہ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے مرض الوفاۃ میں حضرت حفصہؓ کے "مخضب" سے غسل فرمایا تھا اور غسل کرنے کے لیے برتن کا بڑا ہونا ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اس حدیث میں دوسری وضاحت یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اس لگن میں بیٹھ گئے تھے اور اوپر سے پانی ڈالا گیا تھا۔ لہٰذا تنگ ہونا بھی ضروری نہیں ہے: "... واجلس فی مخضب لحفصة زوج النبی ﷺ..."

(بخاری، کتاب الوضوء، الوضوء من التور، حدیث: ۱۹۸۔ اس حدیث کے بہت سے اطراف ہیں؛ فتح الباری، ۱/۳۹۰-۳۹۱؛ مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب استخلاف الامام، حدیث: ۹۰(۴۱۸)؛ اس اختلاف معانی واطلاقات کا ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "مخضب" مختلف قسموں کے ہوتے تھے، بعض چھوٹے منہ کے، بعض بڑے بھاری برتن)

حافظ موصوف نے امام ابن خزیمہ کی روایتِ حضرت عائشہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ تانبے کا تھا: "انه کان من نحاس..." (نیز ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب الوضوء من صفر کے مطابق حضرت زینب بنت جحشؓ کا "مخضب" پیتل کا تھا: "کان لھا مخضب من صفر"

اور زوجہ محترمہ اسی میں رسولِ اکرم ﷺ کے گیسوؤں کو سنوارا کرتی تھیں: "کنت ارجل راس رسول الله ﷺ فیه" (الزوائد: اس کی سند صحیح ہے)۔ان روایات واحادیث سے متعدد باتیں ثابت ہوتی ہیں: مخضب (لگن) تنگ منہ والا برتن بھی ہوتا تھا، وہ پتھر کا بھی ہوتا تھا، وہ چھوٹا برتن بھی ہوتا، اور بڑا بھی، اور وہ تانبہ کا تو ہوتا ہی تھا، ممکن ہے اور دھاتوں کا بھی ہوتا ہو۔ وہ اتنا بڑا اور کھلا برتن ہوتا تھا کہ اس میں ایک قد آور شخص آرام سے بیٹھ کر غسل کر سکے۔ حضرت حفصہؓ کے مخضب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ازواج کے پاس بھی ایسے برتن تھے جن میں وہ کپڑے دھوتی، رنگتی یا نہاتی تھیں۔

جفنة (لگن)

پانی کے برتن یا غسل کے برتن کی حیثیت سے "جفنه" کا ذکر بعض روایاتِ حدیث میں ملتا ہے۔ مصباح اللغات میں اس کے کئی معانی دیے گئے ہیں: "بڑا پیالہ، وہ برتن جس میں شراب بنائی جائے، چھوٹا کنواں"۔ اس کی تین جمع بتائی ہیں: "جفن، جفان و جفنات" قرآن مجید، سورۂ سبا: ۱۳ میں "جفان کالجواب" (لگن جیسے تالاب) حضرت سلیمان علیہ السلام کے عظیم برتنوں کے حوالے سے آیا ہے۔ لیکن احادیث میں وہ لگن یا بڑی لگن کے معنی میں معلوم ہوتا ہے کہ پیالہ سے نہانا مشکل ہے خواہ کتنا ہی بڑا پیالہ ہو۔ لگن کے علاوہ وہ بڑے لمبے چوڑے طباق کے معنی بھی رکھتی معلوم ہوتی ہے کہ اس میں نہانے کے پانی کے علاوہ کھانے - کافی مقدار میں کھانے - کے ہدایائے طعام کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بڑی لگن ہی ہوتی ہوں جن کو کھانے کی کثیر مقدار رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو جیسے ناند جیسی چیزیں آج استعمال ہوتی ہیں۔

- حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی نے غسلِ جنابت کیا اور اس میں پانی باقی بچ گیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے وضو کرنا چاہا تو زوجۂ مطہرہ نے ماجرا کہہ سنایا۔ فرمایا کہ پانی تو جُنبی نہیں ہوتا: "اغتسل بعض ازواج النبی ﷺ فی جفنة، فاراد رسول الله ﷺ ان یتوضأ منه... الخ"

(ترمذی، کتاب الطهارة، باب الماء لایجنب؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الماء لایجنب؛ ابن

ماجہ، کتاب الطھارۃ ، باب الرخصۃ بفضل وضوء المرأۃ : بعض روایات آخر کے مطابق یہ زوجہ مطہرہ حضرت میمونہ تھیں یا ان کے بچے ہوئے پانی سے آپ ﷺ نے وضو فرمایا تھا)

- مسلم کی ایک حدیث: ۲۲۲ (۱۱۷۰) میں چاند کو جفنہ کے ایک پہلو سے "مثل شق جفنۃ" مشابہ قرار دیا گیا ہے: اور شارحِ گرامی نے جفنہ کے معنی قصعۃ کے بتائے ہیں (کتاب الصیام، باب فضل لیلۃ القدر) جو پیالے کے معنی میں آتا ہے۔ بہر حال متعدد روایات میں "جفنہ" نہانے یا وضو وغیرہ کرنے کے ایک بڑے برتن کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اسے ایک بڑی لگن کہا جا سکتا ہے اور بالعموم اردو میں لگن ہی کہا جاتا ہے۔ جس طرح بعض دوسرے ظروف طہارت کو بھی لگن ہی کہا گیا ہے۔

مِرْکَن (لگن)

مصباح اللغات میں اس کے معنی ہیں: "لگن، کپڑے وغیرہ دھونے کا ٹب"، اس کی جمع مراکن بتائی ہے۔ بعض احادیث میں اس کا ذکر غسل کے برتن کی حیثیت سے آتا ہے۔

- حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور رسولِ اکرم ﷺ ایک ہی لگن سے نہاتے تھے:

"رأیتنی و رسول اللہ ﷺ نغتسل من مرکن واحد نفیض علی ایدینا..."

(نسائی، کتاب الطھارۃ، باب اغتسال الرجل والمرأۃ من نسائہ من اناء واحد)

"مرکن" اور جفنۃ بہر حال دو الگ ساخت کے برتن پا کی تھے۔ اردو ترجمہ لگن سے ان کی نوعیت نہیں کھلتی ہے۔ شارحین گرامی نے ان دونوں کو بالعموم مترادف سمجھ کر وضاحت وتشریح کی ہے۔ ان کی ساخت ہی ان کے نام کے اختلاف کی وجہ تھی۔ یہ بہر حال واضح بات ہے۔

مطہرہ

مطہرہ وضو خانہ کے معنی میں آتا ہے اور وضو کے برتن کے معنی میں بھی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس سے وضو کیا کرتے تھے اور دوسری احادیث میں ذکر آتا ہے کہ مرد و عورت اجتماعی طور سے عہدِ نبوی میں ایک ہی وضو خانے سے وضو کیا کرتے تھے، اگرچہ بعض

احادیث میں لفظ مطہرہ کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ بہر حال یہ سماجی اور دینی روایت عہد نبوی کے بعد بھی دوسرے اسلامی ادوار میں جاری رہی جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ صاحب مصباح اللغات نے میضأة کی طرح مِطهرہ کے بھی دو معانی دیے ہیں: ''لوٹا، طہارت حاصل کرنے کا مکان''۔ بہر حال بخاری کی حدیث: ۱۹۳ کے مطابق مرد وعورت عہدِ نبوی میں ایک ساتھ وضو کرتے تھے: ''کان الرجال والنساء یتوضؤون فی زمان رسول الله ﷺ جمیعا''؛ فتح الباری، ۱/ ۳۹۰-۳۹۱۔ حافظ موصوف کے مطابق بعض روایات یہ بتاتی ہیں کہ ہم مرد وعورت ایک ہی برتن سے وضو کرتے تھے اور باری باری سے اس میں ہاتھ ڈالتے تھے: ''من اناء واحد.. ندلی فیه ایدینا''۔ حافظ ابن التین کا قول نقل کیا ہے کہ ایک ساتھ وضو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مرد وعورت ایک ساتھ ایک جگہ وضو کرتے تھے ''معناه ان الرجال والنساء کانوا یتوضؤون جمیعا فی موضع واحد، هؤلاء علیٰ حدة، وهؤلاء علیٰ حدة...''۔ حافظ موصوف نے دیگر تشریحات بھی نقل کی ہیں اور ان سب پر حجاب کا سایہ ہے۔ کوشش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ وہ حجاب کے نزول سے قبل کا معاملہ ہے یا الگ الگ پردے میں بیٹھتے تھے۔ لیکن یہ تمام تشریحات بر بنائے تعمق وتقویٰ ہیں۔ روایات ثابت کرتی ہیں کہ وضو خانہ ایک تھا اور پانی کا ذخیرہ بھی ایک تھا۔

وضو خانے کے معنی میں مطہرہ کی مثال امام مسلم کی روایتِ حضرت ابو ہریرہؓ ہے کہ انھوں نے کچھ لوگوں کو مطہرہ سے وضو کرتے ہوئے دیکھا: ''عن ابی هریرة انه رأی قوما یتوضؤون من المطهرة ... الخ (مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب غسل الرجلین بکما لهما) یہی روایت بعض الفاظ کے فرق کے ساتھ بخاری میں بھی ہے: ''سمعت ابا هریرة، وکان یمرّبنا، والناس یتوضؤون من المطهرة ... الخ''

(کتاب الوضوء، باب غسل الاعقاب، حدیث: ۱۶۵؛ فتح الباری، ۱/ ۳۵۰: حافظ موصوف نے اسے برتن کے معنی میں ہی لیا ہے: الاناء المعد للتطهر منه'' نیز ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الوضوء جمیعا، حدیث: ۷۹ وغیرہ)

ایسا لگتا ہے کہ مطہرہ اصلاً وضو کرنے کے لیے خاص قسم کا برتن تھا جیسے آج کل ٹونٹی دار

لوٹے مساجد میں ہوتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں ان سے مرد و عورت کے ساتھ ساتھ وضو کرنے کا رواج تھا اور وہ اجتماعی طور سے خواہ الگ الگ جماعتوں میں اس سے وضو کرتے تھے۔ بعد میں مطہرہ میں وضو خانے کے معنی داخل ہو گئے جب مسجدوں میں خاص طور سے وضو خانے بنائے جانے لگے۔ متونِ احادیث سے بہر حال ان کے وضو خانے ہونے کا معنی نہیں نکلتا ہے۔

میضأة (وضو کا برتن)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کرنے کا خاص برتن بھی ہوتا تھا جسے میضأة کہا جاتا تھا۔ مصباح اللغات میں اس کے دو معانی دیے ہیں: ایک لوٹا، دوسرے وضو کرنے کی جگہ۔ غالباً یہ دونوں معانی صحیح ہیں اور دونوں پر میضأۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔

- میضأة بمعنی برتنِ وضو کی مثال یہ روایت ہے: حضرت ربیع بنت معوذؓ فرماتی ہیں کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے وضو کا لوٹا لائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: پانی گراؤ، میں نے پانی گرایا تو آپ ﷺ نے وضو فرمایا: "عن الربیع بنت معوذ قالت: أتیت النبی ﷺ بمیضأة، فقال: اسکبی. فسکبت، فغسل وجهه... الخ"

(ابن ماجہ، کتاب الطهارة الخ، باب الرجل یستعین علی وضوئه الخ، حدیث:۳۹۰)

- حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ایک باغ میں داخل ہوئے اور آپ کے پیچھے ایک غلام/لڑکا گیا جس کے پاس ایک وضو کا لوٹا تھا وہ ہم میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے لوٹا ایک بیری کے پاس رکھ دیا: "... وتبعه غلام معه میضأة..."

(مسلم، کتاب الطهارة، باب الاستنجاء بالماء الخ)

- میضأة بمعنی وضو کے برتن کی مثالِ دیگر یہ ہے کہ دورانِ سفرِ خیبر رسولِ اکرم ﷺ اور تمام دیگر صحابہ سو گئے اور نمازِ فجر قضا ہو گئی۔ بہر حال رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ابو قتادہؓ سے ایک وضو کا لوٹا مانگا جس میں تھوڑا پانی تھا: "ثم دعا بمیضأة کانت معی فیها شیء من ماء..."

(مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب قضاء الصلاة الفائتة؛ حدیث:۳۱۱(۶۸۱)

میضأة کا بطور وضو خانہ استعمال احادیث سے نہیں ثابت ہوتا یعنی وضو کرنے کی خاص

جگہ کا معنی- غالبًا یہ بعد کا تمدنی ارتقاء ہے جو "میضاۃ" کے معانی کو وسیع تر کر گیا ورنہ اس کے اصل معنی وضو کرنے کے برتن ہی کے ہیں جس طرح "مطھرہ" کے معنی طہارت/ وضو کرنے کے برتن کے ہیں۔ ان دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے مگر اصلاً مراد ایک ہی ہے: وضو کے برتن مطہرہ میں بھی وضو خانے کے معنی کا اضافہ بعد کا ہے۔ ان دونوں کا عہد نبوی میں اس معنی میں استعمال نہیں تھا کیونکہ ابھی تک کوئی روایت ایسی نہیں مل سکی جو عہد نبوی کے دوران وضو خانوں کا ذکر کرتی ہو سوائے ساتھ ساتھ "اناء واحد" سے وضو کرنے کے۔

طست

"طست" کے متعدد اشکال ہیں جیسے الطسّ، الطِسَّة، الطَسَّة وغیرہ۔ صاحب مصباح اللغات نے اس کے معنی بتائے ہیں: "ہاتھ دھونے کے لیے تانبے کا برتن، سلفچی..." حدیث و روایت سیرت میں اس کے عام معنی طشت کے آتے ہیں جس کا مختلف استعمال ہوتا تھا جیسے:

پانی رکھنے کا طشت: جس کے اندر آبِ زمزم رکھ کر رسولِ اکرم ﷺ کا سینۂ مبارک چاک کر کے قلبِ مبارک دھویا گیا تھا۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلاۃ فی الاسراء؛ حدیث:۳۴۹: "... فنزل جبریل ففرج صدری، ثم غسله بماء زمزم ثم جاء بطست من ذهب ممتلیء حکمة و ایمانا فافرغه فی صدری ثم اطبقه"... الخ؛ فتح الباری، ۱/۵۹۵-۵۹۷ وما بعد نیز دیگر اطراف؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء: "طست من ذهب"؛ ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب صفة وضوء النبی ﷺ، احادیث: ۱۱۱-۱۱۷؛ نسائی، کتاب الطهارة، باب غسل الوجه)

- رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت علیؓ نے وضو کیا تو طست کے پانی سے کیا: "فأتاه الغلام باناء فیه ماء و طست..."

طستِ طہارت

- رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے مرض الوفات کے آخری دن طست منگوایا... "فدعا بطست" (بخاری، کتاب الوصایا، باب الوصایا) اور اسی کے بعد آپ ﷺ نے انتقال فرمایا۔

نسائی کی روایت میں اضافہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے طست اس لیے منگوایا تھا کہ اس میں پیشاب کریں اور اس کے بعد ہی حالت دگرگوں ہوگئی...: "لقد دعا بطست لیبول فیها فانخشت نفسه" (کتاب الطهارة، البول فی الطست)

- حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ کے واقعۂ اسلام میں ذکر آتا ہے کہ طست میں پانی منگوا کر نجاشی نے ان کا خون دھویا تھا: و دعالی بطست فغسل منی الدم [النجاشی] (واقدی، ۷۴۴)

خواتین بھی طست کا استعمال کرتی تھیں مگر دوسرے طریقہ سے۔ ان میں سے جس کسی کو استحاضہ کی بیماری ہوتی تھی وہ اپنے نیچے طست رکھ لیتی تھیں اور نماز پڑھتی رہتی تھیں۔ زائد خون اس طست میں گرتا رہتا تھا۔ یہ کئی روایات میں اور کئی کتب حدیث میں آیا ہے۔

(بخاری، حدیث: ۳۰۹-۳۱۰؛ فتح الباری، ۱/۵۳۳-۵۳۴؛ ابوداؤد، کتاب الصیام، باب الاعتکاف وغیرہ، حدیث: ۲۴۷۶ وغیرہ)

طست یا طشت اصلاً ایک برتن ہوتا ہے جو وسیع چپٹے انداز کا اور لگن کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس کا استعمال مختلف ہوسکتا تھا اور ہوتا تھا۔ وہ پانی رکھنے کے کام بھی آتا تھا، اس کو بطور ظرفِ بول بھی استعمال کیا جاتا تھا، خواتین کی طہارت کا برتن بھی بن جاتا ہے۔ اور یہی صرف استعمالات نہ تھے، بعض دوسرے بھی تھے۔ اصل معروف معنی طشت کے ہیں اور استعمال سے اس کا تعلق نہیں۔

تَور

وضو کرنے کے حوالے سے ایک برتن - تَور - کا بھی ذکر آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنا دستِ مبارک "تور" میں ڈالا اور اس سے قبل تور سے پانی ہاتھوں میں ڈال کر دھویا اور پھر اس میں ہاتھ ڈال ڈال کر پانی نکالتے گئے اور وضو کرتے گئے: "... فدعا بتور من ماء فکفا علی یدیه فغسلهما ثلاث مرار ثم ادخل یده فی التور فمضمض.. ثم ادخل یده... الخ"

(حدیثِ بخاری-۱۹۹؛ فتح الباری، ۱/۳۹۶-۳۹۷؛ مصباح اللغات: چھوٹا برتن، (جھوٹا برتن چھپ گیا ہے غلطی سے)۔

مذکورہ بالا حدیث میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ کے وضو کرنے کا ذکر ہے جو انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کا طریقۂ وضو دکھانے کے لیے کیا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے "تور" کو "طست"

کے مشابہ قرار دیا ہے اور اس کی ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ وہ طست ہی کے معنی میں ہے۔ پھر اس پر محاکمہ کیا ہے کہ حدیثِ معراج میں لفظ طست آیا ہے لہٰذا اس برتن میں فرق معلوم ہوتا ہے اور ترادف کا بھی احتمال ہے گویا کہ طست تور سے بڑا برتن تھا: "... شبه الطست، وقيل هو الطست... وظاهره المغايرة بينهما، ويحتمل الترادف، وكأن الطست اكبر من التور."

بعض دوسرے صحابہ کرام کے تور سے وضو کرنے کا ذکر دیگر احادیث میں ملتا ہے:

- حضرت علی بن ابی طالبؓ نے بعد کے زمانے میں کسی وقت تور سے وضو فرمایا اور دوسری روایت کے مطابق طست سے وضو فرمایا۔ (نسائی، كتاب الطهارة، باب غسل اليدين/غسل الوجه بالترتيب؛ حضرت موصوف نے وضو نبوی کی کیفیت دکھانے کے لیے وضو فرمایا تھا۔ ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب صفة وضوء النبي ﷺ، حدیث: ۱۱۷) بہر حال طست اور تور سے وضو کرنے کے دو الگ الگ واقعات تھے۔

کوز (کوزہ)

- ابوداؤد کی ایک حدیث: ۱۱۳ میں اسی کو "کوز" کہا گیا ہے جس کے معنی مصباح اللغات میں کوزہ کے ہیں۔ وہ عام کوزہ سے بڑا ہوتا ہوگا جس سے حضرت علیؓ نے وضو فرمایا تھا۔ حضرت علیؓ کے وضو کرنے کے سلسلہ میں احادیثِ ابی داؤد ۱۱۱-۱۱۷ میں کئی برتنوں کے نام ہیں جیسے طست، طست (دوسری بار-۱۱۲)، "کوز"، "تور" اور ان کے علاوہ عام لفظ "اناء" بھی لایا گیا ہے۔

- حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے پیشاب فرمایا تو حضرت عمرؓ نے پانی کا کوزہ پیش کیا تا کہ آپ وضو فرمالیں۔ فرمایا کہ مجھے ہر بار پیشاب کے بعد وضو کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، اگر میں نے کیا تو وہ سنت بن جائے گی: "... فقام عمر خلفه بكوز من ماء... قال: ما أمرت كلما بلت ان اتوضأ، ولو فعلت لكانت سنة"

(ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب الاستبراء)

پانی کھینچنے کے برتن

عہدِ نبوی میں پانی کے خاص ذخیرے کنوئیں تھے: مکہ مکرمہ میں بھی ان کی کافی تعداد تھی

اور مدینہ میں بھی۔ ان کا تفصیل سے ذکر آ چکا ہے۔ ان کنوؤں کے علاوہ بھی بعض دوسرے آبی ذخائر تھے جیسے تالاب اور چشمے وغیرہ۔ مگر ان کا معاملہ محدود تھا کہ وہ خاص خاص علاقوں میں تھے اور ان کا استعمال بھی ان لوگوں تک ہی محدود تھا۔ بہرحال ان کنوؤں سے پانی کھینچنے کے بھی کچھ خاص ظروف اور برتن اور چیزیں ہوتی تھیں۔ ان میں سب سے عام دو چیزیں تھیں: ایک ڈول اور دوسری رسی جس سے ڈول کو باندھا جاتا تھا اور اسی کے ذریعہ ڈول کو کنوئیں میں اتارا جاتا تھا اور اس میں پانی بھر جانے کے بعد اسے اوپر کھینچ لیا جاتا تھا۔ اس طرح ڈول بنیادی طور سے پانی کھینچنے کا برتن تھا۔

ڈول کے لیے عام اور مستند ترین لفظ "دلــو" ہے جس کی متعدد جمع ہیں: دلاء، ادل، دلـــی وغیرہ۔ مصباح اللغات کے مطابق وہ کبھی مذکر استعمال کیا جاتا ہے مگر اصلاً عربی لغت و زبان میں وہ مونث ہے۔ ڈول کی مختلف قسمیں تھی اور ان اقسام وانواع کا نام ان کی ساخت اور ان کے خام مواد، جس سے وہ بنائے جاتے تھے، پڑا تھا۔ احادیث اور روایاتِ سیرت میں ان کے یہ مختلف النوع اسماء خوب آتے ہیں۔ ان کا ذکر روایات واحادیث سے ان کے خاص تمدنی تناظر میں آگے آرہا ہے مگر ان کی بعض معروف اقسام کا ذکر بطور تعارف یہاں کیا جاتا ہے:

-"ذنــوب" دوسرا لفظ ہے جو "دلــو" کے مترادف کے بطور آتا ہے۔ غالباً وہ دمدار ڈول ہوتا تھا جس کا نچلا حصہ اوپری سطح کے مطابقہ میں پتلا اور دم کی مانند ہوتا تھا۔

-سَجل: صاحب مصباح اللغات نے "السجل" کے معنی لکھے ہیں: "بڑا ڈول جس میں پانی ہو"۔ غالباً یہ معنی عطیہ/سخاوت وغیرہ کے معانی کے اس میں محاوراتی شمولیت کے بعد آئے ہیں، ورنہ اصلاً بڑا ڈول ہے۔

ذَنوب

"ذَنُــوب" کی ایک اور مشہور ترین حدیث کا تعلق رویائے نبوی سے ہے اور اس کی تعبیر خلافتِ شیخین نکالی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے دیکھا کہ آپ ﷺ ایک کنوئیں سے پانی نکال/کھینچ رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی مدد کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ آ گئے

اور انھوں نے خاصی کمزوری کے ساتھ ایک دو ڈول پانی کھینچا کہ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے خوب ڈول کھینچے اور طاقت کے ساتھ اتنا پانی نکالا کہ سب سیراب ہو گئے: "... رایتنی علی قلیب علیها دلو، فنزعت منها ماشاء الله، ثم اخذها ابن ابی قحافة فنزع بها ذنوبا او ذنوبین، وفی نزعه ضعف ... فأخذها ابن الخطاب، فلم ار عبقریا من الناس ینزع نزع عمر، حتی ضرب الناس بعطن" (حدیث بخاری: ۳۶۷۶، ۷۰۲۱، ۷۴۷۵؛ فتح الباری، ۲۴/۷-۲۸ ومابعد؛ نیز دیگر کتب حدیث مسلم وغیرہ بحث کے لیے: "وحی حدیث"، ۹۶-۱۰۰) "فنزع بها ذنوبا او ذنوبین" کے متن سے بھی دلو اور ذنوب کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ دلو کے ذریعہ جب پانی بھر کر کھینچا گیا تو اسی دلو کو ذنوب کہا گیا اور ایک ذنوب اور دو ذنوب نے تو یہ فرق بالکل واضح کر دیا ہے۔

دلــو (ڈول) جس کی مختلف جمع آتی ہے۔ وہ کنوئیں سے پانی کھینچنے کا برتن ہوتا تھا۔ وہ دھات کا بھی ہوتا تھا اور چمڑے کا بھی۔ "ذنـــوب" خلافت کے ضمن میں اس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد دوسری احادیث وروایات میں بھی آتا ہے۔ جیسے اعرابی کے مسجد میں پیشاب کے واقعہ میں دلو کا لفظ بھی بعض روایات میں ہے: وہ ترمذی میں سَجل یا دلو ہے، اور بخاری وغیرہ میں ذنوب یا سجل ہے۔ ان تینوں الفاظ اور ان کے استعمالات سے ان کے اطلاقات لغوی کے علاوہ دوسرے معاشرتی اور تمدنی امور کا بھی پتہ چلتا ہے۔

- حجۃ الوداع میں رسولِ اکرم ﷺ کے لیے چاہ زمزم سے پانی ایک ڈول (دلـــو) کے ذریعہ ہی نکالا گیا تھا (واقدی، ۱۱۱۰)۔ "سَجل" (بڑا ڈول جس میں پانی ہو)۔ بخاری کی حدیث میں ذنوب کے ساتھ سجل کا لفظ بھی اعرابی کے پیشاب کرنے سے متعلق روایت میں آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس پر ڈول بھر- بڑے ڈول بھر- پانی بہا دو۔

(حوالہ ذنوب کی بحث میں؛ فتح الباری، ۴۲۲/۱: ابوحاتم سجستانی: "هو الدلو ملأی ..."؛ ابن درید: "السجل دلو واسعة؛ صحاح: الدلو العظیمة۔ بہر ال وہ بڑے ڈول کے معنی میں ہے۔

- سورج گرہن کی طویل نماز نبوی کے دوران کئی صحابہ کرام بیہوش ہو کر گر گئے۔ ان کو ہوش میں لانے کے لیے ان پر پانی کے کئی ڈول ڈالے گئے: "حتی ان سجال الماء لتصب علیهم"، (ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب صلاة الکسوف، حدیث: ۱۱۷۷)

پانی رکھنے کے برتن

پانی لانے لیجانے اور ذخیرہ کرنے کیلیے بالعموم چمڑے کے برتن ہوتے تھے جن کا عام اردو نام مَشک/مشکیزہ ہے۔ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے ظروف ہوتے تھے اور چمڑے کے علاوہ دوسری چیزوں کے بنے ہوتے تھے۔ان میں دھاتیں بھی شامل تھیں اور دوسری چیزیں بھی۔ان کا ذکر ذیل میں بعض سماجی پس منظر اور تناظر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔بالعموم چھوٹے مشکیزوں کے منہ کو دھاگے سے باندھ دیا جاتا تھا جسے شنق/اشناق کہا جاتا تھا اور ان کو کسی کھونٹی سے لٹکا دیا جاتا تھا اور اس کے دھاگے کو بھی شنق کہا جاتا تھا۔

(نہایہ،۲/۲۳۹؛ واقدی،۹۹۱؛ مصباح اللغات میں شنق فعل کے معنی ''مشکیزہ کو سر بند باندھ کر دونوں ہاتھوں سے سر بند کو پکڑنے'' کے ہیں اور سر بند کرنے کے بھی)

شَن (چھوٹی پرانی مشک)

صاحب مصباح اللغات نے مذکورہ بالا معنی دینے کے بعد ''قربۃ اشنانٌ: پرانی مشک'' معنی بتا کر کہا ہے کہ ''ہر جزء کو مشک قرار دے کر ''اشنان'' جمع لاتے ہیں۔'' روایاتِ سیرت اور احادیث میں بہر حال اس کے چھوٹی مشک یا مشکیزے کے آتے ہیں۔اور ان ہی معنوں میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔بالعموم پانی پلانے والے اور بالخصوص خواتین خدمت ان کو اپنی کمروں پر لاد کر پیاسوں کو پانی پلاتے تھے۔اس کا مؤنث شنۃ بھی بعض روایات سیرت وحدیث میں استعمال کیا گیا ہے اور معنی غالبًا یکساں ہے۔

شنِّ نبوی

شنِّ نبوی کا ذکر متعدد احادیث میں ملتا ہے اور ان میں عہد ابراہیمی سے عہد نبوی تک ان اسباب تمدن کے تسلسل کا اثبات کیا جاتا ہے جیسے حدیثِ بخاری: ۳۳۶۳ میں حضرت ہاجرہ والدۂ حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی مشک کا ذکر ہے:''معها شنة لم يرفعه''

(فتح الباری،۶/۴۷۸وغیرہ)

حدیثِ بخاری: ۱۳۸: رسولِ اکرم ﷺ نے صلوٰۃ اللیل (نمازِ شب) کے لیے حضرت میمونہؓ کے گھر میں اٹھ کر ایک آویزاں مشکیزہ سے ہلکا پھلکا وضو فرمایا: "... قام النبی ﷺ فتوضأ من شن معلق وضوءا خفيفاً" ۔اسی سے رسولِ اکرم ﷺ کی مانند نوخیز ابن عباسؓ نے بھی وضو کیا تھا۔ (فتح الباری، ۱/۳۱۴-۳۱۵؛ یہ حدیث متعدد کتب حدیث میں آئی ہے)

- حدیثِ بخاری: ۵۶۱۳ میں حضرت ابوالہیثم بن التیہان کی پکھال کو "شنہ" کہا گیا ہے جس سے رسولِ اکرم ﷺ نے پانی پیا تھا۔ (فتح الباری، ۱۰/۹۵-۹۷)

غزوات کے حوالے سے بھی مشکیزہ کا ذکر ملتا ہے یعنی "شن" کا:

- غزوۂ احد، ۳/۶۲۵ میں حضرت ام عمارہ انصاریؓ اپنے شوہر حضرت غزیہ بن عمرو مازنی نجاری اور دو فرزندوں کے ساتھ صبح صبح اپنی مشک (شن) لے کر میدان جنگ پہونچ گئی تھیں۔ اس مشکیزے سے انھوں نے متعدد زخمیوں کو پانی پلایا تھا اور جنگ میں باقاعدہ حصہ بھی لیا تھا۔

(ابن سعد، ۸/۴۱۲-۴۱۳؛ بخاری، کتاب المغازی، غزوہ احد؛ فتح الباری، ۷/۴۵۷؛ تفصیل کے لیے "رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین، ۹۷-۹۸)

- غزوۂ تبوک میں مسلمانوں نے اور رسولِ اکرم ﷺ نے ایک چشمہ سے مشکیزہ میں پانی بھرا تھا۔ (واقدی-۱۰۱۲: القربة الخلصة، بحواله شرح الواهب اللدنيه، ۳/۸۹)

قِربة / قِرَب (مشک)

پانی رکھنے کی بڑی مشک کہلاتی تھی۔ اس میں پانی اس کے سرچشموں سے لایا بھی جاتا تھا اور گھروں میں رکھا بھی جاتا تھا۔ متعدد روایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرب اور عہدِ نبوی کا ایک عام، رائج اور کثیر الاستعمال برتن اور ظرف تھا۔ قربہ/ قرب بھی شن/ شنہ کی مانند چمڑے کے بنے ہوتے تھے مگر ان دونوں میں فرق کا پتہ لگانا مشکل ہے سوائے اس کے کہ ان دونوں کی ساخت الگ ہوتی تھی۔ ان میں لمبائی چوڑائی کے علاوہ دوسری چیزوں کا فرق بھی ممکن ہے۔ مصباح اللغات کے مطابق القربۃ مشک ہے اور قِرَب اس کی جمع، دوسری جمع بھی ہیں۔

مشک سے نہانا

حدیثِ بخاری-۱۹۸ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے مرض الوفاۃ میں سات مشکوں سے غسل فرمایا تھا۔ آپ ﷺ حضرت حفصہؓ کے مخضب (لگن) میں بیٹھ گئے تھے اور سرِاقدس اور جسمِ اطہر پر سات مشکیزوں کا پانی ڈالا گیا تھا۔ غالباً اتنی زیادہ مقدار میں پانی سے نہانے کی حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ شدید بخار سے تپ رہے تھے اور نہانے سے تپ کم ہوگئی تھی: "... هريقوا عليّ من سبع قرب لم تحلل او كيتهن... الخ " (فتح الباری، ۱/۳۹۵-۳۹۶)۔ حافظ موصوفؒ نے امام خطابیؒ کی تشریح نقل کی ہے کہ سات کے عدد کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں تبرک کا عنصر بھی ہے کیونکہ بہت سے امورِ شریعت میں اور اصلِ خلقت میں بھی اس کا دخل پایا جاتا ہے:"يشبه ان يكون خص السبع تبركا بهذا العدد، لانه له دخولا في كثير من امور الشريعة واصل الخلقة" ۔لیکن امام طبرانیؒ کے اضافۂ حدیث سے، حافظ موصوف نے جسے مابعد نقل کیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مختلف کنوؤں سے (من آبارِ شتّی) سے منگوایا تھا۔ لہٰذا حافظ موصوف کا وہ بیان زیادہ صحیح ہے کہ وہ دوا علاج کے غرض سے تھا: "والظاهر ان ذلك للتداوى" جیسا کہ دوسری روایتِ صحیح میں ہے کہ شاید مجھے آرام ملے اور میں لوگوں سے مل سکوں:"لعلي استريح فاعهد" ۔لفظ آخر کا مطلب وصیت ونصحت کا لیا ہے اور وہ بھی صحیح ہے۔

مشک سے پانی پینا

"قربہ" (مشک) میں پانی رکھا جاتا تھا اور اس سے پیا بھی جاتا تھا۔ بعض احادیث میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مشک کے منہ میں منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا:"نهى رسول الله ﷺ عن الشرب من فم القربة او السقاء..." (بخاری، كتاب الاشربة، باب الشرب من فم السقاء)۔ غالباً یہ عام ممانعت ہے اور نظافت وطہارت مزید کی غرض سے ہے، ورنہ بعض دوسری روایات سے مشک کے منہہ میں منہہ لگا کر پانی پینے کے واقعات ملتے ہیں۔

قــربة (مشکیزہ) کا ذکر کئی صحابہ کرامؓ کے استعمالی برتن کی حیثیت سے متعدد روایات و احادیث میں آتا ہے: چھوٹی مشکوں کو بالعموم ان کے مونہوں کو دھاگے سے باندھنے کے بعد دوسرے دھاگے سے کھونٹیوں پر لٹکایا/ ٹانگ دیا جاتا تھا۔ (نہایہ، ۲/۲۴۹)

- حضرت ابن الفراسیؓ ایک شکاری تھے اور ان کے بیان کے مطابق ان کے پاس ایک مشکیزہ تھا جس میں وہ پانی رکھتے تھے اور بحری پانی سے بھی اسے بھرتے تھے: "کـنـت اصيـد، وكانت لى قربة اجعل فيها ماء، وانى توضأت بماء البحر الخ"

(ابن ماجہ، كتاب الطهارة، باب الوضوء بماء البحر)

- حضرت فاطمہؓ کے سامانِ زیست میں بھی ایک قربہ (مشکیزہ یا چھاگل) کا ذکر ملتا ہے۔

(بلاذری، ۱/۲۲۰)

غزواتِ نبوی کے حوالے سے قربہ/ قرب صحابیات و ازواج مطہرات کا ذکر زیادہ آتا ہے۔ امام بخاریؒ وغیرہ نے اس کے خاص عنوان سے ابواب جہاد باندھے ہیں جیسے: "بـاب حـمـل النساء القرب الى الناس فى الغزو وغيره"۔ دراصل وہ ایک عام اور ضروری شے تھی۔

- غزوۂ احد میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام سلیمؓ دونوں اپنی اپنی مشکوں/ قرب سے مسلمان مجاہدین کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے رہی تھیں: حدیث بخاری: ۲۸۸۰: "... تـنـقـلان الـقـرب عـلـىٰ متـونـهـمـا ثم تفرغانه فى افواه القوم، ثم ترجعان فتملأنها ثم تـجـيـئـان فـتـفـرغانه فى افواه القوم"، مع اطراف حدیث: ۲۹۰۲، ۳۸۱۱، ۴۰۶۴۔ یہ مسلسل خدمت تھی)

- اسی غزوہ میں حضرت ام سلیطؓ نے اپنے مشکیزے سے مجاہدین اسلام کو، جن میں حضرت عمر فاروقؓ شامل تھے، پانی پلایا تھا۔ ان کے اس حسنِ خدمت کو حضرت عمر فاروقؓ نے تا زندگی یاد رکھا اور اپنے عہدِ خلافت میں اس کے عوض خاص انعام دیا۔

(حدیث بخاری: ۲۸۸۱: "... فـانهـا كانت تزفر لنا القرب يوم احد" نیز طرف حدیث: ۴۰۷۱؛ فتح الباری، ۶/۹۷ و مابعد)

- اور صرف یہی تین خواتین اسلام نہیں تھیں جو اپنی اپنی مشکوں/ قِرب کے ساتھ خدمت

انجام دے رہی تھیں۔ غزوۂ احد میں ان کے علاوہ اور بھی متعدد خواتین اپنی مشکیں لے کر پہونچ گئی تھیں اور خاص طور سے وقت شکست وریخت میں زخمیوں کو اپنی مشکوں سے پانی پلاتی تھیں۔

- ان کے علاوہ دوسرے غزواتِ نبوی میں ان خواتین کی خدمت اور ان کی مشکوں کا ذکر صراحت کے ساتھ یا مضمر طور سے ملتا ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین کا باب غزوات نبوی میں خواتین، ۹۱-۱۲۰)

- صحابۂ کرام کے مشکیزوں/قربۃ کا ذکر بھی بہت سی احادیث میں ملتا ہے جیسے حدیث مسلم: ۳۱۲ (۶۸۲) کے مطابق ایک غزوہ کے دوران ایک بدوی خاتون کے عظیم الشان پکھالوں سے اسلامی لشکر میں موجود ہر مشکیزہ (قربہ) اور ہر برتن (اداوہ) بھر لیا گیا تھا۔

سطیحہ (توشہ دان)

"سطیحة" نامی بھی ایک برتن ہوتا ہے جس کا ذکر نبیذ کے برتن کی حیثیت سے روایات واحادیث میں آتا ہے۔ مصباح اللغات میں اس کا مطلب "توشہ دان" لکھا ہے۔ ابن ماجہ کی روایت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ سے جنات سے ملاقات کی رات پانی طلب فرمایا تو انھوں نے عرض کیا کہ پانی تو نہیں مگر سطیحہ میں تھوڑی نبیذ ضروری ہے: "... الا نبیذا فی سطیحة..."

(ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب الوضوء بالنبیذ ؛ اس کو ضعیف روایت بھی قرار دیا گیا ہے۔ ابوداود، کتاب الطهارة، باب الوضوء بالنبیذ، حدیث: ۸۴ میں عام لفظ اداوۃ ہے جو اناء کی طرح برتن کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے)

جرّار (گھڑا)

جرہ واحد ہے جس کے معنی گھڑا ہیں۔ وہ بالعموم مٹی کا ہوتا ہے اور آگ میں پکا لیا جاتا ہے۔ احادیث میں اس کی متعدد قسمیں ملتی ہیں۔ اس کے مختلف سائز بھی ہوتے تھے: بڑے مٹکے نما اور چھوٹے گھڑے، اور ان کے رنگ و روغن کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان میں سفید گھڑے ہوتے

تھے اور سبز بھی۔ دوسرے رنگوں کے بھی ہوتے تھے۔ غالباً ان کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا جاتا تھا اور ان پر مختلف قسم کے نقش ونگار بھی بنائے جاتے تھے۔ اس کا امکان ہے کہ بعض گھڑے پتھروں سے کاٹ کر بنائے جاتے تھے۔ بعض گھڑے دوسری چیزوں کے بھی ہوتے تھے۔ ان کے استعمال بھی مختلف ملتے ہیں۔ وہ پانی اور شراب رکھنے کے لیے تو استعمال ہوتے ہی تھے اور بعض چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے:

- شروع زمانے میں رسولِ اکرم ﷺ نے سبز اور سفید دونوں قسم کے گھڑوں سے پینے سے منع فرمایا تھا۔ یہ تحریمِ خمر کے اعلان سے قبل کا معاملہ تھا جیسا کہ حدیثِ بخاری میں ہے: "نھی النبی ﷺ عن الجرّ الاخضر. قلت: أنشرب فی الابیض: قالَ: لا"

(کتاب الاشربہ، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعیۃ والظروف بعد النھی ؛ فتح الباری، ۱۰/۲۷-۷۷ ومابعد؛ امام بخاریؒ کے عنوانِ باب/ ترجمۃ الباب سے ہی ممانعت کی منسوخی کا علم ہوتا ہے۔ باقی حضرت حافظ ابن حجرؒ کی بحث سے وضاحت ہو جاتی ہے)

- مدینہ منورہ میں شرابِ ناب کی حرمت کے اعلان ونفاذ کو سن کر حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے اپنے فرزند حضرت انسؓ سے شراب کا گھڑا تڑوا دیا تھا جس کا ذکر معہ حوالہ جات ظروفِ شراب خوری میں آتا ہے۔

- حضرت ابوحمزہؓ کے پاس بھی ایک گھڑا تھا جس میں نبیذ بنائی جاتی تھی اور اس سے پلائی جاتی تھی: "ان لی جرۃ ینتبذ لی نبیذ الخ" (بخاری، کتاب بدء الخلق، باب وفد عبدالقیس)

- بنو قریظہ کے قلعوں پر فتح کے بعد بہت سا سامان اور بہت سارے برتن اور شراب کے گھڑے ملے تھے اور موخر الذکر کو بہا دیا گیا تھا: "... اثاثا کثیرا وآنیۃ کثیرۃ وخمرا و جرار سکر فھریق ذلک کلہ" (واقدی، ۸۱۰)

گھڑا۔ سامانِ رسدر کھنے کا برتن

جرہ یا گھڑا پانی وغیرہ مشروبات رکھنے کے علاوہ اناج وغلہ کے ماٹ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتا تھا۔

۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک روایت کے مطابق حضرت ام سلمہؓ کو دو گھڑے بھی مہر میں عطا فرمائے تھے کہ ایک میں پانی اور دوسرے میں آٹا رکھا کریں: "... وجرتان فی احداهما ماء وفی الأخریٰ دقیق ..." (بلاذری، ۴۳۱/۱)۔ اس حدیث میں ہدایتِ نبوی سے گھڑے کے دو استعمالات معلوم ہوتے ہیں اور یہ عام سماجی اور تمدنی روایت ہر معاشرہ میں رہی ہے۔ مٹی کا گھڑا بالخصوص اور دوسرے پتھر وغیرہ کے گھڑے اناج اور غلہ رکھنے کے ماٹ کے طور سے ہمیشہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسری کھانے پینے کی چیزیں بھی ان میں رکھی جاتی تھیں جیسے سرکہ بالعموم گھڑے میں ہی بنایا اور رکھا جاتا تھا اور آج بھی دیہاتوں میں اس کا یہی استعمال ہے۔ بہر حال گھڑے کے استعمالات مختلف ہو سکتے ہیں اور ان کے لحاظ سے ان کی ساخت بھی مختلف ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے تاہم وہ ایک ایسا برتن ہے جو گھریلو سامان میں سب سے عام تھا اور ہر گھر میں پایا جاتا تھا۔

گھڑونچی

"حمارہ" (گھڑونچی) گھڑوں کے رکھنے اور ان کا پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک لکڑی کے ڈھانچے کی شکل کی ہوتی ہے اور ابھی تک گھڑوں والے گھروں میں مستعمل ہوتی ہے۔ عہدِ نبوی میں بھی اس کا استعمال عام تھا اور پانی کے علاوہ دوسرے گھڑے بھی ان پر رکھے جاتے تھے۔ حضرت عثمان بن عفان امویؓ اور ان کی اہلیہ حضرت ام کلثومؓ کے گھر میں اس کی موجودگی کا ذکر ملا ہے (واقدی، ۳۳۳)۔ اس کی تشریح النہایہ میں یہ ہے: "الحمارة: ثلاثة اعواد یشد بعض اطرافها الی بعض ویخالف بین ارجلها، وتعلق علیها الادواة لیبرد الماء" (۲۵۸/۱) یعنی گھڑونچی دراصل تین لکڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان کے کنارے مثلث کی شکل میں ایک دوسرے کے مخالف طرف نکال دیے جاتے ہیں اور ان کو آپس میں باندھ دیا جاتا ہے اور اس پر برتن کو رکھا جاتا ہے تاکہ پانی ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ دراصل اونچی گھڑونچی کی تعریف ہے جس میں برتن زمین سے ہاتھ دو ہاتھ اونچا رہتا ہے تاکہ پانی کے برتن کو چاروں طرف سے خوب ہوا لگتی رہے۔ نیچی اور زمین سے چپکی گھڑونچی بڑے ماٹ یا سامان رکھنے کے گھڑوں کے لیے

ہوتی تھی تا کہ گھڑا اپنے پیندے پر قائم رہے اور ادھر ادھر نہ لڑھک جائے۔ اونچی گھڑونچی عمودی ہوتی ہے اور نیچی گھڑونچی افقی۔

”رِکوۃ“ (چھاگل)

مصباح اللغات میں ”رَکوۃ“ اور ”رِکوۃ“ کے کئی معانی لکھے ہیں: رَکوۃ: چھوٹی ڈونگی، وہ برتن جو انگور وغیرہ نچوڑتے وقت جمع ہونے کے لیے نیچے رکھیں۔ ”الرِکوۃ“ چھاگل، جمع: رِکاء و رکوات“۔ اس کا ایک مترادف ”علبۃ“ آیا ہے اور دونوں الفاظ میں کافی فرق ہے۔ مصباح اللغات میں علبہ کے معنی ہیں: چمڑے یا لکڑی کا بڑا برتن جس کی جمع علاب ہے اور علب بھی۔ ان دونوں کا ذکر ایک ہی حدیثِ بخاری -۶۵۱۰ میں وارد ہوا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقتِ آخر میں آپ ﷺ کے سامنے ایک ”رکوۃ“ (چھاگل یا ڈونگی نما برتن) یا ایک عُلبَہ (بڑا برتن) رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں الفاظ میں سے کون سا لفظ حدیثِ حضرت عائشہ میں تھا اس میں بعد کے ایک راوی عمر بن سعیدؒ کو شک ہو گیا تھا۔ بہر حال رسولِ اکرم ﷺ پانی میں اپنا دست مبارک ڈالتے اور اس سے چہرہ انور کو پونچھتے تھے اور فرماتے تھے: ”لا الہ الا اللہ، ان للموت سکرات“ (بخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت؛ فتح الباری، ۴۳۹/۱۱ و مابعد)۔ حدیث کے آخر میں امام بخاریؒ نے دونوں برتنوں کا فرق واضح کیا ہے کہ عُلبہ لکڑی کا ہوتا ہے اور رکوۃ چمڑے کا: ”قال ابو عبداللہ: العلبۃ من الخشب والرکوۃ من الادم“۔ امام موصوف کی اس وضاحت سے دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے، ساتھ ہی لغت بالخصوص مصباح اللغات کا لغوی اختلاف بھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تشریح میں مختلف شارحین و امامانِ حدیث کے حوالے سے دونوں کی تشریح و تفسیر کی ہے: ”المحکم“ میں مرقوم ہے کہ ”رکوۃ“ ”تور“ سے مشابہ چمڑے کا برتن ہوتا ہے: ”الرکوۃ شبہ تور من ادم“۔ مطرزیؒ کا بیان ہے کہ وہ چھوٹا ڈول ہوتا ہے: ”دلو صغیر“۔ دوسروں کا بیان ہے کہ وہ بنایا تو چمڑے سے جاتا ہے مگر اس کا طوق لکڑی کا ہوتا ہے اور وہ پیالے کی مانند ہوتا ہے: ”کالقصعۃ تتخذ من جلد ولھا طوق خشب“ (۴۴۱/۱۱)۔ ان

تمام اقوال میں کوئی منافرت یا مغایرت نہیں ہے۔ دراصل ان تمام ظروف کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اوران میں سے ہر ایک شکل کے لحاظ سے اس کی وضاحت وتشریح مختلف لوگوں نے کی ہے۔ وہ ان کے معاصر ظروف کی نوعیت کا معاملہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس امام یا شارح کے زمانے میں رکوہ (چھاگل) جیسی تھی ویسی بیان کردی۔

- حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن لوگ پیاسے ہوئے۔ اس وقت رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے ایک برتن (رکـــوۃ) تھا جس سے آپ ﷺ نے وضوفرمایا۔ لوگوں کو خوف ہوا کہ دوسرے لوگ بھی یہی کریں گے لہٰذا خدمتِ اقدس میں عرض کیا گیا کہ ہمارے پاس پینے کے پانی کی قلت ہے اوراتنا ہی پانی ہے جس سے پئیں یا وضو کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن (رکـــوۃ) میں اپنا دست مبارک رکھا اوراس میں اتنی برکت ہوئی کہ پندرہ سو آدمیوں نے وضو کرلیا اور پیاس بھی بجھالی: "... عطش الناس يوم الحديبية، والنبي ﷺ بين يديه ركوة فتوضأ ... فوضع يده في الركوة..."

(بخاری، کتاب المناقب؛ باب علامات النبوة؛ فتح الباری، ۶/۷۰۹ ومابعد)

تور/رکوۃ

- حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب بھی بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو میں ایک تور (چھوٹے برتن) یا رکوۃ (چھاگل) میں پانی لاتا جس سے آپ استنجا فرماتے: "كان النبي ﷺ اذا اتى الخلاء اتيته بماء في تور او ركوة فاستنجى ..."

(ابوداؤد، کتاب الطهارة، باب الرجل يدلك يده بالارض اذا استنجى؛ ابن ماجہ، کتاب الطهارة، یکساں باب وغیرہ جس میں رکوہ میں وضوکرنے کا ذکر ہے)۔

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں جس رکوۃ (چھاگل) کا ذکر ہے وہ خاصی چھوٹی ہوتی تھی کیونکہ بڑی چھاگل کا طہارت کے لیے لے جانا مشکل ہی نہیں بے معنی تھا۔ دوسرے "تور" کا ذکر بھی اسے چھوٹی سی چھاگل کے معنی کی طرف لے جاتا ہے۔

(ابوداؤد، احادیث: ۴۵، ۹۸-۱۰۰، ۱۱۷)

- حضرت عبداللہ بن عمرؓ صرف رکاء (جمع رکوۃ) یا لکڑی کے پیالوں سے وضو فرماتے تھے (ابن سعد، ۴/۱۷۱)۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ "تور" اور طست" سے وضو کرنے سے انکار فرما دیتے تھے (۴/۱۰۰، ۱۷۱ وغیرہ)

- حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں کوفہ کے رحبہ نامی مقام پر وضو کیا تھا تو ایک تور (پیالہ) اور طست سے کیا تھا۔ (حدیث ابوداؤد: ۱۱۱-۱۱۲، ۱۱۷ وغیرہ)

- حضرت ابوقتادہ انصاریؓ کے پاس غزوۂ تبوک کے دوران ایک چھاگل (رکوۃ) تھی جس میں تھوڑا سا پانی تھا جو معجزۂ نبوی سے کافی لوگوں کے کام آیا تھا۔ اس برتن کو اسی برکت نبوی کے سبب بڑا عظیم الشان سمجھا جاتا تھا۔ (واقدی، ۱۰۴۰)

مذکورہ بالا احادیث ابوداؤد میں سے ۹۸-۱۰۰ میں پیتل کی دھات کے ساختہ تور (پیالہ) کا ذکر ملتا ہے جس کے لیے ایک جگہ "تور من شبہ" اور دوسری جگہ "تور من صفر" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ مترجمین اور صاحبان لغات کے علاوہ شارحین نے بھی "شِبہ" اور "صُفر" دونوں کا ترجمہ پیتل کیا ہے۔

(مصباح اللغات: الشِبہ لُغ پیتل، الصُفر کے معنی سونا بھی بتائے ہیں اور پیتل بھی؛ اردو تراجم احادیث ابوداؤد وغیرہ)

احادیث ابوداؤد: ۱۱۱-۱۱۲ میں حضرت علیؓ کے لیے ایک برتن میں پانی اور اس کے ساتھ طست لانے کا ذکر ملتا ہے جو خاصا اہم ہے: "فاتی باناء فیه ماء وطست"۔ اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے: "ایک برتن جس میں پانی تھا اور ایک طشت لایا گیا"۔ اس طشت کی وضاحت البتہ نہیں کی گئی۔

الدباء، والحنتم، والمقیر والمزفت چار مخصوص برتنوں کا نام ملتا ہے کہ ان میں شراب رکھی/بنائی جاتی تھی لہٰذا ان کے استعمال سے شروع میں منع کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ان کی اجازت دے دی گئی: "نهی رسول الله ﷺ عن الدباء، والحنتم والمقیر، والمزفت..." بخاری، کتاب بدء الخلق، باب قول الله تعالی: یا ایها الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی / وفد عبدالقیس وغیرہ؛ کتاب الاشربة، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعیة والظروف بعد النهی؛ احادیث: ۵۵۹۲-۵۵۹۶؛ فتح الباری،

۱۰/۷۲-۷۹۔ ان چاروں برتنوں کی تفصیل وتشریح حافظ ابن حجر وغیرہ نے دی ہے۔ وہ سب گھڑوں/ برتنوں کی اقسام ہیں اوران پر اختلاف بہت ہے۔ (فتح الباری، ۱۰/۷۲-۷۸ ومابعد)

پانی کی عظیم پکھال

مــزادۃ (پانی کی پکھال) بھی پانی رکھنے اور لانے لے جانے کا ایک ظرف تھا۔ وہ بالعموم خاصا بڑا مشکیزہ ہوتا تھا۔ متعدد احادیث میں پانی کی پکھالوں کا ذکر ملتا ہے۔ اور وہ قربہ سے کافی بڑا ہوتا تھا۔ مسلم کی ایک حدیث میں اس عظیم وجلیل مشک کے ساتھ دوسرے مشکیزوں اور برتنوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن میں پانی استعمال کے لیے رکھا جاتا تھا۔

(مصباح اللغات: المزود والمزاد و المزادۃ: توشہ دان جمع مزاود)

- ایک سفرِ جہاد میں مجاہدین کے پاس پانی ختم ہوگیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ اور ایک دوسرے صحابی کو پانی کی تلاش پر مامور فرمایا۔ ان کی ملاقات ایک عورت سے ہوئی جو اپنے اونٹ پر دو بڑی پکھالیں (مزادتین) لادے اور ان کے بیچ میں اپنی دونوں ٹانگیں لٹکائے چلی آرہی تھی ... بہرحال اس عورت کو خدمتِ نبوی میں لایا گیا اور آپ ﷺ نے ایک کلی اس کی پکھالوں میں کی اور اس پر دستِ برکت پھیرا اور سب سے کہا کہ اپنی پکھالیں (مشکیزے) بھرلو اور خوب پی لو اور اونٹوں کو بھی پلا دو۔ ہم نے تمام مشکیزے اور برتن بھر لیے اور پانی سیراب ہوکر پی بھی لیا۔ اور وہ دونوں پکھالیں یا مشکیزے بھرے کے بھرے رہے تھے۔ ان دونوں مشکیزوں کے اوپری حصہ میں ان کے منہ تھے جن کو عزلاوین کہا گیا ہے: "... بینما نسیر اذ نحن بامراۃ ... رجلیھا بین مزادتین ... فمجَّ فی العزلاوین العلیاوین ... و ملأنا کل قربۃ و اداوۃ..."

(مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ، حدیث: ۳۱۲؛ ۶۸۲ بروایت حضرت عمران بن الحصینؓ)

- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ دورانِ سفر مدینہ ایک اونٹ بھی تھا جس پر دو پکھالیں لدی تھیں اور ان میں نبیذ اور پانی بھرا ہوا تھا اور ہر شخص کو سویق (ستو) کا ایک پیالہ اس نبیذ سے

ملتا تھا جس کو پی کر وہ چھک جاتا تھا۔

(ابن سعد، ۴/ ۱۴۸: "ومعه بعير له عليه مزداتان فيهما نبيذ و ماء مملوء تان، فكان لكل رجل قدح من سويق بذلك النبيذ حتى يتضلّع منه شبعا")

ابریق/ اباریق (لوٹا/ چھاگل)

مکوک/ مکاکیک (لوٹا)

پانی پینے کے چھوٹے برتنوں میں کوزہ کے علاوہ ابریق کا بھی ذکر احادیث میں آتا ہے اور لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں: لوٹا، کوزہ وغیرہ۔ مصباح اللغات نے اس کے دو معانی لکھے ہیں: لوٹا اور چھاگل اور اس کو معرب بتایا ہے جیسا کہ مولانا شبلیؒ نے بھی کہا ہے۔ بہر حال یہ دونوں معانی خاصے مختلف ہیں۔

- مسلم کی روایت میں اس کا حوالہ حوضِ نبوی ﷺ کے ذکر میں آتا ہے کہ میرے حوض کی وسعت ایلہ اور صنعاءِ یمن کی بیچ کی مسافت کے برابر ہے اور اس میں آسمان کے ستاروں کے مانند کوزے رکھے ہیں: "... وان فيه اباريق كعدد نجوم السماء..." حدیث: ۳۷ (۲۳۰۱: کتاب الفضائل۔ ایلہ شمالی سرحد شام کے قریب کی بستی تھی اور صنعاء جنوب کا مشہور شہر اور تجارتی مرکز تھا)

دوسرا لفظ مکوک لوٹے کے معنی میں آیا ہے۔ مصباح اللغات میں اس کے معنی وتشریح ہے: "پینے کا پیالہ الف- ۱/۲ صاع کا پیمانہ، ب- کپڑا بننے کی نال، ج- مکاکیک"۔ حدیث: ۹۵ کی شرح میں امام ابوداؤد نے حضرت انسؓ کی حدیث بیان کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مکوک سے وضو کرتے تھے اور اس میں دو رطل کا ذکر نہیں کیا۔ اس حدیث پر ضعیف ہونے کا حکم لگایا گیا ہے تاہم برتن مکوک اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ دوسری احادیث و روایات میں بھی مذکور ہے اور معروف برتن اور معلوم پیمانہ تھا۔

کوز (کوزہ)

وضو کے حوالے سے ایک برتن کا نام کوز بھی حدیث میں ملتا ہے۔ احادیث ابوداؤد: ۴۲

اور ۱۱۳ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے ایک بار پیشاب کیا تو حضرت عمرؓ پانی کا ایک کوزہ لے کر آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ کے استفسار پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ آپ کے وضو کا پانی: "فقام عمر خلفه بکوز من ماء..." اسی طرح حضرت علیؓ نے وضو فرمایا تو ان کے لیے بھی پانی کا ایک کوزہ (برتن) لایا گیا...: "... ثم أتی بکوز من ماء ..." ۔ حضرت علیؓ نے یہ وضو اپنی خلافت کے دوران رحبہ/ کوفہ میں کیا تھا۔ صاحب مصباح اللغات نے لکھا ہے: الکوز: کوزہ ج الکواز و کیزان و کِوَزۃ (دخیل)۔ یعنی وہ فارسی لفظ ہے جو دخیل بن گیا ہے۔ وضو کے برتن کے لیے لفظ "میضاۃ" بھی ان احادیث میں استعمال ہوا ہے (ابوداؤد: ۱۰۸ وغیرہ) حضرت عثمان بن عفانؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں وضوء نبوی کا طریقہ دکھانے کے لیے وضو کر کے دکھایا تھا۔ اس لیے پانی اور میضاۃ لایا گیا: فأتی بمیضاۃ: "پانی کا لوٹا لایا گیا (ترجمہ)۔ صاحب مصباح اللغات نے اس کے دو معانی دیے ہیں: "وضو کرنے کی جگہ، لوٹا"۔ غالباً لوٹا ہندو پاک کے استعمالی برتن کی وجہ سے ترجمہ کیا گیا ہے ورنہ حدیث میں اس کے جھکانے کا ذکر ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں ٹونٹی نہیں ہوتی تھی جو لوٹے کا اہم ترین حصہ ہے۔

جام مشروب/ قدح

"قدح" پینے کا بھی برتن تھا جو صاحب مصباح اللغات کے مطابق چھوٹے اور بڑے دونوں کے لیے بولا جاتا ہے اور قدح خالی برتن کو کہتے ہیں اور جب اس میں پینے کی کوئی چیز ہو تو اس کو کاس کہتے ہیں۔ اس کی جمع اقداح آتی ہے۔ احادیث و روایات میں قدح بھرے برتن اور مشروب سے بھرپور برتن کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور کاس کا لفظ کم ملتا ہے۔ جیسے فتحِ مکہ میں جب رسولِ اکرم ﷺ کدید نامی مقام پر تھے تو آپ ﷺ نے قدح منگوایا اور پیا اور لوگوں نے روزہ وافطار کیا: "... فلما کان رسول الله ﷺ بالکدید دعا بقدح فشرب فافطر الناس" (موطا، کتاب الصیام، الصیام فی السفر؛ تنویر، ۱/ ۲۷۵)

قدح سے وضو کرنے کا ذکر متعدد روایات میں آتا ہے۔ مدینہ منورہ کے مقامِ زوراء میں

رسولِ اکرم ﷺ نے قدح سے ہاتھ منہ دھوئے تھے۔

(بخاری، باب الغسل و الوضوء الخ؛ مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: ۴۳ (۲۲۷۹)۔

حدیث: ۲۰۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک "قدح رحراح" سے بھی آپ ﷺ نے وضو فرمایا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسکو کھلے منہ کا برتن قرار دیا ہے اور بعض روایات میں وہ تنگ منہ کا برتن بتایا گیا ہے۔ مگر لغوی طور سے رحراح کے معنی پھیلا ہوا کشادہ کے ہیں اور اس میں اتھلے پن کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے، اتھلے پن سے مراد تھوڑی گہرائی ہے (مصباح اللغات)۔ اسی لیے اس میں "رحراح" کی صفت لائی گئی۔ امام خطابی کی تعریف وتشریح کے بعد حافظ موصوف نے اسے "طست" سے مشابہ قرار دیا ہے کہ یہ صفت یہی بتاتی ہے (۱/ ۳۹۷)۔ امام ابن خزیمہ کی روایت میں "رحراح" کی جگہ "زجاج" (شیشہ) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض پیالے شیشہ کے بھی ہوتے تھے اور دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں شیشے کے برتن مستعمل تھے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ مقوقسِ مصر نے رسولِ اکرم ﷺ کو شیشہ کا ایک پیالہ (قدحا من زجاج) ہدیہ کیا تھا، اگرچہ اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے۔

- قدح لکڑی کے بھی ہوتے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کا ایک لکڑی کا قدح تھا جس میں آپ پیشاب کرتے تھے اور وہ تخت (سریر) کے نیچے رکھا رہتا تھا: "... وکان للنبی ﷺ قدح من عیدان یبول فیه ویضعه تحت السریر"

(نسائی، کتاب الطهارة، باب البول فی الاناء)

یہ واضح رہے کہ عام حالات میں بالخصوص رات میں یہ معمولِ نبوی تھا۔ مرض الوفات کے آخری لمحہ میں آپ ﷺ نے طست میں پیشاب کیا تھا۔ اس سے اس معمول کو خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔

بہر حال استعمالات سے قطع نظر تین چار قسم کے خام مواد کے پیالوں کا ذکر ملتا ہے جو یہ ہیں:

۱- مٹی کا پیالہ، ۲- لکڑی/ عمدہ لکڑی کا پیالہ، ۳- شیشہ کا پیالہ، ۴- دھات کا پیالہ وغیرہ۔

ان کی مختلف ساخت بھی معلوم ہوتی ہے: وہ کافی کشادہ، بڑے اور کم گہرائی کے پیالے تھے، گول یا گول نما زیادہ گہرائی کے پیالے تھے، چھوٹے پیالے تھے، تنگ منہ کے پیالے بھی تھے اور دوسرے انداز کے بھی پیالے تھے۔

قدحِ نبوی

قدحِ نبوی (پیالہ نبوی) سے متعلق متعدد احادیث ملتی ہیں اور ان سے نہ صرف اس برتن کی ساخت، نوعیت اور استعمال کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس عہدِ میمنت لزوم کے بعض سماجی رویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے تو اہم ہے ہی کہ وہ معمولاتِ نبوی کا سراغ دیتا اور اہلِ ایمان کے لیے سرمۂ بصیرت بنتا ہے بلکہ رسولِ اکرم ﷺ کی سننِ شریفہ کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اس سے زیادہ صحابہ کرامؓ کی محبتِ نبوی اور عقیدت وشیفتگی کا مظہر بھی ہے جسے آج کے اصحابِ طہارت و تقویٰ اور حاملینِ سنت وحدیث بلا تکلف بدعت قرار دے دیتے ہیں۔ ان احادیث شریفہ کا ذکرِ خیر انھیں جہات سماجی ودینی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے:

- حضرت عاصم احولؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ کے پاس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیالہ دیکھا جو پھٹ گیا تھا اور اسے انھوں نے چاندی کے تاروں/ پتروں سے باندھ رکھا تھا۔ وہ ایک عمدہ پیالہ تھا جو خاصا چوڑا تھا اور جھاؤ (نضار) کی لکڑی سے بنا تھا۔ صاحب مصباح اللغات نے نضار کے معنی جھاؤ کا درخت اور برتن بنانے کی بہترین لکڑی لکھے ہیں اور قدح نضار کا معنی ''عمدہ لکڑی کا بنا ہوا پیالہ'' بتایا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو فلاں فلاں چیز اس پیالے سے پلائی تھی۔ ابن سیرینؒ فرماتے تھے کہ اس میں ایک لوہے کا حلقہ تھا جسے حضرت انسؓ نے بدل کر چاندی یا سونے کا حلقہ لگانا چاہا تو ان کے سوتیلے والد اور مربی حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے فرمایا: تم ہرگز اس چیز کو نہ بدلنا جس کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا لہٰذا حضرت انس بن مالکؓ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا: ''عن عاصم الاحول قال: رأيت قدح النبي ﷺ عند انس بن مالک، وكان قد انصدع فسلسله بفضة. قال: هو قدحٌ جيدٌ عريض من نضار. قال: قال انس: لقد سقيت رسول الله ﷺ في هذا القدح اكثر من كذا و كذا. قال، وقال ابن سيرين: انه كان فيه حلقة من حديد، فاراد انس ان يجعل مكانها حلقة من ذهب او فضة. فقال له ابو طلحة: لا تغيرنَّ شيئا صنعه رسول الله ﷺ، فتركه''

(بخاری، کتاب الاشربۃ، باب الشرب من قدح النبي ﷺ و آنيته؛ حدیث: ۵۶۳۸ وغیرہ؛ فتح الباری،

۱۰/۱۲۳-۱۲۶؛ حافظ موصوف نے اس پر بحث کی ہے کہ چاندی کے تاروں سے رسول اکرم ﷺ نے اسے باندھا تھا یا حضرت انس نے۔ حافظ بیہقی اور امام احمد نے بھی اس معنی کی مختصر احادیث نقل کی ہیں کہ قدح نبوی میں چاندی کا پھٹہ/ پیوند لگا تھا: قدح النبی ﷺ فیہ ضبۃ من فضۃ"۔ روایات کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے تاروں سے اسے رسول اکرم ﷺ نے ہی باندھا تھا اور حضرت ابوطلحہؓ کی تاکید یہی بتاتی ہے۔ حضرت انسؓ کی دوسری حدیث /طرف حدیث بھی یہی بتاتی ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کا باندھا ہوا تھا: "ان قدح النبی ﷺ انکسر فاتخذ مکان الشعب سلسلة من فضة. قال عاصم: رأیت القدح وشربت فیه" (بخاری، کتاب الجهاد، باب ما ذکر من درع النبی ﷺ)

رسولِ اکرم ﷺ کے زیرِ استعمال اور لمسِ مبارک سے سعادت مند قدح (پیالہ) کا دوسری کئی حدیثوں میں ذکر ملتا ہے: اور وہ حضرت انس بن مالکؓ کی حدیثِ قدح کی تائید اور ان کے بیان کی تصدیق کے علاوہ ان کے مملوکہ پیالے کی حقیقت ثابت کرتا ہے۔

- حضرت انس بن مالکؓ کے گھر میں ایک گھریلو پالتو بکری کا دودھ دوہا گیا اور اس میں گھر میں واقع کنوئیں کا پانی ملایا گیا پھر خدمتِ نبوی میں پیالۂ مشروب پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اس سے پیا اور اپنے دہانِ مبارک سے ہٹایا ہی تھا کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو عطا فرمائیں حالانکہ وہ آپ ﷺ کے بائیں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کے دائیں ایک اعرابی صحابی تشریف فرما تھے اور حضرت عمرؓ کو خدشہ ہوا کہ آپ ﷺ اعرابی کو عطا فرمادیں گے کہ وہ ہی آپ ﷺ کی سنت تھی اور آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا: "... فاعطی رسول الله ﷺ القدح فشرب منه حتی اذا نزع القدح من فیه ... الخ"

(بخاری، کتاب الاشربة، باب فی الشرب فی الاقداح؛ فتح الباری، ۱۰/۱۲۲ و مابعد؛ نیز کتاب الهبة، باب من استسقی' وغیرہ؛ احادیث: ۵۶۳۶-۵۶۳۸ وغیرہ)

- اسی باب و کتاب میں ایک اور حدیثِ بخاری ہے جس کے مطابق ایک دوسرے موقعہ پر حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ دائیں طرف بیٹھے تھے اور دوسری طرف شیوخِ مجلس۔ مگر حضرت سہلؓ کے اصرار و درخواست پر رسولِ اکرم ﷺ نے پیالے سے پی کر اسی نوجوان کو عطا فرمایا: "أُتی النبی ﷺ بقدح فشرب منه ... (نیز کتاب الهبة، باب الهبة المقبوضة الخ)

وضو اور مشروب نوش کرنے کے ضمن میں قدح (پیالہ) کا ذکر دیگر احادیث میں بھی ملتا ہے کہ وہ ایک عام استعمالی برتن تھا:

- حضرت ابوموسیٰؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا: "دعا النبی ﷺ بقدح فیه ماء" اور وضو فرمایا...

(بخاری، کتاب الوضوء، باب استعمال فضل وضوء الناس وغیرہ کتب وروایات)

- حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ سفر کے دوران نماز کے وقت ایک آدمی ایک پیالہ (قدح) میں تھوڑا سا پانی لایا۔ برکتِ نبوی سے ستر اشخاص کے وضو کے لیے کافی ہوا۔

(کتاب الجهاد، باب علامات النبوة ؛دوسری روایت میں ہے کہ وضو کا برتن لایا گیا۔ ایسے ظروف طہارت کا ذکر خاص ان کے عنوان کے تحت کیا جا چکا ہے)

قدحِ نبوی سے وابستہ ایک اور روایت حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ کی ہے اور وہ دوسرا پیالہ نبوی تھا۔ صحابی جلیل کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ ایک کام سے نکلے تھے اور واپسی پر سقیفۂ بنی ساعدہ میں آپ ﷺ اپنے بعض اصحاب کے ساتھ تشریف فرما ہوئے اور حضرت سہل سے پلانے کی فرمائش کی۔ حضرت سہلؓ نے ایک پیالہ دکھا کر کہا کہ میں نے یہ پیالہ نکالا اور اس سے تمام شرکاء مجلس کو پلایا۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت سہلؓ نے وہ پیالہ ہمارے لیے نکالا اور ہم نے بھی اس سے پیا۔ پھر خلیفۂ وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز امویؒ (م ۱۰۱/۷۲۰) نے اسے ہدیہ مانگ لیا اور حضرت سہلؓ نے ان کو ہدیہ کر دیا:

"... فاقبل النبی ﷺ یومئذ حتی جلس فی سقیفة بنی ساعدة هو واصحابه، ثم قال: اسقنا یا سهل! فاخرجت لهم هذا القدح فاستقیتهم فیه. فأخرج لنا سهل ذلک القدح فشربنا منه. قال: ثم استوهبه عمر بن عبدالعزیز بعد ذلک فوهبه له"

(بخاری، حدیث: ۵۶۳۷؛ کتاب وما بعد مذکورہ بالا؛ فتح الباری مذکورہ بالا)

اسی کتاب کے مذکورہ بالا باب کے ترجمہ میں امام بخاریؒ نے ایک مرسل حدیث کا ذکر فرمایا ہے جس کے مطابق حضرت ابو بردہؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس پیالہ سے نہ پلاؤں جس سے رسول اکرم ﷺ نے نوش فرمایا تھا: "وقال ابوبردة: قال لی عبدالله بن سلام: الا اسقیک فی قدح شرب النبی ﷺ فیه؟"

(فتح الباری، ۱۰/۱۲۲)۔ امام موصوف نے اس کو ترجمۃ الباب میں بطور مرسل حدیث نقل کیا ہے ورنہ

دوسری کتب وابواب میں وہ موصول ومرفوع حدیثِ نبوی ہے۔ اور اس کا مفہوم وخلاصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ایک بار حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے گھر تشریف لے گئے اور صحابی جلیل نے اس پیالہ میں آپ ﷺ کو مشروب پلایا تھا۔ امام بخاریؒ کے دوسرے ابواب کے مطابق حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس تبرک کو سنبھال کر رکھا تھا۔

ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام اور اکابرِ عرب کے قدحوں کا ذکر روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔ ان میں حسب ذیل صحابہ واکابر شامل ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ (ابن سعد، ۴/ ۱۴۸، ۱۷۱ وغیرہ)۔ وہ "قدح من زجاج/ قواریر" (شیشوں کے پیالے) سے نہ پیتے تھے اور نہ وضو کرتے تھے، لکڑی کے قدحے ان کو پسند تھے۔ یہ محض ان کی ذاتی پسند کا معاملہ تھا۔ ورنہ زجاج/قواریر کے برتن عہد نبوی میں مستعمل تھے اگرچہ صرف اکابر کے ہاں ان کا رواج تھا۔ شاید اپنی سادگی کے سبب ان کی ترجیح معمولی پیالوں کی تھی۔ تمدنی لحاظ سے وہ بہرحال ایک قسمِ قدح تو تھی ہی۔

قدح اور قدح ساز

پیالے یا قدح مختلف چیزوں -لکڑی، پتھر، دھات وغیرہ- سے بنائے جاتے تھے اور دونوں ادوار جاہلی اور اسلامی میں ان کے بنانے والے بھی تھے جن کو پیالہ ساز اور قدح ساز کہا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک نمائندہ مثال حضرت ابورافع مولی نبوی ﷺ تھے جو اصلاً حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کے غلام رہے تھے۔ وہ اپنے آقا حضرت عباس ہاشمیؓ کے اسلام لانے کے پس منظر میں اپنے پیشہ قدح سازی کا دلچسپ بیان پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک کمزور وبے بس شخص تھا اور میں پیالے بناتا تھا اور ان کو زمزم کے حجرہ میں کھودا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک روز میں اپنے پیالے کھودرہا تھا جب غزوۂ بدر میں قریش کی شکست کی خبر آئی۔ بقیہ واقعہ ابولہب سے متعلق ہے، شارحین روایت کا بیان ہے کہ حضرت ابورافعؓ کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان پیالوں کو لکڑی سے بناتے تھے۔

(ابن ہشام، ۲/ ۲۹۰: "... وکنت رجلاً ضعیفا، وکنت اعمل الاقداح: انحتها فی حجرة زمزم، فواللہ انی جالس فیها انحت اقداحی..." حاشیہ محقق ومحشی: الاقداح: جمع قدح: یرید انہ کان یصنعها من الخشب؛ انحت -من باب ضرب- ای انجرها ...")

عُسٌّ (بڑا پیالہ) الرفد (عظیم ترین پیالہ/ قدح)

پیالوں کے مختلف ناموں میں سے ایک "عسٌّ" ہے جو بقول امامِ لغت جوہری قدحِ عظیم کے معنی میں ہے۔ اس کا ذکر ایک دلچسپ اور اہم حدیث میں ملتا ہے جس کے مطابق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے غسل کے لیے منگوایا تھا۔ ایک سیاہ باندی وہ بڑا برتن لائی جس میں پانی تھا اور اس نے ایک کپڑے سے پردہ کیا اور میں نے غسل کیا: "... فدعا لی بجارية سوداء، فجاءت بعسٍّ فيه ماء..." ۔ اسی حدیث کا دوسرا طرف کافی فرق کے ساتھ آیا ہے جس میں برتن کا ذکر ہے اور بقول جوہری الرفد نامی برتن اس سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

(ابوداؤد، كتاب الطهارة، باب التيمم في الحضر، حدیث: ۳۳۲-۳۳۳؛ مصباح اللغات: العس: بڑا پیالہ، بڑا برتن، جمع عساس، عسسة واعساس وعُسس؛ الرفد: بڑا پیالہ)

- غزوۂ تبوک کے دوران حضرت اسید بن حضیر اوسیؓ نے قبیلۂ بلی کی ایک عورت کے پاس پانی کا ایک بڑا برتن پایا تو اسے خدمتِ نبوی میں لائے کہ مسلمان مجاہدین کو پانی کی سخت ضرورت تھی اور اس سے پانی لیا اور اہلِ بادیہ کے بڑے برتنوں/ پیالوں میں سے ایک عظیم پیالے (قعب عظیم) میں بھر لیا۔ العس/ العساس کو بھی نہایہ، ۳/ ۹۵ کے حوالے سے قدح عظیم/ قدح کبیر کہا گیا ہے۔ قعب/ اَقعب، قعاب، قعبہ کو بھی بڑا پیالہ کہا گیا ہے (مصباح اللغات)۔ روایت کے مطابق تمام مجاہدین نے اپنے اپنے پانی کے برتن بھر لیے تھے اور تمام جانوروں اور مویشیوں کو سیراب کر لیا تھا (واقدی، ۱۰۴۱)۔ واقدی ہی نے غزوۂ تبوک کے دوران ایک قعب سے پانی یا مشروب پینے کی بات کہی ہے (واقدی، ۱۰۹۳)

- دودھ کھانے اور پلانے کے باب میں روایات واحادیث گذر چکی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ دوسیؓ اور دوسرے اصحاب صفہ کو اسی "عس" سے ان کی شکم پری اور سیرابی تک کئی بار دودھ پلایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ کافی بڑا پیالہ تھا۔

- حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسولِ اکرم ﷺ کی چچی حضرت ام الفضلؓ نے عرفات کے خطبہ کے دوران ایک بڑے پیالہ میں دودھ بھیجا جسے آپ ﷺ نے نوش فرمالیا: "فارسلت

ام الفضل اليه بعسّ من لبن فشرب، وهو يخطب" (واقدی، ۱۱۰۴؛ بخاری، حدیث: ۱۶۶۱ میں "قدح من لبن" ہے)۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عس اور قدح دونوں مترادف برتن کے نام ہیں لیکن ان میں لغوی طور سے کافی فرق ضرور تھا جو ان کی ساخت کی بنا پر تھا یا ان میں استعمال شدہ خام مواد کے سبب تھا۔

عُلبہ (چمڑے یا لکڑی کا بڑا برتن)

صاحبِ مصباح اللغات نے یہی معنی بتا کر اس کی جمع عِلاب اور عُلَب بتائی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ امام عسکری کے مطابق وہ بدوؤں کا پیالہ ہوتا ہے جو چمڑے سے بنایا جاتا ہے: "هي قدح الاعراب تتخذ من جلد"۔ جب کہ امام ابن فارس کی تشریح ہے کہ وہ ایک ضخیم لکڑی کا پیالہ ہوتا ہے اور چمڑے سے بنایا جاتا ہے: "قدح ضخم من خشب وقد يتخذ من جلد"۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نچلا حصہ چمڑے کا ہوتا ہے اور اوپری حصہ گول لکڑی کا ہوتا ہے: "اسفله جلد و اعلاه خشب مدور"۔ ان میں سے کسی نے امام بخاریؒ کی تشریح کا حوالہ نہیں دیا جو انھوں نے رکوہ اور علبہ کی جامع حدیث-۶۵۱۰ کی شرح میں خود کیا ہے کہ عُلبہ لکڑی کا ہوتا ہے اور رکوہ چمڑے کا ہوتا ہے۔ صاحب مصباح اللغات نے بھی ابہام قائم رکھا اور امام بخاریؒ کی طرح وضاحت نہیں کی ہے، کیونکہ ان کے مطابق وہ "چمڑے یا لکڑی کا بڑا برتن" ہوتا ہے جب کہ امام بخاریؒ نے کہا ہے کہ علبہ لکڑی کا بنا ہوا برتن ہوتا ہے۔

کھانا پکانے کے برتن

کھانا پکانے کے مختلف قسم کے ظروف کا سراغ تقریباً ہر تمدنِ انسانی میں ملتا ہے۔ سورہ سبا-۱۳ میں "وقدور رسيت" (اور دیگیں چولھوں پر جمیں) کا حوالہ اگرچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع جنات کی کاریگری کے ضمن میں آیا ہے مگر وہ ایک عالمی اور آفاقی حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ دیگوں میں کھانا ہر مہذب سماج میں پکایا جاتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور دوسرے شارحین نے بھی یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ یہ "بڑے باسن (برتن) بناتے بہت بڑے

کیونکہ لشکر کے موافق کھانا پکتا اور بٹتا'' اور ظاہر ہے کہ ان کے لیے بڑے بڑے برتنوں یعنی دیگوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ قرآن مجید میں اس کا ایک ہی حوالہ آیا ہے۔

مگر احادیثِ نبوی اور روایاتِ سیرت میں "قدر" اور اس کی جمع قدور کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے کھانے پکانے کے برتنوں کے نام ملتے ہیں جن میں "برمة" دوسرا سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ ان کھانا پکانے کے بڑے چھوٹے برتنوں کا ذکر ان کے حجم کے لحاظ سے بھی آتا ہے اور ان کے خام مواد کے اعتبار سے بھی جن سے وہ بنائے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے کھانا پکانے کے برتنوں کا بھی حوالہ آتا ہے جن کا ذکر ان کے تاریخی اور سماجی تناظر میں کیا جائے گا۔

رحی (چکی)

عہدِ نبوی میں اور مدتوں تک دوسرے اسلامی اور ایشیائی معاشروں میں آٹا پیسنے کی چکی ایک ضروری لازمی سامان تھی کیونکہ بالعموم گھروں کی خواتین ہی اپنے گھروں میں آٹا پیس لیا کرتی تھیں یا بڑے خاندانوں کی بیویاں اپنی نوکرانیوں یا باندیوں سے یہ کام کرواتی تھیں۔ عہدِ نبوی اور اسلامی معاشرت میں جہیز کا رواج نہ تھا اور بالعموم ایسے گھریلو اسباب کا انتظام گھر کا مرد یا شوہر کرتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی بعض ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کے مہر میں چکیوں کا ذکر ملتا ہے بالخصوص حضرت فاطمہؓ کے مہر میں جسے ہندو رواج کے ماروں نے جہیز کا سامان بنا دیا ہے۔ وہ اصلاً ان کے شوہر نامدار حضرت علیؓ کا فراہم کردہ سامان تھا۔

- ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کو رسولِ اکرم ﷺ نے مہر میں ایک روایت کے مطابق دو چکیاں دی تھیں: "ورحيان تطحنين بهما" (بلاذری، ۱/۴۳۱)

- حضرت فاطمہؓ کی چکی کا ذکر بہت آتا ہے اور مشہور و معروف بھی ہے، اگرچہ وہ ان کی نیک نفسی اور رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیم کے ضمن میں آتا ہے۔ حضرت سیدہؓ ایک بار، جب غلام اور باندیاں کسی غزوہ میں ملی تھیں، حاضر خدمت ہوئیں کہ ایک باندی ان کو بھی عطا ہو کہ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں میں گٹے اور نیل پڑ گئے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو تسبیحِ خاص سکھا دی اور

کنیز دینے سے معذرت کردی کہ ابھی لاچار و بے بس مسلمانوں کی آبادکاری کا کام باقی ہے لہٰذا ان کے لیے یہ غلام و باندیاں ہیں۔ حدیث بخاری: ۵۳۶۱: "... حدثنا علیّ "ان فاطمة علیها السلام اتت النبی ﷺ تشکو الیه ما تلقی فی یدها من الرحیٰ- وبلغها انه جاء ہ رقیق- فلم تصادفه، فذکرت ذلک لعائشة، فلما جاء اخبرته عائشة، قال: فجاء نا وقد اخذنا مضجعنا، فذهبنا نقوم فقال: علیٰ مکانکما، فجاء فقعد بینی و بینها حتی وجدت برد قدمیه علیٰ بطنی. فقال: ألا ادلکما علیٰ خیر مما سألتما؟ اذا اخذتما مضاجعکما- او اویتما الیٰ فراشکما- فسجا ثلاثا و ثلاثین، واحمدا ثلاثا و ثلاثین و کبرا اربعا و ثلاثین، فهو خیر لکما من خادم" (کتاب النفقات، باب عمل المرأة فی بیت زوجها؛ فتح الباری، ۹/۶۲۶ ومابعد)۔ امام بخاریؒ کے معنی خیز باب وعنوان کے علاوہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چکی چلانا بیوی/ بیویوں کا کام تھا اور حضرت فاطمہؓ نے غلام باندی کی درخواست حضرت علیؓ کی فرمائش پر یا ساتھ کی تھی۔ حضرت فاطمہؓ کی درخواست حضرت عائشہؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تھی کہ حضرت زہراؓ کی آمد کے وقت آپ ﷺ تشریف فرما نہ تھے۔ یہ بھی ایک اہم سماجی روایت ہے اور ماں بیٹی کے خوش گوار تعلقات کا ایک خوبصورت اشارہ۔ ان کے علاوہ اس میں بیٹی کے گھر زیارت اور بیٹھنے کے آداب بھی ملتے ہیں۔

(نیز حدیثِ بخاری: ۵۳۶۲ و شرح حافظ)

قدر

کھانا پکانے کے برتنوں میں سب سے زیادہ غالباً ذکر "قِدْر" کا ملتا ہے جسے اردو میں بالعموم ہانڈی یا دیگچی کہتے ہیں۔ اس کی جمع "قدور" ہے اور اس کی چھوٹی شکلیں بھی ہوتی تھیں یعنی تصغیر کے لحاظ سے وہ "قُدَیرة" اور "قُدَیر" کہلاتی تھیں۔ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ نبوی میں اور صحابہ کرام کے گھروں کے اندر اور باہر کھانا پکانے کے لیے ہانڈیوں کا استعمال ہوتا تھا۔ قرآن مجید میں "قدور رٰسیٰت" (دیگیں چولھوں پر جمیں) کا ذکر سورۂ سبا: ۱۳ میں آیا ہے جو عظیم الشان پکانے کے برتن تھے۔ اور ایسی ہی دیگوں (قدور) کا ذکر جناب

ہاشم بن عبد مناف کے زمانۂ قحط میں قریش کو کھانا (گوشت روٹی) کھلانے کے ضمن میں آچکا ہے۔ ان تمام بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ چھوٹی سی ہانڈی سے لے کر عظیم الشان دیگوں تک کا سلسلہ تھا اور درمیان میں بڑی ہانڈیاں، پتیلیاں، پتیلے اور دیگیں آتی تھیں۔ گوشت کی قسم پر بھی ان کے حجم اور لمبائی چوڑائی کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اونٹ جیسے بڑے جانور کو بڑی دیگوں ہی میں پکایا جاسکتا تھا۔

- غزوۂ خیبر کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کے پالتو گدھوں کے گوشت پکانے اور اس کی ممانعتِ نبوی کے بعد ان کی ہانڈیوں کو الٹ دینے کا ذکر متعدد احادیث و روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر، احادیث: ۴۲۲۰-۴۲۲۵ وغیرہ اطراف حدیث: "... فان القدور تغلی ... وبعضها نضجت..." / فنادیٰ منادی رسول الله ﷺ: اکفئوا القدور"؛ فتح الباری، ۷/ ۶۰۱-۶۰۴ وغیرہ؛ ترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء فی کراهیة النهضة: "... فمرّ بالقدور فأمر بها فاکفئت ... الخ")

- حضرت کعب بن عجرہؓ نے اپنے حج - حجۃ الوداع - کے زمانے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی ہانڈی کے نیچے پھونک رہے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لے آئے...:

"جاء نی رسول الله ﷺ وانا انفخ تحت قدر لاصحابی..."

(موطا، کتاب الحج، فدیة من حلق الخ بتحویر، ۱/ ۳۶۵-۳۶۶؛ مسلم، کتاب الحج، باب جواز حلق الراس للمحرم میں کئی روایات ہیں۔ حدیث: ۸۰ (۱۲۰۱) میں "قدر" کا لفظ ہے۔ اور دوسری روایت میں "برمۃ" ہے۔ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں یعنی دیگچی یا ہانڈی جن میں کھانا پکایا جاتا ہے۔ "القدر آنية يطبخ فيها والبرمة مثلها، قال ابن الاثیر: البرمة القدر مطلقا"؛ نیز ملاحظہ ہو: البرمۃ البتہ اس کا مواد مختلف تھا)

- اسی مبارک موقعہ پر ہدی کا گوشت ایک پتیلی/ ہانڈی میں رکھ کر پکایا گیا اور اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا اور اس کا شوربہ نوش فرمایا: "... فجعل فی قدر فطبخه، فأكل من لحمها وحسا من مرقها..." (واقدی، ۱۱۰۸)

- ترمذی کی ایک روایت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ سے مجوسیوں کی ہانڈیوں کے استعمال کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو خوب دھو کر صاف کرلو اور پھر

ان میں پکاؤ...:" سُئِل رسول اللہ ﷺ عن قدور المجوس قال: انقوها غسلا و اطبخوا فیها..." (ترمذی، باب الانتفاع بآنیۃ المشرکین)

بُرمۃ (ہانڈی پتھر کی)

قِدر (ہانڈی) کے لیے دوسرا مترادف لفظ "برمۃ" ہے جو متعدد احادیث میں آتا ہے۔ "قدر" ہانڈی کے لیے عام لفظ ہے اور کسی بھی کھانے پکانے والے برتن پر اس کا اطلاق ہوتا ہے چاہے وہ کسی چیز کی بنی ہو جیسے تانبہ، لوہا اور پیتل وغیرہ جب کہ "برمہ" ہانڈی تو ہوتی ہے مگر وہ پتھر سے بنائی جاتی ہے اور بقول ماہرینِ لغت وہ حجاز اور یمن میں ملنے والے معروف پتھر سے گڑھی جاتی ہے:"قال ابن الاثیر: البرمۃ القدر مطلقا، وھی فی الاصل المتخذۃ من الحجر المعروف بالحجاز والیمن"۔ حضرت کعب بن عجرہؓ کے جس ہانڈی کے تحت پھونکنے کا ذکر "قدر" کے تحت حدیثِ بخاری میں آیا ہے اس کو مسلم کی بعض روایات میں برمہ کہا گیا ہے۔ مصباح اللغات میں ہے:"پتھر کی ہانڈی"۔ اس سے ان دونوں کے مترادف ہونے کا خیال واستعمال ملتا ہے۔

- رسولِ اکرم ﷺ کے مکی دور کی ایک "برمہ" کا ذکر قریشی دشمنوں کی ایذا دہی کے ضمن میں ملتا ہے کہ وہ بُرمۂ نبوی میں بسا اوقات غلاظت ڈال دیا کرتے تھے یا بکری کی اوجھڑی اس میں ڈال دیتے تھے:"... وکان احدھم یطرحھا [ای رحم الشاۃ] فی برمتہ اذا نصبت لہ..."(ابن ہشام، ۲/۲۵)

- غزوۂ خندق ۵/۶۲۷ کے دوران حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور ان کی اہلیہ محترمہ نے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی اپنے گھر پر جو دعوتِ شیراز کی کی تھی اس میں گوشت کے ایک پتھر کی ہانڈی اور روٹی کے تنور میں پکانے کا ذکر ملتا ہے:"قل لھا: لا تنزع البرمۃ ولا الخبز من التنور..." حدیث-۴۱۰۱ اور دیگر حدیث-۴۱۰۲ میں ہے:"... وقطعتھا فی برمتھا..." "لاتنزلنّ برمتکم ... واقدحی من برمتکم... وان برمتنا تنعطّ کما ھی"، میں متعدد جگہ اس کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح کی ہے۔ مزید بحث کے لیے

عہدِ نبوی کے کھانوں کے باب میں یہ خاص فصل ملاحظہ ہو۔ اسی باب سے چند مثالیں برمہ کی پیش کی جاتی ہیں:

- حضرت بریرہؓ اور بعض دوسری باندیوں کو جو گوشت صدقہ میں دیا گیا تھا وہ "برمہ" میں پک رہا تھا اور برمہ کھد بدا رہی تھی، جب رسولِ اکرم ﷺ نے گھر آ کر کھانا طلب کیا اور خدمت میں روٹی اور کوئی گھریلو سالن پیش کیا گیا تب آپ ﷺ نے اس "برمہ" کا ذکر فرمایا۔ تلبینہ میں برمہ کا ذکر ہے اور دوسرے مقامات اور کھانوں میں بھی۔ (فتح الباری، ۹/۶۸۱ وغیرہ)

دسترخوان

کھانا رکھ کر کھانے کے کپڑے کو دسترخوان کہا جاتا ہے۔ عربی میں اس کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے مختلف نام بھی ہیں اور وہ دراصل ان کی قسموں اور ان کی ساخت پرداخت کے سبب ہی پڑے ہیں۔ ان میں بالعموم چمڑے کے دسترخوان "نطع" (جمع انطاع انطوع) کا ذکر زیادہ ملتا ہے اور دوسرے دسترخوانوں کا بھی جو عہدِ نبوی میں تھے یا عہدِ نبوی میں دستیاب اور زیرِ استعمال نہ تھے اور بعد میں متعارف ہوئے۔ امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین اور سیرت نگاروں نے "خوان" اور "سفرہ" پر کھانے کے ابواب باندھے ہیں یا ان سے متعلق روایات نقل کی ہیں۔ بخاری کے باب "... الاکل علی الخوان والسفرۃ" کے تحت ایک حدیث: ۵۳۸۹ میں "مائدۃ النبی ﷺ" کا ذکر خیر بھی آیا ہے۔ فتح الباری میں ان کی تشریح ہے کہ خوان دسترخوانِ بلا طعام ہے: "الخوان المائدۃ مالم یکن علیھا طعام"۔ السفرہ کے اصل معنی کھانا ہیں لیکن وہ دسترخوان کے معنی میں بھی آتا ہے: "واما السفرۃ فاشتھرت لما یوضع علیھا الطعام، واصلھا الطعام نفسہ"۔

(۹/۶۵۶-۶۵۷ ومابعد؛ حدیث: ۵۳۸۶ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے کبھی خوان پر کھانا نہیں کھایا اور نہ ہی سُکرجہ پر۔ موخر الذکر کے معنی پلیٹ یا پیالے کے ہیں اور فارسی سے معرب ہے: مصباح اللغات: چھوٹی پیالی؛ نیز ترمذی، ابواب الاطعمۃ؛ باب ما جاء علیٰ ما یاکل النبی ﷺ)

نطع/ انطاع

لغوی طور سے نطع کے معنی خاصے خوفناک ہیں۔ صاحب مصباح اللغات کے مطابق ''چمڑے کا فرش جو مجرم کو قتل کرنے کے لیے بچھایا جاتا ہے''۔ اس کی ایک اور جمع نطوع بھی بتائی ہے۔ اصلاً وہ چمڑے کی چادر/ چادروں/ فرش کے معنی رکھتا ہے خواہ بچھایا کسی مقصد سے جائے۔ نطع کا ذکر تو روایاتِ سیرت اور احادیثِ نبوی میں بہت ملتا ہے اور مغازی کے حوالے سے وہ سب سے زیادہ آتا ہے۔ (القاموس المحیط، ۳/ ۸۹ کے مطابق وہ چمڑے کی چادر تھی۔ بساط من الادیم)۔

عہدِ نبوی میں مجرم کھانا یا کھانے کی اشیاء ہوتی تھی جو اس پر رکھی جاتی تھیں اور کھائی جاتی تھی۔

- غزواتِ نبوی کے حوالے سے نطع یا انطاع پر کھانے کی اشیاء رکھ کر کھانے کی روایات زیادہ ملتی ہیں۔ ان میں بعض امہات المومنین کی شادی اور ولیمہ کی دعوتوں کے حوالے سے ان کا ذکر آتا ہے: مثلاً غزوۂ خیبر ۷/ ۶۲۹ء سے واپسی پر رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت صفیہ بنت حُیَی بن اخطبؓ سے شادی کرلی اور ولیمہ میں ایک چھوٹے دسترخوانِ چرمی پر حیس نامی کھانا کھایا: ''... ثم صنع حيسا فى نطع صغير ...'' حدیث: ۴۲۱۱ جب کہ حدیث ۴۲۱۳ میں ہے: ''... أمر بلالا بالانطاع فبسطت فالقى عليها التمر والاقط والسمن، فتح الباری، ۷/ ۵۹۷-۶۰۰؛ نیز واقدی ۷۰۸: ''... وكان قصاعهم الانطاع قد بسطت ... ياكل معهم على تلك الانطاع ...'' یعنی ان کے پیالے چمڑے کی چادریں تھیں جو بچھالی گئی تھیں اور رسولِ اکرم ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ ان چرمی چادروں پر کھاتے تھے۔

- ایک غزوہ کے دوران قوم/ لشکر کے تمام کھانے/ ازواد تمام ہوگئے تو رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کے مشورے سے اعلان کرادیا کہ جس کے پاس جو بچا ہو لے آئے اور پھر اس کے لیے نطع بچھایا گیا اور اس پر کھانا رکھا گیا... بخاری، باب الشركة فى الطعام الخ؛ مسلم: ۱۹۰ (۱۷۲۹)

- بخاری کے باب مايقول اذا فرغ من طعامه میں رسولِ اکرم ﷺ کے مائدہ/ دسترخوان کے اٹھانے کا ذکر ہے: ''كان اذا أكل رفع مائدته ...''

- غزوۂ تبوک ۹/ ۶۳۱ میں حضرت بلالؓ نے اپنے تھیلے سے جو مرغن کھجوریں صحابہ کرام

اور رسولِ اکرم ﷺ کے لیے نکالی تھیں ان کو ایک چمڑے کے چادر نما دستر خوان ہی پر رکھا تھا۔ (واقدی، ۱۰۱۸)

ظروف طعام

جفنۃ (پیالہ طعام)

احادیث و روایاتِ سیرت میں "جفنہ" کو بطور پیالہ طعام بھی بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پانی کی لگن یا نہانے کے برتن سے اس کی ساخت الگ ہوتی تھی یا اس کا سائز ہی اتنا بڑا ہوتا تھا کہ اس میں کثیر مقدار میں کھانا آ جائے جیسا کہ بعض صحابہ کرام کے کھانے کے پیالوں کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے متعدد کا ذکر ہدایائے طعام میں آ چکا ہے اور بعض کا اور ملتا ہے۔ اس بحث کے خاتمہ اور تکمیل کی خاطر ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔ احادیث میں بہر حال وہ ایک عام بڑے برتن کے معنی میں ہے کیونکہ اس میں رسولِ اکرم ﷺ اور بعض ازواجِ مطہرات کے نہانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

(حدیث ابی داؤد: ۶۸: اغتسل بعض ازواج النبی ﷺ فی جفنة فجاء النبی ﷺ لیتوضا منها — او یغتسل...")

- حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کا پیالہ طعام (جفنہ) کبھی گوشت کی ثرید اور کبھی کسی دوسرے عمدہ کھانے سے بھرا ہوا آتا تھا اور اس میں بہت سا کھانا ہوتا تھا اور وہ روز آتا تھا (ابن سعد، ۳/۶۱۴ وغیرہ)۔ اس عظیم و کبیر پیالے کے حجم و ضخامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام میں سے حاضرین مجلس جو دس بارہ ہوتے تھے پیٹ بھر کھا لیتے تھے اور پھر بھی وہ کھانا موجود رہتا تھا جو لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان میں ازواج مطہرات بھی شامل تھیں۔

- حضرت صفیہ اور بعض دوسری ازواجِ مطہرات کے ہدایائے طعام کے ضمن میں پیالہ طعام کا ذکر آ چکا ہے۔ "قصعہ" بھی اسے کہا گیا ہے۔ نسائی کی روایت میں اسے "طباق" (صحفہ) کہا گیا ہے۔ یہ سب مترادف الفاظ ضرور ہیں مگر مختلف برتنوں کے نام بھی ہیں۔

- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا جفنۂ ثرید اتنا بڑا تھا کہ اس پر ان کے تمام فرزندانِ گرامی اور

ساتھی جمع ہو کر کھا لیتے تھے۔ اور یہ اہتمام مکہ سے مدینہ کے سفر کے دوران ہوتا تھا: "... وکان له جفنة من ثريد يجتمع عليها بنوه واصحابه وكل من جاء حتى ياكل بعضهم قائما ..." (ابن سعد، ۴/ ۱۴۸)

- ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے مہر کے بارے میں ایک روایت بتاتی ہے کہ اس میں ایک "جفنه" بھی شامل تھا جس میں وہ آٹا گوندھ اور ثرید بنا سکتی تھیں: "... وجفنة تعجنين و تثردين فيها ..." (بلاذری، ۱/ ۴۳۱)

- غزوۂ تبوک کے دوران صحابہ کرام نے ثرید (حیس) سے بھرا ایک بڑا پیالہ (جفنة) رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے رکھا اور آپ ﷺ کے علاوہ ازواجِ مطہرات میں شریکِ غزوہ ازواج اور حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے مسلمانوں نے اس سے کھایا۔ (واقدی، ۱۰۹۴-۱۰۹۵)

قصعة (پیالہ)

بالعموم اس کو پیالہ کہا جاتا ہے لیکن احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق چھوٹے اور بڑے پیالوں بلکہ لگن وغیرہ پر بھی ہوتا تھا۔ "جفنه" کے بیان میں اس کا ذکر بھی آتا ہے اور روایات و احادیث میں ان کو مترادف بھی سمجھا گیا ہے جیسے حضرت "صفیہؓ" کا قصعہ تھا۔ بعض دوسری روایات میں بھی اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے جیسے چرمی چادروں کے لیے عمومی پیالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ خاص قصعہ کی روایات حسب ذیل ہیں:

- رسولِ اکرم ﷺ اور زوجہ مطہرہ حضرت میمونہؓ نے ایک ساتھ ایک ہی برتن - قصعة - سے غسل فرمایا جس میں گندھے آٹے کے اثرات موجود تھے: "... ان النبی ﷺ اغتسل و ميمونة من اناء واحد، في قصعة، فيها اثر العجين"

(ابن ماجہ، كتاب الطهارة، باب الرجل و المرأة يغتسلان من اناء واحد؛ ابن ماجہ کی اس روایت پر کوئی نقد نہیں ملتا ہے۔ کیونکہ یہی روایت یا اس جیسی روایت دوسرے معتبر ذخائرِ حدیث میں ہے)

- حضرت ام ہانیؓ ہی کی حدیث و روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسولِ اکرم ﷺ نے ایسے برتن/لگن سے غسل فرمایا جس میں آٹے کے اثرات تھے: "دخلت على النبی ﷺ يوم

فتح مکة وهو يغتسل، قد سترته بثوب دونه، فقصعة فيها اثر العجين"
(نسائی، كتاب الطهارة، باب الاغتسال فی قصعة فيها اثر العجين؛ یہ ممکن ہے کہ دونوں مذکورہ بالا روایات ایک واقعہ سے متعلق ہوں)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ایک پیالۂ طعام توڑنے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ان کے ہاں تشریف فرما تھے کہ امہات المومنین میں سے کسی نے رسولِ اکرم ﷺ کے لیے ایک پیالہ میں کھانا بھیجا۔ حضرت صدیقہؓ کو غیرت آئی اور انھوں نے اسے ہاتھ مار کر توڑ دیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے کھانا اٹھا کر دستر خوان پر رکھا اور کھایا کھلایا اور بعد میں ٹوٹا ہوا پیالہ رکھ لیا اور اس جگہ حضرت عائشہ کا پیالہ ام المومنین کو بھیج دیا: "ان النبی ﷺ كان عند بعض نسائه، فارسلت احدى امهات المومنين مع خادم بقصعة فيها طعام، فضربت بيدها، فكسرت القصعة فضمها وجعل فيها الطعام ... فدفع القصعة الصحيحة وحبس المكسورة" وغیرہ دوسری احادیث واطراف۔
(بخاری، كتاب المظالم، باب اذا كسر قصعة الخ؛ ابوداؤد، كتاب البيوع، باب فيمن افسد شيئا يغرم مثله، حدیث: ۲۹۷۰، ۳۵۶۷-۳۵۶۸: حضرت صفیہ کا پیالہ تھا جس کا کفارہ دیا گیا؛ ترمذی، ابواب الاحكام، باب ماجاء فی من يكسر له شئ الخ: پیالہ توڑنے والی کا نام حضرت عائشہ بتایا ہے)

صحفة (بڑا پیالہ)

ایک پیالے کو عربی میں "صحفة" کہا جاتا تھا، اس کی جمع صِحاف آتی ہے۔ بالعموم اسے بڑے پیالے کے لیے استعمال کرتے تھے اور وہ چشموں/ چشمے کے معنی میں بھی آتا ہے (مصباح اللغات)۔ بہر حال برتنوں میں پیالہ کی ایک خاص قسم تھی جو "صحفہ" کہلاتی تھی اور اس کا مختلف نام اس کی مختلف ساخت ہی کے سبب تھا۔ روایاتِ سیرت واحادیث میں اس کا بھی بہت ذکر آتا ہے۔ مگر بسا اوقات اس کو دوسرے الفاظ کا مترادف سمجھ کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ دوسری روایت میں جسے "صحفه" کہا گیا ہے وہ "قصعه" نہ ہو اور "صحفه" ہو جیسے گذشتہ بابِ قصعہ میں نسائی کی روایت میں اسے طباق اور صحفہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ طباق دراصل پیالے کے مقابلے میں زیادہ اتھلا اور پھیلا ہوا برتن ہوتا ہے یعنی اس میں گہرائی کم

ہوتی ہے۔ وہ لگن یا کشتی نما ہوتا ہے۔

غزوۂ تبوک میں ایک مقام پر جب رسد کی کمی تھی حضرت بلالؓ نے ایک پیالہ میں تھوڑی کھجوریں نکالیں اور رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک کو اس پیالہ (صحفہ) کے اوپر رکھ دیا اور صحابہ کرام میں سے کم از کم دس حضرات نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ (واقدی، ۱۰۳۷)

کھانا پکانے کے ذرائع:

تنّور (تندور)

آگ جلانے اور روٹی وغیرہ پکانے کے لیے تنور ہوتا تھا جسے اردو میں تندور بھی کہا جاتا ہے اور وہ زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے تنور کی تشریح میں ایک قیمتی نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اس میں روٹی پکائی جاتی ہے: "والتنور ما یخبز فیہ" (فتح الباری، ۱۵۲/۸)۔ حضرت نوح علیہ السلام کی کافر قوم پر عذاب الٰہی پر مشتمل سیلاب ایک تنور سے ہی پھوٹا تھا جیسا کہ کئی آیاتِ قرآنی میں آتا ہے۔ اس کی حکمت و مصلحت یہ تھی کہ تنور ایک مقام آتش ہونے کے سبب پانی کا متضاد تھا اور جہاں سے سان گمان بھی پانی ابلنے کا نہ تھا۔ سورۂ ہود۔۴۰: "حتی اذا جاء امرنا وفار التنور..." یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا، اور جوش مارا تنور نے..." سورۂ مومنون۔۲۷: فاذا جاء امرنا وفار التنور..." پھر جب پہنچے ہمارا حکم اور ابلے تنور..."

عہدِ نبوی کے تنور

تنور دو طرح کے ہوتے تھے: ایک ساجھے تنور جو محلّہ کے مختلف خواتین/گھروں میں مشترک ہوتے تھے اور دوسرے نجی تنور جو گھروں میں ہوتے تھے۔ وہ زمین میں گڈھے کھود کر بھی بنائے جاتے تھے اور زمین کے اوپر پتھروں کو خاص انداز سے جوڑ کر بھی بنائے جاتے تھے۔ اسی بنا پر ان کے نام بھی بعض اوقات مختلف ملتے ہیں۔

سانجھا/مشترکہ تنور

- عہدِ نبوی میں رسولِ اکرم ﷺ کا تنور بھی تھا اور آپ ﷺ کا ایک تنور سانجھا تھا۔ وہ

حضرت حارثہ بن نعمان انصاریؓ کے محلے میں ان کے خواتین کے ساتھ مشترک رہا تھا جہاں بیتِ نبوی کی خواتین بالخصوص باندیاں آپ ﷺ اور ازواج مطہرات کے لیے روٹیاں پکانے جاتی تھیں۔ آٹا وغیرہ گھروں میں گوندھ لیا جاتا تھا اور پھر اس کو تنور پر لے جا کر اس کی روٹیاں مل جل کر پکائی جاتی تھیں۔ (اسد الغابہ، ۲/۷۳)

گھریلو تنور

- حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ نے جنگِ خندق ۵/ ۶۲۷ کے زمانے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دعوت کے لیے جو کھانا پکایا تھا اس میں روٹیاں ان کے گھریلو تنور پر ان کی اہلیہ اور دوسری روٹی پکانے والی (خابزہ) نے نبوی ہدایات کے مطابق پکائی تھیں۔
- حضرت سلمان فارسیؓ کا تنور ان کے گھر میں واقع تھا اور اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا تنور بھی ان کے گھر ہی میں تھا۔ (ابن سعد، ۴/ ۹۳ اور ۱۵۴)
- حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد ماجد کے حوالے سے اپنے دادا حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت و واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ثنیۃ الوداع سے اترے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف توجہ فرمائی۔ اس وقت میرے جسم پر ایک پاٹ کی چادر تھی جو زعفر سے رنگی تھی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ تمہارے جسم پر کس قسم کی چادر ہے۔ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناپسندیدگی کی وجہ سمجھ میں آ گئی اور میں اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور وہ اس وقت اپنا ایک تنور جلا رہے تھے۔ میں نے وہ چادر اس تنور میں جھونک دی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے دوسرے دن چادر کے بارے میں پوچھا اور میں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اسے اپنی خواتین میں سے کسی کو کیوں نہ پہنا دیا... ".... وعلیّ ریطة مضرجة بالعصفر... فقال: ما هذه الريطة عليك؟ فعرفت مما كره، فأتيت اهلي وهم يسجرون تنوراً لهم فقذفتها فيه ..." (ابوداؤد، كتاب اللباس، باب في الحمرة؛ حديث: ۴۰۶۶)

بازار کا تنور

عہدِ نبوی اور اس سے قبل بھی غالباً اور بعد میں یقیناً بازار میں خبازوں کے تنور ہوتے تھے

کیونکہ ان میں کافی لوگوں/خریداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ یہ پیشہ وراور اجرت پر کام کرنے والے خباز ہوتے تھے یا خالص روٹی بیچنے والے خباز ہوتے تھے اوران سے روٹیاں پکی پکائی خرید لی جاتی تھیں۔ بعض روایات میں ان کا حوالہ آتا ہے:

- حضرت کعب بن مالکؓ کو غزوۂ تبوک میں عمداً شرکت نہ کرنے کے سبب سزائے مقاطعہ کا سامنا تھا۔ اس کی خبر جب قیصر روم/شاہِ غسان کو ہوئی تو اس نے حضرت کعبؓ کو پرچانے کے لیے ایک خط لکھا کہ تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہارے شایان شان قدر کریں گے۔ حضرت کعبؓ کو یہ خط بازار میں قیصر روم/شاہِ غسان کے ایلچی نے دیا۔ خط پڑھتے ہی حضرت کعبؓ کو ایک اور آزمائش کا احساس ہوا اور انھوں نے اس خط کو بازار کے تنور میں جھونک دیا: روایات سیرت میں بازار کا تنور کہا گیا ہے اور احادیث میں صرف تنور میں جلانے کا ذکر ہے"... حدیث بخاری: ۴۴۱۸:"فتیممت بها التنور فسجرته بها..."

(فتح الباری، ۸/۱۴۱ و ما بعد بالخصوص ۱۴۲ نے حافظ ابن مردویہ کے حوالہ سے ان کی روایت لکھی ہے کہ وہ بازار کا تنور تھا کیونکہ اسی بازار میں انھیں مذکورہ خط ملا تھا: فعمدت الیٰ تنور به فسجرته بها"؛ واقدی، ۱۰۵۲؛ ابن ہشام، ۴/۱۹۱:"... فعمدت بها الیٰ تنور فسجرته بها")

چولھا

آیت کریمہ مذکورہ بالا میں چولھوں پر چڑھی ہوئی دیگوں کا ذکر آیا ہے اور متعدد روایات سیرت وحدیث میں بھی چولھے کا ذکر ملتا ہے۔ بالعموم اس کے لیے بھی لفظ تنور استعمال کیا جاتا ہے لیکن اصلاً چولھا دوسری چیز ہے اور تنور دوسری۔ تنور میں خاص کر روٹی پکائی جاتی ہے جیسا کہ روایاتِ سیرت اور احادیثِ نبوی سے اس واقعہ کا اظہار ہم دیکھ چکے۔ جب کہ چولھے پر ہانڈی چڑھا کر اس میں سالن، گوشت، سبزی وغیرہ یعنی روٹی کی امدادی چیز/کھانا بھی پکایا جاتا ہے۔ روایات میں اس کی دلچسپ مثالیں اور وضاحتیں ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا کھانا پکانے کے ضمن میں ذکر آچکا ہے مثلاً حضرت جابر بن عبداللہؓ کی اہلیہ محترمہ نے گوشت کی پتھر کی ہانڈی (برمة) کے لیے تین پتھروں کو جوڑ کر چولھا بنایا تھا اور اس پر ہانڈی کو رکھا تھا۔ حدیث بخاری: ۴۱۰۱ میں ہے:"والبرمة بين الاثافي..."

- برمہ کا ذکر ہو یا قدر یا قدور کا، ان کے لیے ہمیشہ چولھے کا ذکر ملتا ہے جو تنور سے مختلف تھے اور روٹی اور سالن/گوشت پکانے کے ضمن میں ان دونوں کا ذکر ہمیشہ الگ الگ آیا ہے خواہ چولھے کا ذکر واضح نہ ہو۔

- قدور/پتیلیوں، ہانڈیوں وغیرہ میں کھانا پکانے کے لیے ایک عام تعبیر یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کو آگ پر رکھ دیا جاتا اور جب کھانا پک جاتا/گوشت گل جاتا وغیرہ تو اس میں دوسری چیزیں جیسے روٹی وغیرہ ملا کر ثرید بنائی جاتی یا سالن/گوشت کی ہانڈی اتار لی جاتی۔ ظاہر ہے کہ اس آگ کے لیے چولھے ہی بنائے جاتے تھے۔

(ابن سعد، ۳/۳۱۷: "... في القدور الكبار على النار...")

سامان رکھنے کے ظروف

انسانی معاشرت وتمدن میں مختلف چیزوں کو گھروں میں طرح طرح کی چیزوں میں رکھا جاتا ہے۔ ان میں غالباً سب سے زیادہ ضروری اور حیاتِ انسانی کے قیام وترقی کے لیے لازمی پانی لانے اور رکھنے کے ظروف تھے۔ ان کا ذکر ایک الگ ذیلی عنوان کے تحت آتا ہے کہ ان کی اقسام بھی بہت ہیں اور ان کی روایات بھی کافی ملتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وضو اور غسل اور طہارت کے ذکرِ خیر میں پانی کے ظروف کا ذکر بھی آتا ہے اور ان کی دینی اور تشریعی حیثیت سے ان کے حوالوں کا بھی۔ محدثین کرام نے ان ہی اسباب سے ان 'آبی ظروف' پر زیادہ توجہ کی ہے۔

دوسری ضروری شے اور حیاتِ انسانی کی اساس غلہ اور اناج ہے اور اس کے ظروف کا ذکر بھی آتا ہے لیکن وہ آبی ظروف کے مقابلے میں بہت کم ہے اور بالعموم روایات واحادیث کے ضمن میں آجاتا ہے کہ ان کی تشریعی اہمیت نہیں ہے۔

کھانوں اور کھانوں کی دوسری اشیاء کے رکھنے کے لیے بہت سے ظروف اور برتنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ایک خاص قسم روغنیات کے ظروف کی ہے۔ گھی، مکھن، تیل، چربی اور ان جیسی چیزوں کے رکھنے کی اشیاء کے نام متعدد بھی ہیں اور رنگارنگ بھی جیسے جراب، عکة، عكنة، الزق، النحي، حميت اور بعض متعدد دوسرے۔

دوسرے گھریلو ساز و سامان کے رکھنے کی اشیاء کا ذکر بھی ملتا ہے اگر چہ وہ خال خال اور ضمنی طور سے ملتا ہے۔ ان تمام رکھنے کے برتنوں کا ذکر اس خاص باب میں کیا جارہا ہے اوران میں سے ہر ایک کو اس کے تاریخی تناظر کے ساتھ اس کے تمدنی اور سماجی پس منظر میں بھی پیش کیا جارہا ہے کہ عہدِ نبوی کے تمدن میں ان ظروفِ حفاظت کی بھی خاصی رنگا رنگی تھی، اگر بہتات نہ تھی۔ اس باب خاص میں عربی زبان کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جراب (چمڑے کی تھیلی)

صاحبِ مصباح اللغات نے اس کے معانی لکھے ہیں: ''چمڑے کا برتن، تلوار کا میان وغیرہ اور جمع اجربة و جربٌ بتائی ہے''۔ احادیث میں وہ تھیلی اور کپی کے معنی میں آتی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے پینے کی چیزوں میں بالخصوص گھی، پنیر اور اس جیسی چیزیں ہدیہ کی گئی تھیں۔ ان کے لیے لفظ ''جراب'' ہی استعمال ہوا ہے۔ ان کو مدینہ منورہ میں بالخصوص اور دوسرے مقامات پر بھی کھونٹیوں سے ٹانگ دیا جاتا تھا۔ اسبابِ تمدن کے تسلسل کا واقعہ ہے کہ یہ تھیلی قدیم زمانے میں بھی تھی۔ اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام جب مکہ مکرمہ میں اول اول بسے تو ان کے پاس ایک ''جراب'' تھی جس میں کھجوریں تھیں اور ایک ''سقاء'' (مشکیزہ) تھا جس میں تھوڑا پانی تھا: ''ووضع عندهما جرابا فيه تمر و سقاء فيه ماء''

(حدیث بخاری: ۳۳۶۴ نیز ۳۳۶۵ جس میں سقاء کو ''شنہ'' کہا گیا ہے وغیرہ؛ فتح الباری، ۶/۴۷۸ و مابعد)

۔ اس ضمن میں ایک بہت دلچسپ اور اہم روایت کتب سیرت میں آتی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتحِ مکہ کے دن مکہ کے ابطح نامی مقام پر مقیم تھے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ کی بہن اور ان کے ساتھ ان کے شوہر کی بہن یعنی ان کی نند خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے ایک تھیلی ہدیہ کی جس میں پنیر اور گھی موجود تھا: ''قدمت علیٰ رسول الله ﷺ یوم فتح مكة، وهو بالابطح، اخت حليمة ومعها اخت زوجها، واهدت اليه جرابا فيه اقط ونحیّ سمن'' (بلاذری، ۱/۹۵)۔ یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ اوران

کے رشتہ داروں کے بارے میں ہماری معلومات کافی ناقص ہیں اور ان کی کچھ تلافی اس روایت سے ہوتی ہے۔

متعدد غزوات وسرایا میں مختلف چیزوں کی تھیلیوں (جراب) کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی ایک مترادف تھیلی "حمیت" ہے جس کی جمع حمتٌ ہے۔ اس کا ترجمہ بالعموم مشک کیا جاتا ہے اور ایسے "الـزِق" نامی شے کو بھی مشک بتایا جاتا ہے جب کہ وہ تھیلیوں کے قبیل سے ہیں۔ ان میں گھی، مکھن وغیرہ جیسی چیزیں رکھنے کا ذکر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا ترجمہ کپی اور کپے بھی کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عربوں میں یہ چیزیں مشکیزے جیسی چیزوں میں رکھی جاتی ہوں۔ اسی قسم کی تھیلی نما رکھنے کی چیز کو "عكنة" کہا گیا ہے جس کی جمع "عكن" ہے۔ ایک اور نام "النحی" ملتا ہے جو خاص کر گھی کی تھیلی تھی: "الزق الذی یحمل فیه السمن خاصة"۔ ان غزوات کے حوالے سے مختلف اشیاء کی تھیلیاں بیان کی گئی ہیں جیسے "جـرابِ شـحـم" (چربی کی تھیلی)، "جـراب اقط" (پنیر کی تھیلی)، "جـراب تمـر" (کھجور کی تھیلی)۔ ان میں سے متعدد کا ذکر کھانے کے باب میں گذر چکا ہے۔ ان میں سے ایک اور عکۃ بھی تھا جیسے "عكة زيت" (تیل کا کپا) (واقدی، ۸۶۸-۸۶۹: ۱۰۱۸، ۱۰۳۶، وغیرہ؛ ابن سعد، ۳/۳۱۴)

- غزوۂ تبوک کے دوران رسولِ اکرم ﷺ کے خزانچی اور سکریٹری حضرت بلالؓ نے اپنے حمیت (مشکیزے/تھیلے) سے کھجوریں نکالی تھیں جو گھی اور پنیر سے ملی ہوئی تھیں: "... ثم جعل یخرج من حمیت له فاخرج خرجات بیده من تمر معجون بالسمن والاقط..."

(واقدی، ۱۰۱۸؛ صحاح، ۲۴۷ میں اس کو کہا گیا ہے: "الزق الذی لا شعر علیه، وهو السمن" نیز ۱۰۳۷)

✪✪✪

کاٹنے اور کھودنے کے اوزار

سبزی، گوشت، پھل وغیرہ جیسی چیزوں کو کاٹنے کے لیے کچھ خاص اوزار ہوتے ہیں جیسے چاقو اور چھری وغیرہ۔ اسی طرح زمین کھودنے کے لیے بعض خاص اوزاروں یا چیزوں کا ذکر ملتا ہے جیسے پھاوڑا، کدال، کھرپا اور ان جیسی چیزیں۔ یہ تمام چیزیں اور ایسے سارے اوزار خواہ معمولی اور ان گھڑ قسم کے ہوں یا عمدہ اور بہترین ساخت کے، تقریباً تمام انسانی معاشروں اور تمدنوں میں رہے ہیں۔ عہدِ جاہلی اور عہدِ نبوی میں بھی وہ تھے اور ان میں سے بعض کا ذکر خاص احادیث میں ملتا ہے اور دوسری روایاتِ سیرت میں بھی۔

معول (کدال)

معول کے معنی کدال ہیں اور اس کی جمع معاول ہے (مصباح اللغات)۔ وہ پتھر توڑنے اور زمین کھودنے وغیرہ کے کام آتی ہے۔ اس کا اصل کارگر حصہ بالعموم لوہے کا ہوتا ہے جو دونوں اطراف میں نکیلا ہوتا ہے اور اس کی شکل نیم ہلالی ہوتی ہے۔ درمیان/ وسط میں اس کا ڈنڈا ڈالنے کا بڑا سا سوراخ ہوتا ہے اور اسی ڈنڈے کے زور پر اسے چلایا جاتا ہے۔ اس کے متعدد حوالے عہدِ جاہلی و عہدِ نبوی و اسلامی سے ملتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ سابقہ امتوں میں بھی مستعمل تھی۔

- حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی مشہور تعمیر کعبہ کے وقت کدال (معول) سے زمین کھودی تھی۔

- جناب عبدالمطلب ہاشمی نے چاہ زمزم کی نئی دریافت یا بازیافت میں اسی کدال سے زمین کی کھدائی کی تھی: "...فجاء بالمعول، وقام لیحفر حیث امر ..." (ابن ہشام، ۱/ ۱۵۷)

- رسولِ اکرم ﷺ نے اور دوسرے اکابر قریش نے کعبہ کی دوسری تعمیر کامل میں کدال سے کام لیا تھا۔ پرانی عمارت کو منہدم کرنے کا آغاز ولید بن مغیرہ مخزومی نے اسی کدال سے کیا تھا

اور بعد میں دوسروں نے اسے انہدام وتعمیر کے لیے استعمال کیا تھا: "فقال الولید بن المغیرہ: انا ابدؤکم فی ھدمھا، فاخذ المعول ثم قام علیھا ..." (ابن ہشام، ۱/۲۱۱ وما بعد)

- غزوۂ خندق، ۵/ ۶۲۷ میں مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے جو شمالی سمت میں عظیم و عریض اور عمیق خندق کھودی گئی تھی اس میں کدال/ معول کے علاوہ دوسرے اوزاروں اور سامانوں کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ خاص طور سے ایک سخت چٹان کے صحابہ کرام سے نہ ٹوٹنے کے واقعہ کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس سنگِ خارا کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور اپنی نبوی معجزاتی ضربوں سے فتوحات شام و یمن وغیرہ کی خوش خبری صحابہ کرام کو دی تھی۔ احادیث میں ان واقعات کا ذکر غزوۂ خندق کے باب کے علاوہ دوسرے ابواب میں بھی ہے۔

(ابن ہشام، ۳/ ۲۳۳ وما بعد؛ ابن سعد، ۲/ غزوۂ خندق ۴/ ۸۳: المعول: "عمل بہ المسلمون یوم الخندق")

المسحاۃ (بیلچہ)

ابن ہشام کی روایت میں اس سخت چٹان کے توڑنے کے سلسلہ میں دو اور اوزاروں کا ذکر ملتا ہے: فاس (کلہاڑی) مسحاۃ (بیلچہ/ گزنما): "... لاترد فاسا ولا مسحاۃ"

- حضرت سلمان فارسیؓ کے حصہ میں یہ سخت چٹان آ گئی تھی اور اس کے توڑنے کی روایات ان ہی سے مروی ہیں: "... فاخذ المعول من یدی، فضرب بہ ضربۃ لمعت تحت المعول برقۃ"۔ اسی طرح تین ضربات میں تین چمکیں/ برقات پیدا ہوئیں اور ان کے بعد آپ ﷺ نے عالمی اسلامی فتح کی بشارت دی تھی۔ (ابن ہشام، ۳/ ۲۳۴-۲۳۵)

احادیثِ بخاری: ۴۱۰۰ میں خندق کے کھودنے اور اس کی مٹی کو اپنے کاندھوں اور سروں پر منتقل کرنے کا ذکر ہے۔ اس میں کدال اور دوسری چیزوں کا ذکر نہیں ہے، نہ حافظ ابن حجرؒ نے کیا ہے۔ البتہ حدیث: ۴۱۰۱ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ وغیرہ صحابہ کے ہاتھ سے کدال لے کر چٹان کو پاش پاش کرنے کا ذکر ہے: "... فاخذ النبی ﷺ المعول فضرب فی الکدیۃ ..."

(بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الخندق؛ فتح الباری، ۷/ ۴۹۴ وما بعد وما قبل۔ حافظ ابن حجرؒ نے المعول کو المسحاۃ کا مترادف قرار دے دیا ہے صرف اس بنا پر کہ روایت احمد بن حنبلؒ میں المعول یا المسحاۃ کے لینے کے بارے میں راوی کو شک ہو گیا: "فاخذ المعول ... ای المسحاۃ – وفی روایۃ احمد "فاخذ المعول او المسحاۃ" بالشک؛ حالانکہ شک کی صورت میں وہ دو قسم کے اوزار معلوم ہوتے ہیں)

کلہاڑی/ فأس

لغوی اعتبار سے فأس کے معنی کلہاڑی ہیں اور اس کے فعل میں لکڑی کو کلہاڑی سے پھاڑنے کے معنی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کا مفعول لکڑی (الخشبۃ) لایا جائے۔ بہر حال اس صورت میں پھاڑنے کے معنی تو ہوتے ہی ہیں (مصباح اللغات)۔ وہ بھی چیزوں کو کاٹنے، توڑنے اور پھاڑنے کا ایک عام اوزار ہے جو ہر معاشرہ میں ملتا ہے۔ بالعموم اس سے لکڑی کاٹی اور پھاڑی جاتی ہے اور بعض اوقات دوسرے استعمالات بھی ملتے ہیں جیسے غزوۂ خندق کے دوران خندق کھودنے کے عمل میں حارج ایک سخت چٹان کو توڑنے کے سلسلے میں کلہاڑی کا ذکر آتا ہے۔ کدال کی مانند وہ بھی ہوتی ہے بس فرق یہ ہے کہ اس کا پھل لوہے کا ہوتا ہے اور خاصا چوڑا بالخصوص نچلا حصہ دھار دار ہوتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر ڈنڈا لگا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ چلائی جاتی ہے۔ (لسان العرب: فاس)

عہدِ نبوی میں اس کے استعمال کا ذکر خاص طور سے جنگل سے لکڑی کاٹ کر لانے کی روایات میں ملتا ہے اور وہ اس طرح لکڑہاروں کا بنیادی اوزار بن جاتا ہے۔ ان کے پاس دوسرے اوزار بھی ہوتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک تندرست و توانا شخص کو خیرات مانگتے دیکھ کر سرزنش کی اور کام کر کے کمانے کی ہدایت فرمائی۔ اس نے ناداری و لاچاری کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے اس کا واحد اثاثہ۔ پیالہ۔ منگوایا اور اسے دو درہم میں بیچ دیا اور ایک درہم اسے اس روز کا خرچہ عطا فرمایا اور دوسرے درہم سے کلہاڑی کا پھل خرید فرمایا اور اس میں ڈنڈا آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ڈالا۔ اور اسے ہدایت کی کہ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لائے اور بیچے اور اس شخص سعید نے ایسا ہی کیا اور چند روز میں وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لائق بن گیا۔

مساحی

معول اور مسحاۃ کو بسا اوقات مترادفات جان کر روایات میں بیان کیا گیا ہے اور مراد کدال ہی لی گئی ہے۔ ان دونوں میں فرق بہر حال ہے کہ الفاظ مختلف ہیں اور ان کے استعمال بھی مختلف نظر آتے ہیں جیسا کہ ابھی آتا ہے۔ اس سے اصلاً پھاوڑا یا بیلچہ مراد ہے جس سے

زمین کی مٹی کھودی جاتی ہے اور وہ ایک عام ضرورت کا اوزار ہے۔ اس کا پھل لوہے کا ہوتا ہے اور خاصا چوڑا جو نصف ہاتھ کے برابر بالعموم ہوتا ہے اور نچلا حصہ خاصا نکیلا یا دھاردار ہوتا ہے۔ اس سے مٹی آسانی سے کھودی جاسکتی ہے اور جاتی ہے۔ وہ زرعی اوزار بھی ہے اور تعمیراتی بھی۔ بعض اور بھی استعمالات ہیں۔

مختلف غزوات و سرایا کے حوالے سے بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور زرعی اور تعمیراتی کاموں کے سلسلہ میں بھی ان کے حوالہ سے بعض روایاتِ سیرت و حدیث کا اوپر ذکر آچکا ہے جو کدال وغیرہ کے بیان میں کیا جاچکا ہے۔ اس کی ایک مشہور اور المناک روایت رسولِ اکرم ﷺ کی قبرِ شریف کھودنے کے سلسلے میں ملتی ہے کہ پھاوڑے سے زمین کھودی گئی تھی۔ اور غالباً قبروں کو کھودنے کا کام اسی اوزار سے زیادہ کیا جاتا تھا جیسا کہ آج کل بھی رواج ہے۔ (بلاذری، ۱/ ۵۶۸)

چھری (سکین)

گوشت، سبزی یا اور کوئی چیز کاٹنے کے لیے چھری (سکین) کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ زوجۂ عزیز کی سہیلیوں کو موصوفہ نے ایک ایک چھری دے کر آزمایا تھا اور انھوں نے جمالِ یوسفی سے مبہوت ہو کر اپنی ہی انگلیاں کاٹ لی تھیں: ''... واعطت کل واحدۃ منھن سکینا وقالت اخرج علیھن، فلما راینہ قطعن ایدیھن...''۔

قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر اور مختلف واقعات کے حوالے سے چھری/ چھریوں کے استعمال کا ذکر عہدِ نبوی میں بھی آتا ہے۔ اور ان کی متعدد اقسام بھی ملتی ہیں اور ان اقسام کی بنیاد ان کی ساخت اور بناوٹ پر ہوتی ہے اور انھیں کے سبب ان کے مختلف نام بھی ہیں۔

عام لفظ ''سکین'' ہے جس کی جمع ''سکاکین'' آتی ہے۔ اور وہ ہر قسم کی چھری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے چھری سے گوشت کو کاٹنے اور کاٹ کر تناول فرمانے کا ذکر امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین نے مختلف کتب میں کیا ہے۔ حدیثِ بخاری: ۵۴۰۸ کے مطابق حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کو چھری سے بکری کے گوشت کاٹ کر کھاتے ہوئے دیکھا اور نماز کی اذان سنتے ہی چھری ہاتھ سے ڈال دی تھی: ''... فالقاھا والسکین التی یحتزبھا ...''

(بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب قطع اللحم بالسکین: اصلاً یہ حدیث کتاب الوضوء کی ہے: ۲۰۸ اور اس کے

متعدد اطراف ہیں: ۶۷۵، ۲۹۲۳، ۵۴۰۸، ۵۴۲۲، ۵۴۶۲؛ فتح الباری، ۱/۴۰۶ و مابعد)۔

فتح الباری، ۹/ ۶۷۷ نے سننِ ثلاثہ کے حوالے سے اسی معنی کی حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے نقل کی ہے کہ ان کے لیے رسولِ اکرم ﷺ نے چھری سے گوشت کاٹا تھا اور اذانِ بلال پر چھری رکھ دی تھی:... "فطرح السکین"۔ جن روایات یا احادیث میں چھری سے گوشت نہ کاٹنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ عجمیوں کا طریقہ ہے اور وہ بقول امام ابوداؤد قوی حدیث نہیں ہیں۔ حافظ موصوف نے نوچ کر کھانے کو بہر حال بہتر کہا ہے۔ مگر یہ ان کی ذاتی رائے اور خالص قیاس ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے علماء اور محدثین کا خیال ہے مگر اس سے بحث نہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے چھری سے کاٹنے کا عمل ثابت ہوتا ہے اور گوشت کاٹنے اور کھانے کا بھی۔ بہر حال چھری ایک عام ضروری گھریلو شے تھی اور وہ ہر گھر میں پائی جاتی تھی بلکہ بسا اوقات ایک سے زیادہ پائی جاتی تھیں کہ مختلف اشیاء کے لیے ان کی ضرورت پڑتی تھی۔ پیشہ ور افراد و طبقات جیسے قصابوں وغیرہ کے لیے تو ان کی مختلف چھریوں کا وجود ضروری تھا اور وہ طرح طرح کی ہوتی تھیں۔ ان میں سے "شفرۃ" چھری کی ایک قسم ہے جو چوڑے پھل کی ہوتی تھی جیسا کہ ابن اثیر نے کہا ہے: "السکین العریضۃ" (النہایۃ، ۲/ ۲۲۷)۔ صاحب مصباح اللغات نے اس کے متعدد معانی لکھے ہیں: "بڑی چوڑی چھری، تلوار کی دھار، نیزے کے پھل کا پہلو، موچی کی رانپی، ج شفر، شفار، شفرات)۔ اس کا ذکر حجۃ الوداع میں رسولِ اکرم ﷺ کے خطبہ یوم النحر کے ضمن میں ایک صحابی جلیل کے حوالے سے ملتا ہے۔ (واقدی، ۱۱۱۲)

دو دھار والی چھری

بالعموم ایک طرف ہی چھریوں میں دھار ہوتی ہے اور دوسرا حصہ خاصا موٹا ہوتا ہے، وہ بہر حال بلا دھار ضرور ہوتا ہے۔ لیکن بعض چھریاں دونوں طرف دھار رکھتی تھیں اور ان کو "سکین ذات طرفین" کا معنی خیز نام دیا گیا تھا۔ وہ دوہری دھار والی تھیں۔ حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ دوم کو ان کے قاتل فیروز نے ایسی ہی ایک دو دھار والی چھری سے زخمی کر کے شہید کیا تھا۔ اگرچہ یہ کچھ بعد کا واقعہ ہے کہ مگر عہد نبوی میں ایسی چھریوں کے وجود سے انکار کرنا مشکل ہے کیونکہ سماجی اور تمدنی معاملات میں دس پندرہ برس کچھ نہیں ہوتے۔ (ابن سعد، ۳/ ۳۴۷)

ماپ تول کے پیمانے

تمام دوسرے انسانی معاشروں اور ان کے تمدنوں کی مانند عہدِ نبوی میں بھی ماپ تول کے پیمانے تھے: یہ بھی انسانی تمدن کی ایک خاص جہت رہی ہے کہ بعض چیزوں کو وزن کے ذریعہ تولا جاتا ہے اور ان کو اوزان کہتے ہیں۔ ان اوزان کے مختلف بانٹ ہوتے ہیں۔ جن میں سب سے کم وزن کا بانٹ بھی ہوتا ہے اور سب سے زیادہ وزن کا بھی ہوتا ہے مگر زیادہ کاروبارِ حیات معیاری اوزان سے چلایا جاتا ہے جو روزمرہ کی زندگی اور کاروبار میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض اشیاء کو مختلف قسم کے پیمانوں میں ماپا جاتا ہے اور ان میں بھی قلیل ترین اور عظیم ترین کے درمیان معیاری ماپ ہوتے ہیں۔ ایک مشترکہ جہت یہ ہوتی ہے کہ بسا اوقات وزن کی جانے والی چیزوں کو ماپا بھی جاتا تھا اور ماپ کے ذریعہ لین دین ہوتا تھا۔ ان دونوں کے لیے الگ الگ عربی الفاظ بھی ہیں اور وزن اور ماپ/ ناپ کے الگ الگ پیمانے بھی۔

اوزان: تولنے کے لیے قرآن مجید میں ''وزن'' کا لفظ متعدد آیات کریمہ میں آیا ہے: مطففین-۳؛ اسراء-۳۵؛ شعرا-۱۸۲؛ اعراف-۸، رحمٰن-۹؛ کہف-۱۰۵؛ حجر-۱۹۔ ان میں اس کے مشتقات بھی شامل ہیں: پھر اس وزن کرنے کے آلے- ترازو- کے لیے المیزان کا ذکر نو آیات کریمہ میں ہے اور موازین کا چھ آیات کریمہ میں۔ ان دونوں کے علاوہ ایک اور لفظ ''قسطاس'' کا ذکر مذکورہ بالا سورۂ اسراء اور شعراء میں کیا گیا ہے جس میں معنی ترازو ہیں۔ ان آیاتِ کریمہ میں تین چار طرح کے انسانی رویوں کا ذکر ہے:

۱- خود اپنے لیے وزن/ ماپ کریں تو پورا وزن لے لیں اور دوسروں کو دیں تو وزن اور ماپ میں کمی کر دیں۔

۲- صحیح وزن اور ٹھیک ماپ کے ذریعہ لین دین کرنے کی ہدایت ربانی ہر قوم کو دی گئی ہے اور قریش کو بھی۔

۳- اعمال صالحہ/سیئہ کا بھی وزن ہوتا ہے جو آخرت میں ترازو میں تولے جائیں گے اور جن کے ترازو میں اعمال صحیح تلیں گے وہ کامیاب ہوں گے اور دوسرے ناکام۔

ماپ/ناپ: ماپنے یا ناپنے کے لیے عربی اور قرآنی لفظ ''کیل'' ہے اور اسی سے متعدد پیمانے بنے ہیں۔ اوزان میں مذکورہ بالا آیات کریمہ میں مطففین، اسراء، انعام ۱۵۲، اعراف - ۸۵؛ ہود -۸۴- ۸۵ میں ان کا ذکر ہے۔ان میں بھی مذکورہ بالا تین بالخصوص اول الذکر دو کا بیان پایا جاتا ہے کہ صحیح ماپ دیں اور لیں اور بے ایمانی نہ کریں۔

روایاتِ سیرت واحادیث میں بالخصوص اور مکی - مدنی معاشی زندگی میں بالعموم ان دونوں پیمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ان میں زیادہ تر عام پیمانوں کا حوالہ ملتا ہے اور خاص وزن یا معیاری تول کے پیمانوں کا بھی۔ان میں سے عمومی پیمانوں کا ذکر:

عام ماپ کے پیمانے کے لیے لفظ کیل کے متعدد مشتقات ملتے ہیں جیسے مکیال، مکتل، مساحی، کرازین وغیرہ۔ مکاتیل وکرازین کا ذکر غزوۂ خندق کھودنے کے حوالے سے آیا ہے اور اسی طرح غزوۂ خیبر میں یہودی اجیروں کے حوالے سے ملتا ہے۔لغوی اعتبار سے وہ سب ناپنے/ماپنے کے پیمانے ہیں اور ان میں خاص ماپ/وزن/مقدار کا لحاظ نہیں کیا جاسکتا ہے۔جنس - غلہ واناج - اور پھل پھلاری اور کھجور وغیرہ کے لیے ان کا عام استعمال ہوتا تھا کہ وہ اسی کے لیے بنے تھے۔لیکن اسی کے ساتھ ان کے بعض سماجی اور تمدنی بلکہ غیر تہذیبی استعمالات ملتے ہیں کیونکہ فطرت انسانی سے انحراف ایسے ہی ناروا رویے پیدا کرتا اور ایسے غیر معقول و ناپسندیدہ استعمالات واظہارات سکھاتا ہے۔

- رسولِ اکرم ﷺ کے دو شری پڑوسیوں میں سے ایک مکی پڑوسی عقبہ بن ابی معیط اموی بھی تھا، دوسرا ابولہب بن عبدالمطلب ہاشمی تھا۔ دونوں قریب کے عزیز و رشتہ دار بھی تھے لیکن اسلام کی وجہ سے خاص دشمن جان عقبہ بن ابی معیط اموی دشمنی میں اپنے ماپ کے پیمانے میں گندگی بھرتا اور رسولِ اکرم ﷺ کے دروازے پر ڈال دیا کرتا: ''ان عقبة بن ابی معیط عمد الیٰ مکتل فجعل فیه عذرة ثم القاه علیٰ باب رسول الله ﷺ ...'' دوسرے کا بھی یہی رویہ تھا۔ (بلاذری، ۱/۹۵)

رطل، مد، صاع، الفُرق وغیرہ خاص وزن/ ماپ کے پیمانے تھے جو عہد جاہلی سے استعمال ہوتے آ رہے تھے: ان کے لغوی اور ''وزنی'' معانی یہ ہیں:

رطل: ''بارہ اوقیہ کا ایک وزن، ۴۰ تولہ، ج ارطال'' (مصباح اللغات)

زکوٰۃ و صدقہ کے احکام کے ابواب میں اس کا ذکر آتا ہے۔

مُدٌّ: ''ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل عراق کے نزدیک دو رطل اور اہلِ حجاز کے نزدیک ایک اور تہائی رطل ہے'' (مصباح اللغات)

عام طور سے ابواب طہارت میں مد کا ذکر آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ایک مد سے وضو کرتے تھے اور دو مد سے غسل۔ ان دونوں کا ذکر ازواج مطہرات اور دوسرے صحابہ و صحابیات کے طہارت کے اعمال کے حوالے سے بھی آتا ہے۔

صاع: ''ایک قسم کا پیمانہ جو اسی روپے کے سیر سے ساڑھے تین سیر کے مساوی ہے، ج اصواع وغیرہ'' (مصباح اللغات)۔ آج کل کلو کے حساب سے اس کا وزن ہوتا ہے: تین کلو چھ سو گرام۔

ابوابِ طہارت اور ابواب صدقہ و زکوٰۃ کے علاوہ خرید و فروخت کے حوالے سے صاع کا ذکر آتا ہے اور اسے بالعموم ایک معیاری اور معمول کا پیمانہ سمجھا جاتا تھا۔

فرق

صاحب مصباح اللغات نے ''الفُرق'' کو صرف ''ناپنے کا ایک برتن'' بتایا ہے، مگر اس کی ضخامت کا ذکر نہیں کیا۔ بہر حال روایاتِ سیرت و حدیث میں اسے ایک بڑا برتن بتایا گیا ہے اور بعض میں صاع سے کہیں زیادہ بڑا اور ضخیم۔ شارح/محشی ابن ہشام نے ''الفرق'' کے دو املا دیے ہیں: ایک ف کے پیش کے ساتھ اور دوسرا زبر کے ساتھ (بقول ثعلب وغیرہ)۔ اس کی وسعت کے بارے میں بھی دو قول ہیں: ایک اس میں سولہ مد چیز سما جاتی تھی: ''میکال یسع ستة عشر مدا'' اور دوسرا وہ بارہ رطل کے برابر پیمانہ تھا: ''یسع اثنی عشر رطلا''

(دار الفکر طباعت ۱۹۳۷ء، ۳/۳۲۰-۳۳ وما بعد)

- اس کا ایک حوالہ مکی عہد میں قریشی اکابر کی اسلام و رسول دشمنی کے حوالے سے آتا ہے۔ ابی بن خلف جمحی نے ایک بہت قیمتی گھوڑا خرید کر پالا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے روزانہ ایک فُرق دانہ کھلاتا ہوں اور اس پر چڑھ کر آپ ﷺ کو قتل کروں گا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے: بلکہ میں ہی تجھے قتل کروں گا انشاءاللہ: "... **ان عندی العوذ فرسا، اعلفه کل یوم فرقا من ذرة، اقتلک علیه...**"

(ابن ہشام، ۲/۸۴؛ مصباح اللغات کے مطابق "ذرة" مکئی کو کہتے ہیں اور وہ انسانوں کی غذا بھی تھی اور جانوروں کا چارہ بھی۔ وہ دشمنِ اسلام اپنے اسی گھوڑے پر رسولِ اکرم ﷺ کے دست مبارک کے معمولی چرکے کی بنا پر غزوۂ احد میں مارا گیا۔ اس بیان میں بہر حال ایک خاص گھوڑے کے روزانہ دانے کا ایک عمومی تخمینہ بھی ملتا ہے)

ترازو (مکیال)

سورۂ تطفیف / مطففین میں جس سماجی اور تمدنی خرابی کا ذکر ہے اور جس کے سبب حضرت شعیبؑ کی قوم پر عذاب نازل کیا گیا وہ چیزوں کو کم وبیش تولنے کی بری اور عالمی عادت اور آفاقی خباثت ہے۔ تجارت پیشہ اور دوسرے طبقاتِ حرص و ہوا جب دوسروں کو تول کر دیتے تو کم تولتے اور جب اپنے لیے تول کر لیتے تو زیادہ تول کر لیتے تھے۔ اس کارِ فریب کے لیے وہ نہ صرف بانٹ / تولنے والے میں ہیرا پھیری کرتے تھے بلکہ ترازو بھی دوغلے رکھتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ دوسیؓ فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنے علاقے سراۃ سے خیبر آئے تو اپنے وطن مالوف میں اپنے ایک چچا کو چھوڑ کر آئے تھے جن کے پاس دو قسم کے ترازو تھے: ایک زیادہ تولنے والا تھا اور دوسرا کم تولنے والا: "...**ترکت عمی بالسراة، له مکیالان: مکیال یطفف به، ومکیال یتنجس به (یتنجس: ای نقص)**۔ اور یہ صرف ایک خاص علاقے کا معاملہ نہ تھا۔ اس کاروبار فریب میں دوسرے عرب بھی شامل تھے البتہ بہت سے مسلم اور غیر مسلم تجار اور زراعت پیشہ ایسے بھی تھے جو صحیح ماپ تول کرتے تھے کہ وہ منصف مزاج تھے۔ (واقدی، ۶۳۷)

ترازو اور بانٹ کا ذکر دوسری روایات بالخصوص احادیث کی کتب البیوع میں بھی ملتا ہے۔

✪✪✪

تفریحات: مختلف کھیل

تفریح، مجلس آرائی اور سرور ونشاط کشید کرنے کا ایک پسندیدہ ذریعہ تمام انسانی تمدنوں
یں کھیل کود رہے ہیں۔ عرب جاہلی سماج میں ان کی بہت سی ناجائز صورتیں بھی رواج پا گئی
تھیں۔ ان میں جانوروں، پرندوں کو باندھ کر نشانہ بنانے، شرط لگا کر گھوڑے دوڑانے، قمار اور
جوا کے لیے تیر اندازی کرنے وغیرہ کے بیدردانہ مشاغل واقسام کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان میں
مخلوقات کو نقصان پہونچانے، مالی ضرر کا بوجھ ڈالنے کے علاوہ انسانی فطرت میں شقاوت و بیرحمی
کے جذبات پیدا کرنا زیادہ نقصان دہ تھا۔ اسلام نے تفریحات کی دو اقسام قرار دی ہیں: جائز اور
ناجائز اور تمام ضرر رساں مشاغلِ تفریح کو ممنوع کہا ہے۔

جائز و مباح اور جسم وجاں کے لیے مفید اور اخلاق وکردار کے لئے صحت افزا تفریحات کو
پسند بھی کیا اور ان کو تحریک بھی دی۔ اسی کے ساتھ ان کی حد بندی اور پابندی کی حدود مقرر
کردیں۔ تفریحات میں حد سے زیادہ انہماک کو نامناسب بتایا۔ وقت اور توانائی کی بے جا
بربادی نے ان کی حرمت یا کراہت پیدا کی، اس سے اخلاق وکردار میں آنے والی افراط بھی اس
کی ذمہ داری تھی البتہ انسان کی فطرت اور توانائی کو جلا بخشنے کے لئے نہ صرف جائز تفریحات اور
کھیل کود کی اجازت دی بلکہ اس کو پسند بھی کیا۔ ان کی پسندیدگی کی سب سے بڑی شہادت
رسولِ اکرم ﷺ کی بنفس نفیس ان میں شرکت، اجازت اور تحریک کی روایات ہیں۔

عہدِ نبوی کے حوالے سے متعدد قسم کے کھیل کود اور دوسری تفریحات کا پتہ چلتا ہے کہ
واقعات وروایات خاصی تعداد میں ہیں۔ ان میں تیر اندازی، شہسواری، تلوار و نیزہ بازی وغیرہ
کے حربی کھیل بھی ہیں جو بالعموم ماہرین اور وہ بھی مرد حضرات کھیلتے تھے۔ بچوں اور لڑکوں کے
ملک مردانہ قسم کے کھیل کود ہیں۔ بعض روایات میں لڑکوں اور لڑکیوں کے مشترکہ کھیلوں کا بھی

ذکر ملتا ہے۔ معصوم بچیوں اور لڑکیوں کے خاص نسوانی کھیلوں کا ذکر بہت دلچسپ انداز میں ملتا ہے۔ خواتین اور عورتوں کے بعض تفریحی مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔ ان تمام اقسام وانواع کے کھیلوں کا الگ الگ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ان کی تفریحی نوعیت کے ساتھ ان کی اسلامیت بھی معلوم ہو۔

فوجی کھیل

موجودہ اصطلاح میں مارشل آرٹس (Martial arts) کہلانے والے کھیل کوئی جدید دور کی پیداوار نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے فوجی کھیل زیادہ دلچسپ، معنی خیز، توجہ انگیز اور نشاط وفرحت بخش ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ خالص فوجی نوعیت کی تربیت بھی فراہم کرتے تھے اور ان ہی کی جنگی اور ماہرانہ صورتیں میدانِ جنگ میں اختیار کی جاتی تھیں۔ عہدِ نبوی میں ان کی یہی دوگانہ صفات تھیں جن کے سبب ان کی اجازت دی گئی، ان کی تحریک کی گئی اور ان کی سرپرستی کی گئی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف طبقات وافراد کو تیراندازی، شہسواری، تلوار بازی اور نیزہ اندازی، حربہ انگیزی اور دوسرے فوجی کھیلوں کی ہمت افزائی کی اور صحابہ کرام کو ان کے حصول اور کمال پر اکسایا بھی۔ اور بنفس نفیس ان میں شرکت بھی کی کتبِ حدیث وسیرت میں نبوی ارشادات وسنن کا ایک ذخیرہ ملتا ہے۔ انھیں کی بنیاد پر ان فوجی کھیلوں کا ایک خاکہ پیش ہے۔

(بالعموم یہ کتاب الجهاد و السير کے ابواب ہوتے ہیں جیسے بخاری، باب التحريض على القتال، باب السبق من الخيل، باب التحريض على الرمي وغیرہ؛ حدیث بخاری: ۲۹۰۱ کے مطابق حضرت عمرؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس اہلِ حبشہ کو ہتھیاروں سے کھیلتے دیکھ کر روکنا چاہا تو آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو منع کردیا)

نیزہ وتلوار بازی

عیدین کے کھیل اور تفریح کے حوالے سے بہت مشہور حدیث گذر چکی ہے کہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ میں حبشی حضرات مسجدِ نبوی کے صحن میں اپنے کمالات نیزہ بازی اور تلوار بازی کے دکھایا کرتے تھے۔ اور رسولِ اکرم ﷺ حضرت ام المومنین عائشہؓ کو بنفس نفیس ان کے فوجی کھیل

دکھاتے تھے۔ اس واقعہ سے اور اس کی شروحِ محدثین سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مستقل قسم کے کھیل تھے صرف ایک موقعہ پر پیش نہیں کیے گئے تھے بلکہ ہر عید پر ان کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کھیلنے والوں کے لیے اجازت بلکہ منشائے نبوی حاصل تھا۔ اصولِ تقریر کے سبب ان کی نوعیت دو چند ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ ان کا کھیلنا مباح و جائز تھا تو ان کا دیکھنا اور دکھانا بھی جائز تھا ورنہ رسولِ اکرم ﷺ ان کو اپنی حرمِ محترم کو کیوں دکھاتے؟ اسی سے یہ دقیق نکتہ بھی نکلتا ہے کہ مردانہ کھیلوں کو عورتوں اور پردہ نشینوں کے لیے دیکھنا دکھانا بھی مباح ہے۔ بعد کے بعض اتقا پسند شارحین و علماء نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ان فوجی کھیلوں کے دیکھنے کے سلسلے میں متقشفانہ انداز اختیار کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ کی بحث میں بھی یہ موجود ہے اور بعض دوسرے تعمق پسندوں کے ہاں بھی۔ بعض نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ صرف اسلحوں اور کرتبوں پر نظر رکھتی تھیں اور کھیلنے والوں کو دیکھتی ہی نہ تھیں۔

تیراندازی

تیراندازی ایک جنگی مہارت ہے اور وہ فوجی تربیت کا ایک حصہ بھی ہے کیونکہ جدال و قتال کا وہ ایک انتہائی مؤثر ذریعہ و طریقہ بھی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے تمام ممالک اور تمدنوں میں اس کو ایک فنِ حرب کی حیثیت حاصل تھی اور جزیرہ نمائے عرب بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس کی تربیت اور مہارت کا ابتدائی مرحلہ تفریح و کھیل کی نوعیت بھی رکھتا تھا۔ کمسنی سے ہی بچوں کو اس کی تربیت دی جاتی تھی۔ مہارت کے بعد بھی ماہرین اسے بطور فوجی کھیل کھیلتے تھے اور اپنے تماشائیوں کو نشاط و سرور عطا کرنے کے علاوہ ان کو خاص تربیت بھی بخشتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بھی اپنے لڑکپن میں تیراندازی کی مشق کی تھی اور بطور تفریح بھی اس کا استعمال کیا تھا۔ عرب بچے اور بچیاں تیراندازی کو بطور ایک تفریحی مشغلہ کے بھی اختیار کرتے تھے اور آج بھی اس کے خاص تفریحی پہلو اور زاویے ملتے ہیں، تیراندازی کے کھیل کے بہت سے واقعات تو نہیں ملتے تاہم ان کی روایات کا ایسا توڑا بھی نہیں ہے:

- حضرت سلمہ بن اکوع ؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا گذر قبیلہ بنو اسلم کے کچھ لوگوں پر ہوا تو ان کو تیر اندازی کرتے ہوئے پایا۔ آپ ﷺ نے ان کو بنو اسماعیل قرار دے کر خطاب فرمایا کہ تمہارے جدامجد بھی تیر انداز تھے لہٰذا تم تیر اندازی کرتے رہو اور میں بھی بنو فلاں کے ساتھ ہوں۔ دوسرے فریق نے تیر چلانے سے اپنے ہاتھ روک لیے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو کیا ہو گیا، تم تیر کیوں نہیں چلاتے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہم کیسے تیر چلائیں کہ آپ ﷺ تو ان کے ساتھ ہیں۔ فرمایا تم بھی تیر چلاؤ اور میں تم سب کے ساتھ ہوں۔

(بخاری، حدیث: ۲۸۹۹ نیز اطراف: ۳۳۷۳، ۳۵۰۷)

ظالمانہ کھیل

عرب جاہلی تمدن میں تیر اندازی کا ایک ظالمانہ کھیل یہ تھا کہ پرندوں اور جانوروں کو کسی چیز سے باندھ دیتے تھے اور پھر ان پر تیروں سے نشانہ لگاتے تھے۔ یہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور متعدد دوسرے مقامات پر نوجوانوں کا بڑا پسندیدہ کھیل تھا رسولِ اکرم ﷺ نے اس کو قطعی ممنوع قرار دیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ محض تفنن کی خاطر پرندوں اور جانداروں کو مارنا اور نشانہ بنانا قساوت تھی۔

شہسواری/جمل سواری

عرب تمدن اور فوجی سماجی زندگی میں شہسواری کو ایک خاص مرتبت، عظمت اور اہمیت حاصل تھی۔ مردوں کی مردانگی کا تو وہ ایک معیار و عیار تھا ہی، خواتین بھی اس میں مہارت پہونچاتی تھیں کہ شہسواری مختلف مقاصد کی حامل تھی۔ کسی مرد کے لیے یہ باعثِ عار سمجھا جاتا تھا کہ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر مردانہ وار نہ بیٹھ سکے۔ بزدل ہی اس کے متحمل ہو سکتے تھے۔ بعض احادیث میں یہ دلچسپ درخواست بھی بعض صحابہ کرام کی جانب سے خدمتِ نبوی میں گذاری گئی کہ گھوڑے کی پیٹھ پر وہ جم کر نہیں بیٹھ پاتے لہٰذا ان کی یہ کمزوری دور ہو اور آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی اور کئی کمزور پشت حضرات کو صلابت کی دولت عطا ہوئی۔ رسولِ اکرم ﷺ کی

شہسواری معروف تھی اور اس مقصد کے لیے آپ ﷺ کے پاس کئی گھوڑے، اونٹ وغیرہ رہتے تھے اور بعض خاص مواقع پر ان کی سواری کا ذکر دوسرے اسباب معاشرت کے حوالے سے آتا ہے جیسے اچانک حملہ کی خبر سن کر آپ ﷺ نے حضرت انس بن مالکؓ کے خاندان کا مندوب نامی گھوڑا مستعار لیا تھا اور حالات کا بذات خود پتہ لگایا تھا۔ آپ ﷺ کا اللُحیف نامی گھوڑا حضرت سہلؓ کے احاطہ میں باندھا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے گھوڑے تھے۔

(احادیث بخاری: ۲۸۵۵-۲۸۵۶: فتح الباری، ۶/۷۲ و مابعد، حضرت سہل کے والد حضرت سعد کے پاس رسولِ اکرم ﷺ کے تین گھوڑے پرداخت کے لیے رہتے تھے۔ ان کے نام تھے: لزاز، الظرب، اللحیف / اللخیف''، ان میں سے بعض ہدایا میں آئے تھے)

دوسرے مقاصد اور فوائد کے علاوہ شہسواری کو بطور تفریحی مشغلہ اور کھیل کے طور پر بھی استعمال کرنے کی روایات ملتی ہیں:

- رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں متعدد احادیث و روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابہ کرام سے شہسواری کے مقابلے کیے اور ان میں ہمیشہ اول و بامراد رہے۔ اسی طرح اونٹ کی دوڑ کے بھی کئی واقعات میں شرکتِ نبوی ملتی ہے۔ آپ ﷺ کے پاس کئی گھوڑے اور اونٹ تھے جن کا اصل مقصد تو جہاد و قتال تھا مگر ان کو ان جائز تفریحات میں بھی استعمال کیا گیا۔

- **شہسواری:** رسولِ اکرم ﷺ نے حفیا نامی مقام سے ثنیۃ الوداع کے درمیان چھ میل کی مسافت مقرر کی اور واپسی کی مسافت ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک اور آپ ﷺ نے اس میں بنفس نفیس حصہ لیا۔ (بلاذری، ۱/۵۱۰)

- حالتِ امن میں مدینہ کے مختلف مقامات پر شہسواری کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ ان میں دوسرے صحابہ بھی حصہ لیتے تھے۔ مذکورہ بالا مقابلہ میں حضرت ابن عمرؓ نے بھی حصہ لیا تھا۔ بلاذری کی روایت کی تصدیق حدیث بخاری -۲۸۶۸-۲۸۸۰ سے ہوتی ہے۔ (فتح الباری، ۶/۸۷ و مابعد)

- دورانِ غزوات بھی آپ ﷺ نے بعض شہسواری کے مقابلوں میں برابر شرکت فرمائی۔

- اونٹ کی دوڑ میں آپ ﷺ کی مشہور اونٹنی العضباء ہمیشہ اول آتی تھی۔ ایک بار نہیں

کئی بار مسابقہ میں ایسا ہوا، ایک بار ایک اعرابی سے آپ کی مسابقت ہوئی تو ناقۂ نبوی نے جیت درج کی مگر دوسری بار ایک اعرابی کی اونٹنی سے وہ ہار گئی۔ صحابہ کرام کو ناقۂ نبوی کی شکست پر حد سے زیادہ ملال ہوا مگر آپ ﷺ نے کھیل کا اصلِ اصول اور صحیح روح اپنے ارشاد سے اجاگر کی کہ مسابقت میں تو یہی ہوتا ہے، کبھی کسی کو جیت ملتی ہے اور کبھی کسی کو، اس میں حد سے زیادہ مسرت اور بے انتہا ملال کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ اصولِ الٰہی بھی بیان فرمادیا کہ فتح و شکست تو اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر اور فیصلہ کی کارفرمائی ہے کہ جسے چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد بلاغت وحکمت کا شاندار کلمہ ہے: "ان حقا علی اللہ ان لا یرفع الناس شیئا الا وضعه" (بلاذری، ۱/۵۱۲؛ احادیث بخاری: ۲۸۷۱-۲۸۷۲؛ فتح الباری، ۶/۹۰-وما بعد میں کلمہ جامعہ نبوی ہے: "حق علی اللہ ان لا یرتفع شیء من الدنیا الا وضعه")۔ بعد کی احادیث بخاری: ۲۸۷۳-۲۸۷۴ میں رسولِ اکرم ﷺ کے سفید خچر اور اس پر سوار ہو کر غزوۂ حنین میں شرکت وثبات کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام قرطبیؒ وغیرہ کے حوالے سے بہرحال شہسواری کے مقابلوں کے جواز یا استحباب پر بحث بھی پیش کی ہے۔ استحباب اور اباحت کے درمیان اس کے گردش کرنے کا معاملہ دراصل مسابقت کے مقصد اور باعث پر منحصر ہے۔ اسی طرح مسابقہ کے نقطۂ آغاز اور مقام انتہا دونوں کو مقرر کرنے کی مشروعیت بھی ملتی ہے۔ یہ دینی اور تشریعی توجیہات بھی ہیں (۶/۸۹)

شہسواری کے مسابقانہ کھیلوں میں حصہ لینے کے علاوہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے تسکینِ شوق اور تربیتِ اخلاق کی خاطر باقاعدہ مقابلے بھی اہتمام کے ساتھ کرائے اور ان میں اپنے گھوڑوں کو صحابہ کرام کے ذریعہ مقابلے میں دوڑایا:

- ایک مقابلۂ شہسواری میں جب شہسوار دستہ طلوع ہوا تو رسولِ اکرم ﷺ اپنے زانوؤں کے بل بیٹھ گئے اور صف سے اپنا سرِ اقدس آگے کر لیا گویا ہمت افزائی فرما رہے ہیں کیونکہ اس گھوڑ دوڑ میں آپ ﷺ کا ایک گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ ایک اور ہدایت کے مطابق ایک دوڑ میں رسولِ اکرم ﷺ کے تین گھوڑوں - لزاز، ظرب اور سکب نامی - نے حصہ لیا اور اول الذکر نے اول اور باقی دو نے دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی اور آپ ﷺ کو اس سے بے اندازہ خوشی ہوئی کہ فطری بات تھی۔ (بلاذری، ۱/۵۱۰)

- حضرت سعد بن مالک ساعدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کے ظرب نامی گھوڑے پر دوڑ میں حصہ لیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے مجھ کو ایک یمنی چادر عطا فرمائی جو ان کے پوتے حضرت عباس بن سہل بن سعد کے پاس موجود تھی۔

- دوسرے صحابی حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ ساعدی نے رسولِ اکرم ﷺ کے دوسرے گھوڑے لزاز پر مسابقہ میں حصہ لیا اور غالباً جیت کی خوشی میں رسولِ اکرم ﷺ سے ایک حلۂ یمانی انعام میں پایا۔ (بلاذری، ۱/۵۱۰)

شہسواری کے ان مقابلوں میں روایاتِ سیرت سے بعض عمدہ، فطری اور حوصلہ افزا نتائج نکلتے ہیں:

۱- محض تفنن اور عربوں کی روایت شہسواری کی پیروی میں ان کھیلوں اور مسابقوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

۲- ان کے بہرحال دوسرے فوائد بھی تھے اور حکمتیں بھی: گھوڑوں کو چاق و چوبند رکھنا اور مسلمانوں کو چست رکھنا بھی مقصود تھا۔

۳- رسولِ اکرم ﷺ نے اور صحابہ کرام نے اپنے اپنے گھوڑوں/اونٹوں پر مسابقہ میں حصہ لیا جو عام طریق و رواج تھا۔

۴- دوسروں کو مستعار دے کر اپنے گھوڑوں سے مسابقت میں حصہ لینے کی بھی ایک سماجی اور تمدنی روایت عہدِ نبوی میں تھی۔

۵- جیت پر انعام دینے کی سنت ملتی ہے اور دو دو مسابقہ میں حصہ لینے والے صحابہ کرام کو انعام سے سرفراز کرنے کی روایت ملتی ہے۔

بچوں کے کھیل

بچوں میں کھیل کود کی صلاحیت و دلچسپی ان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اور عہدِ نبوی کے بچے بھی اس سے محروم نہ تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے بچپن اور لڑکپن میں ان جائز اور پسندیدہ کھیلوں میں شروع سے حصہ لیا تھا اور اپنا اثر چھوڑا تھا۔ حضرت بی بی حلیمہ سعدیہؓ کے گھر

میں آپ ﷺ کا بچپن گذرا اور وہیں آپ ﷺ نے بچوں کے کھیل سیکھے اور اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ان کو کھیلا۔ عین ممکن ہے کہ ان کھیلوں میں رسولِ اکرم ﷺ بنو سعد بن بکر اور دوسرے پڑوسی بچوں بچیوں کے ساتھ بھی کھیلتے رہے ہوں۔ اسی زمانے میں رسولِ اکرم ﷺ نے اول اول تیراندازی، کشتی اور دوسرے کھیل سیکھے تھے۔ روایات میں آپ ﷺ کے کھیلوں کا ذکر بھی باقاعدہ ملتا ہے:

- صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے جب حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور آپ ﷺ کا سینہ مبارک چاک کیا، شقِ صدر کے اس اولین معجزہ کے وقت آپ ﷺ کے کھیل کھیلنے کا واضح ذکر ہے: "**اتاہ جبریل علیہ السلام وھو یلعب مع الغلمان، فأخذہ فصرعہ ...**"

(۱/۲۳۱: کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الخ کی مختلف احادیث؛ نیز کاندھلوی، ۱/۷۳ وما بعد نے کھیل کھیلنے کی جگہ بکریاں چرانے کا واقعہ لکھا ہے اور بلاحوالہ لکھا ہے)

- ابن ہشام نے رسولِ اکرم ﷺ کے تعمیر کعبہ میں پتھر ڈھونے کے پس منظر کے ساتھ غلمانِ مکہ وقریش کے پتھروں سے کھیلنے کا ذکر کیا ہے۔ بچے ان پتھروں کو کندھوں پر رکھنے کے لیے عریاں ہو جاتے کہ ازاروں کو کاندھوں پر رکھ لیتے تھے: "**لقد رایتنی فی غلمان قریش ننقل حجارۃ لبعض ما یلعب بہ الغلمان... الخ** (ابن ہشام، ۱/۱۸۳؛ ابن کثیر، السیرۃ، ۱/۲۵۰)

- چھ سال کی عمرِ شریف میں آپ ﷺ اپنے دادا حضرت عبدالمطلب ہاشمی کے سالانہ سفرِ مدینہ کے دوران اپنی والدہ ماجدہ اور انا کے ساتھ یثرب اول بار تشریف لے گئے تو اپنے ارشادِ مبارک کے مطابق وہاں بنو عدی بن النجار کے تالاب میں پہلی بار تیرنا سیکھا اور وہیں ایک انصاری لڑکی حضرت انیسہ کے ساتھ کھیلتے تھے۔ رضاعی بہن حضرت انیسہ / شیماء کے ساتھ کھیلنے کا ذکر بہت معروف ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے بچوں بچیوں کے ساتھ آپ ﷺ کے بچپن کے کھیل کھیلنے کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (ابن سعد، ۱/۷۳، بحوالہ شبلی نعمانی، ۱/۱۷۶)

- اِن روایاتِ سیرت سے اور ان سے زیادہ شواہدِ فطرت سے بلاشبہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے بچپن اور لڑکپن میں عام شریف بچوں کے کھیل سیکھے اور کھیلے تھے۔ ان کا

زمانہ مکی حیات کا بھی رہا تھا اگرچہ مکی دور کے واقعات کم ملتے ہیں۔ غالبًا ایسی ہی کوئی صورت حال تھی جب مشہور سردارِ مکہ عبداللہ بن جدعان تیمی کے گھر میں ایک دعوت کے موقعہ پر ابوجہل مخزومی سے کھیل کھیل میں جھگڑا ہو گیا تھا اور اس کے نتیجے میں ابوجہل کی ٹانگ پر شدید ضرب آئی تھی اور اس کا نشانِ جراحت تاعمر رہا اور اسی کے سبب غزوۂ بدر کے مقتولوں کے درمیان اس کی لاشِ سر بریدہ پہچانی گئی تھی۔ اسی طرح رکانہ بن عبد یزید سے بعد نبوت کشتی میں اسے پچھاڑ دینے کا واقعہ بھی بتاتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے کشتی کا فن اپنے لڑکپن میں سیکھا تھا۔ اس سے آپ ﷺ کی معجزانہ قوتوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ معجزاتِ نبوی کسی فنی صلاحیت ولیاقت کے محتاج نہیں ہوتے، وہ عطایائے الٰہی ہی ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر ہونے کے ناطے ان کے تقاضوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات دوسری تھی کہ آپ ﷺ کی بشری قوتیں بھی چند در چند تھیں۔

- متعدد صحابہ کرام کے اسماء گرامی کے ضبط کے ساتھ ان کے کھیل کھیلنے کا ذکر مختلف روایاتِ سیرت واحادیثِ نبوی میں ملتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی قرابت اور عام نظریاتِ تقدس کی رعایت سے پہلے چند عزیز ترین اقرباء رسولِ اکرم ﷺ کے کھیل کھیلنے کی روایات پیش ہیں:

- حضرت حسینؓ مدینہ کے کسی راستے پر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک دعوتِ طعام میں اپنے صحابہ کرام کے ساتھ جاتے ہوئے ان کو کھیلتے دیکھا۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب سے آگے بڑھ گئے اور اپنے محبوب نواسے کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے دعائے خیر سے ان کو نوازا۔

(اسد الغابہ، ۵/۱۳۰؛ ابن ماجہ، فضائل اصحاب رسول اللہ ﷺ، باب فضل الحسن والحسین میں ہے: "فاذا حسین یلعب فی السکۃ ...")

- حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کے فرزندانِ کرام۔ حضرات قثم وعبیداللہؓ۔ اپنے ایک اور ابن عم حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کے ساتھ بچوں کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔

(اسد الغابہ، ۴/۱۹۷)

- حضرت حسنؓ کے کھیل کھیلنے کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نمازِ عصر کے بعد نکلے تو

راستہ میں حضرت حسنؓ کو بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا تو ان کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا اور فرمایا: واللہ یہ بچہ نبی ﷺ سے مشابہ ہے، علی سے نہیں اور حضرت علیؓ موجود تھے، سنتے اور ہنستے رہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہدِ نبوی کا واقعہ ہے مگر مسندِ احمد کی روایت میں وضاحت ملتی ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کا بعد واقعہ ہے۔

(بخاری، كتاب بدء الخلق، باب صفة النبی ﷺ؛ كتاب المناقب، باب صفة النبی ﷺ؛ حدیث: ۳۵۴۲: فرای الحسن يلعب مع الصبيان ..." مسند احمد/ ابی بکر: حدیث: ۴۰، ۱/ ۴۱؛ فتح الباری، ۶/ ۶۸۹ و مابعد)۔

حافظ موصوف نے کھیل کے حوالے سے وضاحت کی ہے کہ یہ واقعہ عہد نبوی کا ہے اور اس وقت حضرت حسنؓ سات سال کے تھے اور ان کا کھیل اس زمانے کے مباح کھیلوں میں سے کوئی تھا جو اس عمر کے بچے اس زمانے میں کھیلتے تھے: "... ولعبه محمول على ما يليق بمثله في ذلك الزمان من الاشياء المباحة، بل على ما فيه تمرين و تنشيط ونحو ذلك"

- حضرت انس بن مالک خزرجیؓ رسولِ اکرم ﷺ کے خادمِ خاص تھے اور دس سال کی عمر میں خدمتِ میں خدمت گذاری کے لیے آئے تھے۔ کئی احادیث صحیحہ میں ان کے کھیل کھیلنے کا ذکر ملتا ہے اور وہ صرف ایک موقعہ کی احادیث نہیں ہیں۔ وہ ایک مستقل فطرت اور پختہ اخلاق کی گواہی دیتی ہیں:

- ایک بار رسولِ اکرم ﷺ حضرت انسؓ کے پاس پہونچے تو وہ بچوں/ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، آپ ﷺ نے بچوں کو سلام کیا اور حضرت انسؓ کو اپنے ایک کام سے بھیجا جو رازِ نبوی تھا، ایسا کہ بچے نے اپنی ماں کو بھی نہیں بتایا۔

- حضرت انسؓ رسولِ اکرم ﷺ کے حسنِ اخلاق کا ذکر فرماتے ہوئے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسولِ اکرم ﷺ نے مجھے کسی کام سے بھیجا۔ میں کارِ نبوی انجام دینے کے لیے نکلا تو بازار میں بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اور کام کے لیے جانا ذہن سے نکل گیا۔ اسی دوران رسولِ اکرم ﷺ وہاں تشریف لے آئے اور میرے پیچھے سے میری گدّی پکڑی اور فرمایا: اے چھوٹے انس! جہاں میں نے جانے کو کہا تھا تم گئے تھے؟ میں نے دیکھا

کہ آپ ﷺ ہنس رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں میں اب جارہا ہوں، یارسول اللہ!''۔
یہ صرف ایک یا دو روایات نہیں ہیں۔ احادیث کے دروبست، الفاظ وتراکیب اور شروحِ محدثین سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کھیل میں پڑ کر اسی طرح بھول جایا کرتے تھے کہ بچے تھے اور کھیل سے ان کی دلچسپی فطری تھی اور اسی فطرت وشوق فراواں کے ہاتھوں وہ دوسرے بچوں کی مانند کام سے نکلتے مگر ساتھیوں کو کھیلتے دیکھ کر ان کے ساتھ کھیلنے لگتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو کسی موقعہ پر کام نہ کرنے پر سرزنش کی اور نہ ہی کھیلنے سے روکا۔

(مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل انس بن مالک، حدیث:۲۳۰۳، ۲۴۸۲؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی السلام علی الصبیان، حدیث:۵۲۰۲-۵۲۰۳؛ کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ، حدیث:۴۷۷۳ وغیرہ)

- حضرت ابو ہریرہؓ کی اس دلچسپ کنیت کی وجہ بھی ان کی کھیل سے دلچسپی تھی اگرچہ ان کا کھیل دوسرا تھا جو بچپن میں اکثروں کا ہوتا ہے۔ حضرتِ موصوف سے ان کی کنیت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیوں رکھی گئی؟ تو فرمایا کہ میں لڑکپن میں اپنے گھروں کے جانوروں (غنم) کو چرایا کرتا تھا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی بلی تھی۔ رات میں تو اسے ایک درخت پر رکھ دیتا مگر دن میں جب میں چرائی کے لیے جاتا تو اسے ساتھ لے جاتا اور اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ لہٰذا لوگوں نے میری کنیت ہی ''ابو ہریرہ'' رکھ دی: ''... وکانت لی ھریرۃ صغیرۃ ... فاذا کان النھار ذھبت بھا معی فلعبت بھا ...'' (ترمذی، ابواب المناقب، مناقب ابی ہریرۃؓ)

- حضرت عروہ بن زبیرؓ کا کھیل بچوں کی عجیب وغریب فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے والد ماجدؓ کے شانے پر غزوۂ بدر میں ایک زخمِ شدید آیا تھا اور جنگِ یرموک میں ایک اور آیا اور دوسرا بدری زخم کو مزید گہرا کر گیا۔ دونوں میں خاصے گہرے گڑھے ہو گئے تھے۔ حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ میں بچپن میں ان زخموں میں انگلیاں ڈال کر کھیلا کرتا تھا: ''... فکنت ادخل اصابعی فی تلک الضربات العب وانا صغیر''

(بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب الزبیر بن العوام، باب قتل ابی جھل وغیرہ؛ غالباً حضرت عبداللہ بن زبیر بھی اسی طرح کھیلتے تھے)

- حضرت زید بن ثابتؓ کے کھیل کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک حدیث میں طنزاً یہ تبصرہ آتا ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے ستر بہتر سورتیں پڑھ لی تھیں جب زید دو چوٹیاں رکھے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے: "...وان زیدا لصاحب ذوابتین یلعب مع الصبیان" (نسائی، کتاب الزینۃ، باب الذؤابۃ - دو احادیث: اصل میں حضرت ابن مسعودؓ نے جمع و تدوین قرآن کی کمیٹی میں حضرت زید بن ثابت خزرجیؓ کی شمولیت اور اپنی عدمِ شمولیت پر شکوہ کیا تھا جو اس لحاظ سے جائز تھا کہ وہ قرآن کریم کے ایک عظیم ترین جامع اور امام تفسیر تھے۔ تاہم جمع و تدوین کے لیے "مجلس صحابہ کرام" کی حکمت ان کے پیشِ نظر نہیں رہی کہ وہ ماہرین لسانیات مکہ و مدینہ پر مشتمل تھی اور حضرت ابن مسعودؓ ہذلی/ غیر مکی و مدنی تھے۔ ان کے بعض اعرابات اور قراءات نے، جو شاذ سمجھی گئی تھیں، ان کو زبانِ قریش و مدینہ کا ماہر نہیں قرار دیا تھا)

- جانوروں اور پرندوں وغیرہ کے ساتھ بچوں کے فطری طور سے کھیل کود کرنے کا دوسرا واقعہ حضرت ابو عمیرؓ کے واقعہ/ حدیث میں ملتا ہے۔ صحابی موصوف بچے/لڑکے تھے اور ان کے پاس ایک بلبل (نغر) تھی جس کو رسولِ اکرم ﷺ پیار سے چھوٹی سی بلبل (نغیر) ان کے نام و کنیت کے لحاظ سے کہتے تھے۔ حضرت ابو عمیرؓ اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ جب ان کے گھر جاتے یا ان سے ملتے تو ضرور پوچھا کرتے: "یا ابا عمیر! ما فعل النغیر؟" (اے ابو عمیر! تمہاری چھوٹی بلبل کیا کرتی ہے)۔ جب وہ بلبل مر گئی تو حضرت ابو عمیر کو بہت افسوس ہوا اور رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی تسلی و تشفی کے کلمات فرمائے۔ بعد میں بھی آپ ﷺ اسی البیلے جملے سے ان کی خیریت دریافت فرماتے تھے تاکہ ان کے دل کو مزاحِ نبوی سے سکون ملے۔

(بخاری، کتاب الادب؛ باب الکنیۃ قبل ان یولد للرجل؛ فتح الباری، ۱۰/۱۳/۷ و مابعد: حدیث بخاری: ۲۶۰۳: یا ابا عمیر! ما فعل النغیر؟ نغرٌ کان یلعب بہ..."۔ حضرت ابو عمیرؓ حضرت انس بن مالکؓ کے چھوٹے سوتیلے بھائی تھے اور حضرت ابوطلحہ کے فرزند؛ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ؛ باب استحباب تحنیک المولود؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب ما جاء فی الرجل یتکنی ولیس لہ ولد۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بعض دوسرے شارحین کی مانند اس کھیل کے بارے میں دوسری روایاتِ سیرت و حدیث بھی دی ہیں اور ان کی تشریح بھی کی ہے)

- حضرت ابن صیادؓ ایک بڑے خاندان کے ہونہار فرزند تھے۔ بچے/لڑکے تھے اور بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ حضرت عمر بن خطابؓ اور دوسرے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ ابن صیاد کی طرف تشریف لے گئے تو ان کو بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پایا۔ وہ بنو مغالہ کے ایک قلعہ کا مقام تھا جہاں وہ کھیل رہے تھے اور ابن صیاد اس وقت نوخیز نوجوان بن چکے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ ان کے پاس پہونچے تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ میں کون ہوں ۔حضرت ابن صیاد نے عرض کیا آپ رسول امین ہیں...

(بخاری، کتاب الجهاد، باب کیف یعرض الاسلام علی الصبی ؛فتح الباری،۶/۲۰۶: حدیث بخاری: ۳۰۵۵ "... حتی وجده یلعب مع الغلمان" ؛اسد الغابہ،۳/ ۱۸۷؛ دوسری احادیث بخاری اور مباحث سے مزید تفصیلات ملتی ہیں۔ اسلام ابن صیاد (اصل نام-صاف) قابل بحث ہے)

- حضرت عمر بن خطابؓ کے ایک صاحبزادے حضرت عاصم حضرت جمیلہ بنت ثابت بن ابی الافلح انصاریؓ کے بطن سے تھے جن سے انھوں نے ۷ھ/ ۶۲۹ء میں شادی کی تھی پھر طلاق دے دی۔ وہ اپنی ماں اور نانی کے ساتھ قباء میں رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ خلافت صدیقی میں ایک بار قبا گئے تو اپنے فرزند عزیز کو بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا تو ان کو اپنی سواری پر بٹھا کر لے آئے۔ ان کی نانی حضرت شموس بنت ابی عامرؓ نے نواسہ کی کفالت کا دعویٰ کیا اور بالآخر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صاحبزادے کو نانی کے سپرد کر دیا۔

(اسد الغابہ،۵/ ۴۱۷:"فوجد ابنه عاصما یلعب مع الصبیان")

عام بچوں کے کھیل: مکی دور

احادیث وروایات میں بچوں/لڑکوں کے کھیل کھیلنے کے عام واقعات کا تذکرہ مدینہ منورہ کے حوالے سے بہت آتا ہے اگرچہ مکی دور کے بچوں کے حوالوں کا بھی کوئی خاص توڑا نہیں۔ یہ روایات وواقعات اصلاً ایک سماجی مستحکم طریقے کو بیان کرتے ہیں۔ ان سے بلا شبہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام بچے-لڑکے اور لڑکیاں- دوسرے تمام زمانوں اور تمدنوں کی مانند عہد نبوی کے دونوں ادوار میں کھیل کھیلا کرتے تھے۔ یہ ایک فطری تہذیبی روایت ہے جس کے اثبات کے لیے مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں، لیکن حدیث وسیرت کی روایات کو اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ

اس سے کھیلوں کی اقسام، ان کے کھیل کے طریقے، ان سے وابستہ دوسرے سماجی معاملات بخوبی اجاگر ہوتے ہیں:

- مکی عہد کے بچوں کے کھیلنے کا ایک عام حوالہ یہ آتا ہے کہ وہ مکہ کے کمزور مسلمانوں (مستضعفین) کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ (اسد الغابہ، ۱/۲۰۹)

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے کھیلوں کا ذکر بعد کی ایک معنی خیز سرخی کے تحت لایا گیا ہے تاہم یہاں یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے بیان کے مطابق سورہ/ آیت کریمہ: "بل الساعة موعدهم والساعة ادهیٰ و امر. سورۃ القمر-۴۵-۴۶"۔ جس وقت اتری میں ایک بچی تھی اور اس وقت کھیلا کرتی تھی: "لقد انزل علیٰ محمد ﷺ بمكة وانی لجارية العب": حدیث بخاری، ۴۸۷۶ اور اطراف: ۴۹۹۳- فتح الباری، ۸/۷۸۸ میں حافظ موصوف نے بحث نہیں کی اور اسے فضائل قرآن کے باب کے لیے اٹھا رکھا۔

(بخاری، کتاب التفسیر، باب سورة اقتربت الساعة، فتح الباری کے مزید حوالے آئندہ؛ فتح الباری، ۹/۴۹ و مابعد: حدیث بخاری "لقد نزل بمكة علیٰ محمد ﷺ وانی لجارية العب ..." حضرت حافظؒ کی بحث کا زور تمام تر قرآن مجید کی مکی اور مدنی سورتوں کی تشریح پر ہے)

مدنی عہد

بچوں بچیوں کی فطرتِ سادہ ادوار اور زمانوں کی تفریق و تقسیم سے نہیں بدلتی لہٰذا ان کے کھیلنے کی فطری جبلت بھی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ بس یہ ہے کہ ان کے کھیل بدل جاتے ہیں، ان کے کھیلنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان میں کافی مماثلت بھی رہتی ہے۔ مدنی بچے بچیاں بھی اپنے مکی ہم عمروں اور ہم عصروں کی مانند بہت سے کھیل کھیلا کرتے تھے اور ان سے متعلق روایات بھی خوب ملتی ہیں۔ احادیث میں ان کے کھیلنے کا ذکر سماجی پس منظر پر نظر رکھنے سے بعض بہت دلچسپ اور قیمتی سماجی، تہذیبی اور مذہبی معلومات ملتی ہیں۔ ان سے زیادہ رسولِ اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے بچوں کے کھیلنے کے واقعہ- بلکہ حقیقتِ واقعہ- کا ثبوت ملتا ہے جو اسے قطعی جبلت بناتا ہے:

- رسولِ اکرم ﷺ نے ایک بار اپنی نمازِ شب کے وقت ایک شیطان کو گرفتار کر لیا تھا اور خیال فرمایا کہ اسے کسی چیز سے باندھ دیا جائے تا کہ صبح مدینہ کے بچے اس کے ساتھ کھیل کھلیں لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی تو اسے نہیں پکڑا اور چھوڑ دیا۔

(مسلم، کتاب المساجد، مواضع الصلوٰۃ، باب جواز لعن الشیطان فی اثناء الصلوٰۃ: "... یلعب بہ ولدان اھل المدینۃ ...")

- حدیثِ ام زرع میں ایک خاتون کے دو شیر/شبلی جیسے بچوں کے دو اناروں سے کھیلنے کا دلچسپ حوالہ قصہ نگاری میں ملتا ہے۔

(بخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرۃ مع الاھل؛ فتح الباری، ۳۱۶/۹-ومابعد: "... فلقی امراۃ معھا ولدان لھا کالفھدین یلعبان من تحت خصرھا برمانتین ..." حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث ام زرع پر بہت مفصل بحث کی ہے تا ۳۴۴)

- حضرت ربیع بنت معوذؓ کی روایت و بیان ہے کہ عاشوراء کی ایک صبح رسولِ اکرم ﷺ نے انصاری بستیوں میں ایک فرستادہ کے ذریعہ اعلان کرایا: "جس نے صبح کچھ کھا پی لیا ہو وہ بقیہ دن کچھ نہ کھائے پیے اور جس نے روزہ کے ساتھ صبح کی ہو وہ روزہ پورا کرے"۔ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد ہم نہ صرف خود روزۂ عاشوراء رکھتے تھے بلکہ اپنے بچوں کو بھی روزۂ عاشوراء رکھواتے تھے اور ان کے لیے اون کے کھلونے بنا لیتے تھے اور جب وہ کھانے کے لیے روتے تو وہ کھلونے ان کو دے دیتے اور وہ بہل جاتے یہاں تک افطار کا وقت آ جاتا تھا۔

(بخاری، کتاب الصوم، باب صیام الصبیان الخ؛ فتح الباری، ۲۵۵/۴: "حدیث بخاری: ۱۹۶۰: "فکنا نصومہ بعد ونصوّم صبیاننا و نجعل لھم اللعبۃ من العھن فاذا بکیٰ احدھم علی الطعام اعطیناہ ذاک حتی یکون عند الافطار"؛ نیز روایت مسلم وغیرہ)

- احادیث وروایات میں عام بچوں کے کھیلنے کا ذکر اور بہت سے واقعات کے ضمن میں آتا ہے۔

لڑکیوں کے کھیل

بچوں اور بچیوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے کچھ کھیل مشترکہ ہوتے ہیں اور وہ دونوں ساتھ مل

کر کھیلتے ہیں جیسا کہ عہدِ نبوی کے بعض واقعات بالخصوص رسولِ اکرم ﷺ کے اپنے واقعۂ لعب سے متعلق پہلے ذکر گذر چکا۔ عہدِ نبوی کا یہ ایک عام فطری اور سماجی رواج بھی رہا ہے۔ کچھ کھیل بچیاں/لڑکیاں آپس میں کھیلتی ہیں۔ ہم جولیوں کا یہ کھیل بالعموم گڑیوں اور دوسرے کھلونوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ان کی نسوانی جبلت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ پھر فطری طور سے بچیاں اپنی ہم جنس اور ہم عمر سہیلیوں میں کافی آزادی، راحت اور آسانی محسوس کرتی ہیں۔ ان کے بعض مخصوص کھیلوں کے واقعات اور روایات کو بیان کیا جاتا ہے:

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے کھیل کھیلنے سے اس فصلِ مبارک کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس کی متعدد وجوہ خیر بھی ہیں: اول وہ ام المومنین اور رسولِ اکرم ﷺ کی چہیتی زوجہ مکرمہ تھیں۔ دوم وہ مکی عہد اور مدنی عہد دونوں میں کھیل کھیلتی رہیں کہ نوخیز لڑکی ہی تھیں۔ سوم ان کے کھیلوں کے واقعات و روایات کثرت سے ملتے ہیں۔ چہارم ان میں حسنِ معاشرت اسلامی کے انتہائی دلآویز سبق موجود ہیں۔ پنجم ان کے کھیلوں میں رسولِ اکرم ﷺ نہ صرف بنفس نفیس دلچسپی لیتے تھے بلکہ ان کی سہیلیوں اور ہمجولیوں کو بلا کر ساتھ کھیلنے کو فرماتے تھے۔ ایسی ہی بعض اور وجوہ اور جہات ہیں جن کا ذکر روایات کے ضمن میں بھی آتا رہے گا۔

- مکی عہد کا واقعہ گذر چکا کہ سورۂ اقتربت الساعۃ کے نزول کے وقت وہ مکہ مکرمہ میں ایک بچی تھیں اور کھیلا کرتی تھیں۔

گڑیوں کا کھیل

- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس کچھ گڑیاں (البنات) تھیں جو ان کی ماں حضرت ام رومانؓ نے بنا کر دی تھیں۔ غالباً کیا یقیناً یہ گڑیاں حضرت عائشہؓ کے لیے مکی دور میں بنا کر دی گئی تھیں جو ان کے پاس ہمیشہ رہیں۔ مدنی دور میں رسولِ اکرم ﷺ سے شادی ہو جانے اور رخصتی ہو جانے کے بعد بھی وہ ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ وہ اپنی ہمجولیوں (صواحبی) کے ساتھ ان سے کھیلا کرتیں اور جب آپ ﷺ تشریف لے آتے تو سہیلیاں ادھر ادھر ہو جاتیں مگر آپ ﷺ ان کو حضرت عائشہؓ کے پاس کھیلنے کے لیے پھر بھیج دیتے۔ اکثر و بیشتر وہ

رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے اور موجودگی میں ان گڑیوں/کھلونوں سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی تھیں اور آپ خوش ہوتے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب آتے تھے تو سہیلیاں چلی جاتیں اور جب آپ تشریف لے جاتے تو وہ پھر حضرت عائشہؓ کے پاس آجاتیں۔

(بخاری، کتاب الادب، باب الانبساط الی الناس؛ فتح الباری، ۱۰/۶۴۶: حدیث: ۶۱۲۹ میں حضرت ابوعمیر کے کھیل کا ذکر ہے جب کہ حدیث: ۶۱۳۰ ہے: کنت العب بالبنات مع النبی ﷺ وکان لی صواحب یلعبن معی. فکان رسول اللہ ﷺ اذا دخل ﷺ یتقمعن منه فیسر بهن الیّ فیلعبن معی"۔ حضرت حافظؒ نے قاضی عیاض اور ان کے حوالے سے جمہور کا مسلک بیان کیا ہے کہ ان کھلونوں اور گڑیوں میں تصویروں کی اجازت ہے اور بچیوں کے لیے ان سے کھیلنا جائز ہے کہ ان سے ان کو خانگی امور کی تربیت بھی ملتی ہے؛ مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل عائشة: ۱۸(۲۴۴۰)"... انها کانت تلعب بالبنات عند رسول اللہ ﷺ، ... وکانت یاتینی صواحبی..." (۱۸۹۰):"... کنت العب بالبنات فی بیتة، وهن اللعب"۔ ان کھلونوں میں گھوڑوں/ پروالے گھوڑوں کے کھلونے بھی تھے اور دوسرے بھی۔ ابوداؤد، کتاب الادب، باب اللعب بالبنات، حدیث: ۴۹۳۱:"کنت العب بالبنات فربما دخل النبی ﷺ وعندی الجواری، فاذا دخل خرجن، فاذا خرج دخلن")

جھولا جھولنا

- بعض دوسری روایات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے جھولے (ارجـــوحة) میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ مدینہ میں کھیل رہی تھیں جب ان کی والدہ حضرت ام رومانؓ نے ان کو بلایا اور انصاری خواتین کے حوالے کر دیا اور انھوں نے ان کا بناؤ سنگھار کیا اور پھر ان کو رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بیت نبوی جانے کے لیے ساتھ کر دیا۔ رخصتی کے وقت بھی ان کے کھلونے ان کے ساتھ تھے۔

(مسلم، کتاب النکاح، باب تزویج الاب البکر الصغیرة؛ حدیث: ۶۹ (۱۴۲۲):"... فأتتنی ام رومان، و أنا علی ارجوحة، و معی صواحبی..." حدیث: ۷۱(...): "... تزوجها وهی بنت سبع سنین، وزُفّت الیه وهی بنت تسع سنین، ولعبها معها ... الخ "؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الارجوحة، حدیث: ۱۹۳۵: جاء نی نسوة و انا العب علی ارجوحة... الخ"، ۴۹۳۶:"... وانا علی

الارجوحة، ومعی صواحباتی..." ۴۹۳۷:"... فواللہ انی لعلی ارجوحة بین عذقین، فجاءتنی امی، فانزلتنی ... الخ"۔ روایت کے مطابق بنوالحارث بن الخزرج کے محلہ میں ایک درخت کی دو شاخوں کے درمیان جھولا ڈال رکھا تھا جس میں وہ سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں۔ لہٰذا لڑکیوں کا جھولا جھولنا بھی اس زمانے کے کھیلوں میں سے ایک تھا اور وہ صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ نیز ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب نکاح الصغار یزوجهن الآباء، حدیث:۱۸۷۶؛ بلاذری، ۱/۴۱۰:"وهی تلعب مع الجواری فی النخل")

کھلونے

- حضرت عائشہ صدیقہؓ غزوۂ خیبر میں تیرہ چودہ سال کی تھیں اور غزوۂ تبوک میں سولہ سترہ سال کی تھیں۔ اس وقت بھی ان کے پاس ان کی گڑیاں/کھلونے موجود تھے۔ روایتِ ابوداؤد ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ تبوک سے یا خیبر سے واپس تشریف لائے۔ حضرت عائشہؓ کی مہتابی، کانس (سهوتها) پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ ہوا چلی تو اس نے پردے کا کونا اٹھا دیا اور حضرت عائشہؓ کی گڑیاں/کھلونے نظر آنے لگے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے عائشہ؟ انھوں نے عرض کیا: میری گڑیاں ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان گڑیوں کے درمیان ایک گھوڑا بھی دیکھا جس کے رنگ دار کپڑے کے دو پر تھے۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا اور رسولِ اکرم ﷺ نے ازراہِ تعجب فرمایا کہ گھوڑے کے دو بازو یا پر؟ حضرت عائشہؓ نے ترت جواب دیا: کیا آپ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمان کے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیساختہ ہنس پڑے اور بقول ام المومنین آپ ﷺ کے دانت دِکھنے لگے۔ ان روایات سے بچپن کے کھلونوں کا سنبھال کر رکھنا بھی معلوم ہوتا ہے

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب اللعب بالبنات، حدیث:۴۹۳۲:"...قدم رسول اللہ ﷺ من غزوة تبوک، او خیبر، وفی سهوتها ستر، فهبت ریح فکشفت ناحیة الستر عن بنات لعائشة لعب، فقال: ما هذا یا عائشة؟ قالت: بناتی ورأی بینهن فرسا له جناحان من رقاع، فقال: ما هذا الذی اری وسطهن؟ قالت: فرس، قال ... فرس له جناحان؟ قالت: أما سمعت ان لسلیمان خیلا لها اجنحة؟ قالت: فضحک النبی ﷺ حتی رأیت نواجذه"؛ نیز بلاذری، ۱/۴۱۳: حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں گڑیوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ اس روایت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑے کا ذکر بھی ہے)

لڑکیوں/ بچیوں کے ان کھیلوں اور ان کے کھلونوں سے متعدد تمدنی سماجی روایات کا پتہ چلتا ہے:

۱- لڑکیاں بالعموم گڑیوں سے کھیلتی تھیں جو ان کا اندرون خانہ کھیل (Indoor game) تھا اور وہ عام تھا۔

۲- ان کی گڑیاں ان کی مائیں یا دوسری بڑی عمر کی خواتین بنا کر انھیں دیتی تھیں۔ ان میں ان کی بہنیں وغیرہ بھی شامل تھیں۔

۳- یہ گڑیاں اور کھلونے مختلف چیزوں -سوت، اون، گوڈر، کپڑے وغیرہ- سے بنائے جاتے تھے۔

۴- ان کی صورتیں اور تصویریں ہوتی تھیں۔ یعنی ان کے چہروں کے خدو خال اور جسمانی اعضاء و جوارح کو بھی بنایا جاتا تھا۔

۵- ان میں اساطیری یا کہانی والے کھلونے بھی ہوتے تھے یعنی پر والے گھوڑے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تھے۔

۶- وہ رنگین کھلونے ہوتے تھے تاکہ بچے ان سے بہل جائیں اور ان کو زیادہ دلچسپی سے کھیلیں۔

۷- لڑکیوں اور لڑکوں کا بھی ایک بیرون خانہ کھیل (Outdoor game) جھولا ہوتا تھا جو بالعموم باغ یا کھجور وغیرہ کے درخت کی دو شاخوں کے درمیان میں ڈالا جاتا تھا اور وہ رسی پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں چادر وغیرہ بھی ہو سکتی تھی۔ دوسرے بیرون خانہ کھیلوں میں دوڑ کی مسابقت وغیرہ شامل تھی۔

خیر مقدمی کھیل

اکابر اور محترم مہمانوں اور قریب کے عزیزوں کے استقبال میں بسا اوقات دوسرے کاموں کے علاوہ کھیل بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ قرونِ وسطیٰ کی مختلف تہذیبوں اور گوناگوں تمدنوں کی ہی روایت نہیں ہے بلکہ آج کے متمدن تر معاشروں کی بھی ایک روایت ہے۔

استقبال اور خیر مقدم کے کئی رسوم اور کئی طریقے تھے اور ان میں انبساط و مسرت کے اظہار کا بنیادی طور سے سب سے بڑا عنصر ہوتا تھا۔ احترام و اکرام اور توقیر و تعظیم کا تو تھا ہی۔ خیر مقدمی تقریبات میں لوگوں کا شہر سے باہر نکلنا، اکابر کا ہتھیار سجا کر فوجی خیر مقدم کرنا اور عورتوں لڑکیوں کا گیت گا کر اور باجے بجا کر سواگت کرنا تو تھا ہی ان کے ساتھ ماہرین فوجی کھیل کے اپنے کرتب بھی دکھاتے تھے۔

(بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب استقبال الغزاة وغیرہ ابواب؛ فتح الباری، ۶/۶۳۰ وغیرہ؛ حدیث: ۳۰۸۳: "... ذهبنا نتلقی رسول الله مع الصبیان الیٰ ثنیة الوداع"؛ کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ الخ؛ حدیث: ۳۹۲۵؛ فتح الباری، ۷/۳۲۴ وغیرہ)

- رسولِ اکرم ﷺ کی ہجرت کر کے مدینہ آنے کے مبارک و پرمسرت مواقع پر جہاں دوسرے مظاہرے ہوئے تھے وہاں ماہر فنونِ حرب حبشیوں نے اپنے کرتب اور کھیل بھی دکھائے تھے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حبشیوں نے آپ ﷺ کے قدومِ میمنت لزوم کی خوشی میں اپنے نیزوں اور حربوں سے اپنے شاندار کھیلوں کا بھی مظاہرہ کیا۔

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الغناء، حدیث: ۴۹۲۳ "عن انس: لما قدم رسول الله ﷺ المدینة لعبت الحبشة لقدومه فرحاً بذلک، لعبوا بحرابهم...")

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں حبشی حضرات اور ماہرینِ فن کا ایک طبقہ تھا جو مختلف مواقع پر اپنے فنی کمالات دکھاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے مسجد میں جو فنی کمالات دیکھے تھے وہ بھی حبشیوں کے پیش کردہ تھے۔ خیر مقدمی واقعے میں بھی ان ہی حبشیوں کا ذکرِ خیر ہے۔ دوسرے مواقع اور واقعات کے حوالے سے بھی ان ہی کا ذکر و حوالہ آتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ فوجی سپاہ و رسالہ سے بھی متعلق ہوں مگر غزوات و سرایا میں ان کا ذکر نہیں آتا۔ قیاس یہ کہتا ہے اور روایات بھی یہی بتاتی ہیں کہ ان حربی کھیلوں اور فوجی کرتبوں کے ماہرین یہی حبشی تھے اور ان کا ایک خاص سماجی طبقہ تھا اور ممکن ہے کہ وہ پیشہ ور رہے ہوں کہ ان کے پیشے کے لیے کسی مذہبی قدغن اور شرطِ تقویٰ کی ضرورت نہیں تھی۔

عید کے کھیل کود

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہی حوالے اور سند سے ایک اور تقریبِ عید کا ذکر کتبِ حدیث میں ملتا ہے۔ امام بخاریؒ نے مذکورہ حدیث بابتِ غنا و موسیقی کے معاً بعد یہ دوسری حدیث بیان فرمائی ہے: "باب الحراب والدرق یوم العید"، حدیث: ۹۵۰ کے تحت ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ خاص عید کے دن سیاہ فام (حبشی) لوگ حربوں (الحراب) اور ڈھالوں (الدرق) سے کھیلا کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ام المومنین کی خواہش پر ان کو حبشیوں کا جنگی کھیل اس وقت تک اپنے حجاب میں دکھایا جب تک وہ سیر نہ ہو گئیں۔ حدیثِ مذکورہ بالا پر متعدد شارحین نے کلام فرمایا ہے اور ایک شارح کبیر امام ابن المنیرؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث سے اس حقیقت پر استدلال کیا ہے کہ عید کے دن انبساط کی اتنی حاجت و ضرورت ہوتی ہے جتنی دوسرے دنوں میں نہیں: "... ان العید یفتقر فیه من الانبساط مالا یفتقر فی غیره"۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے دوسری کتبِ حدیث و سیرت سے اس حدیث پر بحث کر کے نتیجہ نکالا ہے کہ سیاقِ حدیث بتاتا ہے کہ حبشی لوگوں کا ہر عید کے دن یہی عام معمول تھا اور اس کی تائید میں متعدد دوسری روایات نقل کی ہیں۔ بہر حال ان سے واضح ہوتا ہے کہ عید کے دن کھیل کود، گانا بجانا اور خوشی منانا ایک روایت تھی جو اسلامی تمدن میں بھی بار پا گئی تھی۔

(فتح الباری، ۲/ ۵۶۸، ۵۷۲ و مابعد: حجاب اور پردہ اور اجنبی مردوں کے عورت کے دیکھنے پر جو مباحث آئے ہیں وہ اپنے خاص افکار کی روشنی میں آئے ہیں۔ بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرت ام المومنین اجنبیوں کے چہرے نہیں دیکھتی تھیں، صرف ان کا کھیل دیکھتی تھیں۔ یہ تقویٰ کی حد ہے۔ مسلم، کتاب صلاة العیدین؛ باب الرخصة فی اللهو، کئی روایات؛ نسائی، کتاب صلاة العیدین، اللعب بین یدی الامام یوم العید، باب اللعب فی المسجد یوم العید ونظر النساء الی ذلک وغیرہ کئی روایات؛ نیز دیگر کتب حدیث و سیرت کی متعلقہ روایات و احادیث)

بہر حال ان روایات و احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں عیدین دو اسلامی -قومی تقریباتِ مسرت کے طور منائی جاتی تھیں۔ ان میں گانا بجانا بھی ہوتا تھا، موسیقی بھی تھی، کھیل کود بھی کھیلے جاتے تھے، عمدہ لباس اور خوشبو کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کی

زیارت وضیافت بھی کی جاتی تھی۔ وہ دراصل تقریباتِ انبساط ومسرت تھیں جن میں لہو ولعب کی کسی حد تک چھوٹ دی جاتی تھی۔ بعض اہل قلم نے اسے سنت بھی لکھا ہے اور بہر حال وہ حدیث سے ثابت بھی ہے۔ یہ عام فطرت انسانی کی رعایتِ نبوی تھی۔ محتاط اور صاحبانِ تقویٰ ان سے اجتناب کریں تو وہ کر سکتے ہیں مگر ایسی جائز تفریحات پر نکیر کرنا سنت وحدیث پر اعتراض کرنا ہے۔

عید کے کھیلوں کا اصل پس منظر یہ ہے کہ بقول رسولِ اکرم ﷺ ہر قوم کی عید/عیدیں ہوتی ہیں جن میں وہ کھیلتے ہیں۔ حدیثِ بخاری: ۹۵۲ میں فرمان رسولِ اکرم ﷺ ہے: "... ان لکل قوم عیدٌ، وھذا عیدنا" ۔ تشریح حافظ ابن حجرؒ میں ان عیدوں کا بیان ہے۔ ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے دو دن خاص تھے جن میں وہ کھیل کھیلتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ان دونوں دِنوں کے بارے میں دریافت فرمایا اور لوگوں نے بتایا کہ ہم جاہلیت میں ان دنوں میں کھیل کھیلا کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے تم کو بہتر دن عطا فرمائے ہیں اور وہ یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر ہیں۔

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب صلاۃ العیدین، حدیث: ۱۱۳۴: عن انس قال: قدم رسول اللہ ﷺ المدینة، ولھم یومان یلعبون فیھما، فقال: ما ھذان الیومان؟ قالوا: کنا نلعب فیھما فی الجاھلیة. فقال رسول اللہ ﷺ: ان اللہ قد ابدلکم بھما خیرا منھما: یوم الاضحیٰ ویوم الفطر. نیز نسائی، کتاب صلاۃ العیدین؛ بخاری، کتاب العیدین، فی العیدین والتجمل فیه، الحراب والدرق یوم العید، سنة العیدین لاھل الاسلام وغیرہ؛ فتح الباری، ۲/ ۵۶۶-۵۷۵ ومابعد؛ نیز دیگر حدیث وسیرت کی کتب: قریش کی مکی عید کا ذکر احناف کے بیان میں ملتا ہے جس دن وہ دوسرے کاموں کے علاوہ تفریح اور کھیل کود کا بھی اہتمام کرتے تھے: ابن ہشام، ۱/ ۲۴۲: "واجتمعت قریش یوماً فی عید لھم عند صنم من اصنامھم... وکان ذلک عیدا لھم فی کل سنة یوماً...")

ان روایاتِ حدیث وسنت میں کھیل کھیلنے والوں کے لیے دو لفظ ملتے ہیں: ایک الحبشة اور دوسرے "السودان" یعنی سیاہ فام لوگ جن سے شارحین نے بالعموم حبشیوں کو ہی مراد لیا ہے، حالانکہ ان سے لغوی طور سے دوسرے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس پر مختصر اور تشنہ بحث کی ہے اور مسلم اور بعض دیگر کتب حدیث کی احادیث وروایات کو مختصراً بیان کیا ہے۔

امام سیرت محب طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ سیاق روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر عید میں اپنے کھیلوں اور کرتبوں کو پیش کرتے تھے اور نہ صرف ہر عید کے دن بلکہ ہر موقعِ مسرت اور وفد کی آمد اور مہمانوں کے استقبال وغیرہ کے مواقع پر اپنے کھیل دکھایا کرتے تھے۔ صحیح ابن حبان کی روایت میں ہے کہ جب حبشہ کا وفد آیا تو وہ مسجد میں اپنے کھیل دکھانے لگے تھے: "... قاموا یلعبون فی المسجد"۔ حافظ موصوف نے ہجرت نبوی کے عظیم ترین موقع مسرت یا عظیم ترین عید کے موقع پر ان کے کھیلوں کی مذکورہ بالا حدیث ابوداؤد بھی نقل کی ہے۔ امام ابن المنیرؒ اور ان کے جیسے اتقا پسند شارحین وعلماء نے اس تفریحی اور پرمسرت روایتِ لہو ولعب کو تربیت حربی پر محمول کیا ہے، حالانکہ نہ صرف مذکورہ بالا روایت/ روایات بلکہ دوسری احادیث ثابت کرتی ہیں کہ یہ عہدِ نبوی کی جائز تفریحات اور کھیل تھے۔

بچوں/ بچیوں کے ساتھ کھیل

چھوٹے بچوں بچیوں کے ساتھ بڑوں کے کھیل کھیلنے بلکہ ان کو کھلانے اور ان کو مختلف طریقوں سے خوش کرنے کی فطرت بھی انسان میں ودیعت کی گئی ہے۔ بچپن میں ہر شریف وکریم انسان اپنے بچوں، چھوٹے بھائی بہنوں اور دوسرے عزیزوں کو پیروں پر جھلاتا ہے، ان کو سینے اور پیٹ پر بٹھا کر ان کو اچھالتا ہے اور ان کے ساتھ بعض دوسرے کھیل کھیلتا ہے۔ عہدِ نبوی کے اکابر واصاغر دونوں اس فطرتِ انسانی اور تمدنِ بشری کے تقاضے سے ماوراء تھے، نہ ان سے بے خبر۔ روایاتِ سیرت وسوانح کے علاوہ احادیثِ صحیحہ سے بھی ان مسرت آمیز اور محبت خیز کھیلوں کا ذکر ملتا ہے اور دونوں ادوارِ نبوی کے حوالے سے ملتا ہے۔ ان کے بعض نمونے پیش خدمت ہیں:

بچوں کو جھولا جھلانا

رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں روایاتِ سیرت بتاتی ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے بچپن میں آپ ﷺ کے چچا جناب زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی آپ کو اپنے پیروں پر جُھلاتے تھے اور لوری سناتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: عم نبوی زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی پر مضمون خاکسار مذکورہ بالا)

- حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت سعد بن ربیع خزرجیؓ کی چھوٹی سی بچی کو اپنے سینے پر بٹھاتے، کھلاتے اور جھلاتے تھے اور اس کو پیار سے چومتے تھے۔ (ابن ہشام، ۲/۹۵)

- رسولِ اکرم ﷺ اپنے نواسوں/نواسیوں - حضرات حسن، حسین، امامہ رضی اللہ عنہم - کو کھلاتے تھے اور ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتے تھے۔ ان کے واقعات بہت سے ہیں۔

(ابن ماجہ، فضائل اصحاب النبی ﷺ، فضل الحسن والحسین)

لعبة الغراب

اس کھیل کی نوعیت تحقیق طلب ہے کہ روایات و احادیث میں اس کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔ بہر حال ایک روایت میں اس کھیل کا ذکر ملتا ہے:

- حضرت ابوہریرہؓ غالباً بعد کے کسی زمانے میں مدینہ کے بچوں کے درمیان جا گھستے جو رات میں کوے کا کھیل (لعبۃ الغراب) کھیل رہے ہوتے تھے۔ بچے کھیلتے رہتے اور ان کو حضرت ابوہریرہؓ کی آمد و شرکت کا احساس بھی نہ ہوتا حتی کہ حضرت موصوف اپنے آپ کو ان کے درمیان پہونچا دیتے اور اپنے دونوں پیروں کو خوب پٹختے تھے، اس سے بچے گھبرا جاتے اور بھاگ کھڑے ہوتے تھے: "وربما اتی ابوهريرة الصبيان وهم يلعبون لعبة الغراب ... الخ"۔ (ابن سعد، ۴/۳۰۷ ومابعد)

- بعض محدثین کرام نے بچوں کے ساتھ کھیل کھیلنے کے ابواب بھی باندھے ہیں: "باب اللعب مع الصبيان" وغیرہ۔ ان کے علاوہ متعدد اکابر محدثین نے اپنی اپنی کتاب الادب وغیرہ میں مختلف کھیلوں کے لیے مخصوص ابواب کا اہتمام کیا ہے۔ جیسے امام ابوداودؒ نے باب اللعب بالبنات، باب فی الارجوحة، باب فی اللعب مع الحمام وغیرہ کے علاوہ بعض کھیلوں کی ممانعت کے ابواب قائم کیے ہیں اور ان میں شامل ہیں: نرد و شطرنج کے کھیل کی ممانعت: باب فی النهی عن اللعب بالنرد۔ بہر حال ان تمام جائز و مباح کھیلوں اور ممنوعہ و متروکہ کھیلوں کے بیان سے اس عہد مبارک میں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر ملتا ہے۔

- رسولِ اکرم ﷺ کے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گڑیوں وغیرہ کے کھیل میں دلچسپی اور شرکت سے مدارات کے علاوہ کسی قدر شرکت کا حوالہ ملتا ہے۔

۔ خاص مہرِ نبوت کے ساتھ بچوں کے کھیلنے کا ذکر بھی اسی ادب نبوی کا ایک مرحمت آسا اور تفریحی باب ہے۔ حدیث بخاری: ۵۹۹۳ کے مطابق حضرت ام خالد بنت خالد بن سعید بن عاص امویؓ رسولِ اکرم ﷺ کی مہر نبوت کے ساتھ کھیلتی تھیں: "... فذهبت العب بخاتم النبوة" ۔ ان کے والد ماجد نے اس پر ڈانٹ لگائی مگر رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو نہ روکا البتہ ان کے والد کو سرزنش کرنے سے روک دیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی مزید تشریح نہیں کی مگر دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو آپ ﷺ مہر نبوت سے بالعموم کھیل کرنے دیتے تھے اور وہ عام انسانی بلکہ طفلی فطرت ہے کہ وہ جسم کے غیر معمولی چیزوں یا حصوں سے کھیلتے ہیں جیسے حضرت زبیر بن عوام اسدیؓ کے بچے ان کے زخموں کے گڑھوں سے کھیلا کرتے تھے۔

(فتح الباری، ۱۰/۵۲۲ومابعد)

سواری پر پیچھے بٹھانے کی تفریح

سفر کے دوران لوگ بالعموم اپنی سواریوں پر دوسروں کو پیچھے بٹھا لیتے ہیں جسے عربی اور دینی اصطلاح میں ارداف کہتے ہیں اور پیچھے بیٹھنے والوں کو ردیف۔ احادیث و روایات اور معمولات وسننِ نبوی میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عہدِ نبوی کی ایک مسلمہ روایت تھی۔ اس کا کھیل وتفریح سے قطعی تعلق نہ تھا۔ لیکن دوسری نوعیت کا ارداف بھی ہوتا تھا جو خالص تفریحی ہوتا تھا، اسے مسرت بخش اور رحمت آمیز اخلاق بھی کہا جا سکتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے اکابرِ عہد کا یہ مستقل طریقہ تھا کہ وہ جب بھی سفر یا غزوہ وسریہ سے واپس آتے تو شہر کے لوگ ان کے خیر مقدم کو نکلتے، ان میں بچوں کی تعداد بھی خاصی ہوتی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ بالعموم یا بلا استثناء بچوں میں سے کسی نہ کسی کو یا بعضوں کو اپنی سواری کے پیچھے بٹھالیا کرتے تھے۔ بچوں/بچیوں کی سعادت ومحبت تو تھی ہی لیکن اس سے زیادہ وہ ان کی تفریح و کھیل کی نوعیت رکھتی تھی۔ اسے تفریحی سواری بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کا شمار تفریحی کھیلوں میں ہوتا ہے اور غالباً عہدِ نبوی میں بھی وہ بطور کھیل اور بطور تفریح سمجھا جاتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے متعدد بار بچوں کو اپنی سواریوں کے پیچھے بٹھایا تھا۔ یہ تمام اسفار وغزوات اور

سرایائے نبوی کا ایک مسلمہ سماجی واقعہ ہے۔ لیکن غزوۂ موتہ کے خاص غمناک موقعہ پر بنفس نفیس رسولِ اکرم ﷺ کا اسوہ حسنہ نقل کرنے کے لائق ہے:

- غزوۂ موتہ کے بعد جب اسلامی لشکر خاصی ابتر حالت میں مدینہ پہونچا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانانِ مدینہ ان کے استقبال کو باہر نکلے۔ ان میں بچے تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے ان سے جاکر ملے۔ رسولِ اکرم ﷺ صحابہ کے ساتھ ایک سواری پر تشریف فرما تھے اور دوسرے صحابہ بھی سواریوں پر تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ بچوں کو اٹھا کر اپنی اپنی سواریوں پر بٹھا لو اور مجھے ابن جعفر دے دو۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو بلایا گیا اور رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ راوی حضرات وخواتین کا اس کے بعد واضح بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ہر سفر میں بچوں کو اپنی سواری پر ضرور بٹھالیا کرتے تھے۔

(ابن ہشام، ۲/۳۸۲: "... لما دنوا من المدينة تلقاهم رسول الله ﷺ والمسلمون، قال: ولقيهم الصبيان يشتدون، ورسول الله ﷺ مقبل مع القوم على دابة فقال: خذوا الصبيان فاحملوهم، واعطوني ابن جعفر، فأتي بعبد الله بن جعفر فاخذه فحمله بين يديه... الخ)

- حدیثِ بخاری: ۳۰۸۲ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کی واپسی پر تین بچوں - حضرات عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس - نے دوسرے لوگوں کے ساتھ استقبال کیا تو آپ ﷺ نے موخر الذکر دونوں بچوں کو اپنی سواری پر بٹھالیا اور ابن زبیر کو چھوڑ دیا۔

(فتح الباری، ۶/۲۳۰-۲۳۱ نے اس موقعہ اور ارداف پر بحث کی ہے اور اختلاف پر زیادہ توجہ دی ہے)

- دوسری روایاتِ سیرت وحدیث سے بہر حال بچوں کو سواریوں پر بٹھا لینے اور ان کی تفریح کا سامان کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں حضرت سائب بن یزید، فضل بن عباس، اسامہ بن زید اور متعدد دوسرے بچوں کا ذکر ملتا ہے حتی کہ بچیوں کو بھی اس سعادت میں شریک کیا گیا۔

پرندوں/ جانوروں کے ساتھ کھیل

انسانی فطرت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ بعض جانوروں اور پرندوں کو پالنے کی خواہش رکھتی ہے اور انسان انھیں پالتا بھی ہے۔ یہی فطرت انھیں پالتو پرندوں اور جانوروں کے روپ

میں ڈھالنے کی باعث بنی ہے، ورنہ ان کی دنیائیں اور بقول قرآن مجید ان کے جہان (عالمین) الگ الگ ہیں۔ اولین روزِ فطرت سے بہرحال انسان انھیں پالتا اور ان کے ساتھ کھیلتا چلا آرہا ہے اور ان کے ساتھ اپنے کھیلوں میں مسرت کشید کرنے کے علاوہ فوائد بھی حاصل کرتا ہے۔ عہدِ نبوی میں بھی ان پالتو جانوروں اور پرندوں کے ساتھ کھیل کھیلنے کا ذکر ملتا ہے اور حضرت ابوہریرہ دوسیؓ کی بلّی اور حضرت ابوعمیرؓ کی بلبل کا ذکر آچکا ہے۔ روایاتِ حدیث و سیرت میں بعض دوسرے واقعات و احکام بھی ملتے ہیں جن کے سبب ایک نئے عنوان کے تحت بحث کرنے کا تقاضا ہوا۔

متعدد احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے مختلف لوگ حمام (کبوتر/کبوتری) کے ساتھ کھیلتے تھے اور ان کے پیچھے دوڑ بھاگ کرتے تھے۔ حضرات عثمان بن عفان اموی، ابوہریرہ دوسی اور عائشہ ام المومنینؓ سے کم از کم تین احادیث ابن ماجہ میں تین مختلف اشخاص کے بارے میں مذکور ہیں۔ ان کا ماحصل ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک حمام/حمامہ کا پیچھا کررہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شیطان دوسرے شیطان/شیطانہ کا پیچھا کررہا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں طائر (پرندے) کا لفظ ہے۔ ان تمام روایات کا دینی اور فقہی حکم یہ ہے کہ یہ کھیل مردود اور لائق نفریں ہے (ابن ماجہ، باب اللعب بالحمام، احادیث: ۳۷۶۴، ۳۷۶۵، ۳۷۶۶؛ اسد الغابہ، ۵/ ۶۱۰ - ۶۱۱: حضرت ام کثیر بنت یزید انصاریؓ یا ان کی بہن کا ایک لڑکا حمام (کبوتری) کے ساتھ کھیلتا تھا۔ دریافت پر رسولِ اکرم ﷺ نے اسے منافقین کا کھیل (لعبة المنافقین) بتایا۔

بہرحال ان روایات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کھیلوں میں تضیعِ اوقات کا بڑا عنصر ہے اس لیے ان کی مذمت و ممانعت کی گئی ہے اور غالباً وہ وحشی پرندوں کے بارے میں ہے۔ کیونکہ اس سے قبل بلی اور بلبل کے پالنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ ایک طرح سے ان کا استحسان ملتا ہے۔ کھیلوں میں سے بعض کو روایات و احادیث نے قطعی ممنوع قرار دیا ہے۔ ان میں سے ایک نرد (شطرنج) کا کھیل ہے جسے اللہ و رسول کی نافرمانی اور لحمِ خنزیر اور خونِ خنزیر میں ہاتھ ملوث کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

(ابن ماجہ، بـاب اللـعـب بالـنـرد، احادیث حضرات ابوموسیٰ اشعری و بریدہؓ: ۳۷۶۳، ۳۷۶۴؛ بلاذری، ۱/ ۴۱۸:

ایک شخص حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں تھا اور وہ نرد (شطرنج) کھیلتا تھا، موصوفہ نے اسے آگاہ کیا یا تو نرد نکالے ورنہ میرے گھر سے نکل جاؤ")

- ممنوع کھیلوں میں سے ایک کو چودہ (اربعۃ عشر) کہا گیا ہے۔ اس کی نوعیت ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت سلمہ بن اکوعؓ اپنے لڑکوں کو چودہ کے کھیل سے منع فرماتے تھے کہ وہ گناہ ہے: "نھی سلمة بن الاكوع بنيه عن لعب اربعة عشر ويقول: هي ماثمة" (ابن سعد، ۴/ ۳۰۷)

دوڑ

تفریحات کی ایک اور قسم دوڑ یا پیدل تیز چلنے کا مقابلہ بھی تھا۔ وہ شہسواری اور اونٹ کی دوڑ کی اقسام میں شامل کی جاتی ہے۔ کھیل کے اصول وقواعد یکساں تھے۔ دو مقاماتِ طے شدہ کے درمیان تیز دوڑنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ وہ اجتماعی مقابلہ بھی ہوتا تھا اور انفرادی بھی یعنی صرف دو کے درمیان۔ ان میں اول آنے والے کو جیت کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اجتماعی مقابلوں میں انعام بھی دیا جاتا تھا۔ دوڑ میں حصہ لینے والے ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ بالعموم مردوں اور بچوں کے مقابلے الگ الگ ہوتے تھے کہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں مختلف ہوتی تھیں۔ خواتین کے مقابلے بھی ان ہی کے درمیان ہوسکتے تھے۔ البتہ میاں بیوی کے درمیان تفریحی دوڑ کے مقابلے سب سے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور ان کا انعقاد بالعموم رات میں اور تنہائی کے عالم میں ہی کیا جاتا تھا۔ ان میں رسولِ اکرم ﷺ کے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ دو مختلف زمانوں میں مقابلوں کا ذکر ملتا ہے اور وہ ان کی دلچسپ نوعیت اجاگر کرتا ہے:

- ایک سفر کے دوران رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے خود فرمایا کہ آؤ دوڑ کا مقابلہ کریں۔ دونوں میں مقابلہ ہوا، اس زمانے میں حضرت عائشہؓ خاصی چھوٹی لڑکی تھیں اور جسمانی لحاظ سے کافی چست لہٰذا وہ مسابقت میں اول آئیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی خاصی تحسین کی۔

- اس کے کافی زمانے کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ایک سفر کے دوران

ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دوڑ کا مقابلہ کرنے کو فرمایا، اس بار رسولِ اکرم ﷺ نے مقابلہ جیت لیا کہ حضرت ام المومنین کا جسم بھاری ہو گیا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے خوش مزاجی سے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: یہ اس مقابلے کا جواب ہے۔

(ابوداؤ، کتاب الجهاد، باب السبق علی الرجل، حدیث:۲۵۷۸:''... عن عائشة : انها كانت مع النبی ﷺ فی سفر، قالت: فسابقته فسبقته علی رجلی، فلما حملت اللحم سابقته فسبقنی فقال: هذه بتلک السبقة'')

امام ابوداؤداور دیگر محدثین کرام نے مسابقت کے ان کھیلوں کا ذکر کتاب الجہاد والسیر کے اندر کیا ہے۔ حالانکہ ان کا تعلق تفریح طبع سے زیادہ ہے اور دوسری تربیت وتدریب سے کم۔ لیکن یہ ان کا مطمح نظر ہے جو صحیح ہے۔ ان مسابقت کے کھیلوں کے واقعات سے بہرحال دوڑ نے اور دوڑ کا مقابلہ کرنے کا عام رواج ملتا ہے۔

✪✪✪

تیوہار و تقریبات

ہر قوم، ملک اور تہذیب میں مختلف قسم کے تیوہار اور تقریبات برپا ہوتی ہیں۔ یہ انسانی تہذیب وتمدن کی ایک مسلّمہ روایت رہی ہے۔ ان میں سے متعدد تقریبات انفرادی ہونے کے ساتھ کسی حد تک اجتماعی بھی ہوتی ہیں جیسے شادی، ختنہ، عقیقہ وغیرہ کی تقریبات جس میں صاحبِ بیت کے علاوہ متعدد اعزہ و اقرباء اور پڑوسی اور احباب بھی شریک ہوتے ہیں۔ ان تقریبات کا مزاج تہنیتی ہوتا ہے اور ان میں مسرت وشادمانی ہوتی ہے۔ کچھ تقریبات قومی نوعیت کے ملکی، قومی اور تہذیبی تیوہار ہوتے ہیں جن میں تمام باشندگانِ شہر، علاقہ و ملک حصہ لیتے اور خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں۔ ان میں مذہبی تقریبات بھی شامل ہوتی ہیں اور سماجی نوعیت کی بھی۔ اسی طرح وہ مقامی، قبائلی، علاقائی اور ملک گیر بھی ہوتی ہیں جن میں سب شامل ہوتے ہیں۔

(ڈاکٹر جواد علی، تاریخ العرب قبل الاسلام، مطبعة المجمع العلمی العراقی، بغداد، ۱۹۵۶ء، ۶/۳۳۲: بحث بر اعیاد)

قریشِ مکہ اور پورے براہیمی عرب دنیا کا سب سے بڑا مذہبی تیوہار حج کا سالانہ موقع تھا جسے سب مل کر برپا کرتے تھے۔ مذہبی مراسم بجالانے کے علاوہ وہ اس زمانے میں مختلف مقامات پر خاص سماجی اور تمدنی تیوہار بھی مناتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور عکاظ کا میلہ تھا۔ مکہ مکرمہ سے تھوڑی سی مسافت پر واقع عکاظ نامی مقامی پر عرب تہذیب وتمدن کا غالباً سب سے بڑا مظاہرہ اور عرب اقوام کا سب سے عظیم اجتماع ہوتا تھا، ان کی سب سے بڑی، پسندیدہ اور نمائندہ تہذیبی رسم شاعری کا بین القبائلی مقابلہ تھا جس میں تمام قبائل کے سر برآوردہ شعراء کرام حصہ لیتے تھے۔ ان کے قصائد واشعار کا تجزیہ ہوتا تھا اور کئی دن تک چلنے والے اس قومی عرب مشاعرہ کے بہترین قصائد اور بہترین شعراء کا انتخاب ہوتا تھا۔ روایاتِ عرب کے مطابق ان قصائد واشعار

اور منظومات کی ملک گیر ترسیل ہوتی تھی اور افتخار و اعزاز کی خاطر بہترین قصائد کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا جاتا تھا، خانہ کعبہ کے دروازے سے قصائد، دستاویزات اور منظومات وغیرہ کے آویزاں کرنے کی روایت کے پیچھے توقیر و اکرام کا جذبہ تو تھا ہی ان کی تقدیس اور ترسیل کا مقصود بھی حاصل کرنا تھا۔ بالواسطہ ان کی عمومی ترسیل بھی ہوتی تھی کہ زائرین وحجاج ان کی نقول سینہ و سفینہ دونوں میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ عکاظ کے علاوہ دوسرے اسواقِ (بازارِ) عرب بھی ان کے میلے ٹھیلے بن جاتے تھے کہ ان میں تجارت کے ساتھ تمدنی کاروبار بھی ہوتا تھا۔ ان میں شعر و شاعری، خطابت و تقریر اور دوسرے علمی مسابقوں کے ساتھ کھیل کود بھی ہوتے تھے اور ناچ رنگ کی محفلیں بھی برپا ہوتی تھیں۔ عکاظ کے قرب و جوار میں ذوالمجاز اور مجنہ تھے جو ایام حج میں ہی بہار دکھاتے تھے اور دوسرے اسواق/ بازار پورے جزیرۂ عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔

قریشِ مکہ کی عیدِ صنم

روایاتِ سیرت و تاریخ بالخصوص ابن اسحاق و ابن ہشام سے معلوم ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ اپنے ایک صنم کے پاس عید مناتے تھے، ان کے اصنام تو بہت سے تھے۔ مآخذ میں ان میں عیدِ صنم کی تعیین نہیں ہوتی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی صنم قوم کی تعظیم و توقیر میں عید مناتے تھے کیونکہ اس موقع پر وہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور اس کے لیے قربانی کرتے تھے، اس کے پاس جمع ہوتے تھے اور اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ وہ سال بھر میں ایک دن کی عیدِ قریش ہوتی تھی۔ وہ اس سالانہ تیوہار کے موقع پر خوشی مناتے اور جشن برپا کرتے تھے: "واجتمعت قریش یوما فی عید لھم عند صنم من اصنامھم، کانوا یعظمونه ویخرون له، ویعکفون عنده ویدیرون به، وکان ذلک عیدا لھم فی کل سنة یوماً... الخ (ابن ہشام، ۱/۲۲۲)

اسی عیدِ صنم کے موقعہ پر ایک سال قریش کے چار بڑے اشخاص نے بت پرستی سے بیزار ہوکر دینِ حنیفی اختیار کرلیا تھا۔

(اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو: خاکسار کا مقالہ حنیفیت عہد جاہلی میں، مذکورہ بالا؛ سہیلی، الروض الانف میں متعلقہ بحث بر صنم قریش: نیز جواد علی، مذکورہ بالا، ۶/۲۹۰-۳۰۹ ومابعد)

شارحینِ سیرت نے بالعموم اس سالانہ قومی عید قریش کی تفصیل نہیں دی ہے۔ متنِ ابن اسحاق سے صرف ایک قربانی کی مذہبی عید معلوم ہوتی ہے۔

یثرب کی عیدِ عاشوراء

روزۂ عاشوراء کے ضمن میں یثرب کے قبائلِ یہود کے تیوہار کا ذکر ملتا ہے۔ وہ بھی مذہبی نوعیت کا تھا اور تہذیبی رنگ بھی رکھتا تھا۔ یہودِ یثرب عاشوراء کے دن کا روزہ اس خوشی میں رکھتے تھے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنو اسرائیل کو فرعونِ مصر کے مظالم سے نجات دی تھی۔ وہ اس کے شکرانے میں ایک دن کا روزہ رکھتے اور اسے بطورِ عیدِ مسرت ونجات مناتے تھے۔ یہودِ یثرب نے رفتہ رفتہ اس مذہبی تقریب کو عام تیوہار میں تبدیل کر دیا اور اس دن بہت سے ایسے کام کرنے لگے کہ وہ خالص یہودی تیوہار بن گیا۔ وہ اس دن نئے کپڑے پہنتے اور اپنے بچوں اور اہل وعیال کو بھی پہناتے، بطور خاص اس دن اپنی عورتوں کے لیے زیورات اور دوسرے سامانِ آرائش خریدتے اور خوب جشن مناتے تھے۔ غالباً دوسرے تیوہار کے لوازم جیسے گانا بجانا اور ناچنا جھومنا اور کھیل کود بھی اُس میں شامل ہو گئے تھے۔ حدیثِ بخاری: ۲۰۰۵ میں صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا واضح بیان ہے کہ یوم عاشوراء کو یہود ایک عید سمجھتے اور شمار کرتے تھے: "کان یوم عاشوراء تعده الیهود عیداً"۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں دوسری کتبِ حدیث وسیرت سے اس موضوع پر روایات/احادیث جمع کر دی ہیں جو ان کی عیدِ عاشوراء کی تفصیلات کسی حد تک فراہم کرتی ہیں۔ ان کا خلاصہ اوپر آچکا ہے۔ ذیل میں ان کے متون نقل کیے جاتے ہیں:

- روایتِ مسلم: "کان یوم عاشوراء تعظمه الیهود تتخذه عیدا:
- دیگر روایتِ مسلم: "کان اهل خیبر یصومون یوم عاشوراء یتخذونه عیداً ویلبسون نساء هم فیه حلیهم وشارتهم"

(بخاری، کتاب الصوم، صیام عاشوراء؛ فتح الباری، ۴/۳۰۶-۳۱۱ بالخصوص آخری صفحہ؛ مسلم، کتاب الصیام، باب یوم عاشوراء؛ نووی، المنهاج: ۸/۲۰۳ ومابعد: حدیث: [۱۲۹] (۱۱۳۱) اور [۱۳۰])

امام نووی اور امام عسقلانی وغیرہ نے حدیث میں وارد الفاظ کی تشریح کی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو عمدہ کپڑے پہناتے تھے اور خواتین کو بطورِ خاص زیورات سے اس موقعہ پر آراستہ کرتے تھے مگر دوسری تفصیلات نہیں دیں۔ بہر حال حدیث مسلم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی عید عاشوراء صرف یثرب و مدینہ میں نہیں منائی جاتی تھی بلکہ خیبر میں بھی برپا کی جاتی تھی۔ اس کا بہر حال امکان ہے کہ دوسرے شہروں کے یہود بھی اس قومی عید کو مناتے ہوں۔ اس یہودی عید کا تمدنی اثر و نفوذ یہ ہوا کہ وہ مسلمانانِ یثرب کی بھی ایک تقریب بن گئی۔ مذہبی روزہ/عبادت کے علاوہ صحابہ کرام نے اس کے تہذیبی و تمدنی جہات کو اختیار کر لیا تھا۔ لہٰذا اس دن وہ بھی نئے لباس و زیور پہناتے اور خوشی و مسرت مناتے تھے حتی کہ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

قبائلِ عرب کے تیوہار

سیرت و تاریخ اور حدیث و سوانح کے اصلی مآخذ اور قدیم مصادر سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف قبائل و اقوامِ عرب اپنے اپنے تیوہار مناتے تھے اور ان کو بالعموم عید/اعیاد ہی کہتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ وہی مسرت و شادمانی اور انبساط کی جشن آرائی کی تھی۔ ان تیوہاروں میں بت پرست عرب قبائل یا دین ابراہیمی کے پیروکاروں کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے اہل جاہلیت کے تیوہار بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر جواد علی نے ان بکھرے اور منتشر معلومات کی بنا پر نتیجہ نکالا ہے کہ بعثتِ نبوی سے قبل تمام اقوام و طبقاتِ عرب اپنے معابد و مزارات پر جمع ہوتے تھے اور اپنی اپنی عیدیں مناتے تھے۔ یہود و نصاریٰ نہ صرف عرب- جزیرہ نمائے عرب میں- واقع اپنے معابد و مزارات سے وابستہ اعیاد میں جشن برپا کرتے تھے بلکہ وہ عراق و شام کے علاقوں میں واقع دوسرے کنیسوں، چرچوں اور مزاروں پر جاتے تھے جیسے شامی عرب سرجیوں کی مقدس ضریح کو جاتے تھے جو رُصافہ میں واقع تھی اور وہاں عبادت و توقیر کے علاوہ جشن برپا کرتے تھے۔ اسی طرح حیرہ کے لوگ اپنے شہر میں واقع متعدد کنیسوں میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور ان سے وابستہ عیدوں میں شرکت کرتے تھے۔ اسی طرح دوسرے عرب قبائل کا معاملہ تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے مشہور عرب جاہلی شاعر امروٴالقیس وغیرہ کے اشعار و قصائد سے نصاریٰ

کی عیدوں کا ذکر فراہم کیا ہے جب وہ عمدہ طویل اور شاندار لباس پہنتے تھے۔ ان نصرانی اعیاد کے نام اہل اخبار نے خوب بیان کیے ہیں۔ (تاریخ العرب قبل الاسلام، ۶/۲۴۴ ومابعد)

ان عرب قومی اور قبائلی اعیاد کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ اول اساس ان کی مذہبی عبادت پر قائم تھی۔ یعنی وہ روزہ رکھتے تھے، عبادت و زیارت کے لیے جاتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، قربانی کرتے تھے اور دوسرے مراسم عبادت بجالاتے تھے۔ بعد میں ان مذہبی اور دینی عبادات میں تمدنی اور تہنیتی اور جشن مسرت کی آمیزش ہونے لگی اور وہ خالص سماجی اور ثقافتی مواقع بن گئے۔ عرب سماج اور خالص عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں عاشوراء کے روزے کی مذہبی و دینی عبادت کے جشن قومی اور بزمِ نشاط میں ڈھلنے کی مثال ملتی ہے۔ بعد کے مسلم سماجوں اور تمدنوں میں ایسی بہت سی عبادات کو تمدنی تقریبات میں ڈھال لیا گیا جن میں سے کچھ بہرحال جواز کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن بیشتر بدعات وخرافات بن گئی ہیں جیسے عید میلاد النبی، شبِ براءت، محرم و چہلم وغیرہ کی تقریبات اور اب توحج وعمرہ بھی ان کی زد پر ہیں کہ وہ تمدنی تقریبات بنتی جارہی ہیں جس طرح نمازِ تراویح کے ختم قرآن کی اور جمعۃ الوداع کی اور بعض دوسری عبادات پر رنگ تقریب چڑھادیا گیا ہے۔

اسلامی تقریبات

اسلام میں اصولی طور سے مسرت وانبساط کی تقریبات کا اہتمام کرنے کی ہدایت انسانی فطرتِ نشاط زا کی رعائت میں دی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ سادگی، وقار اور احتیاط کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور وہ حضورِ قلب اور عبادتِ الٰہی سے آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مکی دور کی قریشی تقریبات میں اول اول حصہ لیا تھا مگر ان کی مشرکانہ چیزوں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ بعد میں ان قومی تیوہاروں سے بھی کلی اجتناب کیا کیونکہ ان میں بہرحال شرک وصنم پرستی کی کسی نہ کسی درجہ میں آمیزش ہوتی تھی۔ جس طرح احناف قریش نے بعثتِ نبوی سے قبل کے زمانے ہی سے ان اعیادِ قریش سے اپنا دامن جھاڑ لیا تھا اور ان میں نمایاں ترین حضرت زید بن نفیل بن عمرو عدوی تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے طواف کے دوران قریش کے اساف ونائلہ کے بتوں کے مسح کے ضمن

میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی صنم کی کبھی پوجا کی نہ ان کی عزت وتوقیر کی، البتہ ان سے وابستہ مشاہد میں شرکت فرماتے تھے، پھر اس سے اجتناب فرمایا (۱/۲۵۲-۲۵۳)۔ اسوۂ نبوی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذہبی یا دینی تقریب ہو یا خالص تمدنی وسماجی، ان کے مضر اخلاق وعقیدہ پہلوؤں سے اجتناب کرنا چاہیے اور خالص ثقافتی اور تہنیتی اور مسرت وانبساط کی جہات سے وابستہ رہا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک مسلمہ آفاقی اصول وقاعدہ ہے۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ مکی حج کے زمانے میں برپا ہونے والی تقریباتِ قومی میں رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کی شرکت کا امکان بہر حال ہے۔

اصلاً ان قومی تقریبات اور خالص حج وعمرہ یا کعبہ سے وابستہ تقریبات کا تعلق دین ابراہیمی کے بقیہ بقیہ سے ہے۔ جس طرح رسولِ اکرم ﷺ نے بعثت سے قبل بھی ان خرافاتِ قوم اور بدعاتِ حمس سے اجتناب فرمایا تھا اسی طرح ان کی ثقافتی تقریبات کے مضر پہلوؤں سے بھی گریز فرمایا تھا۔ بعد بعثت تو آپ ﷺ براہ راست وحی الٰہی کی پیروی میں رہے تھے لہٰذا جادۂ حق و توسط سے انحراف ممکن نہ تھا۔ اس کی مزید تصدیق ان تمام صحیح براہیمی-اسماعیلی اور حنفی تقریبات سے ہوتی ہے جو رسولِ اکرم ﷺ کو اپنی قوم قریش کے درمیان توارث وترکہ سے ملی تھیں۔ ان میں آپ ﷺ کی شرکت ہی نہیں بلکہ ان کی ترقی کا ثبوت موجود ہے۔ مثلاً شادی، عقیقہ، ختنہ وغیرہ کی تقریبات میں مذہبی اور دینی احکام کی بجا آوری کے علاوہ آپ ﷺ نے ان کی تمدنی جہات کی بھی رعایت کی۔ ان کے علاوہ دوسری تقریبات کو بھی اسلامی بنایا تھا۔ مکی دور کے بعد خالص مدنی دور میں عیدین کی خالص تقریبات دراصل اسی سعی نبوی کا ارتقائی مرحلہ ہے۔ گذشتہ سے پیوست کر کے تمدن وثقافت کے معاملات کو آنکنے اور دیکھنے سے یہ ارتقائی وابستگی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ حدیث نسائی: ۱۵۵۷ کے مطابق حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مدینہ کے لوگوں کے جاہلیت میں ہر سال دو دن کھیل کود کے ہوتے تھے جن کو رسولِ اکرم ﷺ نے عیدین سے تبدیل فرمایا: "... كان لاهل الجاهلية يومان في كل سنة يلعبون فيهما. فلما قدم النبي ﷺ المدينة قال: كان لكم يومان تلعبون فيهما وقد ابدلكم الله بهما خيرا منهما: يوم الفطر و يوم الاضحى". اس حدیث میں اس تمدنی تبدل وتبادلہ کی حقیقت بھی

جھلکتی ہے اور ارتقائی وابستگی کی بھی۔ مزید یہ واضح ہوتا ہے کہ مکی دور میں عیدین کی مشروعیت اس لیے نہ ہوئی کہ وہ یثربی تقریبات سالانہ کے بدل میں کی گئی تھی۔

عیدین کی تقریبات

جاہلی پس منظر اور حنفی تناظر میں اسلامی تقریباتِ عیدین کا مطالعہ کرنا ان کے بعض تہذیبی گوشوں کو مزید نمایاں کرتا ہے۔ مکی دور میں خالص اسلامی تقریبات کی قومی سطح پر گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ مذہب وسیاست کے ساتھ تہذیب وثقافت پر بھی جاہلیت کا تصرف تھا۔ بہر حال مدنی دورِ غالبیت میں جب مذہب وسیاست کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن پر اسلام اور مسلمانوں کا تصرف ہوا تو خالص اسلامی تقریبات کا آغاز ہوا اور وہ قومی سطح پر منائی جانے لگیں۔ بنیادی طور سے یہ دو تقریبات – دو عیدین – عید الفطر اور عید الاضحٰی – ہیں۔ بلاشبہ ان کا بنیادی پس منظر خالص مذہبی ہے: عید الفطر رمضان کے ماہانہ روزوں کے بعد بطور جشنِ مسرت وشادمانی منائی جاتی ہے اور عید الاضحٰی دس ذوالحجہ کو برپا ہوتی ہے خاص ان لوگوں کے لیے جو اس دن حجِ بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ جانے کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی محرومی کلی نہ ہوا اسلام اور رسولِ اکرم ﷺ نے ان پیچھے رہ جانے والوں کو تقریبِ بدل منانے کا موقعہ – پرمسرت موقعہ – عطا فرمایا۔ ان دونوں عیدوں کے منانے کا اسلامی فکر وفلسفہ بہت معنی خیز اور روح پرور ہے۔ عید الفطر میں ایک ماہ کے سخت روزوں والی عبادت کے شکرانے میں عید مسرت منائی جاتی ہے کہ دین کو فطرت سے ہم آہنگ کیا جاسکے اور عید الاضحٰی میں حج نہ کرسکنے والوں کو قربانی کی رسم ابراہیمی ادا کرنے کا موقعہ دے کر اور نماز میں اجتماعی شرکت کروا کر حج کے اجتماع وعبادت کا بدل عطا کیا گیا۔ یہ بدل صرف دینی نہیں تہذیبی اہمیت بھی رکھتا ہے۔

ان دونوں مذہبی تقریبات کی تہذیبی اور ثقافتی جہات خالص تیوہار والی ہیں جو مسرت وشادمانی کے مظاہرے ہیں:

- **غسل عیدین:** حدیث ابن ماجہ: ۱۳۱۵-۱۳۱۶ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ غسل فرماتے تھے اور ان دنوں غسل کا حکم دیتے تھے۔

- عمدہ لباس: رسولِ اکرم ﷺ کا حکم عالی بھی ہے اور سنتِ متواترہ بھی کہ عیدین کے دنوں میں بہترین کپڑے زیب تن کیے جائیں۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام بطور خاص ان دونوں تقریباتِ اسلامی کے لیے نئے عمدہ کپڑے سلواتے تھے اور پہنتے بھی تھے۔ امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین اور سیرت نگاروں نے اس کو تجمل آرائش وزیبائش بھی کہا ہے۔

("باب في العيدين و التجمل فيه" - فتح الباری، ۲/ ۵۶۷-۵۶۹ ومابعد؛ نسائی، كتاب صلاة العيدين، باب الزينة للعيدين، حدیث: ۱۵۶۱ وغیرہ)

اگرچہ امام بخاری اور امام نسائی وغیرہ نے واضح طور سے نئے اور عمدہ کپڑوں کے پہننے کی سنت و رواج کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ان دونوں اماموں نے بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ کے حلۂ استبرق/ دیباج پہننے کی درخواست پر مبنی حدیث سے ہی تجمل وزینت لباس کا قاعدہ لیا ہے۔ دیگر کتبِ حدیث میں بھی اسی طرح تجمل وزینت اور عمدہ لباس پہننے کی سنت کو بالواسطہ ہی بتایا گیا ہے۔ البتہ بعض دوسری کتب میں عمدہ اور نئے لباس زیب کرنے کی واضح روایات ملتی ہیں۔

آرائش وزیبائش

عیدین میں آرائش وزیبائش کرنا اور خوشبو میں جسم و کپڑے بسانا بھی سنت اور معمول رہا ہے۔ غسل کا ذکر حدیث ابن ماجہ میں ملتا ہے اور دوسری آرائش وزیبائش کا ذکر صحاح ستہ میں بالعموم نہیں ملتا۔ البتہ دوسری کتب حدیث وسیرت میں ملتا ہے۔

صبحِ عید الفطر میٹھی چیز کھانا بھی سنت ہے اور تقریبِ سعید کی مناسبت سے اس میں مسرت وانبساط کا عنصر ملتا ہے کیونکہ شیرینی اور شیریں چیز کا اول اول یا اس دن استعمال مسرت کی علامتِ ثقافی بھی ہے، آغازِ دن کے وقت استعمال میں مسرت سے افتتاح اور آغاز کی حکمت پائی جاتی ہے۔ روزہ رکھنے کے اشتباہ سے بچنے کا خیال نسبتاً نہیں پایا جاتا ورنہ کچھ بھی کھا لینے کا حکم و معمول ہوتا۔ شیریں چیز - کھجور وغیرہ - سے آغاز میں جو مسرت وخوشی پائی جاتی ہے وہ اہل ذوق پر آشکارا ہے۔

(بخاری، كتاب العيدين، باب الاكل يوم الفطر قبل الخروج؛ حدیث: ۹۵۳؛ فتح الباری، ۲/ ۵۷۵

ومابعد نیز مباحث عیدالاضحی؛ ترمذی، کتاب العیدین، باب فی الاکل یوم الفطر قبل الخروج— حدیث:۵۴۲-۵۴۳:"ویستحب له ان یفطر علیٰ تمر ..."نیز دیگر کتب حدیث)

عیدگاہ میں ہجومِ مسلمانان

مسلمانوں کے لیے عیدین میں عیدگاہ جانے کا حکم اصلاً دوگانہ شکر ادا کرنے کی خاطر ہے۔اس کا تہذیبی پہلو یہ ہے کہ مرد وزن اور بچے سب کے سب اس دن/ ان دنوں عیدگاہ ضرور جائیں حتی کہ وہ خواتین اور بچیاں جو طہارت سے مجبور ہیں ان کو عیدگاہ جانے اور مسرتوں میں شرکت کرنے کا حکم ہے، ظاہر ہے کہ وہ نماز میں حصہ لینے کی اہل ہی نہیں ہیں۔ بلاشبہ اس ہجومِ مسلمانان کو عیدگاہ میں جمع کرنے میں شوکت وقوتِ اسلام کے اظہار ومظاہرے کی حکمت بھی پائی جاتی ہے۔اسی بنا پر نمازِ عیدین کے مقامات کے لیے کھلے میدانوں کی مستحب شرط بھی عائد کی گئی ہے کہ مسجدوں کی چار دیواری میں وہ محدود ہو جائے گی مگر اس سے زیادہ شادمانی اور جشنِ مسرت کا احساس واظہار کرنا ہے کہ انسان اپنے اہل خانہ کے ساتھ مسرت زیادہ کشید کرتا ہے۔عیدگاہوں میں تقریب کے موقعہ پر خرید وفروخت اور کھیل کود اور جشن منانے کی جو فطری خواہش ہوتی ہے اس کے اظہار کا راستہ نکلتا ہے۔مساجد میں ایسی مسرت اور جشن آمیز حرکات وسکنات ان کے تقدس، وقار اور احترام کے بھی منافی معلوم ہوتی ہیں۔اسی حکمتِ شادمانی کے لیے عیدگاہوں کے جانے کے لیے ایک راستہ اور واپسی پر دوسرے راستہ کو اختیار کرنے کو مستحب ومسنون قرار دیا گیا ہے۔

(بخاری، کتاب العیدین، باب خروج النساء والحیّض الی المصلّٰی ؛فتح الباری، ۲/ ۵۹۷-۵۹۸-۶۰۹ نیز دوسرے ابواب ومباحث مابعد؛ نیز ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کے ابواب متعلقہ/ مذکورہ بالا؛ مسلم میں بھی بعض ابواب ہیں؛نسائی، کتاب صلاۃ العیدین، خروج العوانق و ذوات الخدور الخ)

مسرت کے شادیانے بجانا

متعدد ثقہ احادیث اور صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین میں مسرت کے شادیانے بجانے کی اجازت ہے۔عہدِ نبوی میں حضرت عائشہؓ کے گھر میں دو بچیاں/ لڑکیاں دف بجا بجا کر

گانا گا رہی تھیں اور دلچسپ بات ہے یہ انصاری لڑکیاں اپنے قومی جاہلی یوم غم - جنگ بعاث - سے وابستہ گانے گا رہی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ خانہ ام المومنین میں تشریف لائے تو بستر پر لیٹ گئے اور اپنا چہرۂ مبارک دوسری طرف کر لیا مگر ان بچیوں کو گانے بجانے اور حضرت عائشہؓ کو سننے سے نہیں روکا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے اور رسولِ اکرم ﷺ کے پاس شیطانی باجے کے بجانے پر سخت معترض ہوئے لیکن رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو روک دیا اور بعض روایات کے مطابق فرمایا: بجانے دو، آج ان کی عیدِ مسرت ہے"۔ "... عن عائشة قالت: "دخل عليّ رسول الله ﷺ وعندي جاريتان تغنيان بغناء بعاث، فاضطجع على الفراش وحوّل وجهه، ودخل ابوبكر فانتهرني وقال: مزمارة الشيطان عند النبي ﷺ! فاقبل عليه رسول الله ﷺ فقال دَعهما..." (حدیث: ۹۴۹ - اطراف حدیث: ۹۵۲، ۹۸۷، ۲۹۰۷، ۳۵۳۰، ۳۵۳۱) حدیث: ۹۵۲ میں وضاحت ہے کہ وہ عید کا دن تھا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تھا: اے ابوبکر! ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری ہے: "اِنّ لكل قوم عيدا، وهذا عيدنا" (فتح الباری، ۲/ ۵۶۷-۵۷۲ وما بعد)۔ حافظ ابن حجرؒ نے بہت مفصل بحث کی ہے اور دوسری روایات و احادیث سے مزید مدلل کیا ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے مذکورہ بالا حدیث کے ایک طرف کو اہلِ اسلام کی سنتِ عیدین "باب سنة العيدين لاهل الاسلام" قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس سے یہ دینی/فقہی اصول نکالا ہے کہ عیدین میں اہل اسلام کی ایک سنت گانا بجانا بھی ہے۔ دوسرے محدثین نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ امام نسائی نے کتاب صلاۃ العیدین میں دو باب باندھے ہیں: صرف الدف يوم العيد، الرخصة في الاسماع للغناء وصرف الدف يوم العيد۔ امام مسلم کی کتاب صلاۃ العیدین کا باب بھی اسی رخصت کو بتاتا ہے: باب الرخصة في اللعب، الذي لا معصية فيه، في ايام العيد "وغیرہ۔ دوسری کتبِ حدیث میں بھی ایسی ہی عبارات و تراجم ابواب ہیں اور ان کا ذکر نکاح و شادی کے حوالے سے آتا ہے۔ حدیث بخاری کے ایک طرف سے ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوتی ہے حضرت ابوبکرؓ جب حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور رسولِ اکرم ﷺ وہاں اپنے کپڑے سے منہ ڈھانپے لیٹے تھے تو وہ "ایام منیٰ" تھے: "باب اذا فاته العيد يصلي

رکعتین"۔ اس حدیث میں حضرت عمرؓ کو فہمائش نبوی ہونے کا حوالہ ہے۔ گویا یہ دو مواقع تھے۔ حدیث ابن ماجہ: ۱۳۰۲ کے مطابق حضرت عیاض الاشعریؓ نے انبار میں عید منائی تو لوگوں سے کہا کہ تم اس طرح گانا بجانا نہیں کر رہے ہو جیسا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے کیا جاتا تھا: "مالی لا اراکم تقلسون کما کان یقلس عند رسول اللہ ﷺ". باب ما جاء فی التقلیس یوم العید کا خاص باب معنی خیز ہے؛ التقلیس کے معنی دف بجانا اور گانا ہے)

عیدالاضحیٰ کی قربانی

بقرعید یا عیدالاضحیٰ میں عیدالفطر کی مانند مختلف رسوم اور خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ لیکن ایک اس کی خاص تقریب قربانی تھی۔ دراصل قربانی حج کا ایک فریضہ یا رکن یا واجب ہے۔ مگر جو لوگ حج بیت اللہ کے لیے نہیں جا سکتے ان کے لیے اپنے وطن ہی میں قربانی کرنے کا حکم دیا گیا، اس طرح ان کی حج سے مشابہت ہو جاتی ہے اور کم از کم ایک سنتِ ابراہیمی اور سنتِ نبوی پر عمل کرنے کی سعادت بھی مل جاتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے قربانی کی سنت عیدالاضحیٰ کو اول روزِ بقرعید سے رائج فرمایا تھا اور اس کی شروط و آداب بھی واضح فرما دیے تھے۔ پہلے دوگانہ نماز عیدالاضحیٰ پڑھی جائے پھر قربانی کی جائے۔ اسی کو آپ ﷺ نے اپنی اور مسلمانوں کی سنت فرمایا: "اصاب سنتنا / سنۃ المسلمین"

(بخاری، کتاب الاضاحی، باب سنۃ الاضحیۃ؛ فتح الباری، ۱۰/ ۵ و مابعد، حدیث: ۵۵۴۵-۵۵۴۶ و دیگر احادیث صحاح)۔

عہد نبوی میں جن لوگوں نے نماز سے قبل قربانی کر لی تھی ان کو رخصت تو بعض روایات کے مطابق عطا فرما دی مگر ایسا کرنے سے منع فرمایا اور بعض روایات میں صراحت ہے کہ ایسے حضرات کو دوبارہ نماز کے بعد قربانی کرنے کا حکم دیا تھا۔

(فتح الباری، ۱۰/ ۲۶-۲۹: بخاری، باب من ذبح قبل الصلاۃ اعاد")

- رسولِ اکرم ﷺ نے دورانِ حج بھی قربانی فرمائی اور مدینہ منورہ میں عیدالاضحیٰ کے دن بھی قربانی کی۔ ایک بار آپ ﷺ نے دو مینڈھے ذبح کیے: "... إلی کبشین فذبحهما"

(مذکورہ بالا، ۱۰/۹-۱۳ و مابعد) روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بالعموم دو مینڈھے ذبح فرماتے تھے: "کان النبی ﷺ یضحی بکبشین" اور سنت کی پیروی میں حضرت انس بن مالکؓ بھی دو مینڈھے ہی قربان کرتے تھے: "وانا اضحی بکبشین"

(مذکورہ بالا: حدیث: ۵۵۵۳، ۵۵۵۴، ۵۵۵۸، ۵۵۶۴، ۵۵۶۵، ۷۳۹۹)

- صحابہ کرام کو آپ ﷺ قربانی کے جانور بھی عطا فرماتے تھے اور ان سے ذبح کرنے کو فرماتے تھے جیسے دوسرے صحابہ کے علاوہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کو ایک جانور دے کر قربانی کرنے کا حکم دیا تھا۔ (حدیث: ۵۵۵۵)

- دوسرے صحابہ میں جن کی قربانی کرنے کا ذکر آتا ہے بہت سے حضرات و خواتین شامل تھے یعنی مدینہ منورہ کی پوری صاحب استطاعت آبادی - احادیث و روایات میں صرف حضرات صحابہ کے نام ملتے ہیں جیسے حضرات ابو بردہ۔ (حضرت براء بن عازبؓ کے ماموں؛ حدیث: ۵۵۵۶-۵۵۵۷)، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے ذبح کریں۔ (ترجمۃ الباب/ باب من ذبح ضحیۃ غیرہ الخ)

قربانی کا گوشت: طعام وضیافت

قربانی کے گوشت کے بارے میں اول حکم یہ تھا کہ تین دنوں سے زیادہ نہ رکھا جائے۔ اس کی مصلحت یہ بتائی جاتی ہے کہ شروع میں قربانی کرنے والے کم تھے اور مسلمانانِ مدینہ میں سے سب کو قربانی کا گوشت نہیں پہونچتا تھا۔ اس لیے رسولِ اکرم ﷺ نے نادار مسلمانوں کی ضیافت اور عید کی خوشی میں شریک کرنے کے لیے حکم دیا کہ تین دنوں سے زیادہ گوشت نہ رکھا جائے اور اسے لوگوں میں بالخصوص غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ دوسری مصلحت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ قربانی کرنے والوں کو ایثار، قربانی، اپنے عزیزوں، قریبوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا سبق پڑھایا جائے اور ان کو کھلے ہاتھ والا بنایا جائے۔ بعد میں یہ حکم تبدیل کر دیا گیا اور قربانی کے گوشت کو تا مدت رکھنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔ صحابہ کرام بالعموم قربانی کے گوشت کو کافی دنوں تک محفوظ رکھتے تھے اور اپنے مہمانوں یا غائب

عزیزوں کو ان کی آمد پر کھلاتے تھے۔ حضرت ابوسعیدؓ ایک طویل سفر سے واپس آئے تو ان کو قربانی کا گوشت پیش کیا گیا مگر انھوں نے اسے چکھا تک نہیں تا آنکہ ان کے بھائی حضرت ابوقتادہ بدریؓ نے ان کو بعد کے حکم سے آگاہ نہ کر دیا۔ دوسرے متعدد صحابہ کرام کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باقاعدگی سے اور اہتمام سے قربانی کا گوشت بچا کر رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ گوشت میں نمک لگا کر محفوظ کر لیتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات صحابہ حج پر جاتے تو وہاں قربانی کرتے اور اس کا گوشت مدینہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے لاتے تھے۔

(بخاری، باب ما یوکل من لحوم الاضاحی وما یتزوّد عنھا؛ فتح الباری، ۱۰/۳۰-۳۸، احادیث: ۵۵۶۷ ومابعد؛ اسد الغابہ، ۵/۶۰۳ وغیرہ؛ نیز دیگر کتب حدیث)

عید الاضحیٰ کی قربانی کا ایک فقہی پہلو بھی ہے۔ بعد کے ائمہ کرام نے احادیث وسنن ہی کی بنیاد پر فیصلہ/فتویٰ دیا ہے کہ عید الاضحیٰ کے دن ہر صاحبِ نصاب شخص - مرد و عورت - پر فرداً فرداً قربانی واجب ہوتی ہے لہٰذا ہر شخص یا تو ایک بکرا/بکری قربان کرے یا سات اشخاص مل کر گائے اور بڑے جانوروں میں حصہ لے لیں۔ بکرے/مینڈھے وغیرہ کے بارے میں مسئلہ کا نزاعی پہلو ہے کہ وہ صرف ایک شخص کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ مگر بعض روایات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ متعدد صحابہ کرام اور اکابرِ عہد اسلامی ایک بکرے/بھیڑ/مینڈھے کی قربانی کو پورے اہلِ بیت کی طرف سے کافی سمجھتے تھے اور اسی پر عمل کرتے تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن ہشام تیمی وغیرہ شامل تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ صرف ایک کبشہ کی قربانی کسی مرتبہ پورے آل محمد ﷺ کی طرف سے کافی سمجھی گئی۔ ان روایات واحادیث کا ایک دلچسپ تمدنی اور سماجی پس منظر ہے۔ بعض مال دار افراد وطبقات نے بڑھ چڑھ کر اور ایک گھر کے متعدد افراد نے الگ الگ جانور ذبح کرنے شروع کر دیے تھے لہٰذا صحابہ کرام نے راہ اعتدال نکالی

(اسد الغابہ، ۲/۲۳۲: بعض صحابہ کرام کے تاثرات اور پورے گھر کی طرف سے صرف ایک جانور قربان کرنے کی وجہ یہی بتائی گئی ہے۔ اسد الغابہ، ۳/۲۷۰-۲۷۱: عبداللہ بن ہشام التیمی ... کان یضحی الشاۃ الواحدۃ من جمیع اھلہ''؛ دیگر صحابہ کرام کے عمل کے لیے: اسد الغابہ، ۵/۶۶، ۶۹)

عقیقہ کی تقریب

مسرت وانبساط کی دوسری تقریب عقیقہ کے نام سے جانی جاتی ہے اور وہ ارشاداتِ نبوی کے مطابق سنت ہے۔ وہ دراصل اسلامی آفاقی سنتِ انبیاء ہے جو روزِ اول سے چلی آ رہی ہے اور جس پر عرب جاہلی کے طبقات وافراد کا بھی عمل رہا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی ولادت کے باب میں اس تقریبِ سعید کی تفصیلات ملتی ہیں۔ جد امجد جناب عبدالمطلب ہاشمی نے ان کو انجام دیا تھا۔ خاص رسومِ عقیقہ -تسمیۂ نومولود، سر کے بال مونڈنے کے علاوہ- شفیق وکریم دادا نے قربانی کی تھی اور وہ ایک لازمۂ عقیقہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ انھوں نے اعزہ واحباب کی ضیافت کا اہتمام بھی کیا تھا۔ اور یہ کچھ انھیں سے خاص نہ تھا، یہ عام عربوں کا رواج بھی تھا۔

(بخاری، کتاب العقیقة کے ابواب: فتح الباری، ۹/ ۲۶۷-۴۰۷؛ ابن کثیر، ۲/ ۲۶۵؛ نیز عبدالمطلب ہاشمی... ۷۱-۷۲ ومابعد؛ بلاذری، انساب، ۱/ ۴۰۴؛ حدیث ۵۴۷۲: "مع الغلام عقيقة، فأهريقوا عنه دماً..." اس کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے متعدد واقعات عہد کا ذکر کیا ہے)

رسولِ اکرم ﷺ نے اس سنتِ انبیاء کو اسلامی تمدن میں بھی قبول کر کے اپنے احکام و افعال سے اسے فروغ دیا۔ آپ ﷺ نے عقیقہ کو سنت قرار دے کر ان تینوں رسوم کو آئینی، اسلامی اور مذہبی حیثیت تو عطا فرمائی ہی ان کو تمدنی مرتبہ بھی عطا کیا۔ حضرت حسن اور حضرت حسینؓ کے بارے میں وضاحت سے اور دوسرے بچوں/ نواسوں کے بارے میں مضمر طور سے آتا ہے کہ ان کی ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کیا جاتا تھا اور نومولود کے نام رکھنے، ان کے سر کے بال مونڈنے اور ان کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کرنے اور ان کی طرف سے ایک یا دو بکرے بکری ذبح کرنے اور اعزہ واقرباء کی ضیافت کرنے اور خوشی ومسرت منانے کو آپ ﷺ نے سنت بنا دیا۔ اپنے آخری فرزند حضرت ابراہیمؓ کا عقیقہ بھی اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ میں کیا تھا جس طرح دوسری اولادوں کا مکہ مکرمہ میں انجام دیا تھا۔

(فتح الباری، مذکورہ بالا؛ بلاذری، ۱/ ۴۰۴ عقیقہ حضرت حسینؓ؛ اسد الغابہ، ۱/ ۳۸؛ نیز بلاذری، ۱/ ۴۴۳-۴۴۴؛ نیز صحاح کی کتب عقیقہ اور ان کے ابواب)۔

ظاہر ہے کہ دوسرے مکی اور مدنی دور کے تمام مسلمانوں نے بالخصوص اور دوسرے حاملینِ دین براہیمی نے بھی ہمیشہ عقیقہ کی تقریبات برپا کی تھیں۔

ختنہ کی تقریب بھی سنتِ انبیاء ہے اور اسے حدیثِ نبوی ﷺ نے خصالِ فطرت میں شمار کیا ہے اور اسے آفاقی اسلامی روایت قرار دیا ہے۔ اس کی سنت اور مذہبی حیثیت سے قطع نظر ایک تمدنی حیثیت بھی ہے اور وہ بھی تقریبِ مسرت سمجھی اور اسی طور منائی جاتی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیقہ کے ساتھ ہی بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ کا ختنہ بھی کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد دعوت و ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بظاہر وہ عقیقہ کا اہتمامِ دعوت معلوم ہوتا ہے لیکن اسلامی روایات بتاتی ہیں کہ جن بچوں/لڑکوں کا ختنہ بعد میں ہوتا تھا ان کے لیے بطور خاص اس موقعہ پر دعوت و ضیافت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بہر حال ایک سنت تھی اور سنت کی انجام دہی مسرت افزا تقریب بن جاتی ہے۔

خوشی کی تقریباتِ دیگر

عام سماجی طبقات میں کئی ایک خوشی اور شادمانی کی تقریبات بھی بالعموم برپا ہوتی تھیں اور ان میں اسی طرح خوشیاں منائی جاتی تھیں: عمدہ لباس، خوشبو، آرائش و زیبائش، گانا بجانا، موسیقی سننا سنانا اور کھیل کود ان تقریبات کے لوازمے تھے پھر ہر ایک تقریب کی ایک خاص ادا اور مزاج کے مطابق دوسرے انتظامات ہوتے تھے، جو اس تقریبِ مسرت کو چار چاند لگاتے تھے۔ جیسے شادی بیاہ کی تقریب میں دعوتِ برات، رسومِ رخصتی اور ولیمہ، عقیقہ میں دعوتِ طعام اور دوسری رسوم، اور ختنہ کے موقع پر اظہارِ اسلامی مسرت وغیرہ۔ ان تقریبات کا بھی ایک سماجی اور دینی پس منظر ہے جو دینِ ابراہیمی کی روایت بھی ہے اور تمدنِ انسانی کا تسلسل بھی۔

شادی بیاہ کی تقریبات

دعوتِ برات و ولیمہ

نکاحِ اسلامی کی روایت عہدِ جاہلی میں بھی تھی جو تمدنِ براہیمی سے آئی تھی اگرچہ دوسرے

منحرفانہ اور بدعتی نکاح بھی رائج ہو گئے تھے۔عہد جاہلی میں تمام اشراف عرب وہی نکاح کرتے تھے جو بعد میں اسلامی نکاح کے نام سے جانا جاتا ہے۔خوشی کے تمام دوسرے علائم کے علاوہ دعوتِ برات بھی ہوتی تھی جولڑکی یا لڑکی والوں کی طرف سے دولہا اور اس کی بارات کو دی جاتی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ کی حضرت خدیجہؓ سے قبلِ بعثت شادی میں اسی براہیمی/حنیفی نکاح کی رسوم ادا کی گئی تھیں۔رسولِ اکرم ﷺ اپنے اعزہ واحباب پر مشتمل بارات لے گئے تھے، آپ ﷺ کے شفیق ترین چچا نے خطبۂ نکاح پڑھا تھا۔اور پھر لڑکی کی طرف سے دعوتِ طعام دی گئی تھی جس میں ایک گائے ذبح کی گئی تھی۔اس موقعہ پر لڑکی والوں اور لڑکے والوں نے عمدہ لباس بھی زیب تن کر رکھے تھے۔رسولِ اکرم ﷺ نے بنفس نفیس اور بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ کے چچاؤں نے دعوتِ ولیمہ کا ایک شاندار اور پروقار اہتمام بھی کیا تھا۔مکی دور میں حضرت عائشہؓ سے نکاح کی تقریب کے بارے میں معلوم نہیں لیکن مدینہ میں ان کی رخصتی کے وقت خواتین کی دودھ و کھجور سے ضیافت کی گئی تھی۔(اسد الغابہ،۵/۳۹۴)

بعدِ نبوت بلکہ بعدِ ہجرت رسولِ اکرم ﷺ کے حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح (۷ھ/ ۶۲۹ء میں) یہی تمام تقریبات برپا ہوئی تھیں۔اور حضرت نجاشیؒ نے دعوتِ نکاح کو تو سنتِ انبیاء قرار دے کر اس کا خاص اہتمام کیا تھا۔عرب کے باہر حبشہ میں شادی کی تقریبات کی یہ مماثلت و یکسانی تہذیبی لین دین کے علاوہ اسلامی تمدن کی آفاقیت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

(ابن کثیر،۱/۲۶۶-۲۶۷؛ بخاری، کتاب النکاح کے ابواب مختلفہ؛ فتح الباری،۹/۱۴۱-۴۲۸؛ اسلامی احکام کا ارتقاء، بابِ نکاح)

سسرال میں شبِ زفاف

عرب جاہلی میں ایک تمدنی اور سماجی رواج یہ بھی رہا تھا کہ شادی کے بعد دولہا سسرال میں قیام کرتا تھا۔بالعموم یہ قیام تین دنوں تک رہتا تھا اور ان ہی دنوں میں وہ اپنی سسرال ہی میں شبِ زفاف مناتا تھا۔ظاہر ہے کہ اس کا سارا انتظام وانصرام دولہن کے گھر والے کرتے تھے۔ اس خاص رات بعض میٹھی چیزوں جیسے کھجور اور شربت وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا اور پانی بھی بطور

خاص فراہم کیا جاتا تھا۔ بعض دوسرے خاص انتظامات ہوتے تھے۔ روایات و آثار سے ایسا بھی واضح ہوتا ہے کہ سسرال میں شوہر کا بیوی کے ساتھ قیام بالغوں یا بڑوں کے لیے ہوتا تھا یعنی جن لوگوں کا نکاح بڑی عمر میں ہوتا تھا اور نکاح کے بعد ہی دولہن کی رخصتی عمل میں آتی تھی۔ ان کے لیے یہ سماجی ضابطہ تھا۔ اب سسرالی قیام اور اس کے دوران شب زفاف منانے کا ایک حوالہ تو جناب ہاشم بن عبد مناف کے مدنی نکاح میں ملتا ہے جب انھوں نے شیخ نجار/خزرج عمرو بن زید نجاری خزرجی کی دختر نیک اختر سلمیٰ سے مدینہ میں نکاح کر کے ان ہی گھر میں شبِ زفاف گذاری تھی۔ مگر اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ سفر کے دوران کی شادی تھی لہٰذا مجبوری کا سودا تھا۔ (سیرت حلبی، ۱/ ۷؛ تفصیل کے لیے: عبد المطلب ہاشمی ...۴-۵ ومابعد)

رسولِ اکرم ﷺ کے والد ماجد جناب عبداللہ بن عبد المطلب ہاشمی کی حضرت آمنہ بنت وہب زہری سے شادی تو خاص مکہ مکرمہ میں دو عظیم ترین خاندان قریش - بنو ہاشم و بنو زہرہ - کے درمیان ہوئی تھی لہٰذا مقامی تھی۔ ان کی شادی/ نکاح کے بعد ان کے سسرال میں شب زفاف گذارنے اور تین روز قیام کرنے کا ذکر ملتا ہے، اور نہ صرف ذکر ملتا ہے بلکہ اسے عربوں کی ایک سماجی اور تمدنی روایت قرار دیا جاتا ہے جسے سب نے قبول کیا ہے۔

(ابن سعد، ۱/ ۹۴-۹۵؛ کتاب المنمق، ۲۶۵-۲۶۷: "لما تزوج عبداللہ بن عبدالمطلب آمنة بنت وهب اقام عندها ثلاثا، و كانت تلك السنة عندهم اذا دخل الرجل علىٰ امراته فى اهلها..." نیز ملاحظہ ہو: عبد المطلب ہاشمی، ۶۶-۶۸؛ شبلی، ۱/ ۱۶۸: "دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن سسرال میں رہتا تھا..." بحوالہ زرقانی، ۱/ ۱۲۲)

دوسرے مکی یا مدنی نکاحوں کے باب میں اس سماجی یا تمدنی روایت کا بالعموم ذکر نہیں ملتا ہے۔ لیکن یہ طے شدہ ہے کہ وہ قریشی/ مکی سنتِ نکاح یا دستور تمدن ضرور تھا اور عام رواج رکھتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد آپ ﷺ کا سہ روزہ قیام سسرال میں رہا تھا۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ شادی کے بعد آپ ﷺ اپنی زوجہ محترمہ کے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ دستورِ نکاح و شب زفاف ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ اپنی دولہن کو اپنے گھر رخصت کرا لائے تھے۔ اور یہ عام دستور عرب و مکہ و قریش تھا۔ لہٰذا تمام دوسرے نکاحوں اور شادیوں میں بھی اس کو تسلیم کرنا چاہیے۔

نئی دولہن کے ساتھ سہ روزہ قیام

ایک سے زیادہ شادی یا متعدد بیویوں کے معاملہ میں یہی سہ روزہ قیام کی سنت نبوی ملتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اپنی ہر ایک بیوی کے ساتھ شادی کے بعد تین دنوں قیام فرماتے تھے اور پھر دوسروں کی باری بھی اسی مدت کی ہوتی تھی۔ اس کا واضح ذکر حضرت ام سلمہؓ سے شادی کی حدیث بخاری میں ملتا ہے۔ یہ دراصل بیوی کے گھر میں قیام شوہر یا قدیم مکی/ قریشی دستورِ زفاف کی توسیع تھی اور وہ منصفانہ باری تو تھی ہی تھی۔

شبِ زفاف گذارنے کی ایک دوسری روایت یا دستور کمسن بیویوں کے ذکر میں ملتا ہے۔ نکاح کے بعد ان کی رخصتی ایک خاص مدت کے بعد ہوتی تھی جیسے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شادی کے تین سال بعد ان کی رخصتی ہوئی۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور اہم تمدنی اور سماجی روایت بھی ہے اور فقہی، فطری اور دینی رسم بھی۔ اس صورت میں رخصتی کے بعد نئی دولہن کے ساتھ شبِ زفاف شوہر کے گھر میں ادا/ بسر کی جاتی تھی۔

(بخاری، کتاب النکاح، حضرت عائشہ سے نکاح کے ابواب؛ فتح الباری، ۹/ ۲۳۸ و مابعد، ۲۷۸، ۲۷۹ وغیرہ)

ولیمہ

دعوتِ ولیمہ یا تقریبِ ولیمہ کو آفاقی بنانے کی ایک انتہائی خوبصورت مثال حضرت میمونہؓ کے نکاح کے باب میں ملتی ہے۔ ۷ھ/ ۶۲۹ء میں عمرۃ القضاء کے موقعہ پر رسولِ اکرم ﷺ نے عمرہ کے بعد قیامِ مکہ مکرمہ کے مختصر عرصہ میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا اور اکابرِ قریش سے التماس فرمایا کہ دو چار دن مزید قیام کی اجازت دی جائے تا کہ آپ ﷺ ولیمہ کی دعوت طعام دیں اور اکابرِ مکہ کو بھی شریک کریں مگر حیثانِ قوم نے نبوی دعوت مسرت و پیغامِ صلح کو مسترد کر دیا اور خود کو ایک بڑی نعمت میں شرکت سے اپنے ہاتھوں محروم کر لیا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی اس حدیث وسنت سے ایک اہم روایت وعُرف کا پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام بھی سماجی تقریبات میں اپنے غیر مسلم اعزہ واقرباء اور دوسرے اکابرِ قوم کو شریک کیا کرتے تھے۔ دراصل سماجی تقریبات میں نبوی طریق یہی تھا کہ سب کو شریک کیا جائے۔ اسی سے غیر مسلموں کو

اسلامی سماجی تقریبات میں اور ان کی غیر مسلم سماجی تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت کا اصول و معمول نکلتا ہے، شرط یہ ہے کہ غیر مسلم سماجی تقریبات میں مشرکانہ رسوم ورواج سے ضرور بچا جائے اور کلی اجتناب کیا جائے جیسا کہ معمولِ نبویؐ بھی تھا۔

(اسد الغابہ، ۶/ ۵۵۱؛ نیز مکی اسوۂ نبوی- مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل، نئی دہلی ۲۰۰۵ء، بالخصوص ۱۶۲-۱۶۵ و مابعد)

متعدد دوسرے ولیموں میں رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے اکابرِ اسلام کی شرکت کے متعدد واقعات و آثار کتابوں میں ملتے ہیں۔ حضرت ابواسید الساعدیؓ نے جب حضرت ام اسیدؓ سے شادی کی تو دعوتِ ولیمہ میں رسولِ اکرم ﷺ اور اصحاب کی ضیافت کی (اسد الغابہ، ۵/ ۵۶۵)۔ ایک اور ولیمہ میں رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت سلمہ بن سلامہؓ کے ساتھ شرکت فرمائی تھی اور حضرت سلمہ نے وضو ہونے کے باوجود نیا وضو کیا تھا کیونکہ اس وقت تک حدیث کا حکم تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کا استعمال کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا تھا مگر بعد میں وہ حکم دوسری حدیث سے منسوخ ہو گیا (اسد الغابہ، ۲/ ۳۳۷)۔ اس روایت کا دوسرا جز و منسوخی احکام اور انقلابِ احوال کے اصول کے علاوہ ولیمہ کی سماجی حیثیت کو بھی بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے بعد میں ایسی ہی ایک دعوتِ شادی میں شرکت کی۔ یہ عہدِ نبوی یا عہدِ صحابہ کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے جب اپنے شہید بھائی حضرت زیدؓ کی بیوہ حضرت عاتکہؓ سے ۱۲/ ۶۳۳ء میں شادی کی تو منجملہ دوسرے اقرباء و احباب کے حضرت علیؓ کو بھی ولیمہ میں بلایا۔ حضرت علیؓ نے امیر المومنین کی اجازت سے حضرت عاتکہؓ سے اس موقع پر گفتگو بھی کی (اسد الغابہ، ۵/ ۴۹۸)۔ ایسی بہت سی مثالیں اور روایات جمع کی جا سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کی تقریب میں ولیمہ کی ایک عظیم سماجی روایت تھی جو عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں پوری طرح سے مستحکم و مضبوط اور مقبول تھی۔ عہدِ نبوی کے کھانے کی دعوتوں میں ان کا ذکر بھی آیا ہے۔

دولہن کی رخصتی

بعد نکاح یا بعد مدت دو طریقے عہد نبوی میں ملتے ہیں: نکاح کے بعد بالعموم رخصتی ہو جاتی تھی اور کمسن دولہن کی بعد مدت رخصتی ہوتی تھی۔ شادی کی مختلف تقریبات یا رسوم میں سے ایک

لڑکی کی رخصتی کی تقریب تھی۔ دولہن کی آرائش وزیبائش کے علاوہ متعدد دوسری تیاریاں کی جاتی تھیں۔ بالعموم بڑی لڑکیوں اور جوان بچیوں کی شادی یا نکاح کے بعد ان کی رخصتی کی رسم انجام پا جاتی تھی۔ لیکن کمسن بچیوں کی شادی کے ایک عرصہ کے بعد رخصتی یا گونے کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ دولہن کی کم عمری ہوتی تھی کہ اس کے سبب وہ شب زفاف گذارنے کے لائق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شادی/ نکاح اور رخصتی/ گونے میں تین سال کا وقفہ اسی بنا پر روا رکھا گیا تھا۔ اس سے مختلف فقہی احکام کا ارتقاء ہوا۔ ان میں کمسنی کی شادی کی اجازت، ولی کی ولایت، نکاح کے بعد زن وشوہر کے تعلقات کی استواری وغیرہ کے معاملات شامل ہیں۔ (اسلامی احکام کا ارتقاء، باب نکاح - حضرت عائشہ صدیقہؓ نیز مندرجہ ذیل واقعات وحوالہ جات)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شادی مکہ مکرمہ میں دسویں سال نبوت میں (۶۲۰ء کے لگ بھگ) انجام پذیر ہوئی تھی "حضرت عطیہؓ حضرت عائشہؓ کے نکاح کا واقعہ اس سادگی سے بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ ان کی انا آئی اور ان کو لے گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آکر نکاح پڑھا دیا۔... حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب میرا نکاح ہوا تو مجھ کو خبر تک نہ ہوئی کہ میرا نکاح ہو گیا۔ جب میری والدہ نے باہر نکلنے میں روک ٹوک شروع کی تب میں سمجھی کہ میرا نکاح ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میری والدہ نے مجھے سمجھا بھی دیا"

(سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہؓ، ۱۳ بحوالہ طبقات ابن سعد)

ان کی رخصتی کا واقعہ/ رواج بھی سید صاحب نے بیان کیا ہے کہ "مدینہ گویا حضرت عائشہؓ کی سسرال تھی۔ انصار کی عورتیں دلہن کو لینے حضرت ابوبکرؓ کے گھر آئیں۔ حضرت ام رومانؓ نے بیٹی کو آواز دی۔ وہ اس وقت سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں، آواز سنتے ہی ماں کے پاس ہانپتی کانپتی دوڑی آئیں۔ ماں بیٹی کا ہاتھ پکڑے دروازہ تک لائی۔ وہاں منہ دھلا کر بال سنوار دیے، پھر ان کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں انصار کی عورتیں دلہن کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ دلہن جب اندر داخل ہوئی تو مہمانوں نے "علی الخیر والبرکۃ وعلیٰ خیر طائر" یعنی تمہارا آنا بخیر وبابرکت اور فال نیک ہو، کہہ کر استقبال کیا۔ دلہن کو سنوارا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود آنحضرت ﷺ بھی تشریف لے آئے۔ اس وقت آپؐ کی ضیافت کے لیے دودھ کے

ایک پیالہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ حضرت اسماءؓ بنت یزید، حضرت عائشہؓ کی ایک سہیلی، بیان کرتی ہے کہ میں اس وقت موجود تھی کہ آنحضرت ﷺ نے پیالہ سے تھوڑا سا دودھ پی کر حضرت عائشہؓ کی طرف بڑھایا تو وہ شرمانے لگیں۔ میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا عطیہ واپس نہ کرو"۔ انھوں نے شرماتے شرماتے لے لیا اور ذرا سا پی کر رکھ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی سہیلیوں کو دو..."

(سیرت عائشہؓ ۱۸ بحوالہ طبقات النساء ابن سعد، صحیح بخاری، تزویج عائشہ ص ۵۵؛ صحیح مسلم، کتاب النکاح؛ احمد بن حنبل، مسند، اسماء بنت یزید)۔

حضرت سید صاحب کے بیان میں روایات واحادیث کی تلخیص کی وجہ سے متعدد ابہام پیدا ہو گئے ہیں:

۱- حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بنو حارث بن خزرج کے محلے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک باغ میں درخت کی دو شاخوں کے درمیان جھولا ڈالے جھول رہی تھیں جب ان کی ماں نے ان کو خود جھولے سے اتارا اور گھر لے گئیں۔

۲- رسولِ اکرم ﷺ انصاری خواتین کے بعد دلہن کو رخصت کرانے کے لیے حضرت ابو بکرؓ کے گھر تشریف لے گئے۔

۳- دودھ سے ضیافت کا واقعہ دلہن کے گھر پیش آیا تھا۔ سید صاحب کا جملہ کہ "اس وقت آپؐ کی ضیافت کے لیے دودھ کے ایک پیالہ کے سوا کچھ نہ تھا" مبالغہ آمیز ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مہمانِ مکرم کی تواضع اسی طرح دودھ سے کی جاتی ہے اور وہ اب مسلم شادی کا ایک سماجی رواج بھی ہے۔

۴- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے رخصت ہو کر خانۂ نبوی میں آنے کا ذکر اس پورے بیان میں نہیں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ ان کو گھر لائے تھے۔

۵- احادیثِ رخصتی کے مجموعی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کو رخصت کرا کے اپنے دولت کدے پر لائے۔ ان کے ساتھ ان کی سہیلیوں اور ان کے کھلونوں کے علاوہ انصاری خواتین بھی تھیں جو ان کو رخصت کرانے خانہ صدیقی میں پہونچی تھیں۔

۶- ایک اہم سماجی روایت یہ نظر آتی ہے کہ رخصتی کے وقت/ بعد دولہا نے دولہن کی دودھ/ میٹھی چیز سے ضیافت کی تھی اور نہ صرف دولہا دولہن نے اسے نوش کیا تھا بلکہ حاضرین و حاضرات بالخصوص دولہن کی سہیلیوں کی بھی ضیافت کی گئی تھی۔ یہ ضیافت رخصت بھی کہی جاسکتی ہے۔

۷- حضرت سیدؒ نے شبِ زفاف کی رسوم و روایات پر کچھ نہیں لکھا کہ وہ اس طبقہ احادیث میں نہیں مذکور ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ علیہ ﷺ کی شادیوں/ شب ہائے زفاف کے بارے میں ان کا ذکر بطور رسم تمدن آتا ہے۔ ان کے مطابق دولہا دولہن کی شبانہ ضیافت وراحت کے لیے شیرینی اور پانی کا انتظام کیا جاتا تھا۔

حضرت فاطمہؓ کی رخصتی

حضرت سید سلیمان ندویؒ نے حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کا واقعہ/ رواج مختلف کتبِ حدیث و سیرت کی روایات کی بنا پر لکھا ہے: ''...۲ھ کے بیچ میں وہ حضرت علی مرتضیٰ سے بیاہ دی گئیں۔ شادی کے لیے جن ماؤں نے سامان درست کیا ان میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام کیا، مکان لیپا، بستر لگایا، اپنے ہاتھ سے کھجور کی چھال دھن کر تکیے بنائے، چھوہارے اور منقے دعوت میں پیش کیے، لکڑی کی الگنی تیار کی کہ اس پر پانی کی مشک اور کپڑے لٹکائے جائیں۔ وہ خود بیان کرتی ہیں کہ فاطمہؓ کے بیاہ سے کوئی اچھا بیاہ میں نے نہیں دیکھا۔ شادی کے بعد حضرت فاطمہؓ جس گھر میں گئیں اس میں اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں صرف ایک دیوار کا فصل تھا۔ بیچ میں دریچہ تھا جس سے کبھی کبھی باہم گفتگو ہوتی تھی''

(سیرت عائشہ،۶۹ بحوالہ ابن ماجہ، باب الولیمہ و خلاصۃ الوفاء، فصل رابع، نیز ۲۷، بحوالہ خلاصۃ الوفاء، فصل ۴، ص ۱۲۷، مصر بحوالہ یحییٰ کے مطابق ''...اسی دریچہ سے حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ میں کچھ گفتگو ہوگئی۔ آخر حضرت فاطمہؓ کی درخواست پر آپؐ نے یہ دریچہ بند کرادیا'')۔

حضرت سیدؒ نے اس مکانِ بتولؓ کو شادی کے بعد کا گھر قرار دیا ہے جو ان کے قیاس پر مبنی

ہے ورنہ حدیثِ ابن ماجہ-۱۹۱۱ میں ان کے دریچہ کلام کا ذکر نہیں ہے۔صرف تقریباتِ رخصتی کا بیان ہے۔اس کا متن حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ دونوں کے مشترکہ بیان پر مبنی ہے۔ پہلے متن حدیث پیش ہے پھر مختصر بحث آتی ہے:

۱۹۱-حدثنا سوید بن سعید، حدثنا [المفضل] بن عبدالله عن جابر عن الشعبی عن مسروق عن عائشة وام سلمة قالتا: أمرنا رسول الله ﷺ ان نجهز فاطمة حتی ندخلها علی علیّ، فعمدنا إلیٰ البیت ففرشناه ترابا لیناً من اعراض البطحاء، ثم حشونا مرفقتین لیفاً، فنفشناه بایدینا، ثم أطعمنا تمرا و زبیبا، وسقینا ماءً عذبا، وعمدنا الی عود فعرضناه فی جانب البیت لیلقی علیه الثوب ویعلق علیه السقاء، فما رأینا عرسا احسن من عرس فاطمة. (موسوعة:۲۵۹۱)

اس حدیث سے متعدد اہم سماجی اور تمدنی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو بشکلِ نکات ذیل میں درج ہیں:

۱- حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام سلمہؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کے حکم سے حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کا سامان کیا تھا۔اس سلسلے میں سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ تو اس وقت حضرت فاطمہؓ کی ماں بن چکی تھیں کہ وہ شوال اھ میں کاشانۂ نبوت میں آ چکی تھیں، اگرچہ وہ حضرت فاطمہ زہراؓ سے سات آٹھ سال عمر کے لحاظ سے چھوٹی تھیں۔ جب کہ حضرت ام سلمہؓ اس وقت رسولِ اکرم ﷺ کے رضاعی بھائی حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ کے نکاح میں تھیں۔اس لحاظ سے وہ رسولِ اکرم ﷺ کی بھاوج بھی تھیں اور محرم بھی۔ان سے نکاحِ نبوی حضرت ابو سلمہؓ کی شہادت کے بعد ۴ھ میں ہوا تھا۔ان دونوں خواتینِ اسلام کو حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کا سامان کرنے کا حکم نبوی ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب تزویج النبی ﷺ عائشة نیز مسلم، مذکورہ بالا؛ صحیح مسلم، کتاب الجنائز و کتاب الرضاع، باب قدر ماتستحقه البکر الخ؛ سیرت عائشہ مذکورہ بالا)

۲- دونوں خواتینِ اسلام نے حضرت فاطمہ زہراءؓ کے مکان کا فرش بطحاء کی وادیوں سے لائی نرم مٹی سے لیپا۔ممکن ہے پورا کمرہ یا مکان لیپا پوتا گیا ہو۔نرم مٹی سے لیپنے کا یہ سماجی اور

تمدنی زاویہ بھی اہم ہے جو تسلسلِ تمدن کا گواہ بھی ہے، کیونکہ دوسرے مکانات کی لیپ پوت کے بارے میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

۳- دونوں ازواجِ مطہرات نے کھجور کی پتیوں کو اپنے ہاتھوں سے دھن کر دو تکیے بنائے اور ان میں پتیوں کو بھر دیا گیا۔ دوسری روایاتِ تمدن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تکیے/تکیوں میں چھال بھری جاتی تھی۔ اس روایت نے مزید وضاحت کی کہ وہ دھنی بھی جاتی تھی تاکہ باریک اور نرم ہو جائے۔ دونوں خواتینِ اسلام کا اپنے ہاتھ سے دھننے اور تکیے بنانے کا گھریلو عملِ پارچہ بافی میں آتا ہے۔

۴- دولہا دولہن کے کھانے بلکہ شبِ عروسی کے کارِ لذت کام و دہن کے لیے دونوں ازواج مطہرات نے تازہ اور خشک کھجوروں کے ساتھ میٹھے پانی کا خاص انتظام کیا۔ یہ بھی شبِ زفاف کی ایک سماجی اور تمدنی روایت تھی جو دوسری شادیوں میں بھی ملتی ہے۔

۵- بیت العروس کے ایک کنارے ایک لکڑی بطور الگنی لگادی تاکہ اس پر کپڑے اور پانی کا مشکیزہ لٹکایا جا سکے۔

۶- یہ سادہ سا حسنِ انتظام عمدہ بلکہ بہترین سامان و نظام رخصتی تھا جو دونوں ازواجِ مطہرات کے انتظام و مشاہدہ پر مبنی تھا۔

۷- ابن ماجہ کی کتاب/ الولیمہ کی دوسری احادیث نیز احادیث صحیحین وغیرہ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج بالخصوص حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت سہل بن سعد ساعدی کی دولہن وغیرہ کی رخصتیوں میں اسی قسم کی سماجی روایات ملتی ہیں۔ بس ان میں اختصار و تفصیل کا فرق ہے، البتہ ماؤں کی کارکردگی سب سے زیادہ نظر آتی ہے جیسے حضرت ام رومانؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی اور حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ کی رخصتی میں سامانِ رخصت تیار کیا تھا اور تقریباتِ رخصتی برپا کی تھیں۔

تقریباتِ شادی میں شرکتِ خواتین واطفال

حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہؓ کی شادیوں اور رخصتیوں میں خواتین کی شرکت کا

ذکر واضح طور سے ملتا ہے کہ بنو النجار کی خواتین، حضرت عائشہؓ کی سہیلیوں اور حضرت فاطمہؓ کی عزیزوں نے شرکت کی تھی اور عام طور سے ان تقریباتِ شادی میں بچوں اور عورتوں کی شرکت ایک سماجی واقعہ اور تمدنی ضابطہ رہا تھا۔ امام بخاریؒ نے اسی بنا پر اس معنی کا ایک خاص عنوان باب باندھا ہے: ذھاب النساء والصبیان الی العرس ۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ابواب میں بھی اس تمدنی اور سماجی روایت کا ذکر ملتا ہے۔

حدیث بخاری: ۵۱۸۰ میں حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے کچھ عورتوں اور بچوں کو کسی شادی سے واپس آتے دیکھا تو باقاعدہ مضبوطی سے قیام فرما ہو گئے اور پھر ان سے فرمایا: اللہ گواہ ہے تم لوگ مجھے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہوا: "... ابصر النبی ﷺ نساء وصبیانا مقبلین من عرس فقام ممتناً فقال: اللھم انتم من احب الناس الیّ"۔ حافظ ابن حجرؒ نے "ممتناً" کی تشریح پر سارا زور خرچ کر دیا ہے اور اصل روایت و باب پر کچھ ارشاد نہیں فرمایا سوائے اس کے عورتوں اور بچوں کا جانا شادی میں بلا کراہت جائز ہے گویا کہ حضرت امامؒ نے اس باب کے ذریعہ اسے مکروہ سمجھنے والوں کی تردید فرمائی ہے۔

(فتح الباری، ۹/ ۳۰۸-۳۰۹)

✪✪✪

باب موسیقی

مواقع: شادی

۱- تقریبِ مسرت ہو یا شادی بیاہ کا موقعہ، انسانی فطرت میں کچھ طرب وانبساط اور لہو ولعب کا جذبہ ابھر ہی آتا ہے۔ لہو ولعب یوں تو ممنوع اور ناپسندیدہ ہی ہے، نہ صرف مذاہب و ادیان بالخصوص اسلامی دین وشریعت میں، کیونکہ وہ یادِ الٰہی سے غافل اور فرائضِ انسانی سے لاپرواہ بناتے ہی، وقت وصلاحیت کا ضیاع الگ ہوتا ہے اور ان میں دلچسپی افراط وزیادتی تک لے جاتی ہے، لیکن لہو ولعب اپنی جائز حدود میں بسا اوقات ضرورت ہو جاتے ہیں کہ وہ مزاجی خشکی اور روحانی کدورت ویبوست دور کرتے ہیں۔ اسی بنا پر امام غزالیؒ نے حد سے زیادہ عبادت اور کام کرنے والوں کے لیے کبھی کبھی لہو ولعب میں دل لگانے کو نشاط کی خاطر ضروری بتایا ہے۔

(غزالی، احیاء علوم الدین)

مسرت وشادمانی کے مواقع پر موسیقی سننے اور گانے بجانے کی بعض بہت صحیح احادیث و روایات ملتی ہیں۔ ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے، نہ ان کے سماجی اور تہذیبی اطلاق سے۔ وہ عہد نبوی میں بھی ملتی ہیں اور بعد کے اسلامی ادوار میں بھی۔ جاہلی عہد میں تو ان کی صدہا مثالیں ہیں اور موسیقی اور گانے بجانے کی ایسی مستحکم روایات ہیں کہ ان کے بغیر کوئی سماجی تقریب منعقد ہوسکتی تھی اور نہ مجلس ومحفل برپا کی جاسکتی تھی۔ مکی عہد میں قبلِ بعثت کی دو روایات کم ازکم رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں آتی ہیں کہ آپ ﷺ نے لڑکپن میں دو مواقع پر مکی قریشی شادیوں میں بجائی جانے والی موسیقی کی آوازیں سن کر شریک ہونا چاہا مگر آپ ﷺ کو بچالیا گیا۔ یہ عصمتِ الٰہی یا حفاظتِ ربانی کی خاص نوعیت تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی قبلِ نبوتِ زندگی کو آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے ایسی بہت سی ''حفاظتیں'' مخصوص مقاصد

کے تحت کی گئی تھیں۔ ان کا ذکر دوسری احادیثِ صحیحہ میں عریاں ہونے وغیرہ کے بارے میں ملتا ہے۔

(شبلی، ۱/ ۱۹۹-۲۰۰ بحوالہ بزار و مستدرک/نسیم الریاض، ۱/ ۶۰۵؛ سیوطی، خصائص کبریٰ، ۱/ ۸۸؛ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب بنیان الکعبة، حدیث: ۳۸۲۹؛ فتح الباری، ۷/ ۱۸۴-۱۸۵)

بعدِ نبوت بھی موسیقی اور گانے بجانے کی اجازت محدود پیمانے پر دی گئی اور شادی بیاہ کے مواقع پر تو بطورِ خاص دی گئی۔ صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے انسانی فطرت کے رجحان اور مواقع کی مصالح کے تحت بنفس نفیس تحریک بھی فرمائی۔ مکہ مکرمہ سے زیادہ غالبًا یثرب و مدینہ والے موسیقی اور غنا کے دلدادہ تھے اور وہ تقاریب اور خصوصی مواقع پر ان کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ اس سے زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان "دلدادوں" کے مذاق کی رعائت فرمائی اور ان کو تقریباتِ شادی میں اس کی اجازت دی۔ کتبِ حدیث کی صحیح احادیث ہوں یا کتبِ سیر و سوانح کی معتبر روایات، ان سب میں رخصت و اجازتِ نبوی کا ذکر و عنصر ضرور ملتا ہے۔

نکاح اور ولیمہ میں موسیقی

- مشہور صحابیہ حضرت ربیع بنت معوذ خزرجیؓ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ میری شبِ زفاف کے دوسرے دن صبح صبح تشریف لائے اور میرے بستر پر اسی طرح بیٹھ گئے جیسے تم (حضرت خالد بن ذکوانؒ راویٔ حدیث) میرے بستر پر میرے پاس بیٹھے ہو۔ اس وقت چھوٹی چھوٹی بچیاں دف بجا بجا کر غزوۂ بدر میں شریک اپنے آباء و اجداد سے متعلق گانے گا رہی تھیں۔ گاتے گاتے ان میں سے ایک بچی نے مصرعہ اٹھایا کہ ہم میں ایک ایسے نبی ہیں جو کل کی بات جانتے ہیں: "وفینا نبیٌّ یعلم ما فی غدٍ" رسولِ اکرم ﷺ فرمایا: یہ مت کہو اور وہ کہو جو تم پہلے کہتی رہی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک غلط مصرعہ کی تو ممانعت فرما دی مگر ان کے گانے بجانے پر کوئی روک نہیں لگائی۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة بدر - بلا عنوان بعد باب شهود الملائكة بدرا؛ نیز ملاحظہ ہو: کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمه؛ فتح الباری، ۹/ ۲۵۳-۲۵۵: حدیث: ۵۱۴۷)

- امام ابن ماجہؒ کی روایت/ حدیثِ سابقہ میں ایک دلچسپ پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ راوی گرامی حضرت خالد المدنی حضرت ربیعؓ بنت معوذؓ کے گھر ایک عاشوراء کے دن گئے تھے تو وہاں لڑکیاں دف بجا بجا کر گانا گا رہی تھیں۔ راوی محترم اپنے اصحاب کے ساتھ ان کے پاس گئے تھے لہٰذا انھوں نے اس گانے بجانے کا ذکر کیا تو صحابیہ موصوفہ نے وہ واقعہ/ حدیث بیان کیا جو اوپر بخاری کے حوالے سے گذرا (ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الغناء والدف؛ حدیث:۱۸۹۶؛ یہ دو واقعات ایک ہی سلسلۂ حدیث میں ابن ماجہ میں بیان ہوئے ہیں)۔ اس حدیثِ بخاری و ابنِ ماجہ وغیرہ سے کم از کم دو مواقعِ مسرت وغناء کا پتہ چلتا ہے: ایک شادی میں گانا بجانا ہوتا تھا، دوسرے عاشوراء کے دن بھی گانا بجانا معمول تھا جیسا کہ حضرت ربیع کے گھر ہو رہا تھا۔ امام بخاریؒ نے شادی کی دو تقریبات میں دف بجانے کی روایت بیان کی ہے۔ ان کے کتاب النکاح کے ترجمۃ الباب کے مطابق نکاح کے وقت بھی گانا بجانا ہوتا تھا اور دوسرے دن/ بعد میں ولیمہ کے دن بھی گانے بجانے کی روایت تھی۔ اسی بنا پر اس میں نکاح اور ولیمہ دونوں مواقع کا ذکر ہے کہ یہ دونوں مواقع مسرت تھے۔ بعض شارحین نے ان کو ایک موقع بنا دیا ہے۔

- شادی بیاہ میں رخصتی کے وقت بھی گانا بجانا اور لہو ولعبِ غنائی کی روایت ساکنانِ مدینہ/ انصار میں خاص کر ملتی تھی۔ ایک حدیثِ بخاریؒ میں آتا ہے کہ ایک خاتونِ مکرم کی ایک انصاری شخص سے شادی کے بعد شبِ زفاف منائی گئی۔ رسولِ اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: عائشہ! تمہارے پاس/ ہاں کوئی لہو نہیں ہے، انصار کو لہو بہت پسند آتا ہے: "انها زفت امراة الى رجل الانصار فقال نبى الله ﷺ: يا عائشة! ما كان معكم لهو، فان الانصار يعجبهم اللهو..." ابن ماجہ کی روایت/ حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی ایک رشتہ دار لڑکی کی شادی کسی انصاری سے کی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے تشریف لا کر حضرت ام المومنین وغیرہ سے دریافت فرمایا: تم لوگوں نے نوجوان بچی کو کچھ ہدیہ دیا۔ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ دریافت فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ کوئی مغنی بھی بھیجا، لوگوں/ حضرت عائشہؓ کے انکار پر آپ ﷺ نے فرمایا: انصار ایک ایسی قوم ہیں جن میں غزل (گانے کا ذوق) ہے۔ کاش تم اس بچی کے ساتھ کسی کو بھیجتے جو گانا گاتا: "... قال: ارسلتم معها من

یغنی؟ ... ان الانصار قوم فیھم غزل. فلو بعثتم معھا من یقول: اتیناکم اتیناکم فحیانا وحیاکم...“

(بخاری، کتاب النکاح، باب النسوۃ اللاتی یھدین المرأۃ الیٰ زوجھا، حدیث: ۵۱۶۲: اس عنوان میں ایک اور سماجی ریت کا ذکر ہے؛ فتح الباری، ۹/ ۲۸۱-۲۸۲ و مابعد؛ اسد الغابہ، ۵/ ۵۱۶ میں صراحت ہے کہ وہ حضرت اسعد بن زرارہ خزرجیؓ کی یتیم بچی حضرت فارعہؓ کی شادی کا واقعہ ہے۔ وہ اپنے مرحوم باپ کی وصیت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کے زیرِ کفالت تھیں اور آپ ﷺ نے ہی ان کی شادی کی تھی)۔

ابن ماجہ، مذکورہ بالا، حدیث: ۱۹۰۰: الزوائد کے مطابق اس کی سند میں اختلاف ہے تاہم بخاری کی روایت سے غناء کا ثبوت پکا ملتا ہے۔

- اسی کے مماثل حضرت ام نبیطؓ کی روایت ہے کہ بنوالنجار کی ایک لڑکی کی رخصتی کے وقت وہ دف بجا بجا کر گا رہی تھیں: ”اتیناکم اتیناکم ...“ فحیونا نحییکم / لولا الذھب الاحمر ما حلت بوادیکم“۔ رسولِ اکرم ﷺ نے گذرتے ہوئے سنا تو دوبارہ سنا اور پھر بنفسِ نفیس ٹکڑا لگایا: لولا الحنطۃ السمراء ما سمن عذاریکم.

(اسد الغابہ، ۵/ ۶۲۳ بحوالہ ابن مندہ و ابو نعیم؛ رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین، باب خواتین کی تزویج نبوی، ۱۲۱-۱۳۹)

- دوسری احادیث و روایات سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس نکاح کے معاملہ کا اعلان کرو اور اس کو مسجد میں کیا کرو اور نکاح کے وقت دف بجایا کرو: ”اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوہ علیہ الدفوف“؛ واضح رہے کہ مسجد میں اعلان کا حکم دیا ہے، نکاح کرنے کا نہیں، کیونکہ نکاح کے وقت دف بجانے کا بھی حکم ہے جو مسجد میں ممکن نہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق حلال نکاح اور ناجائز و حرام رشتہ ازدواج میں فرق دف کی آواز سے ہوتا ہے: ”فصل ما بین الحلال والحرام الدف بالصوت“۔ یہ بہت دلچسپ اور اہم روایت ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دف کی آواز ہی شادی کا اعلان بن جاتی تھی۔

(ترمذی، ابواب النکاح، باب فی اعلان النکاح بروایت حضرت محمد بن حاتم جمحی اور حضرت عائشہؓ بالترتیب)

- ابن ماجہ کی ایک اور روایت/ حدیث حضرت انس بن مالکؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مدینہ منورہ کے کسی محلے سے گذرے تو لڑکیوں کو دف بجاتے اور گاتے ہوئے

سنا۔ وہ گا رہی تھیں کہ ہم بنو النجار کی لڑکیاں ہیں اور محمد ﷺ ہمارے کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں: "ان النبی ﷺ مرّ ببعض المدینة فاذا هو بجوار یضربن بدفهن ویتغنین ویقلن": نحن جوارٍ من بنی النجار - یا حبّذا محمدٌ من جار". فقال النبی ﷺ: الله یعلم انی لاحبکن"۔ اس روایت میں نکاح کا ذکر نہیں ہے محض دف بجانے سے اسے نکاح کا موقع سمجھ لیا گیا اور اسی بنا پر امام موصوف نے اسے کتاب النکاح میں ذکر کیا۔

(ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الغناء والدف؛ الزوائد کے مطابق اس کی اسناد صحیح اور تمام رجال ثقات (معتبر) ہیں)

- نسائی کی ایک صحیح حدیث بہت اہم ہے کہ وہ نہ صرف عہدِ نبوی کی روایت بلکہ صحابہ کرام کی "سنتِ غنا" کو بھی بتاتی ہے۔ حضرت عامر بن سعدؒ کا بیان ہے کہ میں حضرات قرظہ بن کعب خزرجی اور ابو مسعود انصاریؓ کے پاس ایک شادی کے دوران پہونچا تو وہاں لڑکیاں گا رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں نہ صرف رسولِ اکرم ﷺ کے صحابی ہیں بلکہ اہلِ بدر میں سے بھی ہیں اور آپ کے پاس ایسی حرکت ہو رہی ہے۔ انھوں نے فرمایا: اگر چاہو تو بیٹھ کر ہمارے ساتھ سنو اور چاہو تو تشریف لے جاؤ۔ شادی بیاہ کے وقت ہم کو لہو کی اجازت دی گئی ہے: "عن عامر بن سعد قال: دخلت علی قرظة بن کعب وابی مسعود الانصاری فی عرس، واذا جوار یغنین . فقلت: انتما صاحبا رسول الله ﷺ ومن اهل بدر، یفعل هذا عندکم؟ فقال: اجلس ان شئت فاسمع معنا، وان شئت فاذهب، قد رخص لنا فی اللهو عند العرس"۔ ابن اثیر کے مطابق حضرت فریعہ بنت معوذ بن عفراء انصاریؓ نے بھی شادی میں گانے بجانے کی رخصت کا واضح ذکر کیا ہے: "... دخلت علی النبی ﷺ حدیثها فی الرخصة فی الغناء وضرب الدف فی العرس..." (اسد الغابہ، ۵/۵۳۰ بحوالہ ثلاثہ: "اخرجها الثلاثة"؛ نسائی، کتاب النکاح، اللهو والغناء عند العروس) اسد الغابہ: ۱/ ۲۳۵: میں تھوڑا سا فرق ہے، حدیثِ مذکورہ بالا میں صرف دو صحابہ کے نام ہیں مگر ابن اثیر نے تین صحابہ کے نام دیے ہیں اور دو نام مختلف بھی ہیں: حضرت قرظہ بن کعبؓ کے علاوہ حضرت ثابت بن یزید اور

ابوسعید الانصاریؓ بھی موجود تھے۔ موخر الذکر نے اس اختلاف پر بحث کی ہے اور مختلف روایات نقل کی ہیں لیکن اس اختلاف کو دور نہیں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض رواۃِ حدیث کو بعض کے نام ملے اور بعض کو بعض دوسرے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بعض دوسرے صحابہ کرام بھی اس موقعہ پر موجود رہے ہوں کہ وہ ایک اجتماعی سماجی تقریب تھی۔ اور بہر حال اہل خانہ جن کے ہاں یہ تقریب برپا تھی وہ تو موجود ہی تھے (نیز اسد الغابہ، ۴/۲۰۲: خاکہ حضرت قرظہ بن کعب خزرجی)۔ اس میں حضرات ابومسعود، قرظہ بن کعب اور ثابت بن یزید کے اسماء گرامی ہیں۔ اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دو مختلف واقعات ہوں جو مختلف رواۃ نے بیان کیے ہیں۔

- اسد الغابہ کی ایک اور روایت اس سے زیادہ اہم ہے کہ وہ شادی بیاہ کی سماجی تقریبات و رسوم کو زیادہ واضح انداز میں بیان کرتی ہے اگرچہ اس روایت کے راوی حضرت عبدالرحمٰنؓ کا نسب خاصا مجہول ہے۔ تاہم اس روایت کے مشمولات و مضمونات کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک انصاری صحابی کی شادی کے موقعہ پر جاکر اس کی شادی کرائی اور خیر و الفت، نیک فال اور فراوانی رزق و برکت کی دعا دی۔ لوگوں نے نوشاہ کے سر کے اوپر ہی دف بجانے شروع کردیے۔ پھر سینیاں (اطباق) لائے گئے جن میں میوے اور شکر تھی اور ان کو لٹایا گیا لیکن لوگ ہاتھ روکے بیٹھے رہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہیں کیا ہوگیا، تم لوگ چھینا جھپٹی کیوں نہیں کرتے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے لوٹ مار سے کیا نہیں روکا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تم کو لشکروں کو لوٹنے سے منع کیا ہے، شادیوں میں نہیں۔ پھر رسولِ اکرم ﷺ نے جھپٹ کرلیا اور دوسروں نے بھی آپ ﷺ سے چھینا جھپٹی کی۔ حافظ ابن مندہ اور حافظ ابونعیم نے محمد بن اسحاق سے روایت کی ہے:

"...شهد النبي ﷺ املاک رجل من الانصار فزوّجه وقال: على الخير والالفة والطائر الميمون والسعة في الرزق، دففوا على رأسه، فجاء وا بالدف فضرب به، وجاء ت الاطباق عليها فاكهة وسكر فنثرت عليه فكف الناس ايديهم. فقال رسول الله ﷺ: مالكم لا تنتهبون؟ فقالوا: يا رسول الله! الم تنه عن النهبة؟ قال: انما نهيتكم عن نهبة العساكر، فاما العرسات فلا. فجاذ بهم رسول الله وجاذبوه..."

۳/۳۱۹؛ دوسری روایت ابو مسلم کشی نے اس جیسی کی ہے۔ اس روایت میں نکاح و شادی کے وقت میوے اور شکر لٹانے کی ایک اور سماجی روایت کا ذکر کیا گیا ہے۔ آج بھی بعض طبقات و مقامات پر چھوہارے اور شکر لٹانے اور چھین جھپٹ کر کھانے کا معاملہ ہوتا ہے۔

- اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ علی بن ھبّار یا ہبّار بن اسود کے گھر کے قریب سے گذرے تو دف کی آواز سنی۔ آپ ﷺ کے استفسار پر لوگوں نے بتایا کہ صاحبِ خانہ نے شادی کر لی ہے۔ آپ ﷺ نے اسے نکاح قرار دیا، حرام کاری (سفاح) نہیں بتایا کیونکہ وہ بالا علان کیا گیا تھا (اسد الغابہ، ۴/۴۳: روایت میں اختلاف ہے کہ وہ باپ کی شادی تھی یا بیٹے کی۔ حافظ ابو نُعیم نے ہبار بن الاسود کی شادی بتائی ہے اور علی کا نام بتانے والوں کو وہم کا شکار قرار دیا ہے۔ یعنی متن صحیح ہے۔ صرف دولہا کے نام پر اختلاف ہے اور اس کو ہبار کے خاکے میں دور کیا گیا ہے۔

(اسد الغابہ، ۵/۵۴)

تلاش و جستجو سے بعض اور ایسی روایاتِ شادی و موسیقی پیش کی جا سکتی ہیں لیکن استیعاب مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا مطلوب ہے کہ شادی بیاہ کے مختلف مواقع پر- نکاح، رخصتی، ولیمہ وغیرہ پر- موسیقی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور ان میں دف بجانا ہی اصل تھا اور بسا اوقات اس کے ساتھ گانا بھی ہوتا تھا جو بالعموم چھوٹی بچیاں یا خواتین ہی گاتی تھیں۔ ابھی تک کسی روایت میں بھی کسی مرد کے گانے کا ذکر یا حوالہ نہیں مل سکا۔ ممکن ہے کہ مردانہ میں اشعار یا گانے گائے جاتے ہوں، لیکن جب تک کسی شہادت سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے وہ قیاس کے دائرے سے نہیں نکل سکے گا۔

شادی اور موسیقی اور غناء کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور عہدِ نبوی میں رسولِ اکرم ﷺ نے بہر حال اس لہو کی اجازت عطا کی تھی۔ محض اجازت و اذن سے شاید بعض اصحابِ تقویٰ کی تشفی نہ ہوتی لہٰذا رسولِ اکرم ﷺ نے بنفس نفیس ایسی شادیوں میں شرکت فرمائی جن میں دف بجائے گئے، گانا گایا گیا اور وہ گانا بالعموم لڑکیاں گاتی تھیں۔ بالعموم شادی بیاہ میں نوجوان لڑکیاں ہی اس طرب و انبساط کی علمبردار ہوتی ہیں۔ موسیقی و غنا آمیز تقریبات کی تعداد بھی خاصی ہے لہٰذا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دو چار روایات کی بنا پر اس سماجی طربیہ تقریب کا زور شور سے ذکر کیا جا رہا ہے۔ پھر بعض کمزور و ضعیف روایات کے علاوہ متعدد صحیح احادیث اور معتبر روایات سے شادیوں میں

موسیقی اور غنا کا جواز اور معمولِ زمانہ ثابت ہوتا ہے۔ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد کے شریک اور لطف اندوز ہونے کے واقعات برابر ملتے ہیں اور ان میں بدری جیسے صحابہ اور فضلائے عہد شامل تھے۔ ان احادیث وروایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی کے بعد صحابہ وصحابیات کے زمانے میں بھی موسیقی اور غنا شادی کی تقریبات کا ایک اہم جزو رہے۔ اسی کے ساتھ تقویٰ و طہارت کے رجحان خاص کا بھی علم ہوتا ہے کہ مختلف اکابر صحابہ اور اکابر تابعین کو موسیقی اور غناء کے بارے میں حیرت واستعجاب ہوا اور صحابہ کرام کے سننے پر ان کو اعتراض بھی ہوا۔ یہ وہی رجحان ومزاج ہے جو عہدِ نبوی میں شدت پسندی اختیار کر گیا تھا اور بعد میں تشدد مزاجی بن گیا کیونکہ ان اہلِ طہارت نے انقلابِ احوال کا فرق نہیں کیا۔ حکمتِ نبوی میں اس کی ہمیشہ رعایت ملتی ہے اور شادی بیاہ کے مواقع طرب وطربیہ کا تقاضا کرتے ہیں۔

بیاہ وشادی کے مختلف مراحل نشاط وانبساط ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں موسیقی، غناء، طرب اور ضیافت کا ذکر ملتا ہے:

- اول مرحلہ نکاح کا ہوتا ہے۔ بخاری وغیرہ کے تراجمِ ابواب سے بھی اور احادیث سے بھی اس مرحلہ میں موسیقی وغنا کا ذکر ملتا ہے۔

- دوسرا مرحلہ دولہن کی رخصتی کا ہے، اگرچہ وہ دولہن والوں کے لیے ایک مرحلہ غمناک ہے جس میں طرب وخوشی کا عنصر شامل رہتا ہے۔ تاہم اس موقعہ پر بھی گانا بجانا ایک معمول عہد نبوی تھا اور بابل کی روایت غالباً تمام انسانی تمدنوں میں اسی طرح پائی جاتی ہے۔ دولہن کے گھر کے علاوہ دولہا کے گھر میں برات واپس آنے کے بعد طرب ونشاط کا ایک اظہار موسیقی اور غنا کی شکل میں ہوتا تھا۔

- تیسرا مرحلہ ولیمہ کا ہوتا ہے جب شبِ زفاف کے بعد دولہا یا اس کے ولی دعوت طعام دیتے اور تقریب مسرت برپا کرتے ہیں۔ اس مرحلہ پر بھی موسیقی، غنا، طرب وتہنیت اور ضیافت وسرخوشی کا معقول ماحول اور طرب انگیز اہتمام کیا جاتا ہے۔

عہد نبوی میں ان تینوں مراحلِ شادی میں موسیقی اور غنا کا دوسری رسوم کے علاوہ پکا ثبوت ملتا ہے۔

عیدین میں طرب وموسیقی

۲- عیدین میں گانا بجانا بھی عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ کا معمول، سنت اور رواج تھا اور اسے دینی، مذہبی اور سماجی تحفظ پورا پورا حاصل تھا۔ بخاری، فتح الباری اور دوسری کتبِ حدیث وسیرت وغیرہ سے اس کے بارے میں مختلف شواہد پہلے ہی آچکے ہیں۔ جن کا ذکر دوبارہ تکمیل بحث کے لیے ذیل میں مختصر طور سے کیا جارہا ہے:

- حدیث بخاری: ۹۴۹ اور حدیث: ۹۵۲ اور ان کے اطراف میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن حضرت عائشہؓ کے گھر میں دو بچیاں گانا گارہی تھیں: "جاریتان تغنیان"۔ رسولِ اکرم ﷺ نے نہ صرف اس کو سنا بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بچیوں کو ڈانٹنے اور گانا بند کرنے سے منع فرمایا کہ وہ خوشی اور مسرت اور عید کا دن تھا۔

- صحابہ کرام میں متعدد نے ایام العید میں اس غنائی لہو کی اجازت نبوی سے استفادہ فرما کر غنا سے لطف اندوز ہونا پسند کیا اور دوسروں کو بھی شریک کیا اور اہل اتقاء کے اعتراض کو مسترد فرمادیا۔

عاشوراء میں موسیقی

۳- عاشوراء بھی ایک یومِ عید بن گیا تھا۔ اصلاً تو وہ ایک مذہبی اور دینی شعار یا سنت ہے اور عہدِ نبوی میں بھی تھا کہ اس دن روزہ رکھا جاتا تھا۔ غالباً یہودی تمدن کے تحت وہ مسلمان عربوں میں بھی ایک عید کا دن بن گیا۔ روایات واحادیث گذر چکی ہیں کہ یہودِ مدینہ وخیبر اس کو ایک قومی تیوہار اور تمدنی عید کے طور پر مناتے تھے۔ اس دن نئے لباس زیبِ تن کرتے، عورتوں اور لڑکیوں کو زیورات پہناتے اور سب آرائش وزیبائش کرتے اور پھر میلے اور عید کی طرح اسے مناتے تھے۔ اس جشنِ طرب میں موسیقی، غنا، ضیافت، کھیل کود اور متعدد دوسری چیزیں شامل ہوتی تھیں کہ وہ ان کا لازمۂ طرب تھیں۔ غالباً وہ یہودِ عرب تک محدود نہیں تھا بلکہ عراق وشام کے یہودی طبقات بھی عاشوراء کو ایک یومِ عید سمجھ کر مناتے تھے۔

عہد نبوی کے مسلمانوں بالخصوص باشندگان مدینہ منورہ میں عاشوراء کی عیدان ہی یہودی اثرات کے تحت آئی تھی۔ حضرت ربیع بنت معوذؓ جیسی اہم اور بزرگ صحابیہ کے گھر میں عہدِ نبوی کے بعد عاشوراء کا جشن برپا ہوا تھا جس میں گانا بجانا بھی شامل تھا۔ اور یہ صرف ایک تنہا واقعہ نہیں ہے بلکہ روایات کا دروبست بتاتا ہے کہ وہ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ کرام کا ایک تیوہار بن گیا تھا۔ ایسے تمدنی لین دین اور تہذیبی اثر و تاثیر کی حقیقت سے کسی زمانے میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانی کلی تہذیب و تمدن کے ارتقاء، وسعت اور اثر اندازی کا ایک بین ثبوت ہیں۔ سماجی روایات کی نسل در نسل منتقلی اور تمدنی اقدار و رسوم کی ہمہ گیر تاثیر و نفوذ نے ہی انسانی تمدن کے عظیم ترین اور وسیع ترین جہات کو جنم دیا اور پروان چڑھایا تھا۔ جن افراد و طبقات نے اس تمدنی اور ثقافتی لین دین اور باہمی نفوذ کو نہیں سمجھا وہ کسی زمانے میں بھی تمدن کی حرکیت اور سماج کی ارتقائی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ پندارِ تقویٰ جمودِ فکر پیدا کرتا ہے۔

استقبالیہ موسیقی

۴۔ استقبال و خیر مقدم کے مواقع بھی کافی طرب انگیز ہوتے ہیں اور ان مواقع پر بھی طرب و مسرت کا اظہار فطری طور سے ہوتا ہے۔ عہدِ نبوی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں اور بعد کے خیر القرون میں بھی اس کے شواہد کی کمی نہیں ہے۔ ان مواقع پر بھی موسیقی اور غنا کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ وہ بلاشبہ خاص نوعیت کی طربیہ موسیقی کے تقریبات اور تیوہار تھے۔ ان میں چند کا مختصراً حوالہ دیا جا رہا ہے:

- رسولِ اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو شہری میزبانوں نے شہر سے نکل کر آپ ﷺ کا خیر مقدم کیا۔ شبلی نعمانی کے بقول: ''آپؐ کے ننہالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے، قباء سے مدینہ تک دو رویہ جاں نثاروں کی صفیں تھیں...'' اور لڑکیوں نے خیر مقدمی گیت گایا۔ حدیث بخاری: ۳۹۲۵ کے مطابق شہر والوں کو آپ ﷺ کی آمد سے بے اندازہ خوشی ہوئی حتی کہ لڑکیاں کہنے لگیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے:...: ''ثم قدم النبی ﷺ، فما رأیت اہل المدینۃ فرحوا بشیء فرحھم برسول اللہ ﷺ، حتی جعل الاماء یقلن :

قدم رسول اللہ ﷺ ...''۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کی تشریح میں مختلف روایات کی بنا پر لکھا ہے کہ لوگ راستوں میں اور گھروں کی چھتوں پر نکل آئے۔ ان میں بچے بھی تھے اور خدم بھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے: ''محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اللہ اکبر...'' اور حضرت انسؓ کی روایت حاکم نقل کی ہے کہ بنو النجار کی لڑکیاں دف بجاتی اور گاتی ہوئی نکلیں۔ ان کے بول یہ تھے:

نحن جوار من بنی النجار　　　　یا حبذا محمد من جار

اور ابو سعید کی شرف المصطفیٰ سے ایک منقطع روایت بھی نقل کی ہے جس کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ جب مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو بچیاں گا رہی تھیں:

طلع البدر علینا　　من ثنیۃ الوداع　　وجب الشکر علینا　　ما دعا للہ داع

بقول امام عسقلانیؒ اس کی سند معضل ہے۔ غالباً یہ گیت رسولِ اکرم ﷺ کی غزوۂ تبوک سے واپسی پر گایا گیا تھا۔ شبلی جیسے بعض محققین نے بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ وہ دونوں مواقع۔ ہجرت اور غزوۂ تبوک سے واپسی- پر گایا گیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ ایسے دو ہی مواقع نہ تھے۔

(فتح الباری، ۷/۳۲۴-۳۲۷؛ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ؛ شبلی نعمانی، ۱/ ۲۷۸۔ ''جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں... معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں ...'' (مولانا کاندھلوی کے نقل کردہ اشعار) ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، ۱/ ۱۰۶: ''...جوش کا یہ عالم تھا کہ خواتین جمالِ نبوی کے دیکھنے کے لیے چھتوں پر چڑھی ہوئی تھیں اور یہ شعر گاتی تھیں:

طلع البدر علینا　　　من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا　　　ما دعا للہ داع
ایها المبعوث فینا　　　جئت بالامر المطاع

اور بنی النجار کی لڑکیاں یہ شعر گاتی تھیں:

نحن جوار بنی النجار　　　یا حبذا محمد بن جار)

غزوات سے واپسی پر استقبال

تقریباً تمام تمدنوں میں یہ فطری روایت پائی جاتی ہے کہ جنگوں، مہموں اور طویل سفروں

کے بعد واپسی پر اکابر کا بالخصوص اور دوسرے چہیتوں کا بالعموم استقبال و خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ طویل اسفار میں طویل مدتِ غیر حاضری کے سبب اشتیاقِ فراواں ہوتا ہے۔ مہمات و غزوات کے بعد تو جان کی سلامتی اور حفاظت پر جذباتِ تشکر کلماتِ خیر مقدم اور حرکاتِ استقبال میں ڈھل جاتے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کے بعض غزوات سے واپسی پر شہر نبوی کے لوگوں نے بڑا والہانہ استقبال کیا تھا اور خیر مقدمی گیت گائے تھے۔ ان میں غزوۂ تبوک سے واپسی پر استقبالیہ گیت کے ایک شعر کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ متعدد سیرت نگاروں نے وہی واقعۂ استقبال اور اشعارِ خیر مقدم لکھے ہیں۔ مولانا کاندھلویؒ کی عبارت بھی یکساں نوعیت کی ہے۔ غالباً وہ مولانا شبلی نعمانی کے پیرایہ بیان سے ماخوذ ہے:

''تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالمِ شوق میں استقبال کو نکلے یہاں تک پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی تھیں:

طلع البدر علینا　　　من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا　　　ما دعا للہ داع

(شبلی، ۱/ ۵٦۷ بحوالہ زرقانی، ۳/ ۹۲''س'')

''جب آپ مدینہ کے قریب پہنچے تو مشتاقانِ جمالِ نبوی ماہتابِ نبوت و رسالت کے استقبال کے لیے نکلے یہاں تک کہ غلبۂ شوق میں پردہ نشینانِ حرم بھی نکل پڑیں۔ لڑکیاں اور بچے یہ اشعار گاتے تھے...(کاندھلوی، ۳/ ۹۵ تین شعر سابقہ بلا حوالہ)

ہجرتِ نبوی اور غزوۂ تبوک سے واپسی دو خاص مواقع مسرت تھے: پہلا نادر الوجود تھا اور دوسرا طویل غیبت کا۔ قیاس کہتا ہے کہ روایات و احادیث میں ان دونوں خاص مواقعِ عقیدت و محبت پر استقبال اور خیر مقدمی موسیقی کا ذکر بطور خاص ہوا ورنہ تمام اہم غزوات و سرایا اور دوسرے طویل اسفار کے بعد واپسی پر رسولِ اکرم ﷺ کا استقبال اور صحابہ کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ ان تمام مواقع پر دوسرے خیر مقدمی کاموں کے علاوہ موسیقی، غنا اور گانے کا انفرادی یا اجتماعی اہتمام کیا جاتا تھا جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

غزوات سے واپسی پر استقبال و خیر مقدم کا ایک اور بڑا البیلا، جانفزا اور دلربا انداز ملتا ہے اور وہ بھی خواتین کی جانب سے۔

- بعض کتبِ حدیث و سیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ساکنانِ مدینہ اور عاشقانِ رسولِ اکرم ﷺ سالم و غانم واپسی پر نذریں بھی مان لیا کرتے تھے۔ ان نذروں میں سب سے دلچسپ موسیقی اور گانے بجانے سے متعلق تھی، غالباً اس کی وجہ خیر مقدمی جہتِ موسیقی تھی۔ حضرت بُریدہؓ کی روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنے کسی غزوے سے واپس تشریف لائے تو ایک لڑکی نے آکر خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صحیح سالم واپس بھیجا تو میں آپ ﷺ کے سامنے دف بجاؤں گی اور گاؤں گی۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اگر تم نے نذر مانی تھی تو بجاؤ ورنہ نہیں۔ لہٰذا وہ بجانے لگی۔ اسی دوران حضرت ابوبکرؓ آئے تو وہ بجاتی رہی، پھر حضرت علیؓ آئے اور وہ بجاتی ہی رہی، پھر حضرت عثمانؓ داخل ہوئے تو بھی بجاتی رہی پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے تو اس نے دف اپنے سرین کے نیچے رکھ لیا اور اس پر بیٹھ گئی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: بیشک شیطان تم سے اے عمر بہت خوف کھاتا ہے، پھر آپ ﷺ نے اس کے چاروں یاروں کے سامنے بجانے نہ بجانے کا ذکر اسی ترتیب سے فرمایا...''

(ترمذی، ابواب المناقب، مناقب عمرؓ؛ اسد الغابہ، ۴/۶۴؛ ابوداؤد، کتاب الأیمان والنذور، باب مایؤمر به الوفاء بالنذر حدیث: ۳۳۱۲: اسی نوعیت کی حدیث ہے لیکن اس میں حضرات اربعہ کا ذکر خیر نہیں ہے، صرف ایک عورت کے نذر ماننے کا ذکر ہے اور یہ نذر دو چیزوں کی مانی گئی تھی: ایک آپ ﷺ کے سامنے دف بجانے کی: "انی نذرت ان اضرب علیٰ راسک بالدف..." اور دوسرے ایک خاص جگہ قربانی کرنے کی۔ آپ ﷺ نے دونوں "نـــذور" پوری کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا اس نے دف بجایا۔ اول حدیث میں لفظ "جاریہ" ہے اور دوسری میں "امرأۃ"۔ بظاہر دو مختلف نذریں اور دو الگ الگ واقعے معلوم ہوتے ہیں)

اس کا پکا امکان ہے کہ دوسرے غزوات سے واپسی پر اسی طرح مدینہ منورہ میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے ہوں۔ بہر حال امکان سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ کے تشریف لانے پر گاتی بجاتی خاتون کا خاموش ہونا اور رسولِ اکرم ﷺ کا منقبت عمر فاروقؓ میں ارشاد فرمانا ایک واقعہ اور اس کا نتیجہ ضرور ہے مگر وہ گانے بجانے کو شیطانی چرخہ نہیں ثابت کرتا۔ وہ اصلاً

حضرت عمر فاروقؓ کی صلابت ظاہر کرتا ہے۔ معاذ اللہ حضور نبوی اور مجلس خلفاء ثلاثہ میں گانا بجانا ہوتا رہے اور اسے شیطانی چرخہ سمجھا جائے، یہ خیالِ باطل اور غلط تعبیرِ حدیث ہے۔

حدی خوانی

غزوات وسرایائے نبوی ہوں یا عام عرب مہمات، دورانِ سفر رجزیہ اشعار گانے کی بڑی قدیم روایت رہی تھی۔ بالعموم دورانِ سفر مسافت کی کدورت دور کرنے اور مراحلِ سفر آسان بنانے کی خاطر شاعر حضرات یہ فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ احادیث میں بعض اسفار وغزوات میں ایسے اشعار/ رجز گانے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ غزوۂ خیبر کے دوران حضرت سلمہ بن عمرو بن اکوعؓ کے اشعار گانے کا ذکر بہت نمائندہ مثال ہے۔ کسی شخص نے حضرتِ موصوف سے رات کے سفر کے دوران فرمائش کی کہ اپنے اشعار (ھنیھاتک) میں سے کچھ گا کر سنائیں۔ لہٰذا وہ حدی خواں ہوئے اور یہ اشعار گا کر سنانے لگے:

اللھم لولا انت ما اھتدینا ... ولا تصدقنا ولا صلینا

فاغفر فداء لک ما ابقینا ... وثبت الاقدام ان لاقینا

والقین سیکنة علینا ... انا اذا صیح ما اتینا

وبالصیاح عوّلوا علینا

رسولِ اکرم ﷺ نے اس حدی خواں (السائق) کے بارے میں دریافت فرمایا اور ان کا نام معلوم ہونے پر ان کے لیے دعا فرمائی۔ اس حدیث میں لفظ "ہُنَیہات" بہت دلچسپ ہے: اس میں مبارکباری، مسرت، لطف اندوزی کے علاوہ خالص گیت/ گیتوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر؛ فتح الباری، ۷/ ۵۷۸-۵۸۳؛ ابن ہشام، ۲/ ۳۲۸-۳۲۹؛ حدیث بخاری: ۵۱۹۶ وغیرہ۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرحلہ پر رسولِ اکرم ﷺ نے بنفس نفیس حضرت سلمہ بن اکوع کے چچا عامر بن الاکوع سے رجز پڑھنے کو فرمایا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ھنیھات کو ھنیھة کی جمع اور اس کو ھنة کی تصغیر بتایا ہے اور دوسرا لفظ "ھنات"/ ھنة بھی ایک روایت میں نقل کیا ہے)

۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کی حدی خوانی کا ذکر بعض دوسرے اسفار وغزوات کے حوالے سے آتا ہے۔ اسد الغابہ، اصابہ اور دوسرے مآخذ تراجم وسوانح میں ان کا حوالہ ملتا ہے۔ عام طور

سے وہ غزواتِ نبوی کے حدی خواں سمجھے جاتے ہیں اور ان کے چچا حضرت عامر بھی۔

- اسی طرح بعض دوسری مثالیں بھی حدی خوانی کی ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض کے حدی خواں اتنے بلند آہنگ اور سحر انگیز آواز کے مالک تھے کہ اونٹ اونٹنیاں اپنے قدموں پر قابو نہیں رکھ پاتی تھیں اور حدی خوانی کی لے کے تیز ہونے کے ساتھ ان کی رفتار بڑھتی ہی جاتی تھی۔ بخاری کی حدیث میں حضرت انجشہؓ کی ایک سفر کے دوران حدی خوانی پر رسولِ اکرم ﷺ کی تنبیہ ملتی ہے کہ آبگینوں کا خیال رکھو اور تیز لے میں نہ حدی خوانی کرو: "ویحک یا انجشة! سوقک بالقواریر .." حدیث بخاری: ۶۲۰۲- حدیث بخاری: ۶۲۰۹: ارفق یا انجشة- ویحک بالقواریر"۔ حضرت رباح بن المعترفؓ کے سوانحی خاکے میں ان کی حدی خوانی سے زیادہ دورانِ سفر قطع مسافت میں اس کی کارفرمائی سے زیادہ بحث ملتی ہے۔

(بخاری، حدیث: ۶۲۰۲؛ کتاب الادب، باب من دعا صاحبه الخ؛ فتح الباری، ۱۰/۱۲۷ومابعد؛ نیز بلاذری، ۱/۴۸۲-۴۸۳؛ اسد الغابہ، ۲/۲۶۲؛ اصابہ: ۲۶۱- عام طور سے ان کا ذکر حدی خوانی حجۃ الوداع کے موقعہ کے حوالے سے آتا ہے۔ وہ عام اور مستقل ہدی خوان نبوی تھے۔"... وانجشة غلام النبی ﷺ یسوق بھن، فقال النبی ﷺ: یا انجش، رویدک سوقک بالقواریر"۔ بخاری کی احادیث میں فرمانِ نبوی کی مختلف تعبیرات ملتی ہیں۔ حدیث مذکورہ بالا کے علاوہ حدیث: ۶۲۱۱ میں ہے: رویدک یا انجشة: لاتکسر القواریر؛ فتح الباری، ۱۰/ ۲۷ومابعد، کتاب الادب؛ باب المعاریض الخ)

دیگر حدی خوان عہد

صحابہ کرام کے تراجم وسوانح کی کتب اور شعر وشعراء پر بیاضوں میں متعدد شعراء نبوی کے علاوہ حدیث خوان اور رجز خوان ملتے ہیں اور ان کی اور ان کی حدی خوانی کے بعض واقعات بھی۔ شعراء رسول ﷺ کی بعض کتابیں بھی جدید دور میں تالیف کی جا چکی ہیں اور ان میں بھی ان قدیم روایات سے استفادہ کر کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ابن اثیر کی اسد الغابہ اور ابن حجر کی الاصابہ میں ان حدی خوانوں، رجز خوانوں اور شعر خوانوں کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ ان کے تجزیہ سے ایک مختصر دلچسپ صورت حال ابھرتی ہے جو درج ذیل ہے:

- حضرت انجشہؓ کی شخصیت اور حدی خوانی کے علاوہ حضرت اسلم حبشی، جو سیاہ فام تھے،

دوسرے حدی خوانِ نبوی تھے۔ان کے بیان وتذکرہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے دو حدی خوان تھے۔ اور اس سے اہم تر بات یہ کہ وہ دونوں خواتین کے اونٹوں اور اونٹنیوں کے لیے حدی خوانی کیا کرتے تھے۔ (اسد الغابہ، ۱/ ۷۵-۷۶؛ ۱۲۱ و مابعد؛ اصابہ: ۱۲۹) لیکن ان کے بارے میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے ایک مولیٰ حضرت رافعؓ کے رفیق حدی خوان تھے۔اس لحاظ سے تین تین حدی خوانِ نبوی برائے خواتین مل جاتے ہیں۔ وہ قبیلہ اسلم کے غلام رہے تھے اور مشہور حدی خواں تھے۔

(اسد الغابہ، ۱/......؛ اصابہ: ۲۵۵۸ بطور خاص حضرت رافعؓ کے لیے اور ان کا ذکر حضرت اسلمؓ کے ساتھ بھی آیا ہے)

قافلۂ نبوی میں بہت سے صحابہ کرام اور مرد حضرات بھی شرکت کی سعادت سے بہرہ مند ہوتے تھے لہٰذا ان کے لیے ایک خاص حدی خوان تھے جن کا نام البراء بن مالکؓ تھا۔ وہ انصاری صحابی اور مشہور شخصیت تھے۔ان کے بارے میں ابن اثیر اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ خوبصورت آواز کے مالک تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کے لیے حدی خوانی کیا کرتے تھے۔

(ابن اثیر، اسد الغابہ، ۱/ ۱۲۱، ۱۷۳؛ اصابہ: ۶۲۰)

رجزیہ موسیقی

حدی خوانی میں غالباً رجز کا اتنا عنصر نہیں تھا جتنا دورانِ جنگ وجدال خالص رجزیہ موسیقی اور رجزیہ شعر خوانی میں پایا جاتا تھا۔ ہمت افزائی، حوصلہ افزونی اور ولولہ وجوش انگیزی کی خاطر عرب غازی ہمیشہ اپنی خواتین کو بھی ساتھ لے جاتے تھے جو رجز خوانی کرتی تھیں۔ بالعموم یہ خواتین اشرافِ خاندان کی بڑی مدمغ اور عظیم وکبیر مستورات ہوتی تھیں۔ان کی رجز خوانی میں خاندانی لہجے کا طمطراق بھی ہوتا تھا۔ان کے علاوہ دوسری عام رجز خواں عورتیں بھی ہوتی تھیں جو بالعموم پیشہ ور گانے والیاں (قینات) ہوتی تھیں اور اپنے فن کی ماہر ہوتی تھیں۔ وہ اپنے فنی تبحر اور نفسیات شناسی سے اشعار اور آلاتِ موسیقی میں آگ بھر دیتی تھیں۔ متعدد غزوات میں ان کا حوالہ ملتا ہے:

- غزوۂ بدر میں قریش اپنے ساتھ پیشہ ور گانے والیاں لائے تھے۔ان میں سے تین کا

ذکر بطور خاص ملتا ہے: سارہ مولاۃ عمرو بن ہاشم بن مطلب، غزۃ مولاۃ اسود بن مطلب، اور ایک گمنام مولاۃ امیہ بن خلف، جو ہر مرحلے پر گاتی تھیں: اخرجت قریش معها القيان بالدفوف ... فجعلن يتغنين في كل منهل..." واضح رہے کہ مولاۃ عمرو بن ہاشم سارہ وہی تھی جس کی خدمات حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے فتح مکہ کے موقعہ پر خط لے جانے کے لیے حاصل کی تھیں۔ (بلاذری، ۱/۲۹۰)

- غزوۂ احد میں خواتینِ قریش نے اپنے رجزیہ اشعار و موسیقی سے جنگ کے شعلے بھڑکانے میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان خواتین میں سے متعدد کے نام کتبِ حدیث و سیرت میں ملتے ہیں لیکن خاص رجحان کے مالک سیرت نگاروں نے آتش زنی کا سارا الزام ہند بنت عتبہ کو دے دیا ہے۔ بہر حال ان خواتین نے مردانہ صفوں کے پیچھے دف بجا بجا کر انتہائی جوشیلے اشعار گانے شروع کر دیے تھے۔ ان میں چند کو نقل بھی کیا گیا ہے:

ان تقبلوا نعانق ونفرش النمارق

او تدبروا نفارق فراق غير وامق

(ابن ہشام، ۲/ ۶۷-۶۸؛ شبلی، ۱/ ۳۷۰-۳۷۱؛ کاندھلوی، ۲/ ۱۸۶ ومابعد؛ اور متعدد دیگر کتب سیرت و حدیث؛ بلاذری، ۱/ ۱۳۰-۳۱۲-۳۱۵ نیز ۳۶۰-۳۶۱ برائے سارہ صاحبہ کتاب حاطب بن ابی بلتعہؓ)

- غزوۂ بنو النضیر ۳/ ۶۲۵ کے متعلق ایک دلچسپ روایت یہ ملتی ہے کہ بنو النضیر کے یہودی قبیلے کو جب مدینہ منورہ سے جلا وطن کر دیا گیا اور وہ اپنی عورتوں لڑکوں اور اموال کے ساتھ سواریوں پر بیٹھ گئے تو وہ اپنے اپنے دف اور آلات موسیقی (الدفوف والمزامير) بجانے لگے اور گانے والیاں ان کے پیچھے پیچھے گاتی جا رہی تھیں: "... معهم الدفوف والمزامير والقيان يعزفن خلفهم ..." (ابن ہشام، ۲/ ۱۹۲؛ قیان جمع قینہ گانے والیاں/ مغنیات؛ نیز دیگر کتب سیرت و حدیث)

عام مجالسِ غناء

عرب سماجی روایت کے بطور گانا بجانا عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس کا ایک سبب ان کی جاہلی شاعری بھی تھی۔ انسانی فطرت مسرت کشید کرنے کی اس کے پیچھے کارفرمائی کرتی تھی۔ اسی

لیے ان کے ہاں عام مغنی اور موسیقاروں کے علاوہ خاص پیشہ ور مغنی اور موسیقار طبقات کا وجود ہوا تھا۔ ان میں عورتوں کا پیشہ ور طبقہ خاصا اہم تھا اور وہ مغنیات (قینات) کہلاتی تھیں۔ عورت کا گانا مرد کی دلبستگی کی ایک شاندار اور دلآ ویز روایت رہی ہے اور وہ مرد کے گانے کے مقابلے میں زیادہ کشش انگیز اور زیادہ طرب ناک تھا۔ اسی بنا پر خاص افراد اور اکابر اپنی اپنی مغنیات رکھتے تھے۔ وہ ان کی باندیاں بھی ہوتی تھیں اور آزاد پیشہ ور ملازم گانے والیاں بھی۔ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن میں پیشۂ غنا وموسیقی کو اچھا نہیں سمجھا گیا اور اس کے اپنانے کی ممانعت کی روایات بھی ملتی ہیں بایں ہمہ پیشہ ور گانے والے مردوں اور گانے والی خواتین کے طبقات وافراد بھی ملتے ہیں اور اسلامی تمدن کے ابتدائی دور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں عہدِ نبوی کے مکی اور مدنی دونوں ادوار شامل ہیں کیونکہ اس طربیۂ غنا اور موسیقی کی مثالوں کا تعلق دونوں زمانوں سے ملتا ہے۔ اسلامی شخصیات کے علاوہ غیر مسلم افراد وطبقات میں ان ''قیناتِ خاصہ'' کا رواج پایا جاتا تھا اور اسی مشترکہ عرب سماجی روایت نے مسلم سماج کو بھی متاثر کیا تھا۔ اسلامی حکمت اور قانونی لچک نے بعض خاص قیود وشرائط کے ساتھ ان کو برداشت بھی کیا تھا۔

- اگرچہ بعد کے زمانے کا واقعہ ہے تاہم وہ اپنی شہرت عام کے سبب بہت زیادہ اسلامی اہل قلم میں بار پاتا ہے۔ عبداللہ بن خطل تیمی اسلام اور رسولِ اکرم ﷺ کے سب سے بڑے دشمنوں میں شمار ہوتا ہے جس نے آخر وقت تک دشمنی جاری رکھی۔ اپنی اسی عداوتِ دیرینہ کے سبب اس نے دو گانے والیاں (قینتان) پال رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام ''فرتنیٰ'' تھا اور دوسری کا ارنب یا قریبہ۔ وہ دونوں رسولِ اکرم ﷺ کی ہجو میں گانے پر اور ان کے ذریعہ نفرت ودشمنی پھیلانے پر مامور تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فتحِ مکہ کے موقعہ پر جب ابن خطل کی عداوت وشقاوت کے سبب اس کے قتل کا حکم دیا تھا تو ان دونوں گانے والیوں کو بھی مار دینے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے ایک تو دشمنِ اسلام کے ساتھ ماری گئی اور دوسری فرار ہوگئی اور کچھ دنوں بعد حاضرِ خدمت ہوئی اور امن وعفو سے سرفراز ہوئی۔

(ابن ہشام، ۲/۴۱۰-۴۱۱؛ بلاذری، ۱/۳۶۰-۳۶۱ کے مطابق ''فرتنا'' اسلام لے آئی تھیں اور ارنب یا قریبہ نامی مقتول ہوئی تھی۔ فرتنی کا ذکر اصابہ اور اسد الغابہ میں نہیں ہے۔ البتہ واقدی نے فرتنا اور ارنب دونوں کے پیشہ ور

مغنیہ ہونے کا ذکر کیا ہے؛ کتاب المغازی، ۸۶۰؛ فرتنی کے دو املا مصادر میں ملتے ہیں)

کافرہ قینات اور گانے والیوں کا مطالعہ ایک تحقیقی دفتر کا طالب ہے لیکن وہ ہمارے بحث ومباحثہ کا موضوع نہیں ہے۔ ان کے بارے میں مختصراً صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر صاحبِ ذوق واستطاعت عرب کی پروردہ مغنیات ہوتی تھیں جو ان کی ملازم ہوتی تھیں یا بازار سے پیشہ ور گانے والیوں کی خدمات حسب ضرورت حاصل کر لی جاتی تھیں۔ کتب سیر وسوانح میں ان کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ جیسے عمرو بن ہاشم کی ایک مولاۃ سارہ مغنیہ بھی تھی اور مکہ کی نوحہ خواں (نواحہ) بھی۔ شاہِ دومہ اکیدر بن عبدالملک کندی کی بھی ایک گانے والی (قینۃ) تھی اور ابوداؤد میں ہے کہ مقیس نامی سردارِ مکہ کی دو گانے والیاں (قینتان) تھیں۔ ان میں سے ایک مقتول ہوئی اور دوسری مسلم بنی۔ ابن خطل جیسا قصہ ہے۔

(ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی قتل الاسیر؛ حدیث: ۲۶۸۴؛ غزوۂ بدر میں قریش کے تین اکابر عمرو بن ہاشم بن مطلب کی باندی سارہ اور اسود بن مطلب کی باندی عزہ، اور امیہ بن خلف کی باندی نے ہر مرحلۂ سفر پر گانے بجانے کی مجلسیں برپا کی تھیں: بلاذری، ۱/۲۹۰ غزوۂ احد میں دفوف بجانے والیاں خواتینِ مکہ تھیں، بلاذری، ۱/۳۱۳-۳۱۵؛ واقدی، ۸۶۰، ۱۰۲۵)

اصل موضوعِ بحث عہد نبوی میں مسلم افراد وطبقات کی موسیقی سے دلچسپی اور گانے والیوں کی سرپرستی سے ہے۔ ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

- حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہؓ سے شادی کے موقع پر ایک دلچسپ نزاعی صورت پیدا ہوئی جو خاصی موسیقی آمیز تھی۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت حمزہؓ نے حضرت علیؓ کی غزوۂ بدر میں بطور غنیمت ملی ہوئی اونٹنی یا دو اونٹنیوں کو ذبح کر دیا اور دعوتِ احباب کر دی۔ صاحبِ مال بھتیجے نے رسولِ اکرم ﷺ سے آکر شکایت کی تو آپ ﷺ اس گھر میں پہونچے جہاں حضرت حمزہؓ اپنے بعض انصاری احباب کے ساتھ مجلسِ شراب وکباب میں گانا سن رہے تھے۔ ان کے پاس ایک گانے والی (قینۃ) تھی جو اپنے گانے میں گا رہی تھی: "ألا یا حمز للشرف النواء"۔ بعض دوسری روایات میں اور بھی اشعار کے گائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اربابِ مجلس نشہ میں اتنے مخمور تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بھی ان کو ہوش وخرد میں نہ لاسکی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً واپس ہو گئے۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ یہ واقعہ شراب خوری کے نفاذ حرمت

کے قانون سے پہلے کا ہے۔ شراب کی تحریم اور چیز ہے اور نفاذ تحریم دوسری۔
(بخاری، کتاب المغازی، باب بلا عنوان (بعد باب اصحاب البدر)؛ فتح الباری، ۷/۳۹۴-۳۹۵ نیز بحث برخمس؛ فتح الباری، ۶/۲۳۵، ۲۳۸-۲۴۲؛ تحریم شراب اور نفاذ تحریم پر بحث ملاحظہ ہو: مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء)

- حضرت عائشہؓ کے گھر میں عید/ بقرعید کے دن جو گانے بجانے والی دو لڑکیاں تھیں ان کے لیے ایک حدیث بخاری-۳۹۳۱ میں لفظ "قینتان" ہی استعمال ہوا ہے جب کہ بعض دوسری احادیث میں ان کو پیشہ ور مغنیہ نہیں قرار دیا گیا ہے۔
(بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ واصحابه المدینة؛ فتح الباری، ۷/۳۳۰: وعندها قینتان تغنیان بما تعازفت الانصار یوم بعاث... الخ)

- حضرت طریہ نامی ایک جاریہ (باندی) حضرت حسان بن ثابت خزرجیؓ کی تھیں۔ ایک بار رسولِ اکرم ﷺ ان کی مجلس سماطین (دو رویہ مجلس غناء) سے گذرے تو وہ گا رہی تھیں اور مجلسِ شرب و اکل قائم تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت حسانؓ کی باندی اور گانے والی خاتون کا نام سیرین تھا جو سماطین میں گھوم گھوم کر گا رہی تھیں۔ (اسد الغابہ، ۵/۴۹۶؛ مصباح اللغات: السماط:...سماط القوم: قوم کی قطار"۔ یہ سماطین تثنیہ ہے سماط کا)

- ترمذی کی ایک حدیث ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ گھر میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ نے لفظ وصوت پر مبنی نغمہ سنا۔ اس کے ساتھ بچوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے اٹھ کر ملاحظہ فرمایا تو ایک حبشی خاتون کو گاتے ہوئے دیکھا جس کے گرد بچے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو بلا کر وہ منظرِ موسیقی دکھایا اور وہ آپ ﷺ کے شانہ مبارک پر اپنی تھوڑی رکھے ہوئے اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک سیر نہ ہو گئیں۔ اسی دوران حضرت عمرؓ منظر پر طلوع ہوئے تو وہ لوگ وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔
(ترمذی، ابواب المناقب، مناقب عمرؓ: "... کان رسول الله ﷺ جالسا فسمعنا لفظا و صوت صبیان، فقام رسول الله ﷺ فاذا احبشیة تزفن والصبیان حولها...")

- حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمیؓ کی باندی جس کے ذریعہ فتحِ مکہ سے قبل اکابر قریش کو ایک خط بھیجنے کی سعی نامشکور کی گئی تھی ایک مغنیہ تھی اور نوحہ گانے والی تھی۔ اس کے بارے میں یہ

بھی الزام ہے کہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجویں بھی گایا کرتی تھی۔

(بلاذری، ۱/۳۶۰-۳۶۱؛ ابن ہشام ۴/۱۶ و مابعد؛ بخاری، کتاب الجهاد والسير، حدیث: ۳۰۰۷ و اطراف متعدد مثلاً ۳۰۸۱، ۳۹۸۳، ۴۲۷۴، ۴۸۹۰، ۶۲۵۹، ۶۹۳۹؛ فتح الباری، ۶/۱۷۳ و ما بعد بالخصوص تفسیر سورة الممتحنه کی بحث ۸/۸۰۷ و مابعد؛ ۷/۶۵۱ و مابعد؛ ۱۲/۳۷۸ و مابعد)۔

اہل سیر اور محدثین کرام اور شارحین نے اس مغنیہ کے نام ونسب اور حالات پر مختلف روایات دی ہیں۔ ابن ہشام/ ابن اسحاق کے مطابق محمد بن جعفر نے اسے مزینہ کی عورت بتایا ہے اور دوسروں نے بنوعبدالمطلب کے کسی شخص کی مولاۃ بتا کر سارہ نام لکھا ہے۔ احادیث بخاری میں اس کو ہودے والی عورت (ظعينة) کہا گیا ہے یا امراۃ یعنی صرف عورت یا حدیث ۳۹۸۳ میں اس کو مشرکوں کی ایک عورت (امراة من المشركين)

حافظ ابن حجرؒ نے سورۃ الممتحنہ کی تفسیر میں شرح حدیث کا وعدہ دو تین مقامات پر کیا ہے لیکن وہاں نہیں ہے، اصل شرح کتاب المغازی کے باب غزوۃ الفتح میں ہے جس میں ابن اسحاق کی مذکورہ بالا روایت کے علاوہ واقدی کی روایت کے مطابق اس کا نام کنود لکھا ہے۔ دوسری روایات میں سارہ یا ام سارہ ہے۔ واقدی کے مطابق حضرت حاطبؓ نے دس دینار اجرت دی تھی، ضعیف روایت میں ایک دینار ہے جس طرح اسے حضرت عباس کی مولاۃ بتایا گیا ہے۔ حدیث: ۶۹۳۹ میں اور اس کی شرح میں عورت کے بارے میں زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ ظعینہ کے معنی ہودج والی عورت کہا ہے مگر اصلاً اس کے معنی ہودج ہیں۔ اس کی مزنی وقریشی وغیرہ نسبتوں کے علاوہ ہمارے مقصود کی بحث یہ ہے کہ وہ مغنیہ تھی: "كانت مغنية" (۱۲/۳۸۳)

موسیقی سے متعلق مختصر اصولی بحث

لہو ولعب کی متفرق قسموں میں غناء اور موسیقی کو جو قبولِ عام حاصل ہے، اس سے زیادہ اس کا درجہ حرام سمجھا جاتا ہے۔ احادیث وروایات میں بلاشبہ اس کی ممانعت اور کراہت کے احکام بھی ملتے ہیں اور اسی قدر اس کی اباحت و جواز کے واقعات بھی آتے ہیں۔ ان دونوں کا تقابلی اور تجزیاتی مطالعہ کر کے اس کی ممانعت کی حدود مقرر کرنی چاہیے اور اس کی اباحت و جواز کی سرحدوں کو بھی طے کرنا چاہیے۔ لیکن متاخر علماء وفقہاء اور دوسرے اہل علم نے ان کا صحیح تناظر میں

مطالعہ کرنے کی بجائے اپنے اپنے خاص فقہی نظریات اور اصولی آراء کے پس منظر میں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو متحارب، متصادم اور متوازی اندازِ فکر وجود میں آ گئے اور دو طرح کے سخت مخالف ''فتاویٰ'' دیے جانے لگے۔

- ایک شدت پسند اور تقویٰ پرست رویہ یہ ابھرا کہ تمام احکامِ اباحت اور واقعاتِ جواز کے باوجود غناء و موسیقی قطعی حرام ہیں۔ ان میں سے بعض صالح و معتدل اہل قلم حضرات نے اباحت و جواز بلکہ کسی حد تک برداشت کرنے کی گنجائش نکالی مگر وہ بھی اسے مکروہ سے زیادہ حرام بتاتے ہیں۔ بقول ایک صاحبِ طرز ادیب وطنز نگار وہ جن پاکیزہ قیود اور طاہر شروط کے ساتھ گانے بجانے کی اجازت دیتے ہیں ان سے تقویٰ و طہارت تو وجود میں آ سکتا ہے مگر موسیقی اور غناء پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ان متشدد علماء کے نزدیک بہر حال موسیقی اور غناء کی تمام اقسام حرام ہی ہیں۔ ان کے تجزیہ و نگارش کی عمدہ اور نمائندہ تصنیف مفتی محمد شفیع مرحوم کی عربی کتاب اور اس کا مدلل اردو ترجمہ ہے جو مولانا محمد عبدالمعز کے قلم سے نکلا ہے (اسلام اور موسیقی، شرح و ترجمہ کشف العناء عن وصف الغناء (عربی)، اردو ترجمہ، مکتبہ الفلاح، دیوبند، ۱۴۰۲ھ)۔ دوسرا معتدل نقطہ نظر مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی ؒ نے اپنی اسی نام کی کتاب اسلام اور موسیقی میں اس سے قبل پیش کیا تھا اور اس میں وہ سماع کے جواز اور بعض صورتِ غناء اور موسیقی کے اباحت کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کے نتائج پر اور اس سے زیادہ نظریات پر بہت لے دے ہوئی تھی۔

(اسلام اور موسیقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۶ء؛ سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، اعظم گڑھ ۱۹۸۹ء، نے اگرچہ متعدد واقعات و روایات بیان کر کے ان کے جواز و اباحت کا ذکر کیا ہے مگر پھر شدتِ تقویٰ میں ان کی ناپسندیدگی کی صراحت بھی کر دی ہے، ملاحظہ ہو: ۱۴۰، ۱۴۱ و مابعد)

بہر حال تمام فقہی اور علمی آراء و نظریات سے قطع نظر صحیح احادیث و معتبر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مواقعِ مسرت و نشاط پر غناء اور موسیقی سنی تھی اور ان کی اجازت بھی دی تھی اور اسی بنا پر صحابہ کرام میں سے متعدد نے اپنے عہد میں اس سے لطف اندوزی حاصل کی تھی، یہ دراصل عہدِ نبوی و دورِ صحابہ کرام کے سماجی تمدنی ثقافت کا معاملہ تھا اور اسی نقطۂ نظر سے اسے اسلامی تمدن کا حصہ سمجھنا اور بنانا چاہیے۔

تقریباتِ غم

انسانی زندگی میں خوشی کے ساتھ غم اور مسرت کے ساتھ اندوہ لگا ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی و تمدنی تقریبات کی نوعیت وابستہ ہے۔ دکھ اور غم کے متعدد مواقع انسانی زندگی میں آتے ہیں اور حزن و ملال غم و اندوہ کے ساتھ انسان ان کے تجربات سے گذرتا ہے اور ان لمحاتِ گذران سے وابستہ تقریبات جنم لیتی ہیں۔ ان کو منانے، ان کی رعایت کرنے اور ان کو برداشت کرنے کے کچھ اصول و ضابطے اور رسوم و رواج بھی پڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی انسانی تہذیب و تمدن ہو، ان کے کچھ احکام و اصول مذہبی ہوتے ہیں جو تمدنی اثرات و اقدار کے زیر اثر وجود میں آتے ہیں۔ اصل سماجی روایات اور تمدنی اقدار ہوتی ہیں جو فطرتِ انسانی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ مجموعی طور سے یہ تقریباتِ غم انھیں دونوں قسم کی اقدار کا آمیزہ ہوتی ہیں۔

جاہلی عرب تہذیب و تمدن کا ایک سماجی تناظر یہ بھی تھا کہ اس نے خاص حنیفی تہذیب و تمدن سے اکتسابِ فیض و عرفان کیا تھا۔ دوسرے تمدنوں میں بھی ایک دوسرے سے استفادہ و افادہ، تاثیر و تاثر پذیری اور لین دین کی پختہ روایات رہی ہیں کہ تمدنِ انسانی تجربات کا نچوڑ ہے۔ دینِ حنیفی اور ملتِ ابراہیمی کی تمدنی روایات میں فطری تنوع بہت تھا اور اس کے متعدد جہات و ابعاد کے علاوہ گوناگوں دائرے اور زاویے بھی تھے۔ اٹل قسم کے مذہبی احکام کو آفاقی حیثیت اور اثر انگیزی حاصل تھی جو مقامی تمدنی روایات کو اپنے صالح و مفید فریم ورک میں لے کر ان کو ہم آہنگ کر لیتی تھی۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی اسی آفاقی حیثیت اور اس سے مقامی روایات و رسوم کی ہم آہنگی ہی نے اس کو ایک خاص تشخص و انفرادیت عطا کی ہے۔

مسرت و شادمانی کے ساتھ ساتھ اسلامی تمدن میں تقریباتِ غم کے کچھ آفاقی اصول و احکام اور کچھ مقامی روایات و اقدار ملتی ہیں۔ عرب مقامی روایات اور قومی اقدار نے اسلامیت کے بعد خالص اسلامی تمدنی روایات و اقدار کا روپ دھار لیا اس طرح وہ مذہبی اقدار بن گئیں۔ ان کی افادیت و صالحیت اور انسانی زندگی اور انسانی معاشرے میں ان کی دور رس کارگذاری سے دوسرے تمدن بھی انکار کر سکتے ہیں، نہ بلا تاثر رہ سکتے ہیں۔ عہدِ نبوی نے صرف دین و مذہب کی

تعمیر و تشکیل نہیں کی بلکہ ان تمدنی روایات واقدار اور رسوم و رواج کو انسانی سوز و گداز سے بہرہ مند کیا۔ تقریباتِ مسرت کی مانند وہ بھی گوناگوں ہیں جیسے عیادت، تعزیت، تجہیز و تکفین اور تدفین وغیرہ۔

عیادتِ بیماراں

بیماریوں میں انسانِ مبتلا کی عیادت کرنا ایک انسانی ہمدردی کا زاویہ رکھتا ہے جو اس کام کو دین و مذہب کی قید و بند سے اوپر اٹھا دیتا ہے۔ اسلامی تمدن میں اس انسانی ہمدردی کی روایت رسولِ اکرم ﷺ نے مختلف غیر مسلموں کی تیمارداری اور عیادت کی روایت قائم کر کے فرمائی تھی۔ مکی دور ہو یا مدنی عہد، دونوں زمانوں میں رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے بیمار غیر مسلم رشتہ داروں، عزیزوں اور پڑوسیوں اور دوسرے شہر والوں کی عیادت کی تھی، اگرچہ روایات و اخبار میں لفظ عیادت نہیں ملتا، اور کسی دوسرے مقصد کا واضح ذکر آتا ہے۔ آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا تقاضا تھا کہ آپ ﷺ اپنے غیر مسلم امتیوں کی عیادت کو بھی جاتے اور حقیقت میں آپ ﷺ جاتے تھے۔ مسلم یا غیر مسلم، امتی تو سب ہی آپ ﷺ کے تھے، ایمان نہ لانا ان کی ذمہ داری تھی۔ حدیث بخاری: ۵۶۵۷ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے مرض الوفاۃ میں عیادت کی تھی۔ یہ سعید بن مسیبؒ کا بیان ہے۔

(بخاری، کتاب المرضیٰ، باب عیادۃ المریض وغیرہ؛ فتح الباری، ۱۰/ ۱۵۱ و مابعد؛ باب عیادۃ المشرک، حدیث: ۵۶۵۷ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت کرنے والا ایک شخص یہود کا غلام تھا۔ وہ بیمار پڑا تو رسولِ اکرم ﷺ نے اس کے پاس جا کر اس کی عیادت کی اور اس کو اسلام لانے کو کہا اور وہ مسلمان بھی ہو گیا: "ان غلاما لیھود کان یخدم النبی ﷺ فمرض، فاتاہ النبی ﷺ یعودہ... الخ")

مسلم مریض اور صاحبِ ایمان روگی کی عیادت انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ اسلامی اخوت کے ساتھ مل کر دو آتشہ بن گئی۔ اسی بنا پر مسلمانوں کے ایک دوسرے پر سماجی اور تمدنی حقوق میں سے ایک مسلم کی دوسرے مسلم کی بیماری میں عیادت کو شامل فرما دیا اور وہ سنت بن گئی۔ عرب سماج نے ان ہی دونوں جہات کے سبب اس سنتِ عیادت کو قبول کر کے اسے انسانی اخوت و ہمدردی کا ایک تابناک اسوہ بنا دیا۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی عیادت کے واقعات صرف عہدِ نبوی میں اتنے ملتے ہیں کہ ان پر ایک بسیط تحقیقی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس فصل میں صرف چند

روایات و واقعات پر اکتفا کی جاتی ہے کہ طویل و مفصل بحث کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ بعض جہات و ابعاد کا ذکر ضرور ہوگا:

- رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو اپنی سواری کے پیچھے بٹھایا اور حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کی عیادت فرمائی۔ (حدیث بخاری، ۵۶۶۳-۵۶۶۴؛ اسد الغابہ، ۱/۶۵)

- حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ کی عیادت نبوی کا واقعہ تو بہت مشہور ہے۔ (اسد الغابہ، ۲/۲۹۷)

- حدیث بخاری: ۵۶۶۸ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے زمانے میں حضرت سعد بن وقاص زہریؓ کی عیادت فرمائی تھی۔ (نیز اسد الغابہ، ۲/۲۷۴ وغیرہ)

- حضرت جابر بن عبداللہؓ بیمار پڑے تو رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی عیادت ان کے گھر جا کر کی اور ان کے لیے دعا کی۔ بخاری: ۵۶۷۶ اور حدیث بخاری: ۵۶۵۱ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی عیادت کے لیے پا پیادہ گئے تھے۔

- حدیث بخاری: ۵۶۶۲ کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے بروایت ابن عباسؓ ایک شخص کی عیادت کی اور اس کی شفایابی کی دعا کی۔

- رسولِ اکرم ﷺ نے ایک اعرابی کی عیادت اس کے پاس جا کر کی: "...دخل علیٰ اعرابی یعوده" (حدیث بخاری: ۵۶۵۶)

- رسولِ اکرم ﷺ نے حضرات سعد بن ابی وقاص اور ابی بن کعبؓ کے ساتھ اپنی ایک نواسی کی عیادت کی تھی۔ حدیث: ۵۶۵۵۔

اسد الغابہ کے سوانحی خاکوں کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے متعدد صحابہ کرام کی عیادت کی تھی جیسے حضرات اقرع بن شفی عکلی، عبداللہ بن ثابت، طلحہ بن عبیداللہ تیمی، عبادہ بن صامت، سعد بن ابی رافع، عبداللہ بن جبیر بن عتیک اور آل ابی ربیعہ اور جبیر انصاری کے بھتیجے وغیرہ کی عیادت۔ (اسد الغابہ، ۱/۱۱۰، ۲۵۸؛ ۲/ ۲۷-۲۸، ۱۴۸، ۱۶۳، ۲۷۴، ۲۷۷، ۲۹۵، ۲۹۷، ۳/۱۳۰، ۲۴۰ وغیرہ)

رسولِ اکرم ﷺ کی عیادت اور مریضوں کے لیے دعائے شفا کی ایک خاص جہت یہ ہے کہ مریضوں کو آپ ﷺ کے پاس لایا جاتا تھا۔ حدیث بخاری: ۵۶۷۵: "ان رسول اللہ ﷺ کان اذا أتی مریضا أو أتی به الیه..."

- رسولِ اکرم ﷺ نے متعدد خواتین/صحابیات کی بیماری کے دوران ان کی عیادت کی۔ ان میں شامل ہیں: حضرت ام العلاء:

(حدیث ابوداؤد: ۳۰۹۲)، حضرت اسماء بنت سلمہ، ام الخلاس (اسد الغابہ، ۵/۳۹۳)، ام عبدالرحمٰن بنت ابی سعید خدریؓ (اسد، ۵/۶۰۰)

عیادت صحابہ وصحابیات

صحابہ کرام اور صحابیات طاہرات بھی ایک دوسرے کی عیادت کو جاتے تھے کہ وہ حقوق مسلمین کا ایک باب تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے مرض الموت میں متعدد صحابہ کرام اور صحابیات مطہرات کی عیادت نبوی کے واقعات کا ذکر جمیل بھی روایات میں ملتا ہے۔ حدیث بخاری: ۵۶۵۸ میں ہے کہ متعدد لوگوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی عیادت کی تھی بلکہ روز کرتے تھے: "... دخل علیه ناس یعودونه فی مرضه... الخ"

- حدیثِ بخاری: ۵۶۶۷ میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کی بیماری میں عیادت کی تھی۔ نیز حدیث: ۵۶۶۱۔

- حضرات شیخین اور دوسرے صحابہ کرام کی عیادت نبوی روز کا معمول تھا۔

(اسد الغابہ، ۳/۳۲۴ وغیرہ)

- عورتوں اور صحابیات طاہرات میں سے متعدد کے رسولِ اکرم ﷺ کی عیادت کرنے کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنو عبدالاشہل کی حلیف خاتون حضرت فاطمہ بنت الیمان عبسیؓ بعض دوسری خواتین کے ساتھ آپ ﷺ کی عیادت کو گئی تھیں۔ (ابن سعد، ۸/ ۳۲۵-۳۲۶؛ رسولِ اکرم ﷺ اور خواتین، ۵۶ وغیرہ)۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے واقعات بھی ہیں۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مرض الوفاۃ میں تمام صحابہ وصحابیات مدینہ نے آپ ﷺ کی عیادت کی تھی۔

- حضرت قیس بن ابی حازمؒ اور ان کے اصحاب نے مشہور صحابی حضرت خباب بن ارتؓ کی عیادت کی تھی۔ امام بخاریؒ نے اس کا ذکر متعدد احادیث میں کیا ہے: ۵۶۷۲ اور اس کے اطراف: ۶۳۴۹، ۶۳۵۰، ۶۴۳۰، ۶۴۳۱، ۷۲۳۴۔

- حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجیؓ کی عیادت کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی گئے تھے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ (اسد الغابہ، ۵/۱۵۰ وغیرہ)

- ہجرت مدینہ کے معاً بعد حضرات ابوبکر و بلالؓ بیمار پڑ گئے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنی بیماری کے باوجود ان دونوں کی عیادت ان کی قیام گاہوں پر جا کر کی تھی۔ حدیث بخاری: ۵۶۷۷ نیز حدیث ۵۶۵۴ جس کے ترجمۃ الباب میں امام بخاری نے عنوان باندھا ہے کہ مردوں کی عیادتِ خواتین اور حضرت ام الدرداءؓ نے مسجد جا کر ایک انصاری مریض کی عیادت کی تھی اور اس کے بعد ہی عیادت حضرات ابوبکر صدیق اور بلال حبشی کا واقعہ نقل کیا ہے: باب عیادة النساء الرجال، وعادت ام الدرداء رجلا من اهل المسجد من الانصار"۔ اسد الغابہ، ۵/۱۹۲ کے مطابق حضرت ابوالدرداءؓ بیمار پڑے تو حضرت عبدالرحمٰن ان کی عیادت کو گئے۔

میت پر نوحہ

عہد جاہلی میں میت پر آہ و بکا کرنے اور نوحہ و ماتم کی مجلس برپا کرنے کی ایک بڑی مضبوط روایت تھی۔ نہ صرف میت کے گھر والے نوحہ و ماتم کرتے تھے بلکہ دوسرے اعزہ واقرباء بالخصوص ان کی خواتین نوحہ کے لیے جمع ہو جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ خاص نوحہ و ماتم کرنے والی خواتین کا طبقہ بھی تھا جو پیشہ ور تھا اور وہ ان تقریباتِ غم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ عرب روایات میں ان کے لیے النیاحہ وغیرہ کے مختلف الفاظ ملتے ہیں اور ان کے متعدد واقعات کا ذکر بھی آتا ہے۔ نوحہ و ماتم میں بال بکھرانے، گریبان پھاڑنے اور سینہ و ماتھا پیٹنے کے علاوہ خوب چیخنے چلانے کا بھی کاروبار ہوتا تھا۔

اسلامی تمدن میں نوحہ و ماتم کی جاہلی روایات کا تو سد باب کیا گیا، ماتم کرنے سے منع فرمایا گیا، چیخنے چلانے، گلا پھاڑنے اور گریبان پھاڑنے اور سینہ کوبی وغیرہ کی ممانعت کی گئی کہ وہ صدمہ کے وقت صبر کرنے کے اسلامی حکم و حکمت کے خلاف اعمال تھے۔ تاہم مجلس تعزیت برپا کرنے کی اجازت بہ تقاضائے بشریت دی گئی۔ میت کے گھر والوں کے پاس تعزیت کے لیے جو خواتین آتی تھیں وہ اس کے اہل و عیال کی دلدہی اور دلداری کرتی تھیں اور اپنے کلماتِ صبر

سے غم زدہ خاندان کے لوگوں کا غم بٹاتی تھیں۔ یہ خالص اسلامی نوحہ و ماتم اور نبوی عزا تھی۔

کتبِ حدیث وسنت میں بالخصوص اور ان کی شروح میں بالعموم جاہلی اور اسلامی آداب نوحہ کے ابواب ملتے ہیں اور روایاتِ سیرت کے دوران ان کے بعض واقعات اور اقدار و رسوم کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔ کتاب الجنائز کے مختلف ابواب میں اس تمدنی اور معاشرتی جہت کے متعدد ابواب ہیں جیسے باب البکاء علی المیت، باب المیت یعذب ببکاء اهله علیه، باب التشدید فی النیاحة وغیرہ صرف مسلم میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری کتب میں بھی ہیں۔

مدنی دور میں اسلامی اور عرب نوحہ و ماتم اور مجلس عزا و تعزیت کے دو نمائندے واقعے ملتے ہیں: ایک حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کی غزوۂ احد میں شہادت کا انتہائی دلدوز اور صبر آزما واقعہ فاجعہ تھا۔ دوسرا اسی طرح دیار غیر میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ اور ان کے دو رفقاء کرام حضرات زید بن حارثہؓ اور عبداللہ بن رواحہ خزرجیؓ کی شہادتوں کے واقعات تھے جنھوں نے پورے مدینہ منورہ میں کہرام برپا کر دیا تھا۔ خود غزوۂ احد میں ستر صحابہ کرام کی کثیر تعداد کی شہادت ایک ملّی کہرام اور قومی غم کا انتہائی کربناک واقعہ تھا جس طرح غزوۂ بدر میں ستر اکابر قریش کے میدان بدر میں کھیت رہنے کے سانحہ نے پورے قریش اور تمام مکہ میں غم و اندوہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ ان قومی سانحات کا ردعمل مختلف ہوا تھا اور ان میں اسلامی اور جاہلی روایات کا الگ الگ انداز ملتا ہے۔ غزوۂ بنو قریظہ میں اکابر و مردان قبیلہ کے قتل پر قومی نوحہ اور قبائلی ماتم کی یہودی روایات پیش کیں جو عرب جاہلی روایات سے کچھ زیادہ الگ تھلگ نہ تھیں۔ ان واقعاتِ غم اور بعض دوسرے واقعاتِ نوحہ و ماتم کی کچھ تمدنی تفصیلات پیش ہیں:

- غزوۂ بدر میں ابوجہل مخزومی، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف جیسے اکابرِ قریش کے قتل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اکابر و شیوخ قریش نے ایک قومی پالیسی کے تحت قدغن عائد کر دی کہ جب تک بدر کا انتقام نہ لے لیا جائے کوئی بھی قریشی/مکی نوحہ و ماتم نہیں کرے گا۔ روایت ہے کہ سینے غم سے پھٹے جاتے تھے مگر لبوں پر مہر لگی تھی کہ ناموسِ قریش کا پاس تھا۔ دوسرے بہانوں سے نوحہ و ماتم کیا گیا مگر اصل نوحہ غزوۂ احد میں انتقام لینے کے بعد ہی کیا گیا۔ (ابن اسحاق/ابن ہشام، ۲/۲۸۹-۲۹۱: "...ناحت قریش علیٰ قتلاهم، ثم قالوا: لا تفعلوا فیبلغ

محمد او اصحابه فیشمتوا بکم ..." وکان الاسود بن المطلب قد اصیب له ثلاثة من ولده: ... وکان یحب ان یبکی علیٰ بنیه قال: فبینما هو کذلک اذ سمع نائحة من اللیل فقال ... هل بکت قریش علیٰ قتلاها لعلی ابکی علی ابی حکیمه ... " نیز مابعد کے مباحث جن میں مراثی مقتولین موجود ہیں)

- دوسری طرف شہیدانِ احد پر مختلف اسلامی اور فطری ردعمل ملتے ہیں:

رسولِ اکرم ﷺ کو حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ پر شدید اندوہ ہوا مگر آپ ﷺ نے صبر کیا اور آپ ﷺ کی ہدایت و نصیحت پر سید الشہداء کی بہن حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب ہاشمیؓ نے کمال صبر کا مظاہرہ کیا۔

- ان میں سب سے اندوہ آگیں اور مثالی فطری ردعمل حضرت حمنہ بنت جحش اسدیؓ کا تھا۔ ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحش اسدیؓ، ان کے ماموں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی وفات/ شہادت کی خبر ان کو ملی تو انھوں نے کمال صبر کیا اور انا اللہ پڑھ لیا لیکن جب ان کو ان کے شوہر حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ کی شہادت کی خبر ملی تو پھوٹ پڑیں اور آہ و بکا کرنے لگیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ شوہر کی موت بیوی کے لیے انتہائی صدمہ کا موقعہ ہے اور وہ اس کو برداشت مشکل سے کرسکتی ہے: "ان زوج المرأة لیمکان" (ابن ہشام، ۳/۵۰)

- انصار کے دو خاندانوں بنوعبدالاشہل اور بنوظفر کے گھروں سے گذرتے ہوئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شہیدوں پر نوحہ و ماتم اور آہ و بکا کی آوازیں سنیں تو رسولِ اکرم ﷺ کی آنکھیں بھر آئیں اور آپ ﷺ رو دیے پھر حسرت سے فرمایا کہ افسوس حمزہ پر کوئی رونے والیاں نہیں۔ حضرات سعد بن معاذ اور اسید بن حضیرؓ نے گھروں پر آنے پر فرمان غم و حزن سنا تو اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ تیاری کر کے حضرت حمزہؓ کے گھر جائیں اور عم نبوی پر نوحہ کریں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی مسجد کے دروازے پر ان کی آہ و بکا سنی تو فرمایا کہ تم نے مواسات و دلداری کر لی، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے لیکن اب لوٹ جاؤ اور نوحہ نہ کرو اور اسی دن سے بقول ابن ہشام نوحہ کی ممانعت فرما دی گئی۔ ابن ہشام، ۳/۵۰: "... فسمع البکاء والنوائح علی قتلاهم فذرفت عینا رسول اللہ ﷺ فبکی ثم قال: لکن حمزة فلا بواکی له". فلما رجع سعد بن معاذ و اسید بن حضیر ... امرا نساء هم ان یتحرزمن ثم یذهبن فیبکین

علی عم رسول الله ﷺ الخ ؛ ابن سعد نے اس واقعہ کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت حمزہؓ پر آہ وبکا نے ایک مستقل ہدایت کی شکل اختیار کر لی کہ اس دن کے بعد سے کوئی بھی عورت کسی بھی میت پر آہ وبکا کرتی تو اس کا آغاز حضرت حمزہ پر بکاء سے کرتی: "لم تبک امراۃ من الانصار بعد ذلک الی الیوم علیٰ میت الا بدأت البکاء علیٰ حمزۃ ثم بکت علی میتھا" (۱۱/۳)

- سب سے مثالی اور محبت وعقیدت نبوی میں شرابور ردِعمل ایک خاتونِ بنی دینار کا تھا۔ غزوۂ احد میں ہی ان کے شوہر، بھائی اور والد کی شہادت کی خبران کو یکے بعد دیگرے ملتی رہی اور وہ صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتی گئیں اور برابر رسولِ اکرم ﷺ کی خیر وعافیت پوچھتی رہیں کہ آپ ﷺ کے نہ صرف زخمی ہونے بلکہ شہید ہونے کی خبرسن چکی تھیں لیکن جیسے ہی ان کو رسولِ اکرم ﷺ کی عافیت کی خبر ملی دیوانہ وار آپ ﷺ کی زیارت کو گئیں اور چہرہ انور کو دیکھتے ہی بول پڑیں کہ آپ ﷺ کے بعد ہر مصیبت معمولی ہے: "کل مصیبۃ بعدک جلل"

(ابن ہشام، ۵۱/۳)

- غزوہ/ سریۂ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کی شہادت کی خبر لے کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے پاس پہونچے اور حضرت جعفر کے بچوں کو بلا کر چمٹالیا۔ آپ ﷺ نے ان کو پیار کیا اور آپ ﷺ کی آنکھیں بھر آئیں۔ حضرت اسماء نے گریہ نبوی کی وجہ پوچھی اور جیسے ہی آپ ﷺ نے ان کو حضرت جعفر اور ان کے رفقاء کی شہادت کی خبر دی تو بقول خود ان کے، میں اٹھ کر چیخنے چلانے لگی اور عورتیں میرے پاس جمع ہو گئیں: "قالت: فقمت أصیح، واجتمع الیّ النساء، وخرج رسول الله ﷺ الیّ..." ۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بہر حال ان عورتوں کو آہ وبکا اور ماتم ونوحہ کرنے سے روکا اور صبر کرنے کی تلقین جمیل فرمائی۔

(ابن ہشام، ۴۳۶/۳-۴۳۷: دوسرے دونوں شہداء کے گھر والوں نے بھی اسی طرح ملا جلا ردِعمل کیا تھا۔ واقدی، ۷۶۶-۷۶۷ وغیرہ؛ بخاری، کتاب الجنائز، ....؛ کتاب المغازی، باب غزوۃ موتہ الخ، حدیث: ۴۲۶۳)

- غزوۂ بنی قریظہ میں اکابر وسردارانِ یہود کا قتل ایک قومی سانحہ تھا لہٰذا یہودی عورتوں نے سخت نوحہ کیا۔ انھوں نے اپنے گریبان پھاڑ ڈالے، بال پریشان کر ڈالے اور ماتم ونوحہ برپا

کر دیا اور ان کو تسلی و تشفی دینے اور نوحہ و ماتم میں شرکت کرنے کے لیے عرب عورتوں نے ان کے گھروں میں جا کر شرکت کی اور مواسات کی: "... شققن الجیوب و جززن الشعور، واقمن الماتم، وضویٰ الیهن نساء العرب..." (واقدی، ۵۳۰)

بخاری اور دیگر کتبِ حدیث کی متعدد روایات و احادیث سے جاہلی نوحہ و ماتم اور اسلامی اظہارِ غم و اندوہ کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی روایتِ نوحہ میں بین کرنا، گریبان اور کپڑے پھاڑنا، پچھاڑیں کھانا، اور چیخنا چلانا اور ویل کرنا سب ہی کچھ شامل تھا اور اس میں جتنی زیادتی ہو سکے اتنی کرنا زیادہ محمود و مقبول تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس غیر فطری اور غیر اسلامی تمدنی روایت اور سماجی وطیرے پر سخت بندش لگائی اور نوحہ و ماتم کو یکسر و یک لخت بند کر دیا کہ اس میں صبر اور تقدیر الٰہی پر ایمان کی کمی بلکہ فقدان کا عنصر ملتا ہے مگر اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے فطری غم و اندوہ اور رنج و دکھ کے اظہار کو جائز ٹھہرایا کہ صدمہ سے آنکھیں بھر آتی ہے اور آہ و بکا کی صدائیں نکل پڑتی ہیں۔ اسی بنا پر صدمات پر آہ و بکا کی اجازت ہے اور اس کو رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(بخاری، کتاب الجنائز، مختلف ابواب؛ باب قول النبی ﷺ: "یعذب المیت الخ" وغیرہ؛ فتح الباری، ۳/۱۹۲ و مابعد بالخصوص ۱۹۶: "وما یرخص من البکاء فی غیر نوح" پر بحث حافظ ابن حجر عسقلانیؒ؛ نیز مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کے ابواب جنائز میں خاص نوحہ سے متعلق ابواب اور ان کی احادیث و واقعات)

غسلِ جنازہ

انسانی تہذیب و معاشرت میں میت کو بعد وفات غسل دینے اور پاک و صاف کرنے کا رواج رہا ہے۔ اس کے پیچھے شعوری یا غیر شعوری طور سے یہ خیال و عقیدہ کارفرما رہا ہے کہ وہ اب اخروی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے جہاں اس کی ملاقات اور ربط و ارتباط نیک لوگوں (صالحین)، فرشتوں (ملائکہ) اور پورے عالم غیب سے ہوگی لہٰذا اسے پاک صاف ہونا چاہیے جس طرح دنیاوی زندگی میں اچھے کاموں کے کرنے اور اچھے لوگوں سے ملنے کے لیے غسل اور طہارت کو لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ دراصل طہارتِ جسم و بدن تزکیہ روح و جان تک لے جاتی ہے۔

عہد جاہلی میں اسی میں غسل جنازہ کی مضبوط وقدیم روایت رہی تھی اور وہ دین ابراہیمی سے آئی تھی۔ اکابر قریش بالخصوص عبدالمطلب ہاشمی کے غسل میت کا بڑا مفصل وممتاز اور دلنشیں و محبت آگیں ذکر ملتا ہے۔ اس غسل میں طہارت وصفائی کا پکا اہتمام کیا جاتا تھا لہٰذا متعدد اضافے کیے جاتے تھے:

- پانی کو گرم کیا جاتا تھا کہ گرم پانی سرد پانی کے مقابلے میں زیادہ صاف وپاک ہو جاتا ہے۔
- اس میں بیری (سدر) کی پتیاں ملائی جاتی تھیں جو تطہیر اور تزکیہ کا کام فطری طور سے کرتی تھیں۔
- میت کے جسم کو کافور اور خوشبو اور عطر و پھول وغیرہ سے بھی آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا۔
- نئے کپڑے کے کفن میں بھی اسی اضافی تطہیر وصفائی کا خیال کارفرما تھا کہ وہ زیادہ پاک ہوتا ہے۔
- میت کو حنوط کرنے کا طریقہ بھی عہد نبوی اور عہد خلافت میں اسی تطہیر وصفائی کے لیے اختیار کیا جاتا تھا۔
- غسل میت/ جنازہ کے دوسرے اسلامی آداب بھی تھے جو تمدن ومعاشرت سے زیادہ احکام میں آتے ہیں۔

(بخاری، کتاب الجنائز، باب غسل المیت ووضوئہ بالماء والسدر؛ فتح الباری، ۳/ ۱۶۱-۱۶۶ و مابعد، متعدد احادیث؛ واقدی، ۵۲۷: غسل میت سعد بن معاذؓ: غسل بالماء الاول، والثانیۃ بالماء والسدر والثالثۃ بالماء والکافور؛ ابن سعد، ۳/ ۳۶۶: حنوط عمرؓ غسل وکفن؛ ۴/ ۲۶۰: غسل وکافور حضرت عمرو بن العاص؛ ۴/ ۹۲: مشک سلمان فارسی)

جنازے کی چارپائی

دین حنیفی، عرب جاہلی اور تمدن اسلامی اور دوسرے انسانی معاشروں میں ایک اور روایت بھی ہے اور وہ ہے جنازہ اٹھانے کی چارپائی یا تخت جس طرح جنازہ/ میت کو غسل دینے کی ایک الگ خاص چارپائی یا تخت ہوتا ہے۔ ان دونوں تختوں کا ذکر روایات واحادیث میں ملتا ہے۔ میت نہلانے کا تخت تختہ ہوتا تھا جب کہ جنازہ اٹھانے کے لیے باقاعدہ ایک خاص تخت ہوتا تھا

جو بالعموم لکڑی کا بنا ہوتا تھا اور بعض اوقات وہ لکڑی کے ڈھانچے پر بانوں سے بُنا بھی ہوتا تھا۔ دراصل یہ دونوں اقسام سونے اور آرام کرنے کے تخت کی ہیں۔ ان میں ہی سے کسی کو جنازہ لے جانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ جنازہ کے خاص تخت بنائے جانے لگے اور وہ جاہلی دور میں قبائلی/شہری مراکز میں رہتے تھے اور اسلامی نبوی عہد سے مسجدوں میں ان کا انتظام ہوتا تھا۔

- رسولِ اکرم ﷺ کا تخت (سریر) مبارک، جس پر استراحت وخواب فرماتے تھے، آپ ﷺ کا تخت جنازہ بھی بن گیا تھا کہ اسی پر آپ ﷺ کو نہلا دھلا کر لٹایا اور کفن سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بعد میں آپ ﷺ کو اسی مقام سریر یا مکان وفات میں دفن کیا گیا کہ انبیاء کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کی وفات ہو۔ بعد میں برائے حصول تبرک صحابہ کرام نے اس تخت (سریر) نبوی کو اپنے جنازے لے جانے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا مگر بعد میں حضرت مروان بن حکم اموی ؒ نے تخت نبوی کا یہ عام استعمال بند کر دیا۔

(بلاذری، ۱/۵۲۵:... فوضع علیه وصلی علیه وهو فوقه، فطلبه الناس منا یحملون موتاهم علیه، فحمل علیه ابوبکر و عمر والناس طلبا لبرکته..." ؛ بلاذری، ۱/۴۳۶: ام المومنین حضرت زینب بنت جحش ؓ نے سریر نبوی پر اپنا جنازہ اٹھانے کی وصیت کردی تھی لہٰذا اسی پر اٹھایا گیا، بعد میں دوسروں کے جنازے اٹھائے گئے)

- بہر حال دوسری روایات سیرت واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنازہ اٹھانے کے خاص تخت ہوتے تھے اور وہ مختلف محلوں میں مختلف خاندانوں کے پاس رہتے تھے یا ان کی مساجد میں ان کے رکھنے کا انتظام ہوتا تھا۔ حضرت مروان اموی ؒ نے سریر نبوی کو شرفاء کے لیے مخصوص کرنے کے علاوہ پورے مدینہ میں جنازہ کے لیے متعدد تخت رکھوا دیے تھے جن کا درمیانی حصہ پتیوں سے بنا ہوا تھا: "فلما کان مروان ... وفرق فی المدینة سررا یحتمل علیها الموتی وکان وسطه بلیف منسوج. (بلاذری، ۱/۴۳۶)

- حضرت سعد بن معاذ اوسی ؓ کا جنازہ اس سریر پر اٹھایا گیا تھا جو آل نبیط کے پاس رہتا تھا اور جس کے اوپر ان کے جنازے اٹھائے جاتے تھے: "وقد حمل معاذ علی سریر یحمل علیه موتاهم عند آل نبیط..." (واقدی، ۱۰۵۸)

- منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کا جنازہ آل سبط کے تخت جنازہ پر اٹھایا گیا تھا کہ اسی پر میتوں کے جنازے اٹھائے جاتے تھے: "واتی بسریر کان عند آل سبط، یحمل علیه الموتی ..." (واقدی، ۵۲۷)

بچوں کے لیے چھوٹی چارپائی/تخت

حضرت ابراہیم بن رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کمسنی میں ہوگئی تھی لہٰذا ان کا جنازہ ایک چھوٹی چارپائی/تخت پر اٹھایا گیا: "... وحُمل من بیت ام بردة علی سریر صغیر..."

(ابن سعد، ۱/۱۴۴)

خواتین کے جنازوں پر پردہ

مدتوں خواتین کے جنازے بھی مَردوں کی مانند چارپائی/تخت پر کھلے ہوئے لے جائے جاتے رہے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی ایک دختر نیک اختر کی وفات پر حضرت ام سلمہؓ اور حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے خاص پردہ دار جنازہ کا اہتمام کیا۔ وہ انھوں نے حبشہ میں اپنے قیام کے دوران دیکھا اور سیکھا تھا۔ اس میں ہوتا یہ تھا کہ چارپائی یا تخت کے کناروں پر لکڑیاں لگا کر ایک ہودج یا پردہ دار چھوٹا سا قبہ بنالیا جاتا تھا اور ان پر ایک بڑی چادر ڈال دی جاتی تھی جس سے میت پوری طرح چاروں طرف سے ڈھک جاتی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسے پسند فرمایا اور وہ حبشی تمدنی روایت اسلامی تمدن و معاشرت کا ایک حصہ بن گئی۔

جنازہ کی مشایعت اور اس کے آداب

جنازہ کی مشایعت یعنی اس کے ساتھ پیدل چلنا اور قبرستان تک پہونچانا بھی ایک تمدنی روایت ہے۔ وہ جاہلی عرب میں دینِ حنیفی سے آئی تھی اور اسلامی معاشرت میں سنت بنی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے دادا جناب عبدالمطلب ہاشمی کے جنازے کی مشایعت آٹھ سال کی کچی عمر میں بادیدۂ نمناک کی تھی مکی دور کے دوسرے جنازوں میں حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدیؓ -اولین زوجہ محترمہ- کی مشایعت کی تھی اور اپنے کافر چچا جناب ابوطالب ہاشمی کے جنازے کی

بھی۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام اقربا اور صحابہ کے جنازوں میں مشایعت نبوی کا نہ صرف امکان ہے بلکہ پکا یقین ہے کہ وہ نہ صرف اسلامی سنت ہے بلکہ انسانی مواسات بھی ہے۔ مدنی دور کے جنازوں میں رسولِ اکرم ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام حتیٰ کہ صحابیات کی مشایعت کے شواہد ملتے ہیں۔ لیکن بعد میں خواتین کے مشایعت جنازہ کے آداب واحکام بدل گئے اور ان کو ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔

(بخاری، کتاب الجنائز مختلف ابواب جیسے باب اتباع النساء الجنائز: حدیث: ۱۲۷۸: عن ام عطیہؓ "نهينا عن اتباع الجنائز ولم يعزم علينا؛ فتح الباری، ۳/۸۵ اوما بعد نیز باب الامر باتباع الجنائز، حدیث: ۱۲۳۹ و اطراف کثیرہ؛ فتح الباری، ۳/۱۴۵ وما بعد؛ ترمذی، حدیث: ۱۰۵۵: حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کی زیارت مکہ میں آمد پر کی تھی: باب ما جاء في الزيارة للقبور للنساء؛ اس کے بعد کا باب کراہت بتاتا ہے)

مشایعتِ جنازہ میں بالعموم اس کے پیچھے چلنے کو سنت بتایا جاتا ہے، وہ اکثر حالات کا معاملہ تو ہوسکتا ہے مگر دوسری سنت وتعامل صحابہ یہ بھی تھا کہ وہ جنازہ کے آگے آگے چلتے تھے: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کو اور حضرات شیخینؓ کو جنازہ کے آگے چلتے ہوئے دیکھا ہے: "رايت النبي ﷺ و ابا بكر و عمر يمشون امام الجنازة".

(ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب المشي امام الجنازة، حدیث: ۳۱۷۹؛ ترمذی، مذکورہ بالا ابواب، احادیث: ۱۰۰۷-۱۰۰۹، تین ہم معنی روایات مثل ابوداؤد؛ موخر الذکر میں حضرت ابن عمر کا تعامل بھی ہے۔ امام ترمذی کے بقول اس باب میں اختلاف صحابہ ملتا ہے تاہم بعض صحابہ اور ائمہ کے نزدیک آگے چلنا افضل ہے اور یہی امامانِ فقہ شافعی اور احمد کا قول ہے۔ ترمذی میں اس پر زیادہ مفصل بحث ہے۔ اس کے بعد جنازہ کے پیچھے چلنے کا باب و روایات ہیں)

جنازہ کے لیے کھڑا ہونا

جنازہ کی تکریم وتوقیر کی روایت جاہلی عرب میں دین حنیفی سے آئی تھی جو اسلامی تمدن میں بھی جاری رہی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی متعدد احادیث شریفہ میں مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ جنازہ دیکھو تو اس کے لیے کھڑے ہو جایا کرو تا آنکہ وہ آگے نکل جائے: "اذا رأيتم الجنازة فقوموا حتى تخلفكم"۔ احادیث بخاری: ۱۳۰۷، ۱۳۰۸۔ حتیٰ کہ رسولِ اکرم ﷺ

نے ایک یہودی کے جنازے پر بھی اس اسلامی سنتِ مواسات پر عمل فرمایا تھا اور آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام نے بھی اس کا اکرام کیا تھا: "مرّ بنا جنازة فقام لها النبی ﷺ فقمنا به، فقلنا: یا رسول الله ! انها جنازة یهودی. قال : اذا رأیتم الجنازة فقوموا"۔ حدیث بخاری: ۱۳۱۱- بعد میں اسی سنت و حکم نبوی کی پیروی میں بعض صحابہ کرام- حضرات سہل بن حنیف اور قیس بن سعدؓ- نے قادسیہ میں ایک ذمی/ غیر مسلم کے جنازہ کے لیے قیام کیا تھا۔ حضرات ابو مسعود وغیرہ بھی جنازہ کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

(احادیث بخاری: ۱۳۱۲-۱۳۱۳ و مابعد؛ نیز ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب القیام للجنازة؛ ترمذی، مذکورہ بالا، باب فی الرخصة فی ترک القیام لها، حدیث: ۱۰۴۴: حضرت علیؓ کا بیان ترک قیام نبوی پر شاہد ہے)

- مردوں کا جنازہ اٹھانا بھی ایک اسلامی تمدنی روایت ہے اور عورتوں کے نازک کاندھوں پر اس کا بار ڈالنا ممنوع ہے۔ اسی طرح عورتوں کا جنازہ کی مشایعت کرنا یا قبرستانوں میں جانا ممنوع ہے کہ وہ رقیق القلب ہوتی ہیں اور گریہ کرتی ہیں۔

(حدیث بخاری: ۱۳۱۴؛ حدیث مسلم: ۲۱۶۶: باب نهی النساء عن اتباع الجنائز وغیرہ)

- تیز رفتاری اور سرعت کے ساتھ جنازہ قبرستان لے جانا بھی اسلامی آداب میں شامل ہے: (بخاری: ۱۳۱۵)

- قبرستان میں جب تک جنازہ نہ رکھ دیا جائے مشایعت کرنے والوں کا بیٹھنا غیر مناسب و خلاف سنت ہے۔ (بخاری: ۱۳۰۹-۱۳۱۰ وغیرہ)

تدفین کے بعض معاشرتی رسوم و آداب

عرب اسلامی اور نبوی تمدن و معاشرت میں مردے کو قبر میں دفن کرنے کے بعد بعض رسوم بجالائی جاتی تھیں:

- ایک روایت و رسم یہ تھی کہ میت کی قبر کے پاس قبر کھودنے کے بعد کچی اینٹیں رکھ دی جاتی تھیں اور اس کے ساتھ پانی رکھا جاتا تھا۔ یہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے: "وقد فرغنا من حضرته ووضعنا اللبن والماء عند القبر"

- دوسرے یہ کہ قبر برابر کرنے کے بعد اس پر پانی چھڑکا جاتا تھا: "ورش علیٰ قبرہ الماء" ان سب رسوم وآداب کا ذکر حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ کی تدفین کے ذکر میں اہل سیر میں سے واقدی نے کیا ہے۔ بلاذری وغیرہ نے رسولِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک پر پانی چھڑکنے کا ذکر کیا ہے کہ سر اقدس سے دائیں پہلو پر حضرت بلال نے چھڑکا تھا۔

(۱/۵۷۶؛ واقدی، ۵۲۸-۵۲۹؛ اسد الغابہ، ۱/۴۰: حضرت ابراہیم فرزند نبوی کی قبر پر بھی پانی چھڑکا گیا تھا؛ بلاذری، ۱/۴۳۶: حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت زینب بنت جحشؓ کی تدفین کے بعد ان کی قبر پر پانی چھڑکا تھا۔ نیز بلاذری، ۱/۴۵۱: قبر ابراہیمؓ پر پانی چھڑکنے کا واقعہ بامر نبوی؛ ابن سعد، ۱/۱۴۱)

- تیسرے یہ کہ جب تک تدفین کا کام مکمل نہ ہو جائے مشایعت کرنے والوں کا قبر کے پاس ٹھہرے رہنا ضروری ہے (حدیث بخاری: ۱۳۲۵-۱۳۲۶ نیز حدیث بخاری: ۱۳۲۸، ۱۳۷۴ وغیرہ)

- میت کے لیے بعد تکمیل تدفین دعائے خیر کرنا بھی اسلامی ادب اور نبوی سنت ہے۔

(بخاری، احادیث: ۱۳۶۷-۱۳۶۸، ۲۶۴۳ وغیرہ)

- قبروں پر بیٹھنا غیر مناسب ہے اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ جلوس فرماتے تھے۔ (بخاری، حدیث: ۱۳۶۱ کا ترجمۃ الباب؛ فتح الباری، ۳/۲۸۳-۲۸۶ وغیرہ)

- قبروں کی مرمت واصلاح کا سلسلہ بھی عہد جاہلی سے جاری تھا اور عہد نبوی میں بھی قائم وجاری رہا۔ جنت البقیع کے آسودگان خاک کے علاوہ شہداء بدر واحد وغیرہ اور دوسرے اکابر واساطین کی قبروں کی مرمت واصلاح بھی کی جاتی رہی تھی۔ حضرت فاطمہ زہراءؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ حضرت حمزہؓ کی قبر مبارک پر جاتی تھیں اور اس کی اصلاح ومرمت کیا کرتی تھیں: "کانت فاطمة تاتی قبر حمزة ترمه و تصلحه..." (ابن سعد، ۳/۱۹)

- فرزندِ نبوی حضرت ابراہیمؓ کی قبر کے پاس ان کی خالہ ماجدہ سیرین کھڑی روتی رہیں اور ان کو کسی نے نہیں روکا۔ یہ ان کا اپنا بیان ہے اور رسولِ اکرم ﷺ قبر کے کنارے تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کے پہلو میں حضرت عباسؓ تھے۔

(ابن سعد، ۱/۱۴۳: "عن امه سیرین قالت : ... وانا ابکی عند قبره ما ینهانی احد ...")

قبر پر خیمہ لگانا/سایہ کرنا

عرب جاہلی عام رواج تھا کہ اکابر اور عظیم شخصیات کی قبروں پر خیمے یا شامیانے لگا دیتے تھے۔ ان سے مقصود ان کا اکرام و توقیر کا معاملہ بھی تھا اور سایہ کرنا بھی مقصود تھا بالخصوص سخت گرمی کے زمانوں میں۔ اگرچہ اسلامی دور میں اس رسم کا ذکر ذرا کم ملتا ہے اور جو ملتا ہے وہ بعد کے دور کا ہے لیکن وہ خلافتِ فاروقی کا واقعہ ہونے کے سبب اہم ہے اور پھر خاص کر وہ حضرت عمر فاروقؓ کے اپنے حکم اور دست خاص سے لگانے کا معاملہ ہے۔ ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کی وفات ۲۰/۶۴۰ میں ہوئی اور تدفین کے دن نہایت سخت گرمی تھی لہٰذا حضرت عمرؓ نے ان کی قبر پر ایک خیمہ لگوادیا: "وکان دفنها ای دفن زینب بنت جحش فی یوم صائف فضرب عمرؓ علیٰ قبرها فسطاطا" (بلاذری، ۱/۴۳۶)

قبر پر نشان یادگار

روایات میں آتا ہے کہ مختلف اصحاب اور خواتین کی قبروں پر پتھر وغیرہ سے پہچان کے لیے ایک علامتِ امتیاز لگادی جاتی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرزند حضرت ابراہیمؓ کی قبر کے نزدیک ایک پتھر لگوادیا تھا: "... امر رسول اللہ ﷺ بحجر فوضع عند قبره ورش علیٰ قبره الماء" (ابن سعد، ۱/۱۴۴)

میت کے اہل کے لیے کھانا بھیجنے کی روایت

عرب جاہلی کی ایک اچھی روایت تمدن یہ تھی کہ میت کے اہل وعیال اور خاندان والوں کے لیے ان کے اعزہ واقرباء بالخصوص ان کے پڑوسی کھانا پکا کر بھیجتے تھے کہ وہ اپنی مصیبت کے سبب گرفتارِ غم واندوہ تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس عمدہ تمدنی اور اسلامی روایت کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ اسے برقرار رکھا اور پروان چڑھایا۔ اہل سیر نے بالخصوص اور محدثین کرام نے بالعموم اس روایتِ معاشرت اور قدرِ مواسات کا ذکر خیر کیا ہے اور اس کا زیادہ حوالہ یا نمائندہ ذکر

حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کی شہادت کے واقعہ کے بیان میں ملتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے نصیحت و ہدایت فرمائی تھی کہ آل جعفر کو کھانا پکانے کی زحمت نہ دینا اور ان کے لیے کھانا پکا کر بھیجو کہ وہ اپنے صاحب کے معاملہ میں گرفتارِ بلا ہیں: "لاتغفلوا آل جعفر من ان تصنعوا لهم طعاما، فانهم قد شغلوا بامر صاحبهم" ۔ یہ ابن اسحاق/ ابن ہشام کی روایت ہے۔ واقدی کے ہاں مزید صراحت و پس منظر ہے اور محدثین کرام کی بیان کردہ احادیث میں اور ان کی شروح میں شارحین کرام نے اس تمدنی روایت کا مفصل ذکر کیا ہے۔

(ابن ہشام، ۳/ ۴۳۶؛ واقدی، ۷۶۶-۷۶۷: میت کے گھر والوں کے پڑوسی یا عزیز کھانا پکا کر بھیجتے تھے: ابوداؤد، حدیث: ۳۱۳۲:... عن عبدالله بن جعفر قال: قال رسول الله ﷺ : اصنعوا لآل جعفر طعاما فانه قد أتاهم امرٌ يشغلهم" ۔ باب صنعة الطعام لاهل الميت– دونوں روایات کی عبارت قریب قریب یکساں ہے؛ نیز ترمذی، مذکورہ بالا کتاب/ ابواب؛ حدیث: ۹۹۸: اصنعوا لاهل جعفر طعاما فانه قد جاء هم ما يشغلهم" قال ابو عيسىٰ: ... وقد كان بعض اهل العلم يستحب ان يوجه الىٰ اهل الميت شئ لشغلهم بالمصيبة، وهو قول الشافعي" ؛ ابن ماجہ، مذکورہ بالا، باب ماجاء في الطعام يبعث الى اهل الميت، حدیث: ۱۶۱۰-۱۶۱۱: قال عبدالله: فما زالت سنة، حتى كان حديثا فترك"۔ بہرحال وہ ایک سنتِ مواساۃ ہے)

تعزیت کے لیے گھروں کی زیارت

جاہلی عرب اور تمام دوسرے مہذب و ہمدرد معاشروں کی مانند عہد نبوی کے معاشرہ کا بھی خاصہ تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے گھروں پر تعزیت کے لیے جاتے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کی تو وہ ایک سنت متواترہ تھی۔ واقعاتِ سیرت کے علاوہ متعدد احادیث میں اس سنت نبوی اور تعامل صحابہ کرام کا ذکر تمام ادوار میں ملتا ہے۔ بعض محدثین کرام نے خاص تعزیت کے ابواب اپنی کتاب الجنائز میں باندھے ہیں جیسے ابوداؤد کا باب التعزية ہے۔ اس میں ایک بہت اہم روایت ہے: ۳۱۲۳ جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سہمیؓ ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہم صحابہ نے رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک میت کی تدفین قبرستان میں کی اور پھر آپ ﷺ کے ساتھ مرحوم صحابی کے گھر پہونچے۔ جیسے ہی رسولِ اکرم ﷺ دروازے کے سامنے پہونچے تو

ایک خاتون کو آتے دیکھا، وہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم کو کس چیز نے تمہارے گھر سے باہر نکالا۔ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس گھر کے غمزدہ باسیوں سے ان کے گھر والے کی موت پر تعزیت نے "... قالت : اتیت یا رسول الله اهل هذا البیت فرحمت الیهم میتهم أو عزیتهم به..." الخ۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین بھی غمزدہ خاندانوں کی تعزیت کے لیے ان کے گھروں میں جایا کرتی تھیں۔

(نیز نسائی، مذکورہ بالا، بـاب النعي، حدیث: ۱۸۸۱: واقعۂ حضرت فاطمہؓ: بـاب فی التعزیة، حدیث: ۲۰۹۰ کے مطابق آپ ﷺ نے ایک بچہ کی وفات پر تعزیت کی۔ اسد الغابہ، ۵/ ۶۲۰: حضرت ام العلاء، حکیم بن حزام اسدیؓ کی پھوپھی، کے گھر آپ ﷺ حضرت عثمان بن مظعون جمحیؓ کی وفات پر تعزیت کے لیے تشریف لے گئے تھے، نیز ذکر حضرت عثمان بن مظعون جمحی در اسد الغابہ، ۳/ ترجمہ صحابی؛ اصابہ: ۵۴۵۵؛ کتب حدیث بخاری و مسلم وغیرہ؛ ابن کثیر، ۱/ ۲۳۸: تعزیت فاطمہؓ بروایت احمد)

✪✪✪

منتخب کتابیات

اللہ تعالیٰ — قرآن مجید

ابن ابی ایاس (محمد بن احمد، م ۹۳۰/۱۵۲۴) بدائع الزهور فی وقائع الدهور، بولاق ۱۳۱۱ھ

ابن ابی الحدید (عبدالحمید بن ہبۃ اللہ، م ۶۵۵/۱۲۵۹) شرح نہج البلاغہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء

ابن اثیر (عزالدین علی بن محمد، م ۶۳۰/۱۲۳۳) اسد الغابۃ، تہران ۱۹۳۸ء

الکامل فی التاریخ، بیروت ۱۹۶۵ء

ابن اسحاق (محمد بن اسحاق، م ۱۵۰/۷۶۷) السیرۃ النبویۃ، رباط ۱۹۶۷ء

ابن اعثم کوفی (احمد بن عثمان، م ۳۱۴/۹۲۶) کتاب الفتوح، حیدرآباد ۱۹۶۸ء

ابن تیمیہ (احمد بن عبدالحلیم، ۶۵۲/۱۲۵۴) جوامع الکلم الطیبۃ، بیروت ۱۹۷۶ء

مجموعۃ فتاویٰ شیخ الاسلم احمد بن تیمیہ، مرتبہ عبدالرحمٰن بن محمد الحنبلی وغیرہ

المنقیٰ من اخبار المصطفیٰ، قاہرہ ۱۹۳۱ء

منہاج السنۃ، قاہرہ ۱۹۱۲ء

ابن الجوزی (عبدالرحمٰن بن علی، م ۵۹۷/۱۲۰۰) سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، قاہرہ ۱۹۱۲ء

صفۃ الصفوۃ، حیدرآباد ۱۹۳۶ء

المنتظم فی التاریخ، حیدرآباد ۱۹۳۹ء

ابن حبان بستی (محمد بن حبان، م ۳۵۴/۹۶۵) کتاب الثقات، حیدرآباد ۱۳۹۷ھ

ابن حجر عسقلانی (احمد بن علی، م ۸۵۲/۱۴۴۸) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، قاہرہ ۱۹۳۸ء

تہذیب التہذیب، حیدرآباد ۱۹۱۱ء

فتح الباری فی شرح البخاری، بولاق ۱۸۸۲ء؛ ریاض ۱۹۹۷ء

لسان المیزان، حیدرآباد ۱۹۱۱ء

ابن حجر ہیثمی (احمد بن محمد، م ۹۷۴/۱۵۶۶) تطہیر الجنان، قاہرہ غیر مورخہ

الصواعق المحرقة، بیروت ۱۹۶۵ء

ابن حزم (علی بن احمد، م ۴۵۶/۱۰۶۴) جمهرة انساب العرب، قاہرہ ۱۹۴۸ء

جوامع السیرة، قاہرہ ۱۹۵۶ء

کتاب الفصل فی الملل والنحل، قاہرہ ۱۹۰۲-۱۸۹۹ء

ابن حنبل (احمد بن محمد، م ۲۴۱/۸۵۵) المسند، قاہرہ ۱۹۴۹ء

ابن خلدون (عبدالرحمٰن بن محمد، م ۸۰۴/۱۴۰۶) کتاب العبر (تاریخ ابنِ خلدون)، بیروت ۱۹۵۶ء

المقدمة، مطبعہ مصطفیٰ محمد، قاہرہ غیر مورخہ

ابن خلکان (احمد بن محمد، م ۶۸۱/۱۲۸۱) وفیات الاعیان، بولاق ۱۸۵۹ء

ابن درید ازدی (محمد بن حسن، م ۳۲۱/۹۳۳) کتاب الاشتقاق، قاہرہ ۱۹۵۸ء

ابن سعد (محمد بن سعد، م ۲۳۰/۸۴۵) الطبقات الکبریٰ، بیروت ۵۸-۱۹۵۷ء)

ابن سید الناس (محمد بن محمد، م ۷۳۴/۱۳۳۴) عیون الاثر فی فنون المغازی و الشمائل والسیر، قاہرہ ۱۹۳۷

ابن الطقطقی (محمد بن علی بن طباطبا، م ۷۰۹/۱۳۰۹) کتاب الفخری، قاہرہ ۱۸۹۹ء)

ابن طولون (محمد بن علی، م ۹۵۳/۱۵۴۶) قضاة دمشق الشام، دمشق ۱۹۵۶ء

ابن عبدالبر (یوسف بن عبداللہ، م ۴۶۳/۱۲۶۰) الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، حیدرآباد ۱۹۰۰ء

ابن عبدالحکم (عبدالرحمٰن بن عبداللہ، م ۲۵۹/۸۷۰) کتاب فتوح افریقیا والاندلس، الجیریا ۱۹۴۷ء

ابن عبدالحکم (عبداللہ، م ۲۱۴/۸۲۹) سیرة عمر بن عبدالعزیز، قاہرہ ۱۹۲۷ء

ابن عبدربہ (احمد بن محمد، ۳۲۸/۹۴۰) العقد الفرید، قاہرہ ۱۹۴۰ء

ابن العربی (قاضی محمد بن عبداللہ، م ۵۴۳/۱۱۴۸) احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۵۷ء

ابن عساکر دمشقی (علی بن حسن م ۵۷۱/۱۱۷۶) تاریخ مدینة دمشق، دمشق ۱۹۵۱ء

تہذیب التاریخ الکبیر، دمشق ۱۹۳۲ء

ابن العماد حنبلی (عبدالحی بن محمد، م ۱۰۸۹/ ۱۶۸۷) شذرات الذهب فی اخبار من ذهب، قاہرہ ۱۳۵۰ء

ابن قتیبہ (عبداللہ بن مسلم دینوری ۲۷۶/ ۸۸۹) الشعر والشعراء، لائیڈن ۱۹۰۲ء

عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ء

کتاب الامامامة والسیاسة، قاہرہ ۱۹۲۵ء (منسوب)

کتاب المعارف، قاہرہ ۱۹۶۰ء

ابن قیم الجوزیہ (محمد بن ابوبکر، م ۷۵۱/ ۱۳۵۰) اعلام الموقعین عن رب العٰلمین، قاہرہ غیر مورخہ

بلوغ السول فی اقضیة الرسول، الہند ۱۸۷۵ء

زادالمعاد فی هدی خیر العباد، قاہرہ ۱۹۷۱ء

المنار المنیف فی الصحیح والضعیف، حلب ۱۹۷۰ء

ابن کثیر (اسمٰعیل بن عمر، م ۷۷۴/ ۱۳۷۳) البدایة والنهایة، قاہرہ ۱۹۳۲ء

السیرة النبویة، بیروت ۱۹۸۳ء

الفصول فی سیرة الرسول، دمشق ۳-۱۴۰۲ھ

ابن الکلبی (ہشام بن محمد م ۲۰۴/ ۸۱۶) کتاب الاصنام، لیزگ ۱۹۴۱ء

ابن ماجہ (محمد بن یزید، م ۲۷۳/ ۸۸۶) السنن، قاہرہ ۱۹۵۲ء

ابن مرتضٰی (احمد بن یحییٰ، م ۸۴۰/ ۱۴۳۷) طبقات المعتزلة، بیروت ۱۹۶۱ء

ابن منظور (محمد بن مکرم، م ۷۱۱/ ۱۳۱۱) لسان العرب، بیروت ۶-۱۹۵۵ء

ابن الندیم (محمد بن اسحاق، م ۲۳۵/ ۸۴۹) الفهرست، قاہرہ ۱۹۶۸ء؛ اردو ترجمہ، لاہور ۱۹۸۸ء

ابن ہشام (عبدالملک بن ہشام، م ۲۱۸/ ۸۳۳) السیرة النبویة، قاہرہ ۱۹۲۵ء

ابوحنیفہ دینوری (احمد بن داؤد، م ۲۸۲/ ۸۹۵) کتاب الاخبار الطوال، لائیڈن ۱۸۸۸ء

ابوداؤد (سلیمان بن الاشعث، م ۲۷۵/ ۸۸۸) السنن، قاہرہ ۱۹۲۲ء

ابوزرعة دمشقی (عبدالرحمٰن بن عامر، م ۲۸۲/ ۸۹۵) سیرة رسول اللہ ﷺ و تاریخ الراشدین، دمشق ۱۹۸۰ء

ابوعبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴/ ۸۳۶) کتاب الاموال، قاہرہ ۱۹۳۴ء

ابوالفرج اصفہانی (علی بن حسین، م ۳۵۶/ ۹۶۹) کتاب الاغانی، لائیڈن ۱۹۰۰ء

مقاتل الطالبین، نجف ۱۹۳۴ء، ۱۹۵۶ء
ابونعیم اصفہانی (احمد بن عبداللہ، م ۴۳۰/۱۰۳۹) حلیۃ الاولیاء، قاہرہ ۳۸-۱۹۳۲ء
دلائل النبوۃ، حیدرآباد دکن ۱۹۵۰ء
ابویوسف (یعقوب بن ابراہیم، م ۱۸۲/۸۹۸) کتاب الخراج، قاہرہ ۱۹۳۳ء
ازرقی (محمد بن عبداللہ، م ۲۴۴/۸۵۸) اخبار مکۃ المشرفۃ، بیروت ۱۹۶۴ء
اشعری (علی بن اسمٰعیل، م ۳۳۰/۹۴۱) مقالات الاسلامین واختلاف المسلمین، استانبول ۱۹۳۰ء
بخاری (محمد بن اسمٰعیل، م ۲۵۶/۸۷۰) التاریخ الکبیر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء
الجامع الصحیح، قاہرہ ۱۹۵۵ء
بغدادی (عبدالقاہر بن طاہر، م ۴۲۹/ ۱۰۳۷) الفرق بین الفرق، قاہرہ ۱۹۱۰ء
بغدادی (محمد بن حبیب، م ۲۴۵/۸۴۹) کتاب المحبر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء
کتاب المنمق، حیدرآباد دکن ۱۹۶۴ء
بلاذری (احمد بن یحییٰ بن جابر، م ۲۷۹/۸۹۲) انساب الاشراف، اول قاہرہ ۱۹۵۹ء
یروشلم، چہارم ۱۹۳۸ء؛ پنجم ۱۹۳۶ء
فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۳۲ء
بیہقی (احمد بن حسین، م ۴۵۸/۱۰۶۶) دلائل النبوۃ، حیدرآباد ۱۳۵۶ھ
السنن الکبریٰ، حیدرآباد ۱۳۵۵ھ
ترمذی (محمد بن عیسیٰ، م ۲۷۹/۸۹۲) الجامع الصحیح، حمص ۷۱-۱۹۶۹ء
الشمائل النبویۃ، قاہرہ ۱۸۶۳ء وما بعد
جاحظ (عمرو بن بحر، م ۲۵۵/۸۶۸) البیان والتبیین، قاہرہ ۱۹۴۸ء
رسالۃ فی تفضیل بنی ہاشم، قاہرہ ۱۹۳۱ء
العثمانیۃ، قاہرہ ۱۹۵۸ء
کتاب البخلاء، قاہرہ ۱۹۵۸ء
جمحی (محمد بن سلام، م ۲۳۱/۸۴۵) طبقات فحول الشعراء، قاہرہ ۱۹۵۲ء
جہشیاری (محمد بن عبدوس، م ۳۳۱/۹۴۲) کتاب الوزراء والکتاب، قاہرہ ۱۹۳۸ء

حلبی (علی بن برہان الدین، ۱۰۴۴/۱۶۳۴)	انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون، (سیرت حلبیہ) قاہرہ ۱۹۶۴ء
خلیفہ بن خیاط (م ۲۴۰/۸۵۴)	کتاب التاریخ، دمشق ۱۹۶۷ء
	کتاب الطبقات، دمشق ۶۷-۱۹۶۶ء
دیاربکری (حسین بن محمد، م ۹۶۶/۱۵۵۹)	الخمیس فی احوال انفس النفیس، قاہرہ ۱۸۸۵ء
ذہبی (محمد بن احمد، م ۷۴۸/۱۳۴۷)	تاریخ الاسلام، قاہرہ ۱۹۷۳ء
	تذکرہ الحفاظ، حیدرآباد دکن ۱۵-۱۹۱۴ء
	میزان الاعتدال، قاہرہ ۱۹۱۰ء
زبیری (مصعب بن عبداللہ، م ۲۳۶/۸۵۱)	نسب قریش، قاہرہ ۱۹۵۳ء
سمہودی (علی بن عبداللہ، م ۹۱۱/۱۵۰۵)	وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ قاہرہ ۹-۱۹۰۸ء
سہیلی (عبدالرحمٰن بن عبداللہ، م ۵۸۱/۱۱۸۵)	الروض الانف، قاہرہ (غیر مورخہ)
شامی (محمد بن یوسف دمشقی، م ۹۴۲/۱۵۳۴)	سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد (سیرۃ شامی)، قاہرہ ۱۹۷۵ء
طبری (محمد بن جریر، م ۳۱۰/۹۲۳)	تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری)، قاہرہ ۱۹۶۰ء
	تہذیب الآثار، ریاض ۱۹۸۲ء
	جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری)، قاہرہ ۱۹۶۰ء
فاکہی (محمد بن اسحاق، م ۲۷۲/۸۸۶)	المنقیٰ فی اخبار ام القریٰ، بیروت ۱۹۶۴ء
قاضی عیاض (بن موسیٰ یحصبی، م ۵۴۲/۱۱۴۷)	الشفعاء بتعریف حقوق المصطفیٰ قاہرہ ۱۹۵۰ء
قرطبی (محمد بن احمد، م ۶۷۱/۱۲۷۲)	الجامع الاحکام القرآن، قاہرہ ۱۳۸۷ھ
کشی (محمد بن عمر، ۴/۱۰ صدی)	معرفۃ اخبار الرجال، کربلا ۱۹۶۲ء
کلاعی (سلیمان بن موسیٰ، م ۶۳۴/۱۲۳۶)	الاکتفاء فی مغازی المصطفیٰ الثلاثۃ الخلفاء، قاہرہ ۱۹۷۰ء

کندی (محمد بن یوسف، م ۳۵۰/۹۶۱)	کتاب الامراء والولاۃ والقضاۃ، لائیڈن ۱۹۱۲ء
	ولاۃ مصر، بیروت ۱۹۵۹ء
مالک بن انس (م ۱۷۹/۷۹۵)	الموطا، قاہرہ ۱۹۵۱ء
ماوردی (علی بن محمد، ۴۵۰/۱۰۵۸)	الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ ۱۸۸۱ء
مسعودی (علی بن حسین، م ۳۴۵/۹۵۶)	کتاب التنبیہ والاشراف، لائیڈن ۱۸۹۴ء
	معراج الذهب، قاہرہ ۱۹۲۷ء
مسلم بن حجاج قشیری (م ۲۶۱/۸۷۵)	الجامع الصحیح، قاہرہ ۱۹۵۵
مقریزی (احمد بن علی، م ۸۴۵/۱۴۴۲)	امتاع الاسماع، قاہرہ ۱۹۴۱ء
نسائی (احمد بن شعیب، م ۳۰۳/۹۱۵)	السنن، کانپور ۱۸۸۲ء
نووی (یحییٰ بن شرف الدین، م ۶۷۶/۱۲۷۷)	ریاض الصالحین، دمشق ۱۹۷۶ء
	شرح صحیح مسلم، قاہرہ ۱۹۲۸ء
واقدی (محمد بن عمر، م ۲۰۷/۸۲۲)	کتاب المغازی، لندن ۱۹۶۶ء
ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶/۱۷۶۲)	ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، سہیل اکاڈمی، لاہور ۱۹۷۶ء
	حجۃ اللہ البالغۃ، کتاب خانہ رشیدیہ دہلی ۱۹۵۳ء؛ المکتبۃ السلفیہ، لاہور غیر مورخہ
	فتح الرحمن بترجمۃ القرآن، لاہور وغیرہ
یاقوت حموی (م ۶۲۶/۱۲۲۹)	ارشاد الاریب، لائیڈن ۱۹۰۷-۳۱ء
	معجم البلدان، بیروت ۱۹۵۶ء
یحییٰ بن آدم (م ۲۰۳/۸۱۸)	کتاب الخراج، لائیڈن ۱۹۸۶ء
یعقوبی (احمد بن ابی یعقوب، م ۲۸۴/۸۹۷)	تاریخ الیعقوبی، بیروت ۱۹۶۰ء
	کتاب البلدان، لائیڈن ۱۸۶۰ء قاہرہ ۱۹۵۵ء

اہم ثانوی کتابیں

ابوالکلام آزاد — رسول رحمت، دہلی ۱۹۸۲ء

احمد امین — فجر الاسلام، قاہرہ ۱۹۶۴ء

ضحی الاسلام، قاہرہ ۱۹۶۴ء

اکرم ضیاء عمری — المجتمع المدنی فی عهد النبوة، مدینہ ۱۹۸۳ء

السیرة النبویة الصحیحة، قطر ۱۹۹۱ء

ڈی، سی، ڈینیٹ (D.C.Dennett) — Conversion and Poll-Tax In Early Islam؛ کیمبرج ۱۹۵۰ء

اردو ترجمہ از غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۷۱ء

ڈینیل پائپس (Daniel Pipes) — Slave Soldiers and Islam, ییل یونیورسٹی پریس ۱۹۸۱ء

ریوبن لیوی (Ruben Levy) — دی شوسل اسٹرکچر آف اسلام، کیمبرج ۱۹۵۰ء

سید امیر علی — A Short History of the Saracens لندن، ۱۹۵۱ء

سید سلیمان ندوی — سیرۃ النبی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۶ء، جلد سوم تا جلد ہفتم

شاہ محمد سلیمان منصور پوری — رحمۃ للعالمین، دہلی ۱۹۸۰ء

شاہ معین الدین احمد ندوی — تاریخ اسلام، اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء

شبلی نعمانی — سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۱۹۷۶ء (اول، دوم)

الفاروق، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء

صالح احمد علی — تنظیمات الرسول الاداریة فی المدینة، بغداد ۱۹۶۰ء

عبدالعزیز دوری — بحث فی نشأة علم التاریخ عندالعرب، بیروت ۱۹۶۰ء

فرانز روزنتھال (Franz Rosenthal) — History of Muslim Historiography، لائیڈن ۱۹۵۲ء

فرانسسکو جبرئیلی — اے شارٹ ہسٹری آف دی عربس، لندن ۱۹۶۵ء

فلپ کے ہٹی (P.K Hitti) — دی ہسٹری آف دی عربس، لندن ۱۹۶۹ء

مارگولیتھ، ڈی، ایس — محمد اینڈ رائز آف اسلام، لندن ۱۹۰۵ء

محمد ادریس کاندھلوی — سیرۃ المصطفیٰ، دیوبند، غیر مورخہ

محمد حسین ہیکل — حياة محمد ﷺ، قاہرہ ۱۹۵۲ء

محمد حمید اللہ — عہدِ نبوی کا نظام حکمرانی، حیدرآباد ۱۹۴۹ء

محمد رسول اللہؐ، لاہور ۱۹۸۲ء (اردو؛ انگریزی)

نبی اکرمؐ کی سیاسی زندگی، کراچی ۱۹۴۹ء

محمد یٰسین مظہری صدیقی — بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات علی گڑھ ۲۰۰۱ء

تاریخ تہذیب اسلامی، نئی دہلی، جلد اول ۱۹۹۴ء، جلد دوم ۱۹۹۸ء

عبدالمطلب ہاشمی۔ رسولِ اکرم ﷺ کے دادا

اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی ۲۰۰۴ء

عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت دہلی ۱۹۸۸ء

Organisation of Government Under the Prophet ﷺ

دہلی ۱۹۸۷ء، لاہور ۱۹۸۸ء

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں، لاہور ۱۹۸۴ء

غزوات نبوی کی اقتصادی جہات، علی گڑھ ۱۹۹۹ء

الهجمات المغرضة على التاريخ الاسلامى

دار الصحوہ قاہرہ ۱۹۸۸ء

ولہاسن (Wellhausen) — Arab Kingdom and its Fall، لندن ۱۹۷۳ء

ولیم مونٹگمری واٹ (W.M.Watt) — محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء؛

محمد ایٹ مدینہ، آکسفورڈ ۱۹۵۶ء

ولیم میور (William Muir) — دی لائف آف محمد، ایڈنبرا ۱۹۲۳ء

The Caliphate، بیروت ۱۹۶۳ء

چیدہ مقالاتِ سیرت

تحقیقات اسلامی علی گڑھ

۱۔ عہدِ نبوی کی مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کا تناسب، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۲ء

۲۔ کیا مہاجرینِ مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟ اپریل-جون ۱۹۸۳ء

۳۔ عہدِ نبوی میں مسلم معیشت، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۳ء

۴۔ عہدِ نبوی میں فوجی تنظیم، عہدِ نبوی کا انتظامیہ، عہدِ نبوی کا مالی نظام، عہدِ نبوی کا مذہبی نظام- چار مقالات، جنوری ۱۹۸۵ء تا جنوری ۱۹۸۶ء

۵۔ مکی عہدِ نبوی میں مسلم آبادی-ایک تجزیاتی مطالعہ، اپریل تا ستمبر ۱۹۸۷ء

۶۔ معیشتِ نبوی مدینہ منورہ میں، اکتوبر ۱۹۸۹ء تا جنوری ۱۹۹۰ء

۷۔ معیشتِ نبوی مکی عہد میں، جولائی-ستمبر ۱۹۹۰ء

۸۔ ازواجِ مطہرات کے مکانات-ایک تجزیاتی مطالعہ، جنوری-مارچ ۱۹۹۱ء

۹۔ دعوتِ نبوی کے طریقے: ۱-۲، جنوری تا اپریل ۱۹۹۵ء

۱۰۔ نبوی وسیرت اور قریشی مجالس، جولائی-ستمبر ۱۹۹۵ء

۱۱۔ اسفار و غزواتِ نبوی میں ازواجِ مطہرات کی رفاقت، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۵ء

۱۲۔ عمِ نبوی زبیر بن عبدالمطلب اور سیرتِ نبوی، جولائی-ستمبر ۱۹۹۶ء

۱۳۔ محدثینِ کرام کی توقیتِ غزوات کا ایک تجزیہ، جنوری-مارچ ۱۹۹۷ء

۱۴۔ طاقت کے توازن کا قرآنی اصول، جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۸ء

۱۵۔ سیرت نگاری کا صحیح منہج، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۱ء

۱۶۔ مکہ اور مدینہ کے تعلقات، جولائی-ستمبر ۲۰۰۲ء

۱۷۔ عہدِ نبوی میں سماجی تحفظ کا نظام، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۲ء

معارف، اعظم گڑھ

۱۔ بنو عبد مناف-عظیم تر متحدہ خاندانِ رسالت، فروری-مارچ ۱۹۹۶ء

۲۔ عہدِ نبوی میں رضاعت، جون-جولائی ۱۹۹۶ء
۳۔ مکی مواخاۃ-اسلامی معاشرہ کی اولین تنظیم، دسمبر ۱۹۹۷ء تا جنوری ۱۹۹۸ء
۴۔ حضرت ام ایمنؓ-رسولِ اکرم ﷺ کی انا، فروری-مارچ ۲۰۰۳ء

نقوش، لاہور

۱۔ تاریخِ یعقوبی-سیرت نبوی کا ایک قدیم ماخذ، رسول نمبر ۱، ۱۹۸۲ء
۲۔ تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ-بعثتِ نبوی، ۱۹۹۰ء
۳۔ تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ-پیغامِ الٰہی ودعوتِ نبوی، ۱۹۹۱ء
۴۔ تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ-تبلیغ واشاعت اسلام، ۱۹۹۲ء
۵۔ تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ-خفیہ تبلیغ کے عہد کا تجزیہ، ۱۹۹۳ء

دیگر رسائل وجرائد

۱۔ بنوہاشم وبنوامیہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر، برہان دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء
۲۔ بنوہاشم اور بنوامیہ کے ازدواجی تعلقات، برہان دہلی، مئی تا اگست ۱۹۸۰ء
۳۔ شبلی کی سیرت النبی میں اضافات سلیمانی، مجموعہ مقالات، سید سلیمان ندوی علی گڑھ ۱۹۸۵ء
۴۔ سیرت نبوی کی ہمہ گیری، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
۵۔ علامہ شبلی کی سیرت النبی کی معنویت، فکرونظر علی گڑھ، ۱۹۸۹ء
۶۔ ازواج مطہرات کی تفسیری روایات-ایک تجزیاتی مطالعہ، علوم القرآن علی گڑھ، جولائی ۱۹۹۰ء تا جنوری ۱۹۹۱ء اور متعدد دوسرے مقالات ومضامین سیرت)

ہماری دیگر کتابیں

الہ العالمین اور انسان	ڈاکٹر نجم الدین
تدوین سیر ومغازی	قاضی اطہر مبارکپوری
خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک	مترجم امتیاز احمد
علامہ ڈاکٹر شبلی نعمانی کی قرآن فہمی	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی
فتاوی	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
کلکی اوتار اور حضرت محمدؐ	ڈاکٹر وید پرکاش اُپادھیائے
مرقع سیرت	پروفیسر عبدالجبار شاکر
مقالات سیرت	پروفیسر عبدالجبار شاکر
معرفت علوم الحدیث	ڈاکٹر ابوسلمان سراج الاسلام حنیف
مسلم تاریخ کے فیصلہ کن موڑ	پروفیسر محمد اجمل
ہندو علماء و مفکرین کی قرآنی خدمات	اورنگ زیب اعظمی

فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون 021-32212991, 32633887

کتاب سرائے
Kitabsaray@hotmail.com